عسکری نامہ
افسانے، مضامین
محمد حسن عسکری

محمد حسن عسکری

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Askari, Mohammad Hassan
Askri nama. - Lahore;
Sang-e-Meel Publications,
1997.
638p.
1. Afsaney. 2.Mazameen.
3. Urdu adab. I. Title.

1998ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز
سے شائع کی۔
قیمت =/ ۴۵۰ روپے

ISBN = 969-35-0937-8

سنگِ میل پبلی کیشنز
چوک اُردو بازار، لاہور فون: 7667970
شو رُوم: 25 - شاہراہِ پاکستان (لوئر مال) لاہور
PHONES : 7220100 - 7228143 FAX : 7245101
Email lhr01660 @ paknet1.ptc.pk
http://www.sang-e-meel.com

کمبائن پرنٹرز، لاہور

Hasnain Sialvi

ترتیب

جزیرے

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

تخلیق عمل اور اسلوب

دیباچہ

محمد حسن عسکری کو پہلی بار مَیں نے اس وقت دیکھا جب وہ عارضی طور پر انگریزی پڑھانے کے لیے میرٹھ کالج آئے تھے، شیروانی پہنے ہوئے، پان کی لالی سے ہونٹ رَچے ہوئے، ہاتھ میں کتابیں، آنکھوں پر عینک، اونچی پیشانی، تیل سے جمے ہوئے بال اور مانگ نکلی ہوئی۔ گیہواں رنگ، چمکتی روشن آنکھیں، چہرے پر سنجیدگی، چھریرا بدن، دُبلے پتلے، خاموش، کھوئے کھوئے سے، اپنے خیالات میں مگن۔ آہستہ آہستہ کلاس سے نکل کر اساتذہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حسن عسکری ہیں۔ مَیں نے پوچھا وہی عسکری صاحب جن کے افسانے ساقی، اَدبِ لطیف اور ادبی دُنیا میں شائع ہوتے ہیں، اور وہ جو ہر مہینے "ساقی" میں "جھلکیاں" لکھتے ہیں۔ بتانے والے نے کہا یہ تو معلوم نہیں البتہ یہ مشہور ادیب ہیں۔ مَیں نے انہیں حیرت و حسرت سے دیکھا۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ مَیں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ شوقِ ادب زندگی کا محور تھا اور ادیب بننے کا خواب زندگی کی تعبیر تھی۔ عسکری صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ادیب کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان کے آنے سے میرٹھ میں چہل پہل سی ہو گئی۔ دائرۂ ادبیہ کی نشستوں میں گرمی آ گئی۔ جیسے جیسے وقت گزُرا عسکری صاحب سے تعلقات بڑھتے گئے۔ کالج میں شوکت سبزواری بھی پڑھاتے تھے اور کرار حسین و غیور احمد رزمی بھی۔ صفدر حسین ایم، اے کر چکے تھے۔ قیصر زیدی ان سے بھی پہلے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ انتظار حسین ایم، اے کے آخری سال میں اور سلیم احمد ایف، اے میں پڑھ رہے تھے۔ احمد ہمدانی بھی کالج میں تھے۔ عسکری صاحب فرسٹ ایئر کی کلاس لیتے تھے جو بہت بڑی تھی۔ ان کی آواز پتلی اور پڑھانے کا بھی شاید پہلا تجربہ تھا۔ لڑکے طرح طرح کی شرارتیں کرتے، شور مچاتے اور وہ سب کچھ کرتے جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ ہم سب نے طے کیا کہ جب

عسکری صاحب کلاس میں جائیں تو ہم سب مختلف دروازوں پر کھڑے رہیں اور کچھ اندر جا کر بیٹھ جائیں تاکہ ان کی اخلاقی مدد کی جا سکے۔ کچھ ہفتے اسی طرح گزرے اور پھر فخر الاسلام صاحب واپس آ گئے جن کی عوضی پر عسکری صاحب کام کر رہے تھے۔ عسکری صاحب کالج سے تو الگ ہو گئے لیکن میرٹھ ہی میں رہے۔ محلہ مشائخان میں ان کا قیام تھا۔

۱۹۴۶ـ۷ ۱۹۴ء میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایما پر اُردو تحریک کی تیاری کی۔ رسیدیں چھپیں، چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جلسے کا پروگرام بن رہا تھا کہ گڑھ مکھتیشر میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ بہار، کلکتہ اور دہلی کے فسادات نے سارے برعظیم کی صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا، اور پنجاب کے فسادات نے رہی سہی کسر کو پُورا کر دیا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے اب بہت قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔ اسی زمانے میں عسکری صاحب نے اپنا ایک مضمون "میرجی" دائرۂ ادبیہ میں پڑھا۔ یہ آخری نشست تھی جس میں مَیں شریک تھا۔ مضمون کے بعد بحث کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شوکت سبزواری مناظرے کے ماہر اور سارے شہر میں منطقی مشہور تھے۔ انہوں نے تابڑ توڑ عسکری صاحب کے مضمون پر اعتراضات کیے اور عسکری صاحب کو اس طرح پر گھیرا کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ عسکری صاحب کچھ دیر تو بحث میں شریک رہے۔ آخر میں زِچ آ کر کہنے لگے "سبزواری صاحب! آپ سے بحث کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی مانجھا سُوتے۔"

۷ ۱۹۴ء کے اوائل میں عسکری صاحب نے ایک افسانہ لکھا۔ اس کا ذکر وہ کئی ہفتے سے کر رہے تھے۔ ہم نے کئی بار عسکری صاحب سے افسانہ سنانے کی فرمائش کی لیکن وہ ہر بار طرح دے گئے۔ یہ وہی افسانہ تھا جو اسی سال، دو اور افسانوں کے ساتھ "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" کے نام سے کتابی صورت میں ساقی بک ڈپو سے شائع ہُوا۔ اس وقت تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور فسادات کی آگ چاروں طرف بھڑک رہی تھے۔ یہ کتاب بھی فسادات کا شکار ہو گئی۔ چند کاپیاں پاکستان ضرور پہنچیں اور ختم ہو گئیں۔ "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" عسکری صاحب کا آخری افسانہ تھا۔

اکتوبر ۷ ۱۹۴ء میں وہ پاکستان آ گئے اور لاہور میں ٹک گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ وہ از سر تا پا پاکستانی فکر کے حامل تھے، جس کا اندازہ ان خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد خاں اور صمد شاہین و ممتاز شیریں کے نام لکھے اور جو اب "تخلیقی ادب" اور "نیا دور" کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دُوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ پوری دُنیا میں جاری ہے لیکن "آذری" کا زمانہ آنے تک کلچر کی حفاظت کے لیے شاید سامیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے۔ ادب میں بھی۔" (اختتامیہ، جزیرے ص ۲۰۷) پاکستان آ کر عسکری صاحب نے اسی فکر کو آگے بڑھایا۔ پاکستانی ادب کی شناخت کی بحث اسی اندازِ نظر کا نتیجہ تھی اور اس کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سامیت کا عنصر بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا اور وہ افسانہ نگاری سے دُور اور فکر و خیال سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

حسن عسکری کے افسانوں کی کُل تعداد گیارہ ہے۔ آٹھ افسانے "جزیرے" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ساقی بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئے جس میں ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۳ء تک کے افسانے شامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا دوسرا مجموعہ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" کے نام سے شائع ہوا جس میں تین افسانے شامل ہیں۔ "ذکر انور" اور "گٹھلیوں کے دام" ۱۹۴۳ء میں لکھے گئے، اور تقریباً سوا تین سال بعد ان کا آخری افسانہ لکھا گیا جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ گویا ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک تقریباً ساڑھے سات سال کا عرصہ عسکری کی تخلیقی زندگی کا افسانوی دور ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے وفات (۱۹۷۷ء) تک، کوئی افسانہ نہ لکھنے کے باوجود اُن کے افسانوں کے حوالے اور ان کا ذکر مختلف مضامین میں آتا رہا اور عسکری بحیثیت افسانہ نگار ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کے افسانے جدید اُردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ "شعور کی رَو" وہ بنیادی تکنیک ہے جسے عسکری نے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ نہایت خوبی سے نبھا کر اُردو فکشن کے لیے نیا راستہ کھولا اور اُردو افسانے کو مغرب کے افسانے کے دائرے میں داخل کر دیا۔ "حرام جادی" (۱۹۴۰ء) اور "چائے کی پیالی" (۱۹۴۱ء) اس تکنیک کی بہترین مثال ہیں۔ ۱۹۴۰ء کو سامنے رکھ کر اس کے بعد افسانے اور فکشن کو دیکھیے تو آپ کو اس تکنیک کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ اُردو افسانہ میں حسن عسکری کی یہی تاریخی و تخلیقی اہمیت ہے۔

عسکری کے افسانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان میں پلاٹ نہیں ہوتا لیکن داخلی و خارجی کیفیات کا حقیقت پسندانہ جزئیاتی اظہار شیر و شکر ہو جاتا ہے کہ "پلاٹ" نہ ہوتے ہوئے بھی "کہانی" پورے خد و خال کے ساتھ اُبھر کر قاری کو گرفت

میں لے لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ تنہائی کا احساس، نفسیاتی کشمکش اور جنسیت کا فطری اظہار ایک طرف افسانے کی فضا میں رنگ بھرتا ہے اور دوسری طرف ان کرداروں کو ابھارتا اور نمایاں کرتا ہے جن کے اِردگرد افسانے کا تاروپود بُنا گیا ہے۔ اسی لیے "حرام جادی" کی اِملی اور "چائے کی پیالی" کی ڈولی ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

حسن عسکری کے افسانوں کے اسلوب میں حقیقت نگاری، اشاریت اور تخیل، سب کچھ ایک ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ روایتی معنی میں رواں اسلوب نہیں ہے بلکہ ایک آہستہ رو اسلوب ہے جس میں توازن بھی ہے اور ٹھہراؤ اور ضبط بھی۔ پہلی نظر میں یہ کھُردرا اور خشک سا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ اس مخصوص تکنیک کے فنی تقاضوں کے لحاظ سے یکتا اسلوب ہے۔ اس میں زبان و بیان، روزمرہ، تلفظ و لہجہ بھی وہی استعمال کیا گیا ہے جو کرداروں کی پوری طرح ترجمانی کر سکے۔

حسن عسکری نے "جزیرے" کے اختتامیہ میں لکھا ہے کہ "اب اُردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے۔" اور یہ بھی لکھا ہے کہ تخلیق اور تنقید جہاں مل کر ایک ہو جاتی ہیں وہ کیری کیچر اور پیروڈی ہے۔ تخلیق اور تنقید کے اس اتحاد کی ایک مثال ان کا افسانہ "میلاد شریف" ہے۔ "گٹھلیوں کے دام" کو بھی اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے اور دوسری بہتر مثال "ذکر انور" ہے۔ پیروڈی کا وہ راستہ جو حسن عسکری نے ۱۹۴۳ء میں دکھایا تھا آج بھی اسی طرح کھلا ہے اور کسی ایسے نئے ذہن کا منتظر ہے جو تخلیق اور تنقید کو ملا کر پیروڈی کی سطح پر ایک کر سکے۔

حسن عسکری کے افسانوں کے دونوں مجموعے گزشتہ چالیس سال سے کمیاب بلکہ نایاب تھے۔ اُردو ادب کی نئی نسل ان افسانوں کی تاریخی اہمیت اور گہرے فنی اثرات سے کم و بیش ناواقف ہے۔ اب جو یہ افسانے "محمد حسن عسکری کے افسانے" کے نام سے چھپ کر دوبارہ سامنے آ رہے ہیں میرا خیال ہے کہ اُردو افسانے کے تعلق سے حسن عسکری کی تاریخی خدمات کا دوبارہ چرچا ہو گا اور ہمارے نئے افسانہ نگار یہ بھی دیکھیں گے کہ تنقیدی شعور سے جدید اُردو افسانے کو کاٹ کر ہم نے علامت کو کیسی گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے۔ حسن عسکری کے افسانے ہمیں اس کھائی سے نکلنے میں مدد دیں گے۔

کراچی
۳۰ مئی ۱۹۸۷ء

جمیل جالبی

جزیرے

I can call-up old ghosts, and they will come, But my art limps-- I can not send them home.

کالج سے گھر تک

میرا کالج تین بجے بند ہوتا ہے۔

دس بجے سے اس وقت تک کلاسوں میں لیکچر سننا اور خالی گھنٹوں میں بنچوں پر پہلو بدلنا، ہاتھوں سے چہرہ رگڑنا، ماتھا سہلانا، انگڑائیاں لے کر کوفت دُور کرنے کی کوشش کرنا ہی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں ہوتا اور اوپر سے آخر میں اکنامکس کی خشکی اور لیکچرار صاحب کی بھدی، موٹی اور تھکی ماندی آواز اس احساس کو اور بھی تیز کر دیتی ہے۔ کلاس سے نکل کر قدم آہستہ آہستہ بے ترتیبی سے پڑتے ہیں۔ سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا ہے اور کتابیں نیچے ہاتھ میں لٹکی جھولتی رہتی ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر اس خستگی میں کچھ کمی ہوتی ہے اور پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کل دس بجے تک کے لیے آزادی ہے۔ یہاں مَیں ہلکا سانس لیتا ہوں، اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ سامنے اکنامکس کا کمرہ نظر آ رہا ہے۔ مَیں فوراً گزرتے ہوئے یکوں اور سائیکلوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

مجھے جانا تو ہوتا ہے ڈیڑھ میل، اور گرمی کا گرم سُورج میرے ننگے سر کے ساتھ کچھ بہت زیادہ خوش سلوکی سے پیش نہیں آتا، مگر پھر بھی مَیں قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا — نہیں کرنا چاہتا۔ آخر چوبیس گھنٹے میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب سکون کے ساتھ کسی بات پر غور کیا جا سکے۔ صبح سے اُٹھ کر پڑھنا وڑھنا لگا ہی رہتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے یہ بے چینی ہوتی ہے کہ کہیں گھنٹہ نہ بج جائے — بس بھاگم بھاگ اور شام کو ٹہلنے میں ہلکی ہلکی ہوا کمبخت دماغ کو پتھر کا بنا دیتی ہے: نہ کچھ سوچ سکو اور نہ کچھ — بس جوتا پھٹ پھٹاتے جاؤ اور آ کر پڑ رہو۔ رات کا وقت تو خیر بنا ہی ناول پڑھنے کے لیے ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ کالج سے آنے کے وقت کے علاوہ اور کون سا وقت فرصت کا رہ گیا۔ آخر گھر ہی پہنچنا ہے نا؟ پہنچ ہی جائیں گے اپنے آہستہ آہستہ، پھر جلدی کاہے کی؟

ذرا آگے چل کر تراہا آ جاتا ہے۔ یہاں سے اس سڑک پر میرے سوا کالج کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا، اور تانگوں کی آمدورفت بھی معمولی ہی سی ہوتی ہے، اس لیے مجھے سوچنے کے لیے اور بھی اچھا موقع مل جاتا ہے۔

میرے ڈھیلے ڈھالے بدقطع کپڑوں اور چال ڈھال سے لڑکے مجھے نرا گاؤدی سمجھتے ہیں، مَیں جو خواہ مخواہ دخل در معقولات نہیں کرتا، اور اخباروں کے شذرات پڑھ پڑھ کر سیاسیات پر اناپ شناپ بحث کرنے کو بیکار خیال کرتا ہوں تو وہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مَیں کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ نئے قانونوں، اسمبلیوں کی تقریروں یا شاعروں کی قدروقیمت کے متعلق سرگرمی سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو میری طرف پیٹھ کر لیتے ہیں جیسے یہ معاملات مجھ سے بالاتر ہیں۔ اچھا پھر سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ میرا ہی کون سا بڑا ہرج ہو رہا ہے۔ آخر اور بھی تو بہت سے بڑے آدمیوں کو ان کے زمانے والے بے وقوف سمجھتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ بھی ٹھیک، مگر ان لوگوں کے سامنے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی چیز کم ہے۔ اور مَیں بار بار اپنے آپ کو اُوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوں۔ لیکن یہاں سڑک پر؟ یہاں کون بیٹھا ہے جو مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ یہاں تو میرا جس طرح جی چاہے چلوں، منہ بناؤں، ہاتھ ہلاؤں — بے چارے راہ گیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنستے پھریں.... اور آخر مَیں ان سے کسی بات میں کم بھی تو نہیں ہوں۔ سیاست.... بین الاقوامی معاملات.... ادب.... کیا نہیں آتا مجھے؟ — بڑے آزاد خیال بن کر چلے ہیں وہاں سے.... مجھے دیکھیں، مَیں تو خدا کو بھی نہیں مانتا۔ وہ تھے نا مولانا جواد علی جو جمعیتہ العلماء کی طرف سے تبلیغ کے لیے آتے تھے اور ہمارے ہی محلے میں ٹھہرتے تھے، کیسے کیسے میرے پیچھے پڑے ہیں، مگر مَیں نے ہی نہ دی حضرت کو پڑھ کر نماز، کہیں یہ لوگ ہوتے تو دَم سادھے ہی بنتی۔ اور ہاں پھر میرے کمیونسٹ خیالات!

ایسے موقعوں پر اگر مَیں اپنی کھدر کی سفید والی شیروانی پہنے ہوئے ہوں، اور اس کے دامن ہوا سے دونوں طرف اُڑ رہے ہوں تو مَیں محسوس کرنے لگتا ہوں گویا مَیں ایک سفید پروں والا فرشتہ ہوں اور سڑک پر چلنے والے آدمیوں سے اُونچا ہو گیا ہوں۔ ہوا جب میرے بالوں اور کانوں کے بیچ سے گزرتی ہے تو میری کن پٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں اپنا قد سپاہیوں کی طرح سیدھا کر لیتا ہوں اور شیروانی کا دامن ایک ہاتھ سے پکڑ کر تھوڑی دیر تک ذرا تیز چلتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بھی تو چاہیے کہ ان لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دُوں کہ مَیں اُن سے کچھ ہیٹا نہیں ہوں۔ اچھا تو آنے دو اب کی ڈیبیٹ.... مگر.... نہیں مذاق اڑائیں گے شریر کہیں کے.... پھر کالج کے میگزین ہی میں ایک مضمون لکھ ڈالوں۔ لیکن اگر نہ لیا میرا مضمون تو....؟ کیا کرنا چاہئے.... کیا.... کرنا.... ٹھیک، ٹھیک! اب کے چھٹیوں میں جو گھر جانا ہو تو اپنے پُرانے اسکول میں ایک تقریر کر ڈالوں۔ یہ لوگ تو واقعی میری تقریر نہ سُن سکیں گے، مگر خیر مجھے تو تسلی ہو ہی جائے گی کہ مَیں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں.... بس تو یہی طے ہے.... ہاں پھر تقریر کا مضمون کیا رہے گا؟

مَیں ذرا دیر اپنا چہرہ کھجاتا ہوں اور پھر تقریروں کے عنوان اور اُن کے متعلق فقرے ذہن میں چکر لگانے لگتے ہیں.... موجودہ بین الاقوامی معاملات.... فش.... رُوس کی معاشری حالت.... ہوں، ہوں.... لینن.... ٹراٹسکی.... اسٹالن.... کوئی دوسرا.... ورڈس ورتھ کی شاعری.... نہیں نہیں — آج روس میں ہر ہر کسان....'' مگر اس بات کا تعلق تو پہلے والے مضمون سے ہے.... اچھا پھر.... ادب اور زندگی.... یہ ٹھیک رہا۔ آخر جاننا چاہیے کچھ بے چارے ان اسکول کے لڑکوں کو بھی۔ انہیں پڑھایا جاتا ہے کیا، بس وہی غالب.... شمارِ سبحہ مرغوب بت مشکل.... بھلا یہ کوئی شاعری ہوئی.... ہونہہ.... تو بس یہ مضمون ٹھیک رہا۔

اچھا اب اسے شروع کس طرح کیا جائے گا؟ .... پہلے تو اپنی کم استعدادی کا اعتراف، اور پھر معافی کا مطالبہ وغیرہ.... ''معزز اساتذہ اور بھائیو'' انگریزی میں کہتے ہیں لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مگر عورتیں تو ہوں گی نہیں.... تو پھر یوں.... ''غیر حاضر خواتین اور حاضر اصحاب'' ..... اس سے ایک ہنسی کی بات تو کہہ دی گئی نا.... ''آپ سب مجھے جانتے ہیں.... مَیں نے اسی سکول میں پڑھا ہے۔ مَیں کچھ زیادہ تو جانتا نہیں مگر آپ کی خدمت کے شوق میں حاضر ہو گیا ہوں.... میری غلطیاں معاف کریں گے'' .... اب کوئی لطیفہ یا شعر.... شعر ہی سہی.... یہ مصرع مناسب ہو گا۔ یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ.... پڑھ کر دیکھ لینا چاہیے.... مَیں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں۔ مَیں اپنا ہاتھ مُنہ پر اس انداز سے رکھ لیتا ہوں کہ ہونٹوں کے ہلنے کو کافی جگہ رہے، اور ہلکی آواز میں پڑھتا ہوں:

یہی زِن.... دگی حقی قت.... یہی زِندگی فس آنا

''آپ لوگ غالب کا کلام پڑھتے ہیں۔ قصیدے پڑھتے ہیں، غزلیں پڑھتے ہیں،

کیوں پڑھتے ہیں؟ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ کبھی آپ نے سوچا؟ بتایئے.... آپ اس لیے...." یہاں میری مٹھی بندھ جاتی ہے اور ہاتھ اُوپر اُٹھنے لگتا ہے مگر مَیں شرما کر اُسے جلدی سے نیچے کھینچ لیتا ہوں.... آپ اس لیے شعر پڑھتے ہیں کہ آپ زندگی...." ہاں ہاں یہ ظالم زندگی.... "کہ آپ زندگی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے گہرے رازوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان سمندروں کی تھاہ لانا چاہتے ہیں اور شاعر کا بھی...."

گھوڑے کے ٹاپوں کی زوردار آواز مجھے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے'.... ہاں' وہی ہے۔ یہ لڑکیوں کا تانگہ مجھے اکثر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی انداز سے بڑی تمکنت کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں، اور وہ کبھی مجھ سے نگاہیں چُرانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اُس کا چہرہ بیضوی، سفید اور بھرا ہُوا ہے، اُس کے ہونٹ خُوب سُرخ اور ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ مَیں سوچا کرتا ہُوں، کاش مائیکل اینجلو اُس کا مجسمہ بناتا.... لیکن مجسمہ پھر بھی بے جان ہی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں تو عموماً مجسمہ میں پتھرائی ہُوئی سی نظر آتی ہیں۔ مونا لیزا کا مصور ہی کچھ اس کی نقاشی کرے تو کرے۔ خاص طور سے اس کا سینہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی سفید جالی دار ساڑھی اور ہلکے جمپر میں سے اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہُوں.... سفید ملائم، سڈول.... مَیں چھو سکتا! اگر کہیں وہ بھی میری تقریر سُن سکے تو مزا ہی آ جائے.... ممکن تو ہے.... ابھی تو چھٹیوں میں بہت دِن پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عرصہ میں میری اس سے ملاقات ہو جائے اور اتنی راہ و رسم بڑھ جائے کہ مَیں اُسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ پھر تو مجھے دُوسری طرح شروع کرنا پڑے گا۔ مَیں کہوں گا۔ "اکیلی خاتون اور بہت سے حضرات" سب ہنس پڑیں گے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کیسا کیسا رشک ہو گا لوگوں کو، اور مَیں خوشی سے دیوانہ ہو ہو جاؤں گا۔ اپنے پُرانے انگریزی کے ماسٹر صاحب سے ضرور تعارف کراؤں گا اس کا.... تانگہ گزر بھی چکا ہوتا ہے، اور مَیں اسی کے خیال میں غرق، اپنے نچلے ہونٹ کو اُوپر کے ہونٹ سے رگڑتا ہُوا، سر لٹکائے، بائیں ہاتھ سے کتابیں دل کے قریب چپٹائے ہُوئے اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے برابر والی انگلی کو ملتا ہُوا، آہستہ آہستہ لڑھکتا رہتا ہُوں۔

سُورج کی گرمی سر کو جھلس کر رکھ دیتی ہے، بدن میں چنگاریاں لگنے لگتی ہیں، اور چہرہ پسینے میں ڈُوب جاتا ہے۔ بے قرار ہو کر مَیں یکایک تیز چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ آگے

درختوں کا سایہ آتا ہے جو کافی دُور تک چلا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر مَیں لپکتا ہُوں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر کو چکرا دیتی ہے، اور میرا دماغ تیز لہروں کی دھار پر گھومتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر قسم کے خیالات میرے ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور میری رفتار بہت دھیمی پڑ جاتی ہے۔

درختوں کے ختم ہونے کے قریب سڑک کے کنارے ایک کمہار کا گھر ہے۔ درختوں کے سائے میں اُس کی لڑکی اپنا چاک رکھے آب خورے بنایا کرتی ہے۔ وہ گھٹنوں سے اُوپر تک کا پھٹا سا لہنگا اور آدھی بانہوں کا دھاری دار کُرتا پہنے رہتی ہے اور اس کی اوڑھنی ڈھلک کر کندھے سے نیچے گر جاتی ہے، اُسے اپنے تندرست اور نیم رس سینے کو ڈھکنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی، جس کا کافی حصہ گریبان میں بٹن نہ ہونے سے راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُس کے سُوکھے ہُوئے سخت بالوں کے گچھے اور لٹیں بن گئی ہیں، جن میں سے اکثر اس کے تانبا جیسے اور جابجا مٹی سے سنے ہوئے چہرے پر لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے ڈنڈے سے چاک کو گھماتی ہے تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں گردش کرتی ہُوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُس کی ٹانگیں بے پروائی سے چاک کے دونوں طرف پھیلی رہتی ہیں اور اُس کی برہنہ چکنی پنڈلیوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہُوئی نظر آتی ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے اپنی تقریر یاد آ جاتی ہے اور مَیں سوچنا شروع کر دیتا ہُوں، میری بھنویں چڑھ جاتی ہیں اور مَیں بمشکل اپنے لفظوں کو ہونٹوں تک آنے سے روکتا ہُوں۔

آپ نے اپنی شاعری میں قوس و قزح کی رنگینی اُڑا لی۔ اُسے گُل دیا من میں بسا دیا۔ موجِ نسیم کے گہوارے میں پالا۔ بادۂ ناب اور مے انگوری کی کیفیتیں اس میں بھر دیں، اور طور کی تجلیوں سے اسے ضیا بخشی۔ لیکن.... آپ نے زندگی سے کیا لیا۔ زندگی.... میرا مقصد ہے زندگی.... کیا آپ نے کبھی خون گرم دہقان کی جھلک دیکھی؟ کیا آپ نے مزدور کی کمر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی؟ کیا آپ نے.... ان مضبوط لیکن فاقہ کش اور بدحال مزدُورنیوں کی جفا کیشی کے گن گائے؟.... اگر نہیں تو آپ بے خبر سوتے رہے.... آپ نے آنے والے انقلاب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں.... ہوشیار.... بیدار ہو جائیے.... اُٹھیے اور اپنے ادب کا...."

موٹر کے ہارن کی متواتر آوازیں مجھے جگا دیتی ہیں اور مَیں ایک طرف ہو جاتا

ہُوں۔ یہ موٹر میری کلاس کے ایک کالے اور بدشکل لڑکے کی ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھتا ہے اور مجھے ضرور پہچانتا ہو گا۔ مگر اپنی موٹر میں گزُرتے ہُوئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو ناک سکیڑ کر دُوسری طرف منہ کر لیتا ہے۔ کرتا ہے تو کر لے، ایسا کہاں کا لاٹ صاحب ہے بڑا۔ اور ہو بھی تو کیا ہے۔ انقلاب بھی تو نزدیک آ رہا ہے، اور تھوڑے دن چین کر لے پھر کھل جائے گی حقیقت!..... اپنے منتقمانہ ارادوں کے پُورا ہونے کی اتنی قریب اُمید پر ایک پُر رمز مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک آ جاتی ہے، اور اس طرف سے مطمئن ہو کر مَیں اپنی تقریر سوچنے لگتا ہُوں۔ اس وقت مجھے سلسلے کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی، کیونکہ ابھی تو خیالات کو جمع کرنا ہے، ان کی مناسب ترتیب تو موقع پر ہوتی رہے گی۔

کسی مشہور انگریزی مصنف کا قول بھی آنا چاہیے تقریر میں۔ آخر لوگوں کو یہ معلوم تو ہو کہ ہم نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھا تو پھر کون سا مصنف..... میتھیو آرنلڈ..... ادب تنقید حیات ہے،'..... مگر نہیں، چھوڑو، بہت پامالی ہے یہ..... شیلی کا وہ شعر "ایسی ایسی شکلیں جو بقا کی پروردہ ہیں۔" لیکن یہ تو میرے مقصد کے خلاف رہے گا۔ مجھے تو زندگی کے متعلق کہنا ہے..... پھر؟..... شاید لینن نے کہا تھا کہ یہ "سر ہلانے کا وقت نہیں ہے بلکہ سر توڑنے کا....." لیکن کوئی ٹھوس چیز ہونی چاہیے..... کس نے لکھا ہے وہ؟ ..... والٹر پیٹر..... بینٹ..... فرائی..... خیر، کوئی بھی سہی۔ یُوں کہا جا سکتا ہے۔ "کتنی اچھی بات کہی ہے ایک انگریز نقاد نے کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی سے نشوونما پاتا ہے اور زندگی پر ہی اثرانداز ہوتا ہے۔" اپنے میں یورپ کے مصنفین کے اقوال نقل کرنے کی صلاحیت پا کر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ مَیں اپنی تقریر کو بھُول کر کچھ دیر اسی خیال سے لطف اُٹھاتا رہتا ہُوں، اور بار بار مسکرا پڑتا ہُوں۔ مَیں اُس دن کا تصور کرتا ہُوں جب مَیں اپنی تقریر میں یہ اقوال دُہرا رہا ہُوں گا..... لڑکے میری قابلیت پر تعجب کریں گے۔ فارسی کے ماسٹر صاحب گردن بڑھا بڑھا کر مجھے گھوریں گے۔ مرعوب تو وہ بھی ہو رہے ہوں گے مگر اس پر جھنجھلا رہے ہوں گے کہ مَیں نے ابھی تک فارسی کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا۔ اور آخر مَیں کیوں پڑھوں صاحب، بھلا کہاں انگریزی کہاں فارسی! گھر جا کر بھی تو لڑکے.....

"ارے ہٹتے بھی ہو آگے سے کہ نہیں۔" ایک پسینے میں شرابور اور سر سے پیر تک سیاہی سے پتا ہُوا مزدور کوئلے کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے کو کھینچتے ہوئے پیچھے سے پکار کر کہتا ہے اور ساتھ ہی زیرِ لب ایک غیر شگفتہ اصطلاح کا اضافہ بھی کرتا ہے..... ان

لوگوں کی ایسی باتوں سے میرے دِل کو ایک دھکا سا لگتا ہے.... ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم ان کی حمایت میں تقریریں سوچیں، ان کی خاطر سرمایہ داری کے خلاف دانت پیسیں، ان کی حالت پر افسوس کریں.... اور ان کا ایسا سلوک ہمارے ساتھ؟.... کیا حالت ہے دُنیا کی بھی.... اپنے ہمدردوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے یہ لوگ.... نہ جانیں نہ پہچانیں.... جانور کہیں کے۔ مَیں ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب اپنی تقریر کا موضوع بدل دوں گا اور اقبال کے فلسفہ حیات پر بولوں گا.... مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کچھ ایسا قصور بھی تو نہیں ان بے چاروں کا.... جاہل ہیں نا آخر.... چلو چھوڑو بھی، اپنی طرف دیکھو۔

"ہاں تو...." وہ ادب جو زندگی سے رشتہ مضبوط رکھے، جو زندگی کی ترجمانی کرے.... جو.... زندگی...." زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ اور ساتھ ہی ایک مریل گھوڑے پر یکے والے کے چابکوں کی سڑاسڑ — "ایک مرتبہ یونانیوں نے اپنے ایک شاعر کو اس لیے سزا دی تھی کہ وہ ان کی زندگی کے مصائب اپنے شعروں میں بیان کیا کرتا تھا.... زندگی مصائب سے پُر ہے.... مصائب.... ظلم.... بے انصافی.... اور یہ مزدور...."

میرا خالی ہاتھ کبھی اُوپر آتا ہے، کبھی نیچے جاتا ہے، اور کبھی گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے، میرے ہونٹ بھی کچھ ہلتے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب دو اسکول کے لڑکے اپنی سائیکلوں پر میرے پاس سے گزرتے ہیں اور مجھے دیکھ کر قہقہہ مارتے ہیں، میرے خون کی گردش رُک سی جاتی ہے، اور کنپٹیاں بھاری اور گرم ہو جاتی ہیں لیکن مَیں آہستہ آہستہ اپنے بدن کو ڈھیلا کر لیتا ہُوں، اور پھر....

"آپ لوگ اب بڑے ہونے والے ہیں۔ آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیے.... بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے.... اب آپ لوگوں کے ہاتھ بات ہے۔ آپ کو نیا ادب پیدا کرنا ہے.... زندگی سے باہر آپ کہاں جا سکتے ہیں، زندگی ایک چیستاں ہے.... غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھئے زندگی کو.... ایک شاعر ہے آج کل انگریزی کا۔ وہ کہتا ہے کہ مَیں مُحبت کرتا ہُوں چائے کی پیالیوں سے، کمبلوں سے، ریل کے...."

"چھوئے نہ دیلے نند۔" پگلا نذرو چیخ چیخ کر گا رہا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی سڑک پر ناچتا بھی جاتا ہے، لڑکے اُسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں، اور خود بھی چلاتے جاتے ہیں۔ "کیا کہنے ہیں نجو بیٹا کے۔" پوسا پکوڑی دُور بیٹھا لڑکوں کو شہ دیتا رہتا ہے۔ یہ پوسا، پنواڑی کی دُکان کے قریب پیپل کے نیچے چبوترے پر بوری بچھائے کڑوے تیل میں

پکوڑیاں پکایا کرتا ہے۔ جس کی چراہند دُور دُور پھیلی رہتی ہے۔

اب گھر اتنا نزدیک آ جاتا ہے کہ تقریر کے متعلق کچھ اور سوچنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔ باقی حصے پر کل غور کرنے کا ارادہ کر کے مَیں چال کو تیز کر دیتا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے بارش آ گھیرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر بادل گھنٹہ ختم ہونے پر اُٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن مَیں ان کی دہشت ناک شکل کو ذرا خاطر میں نہیں لاتا۔ سُورج کی جھلسن کا پتا بھی نہیں ہوتا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں طبیعت کی روانی کا کیا پوچھنا — جیسے چلے جا رہے ہوں ہلکے ہلکے اُڑتے ہُوئے اور پھر یہ لازمی تھوڑی ہے کہ بارش ہو ہی، مَیں اپنی تقریر سوچتا ہُوا چل دیتا ہُوں — اور دِنوں سے بھی آہستہ۔ خطرے کے نزدیک ہونے کا احساس مجھے اُس وقت ہوتا ہے جب یکے اور تانگے پوری رفتار سے گھڑگھڑاتے ہُوئے دوڑنے لگتے ہیں۔ سائیکلوں کی گھنٹیاں بے تابانہ زور زور سے بجتی ہیں اور گھاس والیاں ایک ہاتھ سے اپنے لہنگے سنبھالتے ہُوئے یہ کہہ کہہ کر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں کہ "بھاگو بھائی، پانی آلیو۔" مَیں بھی گھبرا کر جلد جلد قدم بڑھاتا ہُوں — موٹی موٹی بوندیں پڑتی ہیں۔ اب مَیں بھاگنے کی تیاری کرتا ہُوں مگر بارش ایک ساتھ آ جاتی ہے.... یُوں ہونے کو تو مَیں حاجی غلام رسول ٹرنک ساز کی دکان میں پناہ لے سکتا ہُوں، اور ایک دفعہ مَیں نے کیا بھی یہی تھا۔ بارش جو آئی تو مَیں سیدھا حاجی جی کی دکان پر چڑھ گیا۔ حاجی جی لکڑی کی کُرسی پر دونوں پیر اُوپر رکھے بیٹھے تھے، اور حقہ پیتے ہُوئے کسی سے باتوں میں مشغول تھے۔ مَیں بھی کھڑا ہو کر سننے لگا۔ اسکول کی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے اپنے مخاطب کی طرف جھک کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہُوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اور بھئی لو بیسیوں واقعے تو خود مجھے معلوم ہیں، جب بورڈنگ کی لڑکیوں کے بچے پیدا ہُوئے ہیں۔ آخر کچھ حد ہے بے حیائی کی۔"

مَیں بھی بول اُٹھا۔ "لیکن جب آپ کی بھینس بچہ دیتی ہے تو اُسے بے حیا کیوں نہیں کہتے؟"

حاجی جی نے اس غیر متوقع جارحانہ حملے کو، جس نے اُنھیں ہڑبڑا دیا تھا، کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور داڑھی کو اس طرح اُوپر اٹھاتے ہُوئے بولے، گویا وہ بھی اُن کی دلیل کا ایک حصہ ہے۔ "تو آدمی اور بھینس کی کیا

مثال؟"

"بھینس آدمی نہیں ہوتی کیا؟" مَیں نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"بھینس آدمی؟" حاجی جی کی حقّے کی نے نیچے گر پڑی۔

"ہاں آدمی، یعنی یہ کہ... جان دار تو ہوتی ہے۔"

میری اور حاجی جی کی خاصی جھڑپ ہو گئی، جس کے دوران میں انھوں نے میری ذات کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں میرے وہاں کھڑے رہنے پر فی الحال کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر مَیں بارش کے باوجود وہاں سے چل دیا۔ جب سے مَیں کبھی ان کی دکان پر نہیں جاتا، چاہے کتنے ہی زور کی بارش کیوں نہ آ جائے، اور پھر بارش اسی وقت آتی ہے جب میرا ایک تہائی کے قریب راستہ رہ جاتا ہے۔ اس لیے مَیں سیدھا بھاگ ہی لیتا ہوں۔ بارش کا زور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بوچھاڑ آنکھوں کو بند کیے دیتی ہے۔ کتاب کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر کپڑوں پر ٹپکنے لگتا ہے۔ مگر مَیں بھاگے ہی چلا جاتا ہوں۔ بارش کے وقت پوسا پکوڑی والا اپنا سامان پنواڑی کے تخت کے نیچے سرکا دیتا ہے اور چبوترے پر پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے، وہ کبھی ایک دھوتی کے سوا اور پہنتا ہی کیا ہے، اس وقت تو وہ دھوتی کو بھی اُوپر چڑھا لیتا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر زور سے گاتا ہے:

"برسو رام جھڑاکے سے، بڑھیا مر گئی پھاکے سے"

جب مَیں بھاگ رہا ہوتا ہوں تو اس کی آواز ایک عفریتانہ تمسخر کے ساتھ، تند، کرخت، ایک دھمکی لیے ہُوئے، بارش کی دھار کو چیرتی پھاڑتی میرے تعاقب میں دوڑی چلی آتی ہے — برسو رام جھڑاکے سے!

میں اپنے مکان کے سامنے کے میدان کو گھوڑوں کی لید اور کیچڑ میں پھنستے ہوئے اور پرنالوں کے پانی میں چھپ چھپ کرتے ہُوئے طے کر کے سر سے پیر تک پانی میں ڈوبا ہُوا زینے کے دروازے تک پہنچتا ہُوں۔ جیب سے چابی نکالنا چاہتا ہوں تو جیب ایسی چپک جاتی ہے کہ چابی بڑی مشکل سے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر تالا بھی کھلنے میں دِقت پیدا کرتا ہے۔ جلدی جلدی اُوپر پہنچ کر مَیں کتابوں کو چارپائی پر پھینک دیتا ہُوں۔ شیروانی کو آہستہ آہستہ اتارتا ہُوں اور اسے اُلٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھتا ہُوں گویا میری نگاہ کی گرمی سے وہ خشک ہو جائے گی یا اُس کی رگڑ سے کتاب کا بہا ہُوا رنگ چھٹ جائے گا۔ پھر مَیں اسے نہایت احتیاط سے کواڑ پر ڈال دیتا ہُوں اور کپڑے اتارے بغیر بالوں کو تولیے سے سکھانے کی

کوشش کرتا ہوں اتنے میں چھدن یکے والا اُوپر چڑھ آتا ہے اور کواڑ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ تیز نظروں سے حالات کا جائزہ لیتا ہے اور پھر چونکتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے:

''کہو بابو جی، بھیگ گئے آج؟'' اور ساتھ ہی اس کے دھکے سے شیروانی کواڑ پر سے نیچے کچی زمین پر گر پڑتی ہے اور مٹی میں سن جاتی ہے۔

اور یہ وہی میری کھدر کی سفید شیروانی ہوتی ہے۔

....

اگلے دِن میں دُنیا کے آئندہ نظام کے متعلق تقریر سوچتا ہوں۔

(''اَدبی دُنیا''۔ اگست ۱۹۴۰ء) ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء

پھسلن

جمیل کا تو اس طرف خیال تک نہ گیا تھا، مگر ذاکر کے غیر متوقع طرزِ عمل نے اس کے دِل میں بھی دلچسپی، ورنہ کم سے کم کھُرچن سی تو ضرور پیدا کر دی۔ وہ ہُوا یُوں کہ ایک دن مردانے میں ذاکر جمیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے پلنگ پر بیٹھا تھا کہ یکایک اندر سے نذرو نمودار ہُوا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر کمرے کے باشندوں کا جائزہ لیا، اور پھر شانے چوڑے کیے، سینہ اٹھائے، اپنی موٹی میلی سُوتی بنیان کی، جس کے مختلف رنگ عرصے کے استعمال سے گھل مل کر اب ایک چتیوں دار بھُوری رنگت میں تبدیل ہو چکے تھے، آدھی آستینوں سے نکلی ہُوئی بانہوں اور ٹخنوں سے اُونچی دھاری دار تہمد ہلاتا، بغیر کسی طرف دیکھے اپنے گلے کے سیاہ ڈورے کو ہاتھ سے گھماتا ہُوا لاپروائی سے سیدھا میز کی طرف چل دیا۔ نذرو کے داخل ہوتے ہی ذاکر کی بھنویں اُوپر اُٹھ گئی تھیں، اور اس کی آنکھیں نذرو کے چہرے پر گڑ چکی تھیں۔ نذرو کے چلنے کے ساتھ ساتھ ذاکر کی آنکھیں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلیں اور جمیل کی کمر کے گرد اُس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ نذرو کے جاتے ہی اُس نے جمیل کے کندھے کو جھٹکا دے کر بایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر فیصلہ کُن انداز سے رکھتے ہُوئے، ایک بھوں اُوپر چڑھا کر اور دُوسری نیچ کھینچ کر، ترچھی سلوٹوں سے بجتے ہُوئے ماتھے اور طنز سے مسکراتی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں بھئی؟"

"ارے! تمھیں نہیں معلوم؟" اور اس کے یہاں ذاکر کی آمد و رفت کی تعداد کو دیکھتے ہُوئے جمیل کا تعجب بے جا بھی نہ تھا۔ "یہ نوکر ہے ہمارا نیا — نذرو... کمال ہے یار، تمھیں اب تک خبر نہ ہُوئی..... ہیں؟"

اس سوال کے جواب کی اہمیت پر غور کیے بغیر، ذاکر نے کہا۔ "یعنی آپ کو بھی یہ

شوق ہُوا۔ یہ کب سے؟ کیا ارادے ہیں آخر؟" اُس کی شک و شبہ سے بھری ہُوئی آنکھوں کی تیزی اور چمک، اور اُن کے جھکے ہُوئے کناروں کے ساتھ اب دو ہونٹ بھی ہنسنے کے لیے کھل چکے تھے۔

جمیل کا دل نہ چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو محض مذاق سے زیادہ وقعت دے، مگر اس نقطۂ نظر کے انوکھے پن نے اُسے ایسا مجبور کر دیا کہ شام تک جتنی مرتبہ بھی نذرو اس کے سامنے آیا، اُس نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھ کر اس نظریہ کی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر ہر دفعہ یہی فیصلہ کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہُوا کہ ذاکر صرف اسے چڑا رہا تھا۔ تاہم اسے اپنے نئے نوکر کی شخصیت کچھ عجیب و غریب، اجنبی اور پُر رمز ضرور معلوم ہو رہی تھی، آج سے نہیں بلکہ پہلے ہی دن سے۔ وہ آکر بڑے لاابالیانہ پن سے ہاتھوں کو پیٹ کے اوپر ایک دوسرے پر رکھ کر دھوپ میں جا کھڑا ہُوا تھا۔ اور ہاں، اُس نے کسی کو سلام تک نہ کیا تھا۔ جب اس سے نوکری کرنے کو پوچھا گیا تو اس نے پُورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا: "ہاں ہاں، جی۔ کیوں نہ کریں گے؟" اُسے دعویٰ تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ جب اُس سے تنخواہ کے متعلق سوال کیا گیا تو اُس نے اپنا زردی مائل بے رنگ لمبا صافہ اتارا، اور اُسے جھاڑ کر دوبارہ باندھتے ہُوئے ایسے انداز میں کہا گویا تنخواہ آخری چیز تھی جس سے اُسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ "اجی، جو بھی دِل چاہے دے دینا۔" اور اُس نے تین روپے پر کوئی اعتراض کیا بھی نہیں۔ دو دن تک وہ بہت خاموشی اور سستی سے اپنا کام کرتا رہا، مگر تیسرے دِن اُس نے بالکل غیر متوقع طرزِ گفتگو اختیار کیا۔ جب جمیل اسکول جانے سے پہلے باورچی خانہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو نذرو نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہا: "اجی آج ایک سالی عجیب بات ہُوئی.... سناؤں مَیں جمیل میاں، وِس کو تمہیں؟" نذرو کے تنے ہوئے کان، گول گول پھرتی ہُوئی آنکھیں، ہنسی میں کھلے ہُوئے ہونٹ، اُس کی ناک کے دونوں طرف سرخی کی جھلک، اور گالوں میں پڑے ہُوئے گڑھے کو دیکھ کر جمیل ہچکچایا اور اس کے منہ سے نوالے میں سے پھنستی پھنساتی ایک نیم رضامند "ہُوں" نکلی۔ نذرو کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ "یہ جو برابر میں لالہ رہتے ہیں نا، اجی یہی دیوار تلے۔" نذرو ہر شخص اور ہر چیز کی بھن کے بارے میں اپنے فاسد خیالات کا بلاجھجک اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے چھپا نہ رہا تھا۔ "تو آج جو مَیں ذرا کوٹھے پہ گیا جمیل میاں، تو کیا دیکھا کہ وِس کی بیوی سالی، بس بالکل ویسے ہی بیٹھی تھی.... بس ایک ساڑھی لپیٹ رکھی

تھی وِس نے۔ اور اب کیا بتاؤں بھئی لو..... لاحول بلا۔ لاحول بلا۔ سب دکھائی دے رہا تھا..... تو جی، اتنے میں آیا وِس کا میاں..... لالہ۔" نذرو اور قریب کھسک آیا تھا اور جمیل کا سارا چہرہ گلابی ہو گیا تھا، اور وہ جلدی جلدی نوالے توڑ رہا تھا۔ "تو جی وِس نے آتے ہی وِس کو لے کے پلنگ..." جمیل کے پھندا لگ گیا اور وہ کھانستا ہُوا گھڑوں کی طرف بھاگا، اور پانی پی کر سیدھا چل دیا۔ اُس کے کسی نوکر نے کبھی اس سے ایسا ذکر نہ کیا تھا۔ اس چیز نے اسے شش و پنج میں ڈال رکھا تھا۔ اور پھر آج کی ذاکر کی باتیں۔ وہ نہایت مضبوط دلیلوں اور مثالوں سے اس سب کی اہمیت کم کرنے اور اسے کوئی غیر معمولی چیز نہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر پھر اسے اپنے فیصلوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

اگلے دن تک یہ بات اسکول میں پہنچ گئی۔ درمیانی وقفے میں جب نویں کلاس کے لڑکے نیم کے پیڑ کے نیچے جمع ہُوئے تو ایک پُوری ٹولی نے جمیل کو گھیر لیا۔

"اُونچے جا رہے ہیں بھئی جمیل بھی آج کل۔"

"خیر میاں شکر کرو، یہ اس قابل تو ہُوئے۔"

"ابے ہٹا۔ یہ! اس مرے یار سے آتا ہی کیا ہے سوائے گھومنے کے، کسی کے سامنے بات تو کر نہیں سکتا، بڑا بنا ہے کہیں کا وہ۔"

"ٹکھیاں مارو گے بیٹا۔" مرزا بیدار بخت نے نصیحت کی۔ "سب بھول جاؤ گے یہ فرسٹ وَرسٹ آنا۔"

جمیل ان سب کے جواب میں جھینپ جھینپ کر روکھی ہنسی ہنس رہا تھا اور خالی نگاہوں سے اُن کے چہرے دیکھ رہا تھا، لیکن وہ اُسے وقتی تفریح سمجھ کر ٹلا نہ سکتا تھا۔ اور شبہوں کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ان چیزوں سے بھی واقف ہونا چاہتا تھا جس کا یہ سب لوگ ذکر کر رہے تھے اور جس کا تخیل اس کے دماغ میں نہایت غیر واضح سا تھا۔ وہ بھی علی بابا کے غار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

اسی دن دوپہر کو مرزا بیدار بخت ذاکر کو ساتھ لے کر جمیل کے یہاں وارد ہُوئے۔ انھوں نے اس کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا۔ مرزا جی کو بڑی پیاس لگی ہُوئی تھی۔ نذرو انھیں پانی کا گلاس دے کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ مرزا جی نے پانی کا گلاس واپس نہیں دیا۔ وہ دو منٹ تک اس کا جائزہ لیتے رہے اور پھر بولے۔ "کہو دوست، کیا نام ہے تمہارا؟"

"ہمارا نام؟ کیا کرو گے پوچھ کے ہمارا نام؟" اس نے بے توجہی سے کہا۔

"کچھ بُرائی ہے پوچھنے میں؟"

"ہمارا نام ہے سید نذیر علی!" نذرو نے بتلایا۔

"اور نذرو؟" مرزا جی نے پوچھ لیا۔

"اب ہم غریب آدمی ہیں، چاہے جو کہہ لو۔"

"رہنے والے کہاں کے ہو تم؟ اچھا بیٹھو، بیٹھو، باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

نذرو پلنگ کے قریب کُرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یُوں تو کبھی کبھی اُسے کُرسی پر بیٹھنے میں جمیل کا لحاظ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اُس کی نشست بتا رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مواخذے سے مامون سمجھ رہا ہے۔

اُس نے ماتھے اور سر پر اپنا چوڑا اور موٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اجی کیا پُوچھو ہو..... ہم غریبوں کا رہنا رہوانا۔"

"ابے سالے؟" مرزا جی نے پہلو بدل کر ڈانٹا۔ "اکڑ گیا کُرسی پہ بیٹھ کے! بتاتا ہے کہ کی جائے قانونی کارروائی تیرے ساتھ۔"

نذرو ایک دم ہنس پڑا۔ اس کا ہاتھ سر سے گھٹنے پر آ گیا۔ پیچھے کھسک کر اُس نے مانوس اور مصالحانہ انداز میں ٹانگیں پھیلا لیں، اور بغیر کسی مزید، گو متوقع، سوال کے اپنی پُوری سوانح حیات سُنا ڈالی — "رہنے والے تو ہم ہیں عنایت پور کے۔ ہمارے والد ہیں سید مقبول احمد۔ دیکھا ہو گا آپ نے.... بہت آتے ہیں وہ تو شیر۔" مرزا جی کے انکار سے مایوس ہُوئے بغیر اُس نے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ دُوسری شہادت پیش کی۔ "اچھا، تو یہ ہیں نا سید اشفاق علی۔ یہ بزار کے نکڑ پر جو رہویں ہیں — موٹے سے — بڑی بڑی مونچھیں — فونوگراف کے رکاٹ بغل میں دبائے جو پھرتے ہیں — یہی تو ہیں ہمارے خالو — سگے خالو ہیں یہ ہمارے..... تو ابا جو تھے ہمارے.... وہ تھے اس قدر کے ظالم کہ بس۔ جب مَیں پڑھنے نہ جاتا تو مار دیویں تھے ایسی بودی کہ..... دس سال کا تھا مَیں وِس وخت۔ ایک دن جو مارا انہوں نے مجھے، تو مجھے آیا بڑا غصہ، مَیں بھاگ کے بدلو جلاہے کی پھلیچ پہ جا بیٹھا۔ وِس نے مس سے کہا چل بے دلی.... شیشے کے کرخانے میں۔ میں وِسی کے ساتھ چل دیا۔ بس جی وہ دن ہے اور آج کا دن۔ قسم لے لو مس سے جو پھر گھر میں جھانکا بھی ہُوں۔ پانچ سال ہو گے اور پھر والد نے کی بھی بڑی کوشش، لیکن مَیں وِن کے نہ آیا

جھانسے میں۔ دِلی میں مَیں شیشے کے کرخانے میں نوکر ہو گیا تھا۔ کرخانے والا بس بیٹے کے برابر سمجھتا تھا مجھے، جو چیز چاہے اُٹھاؤں چاہے رکھوں۔ اور پیسوں کے معاملے میں بچارے نے کبھی مجھ سے ناں نہیں کی۔ بڑی مُحبّت تھی وِسے مس سے۔ ایک دِن مَیں رانگ آگ پہ رکھ کے ذرا نیچے بزار میں اُتر گیا۔ وہاں ایک لونڈا سالا کرنے لگا مجاخ، بس اسی میں دیر ہو گئی۔ آ کے جو دیکھا مَیں نے تو رانگ اُلٹا پڑا تھا۔ کرخانے والا بہت بگڑا مجھ پہ۔ خیر ایسی بات کا تو مَیں بُرا بھی نہ مانتا، پر وہ مجھے گالی دے بیٹھا۔ وخت کی بات آگ لگ گئی میرے بدن میں۔ مَیں وِس سے لڑ کے نکل گیا۔ کئی دن پھرا وہ میرے پیچھے پیچھے۔ خوشامد کرتا وا کہ چل، چل، اِتی سی بات کا بُرا مان گیا۔ پر ساب، یہ دیکھ لو کہ مَیں نے ہی نہ سُنی وِس کی بات۔ سید ٹھہرے پھر ہم بھی۔ کوئی رعیت تھے وِس کی۔ وِس سے کہہ دیا مَیں نے [illegible] تیری خاطر ہم نے دِلی بھی چھوڑی۔ بس مَیں وہاں سے یہاں چلا آیا۔

اس دن سے مرزا جی، اور خصوصاً ذاکر کی آمدورفت پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی لیکن جمیل محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی کمر کے گرد ذاکر کے ہاتھ کی گرفت بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ ان دونوں کو آتے ہی پانی یا پان کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور جتنی دیر وہ بیٹھتے، اُس کا زیادہ حصہ نذرو سے دِلی کے بازاروں، گلیوں، کارخانوں، اور سڑکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں گزرتا۔ نذرو کی وہ پہلے والی کسالت، سستی اور خاموشی سرے سے غائب ہو چکی تھی۔ اب اُس کی چال میں پھرتی آ چکی تھی، اور وہ دِن میں تین چار بار منہ ہاتھ دھونے لگا تھا۔ اس کا صافہ اب باورچی خانے کی کھڑکی میں پڑا رہتا تھا اور اس کے چھوٹے گھونگریالے بال، جن پر پہلے خشکی جمی رہتی تھی، کڑوے تیل سے سیاہ اور چمک دار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اپنے بنیائن اور تہمد کو بھی ایک دفعہ کنوئیں پر پچھاڑ چکا تھا۔ اُس کی ٹین کی ڈبیا اب کبھی بیڑیوں سے خالی نہیں نظر آتی تھی۔ بلکہ اُس کے گلے کا ڈورا بھی ریشمی ہو گیا تھا۔ باتونی بھی وہ اس بلا کا ہو گیا تھا کہ اُس کے دِلی کے متعلق قصے کبھی ختم نہ ہوتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مرزا جی اور ذاکر اسے دو اچھے سامعین مل گئے تھے۔ اور ان دونوں سے تو اس کے تعلقات ترقی کر کے دوستانے کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے۔ انہیں نذرو کے منہ کی جھوٹی بیڑیاں پینے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے یار دوستوں کی سی گالیاں بھی دے لیا کرتے تھے، حالانکہ وہ ایک مرتبہ جمیل کے "گدھا" کہہ دینے پر بھڑک

اُٹھا تھا۔ جب وہ مرزا جی کے جُوتے چھپا دیتا تو مرزا جی اُسے پکڑ کر فرش پر گرا دیتے اور اس کے گالوں اور سینے پر چٹکیاں لیتے، یہاں تک کہ وہ جُوتوں کا پتا بتا دیتا۔ جمیل نے اکثر اندر سے نکلتے ہُوئے ذاکر کی بانہوں کو نذرو کے گلے میں دیکھا تھا، مگر وہ اس کے سامنے آتے ہی ہٹالی جاتی تھیں۔ نذرو نے جمیل کا کہنا ماننا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بات کو اَن سُنی کر دیتا تھا۔ جب جمیل پڑھتا ہوتا تو وہ سامنے چارپائی پر اُلٹا لیٹ کر اونچی جھنجھناتی آواز میں گانے لگتا: "میری جاں جلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھے ہو۔" یا "جانی جبنا پہ اتنا نہ اترایا کرو۔" وہ جمیل کے منع کرنے پر بھی نہ مانتا، اور ہنس ہنس کر دُوسرا گیت شروع کر دیتا۔ "وہ چلے پھٹک کے چاول مری منگنی اور بیاہ کے۔" جب جمیل ضبط کی آخری حد پر پہنچنے کے بعد غصے میں دانت کچکچاتا، جُوتا لے کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تو وہ جُوتا چھین کر بھاگ جاتا اور پھر ہاتھ نہ آتا۔ آخر جمیل رونکھا ہو جاتا اور پھر اس سے نہ پڑھا جاتا۔ وہ تہیہ کر لیتا کہ آج ضرور وہ نذرو کو ابا کے سامنے مارے گا اور گھر سے نکال دے گا۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد نذرو آ کر لجاجت سے کہتا۔ "جمیل میاں، مجاج کا بُرا مان گئے۔" تو وہ اپنے ارادے میں ترمیم کر لیتا اور نذرو کے سر پر دو تین تھپڑ جما کر، جس میں شاید اس کی باریک انگلیوں کو ہی زیادہ تکلیف پہنچتی ہو گی، اپنا غصہ بُھلا دیتا۔ مگر اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نذرو کو جمیل کا خیال نہیں تھا۔ بغیر کہے ہی وہ جمیل کا ہر کام تیار رکھتا تھا۔ اس کے جُوتے کبھی میلے نہیں رہتے تھے، اور نہ اس کے کمرے میں گرد کا نشان۔ نذرو اس کا سرپرست اور محافظ بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جمیل کو کتابیں صاف رکھنے میں، اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے میں، غرض ہر بات میں بزرگانہ ہدایتیں اور نصیحتیں کیا کرتا۔ وہ مرزا جی اور ذاکر کو بھی اسے زیادہ تنگ نہ کرنے دیتا تھا۔ جمیل کو نذرو کی یہ حیثیت جو اُس نے قائم کر لی تھی، گراں تو ضرور گزرتی تھی، اور وہ اب اپنے دوستوں کے سامنے نذرو کی موجودگی میں اپنے آپ کو ایک کم اہمیت والی شخصیت محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اُس کے دل میں کبھی کبھی صرف ایک ہلکی اور غیر واضح جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو کر رہ جاتی تھی۔ چنانچہ اُس نے نہایت آسانی سے نذرو کو اپنے اُوپر مسلط ہو جانے دیا۔ مرزا جی اور ذاکر کے نذرو کی طرف متوجہ ہو جانے سے اب وہ اسے پریشان نہ کرتے تھے، اور وہ اپنے آپ کو کچھ ہلکا سا پاتا تھا۔ نذرو کی خبر گیری اور توجہ سے اس کے کام بغیر کسی تکلیف کے ہو جاتے تھے اور اب اُسے اپنی کتابوں، اور رسالوں کے رُومانی افسانوں میں وقت گزارنے کا پہلے سے بہت

زیادہ موقع ملنے لگا تھا اس لیے اُس نے نذرو اور اس کے برتاؤ کو بغیر کوئی اہمیت دیئے یا بغیر کسی تشویش کے یُوں ہی چلنے دیا اور اپنے پہلے استعجاب کو تحلیل ہو جانے دیا۔

لیکن اس کا استعجاب دوبارہ زندہ ہُوا۔ وہ اس وقت جب مرزا جی اور ذاکر کی آمد و رفت بڑھنے کے بعد پھر گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ گئی تھی۔

اُس کے ملنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک تو اس کے ساتھی، نویں کلاس کے کچھ لڑکے، یہ سب اُس سے کافی بڑے تھے اور سب اپنے اپنے اُستروں کا انتخاب کر چکے تھے۔ یہ جمیل کی طرح دُبلے پتلے کمزور اور منحنی نہ تھے، بلکہ اُن کی چوڑی ہڈیاں، اٹھے ہُوئے کندھے اور بھرے ہُوئے ڈنڈ تھے۔ یہ لوگ جب آتے تو اس سے الگ ہو کر بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ کبھی تو اُس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے، کبھی اسے سینے سے لپٹا کر بھینچتے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور اس کی پسلیاں ٹوٹنے سی لگتیں۔ کوئی اُسے گود میں بٹھاتا، کوئی اُس کے سینے کی کھال کھینچ کھینچ کر لال کر دیتا، کوئی اُس کے بال بکھیر دیتا۔ اور پھر ان لوگوں کی چمکتی ہُوئی آنکھوں اور پھڑکتے ہُوئے نتھنوں اور پھیلے ہُوئے ہونٹوں سے معلوم ہوتا کہ اُن کی تسکین نہیں ہُوئی ہے۔ اُن کے جانے کے بعد وہ تھک کر بالکل چُور ہو جاتا، اُس کے دماغ سے ہر قسم کے خیالات غائب ہو جاتے اور وہ افسردگی سے چارپائی پر پڑا رہتا۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے گالوں پر ایسا لیس دار تھوک لپ جاتا کہ اس کی کھال کھینچتی ہُوئی معلوم ہونے لگتی۔ دو دو تین تین مرتبہ منہ دھونے کے بعد بھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ نجاست اُس کے چہرے پر اُسی طرح نمایاں ہے، اور وہ غسل خانے سے نکل کر گھر والوں کی نظروں سے بچتا ہُوا سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اتنے لوگوں کو اپنا مداح پا کر اسے ایک گونہ تسلی تو ضرور ہوتی تھی۔ مگر اُسے اُن کی یہ حرکات عجب مہمل اور لغو نظر آتی تھیں۔ اُن کا مقصد اس کے لیے مبہم اور مشکوک سا تھا، اور نہ اُس کی متانت نے ان لوگوں کو ان حرکات کی غرض و غایت کو زیادہ واضح کرنے دیا تھا۔ جب وہ جاتے تو اُس کے لیے بس اتنا چھوڑ کر جاتے، تھکا ماندہ جسم، دُکھتی ہڈیاں، نُچے ہُوئے گال، گرم کنپٹیاں، درد کرتا ہُوا سر اور چڑچڑا مزاج۔ اور پھر ان سے بچنا بھی خوشگوار نتائج پیدا نہ کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اندر سے کہلوا دیا کرے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے، لیکن اُس نے خود دیکھا تھا کہ ایک مرتبہ شمس الدین نے شرط بد کر گھونسے سے

کرسی کا تختہ توڑ دیا تھا اور عنایت علی کے ہاتھ کی قوت تو خود اس کی انگلیاں پنجہ لڑانے میں محسوس کر چکی تھیں۔

ملنے والوں کے دُوسرے گروہ میں نیچی کلاسوں کے لڑکے تھے۔ چھٹی سے لے کر آٹھویں تک۔ یہ سب جمیل کے ہم عمر یا اُس سے کچھ چھوٹے تھے۔ یہ لوگ پہلے گروہ کی غیر موجودگی میں آتے تھے اور انہی میں جمیل کو زیادہ کھُل کر ہنسنے بولنے اور تفریح کرنے کا موقع ملتا تھا، پھر ان پر اس کا رعب بھی خاصا تھا۔ اگر وہ کبھی ذرا ناراضگی کا اظہار کرتا تو سب کی ہنسی رُک جاتی تھی اور وہ مجرمانہ نظروں سے ایک دُوسرے کو دیکھنے لگتے تھے۔ تاہم وہ بڑی حد تک اُن کے مذاق کا بُرا بھی نہ مانتا تھا۔ بعض بعض دن تو جب وہ دوپہر کی گرمی اور خاموشی میں بے چینی سے اکیلا کروٹیں بدلتا ہوتا اور کہیں ساتویں کلاس والا مظہر آنکلتا تو اُس کا دِل تیزی سے حرکت کرنے لگتا۔ اپنی قمیض کے دامن کو ہاتھوں سے ٹانگوں کے قریب تھامے ہُوئے وہ مظہر کو کسی بہانے کونے کی طرف لے جاتا اور اُس کا کندھا پکڑ کر ہچکچاتے ہُوئے جلدی سے اس کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا اور پھر فوراً پیچھے ہٹالیتا۔ گال ٹھنڈا، چکنا اور پھیکا سا ہوتا، مگر اسے محسوس ہوتا کہ اُس کی بے چینی یک لخت مدھم پڑ گئی، اسے اپنی یہ حرکت کچھ بے معنی اور احمقانہ سی معلوم ہونے لگتی۔ وہ دِل ہی دِل میں حیرت سے ہنستا۔ پھر کچھ شرما کر بیٹھ جاتا۔ اور مظہر سے اُس کی پڑھائی کے بارے میں پُوچھنے لگتا۔

غرض اسی گروہ نے جمیل کو دوبارہ نذرو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں میں بھی نذرو کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ایک دن نذرو کی موجودگی میں، مشتاق نے مذاق اور قہقہوں اور چیخوں کے درمیان اپنی آواز کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا: "بھئی آج یہ طے کرو کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، مالک یا نوکر۔" اپنے نوکر کو اس نئی روشنی میں دیکھے جانے کے خوف سے جمیل کی ناک کے دونوں طرف سُرخی جھلک آئی اور اسے اپنی کھال سکڑتی ہُوئی معلوم ہونے لگی۔ مگر اُس نے اس ترکیب میں اپنی آخری اُمید سمجھتے ہُوئے مسرور کو زور سے دھکا دیا۔ "ابے، میرے اُوپر گرا ہی پڑتا ہے۔" اسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مسرور کے دھکے سے میز گر پڑی، اور اس نے سب کو کتابیں چننے میں لگا دیا۔

اب جمیل کی آنکھیں زیادہ تجسس سے اور شک آمیز حیرت سے نذرو کے چہرے

اور جسم کو ٹٹولا کرتی تھیں۔ مشتاق نے ایسا ذکر چھیڑ کر اُس کے جذبۂ افتخار کو ایک بے پناہ ٹھیس لگا دی تھی۔ اُس نے اپنے دوستوں کے دُوسرے گروہ سے بھی ملنا اب بہت کم کر دیا تھا۔ کیونکہ اُسے اُن کے متفقہ فیصلے کا، جو ممکن تھا اُس کے خلاف ہوتا، بہت ڈر تھا۔ مگر وہ اس خیال کو اپنے دِل سے کسی طرح دُور نہ کر سکا۔ اسی لیے وہ اپنے خطروں کو دلیلوں سے دُور کرنے کی پیہم کوشش کرتا کہ ایک نفرت آمیز "ہنہ" کے ساتھ اس کی ہر طرف سے نظریں پھیر لے۔ نذرو کی اُنگلیاں، وہ سوچا کرتا، کیسی موٹی موٹی گنواروں کی سی ہیں اور اسی طرح اُس کے بھدے پیر، بغیر بالوں والی پنڈلیاں کیلے کے پیڑ جیسی ہیں، بیچ میں سے مڑا ہُوا، ایک دانت آدھا ٹُوٹا، ادرک کی گانٹھ جیسے کان، چھوٹی اور گھنی گردن، پھیلا ہُوا پیٹ، گالوں میں ہنسی کے وقت گڑھے پڑ جاتے ہیں جیسے بازاری عورتوں کے — جمیل کو اس چیز سے کِس قدر گھن آتی تھی۔ شرابیوں کی سی چال، کندھے مٹکاتے ہُوئے — ایک نفرت آمیز "ہنہ!" لیکن اس "ہنہ" کے باوجود وہ اُسے دُوسری دفعہ دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ اس کے گندمی رنگ میں سفیدی کی چھینٹ ہے۔ آنکھوں کے نیچے ہڈیوں پر تو ذرا سی سُرخی بھی جھلکتی ہے، کھال تنی ہُوئی ہے مگر چکنی اور چمک دار۔ تھوڑی کیا گول ہے! چال کے لاابالیانہ پن میں نہ معلوم یہ ہلکی سی کشش کیوں ہے۔ آنکھیں گول مٹول سہی، مگر متجسس اور چمکتی ہُوئی۔ اس کی گردن پر ذرا میل نہیں جمتا۔ بازوؤں کی مچھلیاں کیسی حرکت کرتی ہیں۔ چہرہ گولائی لیے ہُوئے ہے۔ جمیل خود اپنی رائے سے بھی خوف زدہ ہو جاتا اور فوراً کوئی کتاب اٹھا لیتا۔ جو دس منٹ سے زیادہ اُس کی مدد نہ کر سکتی۔ آستینیں اُوپر کھینچ کر وہ اپنی بانہوں کو اُوپر سے نیچے تک دیکھتا، گندمی رنگ، پتلی پتلی لکڑیاں سی، ہلکے ہلکے بال۔ کچھ مطمئن ہو کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا۔ ایک نرم۔ نہایت نرم، روئی کی طرح — اور چکنی سطح پر اُس کی اُنگلیاں پھسلتیں۔ یقین کو عین الیقین بنانے کے لیے وہ آئینہ اٹھا لیتا۔ بڑی بڑی سیاہ، بادامی، لمبی پلکوں والی آنکھیں آئینے میں سے دیکھ کر اُس کی طرف جھانکتیں۔ اسے ایسی خوشی ہوتی گویا اُس نے کوئی نئی دریافت کی ہے۔ دُودھ جیسے سفید اور بلند ماتھے پر سیاہ چمک دار بالوں کی، جن میں پیچھے کی طرف ہلکا سنہرا رنگ جھلکتا تھا، کوئی لٹ پڑی ہوتی، زردی مائل سفید رنگ میں آنکھوں کے بیچ کافی دُور تک سیب کی سی سُرخی ملی ہُوئی ہے۔ ناک لمبی سہی مگر پتلے ہونٹ خاصا نعم البدل ہیں۔ کانوں کے لمبان کو بال چھپا لیتے ہیں۔ تھوڑی چپٹی ہے.... ہے تو ہُوا کرے، رنگ تو گورا ہے۔ چہرہ گول نہیں ہے....

آنہہ.... گول چہرے ہی میں کون سی خوبصورتی لگی ہُوئی ہے۔ اُوپر کے ہونٹ پر ہلکے ہلکے بال نظر آنے لگے ہیں.... مگر ایسا رُواں تو جمیل نے کئی عورتوں کے بھی دیکھا تھا.... اپنی پتلی کمر کی بدولت وہ اپنے دُبلے پن کو بھی معاف کر سکتا تھا۔

یہ نظریے اطمینان بخش تو ضرور تھے، مگر موازنے کا خیال جمیل کے سامنے ایک ایسے گھناؤنے عفریت کی شکل میں آتا تھا جو اپنی زہرناک حاسدانہ نظروں سے ناک اور کانوں کو کھینچ کھینچ کر دُگنا لمبا کر دیتا۔ ٹھوڑی کو پھیلاتے پھیلاتے دہلیز بنا دیتا۔ چہرے کو ہر طرف سے پیٹ پیٹ کر کانئیں نکال دیتا۔ اس کے رنگ کو ہلدی کی طرح دِکھلاتا اور اس کی سیب کی سی سُرخی کو دھندلا دیتا۔ اُوپر کے ہونٹ کے ہلکے ہلکے بال گھرے اور گھنے ہونے شروع ہو جاتے اور جمیل پیچ و تاب سے تنگ آ کر انہیں ناخونوں سے کھینچنے لگتا۔

مگر نذرو کا طرزِ عمل بدل رہا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اب وہ اس کا کہنا ماننے سے انکار نہ کرتا تھا اور کم سے کم جمیل کے پڑھتے وقت وہ بالکل نہ گاتا تھا۔ بلکہ اب تو اس کی غزلوں کا انتخاب بھی اصلاح پذیر تھا اور اس کا دِل پسند گانا اب یہ تھا: "کرے گا کیا ارے صیاد تو جنجیر کے ٹکڑے۔" اب وہ جمیل کے کمرے کی طرف زیادہ رہنے لگا تھا۔ جمیل پڑھتا رہتا اور وہ ایک طرف کُرسی پر بیٹھا اپنا سر کھجایا کرتا، اور بعض اوقات تو اونگھنے بھی لگتا۔ نہ معلوم اُسے کیا سمائی تھی کہ وہ اپنی عُمر جمیل سے کم ثابت کرنے کے لیے بہت بے قرار رہتا تھا، بیٹھے بیٹھے وہ جمیل کو پڑھنے سے روک کر کہتا "ذرا حساب تو لگانا جمیل میاں، کہ میں کتنے برس کا ہُوا.... جب میں پڑھنے بیٹھا ہُوں تو آٹھ سال کا تھا۔ مَیں تو .... آٹھ.... اور دو دس.... اور پانچ.... پندرہ۔ چھوٹا ہی ہُوا نا مَیں تم سے؟"

جمیل چڑ سا جاتا، اُسے محسوس ہوتا کہ نذرو اپنی برتری جتانا چاہتا ہے۔ ایک دُوسری چیز بھی جمیل کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ جب وہ اپنی کتاب میں غرق لیٹا ہوتا تو نذرو اس کے پیر میں گدگدی کیے بغیر کبھی نہ مانتا۔ حالانکہ اس کے بدلے میں اُسے لاتیں اور چانٹے کھانے پڑتے تھے۔ نذرو کی ایک اور عادت یہ تھی کہ وہ جمیل کے سرہانے بیٹھ جاتا اور اس کے بالوں میں ہلکے ہلکے انگلیاں پھرایا کرتا۔ اس سے جمیل کے تھکے ہُوئے اور خشک دماغ میں ایسا معلوم ہوتا گویا سکون اترتا چلا جا رہا ہے اور وہ گردن کو ڈھیلا چھوڑ کر کتاب سے توجہ ہٹا لیتا۔ شروع شروع میں تو اُس نے نذرو کو بھگا بھگا دیا، مگر جب وہ کسی

طرح باز نہ آیا تو آخر اُس نے نذرو کو یہاں تک اجازت دے دی کہ وہ کنگھا لے کر بیٹھ جائے اور جس طرح چاہے اُس کے بال بنائے اور پھر بگاڑے، اور پھر بنائے اور پھر بگاڑے۔

اخیر اکتوبر کی رات کے نو بجے تھے، کچھ خنکی سی ہو رہی تھی۔ جمیل کوٹھے پر دالان میں اکیلا لیٹا تھا۔ نذرو آیا اور اُس نے ہچکچاتے ہُوئے کہا "جمیل میاں ایک بات کہوں تم سے۔ بُرا تو نہیں مانو گے؟"

جمیل دھک سے رہ گیا۔ اُس کے دِل کی حرکت رُکتی سی معلوم ہُوئی اور ٹانگیں سنسنانے لگیں۔ کئی دن سے نذرو کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی بات کہنی چاہتا ہے جمیل کو شبہ تھا کہ وہ بات غیر معمولی ضرور ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ایسی بات سُننے سے، جس کی نوعیت سے وہ بالکل بے خبر ہے، انکار کر دے گا۔ لیکن اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اُس نے رُکتے ہُوئے کہا۔ "ہاں، کہہ۔"

نذرو نے بات کہنے کا انداز بنانا شروع کیا ہی تھا کہ قدموں کی آواز آئی۔

یہ بات کئی دفعہ قدموں کی آواز سے ملتوی ہو ہو گئی۔ لیکن آخر ایک دن ایسا آیا کہ نذرو نے نہ صرف بات کہنے کا انداز بنا لیا بلکہ بات بھی شروع کر دی، اور کوئی آواز نہ سُنائی دی۔ اس نے پُراسرار آواز میں، مسکراتے ہُوئے کہا۔ "اجی کیا بتاؤں مَیں نے کیسا عجیب خواب دیکھا.... عجیب خواب تھا سالا.... کیا بتاؤں جمیل میاں، کیا خواب تھا وہ۔"

"ہاں، کیا خواب تھا وہ؟" جمیل نے بے تابی، مگر شبہ سے پوچھا۔

"اجی، کیا بتاؤں.... کیا خواب تھا وہ.... مَیں جب سے وسی کو سوچ رہا ہُوں برابر۔"

"ابے تو کچھ کہے گا بھی؟"

"ہاں ہاں، تو جی، وہ خواب.... بُرا تو نہیں مانو گے، جمیل میاں۔"

"تو کہہ تو کسی طرح۔"

لمبا سانس لے کر نذرو نے سُنایا "بُرا مت ماننا جمیل میاں، دیکھو.... وہ خواب.... ہنسی آوے ہے مجھے اُس خواب پہ...."

جمیل نے پھر ڈانٹا۔

"ہاں تو مَیں نے یہ دیکھا خواب میں، جمیل میاں، کہ.... کہ.... مَیں اور تم ایک پلنگ پہ لیٹے ہیں۔"

بم کا گولہ پھٹا۔ مگر چوں کہ جمیل نے اسی نوعیت کی کوئی بات سننے کے لیے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر لیا تھا، اس لیے اس دھکے کا مقابلہ کرنے میں اس کی کوشش زیادہ کامیاب رہی۔ اس سب کو وہیں ختم کر دینے کے لیے جمیل نے اس لفظ کو انتخاب کیا ''اچھا۔'' اور اس لفظ کو اُس نے ایسی آواز میں ادا کرنے کی کوشش کی جس میں کسی جذبے کی آمیزش نہ ہو۔

نیچے سے کسی نے نذرو کو پکار کر جمیل کی مدد کی۔ اُس نے جانے کے لیے اُٹھتے ہُوئے تمسخرانہ انداز میں آنکھیں گھما کر کہا۔ ''جمیل میاں، ویسے چاہو جتنا چاہے دِق کر لو، خواب میں تو مت تنگ کیا کرو۔''

اب جمیل نذرو کی نگاہوں سے کچھ سہما سہما سا رہنے لگا۔ نذرو نے بھی اُس کے کمرے میں آنا بہت کم کر دیا تھا، لیکن وہ اکثر جمیل کے سامنے مسکرا پڑتا تھا۔ جس سے جمیل شرمندہ سا ہو جاتا، گویا وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ جب تک نذرو اس کے کمرے میں رہتا اسے سُوئیاں سی چبھتی معلوم ہوتیں اور اس کا دِل چاہتا کہ چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو نذرو کی نگاہوں سے بچا لے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ لیٹے لیٹے وہ کسی چیز کو اپنے پیروں کے قریب محسوس کرتا۔ کتاب سامنے سے ہٹا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ نذرو اس کے پیر سے اپنا چہرہ لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نفرت اور غصے سے پیر کھینچ لیتا۔ مگر اب وہ نذرو کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کے خوف سے اُس کے لات نہ مارتا تھا۔ اب چاہے اُس کے سر میں درد ہی کیوں نہ ہو، وہ کبھی نذرو سے سر ملنے کو نہیں کہتا تھا اور اُس کے بالوں سے نذرو کی دلچسپی بھی جیسے زائل سی ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ سب معمول سا ہو گیا اور جمیل نے نذرو کی طرف زیادہ خیال کرنا چھوڑ دیا لیکن ایک واقعہ سے اُس کی جھینپ اور ڈر، جو اب کم ہو چلے تھے، نفرت اور کراہت میں تبدیل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ قوالی سننے کا شوق جمیل کو عرس میں لے گیا اور رات کے خیال سے نذرو بھی اُس کے ساتھ کر دیا گیا۔ جگہ تو خیر بیچ میں مل گئی، مگر کھچ پچ اتنی تھی کہ کروٹ بدلنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ تالیوں اور ڈھول کے گھٹاکے، قوالوں کی منجھی ہُوئی بے روک آوازوں کے ساتھ مِل کر اپنا کام کر چکے تھے۔ ایک گیروا لباس اور لمبی ڈاڑھی اور بالوں والے صاحب نے اپنی وارفتگی کا اظہار، آنکھیں بند کر کے جھونٹے کھانے سے بڑھ کر، اپنے مسلک کی روایتی خوش ادائی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے لیے

میدان خالی کر دیا گیا اور "جہاں پیدا ہوا شیر خدا معلوم ہوتا ہے" کی تکرار ہونے لگی۔ اُن کی ہر فلک شگاف "اللہ ہُو" پر اُن کے سر کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر نذرو "اجی! اجی!" کہہ کر پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور جمیل کے اُوپر گرا پڑ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے جمیل کا بازو کھینچ کھینچ کر کہہ رہا تھا۔ "اجی جمیل میاں، مجھے تو ڈر لگے ہے۔" لوگ ہنسنے لگے۔ جمیل کے کان سُرخ اور گرم ہو گئے اور اس کی کنپٹیاں جل اُٹھیں۔ اُس دن سے جمیل کی جھجک نکل گئی، اور اب وہ نذرو کی نگاہوں کا بے خوف ہو کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب اس نے نذرو کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے اس کالے پیلے مینڈک کو، جو برسات میں نالیوں پر سے رینگتا ہُوا بستر پر آ چڑھے۔

اپریل آ گیا — گنگا اور جمنا کے دو آبے کا رنگ اور افسردہ اپریل۔ موسم کی خشکی، گرمی، ہَوا، خاک، دُھول، سالانہ امتحان کی تیاریوں، مایوسیوں اور اُمیدوں نے اضمحلال اور گُم گشتگی کی ایک مستقل فضا پیدا کر دی تھی — رُوح پر ایک ناقابلِ برداشت لیکن لازمی بوجھ کی طرح۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہَوا کمرے کے کواڑوں کو ہلائے ڈالتی تھی اور گرد نے روشن دانوں میں سے آ آ کر چہرے اور بالوں کو بھُورا بنا دیا تھا۔ باہر تو دُھوپ کا جو کچھ بھی حال ہو، مگر کمرے میں، جہاں جمیل لیٹا تھا، گرمی کا اس قدر اثر ضرور تھا کہ اُس کے جسم کو تھکا ہُوا اور دماغ کو گُٹھل بنا دیا تھا۔ باوجود درختوں کے ہلنے کے ایک پُر رمز اور گراں بار خاموشی مسلط معلوم ہوتی تھی۔ جس میں دُور سے کسی خوانچے والے کی آواز وحشت کا اضافہ کر دیتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ایک جانکاہ ہتھوڑے کی طرح کان کے پردے پر پڑ رہی تھی۔ اور ہری مکھی کی بھنبھناہٹ تیز لمبی سلاخوں کی طرح دماغ میں گھُس کر اُسے بے حس کر چکی تھی۔ جماہیاں ٹوٹی پڑتی تھیں اور آنکھوں سے پانی ڈھلکنے لگا تھا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلنے اور سر کے بال نوچنے پر بھی نیند نہ آ رہی تھی۔ کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا گویا موسم کی سختیوں نے ہر چیز کو برباد کر دیا ہے۔ خاتمہ کر دیا ہے — سکون کا بھی اور نیند کا بھی۔ ٹانگیں پتھر کی ہو گئی تھیں، اور رانوں میں ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جمیل خاموش سیدھا لیٹ جاتا، ہاتھ پھیلا کر اُوپر کی طرف، اور ٹانگیں اکڑا نیچے کی طرف کھینچتا، اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ وہ رانوں کو مضبوطی سے پکڑ کر خوب رگڑتا، گویا وہ آج انہیں گھس کر ختم کر دینے پر تلا ہُوا ہے۔ جب اس سے بھی اُسے چین نہ آتا تو وہ گھٹنے پٹی پر اور بانہہ آنکھوں پر رکھ کر خاموش لیٹ جاتا.... تھوڑی دیر سے نذرو کھڑا

دلچسپی سے اُس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ پائینتی کی طرف آیا اور ایک منٹ تک آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا اور پھر یک لخت ہنس کر کہنے لگا: "جمیل میاں! تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔"

جمیل کے پیروں میں سے خون بھاگا اور رانوں میں سنسنی پھیلاتا ہُوا تیزی سے دماغ میں جا کر کھوپڑی سے کھٹ سے ٹکرایا۔ دِل دھڑ دھڑ چلنے لگا۔ کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئیں اور دَرد کرنے لگیں — معلوم ہوتا تھا اُس کے جسم کی ہر ہر رگ بغاوت پر اُٹھ کھڑی ہُوئی ہے۔ خون کے دوران نے اُس کی سوچنے کی قوتوں کو معطل کر دیا تھا۔ وہ "ہاں" کہنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے پکارا۔ "جمیل!"

امتحان کے اندیشوں اور دغدغوں کی جگہ اب چھٹیوں کی بے فکری اور بے خیالی نے لے لی۔ گرمیاں جم چکی تھیں۔ گرمی اب بھی پڑتی تھی، ہوا اب اور تیز ہو گئی تھی مگر نئے موسم کا کسل اور بے گانگی ختم ہو چکی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ کسی چیز کے اُس کی ٹانگ کے قریب حرکت کرنے سے جمیل کی آنکھ کُھلی۔ وہ چھت پر سو رہا تھا۔ چاند آسمان پر بیچوں بیچ میں تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ صحن کے دُوسرے کونے سے خالو کے تیز خراٹوں کی متواتر آواز آ رہی تھی، لیکن یہ دیکھ کر اسے تعجب ہُوا کہ نذرو کا پلنگ جو شام دُور بچھا تھا، اب اُس سے ایک گز کے فاصلے پر آ گیا ہے۔ اُس نے اپنے پلنگ پر ہر طرف ٹٹولا۔ مگر کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ اس نے پھر چادر سے مُنہ ڈھک لیا۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹے رہنے سے اُسے پسینہ آتا معلوم ہُوا اور اس نے چادر کو سینے تک کھینچ لیا۔ نیند ایک دفعہ اُچٹی تو بس پھر غائب ہی ہو گئی۔ کچھ دیر تو وہ چاند کو آسمان پر کھسکتے ہُوئے دیکھتا رہا، اور پھر اُس سے اُکتا کر خالو کے خراٹوں پر دِل ہی دِل میں ہنسنے لگا۔ کیسی آواز نکل رہی ہے، اُس نے سوچا، جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں — یہ تشبیہ اس نے اپنی خالہ سے سیکھی تھی۔ دفعتاً اسے نذرو کی آنکھیں چمکتی ہُوئی دکھائی دیں۔

"ابے جاگ رہا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

گاڑھے کی موٹی چادر میں سے نکلے ہُوئے مُنہ نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"یہاں کیسے آ گیا ہے تُو؟" کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے جمیل نے پُوچھ لیا۔

"تو کچھ ہرج ہے؟"

جمیل نے اتنی رات گئے اُس کا جواب چاٹنے سے دینا مناسب خیال نہ کیا، مگر یہ جواب گفتگو کو آگے بڑھانے میں بھی مددگار نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش لیٹے اپنی پلکیں جھپکاتے رہے۔

نذرو کا ہاتھ اور سینہ بھی چادر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے کہا "اجی، کیا چاندنی ہو رہی ہے۔"

"ہُوں" جمیل نے جواب دیا۔ مگر چاہتا وہ بھی تھا کہ اگر نیند نہیں آتی تو کم سے کم باتیں کر کے ہی وقت ٹالا جائے۔

"بڑی سیریں کی ہیں ہم نے بھی دِلی میں چاندنی میں۔"

جمیل نے ایسا موضوع تلاش کرنے کی کوشش میں، جس پر کچھ دیر تک باتیں ہو سکیں، ہمیشہ سے زیادہ بے تکلفی سے کہا "بڑی بدمعاشیاں کی ہوں گی سالے تم نے دلی میں۔"

"اجی ہم نے؟" نذرو ہنسا۔ "اجی ہاں.... نہیں.... تمہیں تو جمیل میاں کچھ شوق ہی نہیں۔"

"ابے، مجھے شوق! کِس بات کا؟"

"یہی سیر وَیر، دِل لگی۔" نذرو اپنی کہنی کے سہارے اُٹھا اور اُس کا ہاتھ جمیل کے پلنگ کی پٹی پر آگیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ "لاؤ ٹانگیں دَبا دُوں جمیل میاں۔"

"کیوں، کیا مَیں کوئی تھکا ہوا ہُوں۔"

نذرو کا ہاتھ اس کی ٹانگ کے قریب آگیا "نا ویسے ہی۔"

"ہُونہہ!" جمیل نے جھینپتے ہُوئے کہا۔ لیکن جب نذرو کا ہاتھ اُس کی ران پر پہنچ گیا تو اُس نے کوئی اعتراض کیا بھی نہیں اور چُپ لیٹا رہا۔

ہاتھ ران پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جمیل کی ٹانگوں پر چیونٹیاں سی رینگتی ہُوئی معلوم ہُوئیں اور نذرو کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ اُس کا خون بھی چلنے لگا۔ جب انگلیاں زیادہ سریع الحس حصوں پر پہنچیں تو اُس کے گدگدی ہونے لگی۔ اور اُس نے نذرو کا ہاتھ ہلکے سے پکڑ کر، بغیر اُسے ہٹانے کی کوشش کے "ابے" کہا۔ مگر ہاتھ اسی طرح چلتا رہا۔

خالو کے خراٹے رُک گئے۔ ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

پھر وہی خر خر خر خر — ران پھر سہلائی جانے لگی۔

یک لخت نذرو نے ہاتھ کھینچ لیا اور چادر سے اپنے جسم کو کندھوں تک ڈھک کر سیدھا لیٹ گیا۔ اُس کا بدن تیر کی طرح کھنچا ہُوا تھا۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے اور پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ اگر جمیل اُس کا چہرہ چھُو کر دیکھتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ وہ کتنا گرم ہے۔

"ابے یہ کیا؟"

"اجی تم کیا جانو، تم نے کیا کر دیا۔" نذرو نے رُکتی ہُوئی آواز میں جواب دیا۔

جمیل حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ دس منٹ بعد نذرو پھر سیدھا ہُوا۔ اب اس کے چہرے سے ایسا سکون ظاہر ہوتا تھا گویا کوئی طوفان چڑھ کر اُتر گیا ہو۔

جمیل کی ران پھر سہلائی جانے لگی.... جمیل کے بدن میں کھلبلی سی ہُوئی۔ سر چکرا سا گیا۔ سارا جسم پھنکنے لگا۔ اسے ایک پھریری سی آئی اور وہ نذرو کا ہاتھ الگ پھینک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے جلدی سے نالی پر جا کر پیشاب کیا۔ پانی پی کر اس نے تھُوکا اور اب سونے کے ارادے سے چادر تان کر لیٹ گیا۔ خالو کے خراٹوں سے اس پر جلدی ہی غنودگی طاری ہو گئی۔

اُس کی ٹانگ پر کوئی چیز ہلی۔ اُس نے چادر سے سر نکال کر دیکھا، نذرو کا ہاتھ تھا۔ نذرو اپنے پلنگ پر سے آگے جھُکا ہُوا تھا، اور اُس کی آنکھیں گول گول گھُوم رہی تھیں۔

نذرو نے کہا "آ جاؤں؟"

جمیل کے پیٹ میں ایک ہیجان سا پیدا ہُوا جو بجلی کی سُرعت سے تمام جسم میں پھیل گیا۔ اُس کا سر گھُوما۔ آنکھوں کے سامنے دُھند سی پھیل گئی اور سائبان کے کھمبے اور ان کے لمبے سائے ناچتے ہُوئے معلوم ہونے لگے۔ اُس کے رُکے ہُوئے حلق سے پھنسے ہُوئے صرف دو لفظ نکل سکے: "ابے ہٹ!؟"

(نیا ادب۔ اپریل ۱۹۴۱ء)

۱۹ فروری ۱۹۴۰ء

حرام جادی

دروازے کی دھڑ دھڑ اور "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں، اُس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہُوئی آواز۔ اُس کی پُر خواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں، لیکن دُوسرے لمحہ ہی مُنہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اُجالے میں ملی ہُوئی سُرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پَردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر بھنبھنا رہے تھے، وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے —اور پھر وہ بھی بھنبھنا رہے تھے۔

اُمید و بیم کی یہ کشمکش، جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر تک جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازے کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں، اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہُوئے گلے سے نکل رہی تھیں۔ "کھولو" — "کھولو" یہ آوازیں پتلی، نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پَردوں کو تار تار کیے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سُن رہی تھی کہ پکارنے والا "کھولو" — "کھولو" کے وقفوں کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا.... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہُوئے کہا۔ "نصیبن، دیکھو تو کون ہے۔"

یہ اُس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے وہ اس قصبے میں مڈوائف ہو کر آئی تھی، یہ سب کچھ روز ہوتا تھا — یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی

یہی تلخ کشمکش، یہی جھلاہٹ اور پسپائی — سب اسی طرح۔ اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا، اور پھر اُس کا سارا دن نو واردوں کو احتجاجانہ چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے، دُنیا میں آتے ہُوئے دیکھنے میں، کچھ دن کے آئے ہوؤں کی رفتارِ ترقی کے معائنے میں اور آمدورفت کے اندراج کے لیے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا۔ کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے — ہر گھنٹہ، ہر گھڑی اُسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آرہے تھے، جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہُوئے پتھر۔ ضبط تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے، اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہُوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۵۶ سالہ بڈھے، الہڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کیے چلے جا رہے تھے، گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں۔ اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا، وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرض کہ بچے چلے آرہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، پَر نُچے مُرغ کی طرح سُرخ بچے، اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مُڑے ہُوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

اصلی نے اپنی دادی سے سُنا تھا کہ اُن کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی — اور اُس وقت اُسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی — کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں — پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک!

اور اسے ان ہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرے کو برستے ہُوئے دیکھنے کے لیے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ تاریک سیلی ہُوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہُوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور

گھاس والیوں سے ٹھنسے ہُوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا، اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہے ہُوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کیے رکھتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سمٹا کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے، جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلی کو ہلکے پھلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اُونچی ایڑھی والا کالا جُوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے اُبھرے ہُوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستے میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے لونڈوں کا لا اُبالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر یہ شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی۔ اور یہاں کی گرمی! اُسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سُورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اُس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھُولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اُونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی بھنتی، سڑکوں پر سے گزُرتی تو اُسے دُور آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ، اور درختوں کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح، بیزار کُن اور پُر استہزا معلوم ہوتے، اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہُوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا جسے صبح اُٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی — ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی — کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی.... اور پھر وہ اُسی تپتی کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اُس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں، جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی، اور اُسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اُس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سینما کے پردے کی طرح پوری روشنی اور صفائی کے ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے گزُرنے لگتیں، اور وہ جس تصویر کو جتنی دیر چاہتی، ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان اُن مناظر کو یاد کرتی جن سے اُسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا، تو اُس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔

گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں، دِل بھینچنے لگتا، سانس گرم اور دُشوار ہو جاتا، اور اس کا سر گھمنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اُسی پُرانے ہسپتال میں پہنچ گئی ہے، مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بے گانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضا منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دِل پر مسلط ہے۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی اور دراصل اس کے لیے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہیے تھا، ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا۔ مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی سیلی ہُوئی گلیاں، ٹوٹی پھُوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے، اور وہ ان کے وجود سے بے خبر بھی نہ تھی۔ لیکن وہ تو ہَوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پَروا اور مطمئن، تانگے کے گدوں پر جھولتی ہُوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اُس کی دُنیا تو ان علاقوں سے دُور ضلع کے صدر اسپتال میں تھی۔ کتنی کھُلی ہُوئی جگہ تھی وہ، اور وہاں کی ہوا کا لطف تو وہ ساری عمر نہ بھُول سکے گی۔ اسپتال کے سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دِن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ شام کو اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لیے نکلتی تھی تو دُور دُور تک پھیلے ہُوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اُس کی ساڑھی پھرپھرانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لڑی تیرتی، اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُر لطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جُون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سنسناتے ہُوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے تھے اور بجلی کے پنکھے سے سَرد رہنے والے کمرے میں دوپہر کی سختی اور اُداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُر وقار انداز سے ساڑھی کا پلہ سنبھالتے گزرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب، میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ قصبے کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رُعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس، وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزوِ لاینفک تھی۔ اس سفید، سَرد اور متین عمارت اور اس کے

غیر مرئی اور اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اُس کے حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اُس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنے کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی مُنہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں مگر اُسے دُو بدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک اُن پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی۔ اور صفائی اور سلیقہ کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چاول اور دُوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہُوئی چارپائیاں، برتن، کوئلوں کا گھڑا، سُوت اور روہڑ کی گٹھڑیاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے، اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرے میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اُکھڑ اُکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں — اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں — اپنے بدبو دار کپڑوں سمیت کمرے میں گھُس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا اُلٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر، کھڑر بڑر، کراہوں، یا اللہ یا اللہ.... اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پا کر چن چنانا شروع کر دیتے تھے اور اُن کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ "ارے چُپ، چُپ.... دیکھ بھیا آیا ہے.... صبح کو دیکھیو.... منا سا بھیا۔" مگر صبح کو منا سا بھیا دیکھ سکنے کی اُمید انہیں اس وقت کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی روں روں دہاڑوں کی شکل میں بلند ہو کر کمرے کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں، لیپ چڑھے ہُوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہُوئے کپڑوں اور مُدتوں سے نہ دُھلے ہُوئے بالوں کی بدبُو سے،

جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اُس کا جی اُلٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرے میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جنہم کے عذابوں کے لیے تیاری کرنا تھا۔ یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبے کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لیے پیش کرنے، اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈ وائف کے، جو اَن دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی، ہاتھوں میں دے دینے کے لیے قطعاً تیار نہ تھیں۔ انہیں تو قصبے کی پُرانی دائی اور پھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا۔ تاہم اُن کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بالکل کم ہو گیا تھا۔ لیکن آخر ذمہ داری تو اُس کی ہی تھی، اور وہ ہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر بھلائی بُرائی کے لیے جواب دہ تھی۔ اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر نو گرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتی اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا، یا پھر بعض ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت تک نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی زیادہ آفت تھیں، وہ اپنے تجربے کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی رُک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں، اور اصلی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا۔ اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی، مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتے دیکھ کر اس نے اصلی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو اصلی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پی جانے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دُوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کیے بغیر وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں، اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے لیے اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا جھنجلا کر پیر پٹخے، اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لیے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ان کے پان میں سنے

ہُوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے اور وہ اس کی طرف کُرسی کھسکاتے ہُوئے کہتے: "کہو میم صاحب! لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے، سخت، کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اُس کے چہرے سے آ ملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہُوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہُوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر بھنایا ہُوا ہو، جب جسم کا کوئی عضو بھی ایک دُوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیرے کونے میں اچھال دیتی اور کپڑے اس طرح جھنجھلا جھنجھلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ اُلٹا سیدھا کھانا حلق کے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تنے پر سر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دُنیا اُس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتی۔ بھیجا دھڑا دھڑ کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکیے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اسے اُچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے۔ ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا، اور ہاتھ اُوپر نہ اُٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر ہی بن جاتی۔ وہ اپنے پُرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی، مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی — کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہُوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے۔ وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی، بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا...
پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیے والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہُوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بے تابی سے ہلتیں... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتیں، اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی، دوڑتیں... سیاہ آسمان پر

روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے بھنگوں کی طرح آنکھوں میں گھُس گھُس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہُوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں.... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی ..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے.... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں، ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور امِلی نیند میں بالکل بے ہوش ہو جاتی.... مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں — وہی چیخیں، وہی دھڑدھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نسیمن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے یہاں بلُایا گیا تھا۔ اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا۔ "جلدی" — بلایا ہے — جلدی — ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے — جلدی۔ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے، یا وہ اسے کوئی دولت بخش دیتے ہیں؟ — ہنہ — جلدی! وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مرجائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلُا کر؟ — کہتی ہیں چڑیلیں: "اسے کیا خاک آتا ہے" — کیا خاک آتا ہے — کچھ نہیں آتا! — جیسے جیسے آلے اُس نے دیکھے ہیں، ان لوگوں کے تو خواب میں بھی نہ گزرے ہوں گے — چمک دار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے — اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر۔ وہ کیسے نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں — کچھ نہیں آتا — ہونہہ!

امِلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے کہ وہ جلدی نہیں آ سکتی، وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں، ان کے بکنے سے اس کا کیا بگڑتا ہے، اور آخر ذمہ داری تو خود اس کی ہے۔ چنانچہ اُس نے نسیمن سے کہا: "کہہ دو کہ چلو، مَیں آ رہی ہُوں۔" مطمئن ہو کر اُس نے کروٹ لی۔ سر کو تکیہ پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر

پر پھیلا دیا۔ اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے۔ مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا — "جلدی" — جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں.... اُسے جلدی جانا تھا — جلدی۔ اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی — جلدی جانا تھا.... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو قربان نہیں کر سکتی تھی۔ کل رات ہی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین — اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اُٹھ جانا بہت مضر ہو گا اور خصوصاً اس قصبے جیسی آب و ہوا میں، جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر مہینے میں چار دن اسے بخار آ چکا تھا۔ اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی۔ ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اس کی، — تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہو گا۔

وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں پر سے کھسکا لیا، اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں مگر ہر دفعہ "دودھ لو دودھ۔" "ابے او کلو ہوئے!" "اُٹھ! ہٹ! ابے پڑھنے نہ جائے گا؟" کی صداؤں، اور نسیمن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی — سونے کی کوشش کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لیے۔ اب اس کے اعضا اور بھی بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہو گئے، اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں — "جلدی بلایا ہے" — اس صبح کے چاندنے، اس قصبے پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں — "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاند، اس قصبے، سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے، — اپنے آپ سے غافل ہو جائے — اپنے آپ کو کھو دے.... اسے محسوس ہوا کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کیے بھینچ رہے ہیں۔.... سر کے درد کو گویا کسی نے یکایک

پکڑ لیا.... دو آنکھیں ذرا کچھ دُور چمکیں، مسکراتی ہُوئی معلوم ہُوئیں، اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا.... جسم ہَوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ سکون تھا، خاموشی تھی اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی.... دو بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے.... دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو۔

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاندنے میں چمک آ گئی تھی۔ نسیمن نے چُولھے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلے سے جانے کے لیے بکریاں جمع کر رہی تھا۔ اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہَوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں.... دو بادامی سائے اُترنے لگے — آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دُوسرے سے مِل گئیں، گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں.... سائے کچھ دور پر رُک گئے۔ وہ ڈگمگائے اور دُھندلے ہوتے ہوتے ہَوا میں تحلیل ہو گئے.... آنکھیں صبح کے بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے — دو مُدت کے آشنا بازو — مگر وہ یہاں کہاں۔

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمسن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے اُلٹے ہُوئے بال، چوڑا سینہ، سُرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہُوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لَو تک کٹی ہُوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہُوئی ڈاڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہُوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو.... دِن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے اور اُن کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجھلا پڑتی تھی، مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا.... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے.... اور دن میں کئی کئی مرتبہ.... اُس کے مُنہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی، مگر وہ کیسے جوش سے اسے بازوؤں میں اُٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے، سب پر بوسے دے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا.... "میری جان.... ہاہاہا.... اے می لی.... ڈی یر.... پیاری.... ہاہاہا" — اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا: "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی میری جان؟.... ہیں؟.... اس سینے پر تو سُرخ ہی کھِلے گی! کہو، کیسی رہی؟ ہاہاہا" —

اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اُسے ایسے وقت میں اسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمسن سو رہی ہیں — وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا — اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا — مگر وہ یہاں کہاں! — اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا — لیکن وہ یہاں ہوتا؟ — وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی — لیکن — کچھ دُوسری شکلیں ابھریں — اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے — اُس کے بال اُلجھے ہُوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا — اور اُس نے اُسے کیسے بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا، اور لے گی.... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ....'' اگر میم صاحب شور سُن کر نہ آ جاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا — املی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی — ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا۔ کیسی خُونی آنکھیں تھیں — اور آخر میں وہ شراب کتنی پینے لگا تھا — مگر وہ ہوتا تو اسے سویرے کہیں نہ جانے دیتا — مانا کہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر تک ٹہلتا رہتا تھا، لیکن ظاہراً تو اس کے ساتھ اُس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا۔ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی، اور اسے ہر وقت اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی — وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا۔ لیکن وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ روزا کے ساتھ پھرا کرے — روزا — کالا توا سی، مُنہ پہ ہڈیاں نکلی ہُوئیں، سُوکھی جیسے لکڑی ہو — اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھی۔ چار حرف انگریزی کے آ گئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے — نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہُوئی تھی اُس میں جو وہ اس پر ایسا لٹو ہو گیا تھا — اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا — وہ اسے تھوڑے دِنوں یُوں ہی چلنے دیتی تو کیا تھا — مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا — ہاں — ایک دفعہ مار ہی لیا، تو کیا ہو گیا — وہ خود بھی تو شرمندہ ہوتا تھا اور اُس کے سامنے نہ آتا تھا — اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو شاید وہ طلاق بھی نہ لیتی۔ بس اپنا ذرا مزہ لینے کے لیے وہ اسے اکساتی رہی — یہ اچھی دوستی ہے — اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی۔ اگر وہ ملے گی بھی تو وہ مُنہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی، اور جو ڈینا خود اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی — ڈینا

بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب تو وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی۔ اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے.....

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "اجی میم صاحب! اُٹھو، سُورج نکل آیا۔" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، اور چاروں طرف دیکھا۔ اب تو واقعی اُسے چلنا چاہیے، مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیے پر سر رگڑا۔

وہ مُنہ دھو دھا کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی — نصیبن لکڑیوں کو چُولھے میں ٹھیک کرتی ہُوئے بولی۔ "وہ ملسائن کہہ رہی تھی کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں، کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتیں.... اجی، ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب، کِسی دن۔ بڑا یاد کریں ہیں تمھیں۔"

ہو ہی آئے ان کی طرف — کیا کرے وہ جا کر؟ میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے، ٹوٹے ٹاٹے — یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو یہ قصے سُنائے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہُوا پیدا ہُوا، اس کو اتنی تکلیف ہُوئی، اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے انہیں سُنانے کو۔ اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں.... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہُوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں.... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہُوئے کتنی گھن آتی ہے، مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے.... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں.... اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں، گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا لے گی..... یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے؟ عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں بھی! اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک کر اسے دیکھتی ہیں اور اگر کہیں اس کی نظر پڑھ جائے تو فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے، اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چُراتی ہُوئی اوپر سے نیچے تک دوپٹہ تانے ہُوئے آتی ہیں، جیسے اس کی نظر اُن میں سے کچھ چھٹا لے گی، یا اس کی نگہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی — ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اُس

پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں؟ — اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا۔ بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کر اپنے گھر میں — اور وہ گندے بچے، مٹی سے سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہُوا۔ وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں جیسے وہ کوئی نیا پکڑا ہُوا عجیب و غریب جانور ہے — اور جب وہ اُن سے بولتی ہیں تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں — وحشی ہیں بالکل، جانور.... بالکل — اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی ان کے ہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں۔ اور کوئی کیوں ان کے یہاں جا کر بیماری مول لے — اور ان کے مرد، کتنی شرم آتی ہے اسے ان کی حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں، اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے، نہیں ہٹتے — "ارے حُقّہ ہٹاؤ، حُقّہ ہٹاؤ۔" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے — جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں — تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں — اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے — عجب بدتمیز ہیں — انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی — وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھے آدمی تھے بے چارے۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے — سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا — وہ خود — ڈینا — کٹی — میری — شیلا — اور ہاں مرسی — مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں چھتری ہاتھ میں لیے ہانپتی ہوئی۔ اور ان میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس — اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے آپس میں ہنستے، مذاق کرتے — افوہ، شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی، کیسے کیسے مُنہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی — مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں — اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں — اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے — اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے — جیسے جانور — نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو۔ بس آؤ اور پڑ رہو — لے دے کے رہ گئی نصیبن، تو اسے اُس کے سوائے کوئی بات ہی نہیں آتی تھی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا۔ اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اُس کے یہاں برات بڑی دُھوم دھام سے آئی — اسے کیا ان سب باتوں سے، ہُوا

کرے، اُس سے مطلب — یا بہت ہُوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سُنا سُنا کر — ایک دفعہ اُس نے سُنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ بہکا کر لے گئے تھے، اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا — بکتی ہے، بھلا کہیں یُوں بھی ہُوا ہے؟ — لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ — مگر نہیں بیکار کا ڈر ہے۔ جو یُوں ہُوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں۔ بھلا دُنیا کا کام کیسے چلے؟ — پاگل ہے بڑھیا۔ بہکا دیا ہے کِسی نے اُسے — مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار۔ نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں — اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا۔ اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی، بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہُوئیں — کتنے دِن ہو گئے پاپا کو مرے ہوئے — بارہ سال۔ کتنا زمانہ گزر گیا۔ اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو — کتنا پیار کرتے تھے وہ اُسے — روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ — کلاس میں اُس کی سیٹ میز کے پاس تھی — اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے آدمی تھے بچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے مگر کبھی کچھ نہ کہتے تھے — اور لڑکے تو اُسے نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا۔ سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اُس کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ارے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اُسے — اور ہاں وہ عظیم — بڑا بھولا تھا بچارہ۔ سوکھا سا۔ زرد۔ مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اُس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ اور رومال نکال کر مُنہ پونچھنے لگتا تھا — اوہ، اس دن وہ دِل ہی دِل میں کتنا ہنسی تھی۔ اُس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدے میں دُوسری طرف سے وہ آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس پہنچ کر وہ رُک گیا اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا۔ اسے گھبرایا ہُوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا اور اس نے بڑے گڑگڑا کر کہا تھا۔ "کہیے گا نہیں" — وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی — کتنا سیدھا تھا واقعی وہ — وہ ابھی اسکول میں ہی رہتی تو کتنا مزا رہتا — مگر — وہ زمانہ تو اب گیا۔ اب تو وہ یہاں اکیلی دُنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں — کِسی کا خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روز ڈاکیے سے پوچھتی ہے کہ اُس کا کوئی خط تو نہیں، مگر روز وہی جواب "نہیں"

— اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے — آن ہز میجسٹیز سروس — ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یُوں کرو اور وُوں کرو۔ کوئی اس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے۔ خواہ مخواہ کی آفت — اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ — اگر آنٹی ہی دلی سے بھیج دیا کریں تو کیا ہے، مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں — ایک دفعہ جانا چاہیے اُسے دلی — اچھا شہر ہے۔ کیا چوڑی سڑکیں ہیں — اور سینما کس کثرت سے ہیں — اور وہ — وہ تو خیر ہے ہی — مگر وہ —

کائیں، کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اُتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا، اور اُس نے بے کار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اُس نے چائے کیوں نہیں لا کر رکھی۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں، اور واقعی، اُس نے خیال کیا، اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اُس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اُس نے دوبارہ مُنہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کون سی ساڑھی پہنے — سفید، سُرخ کناروں والی — مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ — اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے۔ اس کی بہار تو بس ایک دن ہے، اگلے دن کام کی نہیں رہتی — نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی — اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ — مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے — وہ جدھر سے نکلتی ہے، سب کے سب اس کی طرف گھُورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بُری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت — اور ان زمینداروں کو دیکھو، بڑے شریف بنتے ہیں! — خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں، اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں — "کہو یار؟" — ابے مجید، ذرا لیجیو!" — کوئی کھانسنے لگتا ہے — کیا وہ سمجھتی نہیں — ذرا شہر میں کر کے دیکھتے ایسی باتیں۔ وہ مزا چکھا دیتی انہیں — مگر یہاں وہ کیا کرے۔ مجبور ہو جاتی ہے — ان کی ہی تو وجہ سے اس نے رنگ دار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی۔ مگر پھر بھی نہیں مانتے — اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے — تو پھر سفید ہی پہن لے — مگر روز روز سفید — اور کیا وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے ہنستے ہیں تو ہنسا

کریں، کوئی اُسے کھا تھوڑے ہی لیں گے۔ بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اُس کا؟ — اب وہ پھر رنگ دار ساڑھیاں پہنا کرے گی۔ دیکھیں، وہ اس کا کیا بناتے ہیں — ہنسیں گے تو ضرور — مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے — آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی۔

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لیے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اُس کی آنکھیں لال اور کچھ سُوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا، اور کھال بھی کھُردری ہو چلی تھی — جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کیسی چمک تھی — رنگ سانولا تھا تو کیا، چمک دار تو تھا — اُس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں۔ "تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے" — مگر اب —

اس نے آئینہ رکھ دیا، اور اپنے جسم کو اُوپر سے نیچے تک ایسی حیرت سے دیکھنے لگی جیسے مور اپنے پیروں کو — اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور تھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے، اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے، اور ہلکے رہ گئے ہیں۔ اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اُڑا دیا تھا۔ اُس نے بال ایسی بے دِلی سے بنائے کہ بہت سے تو اِدھر اُدھر اُڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی اور اُس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ وہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اُس کے پاپا نے اُسے دی تھی۔ مدّتوں سے اُسے کھولا تک نہ تھا، اور وہ گرد سے اَٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دِلا دی اور وہ اسے اُٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پہلے ہی صفحے پر اس کا نام لکھا تھا۔ یہ خود اُس کے ہی ہاتھ کا لکھا ہُوا تھا لیکن اب اُس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی ہنسی آئی کہ اُس وقت وہ کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی، اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانے میں اُس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اُس کا ارادہ ہوا کہ

اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا، اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا پڑتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائبل کے وَرق اُلٹنے لگی — پیدائش — خروج — وَرق تیزی سے اُلٹے جانے لگے — استثنا — روت — یرمیاہ — حبقوق — متی — لوقا — رسولوں کے اعمال — کہاں سے پڑھے — آدم — نوح — طوفان — ابراہیم — کشتی — صلیب — مسیح — یسو راجا آئے — گرجا کا گھنٹہ — سب مِل کر گرجا جاتے تھے۔ ہنستے، مذاق کرتے —

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے۔ اور پھر اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ روز صبح کو بائبل پڑھا کرے گی — ورنہ کم سے کم اتوار کو تو ضرور — لیکن دُعا تو مانگ ہی لینی چاہیے — بہت ہی بُری بات ہے۔ ماں کبھی بغیر دُعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں — اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا — اور لگے بھی تو کیا ہے۔ دُنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر باوجود اس کے آنکھیں بھٹ پھٹانے کے پہلے تو اُس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھُس آئیں، اور پھر پاپا اور ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ، اور سب جو مِل کر گرجا جایا کرتے تھے ہنستے، مذاق کرتے — اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دیئے گویا وہ ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے — آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا، اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، دونوں ہاتھ جوڑ لیے، اور دُعا کو دُہراتی چلی گئی: ”اے میرے باپ، تُو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین۔“

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پھر آئینے میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کیلئے دُعا مانگے — لیکن

کیا چیز؟ — کوئی؟ — اس کا تبادلہ شہر کو ہو جائے — مگر وہاں اسے ولیمسن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے — پھر اور کیا؟ — وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پَری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا — پھر آخر کیا؟ —

اس نے بہت بازو ملے، مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لیے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سُورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی، اور وہ سڑک کی نالی، ریت، کنکروں، سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اُسے کبھی اپنی رفتار کچھ سست معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے، اس لیے اُسے اپنی ناک کی حفاظت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سائے میں سے گزرتی تھی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دُور رہ گیا تھا، اور اسے اطمینان سا ہو گیا تھا کہ اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ یکایک اس کی نظر ایک دکان دار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا — کیا یہ اُسے دیکھ کر تھا؟ — ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اُسے دیر بھی ہو گئی تھی — وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی: "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی.... بڑے دن میں ہُوا ہے ایسا آج" — اُس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے.... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی — آخر کہاں تک؟ — پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی — نگران آنکھوں نے، جو اَب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، اُسے رُکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی....

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے

حقّہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اُس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے: "آخاہ میم صاحب..... بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو۔"

"جی.... ہاں..... وہ ذرا دیر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ زنانے کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ قصبے کی پُرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اُٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزُر رہی ہے یہ کہتی ہوئی: "جرا دیکھو تو.... ابھی تک نا نکلی گھروے سے حرام جادی!"

(ادبی دُنیا۔ سالنامہ ۱۹۴۱ء)

(۱۲۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء)

میلاد شریف

ابھی شیخ بنیاد علی یہی طے کر رہے تھے کہ جمعرات کا دِن رکھیں یا جمعہ کا، اور بڑے بتاشے ہوں یا جلیبیاں یا لڈو، کیونکہ چار بتاشوں کے مقابلے میں چار جلیبیاں ذرا ہلکی پھلکی چیز ہیں اور مزے دار بھی، اور پھر نام بھی زیادہ ہوتا ہے، لڈو گول گول ہوتے ہیں اور ٹھوس، اس لیے پُر وقعت معلوم ہوتے ہیں.... کلو حلوائی کی تھال کے زرد لڈو خلا میں ایسے اُچھل رہے تھے جیسے کوئی پوشیدہ اسپرنگ لگا ہو۔ لیکن لڈو تو بہر حال لڈو ہے، گرا اور ٹوٹا۔ موتی چُور کے لڈو کی زرد بندیاں پارے کی طرح زمین پر بھاگنے لگیں.... اور اگر بندیاں ہوں تو کٹوری میں بھر بھر کر دی جاسکتی ہیں.... ''اماں دونوں ہاتھ پھیلاؤ، گریں گی بھی کہ نہیں؟'' رحیم اللہ راستے ہی میں کھانے لگے گا، کمر ٹیڑھی کر کر کے۔ ایک ایک منہ میں ڈالے گا، جیسے چنے کے دانے، پھر بندیاں ہیں؟ کہاں ہوتی ہے ایسی روز بندیوں کی میلاد شریف.... مگر عنایت کے تو دونوں بازوؤں میں ایک ایک لڈو پھنس گیا اور وہ شیخ جی کے آخری فیصلے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔

سب سے پہلے اسے نتھو سقہ ملا جو اپنے بیٹے کو گالیاں دیتا آ رہا تھا۔ وہ عنایت کی خوش خبری سے محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ اسے صاف نظر آ گیا کہ یہ بدمعاش عزیز مولود کے بہانے سے پھر رات کے دو بجے تک غائب رہے گا اور اگلے دن آٹھ بجے سو کر اُٹھے گا اور آدھے گھروں کا پانی خود اس کے سر پڑ جائے گا۔ ''ملود؟'' اس نے رُک کر کہا ''ہاں، ہوتی ہی رہے ہے ملود!'' عنایت کو اپنے کندھے تو ضرور اونچے نیچے کرنے پڑے، مگر اس نے

اپنے جوش کو سرد نہیں ہونے دیا۔ اور ارادہ کرلیا کہ اب کے ذرا انتخاب سے کام لے گا۔
سلامت آج بے طرح کھانس رہا تھا۔ داروغہ جی کے بیٹے کے کپڑے آج بہت سفید تھے
لور کالا سینڈل چمک رہا تھا، اور پھر ان کی بغل میں انگریزی کی ایک بہت موٹی کتاب تھی۔
آم والا مہتاب، لالہ رام پرشاد کو آم دے رہا تھا، مگر اس کے کچھ پیسے عنایت پر باقی تھے۔
ان لوگوں کے چہرے اسے اُمید افزا نہ معلوم ہوئے اسی لیے اس نے اپنا چہرہ خشک بنالیا۔
دانت خوب بھینچ لیے اور سینے کے پٹھوں کو پھیلا دیا کہ کہیں یہ زرد، گول اور میٹھی خبر اس
کے اندر سے نہ اُڑ جائے۔ یہاں تک کہ جب اُسے گلابو بھنگن گھروں سے روٹیاں جمع کرتی
ہوئی ملی تو اُس نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ "اری پیسے کی کے سیر؟" لیکن بازار کے نکڑ
پر چھدن کو دیکھتے ہی بازوؤں میں پھنسے ہُوئے دونوں لڈو اس کے جبڑوں میں آکر جھولنے
لگے۔ اس نے چھدن کو پکارا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی طرف جھپٹا، اب تو سینکڑوں
لڈو اس کے گلے میں، سینے میں، ہاتھوں میں، ٹانگوں میں کُود رہے تھے، کُود ہی نہ رہے
تھے بلکہ نکلے پڑ رہے تھے۔ اُس نے چار گز کے فاصلے ہی سے چیخ کر کہا:

"ابے چھدن، مولود ہے بے!"

چھدن کے گلے کی رگیں لپک پڑیں۔ "مولود؟" اس نے ایسی آواز میں کہا جیسے
کوئی ڈاکہ کی خبر سنی ہو۔ "میری قسم؟"

"ہاں، ہاں بے۔"

"میری قسم کھا۔"

"کہہ تو رہا ہوں بے کہ مولود ہے، مولود ہے، اور وہ مانتا ہی نہیں۔"

"ہے کائیں کی ویسے؟ بتاسوں کی؟"

"بتاسوں کی؟ ربڑی ملے گی پاؤ پاؤ بھر۔"

"ابے چل؟" اپنے لہجے کا طنز محسوس کر کے چھدن نے انداز بدل دیا، اور ملتجیانہ
کہا: "ٹھیک ٹھیک بتا بے۔"

"اچھا، لے ٹھیک ٹھیک۔ دو دو آم ملیں گے ایک دونے میں رکھ کے۔"

"ابے تُو تو ہر وقت وہی بس.... ٹھیک ٹھیک بتا۔"

عنایت نے بہت احتیاط سے خوان پر سے کپڑا ہٹایا۔ "لڈو ہیں چار چار۔ تمہارے تو
آٹھ آٹھ ہُوئے۔"

"میری قسم؟"

"اور کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

"اجی ہاں؟"

"بھئی تیری جان قسم۔"

اب جا کر چھدن کی کنپٹیوں کی رگیں ڈھیلی پڑیں اور اس نے اپنے آپ کو سانس لیتا ہوا محسوس کیا۔ جب وہ آٹھوں لڈوؤں کو اپنے ہاتھوں میں اچھی طرح سنبھال چکا تو اُسے دُوسری غیر اہم معلومات حاصل کرنے کا خیال آیا۔ "ہے کس کے؟" اُس نے بہت ہی ہلکے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"شیخ جی کے ہے، بنیاد علی کے۔"

راکھ پر پانی پڑا، اور راکھ بیٹھ گئی۔ "شیخ بنیاد علی کے؟" چھدن نے ٹانگ ڈھیلی کر کے اس مسئلہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا دیکھو، پوچھوں ہوں اُستاد سے۔"

لیکن اُستاد کریما پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ بات کبھی نہ بھولی تھی کہ پہلے مولود میں شیخ بنیاد علی نے اتنی چھوٹی چوکی بچھائی تھی کہ اس پر اُن کی پارٹی کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی کیوں کہ شرفو کی پارٹی پہلے ہی سے آ کر ڈٹ گئی تھی، ان ہی لوگوں کے حافظ نے بیان پڑھا تھا اور ان ہی نے پنج آیت شروع کی تھی، اور سلام بھی ان ہی کا تھا۔

استاد کریما نے دروازے سے نکلتے ہی اپنے سب شاگردوں سے کہہ دیا تھا۔ "دیکھو، اصل کے ہو تو اب سے یہاں نہیں آنے کے ہو۔" انہیں بدلہ لینے کا ایسا موقع خدا دے۔ گو چھدن نے پیش بینی سے کام لیتے ہوئے لڈوؤں کا ذِکر پہلے ہی کر دیا تھا، مگر شیخ بنیاد علی کا نام سُن کر وہ اپنے شاگرد کو بتائے بغیر لڈوؤں کو پُورا ہی نگل گئے، اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ان پر بیٹھ گئے۔ پھر اُستاد کا بوجھ تھا، لڈو ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں رل گئے۔ مٹی میں نہ بھی ملے ہوں، کم از کم اُن کی نظروں سے تو او جھل ہو گئے۔ اس عمل سے ان کی آواز میں ذرا ارادے کی کرختگی پیدا ہُوئی اور انہوں نے چھدن کو ڈانٹتے ہُوئے کہا: "کیا کہا، شیخ بنیاد علی کے؟ کیوں بے الو کے پٹھے، کیا قسم کھلائی تھی اس روز؟..... سالے، ہو نہ کمینے، آخر کہاں جائے اصل؟ یاد ہے نا کیسی اس روز ذلت ہُوئی تھی؟ نیچے پڑے رہے۔ سلام بھی انہوں نے ہی پڑھا اور پنج آیت بھی انہوں نے ہی شروع کی تھی۔ جسے

جُوتیوں میں بیٹھنا ہو، وہ جائے۔ جو اصل کا ہو گا وہ تو جائے گا نہیں۔ اب تمہی کہہ دو انصاف سے کہ ایسی جگہ جانا چاہیے کہ نہیں؟ میاں، شریفوں کو تو ذرا سی بات لات کے برابر ہوتی ہے۔"

عزیز اور کلوا دونوں کے نزدیک انصاف کی بات یہی تھی کہ نہیں جانا چاہیے کیونکہ یہاں تو شجرے معرضِ بحث میں آ گئے تھے، اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ چاہے ذِلت ہوتی یا نہ ہوتی مگر چھدن کو تو اپنا سر کھجانا پڑ رہا تھا۔ ان دونوں کو تو اپنی گردن کی نسوں کی گدگدی میں کافی مزا آ گیا تھا، مگر بچارے چھدن کے خشک اور بوجھل ہونٹوں نے اُن آٹھ میں سے صرف دو لڈوؤں کو کوٹھے کے ادھر اُڑ کر جاتے ہُوئے دیکھا۔

لیکن استاد شرفو کے یہاں اس خبر کو زیادہ پُرسکون اعصاب کے ساتھ سُنا گیا۔ انہوں نے انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہُوئے غیر جانبدارانہ آواز میں کہا۔ "اچ چھا۔"

رشید اس چکنم میں تھا کہ اُستاد کی آواز میں نارضامندی پائے یا شک یا بے پروائی۔ لیکن خیر اُس کی گردن ڈھلکنے سے پہلے ہی اُستاد نے ہاتھ کو گھٹنے پر اُتارتے ہُوئے دُہرایا "تو مولود ہے.... ہے کس روز؟ شیخ جی کے ہے؟"

"ہاں، شیک جی کے، جمعے کے روز ہے، عشا کے بعد۔ دِن کی پانٹی نا آرئی ہے۔ منع کر دیا کریما نے۔ کہہ دیا کہ ہم نہ جانے کے ہیں شیک جی کے، وِد دن ہمیں نیچے بیٹھنا پڑا، سلام بھی ونھوں نے ہی پڑھا، اور جو اصل کا ہو گا وہ تو جانے کانا ہے۔"

رشید کی پُر اشتیاق آنکھوں کو مایوس نہ ہونا پڑا۔ اُستاد کی ڈاڑھی تیزی سے جھرجھرائی، اور انہوں نے غائب کریما کو ڈانٹ سکنے کی جرات سے لطف اُٹھاتے ہُوئے کہا "نہ آویں گے سالے تو مت آوَ۔ کوئی مولود نہ ہو گی وِن کے بغیر؟ کیا اور پڑھنے والے نا رہے ہیں؟ کس بات کی ہے دھونس اُن کی؟ کوئی دبے لبے ہیں شیخ جی وِن کے، یا کیا ہے؟ کمینے ہیں سالے۔ ابھی بتا دیں ڈانٹ تو ہو لیں گے آگے آگے۔ ایسے ایسے تو جُوتیں چاٹتے پھریں ہیں سینکڑوں!"

"اور کیا۔" رشید نے لہجے میں وقار پیدا کرتے ہُوئے تائید کی۔

"ہاں جی، یہ تو ہے ہی۔" اسمٰعیل جوش میں پٹی پر کھسک آیا تھا۔ "رئیس ہیں

صاحب، کون ہے وِن کی برابر کا قصبے میں؟"

گیند گدا کھا کر اور اُچھلی۔ "اور وہ بھول گئے جب خوشامدیں کرتے پھرتے تھے، جب مقدمہ چلا، ٹوپی ڈال دی تھی شیخ جی کے پیروں پہ۔ جو شیخ جی داروغا جی سے سفارش نہ کریں تو کاٹتے ہوتے جیل، بھول جاتے سب، کھا کھا کے ڈنڈے۔ اجی شیخ جی ہی کچھ ڈھیلے ہیں ہمارے، اِک لگواتے دو دو جُوتے تو ہو جاتے ٹھیک۔ پر کیا کریں شیخ جی ہی بچارے سیدھے سادے ہیں۔"

"بہت سیدھے ہیں واقعی شیک جی بھی۔" رشید نے لہجے میں رقت پیدا کرتے ہُوئے تائید لی۔

"بھئی ہاں۔" اسمٰعیل دونوں ہاتھ پی پر رکھ کر اُوپر اُٹھ گیا تھا۔ "یہ تو ہم بھی کہیں گے، بڑے ہی سیدھے ہیں شیخ جی۔"

"رئیس ہیں، بھائی! رئیس کو ہونا ہی چاہیے ایسا۔" اُستاد نے اپنے سامعین کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کہنا شروع کیا۔ "اور ان کے باپ تھے، صاحب! کیا بتاؤں کیسے آدمی تھے۔ وہ رُعب تھا کہ کوئی نکل تو جائے سلام کیے بغیر سامنے سے۔ چار پانچ آدمی جمع ہی رہیں تھے ہر وقت۔ مجھے تو وہ بیٹا کہیں تھے۔ مجھ سے کہتے، لے بیٹا شرفو، چلم تو بھر لا۔ اب میں چلم لے کر اندر پہنچتا۔ اجی آگ منگائی ہے چلم میں۔ بُوا، وہیں سے چلاتیں "ارے تھم، تھم، مَیں آئی، آگ اجاڑ کے رکھ دے گا ساری۔" تھیں وہ بھی بڑی اچھی۔ جب کبھی مَیں گیا وہ چھاچھ بلوتی ہُوئیں تو اُنھوں نے کبھی چھاچھ پیے بغیر نہیں آنے دیا مجھے۔ "لے رے شرفو، چھاچھ پیتا جا۔ اور مَیں لے کے، بیٹھ کے، کٹورا لاؤ بُوا جی۔ اور بڑا دُودھ دیوے تھی ان کی بھینس بھی۔ ساب، پچپن روپے کی لی تھی انھوں نے پینٹھ میں سے۔ جاٹ تھا وہ، کہنے لگا لو سیکھ جی! کیا یاد کرو گے تم بھی کہ دی تھی کوئی بھینسیا، اور نکلی وہ بھی ایسی ہی زوردار۔ دونوں وقت —"

"کیا ڈینگ مار رہا ہے بے لنگڑے؟" رشید ٹیلر ماسٹر نے رشید کو مونڈھے پر سے اٹھاتے ہُوئے کہا۔

"استاد نے تو خیر ذرا بُردباری سے کام لیا، مگر رشید اور اسمٰعیل کے کندھے فوراً تن گئے کہ دیکھیں پہلے کون بتائے۔ اسمٰعیل تو "با — بب — با" ہی کرتا رہ گیا۔ مگر رشید نے باوجود پھُولے ہُوئے سانس کے مولود کی خبر اور کریما کا حکم، سب حال سُنا ڈالا۔

"ابے چھوڑ یہ جھگڑا۔" ٹیلر ماسٹر بولے۔ "یہ بتا کہ بٹے گا گیا؟"

"لڈو ہیں، ماسٹر لڈو، لڈو؟" اسمٰعیل تلا ہُوا تھا کہ اب کے رشید کو آگے نہ بڑھنے دے گا۔

"لڈو؟" ٹیلر ماسٹر نے اپنی آواز میں سے لڈوؤں کی ساری مٹھاس اور خوشبو نکال دینے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "کیا روز روز لڈو۔ ہونہہ؟"

"تو پھر تمہارے لیے کون بانٹے گا سوہن حلوہ؟" اسمٰعیل نے ماسٹر کو اپنا جارحانہ اور غیر انسانی خیال ترک کر دینے پر اُکساتے ہُوئے کہا۔

مگر ماسٹر بھلا کسی کو ایسی چھوٹی چیزوں پر پھسلتے ہُوئے کہاں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا دہلی میں سوچا ہوا فقرہ اُنیسویں بار استعمال کیا۔ "اس سے تو اچھا ہے کہ دو دو روٹیوں پہ ایک ایک ہڈی اور چنے کی دال رکھ کر بانٹیں جو پیٹ تو بھرے کسی بھلے مانس کا۔" ماسٹر رشید اور اسمٰعیل کے صرف مسکرا دینے سے مطمئن نہ ہُوئے اور دو سیکنڈ انتظار کے بعد انہوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے خود ہی قہقہہ لگایا کہ ایسے نازک لطیفے عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

جب ٹیلر ماسٹر کے فقرے کے اثرات سے فضا کچھ خالی ہُوئی تو رشید نے مصالحت آمیز انداز میں پوچھا۔ "تو چلو گے ماسٹر پھر؟"

کچھ سہی، مگر ماسٹر ایسے سنگ دِل بھی نہ تھے کہ اپنی کلیت پر اڑے رہتے۔ "جب پالٹی ہی چلے گی تو ہم کیوں نہ جائیں گے؟" اپنے ساتھیوں کا دِل رکھنے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو کچھ اور ڈھیل دے دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ "آٹھ آٹھ لڈوؤں کا معاملہ ہے یار، کیوں چھوڑو؟ میرے داہنے کو بیٹھیو بے رشید، بول؟"

"کیوں ماسٹر؟" اسمٰعیل نے ٹیلر ماسٹر کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہُوئے کہا۔ "چکنا چپڑا چھانٹو گے؟"

بہرحال، ماسٹر اپنی اس تعریف سے خاصے خوش ہُوئے اور ان کی آنکھوں کے کونوں نے پھڑک کر اسمٰعیل کو زیادہ تفصیل سے کام لینے پر اُکسایا، اور رشید کو ایسا معلوم ہُوا جیسے اس کے دونوں جبڑوں میں فاصلہ بڑھ گیا ہے اور وہ ہونٹ کھول کر اپنے مُنہ میں ہَوا بھرنے لگا۔ یہ اچھا ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً جتا دیا جائے کہ استاد اپنی استادی اور دوسروں کی شاگردی نہیں بھولے ہیں، اس لیے استاد شرفو نے بھی اس موقع کو اپنے مقصد کے

لیے استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ "دیکھو بھئی!" انہوں نے اپنے شاگردوں کو جھنجھوڑا۔ "ایک بات تو ہم کہیں گے، چاہے تم مانو یا نہ مانو۔ جو مولود پڑھو تو اپنے فعل تو ٹھیک رکھو۔ بس ہر وقت وہی باتیں، کچھ اور بھی رہ گیا ہے تمہیں کہ نا؟ اور ایک یہ ہیں، ماسٹر۔ ڈاڑھی گھٹ منڈ۔ اور مونچھیں دیکھو تو اِتی اِتی، جیسے زنخے۔ اور نماز تو اس نے کبھی پڑھ کے ہی نہ جانی۔"

"کون؟ نماز؟ کس نے نا پڑھ کے جانی؟"

"تُو نے۔" اُستاد نے ماسٹر کے تین سال دلی میں رہنے کا رُعب نہ مانتے ہُوئے کہا۔

"اور کس نے؟"

"مَیں نے؟ مَیں نے؟ مَیں نا پڑھتا ہُوں نماز۔؟"

"تو دیکھا ہے کسی نے آج تک تجھے نماز پڑھتے؟"

"تو کوئی مَیں دکھانے کو پڑھوں ہُوں نماز تیری طرح۔" اور ماسٹر نے اپنے دہلی کے ایک دوست کے فقرے کو بُرہان قاطع کے طور پر پیش کیا۔ "مَیں تو تہجد کے ساتھ ملاتوں ہُوں سب وقت کی نمازیں، یار۔"

"تہجد کے ساتھ ملا لے ہے!" استاد نے پست نہ ہونے کی کوشش کرتے ہُوئے طنز سے کہا تاکہ دُوسرے شاگردوں کی مسکراہٹ ختم ہو جائے۔ "ابے کچھ تو خیال کیا کر، دُنیا کیا کہے گی۔ چڑھ کے بیٹھ گئے تخت پر مولود پڑھنے، اور فعل دیکھو تو ایسے!"

"ابے رہنے دے، بڑا بنا ہے پاک۔" اسمٰعیل اور رشید کی ہنسی نے واقعی بچارے ماسٹر کو اس پر مجبور کر دیا تھا۔ "تو پھر کھولوں تیری....."

لیکن اصول تو آفاقی حقائق ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی بحث میں استاد کو ذاتی سوانح عمریوں کا ذکر — جب کہ وہ خود ان کے بارے میں ہو — قطعاً پسند نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے گفتگو کو دُوسرا رنگ دینے کے لیے کہا۔ "بس چھیلا بنے رہیں ہر وقت۔ کہیں سلوٹ نہ پڑ جائے کپڑوں میں نماز پڑھتے میں!"

"جنٹل مین ہیں ساب ماسٹر، کوئی ایسے ویسے ہیں۔" اسمٰعیل اپنی شکایت کو جو اب ایک پُرلطف واقعہ بن گئی تھی، زیادہ دیر تک نہ روک سکا۔ "وہ اس دفعہ گئے تھے نا جمال پور مولود پڑھنے۔ بڑا دِک کیا ماسٹر نے راستہ میں۔ اپنے آپ نہ چلا گیا اتر کے، ڈٹے رہے گاڑی میں۔ سارے راستے مجھے ہی گھسٹوایا۔ جُوتا خراب ہو جائے گا میرا، جیسے بڑا بڑھیا تھا

آپ کا جُوتا۔"

"ابے، پانچ کا تھا پانچ کا۔" ماسٹر اپنے جُوتے کی اہمیت واضح کرنے سے کبھی نہ چُوکتے تھے، اور اُس وقت تو اُس پر حرف آ رہا تھا۔ "دیکھنے کو بھی نصیب نہ ہُوا ہو گا۔"

"پانچ کا ہو چاہے دس کا، پیر تو توڑے تم نے میرے۔"

"تو چار پیسے جو لیے تھے تُو نے دُودھ کو؟" مذاق تک تو خیر کوئی بات نہ تھی مگر شکایت آمیز لہجہ ماسٹر کو پسند نہ آیا تھا۔ "ابھی تک تو نہیں لوٹائے ہیں تُو نے وہ چار پیسے، بیٹھ ہی گیا ہضم کر کے؟"

استاد نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے خیال سے کہا۔ "مگر، ماسٹر، چائے بہت اڑائی تم نے جلال پور میں۔ وہ بھی کہتے ہوں گے کہ کیا مٹھور ہی پئیں گے۔"

"چھ!" بدمذاقی کا الزام ماسٹر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ "چائے تھی وہ؟ اونٹے ہُوئے پانی میں گڑ گھول دیا جیسے۔ گنوارو! ارے چائے ہم نے پی ہے دلی میں۔ پہنچ گئے صبح ہی صبح، اک پھینکے چار پیسے، لو جی بناؤ ایک پیالی۔ بس ساب، دی اس نے بنا کے، دو دو انگل ملائی چڑھی ہُوئی۔ اور جو ذرا کم ہُوئی تو ڈانٹا، کیوں جی، یہ کیا دی ہے، دیگچی کا دھوون۔ فوراً کہا اُس نے، اجی لو، لو، ناراض مت ہو، اور لو ملائی، ملائی کی کیا کمی ہے۔"

ماسٹر تو دِلی کی ملائی پر ہونٹ چٹخا رہے تھے، مگر ملائی کی چکنائی اسمٰعیل کو ماسٹر کے ہونٹوں پر چپکا ہُوا نہ رکھ سکی تھی، اور وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے والے بنیے کی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کو لینے کے لیے باہر نکلی، جو نالی کے کنارے کھڑی روٹی کا ٹکڑا کھا رہی تھی، ان لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر اس کے کُولھے اور زیادہ مٹکے۔ کمر میں اور بل پڑے، کندھے اور آڑے ترچھے ہُوئے۔ اس نے اپنی بانہہ ساڑھی میں سے ذرا اور باہر نکال دی اور "للی" کے بجائے آواز میں جھنک پیدا کرتے ہُوئے "لیل لی ای!" پکارنے لگی۔ اسمٰعیل کی دونوں پنڈلیوں میں گدگدی ہُوئی، اور اُس کی انگلیوں کے سرے بوجھل معلوم ہونے لگے۔ پہلے تو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا رہا۔ لیکن مصنوعی غصے سے پھُولی سُرخ ناک دیکھ کر اور "نا چلتی ہے تو مَیں چھوڑے جاؤں ہُوں" سُن کر اُس نے اپنی ٹانگیں سکوڑ لیں، اور "رُخسار سے بُرقع کو اٹھا کیوں نہیں دیتے" گانے لگا۔ اب تک اوروں نے بھی اُس گانے کے ماخذ کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن اُستاد لڑکی کو دیکھنے کے بجائے شوخ آنکھوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ: "ہم بھی تاڑ گئے ہیں، مگر خیر، جاؤ چھوڑتے

ہیں، ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں تمھارے۔"

رشید کی مسکراہٹ یہ بتانے کے لیے بے تاب تھی کہ اُسے چھوٹا نہ سمجھا جائے۔ وہ بھی ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ٹیلر ماسٹر بڑے بے پروا اور متین بنے ہُوئے تھے — یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ دہلی میں جن میم صاحب کے یہاں کام کرتے تھے، وہ ابھی ولایت سے آئی تھیں، اور بڑی خوبصورت تھیں، اور ماسٹر صاحب کو اپنے آپ بلُا کر چائے دیا کرتی تھیں، اس لیے اُنھیں ایسی دمڑی لونڈیوں سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اور صرف سانسوں کی آواز آتی رہی۔ یکایک اسمٰعیل نے چونکتے ہُوئے ایسے انداز میں کہا، جیسے وہ ان سے کسی بڑی چیز کی درخواست کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو کہ وہ انکار کر دیں گے: "مولود میں یہی نعت پڑھیں گے! رہے گی تو اچھی۔"

ٹیلر ماسٹر اس جذباتیت کو وہیں ختم کر دینا چاہتے تھے۔ وہ انکار کرنے ہی والے تھے کہ سامنے تھانے کے دیوان جی جاتے نظر آئے۔ "دیوان جی ہیں کیا؟" اُستاد نے پوچھا۔

"ہاں، دیوان جی ہی ہیں۔" رشید نے یقین دلایا۔

"دیوان جی کو بھی دعوت دے دیں مولود کی؟" استاد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مَیں کہہ دُوں بھاگ کے دیوان جی سے؟" اسمٰعیل نے پوچھا۔

"اچھا کہہ دے۔" استاد نے کہا، مگر پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "ذرا ٹھہر، مَیں ہی جاؤں ہُوں۔ مَیں ہی کہوں گا دیوان جی سے۔"

جب سے بُوا فاطمہ نے یہ سُنا تھا کہ شیخ بنیاد علی کی بیٹی شفیقہ چھ سال بعد آگرے سے آئی ہے، وہ بہت بے چین تھیں کہ کسی طرح اُس سے ملیں، اور اُن کے علاوہ اُن کی بھتیجی زینت بھی، اور وہ نئی بیاہنی بھی جو جلدی ہی انھیں بُوا کہنے لگی تھی اور اب دوپہر کا وقت ان ہی کے ہاں گزارتی تھی۔ خاص طور پر وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ شفیقہ آگرے سے کس رنگ میں رنگ کر آئی ہے۔ وہ پہلے ہی کی طرح سیدھی سادی ہے یا ساڑھی یا شلوار یا بڑے پانچوں کا پیجامہ پہنے اور ٹیڑھی مانگ نکالنے لگی ہے۔ مگر وہ یہ سوچتیں کہ بچوں کے گھر میں کہاں نکلنا ہوتا ہے اور کسما کسما کر رہ جاتیں۔ لیکن جب مولود کی

دعوت پہنچی تو انہیں تمنا پوری کرنے کا ایک زریں موقع ہاتھ آگیا۔ کیونکہ یہی دو ایک ایسی چیزیں ہوتی ہیں جب جانا فرض ہو جاتا ہے، جیسے کوئی خوشی، یا موت یا مولود۔ چنانچہ تینوں نے اپنے اپنے یہاں نہانے کے لیے پانی گرم ہونے کو رکھ دیا اور دوپہر ہی سے جو کچھ پکانا تھا منگا لیا تاکہ مغرب کے وقت تک کھانے وانے سے فارغ ہو جائیں۔

گو سیاہنی نے نہانے میں بہت دیر کر دی تھی جس پر بُوا فاطمہ بہت بگڑی تھیں مگر پھر عشا سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ سب تیار ہو گئیں اور چار بچوں اور بُوا فاطمہ کی بڑی لڑکی کلثوم کو ساتھ لے کر چل پڑیں۔ سیاہنی نے آج اپنا اکیلا بڑے پائینچوں کا پیجامہ پہنا تھا، اور کچھ دیر سوچنے ساچنے کے بعد ٹرنک میں سے اپنا تین روپے والا ریشمی سُرخ بُرقع بھی نکال لیا تھا، جس کے دو حصے تھے۔ اس برقعے کو ایک منٹ تک دیکھنے کے بعد زینت کے پپوٹے کچھ اس طرح کھلے رہ گئے جیسے اُن میں پلکیں نہ رہی ہوں، اور اس کے نیچے کے دانت اوپر کے دانتوں میں گڑنے لگے، مگر جب بُوا فاطمہ نے کہا۔ "اری، کیا ہے یہ تیرا بُرخا، ہاتھ تو سارے باہر نکلے وے ہیں۔" تب جا کر اُس کے ہونٹ کچھ ڈھیلے پڑے اور اس نے اپنا پرانی وضع کا سفید برقع جھاڑ کر اوڑھ لیا۔

جب یہ چاروں شیخ جی کے یہاں پہنچیں تو وہاں ابھی تک کھانا ہی کھایا جا رہا تھا۔ بچے پیچھے پیچھے آرہے تھے، اس لیے انہیں اپنی جوتیوں سے پھٹ پھٹ کرنی پڑی۔ تب شیخ جی کی بیوی چونکیں اور اُنھوں نے چُولھے کے پاس سے پکارا: "اجی ہٹیو ہٹیو۔" جتنی دیر میں شیخ جی نے پانی پیا اور ہاتھ دھوئے، ان چاروں کو دالان میں گرمی میں گھٹنا پڑا۔ چلتے چلتے بھی شیخ نے بیوی کو بلایا اور آہستہ سے کہا۔ "دیکھو باہر چھوٹی والی سینی بھیجنا، سمجھیں؟" جب شیخ جی کے جُوتوں کی آواز باہر پہنچ گئی اور بُوا فاطمہ نے دروازے کی طرف جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تو وہ چاروں ایک شکایت آمیز لمبا سانس لے کر باہر صحن میں نکلیں۔
"سلام۔" دونوں پارٹیوں نے ایک ساتھ کہا — ہر ایک فرد نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اس کی آواز سب سے کم سُنائی دے۔

"ہے ہے، مر گئے مارے گرمی کے!" سیاہنی نے آگرے والی پر پہلے ہی یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اُس کا مزاج بھی شہر والیوں کا سا ہے اور وہ قصبے کے دالانوں کی قطعاً عادی نہیں ہے۔ اُس کا ارادہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر پانی مانگنے کا تھا مگر بُوا فاطمہ نے شفیقہ کے پاس پہنچ کر اُس کی کمر تھپکنی شروع کر دی اور پوچھا۔ "بڑے دن میں آئی ہے

بٹیا: اچھی تو ہے؟"

"جی۔" شفیقہ نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔ "آیئے، بیٹھیے۔ اِدھر آ جایئے، اس پلنگ پر۔ اس پلنگ پہ تو...." مگر اس نے جملہ ناتمام ہی چھوڑ دیا۔

اس دوران میں بُوا فاطمہ خوب دیکھ داکھ کر اطمینان کر چکی تھیں کہ بات بڑے پائنچوں کے ریشمی پیجامے اور بالیوں کے بجائے بندوں تک ہی پہنچی ہے۔ زینت کا بھی ڈر کم ہو گیا، اور اس نے اپنے تنگ پائنچوں میں ٹانگوں کے پٹھے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ سیاہنی کو ایک حد تک مایوسی ہُوئی، مگر اس خیال سے تسکین ضرور ہُوئی کہ اب اسے خواہ مخواہ پچکنا تو نہ پڑے گا۔ کلثوم نے بھی پیچھے سے جھانک کر دیکھا اور آگرے والی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی چاہی مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد اُسے کسی اور وقت پر ملتوی کر دینا ہی بہتر سمجھا۔

اب بچے بھی آ پہنچے تھے، اور دونوں گھروں کے بچوں نے بھاگ کر اور غل مچا مچا کر پس منظر کی موسیقی فراہم کرنا شروع کر دی تھی۔ سیاہنی نے زیادہ دیر پُر تکلف بنا رہنا بیکار سمجھا، اور سیدھے شفیقہ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ "بہن مَیں تو تمہارے پاس بیٹھوں گی۔ مَیں تو برابر بُوا سے کہے جا رئی تھی کہ دیکھ پاؤں کسی طرح انہیں۔" اور پھر ساتھ ہی اپنے خصائص سے بھی آگاہ کر دیا تاکہ آگرے والی کو زیادہ دیر تک اُس کے بارے میں غلط فہمی نہ رہے۔ "میری تو ایسی ہی عادت ہے بہن، ہنسنے ہنسانے کی۔ اب کیا کروں اپنی عادت کو۔ بُوا کہتی رہی ہیں کہ اری کیا ہو گیا تیری ہنسی کو۔"

"ہاں ہاں، بہن بیٹھو۔" آگرے والی نے فوراً بتایا کہ اسے بھی مُردہ دِل نہ سمجھا جائے۔ "مَیں بھی یہ کہہ رہی تھی کہ کوئی باتیں واتیں کرنے والا ہی نہیں ملتا یہاں۔ آگرے میں تو ہر وقت آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔"

"وہاں تو بہت سی بہنیں بنی وی ہوں؟ فرخ آباد میں تو مَیں بھی نا مکوں تھی، کھڑکی تھی ہمارے گھر میں۔ بس کھڑکی کھولی اور اُدھر نکل گئی۔ پھریائی سارے محلے میں۔ وہ آئے اور بگڑنے لگے، بس کبھی گھر میں ہی نہیں دکھائی دیتی ہو، اُٹھیں اور چل دیں۔"

آگرے والی نے نہ معلوم کیوں یہ محسوس کیا کہ زیادہ سہلیاں رکھنا کوئی مبتذل سی بات ہے: "ہاں..... بہت سی تو کیا، دو ہیں جن سے ذرا زیادہ میل جول ہے، ایک تو ہیں آصف کی اماں، وہ بھی۔" اس نے سیاہنی کا دِل رکھنے کے لیے کہا۔ "بالکل تمہاری ہی سی

ہیں، بہن۔ بہت ہنستی ہیں۔ جب ہنسنے پہ آتی ہیں تو بس ہنسے چلی جاتی ہیں۔ فوج کے دفتر میں ہیں وہ۔ اور ایک ہیں نسیمہ کی اماں، وہ بہن بنی ہوئی ہیں، خالہ کہلواتی ہیں وہ اپنی بیٹی سے مجھے، کوئی آٹھ سال کی ہے اُن کی بیٹی۔ تیسری میں پڑھتی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے۔ ہے تو وہ اتنی سی مگر باتیں بالکل بڑوں کی سی کرتی ہے۔"

"اسکول جاتی ہو گی پڑھنے؟" سیاہنی نے اپنے شبہ کی تصدیق کرنے کے لیے پوچھا۔

بُوا فاطمہ نے بھی اس سلسلہ میں کچھ پوچھنا چاہا، مگر اسے اپنے سے بالاتر یا قبل از وقت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کلثوم نے بھی ایک چوڑی سی سڑک بنائی جس کے دونوں طرف مبہم سی دکانیں تھیں اور جہاں انجان شکلوں کی کالی اور بھاری گاڑیاں بغیر گھوڑوں اور پہیوں کے اُڑتی ہُوئی آ جا رہی تھیں، اور وہ آٹھ سال کی نسیمہ کو اپنی ہری اوڑھنی سنبھالتے ہُوئے بغل میں بستہ دبائے اسکول جاتے دیکھنے لگی۔ مگر چُوں کہ وہ راستوں سے ناواقف تھی، اِس لیے اُسے نسیمہ کو چوراہے پر کھڑا چھوڑ دینا پڑا، اور وہ باوجود متعدد کوششوں کے اُسے آگے نہ بڑھا سکی۔

"ہاں اسکول ہی تو جاتی ہے۔" شفیقہ نے بتا دیا۔

"بڑے ٹھاٹھ سے جاتی ہو گی پڑھنے؟" سیاہنی نے پوچھنے میں جلدی کی کہ کہیں گفتگو کسی اور طرف نہ بہک جائے۔

"ٹھاٹھ؟ نہیں، ٹھاٹھ کیا، اپنا یہی جیسے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔"

"تُو تو بیٹی آگرے میں رہ کر بالکل نہیں بدلی۔" بُوا فاطمہ بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھیں، اب ان سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ "بالکل ویسی ہی سیدھی سادی ہے، جیسے سب ہووے ہیں۔"

"ہاں بہن۔" سیاہنی کو بھی اس موضوع پر روشنی کی ضرورت تھی۔ "تم کیوں ہو اِتی سیدھی؟ تم کیوں نہیں کرتیں شہروالیوں کے سے فیشن؟"

"ہاں، فیشن؟ فیشن کیا! انہیں نہیں پسند، وہ تو کہتے ہیں کہ یہی اچھی ہے اپنی سیدھی سادی وضع۔ اور ویسے فیشن دیکھنے ہوں تو آگرے میں دیکھو۔ ایک سے ایک فیشن کرتی ہیں عورتیں جس رنگ کی قمیص ہو اسی رنگ کی شلوار ہو۔ سُوٹ کہتے ہیں اسے.... ہاں، سُوٹ۔ اور پھر ایک ہاتھ میں تو ایک چُوڑی، اور دوسرے میں پانچ پانچ، چھ چھ۔"

"اے سچ؟" اور جب شفیقہ نے یقین دلایا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے تو سیاہنی اور

لیکن۔ "اے ہائے! سُن رہی ہو بُوا؟"

"بس تو ہی سُن۔" بُوا نے فیشن پرستی کے الزام سے بچنے کے لیے کہا۔ "تجھے ہی ہے شوق ایسی باتوں کا۔ مری جاوے ہے اونچی ایڑی کے جُوتے پہ۔ کیا اچھا لگے ہے تجھے؟ مجھ سے تو نہ چلا جائے۔ دوپہر کو دیکھو اس کے تو تماشے۔ کبھی شیشہ لے کے ٹیڑھی مانگ بنائے گی۔ کبھی دوپٹے کی ساڑھی باندھے گی، کبھی مٹک مٹک کے گائے گی۔ اب تو بڑھیں بھی کنگھا لگانے لگیں۔ اور ذرا انگریزی سنو اس سے بلوا کر۔"

سیاہنی نے آتے ہی اپنی جو تعریف پیش کی اُس کے صحیح ہونے کے ثبوت دینے کی وہ اب تک کئی دفعہ کوشش کر چکی تھی۔ مگر جب بُوا فاطمہ نے شہادت دینی شروع کر دی تو اُس نے اُن کے بیان کے اثر کو مکمل کرنے کے لیے کئی قہقہے لگائے۔ "تم تو یہاں پڑی ہو، بُوا، تمھیں کیا خبر دُنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ جو باہر نکلو تو پتا چلے۔"

"ہاں؟" آگرے والی نے تال دی۔

"ہاں۔" بُوا فاطمہ نے بھی مرعوب نہ ہونے کی کوشش کرتے ہُوئے کہہ دیا۔

"ہوں۔" سیاہنی نے زیادہ پُریقین انداز میں کہا۔

فیشن کے ذکر پر شروع شروع میں تو کلثوم بھی سیدھی ہو گئی تھی اور پلکوں کو آنکھوں کے نیچے کی ہڈی پر جلدی جلدی گرتے محسوس کیا تھا۔ مگر جلدی ہی اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ ان صورتوں میں سے کسی نہ کسی کو دیکھ لینے کی کوشش کرنے لگی جو کٹی کٹائی شکلوں میں آدھی تہائی اُس کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ جلدی ہی ان صورتوں کی جگہ کالی، بھُوری اور بادامی پٹیوں نے لے لی، اور کبھی تو اسے اپنے کندھے چوڑے معلوم ہونے لگے اور کبھی کمر۔

"تو پھر سُناو بہن اور کچھ باتیں۔" سیاہنی نے خاموشی توڑی اور احتیاطاً یہ بھی کہہ دیا۔ "اور کیا کیا فیشن ہیں؟"

"اور کیا کیا فیشن ہیں؟ سینکڑوں ہیں، بہن، یہاں تو معلوم نہیں ہوتا، باہر نکلو تو پتا چلے۔"

موضوع کا یہ نیا پہلو سیاہنی کو بہت پسند آیا۔ "ہاں، بہن، تم نے بہت ہی ٹھیک بات کہی ہے یہ، باہر نکلو تو پتا چلے، یہاں آ کے تو ایسا ہو گیا ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بیٹھ گئے نہ ریڈیُو ہے یہاں نہ اور کچھ۔ اب وہاں تھے تو سنتے ہی رہیں تھے لڑائی کی باتیں کہ آج

ماتے مارے گئے، آج یوں ہوا، آج یوں ہوا۔"

تھوڑی ہی دیر سوچنے کے بعد سیاہنی کو آگرے والی سے باتیں سننے کا ایک مزے دار نسخہ ہاتھ آگیا۔ "ایک دفعہ اخبار میں لکھا آیا تھا کہ ایک اسکول کی لڑکی ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں کہوں ہوں بہن کہ کیسے مل گئے ہوں گے دونوں۔"

"تمہیں نہیں معلوم؟" آگرے والی نے وضاحت کی۔ "ایک ساتھ پڑھتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں تو کالجوں میں۔ وہ آصف کی اماں جو ہیں ان کا بڑا لڑکا پڑھتا ہے کالج میں۔ وہ بتایا کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں سب۔ وہ آصف کی اماں سُنا رہی تھیں کہ ان کے بھائی کے بیٹے نے کالج میں ایک لڑکی سے طے کرلیا تھا کہ تم سے کروں گا شادی۔ جب اس کے باپ شادی کرنے لگے تو اُس نے انکار کر دیا کہ مَیں نہیں کرتا ہوں شادی۔ پھر اس نے اسی لڑکی سے کی شادی۔ باپ بھی مجبور ہو گئے، کیا کرتے بچارے۔"

"وہ اچھے ماں باپ ہوں گے بھیا۔" بُوا فاطمہ نے غور کرنے کے بعد فیصلہ صادر کیا۔ "جو اپنی بیٹیوں کو بھیج دیتے ہوں گے اس طرح پڑھنے۔"

"باہر نکلو تو پتا چلے۔" سیاہنی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "ہاں؟"

"ہاں۔" اب آگرے والی میں بھی گرمی آ گئی تھی۔ "ابھی کالج کی لڑکیوں کے دیکھو فیشن۔ ایک دفعہ ہم رات کو گئے تھے تاج محل دیکھنے۔ چاندنی میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے تاج محل، بہت آدمی جاتے ہیں چاندنی راتوں میں۔ تانگے پہ تانگے دیکھ لو جاتے وے۔ بہت دِن سے کہہ رہی تھی کہ چلو چلو، ہمیں بھی دکھا لاؤ، چاندنی رات میں تاج محل۔ مگر ٹلتا ہی رہا ہر دفعہ۔ تو اُس دن کالج کے لڑکے بھی آئے تھے تاج محل دیکھنے، جس دن ہم گئے تھے۔ ہماری پڑوسن بھی گئی تھیں ہمارے ساتھ۔ وہ بھی بہت دن سے....."

"ذرا سننا۔" شیخ جی نے دروازے پر سے پکارا۔ "فرش ورش بچھ گیا؟"

مگر جب ان کی بیوی نے اطلاع دی کہ ابھی تو وہ برتن ہی منگوا رہی تھیں تو انہوں نے غصے میں دروازے کی زنجیر ہاتھ سے چھوڑ دی۔ "بھئی ٹھیک رہے! کب بچھے گا فرش؟ رات کے بارہ بجے؟ یہاں پڑھنے والے بھی آ گئے۔ اب بچھاتی ہو فرش یا کہہ دُوں کہ آج نہیں ہوتی میلاد ویلاد کچھ؟" اور واقعی انہوں نے پکار کر کہہ بھی دیا۔ مگر جب ان کی بیوی نے یقین دلایا کہ دیر نہ لگے گی تو وہ مان گئے، بلکہ ہنس پڑے اور واپس چلے گئے۔

سیاہنی کی تجویز پر دونوں گھروں کے بچوں کو لگا دیا گیا کہ وہ رسّی باندھیں، چادروں اور دَریوں کے پردے لٹکائیں، فرش بچھائیں، چوکیاں لا کر رکھیں، بڑی لالٹین جلائیں۔ جب شیخ جی کی بیوی کی مدد سے وہ بچوں کو کام کے متعلق مفصل ہدایات دے چکی تو وہ فوراً شفیقہ کی طرف مڑی۔ "ہاں بہن، تو پھر کیا ہُوا؟ تم سُنا رہی تھیں جو قصہ؟"

"ہاں تو پھر یہ ہُوا کہ..... " آگرے والی نے بچوں کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "غل تو مچ رہا ہے، کیا کروں باتیں! کان پڑی آواز تو سُنائی نہیں دیتی۔"

"ہونے بھی دو بہن غل۔" سیاہنی اپنے جوش میں ایسے بہانوں کو کب خاطر میں لانے والی تھی۔ "تم سناؤ۔"

"ہاں.... تو اس دن کالج کے لڑکے بھی آئے تھے۔ مجھے تو پڑوسن نے دکھایا کہ دیکھو تو بہن، کیسے پھر رہی ہیں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ۔ ایک ٹھٹے لگ رہے تھے۔ ایسے باتیں ہو رہی تھیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ ایک اُچھل کُود! بھاگ کے یہاں، بھاگ کے وہاں۔ کوئی تو ساڑھی باندھے وے، سر کھُلا ہُوا، پلا چلا جا رہا ہے زمین میں جھاڑو دیتا ہُوا۔ کسی بات کا ہوش ہی نہیں۔ اور کوئی نکر پہنے وے..... ہاں نکر، یہی جو گھٹنوں تک کا ہوتا ہے۔ ٹانگیں بالکل ننگی آدھی آدھی بانہوں کی قمیصیں۔ اور جو ساڑھی پہنے وے تھیں، بانہیں اُن کی بھی کھُلی ہُوئی تھیں کندھوں تک۔"

"اور دوپٹہ ووپٹہ کچھ نہیں، وہ جو نکر پہنے وے تھیں؟" بُوا فاطمہ نے پوچھا۔

"نہیں، کچھ نہیں، بس نکر اور کھُلے گلے کی قمیص، آدھی بانہوں کی۔"

"اور وہ.... وہ سب.... ہیں؟" یہ پوچھتے ہُوئے سیاہنی کی گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"سب.... سب" آگرے والی نے اس سوال میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہُوئے جواب دیا۔

بُوا فاطمہ تو خیر ہکا بکا ہو کر رہ گئیں۔ مگر سیاہنی کو اپنے پیٹ میں سانس زیادہ بھاری معلوم ہُوا، اور دونوں کنپٹیاں سرسرانے لگیں۔ وہ ایک روشن، واضح اور معین تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگی، مگر اُس جگہ جگہ سے پھُولے ہُوئے سفید کپڑے پر نہ معلوم ننگی ٹانگیں کیوں جھُولے چلی جا رہیں تھیں۔ کلثوم کے اندر بھی دو ایک پتیاں جلد جلد ہلیں، مگر اُس نے اپنے چہرے سے اُس کے سب آثار مٹا ڈالے، اور وہ ہوا کو سُونگھ سُونگھ

کر دیکھنے لگی کہ اس میں اس وقت کیسی خوشبو آ رہی ہے۔

سیاہنی کے جسم میں لہریں اُٹھ رہی تھیں جو اپنی اصل کے لحاظ سے تو ہنسی نہ تھیں، مگر حلق تک آ کر وہ مسکراہٹ کی شکل میں ظاہر ہونا چاہتی تھیں، اور وہ انہیں چُپ چاپ چہرے کی ہڈیوں میں جذب کر لینے کی کوشش کر رہی تھی، وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی ان لڑکیوں کی رانیں دکھائی دے رہی تھیں، مگر لفظ اُبھرتے اُبھرتے پھر ڈوب جاتے تھے۔ وہ ابھی یہ سوال کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی کہ شیخ جی نے پکار کر اطلاع دی کہ پڑھنے والے اندر آ رہے ہیں۔

اوس کے ساتھ خاموشی گر رہی تھی اور ہر چیز پر چپکی جاتی تھی۔ یُوں ہونے کو میلاد پڑھنے والوں کے گلے کافی بلند تھے، مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آوازیں فضا میں اُٹھ جاتی ہیں اور اُوپر کی خاموشی کو نیچے دھکیل دیتی ہیں۔ صرف شروع شروع میں سیاہنی نے ایک قہقہہ لگایا تھا، کیونکہ حافظ جی بیان پڑھتے ہُوئے اپنی آواز میں سوز و ساز پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر الف ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ تو زبر بھی 'عین' بن جاتا تھا، اور اُن کا بُوڑھا اور بھرایا ہُوا گلا لفظوں کو پچکا پچکا کر لمبوترا بنائے دے رہا تھا۔ اس کے بعد سیاہنی چُپ ہو گئی، اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بُوا فاطمہ کی تنبیہہ کو مان لیا تھا، بلکہ خود اُس کا جسم کچھ سست پڑ گیا تھا۔ اب تو ایسی خاموشی چھائی تھی کہ وہ اپنے اندر خون کی سنسناہٹ اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ صرف چھالیا کاٹنے کی آواز انہیں ایک لمحے کے لیے خارجی دُنیا میں کھینچ لاتی تھی، مگر "کٹ" کے ختم ہوتے ہی وہ بہت تیزی سے واپس ہو جاتی تھیں، جیسے کھینچی ہُوئی ربڑ کا سرا چھوڑ دیا جائے۔ کلثوم کی ہم آہنگی میں تو یہ "کٹ" بھی مخل نہ ہو رہی تھی۔ وہ یہ ارادہ کر کے بیٹھی تھی کہ بہت دلچسپی سے مولُود سنے گی۔ ایک دو دفعہ تو ضرور ایسا ہُوا کہ کسی مصرعے کے ٹکڑے نے اُس کے اندر بے چینی سے کروٹیں لیں اور اس کی کلائیوں میں خون بھر بھر آیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اُسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ وہ آنکھیں جھپک رہی ہے اور پہلو بدل رہی ہے۔ اُس کا خیال چپکے سے کھسک گیا تھا اور سرگشت کرتا پھر رہا تھا۔ کبھی تو اُسے ایسے چہرے، نیم کے پیڑ، دیواریں اور چُولہے نظر آتے تھے جو جانے بُوجھے تھے، مگر کبھی وہ ایسے طبقات پر سے گزرتا تھا۔ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور گہرائی ہی گہرائی، اور یہ اندھیرا کچھ ایسا سہاونا اور رسیلا تھا کہ وہ رُک کر

منڈلانے لگتا تھا، اور بار بار سر جھکا کر اس میں غرق کر دیتا تھا۔ بُوا فاطمہ نے اپنے خون تک کو وضو کرا رکھا تھا جس سے وہ بہت ست ہو گیا تھا۔ ان کے خیالات آ کر سینے میں جمع ہو گئے تھے اور بہت کلبلا رہے تھے۔ مگر انھوں نے سب کی ٹانگ میں رَسی باندھ رکھی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو یقین دِلا دیتی تھیں کہ اُن کی توجہ صرف "حضور کے بیان" کی طرف ہے۔ سیاہنی اس فرصت کے وقت فرخ آباد گھومنے چلی گئی۔ مگر کالج کی لڑکیوں کی رانوں کا خیال، جو کبھی تو سُرخ معلوم ہوتی تھیں اور کبھی سفید، بار بار اُس کے اندر چمک پیدا کر رہا تھا۔

اس تقدس کی فضا میں سیاہنی کا دَم گھٹنے لگا، اس لیے اُس نے چادر کو تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اوروں نے دیکھا تو وہ بھی کھسک آئیں اور اس کے اوپر سے جھانکنے لگیں۔ سیاہنی کی نگاہیں سامعین کے سروں سے تیرتی ہُوئی تخت پر پہنچ گئیں، چینی کے رنگین گلدان پر پھریں، تھوڑی دیر حافظ جی کی لمبی ڈاڑھی سے کھیلیں، اور پھر پڑھنے والوں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

"یہ کون ہے؟" سیاہنی نے ہنستے ہُوئے پوچھا۔ "یہ چکن کی ٹوپی اوڑھے رے، لڑکا سا؟"

"یہ رشید ہے۔" کلثوم نے جھانک کر دیکھا اور بتایا۔ "میرے ساتھ تھا یہ مدرسے میں۔ آٹھواں سپارہ تھا اُس کا جب۔"

"ہے کِس کا یہ؟" سیاہنی نے دوبارہ پردے سے آنکھ لگاتے ہُوئے کہا۔ "بڑا گورا ہے!"

کلثوم فوراً نیچے بیٹھ گئی اور دوپٹے سے ناک سہلانے لگی۔ وہ سب سے کہہ دینا چاہتی تھی کہ اُس زمانے میں تو رشید بہت گندا رہتا تھا، اور اُس کے کپڑوں میں جُوئیں بھری رہتی تھیں۔ مگر اُس کا سانس پُھول گیا اور گال بوجھل معلوم ہو رہے تھے۔

پھر ربڑ کھینچی اور چھوڑی جانے لگی۔

ہاں، جب سلام پڑھنے کے دوران میں لوگ اس مصرعے ("نُور سے معمور سینہ") پر پہنچے تو کلثوم کا بدن جسے اُس نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا تھا، پھر گرم ہو گیا، اور اس کے سر میں فوارے چھوٹنے لگے۔ "مہبط وحی سکینہ" سے بُوا فاطمہ اور سیاہنی، دونوں کو اُپلوں والی سکینہ یاد آ گئی۔ بُوا فاطمہ تو یہ سوچ رہی تھیں کہ اب سکینہ نے پیسے کے چھ پنجوں کے

بجائے پانچ کر دیئے ہیں، اور انہیں لُوٹ رہی ہے اور ساتھ اس کے اُپلے کتنے ہلکے ہو گئے ہیں۔ مگر سپاہنی کو اس پر ہنسی آ رہی تھی کہ وہ اپنی بہو کو لڑائی میں کیسی کیسی گالیاں دیتی ہے۔

جب اسمٰعیل اور رشید استاد سے رخصت ہو کر گلی میں مُڑے تو اسمٰعیل نے قریب ہوتے ہُوئے کہا۔ "تُو نے دیکھا تھا بے رشید؟ کون تھی جو پردے میں سے جھانک رہی تھی؟ مجھے تو آنکھ ہی دکھائی دی تھی بس.... آنکھ تو اچھی تھی یار!.... شیخ جی کی بیٹی تو نا تھی؟ ہے کوئی شیخ جی کے بیٹی اِتی بڑی؟"

"ادبِ لطیف" ستمبر ۱۹۴۱ء

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء

چائے کی پیالی

حالاں کہ وہ دیکھنا تو یہ چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کون سی نئی دکانیں کھلی ہیں، کون کون سے پُرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں، وہ گورا گورا سُنار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہُوا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں، سنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر، باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہُوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے! وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی، اور خود کو بڑا ہلکا اور سبک محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور سیٹ پر خُوب کُھل کر بیٹھ گئی۔ بے شمار دوڑتی ہُوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں — ہیچ مقدار اور ناچیز، بلکہ مضحکہ خیز لکیریں — اور وہ بلندی پر بیٹھی ان کی سراسیمگی سے لطف اُٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گن گن کر قدم رکھتا، اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دکان دار اسے دیکھ کر چونک سے پڑتے، اُن کی نگاہیں دُور تک اُس کا پیچھا کرتیں، اور وہ سوچتے: "اوہ، اب یہ کتنی شان دار ہو گئی ہے، اس کے بال کیسے چمکیلے ہیں، اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!" مگر ان کے دِل میں تحیر اور تجسس کبھی نہ پیدا ہوتا، اور نہ ان کی آنکھوں کی چمک یہ پوچھتی: "کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے۔" اُس کے برخلاف ان کا انداز تو سرپرستانہ ہوتا، اور ان کے خیالات کچھ اس قسم کے ہوتے: "بھئی ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ رُوپ نکالا ہے! شاباش، شاباش! جیسے اس کے رنگ رُوپ نکالنے میں اُن کی

کوششوں کو بھی دخل ہو، اور وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پُر تجمل چیز کے حصول پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ اُن کی ہلکی زیرِ لب مسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں: "کہو، اچھی تو رہیں، بہت دن میں دکھائی دی ہو۔" یا پھر جیسے انہیں یہ توقع ہو کہ وہ اُن کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پرَوانہ کرتے کہ اب وہ یہاں کے "مشن گرلز اسکول" میں نہیں پڑھتی۔ جس پر دُھندلے اُردو حرفوں میں "لڑکیوں کا مدرسہ" لکھا رہتا ہے، بلکہ ایلی نگر کے "کرسچین گرلز انسٹی ٹیوٹ" کی طالب علم ہے۔ اور نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اُسے ہلائے ڈال رہے ہیں۔ وہ تو بس زمین پر پڑے پڑے گستاخانہ کہتے رہتے "ارے، اب تم سے کیا وہ، تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو۔ نہ جانے کتنی بار تمہارے ٹھوکریں لگی ہیں اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آ گئی تھی۔" بس بالکل اس بسکٹ بنانے والے کی طرح، جو اسے دیکھ کر اپنے کالے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "اوہ، یہ تو وہی ہے عیسائی کی۔" اور دکانوں کے چھجوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اُسے گھیر لیتے۔ کھسکتے، رینگتے، گھسٹتے، اس کے پیچھے چلے آتے، اس کے قدموں سے لپٹے جاتے، اس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے۔ بے کسی کے لہجے میں، بھنچے ہُوئے گلے سے کہتے، جیسے دم توڑ رہے ہوں: "بس ایک لمحہ ٹھہر جاؤ.... بس ایک نظر... اپنے پرُانے سایوں کی طرف۔" اور ان کی یہ عاجزی اور منت سماجت بیکار نہ جاتی۔ اس کے ڈھیلا پڑتے ہی وہ اُس کے دِل میں گھس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کے سو جاتے۔ یہاں تک کہ اس کا سر ڈھلک جاتا۔ سانس ہلکا مگر بھاری پتھر ہو جاتا۔ اور اس پر کسلمندی طاری ہو جاتی۔ جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی۔ لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت نے اسے ان تمام بیچی ہُوئی چپچپاتی اُلجھنوں اور جھنجھٹوں سے بچا لیا۔ اب وہ کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی۔ اُس کی شخصیت پگھل کر دُوسری چیزوں میں نہیں مل جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی، صرف اور محض — مس ڈولی روبنسن — بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک، سفید دوپٹہ، اور اونچی ایڑی کا کالا جُوتا پہنے ہُوئے، سفید چکنی پنڈلیاں، تانگے پر مضبوطی سے جمی ہُوئی، کہنی تکیے پر، سنہرے بندے دونوں طرف جھُول جھُول کر چمکتے ہُوئے، احتیاط سے بنے ہُوئے کالے بال، اور پاؤڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اسے "ڈولی" کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر مار کر

کہتی: "کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی! مگر معاف کیجئے گا، مَیں تو مس روبنسن ہُوں، کرچین گرلز انسٹی ٹیوٹ ایلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم۔ اور مَیں موجود تو ہُوں آپ کے سامنے۔ دیکھ لیجئے، بھلا مَیں ڈولی ہو سکتی ہُوں؟" اگر وہ محض مس روبنسن بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ، کوئی سیڑھی، کوئی دہلیز کوئی گڑھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کیے چلا جاتا: "مگر تھمو تو۔ ہم تو تمہیں مدتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں۔" شہر کے باہر جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خوددار، پُر تمکنت اور بے نیاز واقع ہُوئی تھیں، وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اس پر بڑی مہربان ہوتیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں: "اچھا، تو آپ کا نام مس روبنسن ہے! جی، بہت خُوب۔" ان کوٹھیوں کے مطالبہ سے تو وہ یُوں آزاد ہو گئی، مگر دوپہر کا سُورج تو عملی طور سے اُس کی مدد کر رہا تھا۔ ایک سخت گیر آقا کی طرح اُس نے اپنی نگاہ کرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا تھا۔ اور وہ سہم سہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دُھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی تھی کہ ان کا رنگ و ڈھنگ سب اُڑ گیا تھا، اور ان کے دِل سے خود نمائی کے ولولے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جلی بھنی کھڑی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں: "چاہے دیکھو، چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ!" ان کی چڑچڑاہٹ اور کوسنے بھی کتنے مضحکہ خیز تھے۔ "تم رُوٹھے، ہم چھُوٹے۔" تانگے کے تختے پر اُس کے پیر کا دباؤ برابر اُسے یاد دلائے جا رہا تھا کہ اُسے ان گردوپیش کی چیزوں پر حاوی ہونے کا حق حاصل ہے کیوں کہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ مس روبنسن ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں، اور آستینوں سے باہر نکلے ہُوئے۔ اور پھر یہ بھی کچھ کم نہیں کہ ایلی نگر سے آ رہی ہے۔ جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہُوئی کوٹھیاں، شان دار اسٹیشن، اور فرح ناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اس کے لیے جاذبِ نظر ہیں۔ اب کیا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اگر وہ رشک و حسد سے پھُنکی جا رہی ہو تو خیر کر بھی لے۔

اب تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی چلی آئی تھی، مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اسے اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں، اناج کی گاڑیوں، اِکوں، گھاس والیوں، بھُوری مونچھوں والے کسانوں، گڑ کی جلیبیوں پر بھنکتے ہُوئے مکھیوں، اور لوہے کی دکانوں کی دُوسرے شور و غل سے اُوپر سنائی دینے والی ٹھناٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک

بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب یا مضحکہ خیز نہیں — محض مہمل اور ناقابلِ توجہ۔ جیسے مسز تربوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی — یا رعایتاً ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے اِکے میں دو مرد، چار عورتیں، پانچ بچے۔ یا گاڑی میں لگا ہوا پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز۔ ہر چیز کی ہیئت معین تھی۔ واضح، روشن، قطعی، پوری طرح، اپنی لکیروں کے درمیان — نہ کہیں سے رنگ بہا ہُوا، نہ کہیں دُھندلا۔ ہر چیز کی اپنی فردیت تھی — علیحدہ، ٹھوس، مستقل، جری، اپنی جگہ پر مطمئن، مرنجاں مرنج، نہ تو وہ دُوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ دبا لینا چاہتی تھیں اور نہ گڑگڑا کر التجائیں کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر مدغم کر لے۔ بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہُوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا اور اُسے اُوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور پھر ان سب نے ایک دُوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتہ کر لیا تھا اور ایک دُوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوشش کر رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی۔ ایلی نگر کی مس روبنسن بھی۔ مس روبنسن کے لیے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آ کر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی، مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بیزار نہیں تھی۔ اس پر تو ایک مطمئن تعطل کی کیفیت طاری تھی۔

یُوں تو منڈی اور اڈے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت رُوح افزا نہ تھا، اپنا یہی ایک آدھ پان اور سوڈا واٹر کی دکان تھی۔ یا پھر درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے، ایک دُوسرے سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے مگر پھر بھی اُسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کا حیاتی جمود ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کم سے کم اپنا ردعمل تو متعین کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اس طرح دبا رہا تھا۔ تکیہ پھر اس کی کہنی کے نیچے واپس آ گیا تھا اور خود تانگہ بھی پہلے سے اُونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ سامنے والی دکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ اس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ نائی کے لڑکے، جو اسے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے، اس کی آنکھوں اور رخساروں کو پھڑکا سکتے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کو مائل بہ تبسم کر سکتے ہیں، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے — اتنا بھی نہیں جتنا سینما

کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹریس کا، کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دے کر کم سے کم ایکٹرس کے گالوں کے گڑھے پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں۔ مگر مس روبنسن اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں اُن کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیرپا ثابت نہ ہُوئیں۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ گھڑگھڑاتے ہُوئے اکوں، لاریوں کی قطاروں، موٹر کے ہارن کی آوازوں، اکے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلاّ و مصفا و پُرسکون فضا میں رہنے کے بعد یہ شور و غوغا، یہ ہنگامۂ رستاخیز، اور یہ گرد کے بادل اسے ناگوار گزر رہے ہوں اور اس نے دو ایک بار "فوہ.... فوہ!" کرنے کے بعد مُنہ پر رُومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں، اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری بکھیڑے جاتی ہے اور لال رنگ کی ٹیکم پور، اور وہ ٹوٹی ہُوئی چھتری والا اکہ بہت سست چلتا ہے، اور وہ ڈاڑھی والا آدمی چنگی کا منشی ہے۔ کوئی بھی چیز پُر عناد نہ تھی۔ بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و پیش کی ساری چیزیں بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اُس کا خیرمقدم کرنے کے لیے تیار تھیں، مگر، نہ جانے کیوں، وہ مس روبنسن کی شخصیت کو پھیلا کر اس ماحول پر مسلط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دِل کو بیٹھتا ہُوا محسوس کر رہی تھی اور نہ اُس سے یہ ہوتا تھا کہ وہ ڈولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹتی تھی، سکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی، جیسے کوئی وار روک رہی ہو۔ کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی رہے، چلتا ہی جائے، اور کبھی یہ کہ بہت سے اکے سامنے ہو جائیں اور تانگہ رُکا کھڑا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اس کی حالت بس بالکل اس نوخیز لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپاتی پھرے، اور اگر کبھی ایسا حادثہ رُونما ہو جائے تو گھنٹوں ہونٹ کاٹتی رہے۔ وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی اور اس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی۔ کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اسی کی تو اُسے سب سے زیادہ تفصیل معلوم تھی، جب اس کی اپنی لاری کے بجائے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اسے خوشی ہوتی تھی کہ چلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آ کر کہا۔ "کہاں جانا

ہے؟ ٹیکم پور؟" تو اسے ایک گونہ تکلیف ہوئی — اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے اُسے پہچانتا نہ ہو۔ اس نے بڑی گلو گرفتہ آواز سے جواب دیا:
"ہاں.... نہیں۔ سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں۔" ایجنٹ نے ایک اکے کی طرف جاتے ہوئے کہا:
"وہ بھورے رنگ کی.... بس تیار ہے۔"

تانگہ رُکنے سے پہلے ہی اُس نے تانگے والے کو پیسے پکڑا دیئے اور جلدی سے نیچے کُود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے، اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیرنگ وہیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈولی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا مگر ہونٹوں پر آتے آتے اس کے لفظ بدل گئے۔ اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا، جیسے اُسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو: "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد۔" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویہ ایسا تلطف آمیز نہ تھا مگر اس کی آواز سنتے ہی ڈولی کو ایسا معلوم ہوا جیسے سرد، سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان یکایک ایک کمرے نے آ کر اُسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اس کے لیے اسم اعظم کی وہ تختی بن گیا تھا جو اُسے ہر قسم کے آسیبوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟.... یہی کوئی ڈھائی تین بجے۔"

"تو کے بجے؟.... ٹھیک۔"

"ہاں.... بس تین بجے چل پڑے گی لاری۔"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں متذبذب تھی۔ دو ایک لمحے دیکھنے کے بعد اُس نے پوچھا: "اور اب کیا بجا ہو گا؟"

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا۔ "کوئی ایک ہو گا۔"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا، مگر ڈولی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا:
"اچھا تو —"

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اُس کی مردانگی غالب آ چکی تھی اور اُسے یہ بھی

خیال آ گیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دُعا ہے ہی۔ اس لیے وہ اُٹھ بیٹھا اور کلینز کو دو تین آوازیں دے کر ڈولی کا سامان اُوپر رکھ دینے کے لیے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد ہی مطمئن ہو گئی مگر جگہ کا مسئلہ ابھی درپیش تھا۔ وہ باہر سے کھڑی اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف سے ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پائجامہ پہنے، پیر اُوپر رکھے بیٹھی تھی اور اپنے پوپلے مُنہ سے پان چبا رہی تھی۔ اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک آدمی جو اُس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، بیٹھا ایک گٹھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچ کے حصے میں رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب نکر پہنے ہوئے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی جو گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اُس کے پاس رکھے تھے، اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈولی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے اور ادھر دُھوپ اب ناقابلِ برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ ڈرائیور نے سر اُٹھا کر کہا: "بیٹھو، اندر بیٹھو۔ بس اب چلنے ہے لاری۔"

گو "بیٹھو" ذرا چونکا دینے والی بات تھی، مگر اس کی آواز سُن کر ڈولی کے دِل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے اُس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہاں.... اچھا.... کہاں بیٹھوں؟"

"یہاں آ جاؤ، بیچ کی سیٹ پہ۔" ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

"ہاں..... لیکن۔" ڈولی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی۔ "اگر آگے...."

"آگے؟..... آگے تو جی، آج داروغہ جی جا رہے ہیں، آگے تو اُن کی جگہ ہے۔"

مگر جب ڈولی اُسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی، اور کانکھتا ہُوا نیچے اُتر آیا۔ "آگے بیٹھو ہو۔" اس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ ہمیں کیا وہ۔ ہمارے سے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن داروغہ جی جا رہے ہیں آج۔"

ڈولی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے مورچے کے لیے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اس تکلیف دینے سے روک سکے، مگر وہ حالات کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا، اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس دُرست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی منٹ تک

رُومال سے ہَوا کرنے کے بعد اسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اُس نے یکایک یہ دیکھا کہ لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہُوئے ہیں جن میں اُس کا چہرہ نظر آ رہا ہے، تو اُسے بڑی حیرت ہُوئی۔ مگر دُوسری نگاہ نے حیرت کو کسمساہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اُس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہُوئے تھے اور گرد سے بھُورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اُس کے چہرے کو تمتما دیا تھا، اور وہ گرد آلُود ہو رہا تھا۔ خشک پپڑیوں نے اُس کے ہونٹوں کی سُرخی زائل کر دی تھی، اور اُس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھیں۔ اُس نے شرما کر گھبراتے ہُوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا۔ زور زور سے چہرے کو رگڑا، اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری، یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھِل بھی گئے۔ آخر اُس نے جھنجھلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجن کی تصویر لگی ہُوئی تھی۔ ستاروں والی ہری ساڑھی، لمبے لمبے بندے، پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی، سُرخ چہرہ، بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اُسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لیے اُس کی نگاہیں آگے بڑھ گئیں اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی قطار کی قطار کھڑی تھی مگر اُسے صرف اُن کے انجن اور مڈگارڈ نظر آ رہے تھے۔ سامنے دو اِکے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اور اپنے اپنے اِکے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ دو ایک خوانچے والے، پانی پلانے والا اور چند کلینر جمع ہو گئے تھے۔ اور آدھے ایک اِکے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا ہُوا سا بیٹھا تھا۔ وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمت کر رہا تھا اور اُس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک اُونچا سا ڈھیر تھا، جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا، خشک اور بالکل سفید۔ دھوپ کی سختی کے باوجود مطمئن اور ساکن — بے نیاز جیسے کوئی معمر اور جہاں دیدہ رواقی فلسفی۔ ہَوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اٹھتا تھا، اور آہستہ آہستہ اُوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے ہُوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دُور آگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچی دیواریں اور چھپر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچہ

درختوں سے باہر نکل آتا تھا اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کا جسم ایک نُورانی اور لطیف مادے کی شکل میں تبدیل ہو کر تفکرانہ انداز میں اس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے۔ جس کے دونوں کنارے ہَوا سے اُڑتی ہُوئی چادر کی طرح اُوپر اُٹھے ہُوئے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہُوا تھا جیسے اُس کی رُوح اپنے جسم کو وہیں چھایا ہُوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو، اور ایک ننھی سی ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی بہار کی شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چٹ چٹاتی پھر رہی ہو۔ ٹانگیں ملا کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر، سر کو کچھ تو اضمحلال اور کچھ جذبۂ تسلیم و رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہُوئے، وہ بگولوں کے ساتھ اُوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ جو اسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اُتر جاتے تھے، اور وہاں سے آسمان کی متخیل نیلاہٹیں اسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک آم کے پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی۔ اُس نے آم کے پتوں کی ترو تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی، فضا کی طراوت اور خوابناکی اس کے جسم میں اُتر گئی تھی، اور وہ کچی دیوار اُسے اپنی پُرانی ہجولی معلوم ہونے لگی تھی۔

اسی لیے جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آوز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مڑیں۔ ایک اِکے میں سے دو تین عورتیں، بچے اور کچھ مرد اُترے تھے، اور اب اُن کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا۔ ڈولی کو پیچھے پھر کر دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ اس دوران میں پچھلے حصے میں چند آدمی اور بیٹھ چکے تھے۔ اُن کے قریب ہی نیچے چاٹ والا اپنا خوانچہ لیے بیٹھا تھا، جسے دیکھتے ہی بچوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا، اور اپنی ماؤں کو اُوپر چڑھنے کی بھی اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لیے پٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں اور ان کے کلینر زور زور سے آوازیں لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں، لے لیں۔ لاریوں کے چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور ان کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے یکایک ڈولی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پٹرول کی دکان کے قریب بن رہا تھا اور جس کی طرف اس نے ابھی تک خیال ہی نہیں کیا تھا۔ پہلے یہاں خالی زمین پڑی تھی جہاں کتے اپنی

کھلاڑیوں سے گرد اُڑاتے رہتے تھے، اور کبھی کبھار کوئی خوانچے والا ستانے کے لیے آ بیٹھتا تھا۔ لیکن اب تو وہاں پاڑیں لگی ہُوئی تھیں اور ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا، بس چھت پُوری ہونے کی کسر تھی۔ مکان کے اندر اندھیرا سا تھا اور اُس کی زمین ابھی تک سیلی ہُوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی، پُر کیف اور ذہن کو کند کر دینے والی خنکی تھی جو ڈولی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائے جا رہی تھی۔ اس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو ست کیے دے رہے تھی۔ داہنی طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو اُس کا چھوٹا بھائی فریڈی اُس کا بستر کر لیے گا، اُس کا ٹرنک کھولنے کو بے تاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ بوا اُس کے واسطے کیا لائی ہیں، اور جب وہ کچھ نہ پائے گا تو بہت مایوس ہو گا اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے آٹھ آنے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد اُس کے پاس چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنس کو خط لکھنے کے لیے بھی سہی۔ تین آنے میں کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اِس لیے وہ اُتر کر پھلوں والے کے پاس گئی اور ایک منٹ تک اُس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا:

"سنترے کیا حساب دیئے ہیں؟"

اُمیدوں سے بھرے ہُوئے لہجے میں پھلوں والے نے کہا: "پانچ پانچ پیسے دے رکھے ہیں میم صاحب۔"

"پانچ پیسے کا ایک؟"

"ہاں، پانچ پانچ پیسے، بڑے میٹھے ہیں، میم صاحب۔ لو چکھ کے دیکھو۔"

"نہیں نہیں، رہنے دو۔" اُس نے تین آنے کو پانچ پیسے سے تقسیم کرتے ہُوئے کہا: "تین تین پیسے نہیں؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں، میم صاحب۔" پھل والے نے اپنی باطل اُمیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا۔ "لو، کیلے لو۔ پانچ پیسے کے دو دیئے ہیں۔"

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہیں تھی۔ اُس نے آدھی مایوس ہو کر پُوچھا۔ "کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"کم؟ اجی، تمہیں نہیں لینا دینا۔ لاؤ کیلا، مَیں چلوں۔" اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہُوئے کسان کو پکار کر کہا۔ "لو چودھری، چوس لو۔ رسیلے ہو رہے ہیں

رسیلے۔"

یکایک اُس کے حلق میں ڈاٹ سی اڑ گئی اور سانس لینے کی کوشش میں کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئیں، اُس کے شانے خود بخود کام کرنے والے مدافعتی آلات کی طرح نیچے جھک گئے اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ، جہاں وہ کھڑی تھی، دفعتاً بلند ہو گئی ہے۔ اور ساری دُنیا کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئی ہیں۔ اُس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ ہی بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے اور اس نے تین آنے پھینکتے ہُوئے کہا۔ "بسکٹ۔"

"بسکٹ؟" یہ محض ایک لفظ بسکٹ والے کے لیے کسی قدر مبہم تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "ایک آنے درجن والے کہ تین پیسے درجن والے؟"

"کوئی سے۔" ڈولی نے ہاتھ بڑھاتے ہُوئے جواب دیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے تین بنڈل ہاتھ میں پکڑ لیے، اور تیز قدم اٹھاتی ہُوئی اپنی جگہ پر واپس چلی آئی۔ مگر بیٹھنے کے بعد تو اس کا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگنے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ تھوڑا سا نیچے کھسکتا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی چھاتیاں بڑی بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں اور ان میں کوئی چیز اُبل رہی تھی، سنسنا رہی تھی، گول گول چکر لگا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا، جسے خشک کرنے کی کوشش میں اُس کا سانس بھاری اور دشوار بن کر اُس کے دِل کی حالت کو اور بے قابو کیے دے رہا تھا۔ وہ جتنی نیچی ہو سکتی تھی ہو گئی اور دوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہُوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ دوپٹے کے لمس میں تسکین تھی، دلاسا تھا، ہمدردی اور غم گساری تھی، شفقت اور محبت، اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور محافظت کرنے کا وعدہ۔ اس کی کھال سے دوپٹہ کیا چھُوا تھا، آگ پر پانی پڑا تھا۔ اُس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور چند ہی منٹ میں اُس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی، مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے بخار کے بعد۔

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جماہیاں لینے سے بھی اس کی تسکین نہ ہوئی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے، یا ٹانگوں کو خوب تان کر پھیلا دے — لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا اُس کی ٹانگوں کے مان کا نہ تھا اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ

تھا کہ اُس کا دوپٹہ پھسل جاتا اور بازو اُونچے اٹھتے، جہاں سب کی نظریں اُن پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اُس نے ڈرائیور کو پکار کر بلایا اور وقت پوچھا۔

"اب چلے ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "گھبراؤ کیوں ہو۔"

"مگر ویسے بجا کیا ہے؟"

"سوا دو بج رہے ہیں اب۔"

ابھی پورا پون گھنٹہ باقی تھا اور یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی رانیں پتھر ہوئی جا رہی تھیں۔ پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی۔ مگر اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ لاری والوں کے قاعدے کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اس نے کسی المیہ کی ہیروئن کی سی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا، اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی، اور پھر اندر جائے گی۔ فریڈی اسے دیکھتے ہی "ڈولی بوا، ڈولی بوا" چیختا دوڑے گا اور آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا: "ڈولی بوا کیا لائی ہو؟ دکھاؤ — انگریزی مٹھائی لائی ہو؟ — تم کہہ گئی تھیں" جب اسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد بھی کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھن ٹھنانے لگے گا۔ وہ اسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی رہے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی: "اچھا آنکھیں بند کرو، دیکھو، ہم تمہیں ایک چیز دیں۔" فریڈی یقین نہیں کرے گا اور بڑی دیر کی بحث کے بعد آنکھیں بند کرے گا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا بنڈل دے دی گی، جسے دیکھ کر فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا اور وہ اسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرے گی — جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی، اور کہے گی ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے۔" فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہُوا گلاب رکھ دیا ہو۔ اس کے جسم میں رس اُترتا چلا جائے گا اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اس کے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا مگر وہ اُسے صاف نہیں کرے گی، بلکہ یوں ہی رہنے دے گی — اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتے تو چلیں گے۔ گو اُس نے جلدی میں تین آنے پھینک دیئے تھے، مگر خیر ٹھیک ہے — اب وہ برنس کو لفافہ کے بجائے کارڈ بھیج دے گی۔ چلتے ہوئے برنس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا چوں

کہ وہ وعدہ کر آئی تھی اس لیے چھٹیوں بھر اُسے خط بھیجتی رہے گی.... لفافہ نہ سہی تو کارڈ تو ضرور.... مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا جائے گا؟.... بہرحال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشن کے اشتہاروں کی ردی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سُنا کر ناج لایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ ان سے ناج لے لیا کرے گی، اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیج کر اُس کے پیسے منگوا لیا کرے گی۔ وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور خط بھیجے گی.... کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک ایک چارپائی پر لیٹی باتیں کرتی رہی تھیں، یہاں تک کہ اُن کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دُوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں، اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات اُن کے سینے مل جاتے تھے۔ اُن کے تھوک نگلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونجتی تھی۔ دونوں کے بازو جل رہے تھے، مگر اس کا مس کتنا راحت بخش تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں۔ مگر بغیر کسی خاص سبب کے اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں اور پھر اس راحت کے احساس کی شدت بھی اُس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے اُسے بار بار بانہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔

اُس رُخصت کی رات برنس نے اپنے سارے راز جنہیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی، ایک ایک کر کے بتا دیے تھے۔ اُس نے سنایا تھا کہ ایک دن، جب کہ سارا اسکول مل کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اُس کے پیچھے بیٹھا تھا، برابر اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ برنس نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اُس کی طرف دیکھا تھا، اور اندھیرے میں اُس نے ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دِلچسپ اُس لڑکے کا قصہ تھا جو اُسے چھٹیوں میں ملا تھا، جب وہ اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصہ سنانے سے پہلے اُس نے رُکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ذرا اور قریب کھسک آؤ۔" برنس نے اپنا بازُو مضبوطی سے اُس کے گرد ڈال لیا تھا، اور اُس کی کمر تھپ تھپاتی جاتی تھی۔ اُس کا دِل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا، اور جسم سے لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اُس نے دیوی داس بتایا تھا جو اُس کے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا اور بڑا گورا اور خوبصورت تھا، اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا۔ دیوی داس کی خوش مزاجی نے اس کی مدافعت پر جلد قابو پا لیا تھا۔ جب اس کا بھائی

اِدھر اُدھر ہوتا تو وہ اسے گود میں بٹھالیتا تھا اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا، "اور وہ" برنس نے اپنی ٹھوڑی سے سینے کی طرف اشارہ کرکے لفظ چباتے ہوئے کہا: "یہاں ہاتھ رکھے رہتا تھا۔" قصہ سناتے سناتے برنس نے رُک کر تکیے سے سر اُٹھالیا تھا اور چند لمحے اُس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد ملتجیانہ لہجہ میں کہا تھا: "ڈولی، ہم پیار کرلیں تمہیں؟" اور اُس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اُس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے کے لیے اُس کے گالوں پر رکھ دیے تھے۔ اُس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا اطمینان، بے فکری اور محظوظ ہونے کا احساس حاصل ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کنگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر — قصے کے دوران میں اُس نے اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں سے دُور رہیں۔ مگر اس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا جاتا تھا — اس کے روکنے کے باوجود۔ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں اور بار بار چادروں سے منھ اور ہاتھ نکال کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں — چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر اُن میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو ایسی کھنچن محسوس ہوتی تھی جیسے اُن کے بدن جڑے ہوئے ہوں — برنس کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی — برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اُداس رہی تھی، خصوصاً ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی۔ کھیت، جھاڑیاں، تار کے کھمبے، درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم کر اُفق کی طرف نکلے چلے جاتے تھے، گویا وہ اسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کے سینے کے بیچوں و بیچ کوئی چیز ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جو اندر اُترتی چلی جاتی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے اور نزع میں پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے کی طرح اپنا سینہ دیوار کے ٹھنڈے ٹھنڈے تختے سے لگا دے، اور ساری دُنیا سے غافل ہو جائے — جب وہ لال لال پل آیا تھا تو اسے ذرا ڈھارس بندھی تھی کہ اس نظارے سے اس کی افسردگی دُور ہو جائے گی، مگر ان دیوؤں کی سی سُرخ ٹانگوں سے جو اسے دریا کے نیلے نیلے، چمکتے ہوئے پانی کو اچھی طرح دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ اور گھڑ گھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوئی تھی کہ اگر پل جلدی ختم نہ ہو جاتا تو مارے وحشت کے رو دیتی.... اسے کچھ پتا

نہیں رہا تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی جولیا کی بیٹھی ہوئی آواز، یا گریس کی چیخیں، جسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں، یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے کے لیے اُس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا — برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ گئی ہوگی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہوگی جو اُس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے.... برنس دُھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اتری ہوگی، اور اُس کے ہرنے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بولی ہوں گی.... اس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اتارنے کے لیے کہا ہوگا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی....

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے بھڑ سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سر اور ہاتھ ہلانے جلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رُخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لیے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے آوازیں آئیں: "لو بھئی، چلی تو کسی طرح۔"

"کچھ معلوم بھی ہے؟" ڈرائیور نے کلینر کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا۔ "پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں۔"

لاری کا انجن بھر بھرانے لگا: ننھے ننھے چکر اس کے پیروں میں داخل ہوئے اور گول، گھومتے، ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے، اُوپر چڑھتے چلے گئے، اور پنڈلیوں، رانوں، پیٹ، چھاتیوں، بغلوں، بازوؤں، کانوں اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیے تاکہ اس کے پیر اور جھنجھنانے لگیں۔ مگر ایک دفعہ چکروں کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پیل میں آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ پیٹ کے نچلے حصے میں اٹک کر اُدھم مچانے لگا، یہاں تک کہ ڈولی نے بجلی کی سرعت سے پیر کھینچ لیے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملائے۔ لاری اسے ہلکے ہلکے جھولے دیتی آگے بڑھی، مگر وہ ابھی رینگ رینگ کر ہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رُک گئی۔

"کیوں بھیا" کسی نے پچھلے حصے سے پکارا: کیا اور بٹھاوے ہے؟ یہاں پہلے ہی گھٹے جا رہے ہیں، مرے یار۔"

مگر ڈرائیور نے اسے ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا، اور اُتر کر پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لیے کہا.... پمپ کے اُجلے صاف شیشے میں نقرئی سیال اتھلا

اٹھلا کر اور ٹھمک ٹھمک کر اُوپر چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ جو چیز ڈولی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے تھے جو اُبلتے ہوئے شفاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ پٹرول کی بو کے باوجود اُس نے سر نہیں پھیرا تھا، اور تیل کو چڑھتے اُترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اُس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی، اور اس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی جو اُسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اکوں کو گرد کے بادلوں میں چھپاتی پھر روانہ ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ کلچ پر پہنچتا تھا۔ ڈولی سانس کو حلق ہی میں روک کر کسی گم نام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو جو اس وقت انتظار، ارتعاش، کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا، ہوا پر جس کی ہستی اُسے ٹھوس اور مرئی معلوم ہو رہی تھی، آگے جھکا دیتی تھی — ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اُس کی ران میں گھس آتی تھی جسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے اُن کے ڈھیلے پڑتے ہی اُس کی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی۔

سعد آباد کی سڑک پر مُڑنے کے بعد لاری کی رفتار کینڈے پر آ گئی، اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اِدھر سے اُدھر کھسک کر اُس نے گدے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصہ مدور تھا۔ ایسا گول کہ اس کی کمر اس میں بالکل ٹھیک آتی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو اس حلقے کی آغوش میں گرا دیا اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اسے وہاں سے علیحدہ کر دیے جانے کا خوف ہو۔ اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی، اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضاء کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور اور ادراک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیزوں میں اسے روشنی، تازگی، دلچسپی، ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسم

نظر آرہا تھا، جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو۔ اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دُور دُور دوڑانا نہیں چاہتی تھی، بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کیے ہوئے تھی، اور جب سڑک پر پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے زیرِ اثر دِل فریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور عجوبے کی تلاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ! دُھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی تھی اور ایک ہمیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے، مگر تیز دُھوپ نے ان کی آدھی شخصیت اپنے اندر جذب کرلی تھی۔ لاری عجب خود اعتمادی اور پندار کے ساتھ بے نیازی سے چلی جا رہی تھی۔ اس کی آواز دُور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلدی جلدی بالکل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے، سڑک کے ایک طرف سے دُوسری طرف بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصاً بیل گاڑیوں پر اُس کی فوقیت ڈولی کے دِل میں رفعت کا احساس پیدا کر رہی تھی، اور اسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اُس کی آلودگی اوروں کی نسبت کم ہو گئی ہے۔ انجن کی بھن بھناہٹ نے اُسے دُوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ کی چیخ چاخ سے محفوظ کر دیا تھا۔ اُس سے بھی زیادہ یہ کہ اس تھرتھراہٹ نے اُس کے گرد ایک ایژی حلقہ بن دیا تھا جہاں اُس کے خیال کے مطابق اُسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس لیے پوری آزادی کے ساتھ اس کے نتھنے پھول سکتے تھے اور بند ہو سکتے تھے اور چہرہ جو رنگ چاہے، اختیار کرسکتا تھا۔ اپنے اس قلعہ بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گزرتے ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کئی ٹیلوں، مزاروں، کنوؤں اور باغوں سے اچھی طرح آشنا تھی، بلکہ بعضے بعضے درخت تک ایسے تھے جنہیں وہ پہچان سکتی تھی۔ رہٹ کنویں کو دیکھتے ہی اُس نے بتا دیا تھا کہ اب اس کے بعد کھجور کے پیڑ والا باغ آئے گا۔ شہر سے دو میل آگے کنجروں کا ایک نگلہ تھا جہاں کچھ مرد اور عورتیں بیٹھے سینکوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے۔ اول تو ڈولی کو ان لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور وحشت ناک حلیوں ہی سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ مگر دو دفعہ اُس نے یہاں ایک چھوٹے اور دوہرے بدن کی عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی پُرفن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں، اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اُس پر موٹے موٹے حرفوں میں "نامناسب" اور

"مشتبہ" لکھ دیا تھا۔ مگر جو اِن ہی اوصاف کے سبب سے قابلِ توجہ بن گئی تھی۔ ڈولی نے لاری سے سر نکال کر اُسے بار بار دیکھا تھا، اور آج بھی وہ اُسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی، مگر جب لاری وہاں سے گزری تو بنگلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لیکن ڈولی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی، اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی طرف متوجہ ہو گئی.....

مگر صرف ایک چیز تھی جسے وہاں پانے کے لیے وہ پہلے سے تیار نہ تھی، اور جسے وہاں پا کر اسے تعجب ہوا۔ یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چاروں طرف پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت اونچی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا، اور چند مزدور ٹوکریاں لیے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی —— ایسے اڈے پر ایک مکان بن رہا تھا جس کی اینٹ اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈولی کا دِل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے۔ سیلی ہوئی مٹی کی بھینی خوشبو سونگھنے اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سنے —— اس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو جاڑے کی اُن شاموں کی طرف لے گئی جب اسکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دُھواں ہلکے ہلکے اُٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا، اور بیرونی دُنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور مسحور خطہ بن جاتا تھا، اور وہاں کی رہنے والی مقید شہزادیوں کی کھلی ہوئی بانہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آ کر لگتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو، اور کندھے اور سینے تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی گم گشتگی اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضا تھا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ ہی جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سُوٹ والا لڑکا اُدھر سے گزرتا تھا —— جب تھوڑی دُور سے بھی اچھی طرح شکل پہچاننے میں نہ آتی تھی، مگر وہ چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا، قریب ہو کر چلتا تھا اور ڈولی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ تین دن کے اندر ہی ڈولی کو اُس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی اور وہ بھی اس کے انتظار میں چار دیواری کے قریب سے قریب ٹھہرے رہنے اور کم سے کم ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ معلوم وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ

صرف یہ کہ اس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا ہو، بلکہ اس کا چہرہ بھی ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ جب ڈولی کی نگاہیں اُس سے مل جاتی تھیں تو ان آنکھوں کی پر تفکر اداسی ایک مختصر ترین لمحے کے لیے اُس کے دِل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی۔ نیلے کوٹ میں سے اُس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہوتے تھے، اور اُس کے چمک دار بالوں اور پر متانت چال کے تصور نے اُس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا — وہ گرمیوں میں بھی آتا رہا تھا اور جاڑوں کی دُھندھ ہٹ جانے کے بعد اب اس کے ہونٹ بھی صاف نظر آنے لگے تھے۔ جن سے اُس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اس کے دِل کی حسرت ناک ٹپکتی تھی۔ وہ آج بھی یقیناً آئے گا مگر میدان کو بالکل خالی پا کر بہت مایوس ہو گا۔ وہ کس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہے گا اور ہر لمحے اس کی مایوسی بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ دو تین دِن برابر آئے گا مگر آخر اُس کی امید بالکل ٹوٹ جائے گی... اس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دِل میں بار بار ٹھونگیں سی مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی! جب وہ گزر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں میں گھر جا رہی ہے، یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اُس کو اتنی شدید مایوسی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا... شاید وہ اسے اپنی کوئی یادگار دیتا۔ مثلاً وہ اپنا رُومال چار دیواری کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہوتا، اور وہ اُسے پکار کر کہتی۔ "ذرا سنیے... کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتی، کیوں کہ اس کا چہرہ خود اس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چار دیواری کے پار چلا آتا اور دونوں کسی چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہ گیر بھی نہ چل رہا ہوتا اور میٹرنیں وغیرہ سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا، اور اسے پیار کرتا... مگر سینما میں تو اُس نے دیکھا تھا کہ گالوں کے بجائے ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا ہے... اس لیے فلم کی ہیروئن کی طرح اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ فلمی ہیرو کی طرح اُس کے ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے... خود ڈولی اپنے جسم کو اس سے جس قدر قریب ممکن تھا، لگا دیتی اور اپنے گوشت میں اُس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی... گرمیاں یکایک جاڑوں میں بدل جاتیں، اور ہر طرف

سے دُھواں اُٹھ کر انہیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمیوں کی شام کی واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف دینے والی عامیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں کی پُراسراری، ابہام اور ماورائیت لے لیتی۔ بتدریج تاریک ہوتے ہوئے لمحوں کی بے دود گریزپائی وہیں کی وہیں جم کر رہ جاتی۔ وہ ایک دُوسرے سے اپنا جسم لگائے ہوئے پیار کی باتیں کرتے رہتے، یہاں تک کہ اُن کی یکجائی کا ایک ایک لمحہ ابدیت سے ہم کنار ہو جاتا.... بخارات کی طرح دھجی دھجی ہو کر اُڑتے ہوئے اندھیرے سے جدوجہد کرنے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے معصوم، آمیزش و آلائش سے پاک، اور مصفاو منزہ معلوم ہونے لگتے — جیسے آدم و حوا عرشِ بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے دن.... بہجت و مسرت کی اس فراواں منظری کے ساتھ ساتھ ڈولی کے تحت الشعور میں طرح طرح کے تہدید آمیز خدشے اور دغدغے جڑ پکڑ رہے تھے۔ جب وہ اپنے تخیل کی سحر کاری سے اچھی طرح لطف اُٹھا چکی اور کسی بچی بچائی چیز کے کھوج میں ذرا سا رُکی، تو وہ فتنے اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال اسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اسے نظر نہ آیا تو — ؟ ممکن ہے وہ اس دوران میں کہیں باہر چلا جائے، یا اتنی دُور مکان لے لے کہ وہاں سے آنا مشکل ہو جائے، یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سوٹ کسی اور سڑک پر نظر آیا کرے۔ اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد اسے ڈولی پسند نہ رہے، اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پھیر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے اور کیا خبر کہ وہ شروع ہی سے ڈولی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو اور محض تفنن طبع کے لیے اُس سے نظر بازی کرتا رہا ہو اور اب اس مذاق سے اُس کا دِل بھر جائے....
اگر وہ نہ آیا تو ڈولی کی دُنیا کیسی ویران ہو جائے گی۔ کھیل ویل میں اس کا بالکل جی نہ لگے گا، وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی، مگر ہر دفعہ اُس کی نگاہ کسی خوانچے والے یا کسی بڈھے ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آجایا کرے گی۔ چند دن تو رات تک ٹہل ٹہل کر وہ انتظار کرے گی، مگر پھر اس کا دل اتنا رنجیدہ اور بیزار ہو جائے گا کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی۔ وہ جھنجلا جھنجلا کر اپنے ہونٹ چبایا کرے گی، اور بولنا بالکل کم کر دے گی....
اسے چاہیے تھا کہ پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اسے یاد تو کر لیا کرتا، مثلاً وہ دیوار کے اُس طرف کوئی چیز گرا دیتی، اور اس سے دوستانہ مگر انکسار کے لہجے میں کہتی: "مہربانی سے ذرا اسے اُٹھا دیجئے۔" جب وہ اُٹھا کر دیتا تو وہ مسکرا کر اُس کا شکریہ ادا

کرتی اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے چند لمحے ٹھٹکی رہتی، اور کئی دفعہ متشکرانہ اُس کی طرف دیکھتی۔ تب تو یقین تھا کہ وہ اس کے دِل میں جگہ پا لیتی، اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا..... یا پھر کسی دن ہمت کر کے اور ساری دُنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کے وہ اسے روک لیتی اور پوچھتی: ''کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟ کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں، یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پروا سے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟..... میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہتی ہوں، یہاں تک کہ میرا سر مارے درد کے پھٹنے لگتا ہے۔ کلاس میں بیٹھے بیٹھے بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکی ہوں۔'' وہ خاموشی سے سنتا رہتا اور آخر کہتا..... مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا! — یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ دونوں سامنے بیٹھے ہوتے اور وہ اس سے شرماتے ہوئے کہتی: ''آیئے، لَو، لائک، ہیٹ (Love, Like, Hate) کھیلیں..... میں سلیٹ کے ایک طرف کسی کا نام لکھ دوں گی اور آپ کو دکھاؤں گی نہیں، آپ دُوسری طرف Love یا Like یا Hate لکھ دیجیے۔'' وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی، جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو Hate لکھ دیتا اور کبھی Like اور جب وہ اسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے اور آخر میں وہ اپنا نام لکھتی اور بے چینی سے اُس کے لکھنے کا انتظار کرنے لگتی۔ وہ سلیٹ پر Love لکھ دیتا، اور جب سلیٹ اُلٹی جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگتی، مگر اس کے دِل میں خوشی کا دَریا اُمنڈ آتا اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے اور پھر وہ..... مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا؟ یا اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا؟ — ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اسے پسند نہ آئے ہوں..... کیسا اچھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا اُدھر سے گزرے تو وہ امی کا سا ریشمی فراک پہنے ہو — سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا، جس کے گریبان پر خوب صورت سی بو بنی ہوئی تھی..... امی نے بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھایا تھا، اور وہ اس کپڑے کی قیمت دو روپے گز بتا رہی تھی..... دام تو بہت زیادہ ہیں..... مگر ایسا بھی کیا ہے..... جب وہ گھر پہنچے گی تو اس کی ماما کہیں گی: ''ڈولی، دیکھو تمہاری آنٹی نے آگرے سے تمہیں فراک بھیجا ہے۔'' اور جب وہ فراک نکال کر لائیں گی تو وہ بالکل ویسا ہی ہوگا..... یا پھر وہ یوں کہیں گی: ''تمہارے پاپا دلی گئے تھے، وہاں انہوں نے ٹکڑوں والے کی دکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ انہوں نے سوچا کہ ڈولی کے لیے لیتا

چلوں- بڑا سستا مل گیا ہو- بس ایک فراک کا ہی تھا-" وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی، اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہی سبز پھولوں والا ہو گا.... وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا تراشوائے گی، اور گریبان پر سیپ کے نیلے بٹن ٹکوائے گی- جب وہ اسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہوگی- وہ اس دن دوپٹہ بالکل نہ اوڑھے گی- اول تو دوپٹے سے ساری خوب صورتی چھپ جاتی ہے، دُوسرے دوپٹہ کیا ہوتا ہے، عذاب جان ہوتا ہے ہر وقت سنبھالتے رہو- ہاتھ اِدھر اُدھر ہلاؤ تو پھنس جائے- مسلمان سے لگنے لگتے ہیں دوپٹہ اوڑھ کر.... یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے: باہر جاؤ تو دوپٹہ اوڑھ کر جاؤ- ساڑھی نہ پہنو، میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ.... وہ میٹرن ایک چڑیل ہے، ذرا سامنے سے کھسکنے نہیں دیتی- گرجا سے لوٹتے ہوئے کتنی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر چلے- مگر میٹرن نے ایک نہ مانا اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کن سوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو.... اور ہاں، ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں- وہ رنگ برنگ کی ساڑھیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں دس بجے- یہاں صبح پانچ بجے ہی اُٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے- اٹھنے میں دیر کرو تو ایک چیخ پکار، آفت- چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ- یہ بھی تو نہیں کہ اس کے بدلے ایک تکیہ ہی زیادہ مل جائے- وہاں تو الٹی میٹرن صاحبہ چلاتی ہوئی آئیں گی: "اس مہینے میں گھی بہت خرچ ہوگیا مجھے دکھا لیا کرو روز-" اور پھر اُوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی ضدیں: "وہ لیں گے ہم، وہ بڑی ہے-" کام کے وقت تو پڑی سوتی رہیں، اور جب سب ناشتہ واشتہ تیار ہوگیا تو چلیں نخرے کرتی ہوئیں- یہ جی چاہتا ہے کہ بس دھمک دے اٹھا کے، اور کچھ نہ کرے- یہ سب ہنگامہ ختم ہوچکے تو پھر چلو اسکول، وہاں الگ مصیبت: سوال کیوں نہیں کیے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کچھ کیا بھی جائے- پلنگ پر پڑ کے بھی تو چین نہیں ملتا- حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز سنائی نہ دے.... اور ہاں، اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو کھانا پکاؤ- اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو، میلے میلے، الجھے ہوئے سر، جنہیں چھونے کو بھی جی نہ چاہے، بیٹھے کُریل رہے ہیں انہیں .... کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے تو میم صاحب ساتھ انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی آگے آگے پکارتی چلتی ہیں: "پلیز کم ٹو می-" (Please come to me) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دُہراتی ہے- اگر میم

صاحب نے سُن لیا کہ کسی نے "کھم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اُس کے پیچھے ہیں، جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اُس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آجاؤ.... اس کے مقابلے میں گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں جیسے کپڑے، جی چاہتا ہے، پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک.... اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیسا مزا رہتا۔ وہ اطمینان سے سو سلا کر اُٹھتی تو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی اور اس کی کہنی باہر نکلی رہتی۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اُڑتی جاتی، اور ساری دُنیا اس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی.... مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں کے پانچ روپے لیے جاتے تھے، حالاں کہ یہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی.... فیس زیادہ سہی، مگر اس کا وہاں داخل ہونا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا.... گھر جا کر وہ پاپا سے کہے گی کہ وہ گورنمنٹ گرلز اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ پاپا تھوڑے سے اصرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکیٹ لینے اسکول جائے گی، وہاں اُسے ایمی ملے گی.... ایمی کتنا بنتی ہے، دیکھو تو زرد، دُبلی پتلی، جسے بھوکوں ماری بلی اور اپنے آپ کو خوب صورت سمجھتی ہے بھلا! اسٹیشن پر کیسا بن بن کر چل رہی تھی۔ ٹرین میں سے ہر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دیوانہ ہی تو ہوگیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی، اُن کی قیمتیں بتائے گی، طرح طرح سے یہ جتائے گی کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے، اور سب دُوسروں کی معاف ہے۔ اسٹیشن پر بھی جب دُوسری لڑکیاں ملائی کی برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں ریشمی رُومال ہلاتی ہوئی اسٹال پر گئی تھی اور ایسی آواز میں کیک اور لیمنیڈ مانگا تھا کہ سب سن لیں.... ایمی اس سے پوچھے گی: "سرٹیفکیٹ کیوں لے رہی ہو تم ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے جواب دے گی: "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں جا رہی ہوں!" ایمی اُس کی طرف رشک سے دیکھتی رہ جائے گی، اور وہ وہاں سے کندھے اور سر اُٹھائے چلی آئے گی، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی۔ پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول جایا کرے گی — اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، روز طرح طرح کی ساڑھیاں پہن کر — کپڑوں کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ دراصل وہ سبز

پھولوں والے فراک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لیے ارادہ کر لیا کہ جب وہ پہلے پہل فراک پہنے گی تو اُس دن نہا کر اچھی طرح بال بنائے گی، ان میں گلاب کا پھول لگائے گی، چہرے پر سیل کھڑی (جو اُس کے ہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) ملے گی، اور جوتے کو پالش سے خوب چمکا لے گی۔ اسی دن وہ اپنے چار آنے والے بندے بھی نکالے گی جن میں اُودی گولیاں لگی ہوئی ہیں، پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کر لے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ جمیلہ کے یہاں جائے گی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ راستے میں اُسے طاہر، ایوب اور دیپ چند ملیں گے۔ اُن کی یہ ہمت تو نہ ہوگی کہ اُس سے کچھ بولیں، مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگیں گے۔ آنکھوں سے ایک دُوسرے کی طرف اشارے کریں گے، اور اُن میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دُوسروں سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ اُن کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ اُس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزری چلی جائے گی۔ تاہم اُس کا دِل بلیوں اُچھل رہا ہوگا، اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑپھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مُسکراہٹ کو روک سکے گی۔ سقّے کی شبراتن بھی اُس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہوگی۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر بڑی متعجب ہوگی اور آہستہ سے پکارے گی۔ "ڈولی!" اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلُائے گی، مگر ڈولی اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مُسکرا دے گی اور آگے بڑھتی چلی جائے گی اور جمیلہ تو بالکل مبہوت رہ جائے گی۔ وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی، اور اُس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا۔ وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی۔ جیسے اپنے تنگ پائنچوں کے پیجامے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے گی، اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اس کی اماں بھی مُسکرا مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھیں گی، اور فقرہ چست کرنے کی فکر میں کہیں گی: "افوہ، آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو ڈولی!" پھر جمیلہ کی بھی زبان کھلے گی: "ہاں ڈولی! آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو۔" وہ اس دن جمیلہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اُس کے فراک پر دھبہ لگ گیا تو؟ — وہ بس ایک جگہ جا کر پلنگ پر بیٹھ جائے گی اور تھوڑی ہی دیر میں چلی آئے

گی یہ کہہ کر: "اچھا، اب تم کام کرو گی، میں چلوں"..... وہ جمیلہ کو بتائے گی: "اسے "بو" (Bow) کہتے ہیں۔" وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی اور کئی انگریزی لفظ بولے گی جنہیں سن سن کر جمیلہ بہت مرعوب ہوگی اور شرم کے مارے ان کا مطلب بھی نہ پوچھے گی، بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں وہ سب سمجھ رہی ہے.... بالکل جاہل ہے جمیلہ بھی پاؤڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا۔ اُردو تک تو آتی نہیں اُسے۔ اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت وہ کہ ہم لوگ بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کپڑے تو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اس کے کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں، اور ان میں سے پسینے کی بو آتی رہتی ہے۔ بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر ان میں کنگھی ہی کرلے.... شاید عید کے دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو۔ اب کی عید کو اُس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جا کر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں، مگر وہ اس خیال سے رُک گئی کہ کہیں اسے ندیدہ نہ سمجھا جائے.... اس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سویاں آئی تھیں، اور اگلے دن جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا: "تم کل نہ آئیں، ہم تو تمہارا انتظار کرتے رہے۔ آتیں تو ہم تمہاری دعوت کرتے".... جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر بن بلائے نہیں جایا کرتے.... وہ اب کے کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی، اور انگریزی میں رُقعہ لکھے گی جسے ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جاسکتا ہے۔ رُقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے گی، اور پوچھے گی۔ "کیا ہے یہ؟" تب وہ اسے مطلب سمجھائے گی.... لیکن جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں.... تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابا سے کہے گی کہ وہ اسے جانے دیں۔ اس کے کہنے سے وہ اسے اجازت دے دیں گے۔ پھر جمیلہ آئے گی، رات کو برقع میں لپٹی لپٹائی سمٹتی ہوئی۔ وہ اسے کرسی پر بٹھائے گی۔ جمیلہ کو میز پر بیٹھ کر کھانا عجب معلوم ہوگا اور وہ کچھ سٹ پٹا سی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اُس کی طرف چمچہ بڑھائے گی۔ "لو لو، چمچہ سے کھاؤ۔" جمیلہ بڑی شرمندہ ہوگی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گی۔ وہ جمیلہ کو فلموں کے قصے، اسکول کے کھیلوں کا حال اور میم صاحب کی باتیں سنائے گی جو اُسے پریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہوں گی جہاں کی سیر کا وہ خیال تک نہیں کرسکتی۔ خصوصاً یہ سن کر اُسے بڑی حیرت ہوگی کہ فلم دکھانے سے پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل میں تعجب کر رہی ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک بڑھاتے ہوئے کہے گی: "لو کیک لو.... یہ

کیک ہے، انگریزی ہوتا ہے یہ، اِسے انڈوں سے بناتے ہیں۔" وہ یہ بھی پوچھ لے گی۔ "تم نے چاکلیٹ کھائی ہے جمیلہ؟..... انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ..... اِتی بڑی بڑی تختیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی مزے دار ہوتی ہے۔ ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی ہیں"..... وہ اسے یہ بھی سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنا ہنستی ہیں، گاتی ہیں، مذاق کرتی ہیں، اور کیسا کیسا لطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے گی اور کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے گی..... وہ جمیلہ کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا —"

ایک مٹھی ریت آکر اس کے چہرے پر اِس بُری طرح گرا کہ اُس کی آنکھیں اور منھ کرکرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی اور درخت دیوانہ وار ہل رہے تھے۔ آسمان گرد سے بالکل اَٹ گیا تھا، اور خالی کھیتوں میں دُور دُور تک بگولوں نے اٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا، گویا انہوں نے ایک دُوسرے سے شرط بد رکھی تھی۔ برے کی طرح چکر بناتے ہوئے اُوپر چڑھنے کے باوجود ان کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جاسکتا تھا مگر نیچے گرنے میں اُن کی سستی، ٹھیراو، نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابل برداشت تھی۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے معلق ہو جاتے تھے گویا انہوں نے بالکل ہمت ہار دی ہے، اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ اُن کی کاہلی دیکھ دیکھ کر ڈولی اپنے آپ سے تنگ ہوئی جا رہی تھی، اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیشے پر مکا مارے یا کوئی ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اُس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے، صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پار تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب قریب بچھی ہوئی نظر آتی تھی، خشک اور تر کا یہ میل گنجی چاند کی طرح ایسا گھناؤنا تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کھیت اس کے پیٹ میں سے اُٹھ کر حلق میں اڑ گئے ہیں اور اُسے قے سی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت اُس کی بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر کی طرح اُڑتے ہوئے آتے تھے جیسے اس کے دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں گے، مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے بچ کر نکل جاتے تھے۔ ڈولی اُس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اُس کا سر پھوڑ دیں، مگر اس کے لیے یہ پُر فریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا، اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا، اُس کی آنکھوں کے ڈیلے جل رہے تھے، اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے اُلٹی چبھن ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے اور اتنے لوگ ایک ساتھ مل کر بول

رہے تھے کہ لاری منارۂ بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز دُوسرے سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ارے جناح، جناح.... جناح نے تو وہ کیا جو...." چند آدمی کسان.... کسان.... "کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے، مگر دُوسرے آدمی اُن کی بات کاٹ کر خود بھی "کسان.... کسان...." کہنا شروع کر دیتے تھے۔ ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کر دے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لفظ ضرور آ کر اس کے مغز میں ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ غوں غوں، غوں غوں مچا رکھی تھی جس کی دُھن پر چکر کھاتے کھاتے اُس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا اور گرا پڑا رہا تھا.... اُس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی، مگر اس کے پپوٹے اب ڈلوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اُس نے ہرچہ بادا باد کہہ کر اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا، اور بالکل بے حرکت ہو گئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا حصہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چمک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا، اور اس کی آنکھیں آخر بند ہو گئیں.... نیند میں ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھن بھناہٹ صاف سُن رہی تھی، مگر وہ اس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اسے لوری دے رہی تھی، اور دوسری مداخلتوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس سے زیادہ اسے زمان و مکان کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ کسی لطیف شے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی، بلکہ محض ایک شناخت، صرف ایک خیال — "میں" — باقی رہ گئی تھی۔ اُس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی باقی تھی۔ جس میں کبھی کبھی پھیکی سی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھن بھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے۔ صرف ایک دفعہ اسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا تھا جسے اس نے پہچان لیا تھا کہ آیرین کا ہے۔ مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا اور اندھیرے کی روانی پھر اسی طرح جاری ہو گئی تھی....

لاری کے ایک دھچکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ لاری ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت کٹی کاٹ رہی تھی اور دُوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اُٹھا اُٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اس کے

پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا درد تو اب اچھا ہو گیا تھا مگر سر بھاری تھا اور آنکھیں نیند کی وجہ سے اچھی طرح کھل نہ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کچھ زکام سا بھی ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا ہے، اور اس کے بجائے ٹھوڑی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اُس نے گردن اکڑا کر انگڑائی لی، اور سڑک کے نظاروں میں دِلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اُس کی گرانی کچھ دُور ہو جائے۔
گاؤں سے تھوڑی دُور آگے ایک بچہ روتا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چُپ ہو گیا، اور اس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے کُرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اُوپر اٹھا لیا اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد دوپٹہ دانتوں میں دبا رکھا تھا، اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈولی کو اس کے پیلے پیلے دانت پسند نہ آئے اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ وہ گویا ہوا میں معلق تھے، اور ایک تعجب خیز ہم آہنگی کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے.... مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصنوعی دِلچسپی کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی اور اسے یقین ہو گیا کہ اپنا دل بہلانے کے لیے اسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور واقعوں کو رَد کر دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ صرف "غزل الغزلات" ہی سے اس کی کار برآری ہو سکتی ہے جس سے اس کا تعارف برنس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائیبل لیے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اُس سے کہا تھا۔ "تم نے یہ دیکھا ہے ڈولی؟" اس نے "غزل الغزلات" کا ایک صفحہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخن کاٹنے لگی تھی اور جب ڈولی کو بھی اس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ ان دونوں نے پوری "غزل الغزلات" کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا، اور ڈولی نے اکیلے میں بھی، یہاں تک کہ اسے کئی مزے دار حصے یاد ہو گئے تھے، اور اس کے کتنے ہی ویران اور آزردہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے.... اس دن کہ جب اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اُس کی طرف دیکھنا ہوا چاہتا ہے، وہ رات کو پلنگ پر لیٹی ہوئی دیر تک اُن حصوں کو یاد کرتی رہی تھی۔ اُس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں، بانہیں تکیے کے دونوں طرف پھیلا کر اُلٹی لیٹ گئی تھی، اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کی پوری قوت سے دبایا

تھا، جس کی ہلکی سی کسک میں اسے انتہائی لطف ملا تھا.... ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کہیں لاری میں اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا — جیسے وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ عریاں کرنے والی ہو۔ اس کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ ایک ایک، دو دو جملے دُہرانے شروع کر دیے تاکہ وہ ہر ایک سے پوری طرح فیض یاب ہو سکے.... ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابھی اُس کی چھاتیاں نہیں اٹھیں.... تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں.... تیری ناف گول پیالہ ہے.... وہ اپنے منھ کے چوموں سے مجھے چومے.... میرا محبوب جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے....
میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے، میرے لیے دروازہ کھولو میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری!.... دیکھ تو خوب رُو ہے۔ دیکھ تو خوب صورت ہے....
اُس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے، اور اس کا داہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے....
اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں جب ایک دن فریڈی کہانیاں سنتا سنتا اُس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات بھر اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی اور اسے بڑی گہری نیند آئی تھی۔ اس لیے اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب کے چھٹیوں بھر فریڈی کو اپنے پاس سلائے گی.... ایسے ہی جب ایک دفعہ برنس اُس کے ساتھ سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگلے دِن عیسائیوں کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لیے وہ دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں، اور انہیں پھر صبح سویرے اٹھنا تھا۔ برنس کا تو اتنا برا حال تھا کہ اُس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی بلکہ ڈولی کے ساتھ ہی سو رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہو گئیں۔ مگر پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ اُن کی بانہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں اُلجھ گئیں.... صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں، اور انہیں اپنی کیفیت دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ مگر اُن کے سینے مسل رہے تھے اور ان گلگلے پن اور نرماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک دُوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اُٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرما اور لجا نہیں رہی تھیں۔ بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو.... وہ دونوں جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب تھے۔ ان کے بعد مرد، پھر عورتیں، پھر لڑکیاں، اور آخر میں پھر مرد۔ وہ اور برنس دونوں ایک ہی لائن میں چل رہی تھیں، اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے

باتیں کرتی جاتی تھیں۔ سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے، اور گانے کے ٹکڑے لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کے دو دو تین تین کے مجموعے ایک دُوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں، اور مشین کی طرح اُٹھ اور گر رہے ہوں.... ہاتھوں میں میخیں گاڑ کر سولی پہ چڑھا دیا.... یسوع نے تیرے واسطے اپنا لہو بہا دیا.... اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا: یشیو یشیو من میں آ جاہ ہم کو بچا جاہ پاک بنا جا.... یہ گانا اُسے اچھا تو معلوم ہوتا ہے، لیکن خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو؟ اسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا، جو ہاکی اسٹک لیے سائیکل پر جا رہا تھا، جلوس کو دیکھ کر اُتر پڑا تھا، اور اُس کی طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے پان سے سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنسا تھا تو اسے اتنی نفرت ہوئی تھی کہ اس نے دوپٹہ سر اور چہرے پر کھسکا لیا تھا، اور بہت دیر تک خاموش نیچی نظریں کیے ہوئے چلتی رہی تھی.... ہاں ایمی جلوس کے دِن بڑی خوش رہتی ہے، اسے اپنے کپڑے اور خوب صورتی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں.... اس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی اُس کی چاپلوسی کرتی ہیں یہاں تک کہ وہ مشن کا ولیم سنگھ بھی۔ آج بھی کہ جب وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ایمی کی خوشامد میں لگا رہا تھا اوروں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکالنے پر بھی ٹوک دیتا تھا، مگر ایمی سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھر رہی تھی اور وہ اسے ایک لفظ نہ کہہ رہا تھا.... اور اب تو وہ اپنے آپ کو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آئرین نے اسے بتایا تھا کہ ایمی کو اب کے فرسٹ آنے کی اُمید ہے۔ کہیں آئی نہ ہو! اب تک ہمیشہ ڈولی فرسٹ آتی رہی ہے، اور اس دفعہ تو مس جونسن نے اسے اپنے گھر بُلا کر پڑھایا تھا.... بہت ہی اچھی ہیں مس جونسن! ان کا جوان ہنس مکھ چہرہ، اور اس پر سنہری عینک، کتنا خوب صورت معلوم ہوتا ہے، اور اس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر اسی کو دیتی ہیں اور اس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ امتحان کے قریب بے چاریوں نے خود اُسے بلا کر پڑھایا تھا، اور اس سے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی اُن کے پاس پڑھنے آیا کرے۔ ایک دن جب وہ ان کے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی، وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں.... جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوب صورت معلوم

ہوتی ہیں کہ اُس کا جی چاہتا ہے کہ ہلکے سے اُن کا گال چوم لے۔ کتنی مرتبہ اس کے دِل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اُن سے کہہ دے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انہیں اپنے سینے سے لگالے اور اپنے بازوؤں میں لیے رہے، مگر وہ ہر بار شرما شرما کر رہ گئی ہے اور ان سے اپنے دِل کا راز نہیں کہہ سکی ہے.... ایک مرتبہ وہ اسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں۔ وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی.... اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے.... ان کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی، ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لیے ترستی ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے، اسکول والے کم بخت ذرا بھی نہیں نکلنے دیتے۔ ایمی سے "اچھوت کنیا" اور "پکار" کی تعریف سُن کر اس کا کیسا کیسا جی لوٹا ہے کہ کسی طرح اسے بھی دیکھنے کو مل جائیں، مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی.... اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا مل جائے.... وہ مس جونسن ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے.... یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن کلاس میں بیٹھی وہ پڑھ رہی ہو اور یکایک اس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آ کھڑے ہوں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہوں گے، اور ان کے سنہری عینک لگی ہوگی۔ لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر ان کی طرف دیکھیں گی، اور یہ بوجھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور پھر پڑھنے سے ان کا دِل اُچاٹ ہو جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی۔ وہ اس سے کہیں گے: "ڈولی، میں ابھی ابھی آ رہا ہوں۔ آج کل یہاں "اچھوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما۔" وہ خوشی خوشی تیار ہو جائے گی اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اُن کے ساتھ سینما جائے گی.... جوزف بھائی کے سنہرے بال کیسے چمکتے ہیں، اور ان کے گورے رنگ پر نیلا سوٹ تو بہت ہی سجے گا.... وہ سینما ہال میں بیٹھی ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہوگی، اور اتنی خوش ہوگی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا — بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے، — جسے ایمی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے، کس موقع پر گایا جاتا ہے۔ گھنٹی بجے گی اور ہال میں اندھیرا چھا جائے گا، اور پھر پردے پر....

سامنے وہ سفید دھرم شالہ نظر آ رہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آ گیا ہے۔ اس علم کے تقریباً ساتھ ساتھ اسے وہ نیا مکان زمین میں سے ابھرتا دکھائی دیا جو اڈے

پر بن رہا تھا، اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین کے باہر نکل آیا۔ اس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی۔ مگر اب اس میں کچھ تمکنت، خود اختیاری، اور تفکر کا سکوت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ اب وہ خواہ مخواہ گن گن نہ کر رہا تھا۔ بلکہ اس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیروں میں کھینچ لیا تھا۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا اور اس میں سے چھت بہت اونچی نظر آ رہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر اتنا اُونچا کر دے کہ اندھیرا اسے ڈھک لے.... ڈولی نے اپنا اُوپر کا جسم اٹھا کر لاری کے باہر پھینک دیا جو شیشے میں سے سورج کی کرن کی طرح آسانی سے نکل گیا اور ڈولی کی طرف منہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ گویا نصف مجسمہ تھا، حالاں کہ اُس کے رنگ میں سنگ مرمر کی سی روشنی نہ تھی۔ بلکہ اُس کے رنگ زندگی کے رنگ تھے۔ یہ مجسمہ بالکل عریاں تھا۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی، مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا۔ خصوصاً اس کی کنپٹیوں کے پاس کے حصے اب اتنے ابھرے ہوئے نہ رہے تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ترتیبی نہ تھی بلکہ وہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ میانہ وار اُوپر سے نیچے آ رہے تھے۔ پیشانی بھی کشادہ تھی، اور اس کی متین لمبی پلکیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھیں بھرے بھرے، صاف شفاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شانوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں، جو بے داغ، نرم گلابی رنگت کی، موزوں، متناسب، بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی گدگدی سے پُر جوش نہ تھیں، بلکہ ان سب سے اونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام، قرار، جمالیاتی غور و فکر، اس سے متنج سرشاری اور عبودیت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے"....

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لیے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اس کے یہاں کیا ہو رہا ہو گا.... شاید ماما گبرڈن کا سایہ پہنے جھاڑو دے رہی ہوں.... شاید پاپا بزار سے لکڑیاں لے کر آئے ہوں اور ماما ان پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بھیگی ہوئی آواز میں آنٹی کی خوش نصیبی کا تذکرہ کر رہی ہوں، اور اس کے مقابلے میں اپنی.... مگر ڈولی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گزارے جا سکتے تھے،

خیالات کی اس روش سے مکدر کر لے، چناں چہ اُس نے نئی ریل چڑھائی.... فریڈی اپنا نیلا نکر اور ہری قمیص پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہو گا۔ وہ اسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا.... پاپا ابھی دورے سے واپس آئے ہوں گے، اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ وہ پوچھیں گے۔ "ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر انہیں بتائے گا: "ڈولی بوا آگئیں پاپا!" وہ کہیں گے: "تو آگئی، بیٹی ڈولی؟" اور وہ جواب دے گی: "جی ہاں، پاپا".... ماما باورچی خانے میں اس کے لیے کوئی اچھی سی چیز تیار کر رہی ہوں گی۔ آواز سن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی: "آگئیں لو ڈولی بھی! میں تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہو گی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں، شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمہیں روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈولی بوا کے آنے میں کتنے دن رہ گئے.... اور آج تو صبح ہی سے تیار پھر رہا تھا".... ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اسے بتائیں گی کہ اُس کے پاپا اُس کے لیے ایک چھوٹی سی سفید بلی لائے ہیں جس کی اُسے بڑی خواہش تھی....

سوچنے کو تو وہ سوچے جا رہی تھی، مگر ویسے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے۔ پھر بھی وہ اس آخری تنکے سے چمٹی ہوئی تھی اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اُس کے دِل پر چرکا سا لگتا تھا اور اس کے گلے کی رگیں چٹ پٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دُور ہے مگر اسے اس کے خلاف ناقابل تردید شہادتیں ملے چلی جا رہی تھیں۔ وہ اُمید کر رہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکلی چلی جائے گی اور پھر کبھی نہ رُکے گی۔ یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ مگر یہ علم اس کی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز، رکاوٹوں کو توڑتی، کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو۔ اور اسے قصبے کے اڈے پر کھڑا کرے گی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اُس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی جھنجھناہٹ پر خود ہی مست ہو ہو کر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی اور اسے ڈولی کے جذبات کی مطلق پروانہ تھی۔ ڈولی بے چاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے دشمن بنے ہوئے تھے اور اسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے.... آخر

اُس نے ایک گہرا سا سانس لیا اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا....

اڈے کے قریب پہنچ کر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اُس کی اُمید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے، ورنہ کم سے کم تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے، مگر جلد ہی کلچ ایک دُرشت کڑ ڑ کے ساتھ بولا اور انجن رُک گیا۔ ڈولی کے کانوں میں خاموشی بھربھرانے لگی، اور اُسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دُنیا ڈوبی جا رہی ہے — سب لوگ لاری میں سے اُتر رہے تھے، مگر وہ ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آکر اُس سے پوچھا کہ "ابی سامان چلے گا؟" تو اس نے ٹھنسے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد "ہاں" نکالا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو، اور آخر کار اُس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لیے تیار کر لیا ہو....

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اُتروا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اسے اس خیال سے بے چینی ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت ڈولی کو اُس وقت اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیا نہیں کر رہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اسے ان کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے۔ اس لیے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدھم ہو گئی تھی اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً سرسرائے جا رہی تھیں، زمین کا غبار اُٹھ اُٹھ کر آسمان پر پھیل گیا تھا، اور اس نے آسمان کو گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی ایک دبیز چادر پر سورج کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی، اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ اُلٹا اور دُھول میں اٹا جا رہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے اُن کے ساتھ دغا کی ہو، اور اب اُن میں گلے شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو....

ادبی دُنیا۔ جنوری ۱۹۴۲ء (نومبر ۱۹۴۱ء)

اندھیرے کے پیچھے

اُسے جس کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا تھا اور اس کی تمام جلدی بالکل بے نتیجہ رہی تھی۔ جب اُس کا روٹی پکانے کا نمبر ہوتا تو ہمیشہ یہی ہوتا تھا اور آج تو گوشت کا دن ہے۔ دس دن تک ارہر کی دال کو آلوؤں سے تبدیل کرتے کرتے لڑکیوں کی بھوک بالکل خراب ہوگئی تھی۔ یوں تو یہ پرہیز ایک ہفتے سے پہلے کبھی بھی نہ ٹوٹتا تھا مگر اس دفعہ شہر کے گوشت کے بارے میں ہیلتھ آفیسر کی غیر تسلی بخش رپورٹوں نے اُس کی مدت میں تین دن کا اضافہ کردیا تھا۔ دراصل نئی مس صاحب کو جو ابھی امریکہ سے آئی تھیں، اپنے اِنسٹی ٹیوٹ کی لڑکیوں کی صحت کا بہت خیال تھا۔ جب انہیں ناخونوں کی مٹی تک کی اتنی فکر پڑی رہتی تھی تو یہاں تو معاملہ اور بھی گہرا تھا۔ اور آخر انہیں کیوں نہ فکر رہتی؟ وہ کوئی روپے کے لالچ سے تو ہندوستان آئی نہ تھیں کہ بس اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھیں اور مُردے کے مفاد کو نظرانداز کردیں۔ وہ تو جیسا کہ وہ اکثر بتایا کرتی تھیں، امریکہ کے ایک مرحوم لکھ پتی کی اکلوتی وارث تھیں، اور یسوع کی مُحبّت اور اس کے دین کی خدمت کا جوش انہیں سات سمندر پار گھسیٹ لایا تھا اور چیزوں کے ساتھ وہ امریکہ کی "Eat More Fruit Association" کی سرگرم کارکن تھیں، اور حیواناتی غذا کو ترک کردینے کی دل و جان سے قائل، گو انہیں اپنے مشرب کی اشاعت کا شوق مجنونانہ حد تک تھا مگر افسوس کہ اُن کے فواکہاتی نظریوں کے مقابلے میں اِنسٹی ٹیوٹ کا فنڈ بڑا رجعت پسند واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں پر اپنی مخصوص ریاضت عائد کرنے میں بھی انہوں نے مسیحی نرمی سے کام لیا تھا اور لڑکیوں کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا رُوحانی کرب اور اپنے ضمیر کی اذیت قبول کرلی تھی۔ ان کے وسیع مطالعے اور ایک عمر کے تجربے نے بھی انہیں یہی سکھایا تھا کہ گناہ گاروں کو آہستہ آہستہ سیدھی راہ پر لانا ہی آخر میں زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اس

لیے انہوں نے ہیلتھ آفیسر کی رپورٹوں کی آڑ میں پہلا اصلاحی قدم اٹھایا تھا، مگر بیماروں نے اپنی روایت کی پوری پابندی کے ساتھ معالج کے نشتر کے نیچے تلملانا شروع کر دیا تھا۔ روزِ موعود کے ملتوی ہو جانے کا حکم سُن کر لڑکیوں کے منھ کھُلے کے کھُلے رہ گئے تھے، اور وہ کچھ سوچتی ہوئیں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ ان کے قدموں نے شام کو باورچی خانہ کی طرف تیزی سے اٹھنا چھوڑ دیا تھا، اور طعام نامے سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود وہ آدھی آس اور آدھی یاس کے ساتھ روزانہ پوچھتی تھیں: "کیا پکا ہے؟" وہ بڑے ڈھیلے ہاتھوں سے رکابی پکڑتی تھیں، اور آدھا تہائی کھا کر ہی کھڑی ہو جاتی تھیں۔ آخر روزہ کھولنے کا دن آگیا تھا اور ان میں نادانستہ طور پر زندگی کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ جیسے جیسے افطار کا وقت قریب آتا جاتا تھا، ان کی آنکھوں کی تڑپ اور گالوں کی پھڑپھڑاہٹ زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کھانا پک چکنے پر تو وہ بھوکے چیونٹوں کی طرح آ چپٹی تھیں۔ فیتھ نے اس خیال سے پہلے ہی آٹا زیادہ لے لیا تھا اور دوسری پکانے والیوں کو بھی یاد دلا دیا تھا، مگر پھر بھی اسے اور آٹا گوندھنا پڑا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ للی سر کے درد کا بہانہ کرکے کھسک گئی اور اسے روٹیاں بھی خود سینکنی پڑیں۔ دَم گھونٹنے کو پتھر کے کوئلے کا دھواں ہی کون سا کم تھا کہ اس میں لڑکیوں کی چخ چخ بھی شامل ہو گئی تھی — "اِتنا سا شوربا؟" — "ایک بوٹی تو اور دو۔" چھوٹی لڑکیاں خیر کریں تو کریں، مگر بڑی بڑیوں نے بھی تو یہی ضدیں لگا رکھی تھیں۔ اس نے تنگ آکر پوری کی پوری دیگچی ان کے سامنے رکھ دی تھی اور آخر جب وہ کھانے بیٹھی تو دیگچی میں صرف چند پھیچھڑے، کچھ ہڈیاں اور دھوون جیسا شوربا باقی بچا تھا۔ اُس نے غصے میں سارے پھیچھڑے اور ہڈیاں کتوں کے سامنے پھینک دی تھیں اور جلتے بھنتے روٹی حلق کے نیچے اتاری تھی۔ اُسے اپنی قابلیت اور دیانت داری کی بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی، کیوں کہ لڑکیوں کے اس ریوڑ میں انتظام قائم رکھنا ناک سے آگ نکالنے والے بیلوں کو جوتنے سے کم نہ تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ جیسے کئی دن سے ہو رہا تھا ایسے ہی آج بھی کام دھندے سے جلد فراغت پاکر رات کی تاریکی چھا جانے سے پہلے پہلے کمرے میں پہنچ جائے، تاکہ شام کے دھندلکے کی روشنی میں بستر اچھی طرح بچھا سکے۔ لیکن وہ اس تمام جھاڑ جھنکار سے اپنے آپ کو نکالنے میں آسانی کے ساتھ کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ اندھیرے نے اس سے بازی جیت لی تھی اور جب وہ کمرے میں پہنچی تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور دلدلوں کی زہریلی گیسوں کی طرح فضا میں منڈلا رہا تھا پہلے پہل تو

اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا بھر گیا کہ وہ یہ بھی نہ معلوم کر سکی کہ اس کا پلنگ کدھر ہے۔ اندھیرے کے چکروں نے سمتوں کے شعور تک کو مسخ کر دیا تھا، اور ہر چیز، ہر خیال، ہر احساس بے طرح گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اگر فیتھ سے پوچھا جاتا کہ اس کا ہاتھ کہاں ہے تو اسے یقیناً اپنے چاروں طرف ٹٹولنا اور اپنے دماغ پر زور ڈالنا پڑتا۔ لیکن اندھیرے کی زرد چتیوں کو اپنی آنکھوں سے گھیر گھیر کر اُس نے انہیں اپنے بستر پر اتار ہی لیا۔ اسکول نے فیتھ کو اپنا کمرہ صاف رکھنے پر ایک بائبل دے کر اُس کی رُوح کو بالکل انعاموں کی زر خرید لونڈی بنا دیا تھا، بلکہ اگر کوئی چیز اس سے بھی بدتر ہوتی ہے تو وہ بھی۔ وہ ہر وقت اپنی جان اسی فکر میں گھلاتی رہتی تھی اور انتقامانہ سرگرمی سے جھاڑ پونچھ اور اُلٹ پلٹ میں مشغول نظر آتی تھی۔ گویا زندگی کی ساری ذمہ داریاں اُس کے کندھوں سے اٹھالی گئی تھیں اور ان سب کی بجائے ایک "اہم ترین" فرض اُس کے سپرد کر دیا گیا تھا: اس کوٹھی کا ناچ اس کوٹھی میں کرتے رہنا۔ اس وقت بھی کہ جب اندھیرا مکڑی کے جالوں کی طرح انگلیوں میں پھنسا جاتا تھا اور مخاصمت آمیز شرارت کے ساتھ اسے اپنا کام نہ کرنے دے رہا تھا، اور جب کہ اسکول کی عمارت کے قریب لگے ہوئے کھمبے کی روشنی، جو پہرا دینے والے سنتری کی طرح اپنے مقرر حلقے سے ایک انچ آگے نہ بڑھتی تھی، دُور ہی سے کمرے کی فضا میں دل شکن بے بسی، لاچاری اور تنہائی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ فیتھ جھنجلا جھنجلا کر بستر کو اِدھر سے اُدھر کھینچ رہی تھی، بار بار اس پر ہاتھ پھرا رہی تھی، یہ دیکھنے کے لیے کہ بستر دونوں طرف سے برابر ہے یا نہیں، لحاف کی تہیں تو ٹھیک ہیں، چادر پر کوئی شکن تو نہیں رہ گئی۔ لیکن اسے خوب معلوم تھا کہ اس کی ان ساری احتیاطوں کا انجام کیا ہونا ہے۔ کچھ دیر بھی نہ گزرے گی کہ روڈا آندھیوں اور بگولوں کی طرح طوفان اٹھاتی آئے گی اور اس کے جھپیٹوں میں چادر تو الگ رہی، پلنگ کی چولیں ہی سلامت رہ جائیں تو بہت جانو۔

اپنے بستر کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اس نے چاہا کہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹال کر اپنی چھوٹی بہن کا بستر بھی کھول دے۔ لیکن شیلا! یہ آٹھ سال کا چیتھڑا بالکل ناقابلِ اصلاح تھا۔ بس اسکول سے چھٹی ملی نہیں اور وہ پہنچی، دو چار لڑکیوں کو جمع کر کے پیڑوں کے نیچے کیلم کانٹی کھیلنے اور کپڑے خراب کرنے میں اُس نے خاص مہارت بہم پہنچائی تھی۔ یہاں تو لڑکیوں کو ہفتے میں دو جوڑوں سے زیادہ دھوبی کے یہاں ڈالنے کی اجازت نہ تھی، اور اس نے یہ حال کر رکھا تھا کہ کپڑے پہن کے نکلی ہے، اور چلی آ رہی

ہے تھوڑی دیر میں مٹی تھوپے۔ خیر اسے تو خود کپڑے دھو کر بھگت بھی لیا جائے۔ لیکن اس کے کپڑے پھاڑتے رہنے کا کیا علاج تھا۔ ابھی اسی سال میں اس کا ایک فراک تو دھوبی کے یہاں سے آئے ہوئے کپڑوں کو الگ الگ کرنے میں کسی لڑکی نے اڑا لیا تھا، اور دو نئے فراکوں کے دامن اس نے خود اپنی دھما چوکڑی میں چری بتی کر کے رکھ دیے تھے۔ اب وہ گھر جائے گی تو ماما الٹی اس پر بگڑیں گی کہ ذرا سا چھوٹی بہن کا خیال بھی نہیں رکھتی۔ چھوٹی بہن اپنا خیال رکھنے بھی دے! وہ بڑے شکوے کے لہجے میں، جیسے فیتھ کو اپنی ماں کو قلاش بنا دینے کا تہیہ کر لینے پر شرم دلا رہی ہو، کہیں گی: "یہ تو سوچو ذرا، بھلا میں کہاں تک ہر سال نئے نئے کپڑے بنائے جاؤں۔" وہ کئی دفعہ سوچ چکی تھی، اور ہر دفعہ اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے ہر سال نئے نئے کپڑے بنائے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے بعض پیٹی کوٹ تو تین تین سال پرانے تھے، اور وہ بلیزر کا نیلا کوٹ بھی دو سال تو یونس بھیا پہن چکے تھے، اور دو ہی سال سے وہ پہن رہی تھی۔ ماما اس پر غور نہیں کرتیں کہ اگر وہ اتنی احتیاط نہ برتے اور چھوٹے پیٹی کوٹوں میں بھی لیفے بڑھا بڑھا کر کام نہ چلاتی رہے تو انہیں ہر سال کتنے کپڑے بنانے پڑیں۔ رائے تو انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کی لینی چاہیے جسے اپنے کپڑے اٹھا کے رکھ لینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔ یہاں آ کر دیکھیں ماما تو انہیں پتا چلے۔ چھٹی کے دِن صبح اُٹھ کر منھ بھی نہیں دھوتی، اگر اسے ٹیچر کا ڈر نہ ہو تو شاید کبھی بھی منھ نہ دھوئے، اور نہ کنگھا کرے اور یوں بالوں میں کنگھا پھیر لینے سے ہوتا بھی کیا ہے، سارے سر میں تو جوئیں بھتی رہتی ہیں۔ ایسی سے تو وُہی اُلجھے جس کے دماغ میں کیڑے ہوں۔ اگر اس کا بستر بچھا بھی دیا جائے تو کیا فائدہ؟ جب میٹرن ڈانٹ کر اُسے باہر سے بھگائے گی، تو وہ دھبڑ دھبڑ کرتی ہوئی آئے گی اور مٹی میں سنے ہوئے پیروں سمیت لحاف میں گھس جائے گی۔

شیلا کی بدعنوانیوں پر غور کرتے کرتے اس کی بیزاری اور خستگی آپ ہی آپ تحلیل ہوتی چلی گئی، اور اسے شیلا کے عیب ڈھونڈنے میں ایسا مزہ آنے لگا جیسے بچوں کو موٹی ناک والی بھدی بھدی تصویریں بنانے میں آتا ہے۔ چنانچہ جب وہ پنسل سے آخری خط کھینچ چکی تو اُس نے شیلا کی طرف سے اپنے دِل کو اتنا سخت نہیں پایا۔ دُوسرے باہر میدان میں جہاں سے لڑکیوں کے کھیلنے اور شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں، جانے کے خیال سے وہ ایک عجیب ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی اور کمرے میں ٹھہرے رہنے کا جلد

سے جلد کوئی عذر تراشنے میں ایسی کوشاں تھی، جیسے وہ اس غیر مناسب فعل کے لیے کسی کے سامنے جواب دہ ہو۔ شیلا کا بستر بچھانے میں اسے اتنا وقت ملنے کی اُمید تھی کہ مختلف بہانوں کے امکانات پر غور کرسکے، بلکہ خود اسے ایک بہانہ بنا لینے میں بھی کوئی خرابی نہ تھی۔ اتنی دیر میں وہ کمرے کی تاریکی سے کچھ مانوس تو ضرور ہوگئی تھی، مگر تھوڑی تھوڑی دیر میں اندھیرے کی ایسی رَو آ جاتی تھی جو آنکھ جھپکنے میں ہستی کی بنیادوں کو غرق کرلیتی تھی۔ اس کے دِل میں ڈر کا تو نام تک بھی نہ تھا، مگر دُور کمپاؤنڈ میں چمکنے والے بلب کی روشنی کے سامنے اور لڑکیوں کی پھلوں اور قہقہوں کے درمیان اندھیرا اس کے گرد ایسا محیط تھا جیسے کوئی جادو کا حلقہ، جس میں سے نکلنے کی، وہ محبوس ہونے کے احساس کے باوجود آرزو تک نہ کرسکتی تھی۔ چمگادڑوں کے سے جناتی پر اُبھرتے تھے اور وہ اُن کے کنارے بھی اچھی طرح نہ دیکھنے پاتی تھی کہ پھر ڈوب جاتے تھے۔ فیتھ اور آشنا چہروں کے درمیان اتھاہ اونچائیاں اور گہرائیاں حائل تھیں جنھیں عبور کرنے کے لیے کوئی بال جیسا باریک پل تک نہ تھا۔ اس کی ماما کا شفیق چہرہ اور مُحبّت بھری آنکھیں تک، جنھیں وہ اپنے تصور کی پوری روشنی پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کی تیرگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے کافی نہ تھیں جس کی ذی رُوح اور مدافعتوں کو خاطر میں نہ لانے والی کروٹیں اس کے بازوؤں کو ٹھوکے دے دے کر اسے مجبور کر رہی تھیں کہ وہ انھیں مصلوب یسوع کی تصویر کی طرح دونوں طرف پھیلا دے اور اپنے آپ کو حوالے کردے۔ اور وہ واقعی اس کے قریب آ رہی تھی کیوں کہ یہ گھٹے ہوئے آنسوؤں جیسا ٹھہراؤ اس کے لیے قابلِ برداشت نہ رہا تھا، اور کمپاؤنڈ میں چمکنے والے بلب کی روشنی کے سامنے اور شادمان و خورسند لڑکیوں کے بے فکر قہقہوں کے درمیان، اپنے گھر سے ساٹھ میل کے فاصلے پر الگ تھلگ کمرے کی بھناتی ہوئی تیرگی اور تنہائی میں وہ چاہتی تھی کہ اپنے جسم اور جان کی انتہائی قوت سے کسی چیز کو پکڑ لے.... آخر کار شیلا ایک ایسی چیز تھی جسے پکڑا جاسکے۔ وہ کپڑے پھاڑتی تھی، گندی رہتی تھی، زبان چلاتی تھی۔ یہ سب سہی، لیکن اس سے کیا؟ وہ ایک ایسی چیز تو تھی، جسے پکڑا جاسکتا تھا۔ جس کی طرف وہ اپنے اندر سے نکل کر اپنے وجود کی پوری شدت اور گہرائی کے ساتھ بڑھ سکتی تھی — جو اسے اندھیرے کی دُشت برد سے بچا سکتی تھی۔ اُس کی اپنی بہن، اس کا اپنا خُون! اتنی قریب، اتنی نزدیک! وہ نظام جو یک جا ہونے کے بعد اندھیرے کی تلاطم خیزیوں پر بھی ٹھٹے لگا سکتے تھے — ایسے محفوظ، ایسے مامون!.... اس اندھیرے

میں بھی سب کچھ کھویا نہیں گیا تھا۔ ہوا میں ایک روپہلا پن گندھا ہوا تھا۔ جس کی کرنوں کا عکس وہ اپنے دِل میں پا رہی تھی۔ شیلا کے بکھرے ہوئے بالوں والے چہرے نے گھر کی فضا کی اتنی جاذبیتیں اخذ کرلی تھیں کہ صرف اس ایک وجود سے کمرے کا خلا بھرا پُرا ہو گیا تھا۔ وہ اس کا بچھونا ایسی نرمی اور احتیاط سے کھول رہی تھی جیسے شیلا کے بچپن میں وہ اُسے سوتے ہوئے ایک پلنگ سے اُٹھا کر دُوسرے پر لٹایا کرتی تھی۔ پیشاب کی جھلیں تک اسے منغض نہ کر رہی تھیں، بلکہ بچھونے میں سے نکلی ہوئی روئی کو تو وہ ایسے ہلکے ہلکے تھپ تھپا کر اندر بٹھا رہی تھی جیسے شیلا کی چوٹوں کو سہلا رہی ہو۔

وہ اپنے آپ سے بے انتہا خوش تھی، اور خود کو بڑی دریا دِل، منصف مزاج اور ذی فہم محسوس کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک شیلا کے پلنگ کے قریب ٹھٹکی کھڑی رہی اور ایک خوش گوار بے خیالی میں اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھراتی رہی۔ لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے بستر پر بھی شیلا کی قربت سے اتنی ہی اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتی ہے تو اُس نے اپنے پیروں اور ٹانگوں کو اکٹھا کیا اور مڑ مڑ کر شیلا کے تکیے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے پلنگ پر آ بیٹھی۔ وہ شیلا کے تصور کو، جس کے دَم سے کمرہ منور ہو گیا تھا، کسی قیمت پر بھی الگ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اُس نے اپنی کہنیوں کو چھوٹے سے بچے کی طرح گود میں بھینچ رکھا تھا گویا وہ منجمد ہو کر اُن کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے، یا وہ ان میں چپک گیا ہے اور اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی ہوا اُسے چھٹا دے گی۔ اس تین سال کے عرصے میں جاڑے کی سختیاں بھی اُس کے دِل میں کمرے کے دروازوں میں کواڑ لگے ہونے کی ایسی زبردست تمنا پیدا نہ کرسکی تھیں جیسی کہ وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم سے کم دو گھنٹے تو اور لڑکیاں اندر نہ آئیں، اور وہ بغیر کسی مداخلت کے شیلا کے تصور کو نئے نئے رنگ اختیار کرتے ہوئے دیکھتی رہے، اسے اپنے دِل میں کلکاریاں مارتے ہوئے سنے، اس کے خشک بکھرے ہوئے بال نکھر جائیں۔ اُس کی میل سے اَٹی ہوئی گردن اور چہرہ چمکنے لگیں، اور شیلا اس کی محبت کی پوری طرح مستحق بن جائے تاکہ جو کوئی انہیں دیکھے وہ یہی کہہ اٹھے کہ "بس صاف تو یہ دونوں بہنیں رہتی ہیں!" اور اپنی بیٹیوں کے لیے انہیں مثالی نمونہ بنائے: "ان دونوں بہنوں کو نہیں دیکھتی ہو؟" اور شیلا کی ان ترقیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جائے۔

لیکن ساری تمناؤں کی بطالت کے ثبوت میں زہر خند، اتفاق، کی ٹاپیں باہر کھڑ نجے

پر گونج رہی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اگلے ہی لمحے میں کمپاؤنڈ کے لیمپ کی روشنی غائب ہوگئی اور دروازے کی تاریکی میں سے آنے والی آوازوں نے اُس کے آپہنچنے کی منادی کر دی۔ ''فیتھ! فیتھ! کدھر ہے؟'' وہ آوازیں کہہ رہی تھیں اور پھر جھنجھلاہٹ کے ساتھ ''کہاں جا چھپی ری؟''

لیکن اُس نے روڈا کو اس وقت تک نہ پہچانا جب تک کہ روڈا نے اُس پر گھٹنا رکھ کر اُس کے کندھوں کو نہ ہلا ڈالا۔ ''یہاں آ چھپیں!'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اور ہم ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ساری دُنیا میں۔''

گو روڈا نے اُس کی گود میں ہل چل ڈال دی تھی، مگر وہ اب بھی بچے کو ہاتھ سے دینے پر راضی نہ تھی۔ ''ہاں، میں وہ ذرا — '' اُس نے اپنی کہنیوں کو دوبارہ چھپاتے ہوئے بغیر کچھ سوچے جلدی سے بولنا شروع کر دیا، تاکہ روڈا کا دھیان بٹ جائے اور وہ اس کی گود کے راز سے واقف ہونے کی کوشش نہ کرے۔

''یہاں کیوں پڑی ہے تو اندھیرے میں؟ ذرا باہر واہر نکل جی نہیں گھبراتا تیرا؟.... اچھا! اب مَیں سمجھی!'' روڈا نے ایک پُرجوش فاتحانہ چیخ کے ساتھ کہا۔ ''تو کچھ کھا رہی تھی یہاں چھپا کے اندھیرے میں!.... کیوں ری ندیدی؟ صابونی لی ہوگی تو نے آج دوپہر خوانچے والے سے؟ ہمیں بتا دیتی تو کیا ہم کھا جاتے؟''

یہ الزام ان کریہہ ترین دھبوں میں سے تھا جس کا نشان تک فیتھ کو اپنے دامن پر گوارا نہ تھا۔ مدافعت کی فوری ضرورت نے اسے بالکل بیدار کر دیا، اور اس نے روڈا سے زیادہ ہواؤں اور کائنات کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اخلاقی پاکیزگی کے لہجے میں، جس میں روڈا کی فطری بدیقینی اور بدگمانی کی شکایت بھی ملی ہوئی تھی، کہا: ''لو بھلا مَیں کھا رہی تھی؟ میں بستر کرنے آئی تھی۔''

''بستر کرنے آئی تھی۔'' فیتھ کے بیان کو دُہراتے ہوئے روڈا کو اس کے خلاف ایک دلیل سوجھ گئی تھی۔ ''اتنی دیر میں ہوتا ہوگا بستر؟ چار گھنٹے میں؟''

''چار گھنٹے ہوئے ہیں مجھے؟ ابھی تو آ رہی ہوں روٹی کھا کر کچن سے تمہیں کیا خبر! کام نہ دھام، بس اپنے کدکڑوں سے مطلب!''

''جیسے مَیں.... کرتی نہیں ہوں کام؟'' اسے خود معلوم تھا کہ یہ ایک مستحکم مورچہ نہیں ہے۔

"بڑا اچھا کرتی ہیں کام! کچی پکی روٹیں تھوپ کے رکھ دیں، یہ ہو گیا کام!"

"اچھا چلو۔" روڈا کی یہ ایک کمزوری تھی کہ وہ کسی جھگڑے کو دیر تک نہ چلا سکتی تھی اور وہ اب اس قضیئے سے جو اس کی سدا بہار خوش مزاجی میں مخل ہو رہا تھا، تنگ آ چلی تھی، "تم ہی سہی بڑی کام من، اس کا کیا جھگڑا!" اور فیتھ کو یقین دلانے کے لیے اس کا مقصد کبھی بھی اُس پر الزام لگانا نہیں تھا، اس نے ارادی طور پر لہجے میں مذاق پیدا کرتے ہوئے کہا: "اب بتا دو تم کیا کھا رہی تھیں؟"

اب کے تو فیتھ اس پر برس پڑنا چاہتی تھی، مگر روڈا کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ہنسی نے اُس کے شبہ کو مٹا دیا اور اس نے اپنی غلط فہمی اور جلد بازی پر مجوب ہو کر روڈا کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا: "بڑی بڑی چیزیں کھا رہی تھی میں، تجھے تو نام بھی نہ معلوم ہوں گے اُن کے۔" اور پھر اسے وہ بات یاد آ گئی جسے وہ روڈا سے کہنے کو صبح سے بے چین ہو رہی تھی، اور ابھی تک موقع نہ پا سکی تھی۔ "ایک اور بات بھی معلوم ہے تجھے؟" اُس نے روڈا کی دلچسپی بڑھانے کے لیے پوچھا جس کی دِلچسپی ہر چیز میں دُوسروں سے ایسی ہی جداگانہ اور غیر معمولی ہوتی تھی، جیسی اُس کی غیر متناسب فربہی۔

جیسا کہ پہلے سے بتایا جا سکتا تھا، روڈا کو نہیں معلوم تھا۔

"رات بڑا مزا آیا۔" فیتھ نے وہ تعجب خیز بات سنانی شروع کی۔ "میری جو آنکھ کھلی سوتے سوتے تو کچھ کڑ کڑ کی آواز آئی۔ اب میں اِس اُس میں کہ یہ ہے کیا چیز۔ کبھی تو میں یہ سوچوں کہ باہر کوئی کتا ہے اور کبھی یہ کہ چوہا ہے۔ غور سے جو سنا تو بیولا کے پلنگ کی طرف سے آتی وی معلوم دی آواز۔ پہلے تو مجھے اندھیرے میں پتا نہ چلا پھر جو دیکھوں تو بسکٹ کھا رہی ہیں مس صاب! تکیے میں بھر رکھے تھے آپ نے بسکٹ اور چپکے چپکے نکال کر کڑ کڑ کر رہی تھیں۔ کل اُس کے گھر سے کوئی آدمی آیا تھا۔ وہ اُسے کلاس میں سے بلا کے لے گیا تھا۔ وہی دے گیا ہو گا بسکٹ۔ آپ نے رکھ دیے چھپا کے بچھونے میں کہ رات کو کھاؤں گی... پہلے تو میرے جی میں آئی کہ اُٹھ بیٹھوں، اور کہوں کہ بیولا، اکیلے ہی اکیلے! پھر میں نے سوچا ہٹاؤ... تو جاگتی ہوتی کہیں اُس وقت، روڈا!"

"مجھے نہ جگا لیا اُسی وقت۔" روڈا نے مصنوعی افسوس کے ساتھ کہا۔ "اچھا ایک کام کرو۔ آج جب بیولا سو جائے تو اُس کے تکیے کی تلاشی لو۔"

روڈا کے ساتھ اتنی دُور جانا فیتھ کے مان کا نہ تھا، بلکہ اسے تو اس میں بھی شبہ تھا

کہ روڈا، جسے آٹھ بجے کے بعد اپنے سر پیر کا بھی ہوش نہیں رہتا، خود اتنی دُور جا سکتی ہے۔ اس کے لیے یہ ضمانت کافی تھی، اس لیے اُس نے فوراً نیم سنجیدگی سے حامی بھرلی۔
"ہاں، ہاں، ضرور۔ رات کو!"

روڈا کی چلبلی رُوح اب اس موضوع سے بالکل سیر ہو چلی تھی۔ روح تو الگ رہی، اس دو منٹ کے قرار سے وہ اپنے جسم تک کو زنگ آلود سا محسوس کرنے لگی تھی، اپنی رگوں میں خون کو دوبارہ تیز کرنے کیلئے اُس نے فیتھ کے کندھوں کو پھر جھنجھوڑ ڈالا۔ "رات کی رات کو دیکھی جائے گی۔" اس نے ایسے بے چینی سے کہا جیسے فیتھ اپنی پیش کی ہوئی تجویز پر فوراً عمل درآمد کرانے کیلئے بیکار ضد کر رہی ہو۔ "بس اب اُٹھو۔ چلو باہر۔"

فیتھ کو معلوم نہیں تھا کہ خود اس کا دل کیا چاہتا ہے۔ یوں تو اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن وہ اتنی دیر انتظار کرنا چاہتی تھی کہ اس کے دل میں باہر جانے کی خواہش پیدا ہو جائے، اپنے آپ کو اتنا وقفہ دینے کے لیے اُس نے آواز کو غیر دلچسپ بناتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کریں گے اب باہر جا کے؟ رات تو ہو گئی۔"

لیکن روڈا ایسی چنگاری نہیں تھی جو پہلے ہی چھینٹے میں بجھ جائے۔ اُس نے فیتھ کو پہلے سے بھی دُگنے جوش و خروش کے ساتھ جھنجھوڑ ڈالا۔ "رات ہو گئی ہے تو کیا ہے؟ چل باہر ٹہلیں گے۔" اور جب اُس نے فیتھ کے اعضاء میں کوئی حرکت نہ پائی تو اپنی آستین سے ایک زیادہ للچانے والی ترغیب بھی نکال لی۔ "شیریں اور آئیوی پیپل کی طرف گئی ہیں ابھی ابھی۔ چل ان کے پیچھے چلیں، دیکھیں کیا باتیں کر رہی ہیں۔" اور اس نے محض ترغیب کو کافی نہ سمجھتے ہوئے ایک دھمکی کا بھی اضافہ کر دیا۔ "نہ چلی تو پھر وہیں نوچ لوں گی۔"

لیکن درحقیقت روڈا کو انتہائی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ اس کے ساتھ ہنسنے بولنے سے فیتھ کی تھکن اُتر گئی تھی، اور وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا اور تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ اب تو اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ باہر ہوا میں ٹہلے جو اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کو تو ضرور ٹھنڈک سے جما دے گی، مگر دل میں انبساط کی لہریں بھی دوڑا دے گی اور روڈا کے ساتھ ٹہل ٹہل کر باتیں کرے، گھاس پر ایک سرے سے دُوسرے سرے تک دوڑ لگائے۔ لڑکیوں کو اکسائے کہ چل کر لنگڑی پھماری کو چھیڑیں۔ اس لیے وہ روڈا کی دھمکی پر ہنستی اور چہکتی ہوئی فوراً اُٹھ تو کھڑی ہوئی مگر روڈا کو ممنون کرنے کے لیے اُس نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا۔ "دیر تو بہت ہو گئی ہے۔ خیر چلو۔"

جب وہ ایک دُوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے سائبان سے باہر نکلیں تو آنکھیں بند کر کے زندگی کی چہل پہل اور ریل پیل میں کود پڑنے کا عزم ان کے خون میں تلملا رہا تھا۔ شام کی ہلکی پھلکی اور نتھری ہوئی ہوا کا، جس نے ابھی تک جاڑے کی راتوں کی اپنے اندر غلطاں و پیچاں درشتی اور نشتریت جذب نہیں کی تھی، فرحت بخش سانس اُن کی ناکوں اور چہروں پر لگ رہا تھا اور ریڑھ کی ہڈی کے سہارے سہارے کمر پر پھیلا جا رہا تھا۔ حالانکہ کھمبے کے گرد روشنی نے آدھی رات کا سماں کر رکھا تھا، اور رات کے آبنوسی آسمان پر تارے غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ ٹمٹما رہے تھے، لیکن کچھ حصے پر ابھی تک شام کی معصوم اور یاسمینی روشنی کے نشانات باقی تھے۔ بلکہ بجلی کی زرد اور اکھڑ روشنی میں تو ایسی کراہت انگیز تنبیہہ برس رہی تھی کہ دل خود بخود ہٹ کر شام کی نزہتوں کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ فضا میں ایک وجد آور نغمے کی مبہم سرسراہٹ تھی، اور زندگی کی رنگ ریلوں میں گھل مل جانے کا ملائم مگر مضطرب بلاوا۔ جسم پر خالی فراکوں اور برہنہ پنڈلیوں کے باوجود دونوں لڑکیاں ذرا بھی نہ سکڑ رہی تھیں، اس کے بجائے انہیں اپنے اعضا پھیلتے اور بڑھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ گو فیتھ کے ساتھ دو قدم ہی تیز چلنے سے روڈا کا سانس پھول گیا تھا، مگر ایک مزے دار شام کی بے داغ مسرتوں کی توقع اُسے ڈھیلا نہ پڑنے دیتی تھی۔ فضا میں ہر طرف کسی لڑکی کے پھسل کر گر پڑنے پر قہقہے، کسی کے چور بن جانے پر خوشی کی چیخیں "اینا، مینا، مونا، مائٹ" یا "ہڈی گڈی، گو، آوٹ گو یو" کی آوازیں چلبلے بچوں کی طرح تڑپ رہی تھیں، جنہیں سن سن کر فیتھ بے قرار ہوئی جا رہی تھی کہ کسی طرح جلدی سے دوڑ کر کسی گروہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن ابھی وہ مسرت کے اُمید افزا بنج رنگ پانیوں میں ٹخنوں ٹخنوں بھی نہ پہنچنے پائی تھی کہ دفعتاً اس نے ایک مبہوت کن صدمے کے ساتھ دیکھا کہ درحقیقت اس کے پیروں کے نیچے صرف خوش آئند لیکن بے جان اور بے فیض ریت کی لہریں تھیں۔ شام کی درخشانی میں، ہوا کی لطافت اور نرمی میں ایک بلند و بالا علیحدگی تھی اور عظیم جدائیوں کی سی خوشبو بسی ہوئی تھی، جس کی پہلی ہی مہک سے فیتھ کی طفلانہ خوشی کملا گئی۔ اس کے چاروں طرف منقش کے سے مہین ٹکڑے فضا میں بہہ رہے تھے، مگر انہیں ہاتھوں سے جمع کر کے اپنے قریب کر لینے کا خیال دل میں آتے ہی وہ اتنی دُور ہٹتے معلوم ہوتے تھے کہ فیتھ کو جھینپ کر اپنے کندھے تک سکیڑ لینے پڑتے تھے۔ لڑکیوں کے قریب پہنچنے تک اس کا پہلا

ارادہ بجھ چکا تھا۔ مختلف گروہوں کی "یہاں آؤ، یہاں آؤ" کو چند لمحے بے اعتنائی سے سننے کے بعد وہ میدان کے خالی حصے کی طرف مڑ گئی اور اس کی بانہوں کی نکیل اور اُس کی پُر رمز خاموشی نے روڈا کو بھی بغیر کسی احتجاج کے اُدھر پھیر دیا۔ ممکن ہے وہ اسے روکنے کی خفیف سی کوشش کرتی، مگر فیتھ کی مختصر اور سنجیدہ "ادھر آؤ" نے اسے چُپ کر دیا۔ خون کے مدھم پڑتے ہی فیتھ کے ہاتھ سردی سے جمنے شروع ہو گئے تھے اور جاڑا برف کی پٹیوں کی طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بعض لڑکیاں تو صرف ہلکا سا بغیر بانہوں کا زیر جامہ ہی پہنے کھیل رہی تھیں، اور معمولی چھوٹے کوٹ سے زیادہ تو کسی کے پاس بھی نہ تھا، لیکن اسے اپنا چھوٹا کوٹ اتنا حقیر اور مضحکہ خیز حد تک بے مصرف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے لینے کے لیے اندر جانا اس کے خیال میں ایک فضول تکلیف تھی۔ وہ ادھر اس خیال سے آئی تھی کہ شاید گھاس کی بھیگی بھیگی خوشبو اسے آہستہ آہستہ اپنا دوست بنا لے، اور تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیوں کے پاس لوٹ آنے کے قابل ہو جائے، مگر کوئی یہاں آسمان دوسرا تھوڑے تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ ہوا اُس کی دائیں آنکھ کے نیچے ہلکے ہلکے گدگداتی ہوئی پھسلے، مگر وہ وہیں سے بچ بچ کر نکل رہی تھی۔ لمبی اور سیدھی ٹھنڈی سڑک اور سینما ہال کی چمک دار دیواروں کی طرح یہاں کی ہر چیز، یہاں تک کہ اندھیرا اور ہوا بھی، صاف اور بے عیب ترشی ہوئی، ہموار، منظم و مرتب، بے غرض، پُر تمکنت اور غیر شخصی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ ان سب چیزوں کے ساتھ یک جان و یک قالب ہو جائے مگر ان کی آب دار، نہ مڑنے والی ہمواری میں اس کے جسم اور رُوح کے پیچ و خم سے ہم آہنگ ہو سکنے کی کہاں گنجائش تھی۔ اگر وہ چار سال تک روزانہ سینما کی رنگین عمارت کے سامنے سے گزرتی رہتی، تب بھی وہاں کی روشنیاں، تصویریں، ہمیشہ دھڑکتی رہنے والی سڑک، اس کی منجمد لیکن متحرک بھیڑ — کوئی چیز بھی اس کی ضرورت محسوس نہ کرتی اور وہ سارے ہنگامے لاعلمی کے ساتھ، بے پروائی کے ساتھ، رواں رہتے۔
اس اندھیرے سے وہ دوسرا — گھر کا — اندھیرا کتنا مختلف تھا۔ وہ صاف ترشی ہوئی رَو کی شکل میں نہیں، بلکہ آوارہ مزاج بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح لاابالیانہ پن سے رُکتا رکتا، گھلتا ملتا منڈلاتا رہتا تھا، کبھی اس دروازے میں سے ہو کر اندر جا پہنچا، کبھی اس دروازے میں سے باہر نکل آیا، کبھی باورچی خانے میں جا گھسا — جیسے خاندان کا زندہ دل رُکن، جو دو باتیں یہاں کرے اور دو وہاں۔ اس اندھیرے اور لالٹین کی ملائم اور مانوس روشنی میں

یہاں کی طرح کوئی معاندت نہ تھی، تھوڑا سا اجالا دیتا تھا، تھوڑا سا اندھیرا۔ وہاں کی ہر چیز اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی ہر چیز اس پر منحصر تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے چلے آنے کے بعد اندھیرے تک نے اپنے آپ کو سُونا سُونا پایا ہو گا۔ وہاں کے خطوط کتنے لچک دار اور موم جیسے نرم تھے۔ وہ کسی شکایت کے بغیر اس کے مزاج کی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ بدل سکتے تھے۔ دیواریں اس کی خواہش کے مطابق خم دار یا سیدھی ہو جاتی تھیں۔ نیم کا گدا اتنا جھک آتا تھا کہ اگر وہ چاہتی تو اسے ہاتھوں سے پکڑ کے لٹک جاتی۔ یہاں تو وہ مصالحت کی شرط کے طور پر یہ خواہش پیش کر رہی تھی کہ دیواروں میں مبہم سا خم پیدا ہو جائے، ان کا پلاسٹر دو ایک جگہ سے اُکھڑ جائے، کھمبا مڑ جائے، کم از کم ذرا سا جھُک ہی جائے، مگر یہ چیزیں اپنی سختی اور باقاعدگی کو بغیر کسی گزند کے صحیح سلامت رکھنے پر اتنی مصر تھیں کہ وہ اس قسم کی کوئی شرط بھی سننے کو تیار نہ تھیں اور انہیں مصالحت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ فیتھ تو یہاں تک چاہتی تھی کہ ان سب کی بڑائی مان کر ان کا خیال ہی چھوڑ دے اور گھر کے اندھیرے میں جا بسے — اپنے آپ کو اور اپنی اس نو آبادی کو اپنے تخیل، اپنے خوابوں، اپنی ہستی کے پھیلاؤ کی شدت سے گھیر لے، ایک ناقابل تسخیر قلعہ بنا لے، مگر یہاں تو اس شہر کے اندھیرے کی لا شریک آمریت تھی، اُس کی قلم رَو میں رہتے ہوئے کہیں اور جا بسنا ممکن نہیں تھا۔ اس زمین پر ہر کھڑا ہونے والا اس شراپ میں گرفتار تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھے کہ اُس کے گرد کیا ہے اور فیتھ کے گرد کیا تھا؟ وہی غیر شخصی اندھیرا اور عمارتیں، وہی یرقانی روشنی، وہی بیزار کن شور و شغب اور لایعنی قہقہے، وہی پیڑوں کے سایوں میں چھپتے ہوئے لڑکیوں کے جوڑے۔ فیتھ کو دو لڑکیوں کے یوں چوروں کی طرح چھپتے ہوئے ساتھ ساتھ پھرنے اور سر ہلا ہلا کر شرماتے ہوئے نیچی آواز میں باتیں کرنے سے زیادہ لغو، مہمل اور تھکا دینے والی بات اور کوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ جب کبھی وہ ایسی دو لڑکیوں میں گھر جاتی تھی تو اُسے سارے وقت اپنے حلق میں ایک تلخ شیرینی کا احساس ہوتا رہتا تھا جس سے اُس کی زبان بالکل سیٹھی سیٹھی ہو جاتی تھی اور اسے بار بار تھوکنا پڑتا تھا۔ اور نہ اسے دُوسری لڑکیوں کی طرح سڑک کے قریب گھومتے رہنے یا ٹھٹک کر کھڑے ہو جانے میں کوئی خاص لطف آتا تھا۔ جب وہ لڑکوں کو اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مضحکہ خیز چھڑیوں کی طرح تن تن کر چلتے، یا لڑکیوں کو دکھانے کے لیے ندیدے پن سے سگریٹ پیتے دیکھتی، تو اُسے اُن کی ذہنی پچپاہٹ پر خود اپنے آپ سے شرم آنے لگتی تھی

اور وہ انتہائی کراہیت کے ساتھ ادھر سے منھ پھیر لیتی تھی۔ نہ سائیکل پر پیچھے دیکھتے ہوئے چلنے اور تانگوں سے ٹکرا جانے کا خطرہ مول لینے میں اسے کوئی فہم و فراست کی معراج نظر آتی تھی۔ ساری لڑکیاں ایسی ہی سستی اور چھچھوری چیزوں کی دُھن میں پڑی رہتی تھیں اور اس نے ان میں سے کسی کو بھی اپنی طرح دوپہر کو گڑھل کے سائے میں گھنٹوں خاموش بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ وہ روڈا کے سوا کسی کے بھی گلے میں بانہیں نہ ڈالتی تھی، اور وہ بھی روڈا کی زبردستی سے۔ روڈا کے پلپلے اور اپنے کو دوسروں کی نگاہوں میں ٹھونسنے والے سینے کے چھو جانے سے تو وہ ہمیشہ گھبرایا کرتی تھی، اور اس وقت تو وہ اس سے ایسی بچ رہی تھی جیسے روڈا نے اپنی فراک میں گیلی اور گلگلی چھچھوندریں بھر رکھی ہوں، لیکن روڈا کو اس وقت نہ معلوم کیا ہو گیا تھا کہ اُس کی الگ رہنے کی کوششوں کے باوجود اُس سے لپٹی جا رہی تھی اور فیتھ کو اپنے گلے میں سے ہاتھ نہ نکالنے دیتی تھی.... اُس لڑکیوں سے بھرے ہوئے میدان میں، روڈا کی بانہہ کے نیچے وہ اکیلی تھی — بے طرح اکیلی، نہ کوئی اس کا دم ساز تھا نہ محرمِ راز، نہ کوئی اس کی تنہائیوں کو کم کرنے والا۔ بس وہ اکیلی تھی — غیر شخصیت کے بے پناہ نرغے میں اکیلی! اگر اس کے درد کا تھوڑا بہت مداوا — بلکہ افیون — کوئی ہو سکتا تھا تو یہ کہ وہ اندھیرے کی اُڑان کو دیکھتی رہے جو اپنی بے اعتنائی میں اتنا ظالم تھا کہ ضرر رساں بھی نہ رہا تھا۔ اندھیرے کے گالوں کی ایک قطار ہوا پر آہستہ آہستہ ہار سنگار کی جھاڑیوں کی طرف کھسک رہی تھی، اور ان کے ادھر جا کر غائب ہو جاتی تھی۔ کیوں نہ وہ اندھیرے کے پیچھے پیچھے ہار سنگار کی جھاڑیوں کے اُدھر چلی جائے؟ کاش وہ جا سکتی، ہار سنگار کی جھاڑیوں کے پیچھے اس کے ساتھ نہ معلوم کیا واقع ہو، شاید کچھ بھی واقع نہ ہو، شاید وہاں "کچھ نہیں" کی ابدیتیں پھیلی ہوں — شاید ہار سنگار کی جھاڑیوں کے ادھر بے نام اور بے کنار گہرائیاں ہوں جن میں غرق ہو کر اندھیرا وہاں کی لامحدود وسعتوں پر حیرت کرنا بھی بھول جاتا ہو۔ بس وہ ایک لمبا کوٹ پہنے، متانت سے قدم اٹھاتی اندھیرے کے پیچھے روانہ ہو جائے، اور اگر روڈا روکنے کی کوشش کرے تو بغیر سر موڑے، وہ ہاتھ ہلا کر صرف تین فیصلہ کن لفظ کہہ دے "مَیں جا رہی ہُوں۔" اور روڈا مبہوت و بے حرکت کھڑی کی کھڑی رہ جائے۔ کاش کہ یہ سب ہو سکے!.... وہ عزم اور بزدلی کے درمیان ایک بال جیسے باریک تار پر کھڑی تھی، لیکن وہ اس تار کے شعبدے سے خوب آگاہ تھی کیوں کہ ساری کی ساری کشش ثقل بزدلی ہی کی طرف تھی۔

فیتھ اپنی دارو کے گھونٹ چڑھا رہی تھی اور وہ مجرب بھی ثابت ہوئی تھی۔ جب اس کا سر تھکن اور گرانی سے پھٹنے کے قریب ہوگیا تو یکایک اس اندھیرے کی فولادی دیواریں گل کر بیٹھنے لگیں اور وہ اس کے شگافوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے دل پسند اندھیرے میں جا پہنچی جس کے سائے میں وہاں کے مانوس و محبوب دروازے، دالان، نیم کا پیڑ اور خم دار دیواریں اسے میٹھی یادوں کی لوریاں دے دے کر جھولا جھلانے لگے۔ اس دوران میں خواہ اسے پتا نہ چلا ہو، لڑکیوں کی آوازیں بھراتی چلی گئی تھیں۔ اُن کے قہقہے کم اور بناوٹی ہوتے گئے تھے، کھمبے کی برقانی روشنی میں بخار کی آنکھوں کی سرخی آگئی تھی۔ مقیش کے ٹکڑے بالکل غائب ہوگئے تھے اور رات کی سردی اور تاریکی متوحش کن بنتی جا رہی تھی۔ روڈا نے کئی مرتبہ باتیں شروع کرنے کا ڈھب ڈالا تھا، مگر فیتھ نے اُسے ہوں ہاں میں اُڑا دیا تھا۔ آخر فیتھ کی بے وجہ مگر نہ ٹوٹنے والی خاموشی نے اُسے ہرا دیا، اور اس کے دل میں فیتھ کے لیے ایسی ہم دردی اور سخاوت کی سی لہر اٹھی کہ اُس وقت اُسے پریشان نہ کرنے کا ارادہ کر کے وہ بھی چپ ہو گئی۔ لیکن کون جانے پھول دار جھاڑیوں کے نیچے تالاب کتنا گہرا ہے۔

ابھی آٹھ بھی بجنے نہ پائے تھے کہ میٹرن نے اپنے کمرے سے نکل کر لڑکیوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔ ممکن تھا کہ آج فیتھ کی میٹرن سے جھوڑ ہو جاتی، کیونکہ اور بڑی لڑکیوں کی طرح اسے بھی یہ پسند نہ تھا کہ چھوٹی لڑکیوں کے سامنے اسے کچھ کہا جائے، بلکہ وہ تو شاید اسے بالکل ہی پسند نہ کرتی تھی لیکن روڈا نے میٹرن کی آواز سن لی تھی، اور اس نے فوراً ہی فیتھ کو خبردار کر دیا۔ "دیکھ بڑھیا نکل آئی، چل اندر چلیں۔" فیتھ چل تو پڑی مگر اُس کی آنکھیں ایسے بند ہوئے جا رہی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی بڑی گہری نیند سو کر اُٹھی ہو۔ روڈا نے اُس سے ذرا قدم بڑھانے کو کہا بھی، کیونکہ ممکن تھا راستے میں میٹرن سے مڈبھیڑ ہو جائے اور وہ کچھ کہنے لگے، لیکن وہ خود بھی چاہتی تو شاید اُس وقت قدم نہ بڑھا سکی۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہُوا کہ اسے کتنی سردی لگ رہی تھی۔ وہ تو اپنی بے خیالی میں کھونٹی سے کوٹ اتار کر پہننے لگی تھی مگر روڈا نے اسے یاد دلایا کہ اب تو لیٹنے کا وقت آگیا ہے، اب کوٹ پہننے سے کیا فائدہ۔ میٹرن اب بھی باہر چیخ چلا رہی تھی، اور کھیل سے لوٹتی ہوئی لڑکیوں کے جوتوں کی آوازیں سائبان اور کمروں کے دروازوں سے آ رہی تھیں۔ جو لڑکیاں آ پہنچی تھیں وہ جھٹک جھٹک کر پیروں سے جوتے اتار رہی

تھیں اور وہ کھٹ کھٹ فرش پر گر رہے تھے۔ برابر والے کمرے میں زور زور سے پلنگ گھسیٹے جا رہے تھے، اور آخری کمرے میں چند لڑکیاں جمع ہو کر بوڑھی میٹرن کی نقلیں اُتار رہی تھیں اور کمرے بھر میں اُچھل اُچھل کر ہنس رہی تھیں۔ جین میٹرن کی تھرتھراتی ہوئی آواز میں گھسیٹ گھسیٹ کر کہہ رہی تھی: "آٹھ کا ٹائم ہو گیا، ہم کہہ رئے ہیں، اور ابھی تک دوڑ لگ رہی ہے۔ نمونیا ہو گیا تو رونا پھر میم صاحب، میم صاحب، کرکے۔"

"تم تو کر چکی ہو گی اپنا بستر؟" روڈا نے اپنے بچھونے کا کونا کھینچ کر بے ترتیبی سے پلٹتے ہوئے طنز کے ساتھ پوچھا۔

فیتھ نے اس میں اپنی مستعدی اور صفائی کی تعریف محسوس کرتے ہوئے کہا: "اور کیا میں تیری طرح ہوں؟" اور اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی، خواہ وہ مرجھائی ہوئی سہی۔

"ارے ہمیں کون سا انعام لینا ہے۔" روڈا نے اس کے عملی ثبوت میں تکیہ نیچے گرا کر جھاڑے بغیر بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو پڑ رہنے سے مطلب۔" اور اس کے بعد اس نے ایسا مطمئن قہقہہ لگایا جس نے فیتھ کے آدرش کو خود اُس کی نظروں میں کم سے کم ایک لمحے کے لیے مضحکہ خیز بنا دیا۔

اپنا بستر کھول چکنے کے بعد روڈا اُس پر لڑھکنے ہی والی تھی کہ فیتھ نے اُسے روکا۔ وہ اندھیرے میں لیٹنے سے گھبرا رہی تھی، اور چاہتی تھی کہ کھمبے کی روشنی کم سے کم اسے نظر ہی آتی رہے۔ "ذرا تھم، تھم" اُس نے روڈا کو روک کر اُٹھتے ہوئے کہا: "میرا پلنگ پکڑوا دے دروازے کے قریب۔"

"دروازے کے قریب؟" فیتھ کی منطق اُس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ "ہوا آئے گی یہاں تو پھر پھر۔ جاڑا نہ لگے گا تجھے؟"

"تجھے کیا، تو پکڑوا دے۔"

"روڈا نے اسے جاڑے سے بھی زیادہ ڈرنے کی چیز سے خبردار کرتے ہوئے کہا:

"اچھا اور بیولا کا پلنگ؟ یہ تو یہاں اڑ رہا ہے۔"

"ذرا پیچھے کو کھسکا دے اسے۔"

"پیچھے کو کھسکا دے؟" روڈا نے فیتھ کے غبی پن پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"اور بیولا جو لڑے گی آگے۔"

"لڑے گی تو لڑنے دے۔" اس وقت فیتھ ساری باتوں کو مچھروں کی طرح بے پروائی سے اُڑا دینے پر مصر تھی۔ "تو پلنگ پکڑوا۔"

"لے پکڑوا رئی ہُوں۔" روڈا نے بیولا کے پلنگ کو ٹانگ سے پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا: "میرا کیا ہرج ہے۔ مَیں نہیں جانتی ہوں جو لڑائی وڑائی ہو۔"

"تجھے کون جنوا رہا ہے؟" فیتھ اپنی دُھن میں مست تھی۔ "تجھ سے تو نہیں ہوگی لڑائی؟"

فیتھ اور روڈا اپنے بستروں پر لیٹ کر تعجب کر ہی رہی تھیں کہ شیلا اور ویلری ابھی تک نہیں آئیں کہ باہر سے اس کے بنگلے پیروں کی دھب دھب اور شیلا کے دِن رات کے وظیفے کے بولوں کی آوازیں سنائی دیں۔ "کیا ہوا بھئی کیا ہوا؟ للا ہوا۔" اور اگلے چند لمحوں کے دوران میں ہی "پا، پگی، پوا، پوڑی، پیسا" دروازے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں پہنچ کر بھی شیلا رُکی نہیں، اس نے پورے انہماک سے اپنی مثنوی پھر سرے سے شروع کر دی۔ "کہاں چلے بھئی، کہاں چلے؟" گویا اس کے ہر لفظ کے دھماکے سے اندھیرے میں ایک سوراخ ہو جائے گا اور وہ اس روشنی میں اپنا پلنگ ڈھونڈ لے گی اور اُس نے اُس وقت تک سانس نہیں لیا جب تک کہ چوکی پر للا ہونے کی وجہ سے زیرہ لینے کے لیے بازار جانے کی ضرورت کے بیان سے لے کر للا کے رونے کی آوازوں تک نہ پہنچ گئی۔ فیتھ کو، جس کے کان اب تک پھٹ چلے تھے، خیال بھی آیا کہ شیلا کو بتا دے کہ اس نے بستر بچھا دیا ہے، مگر اسے اندیشہ تھا کہ نرمی کے ایسے بے موقع اظہار سے شیلا کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔ اس لیے اُس نے اپنی آواز میں حق اور عدل کی سختی پیدا کرتے ہوئے پوچھا: "کچھ بچھونے وچھونے کی بھی فکر ہے کہ نہیں؟ اب آئی ہیں بارہ بجے۔"

"اب بارہ بجے ہوں گے؟" شیلا نے بیولا کے پلنگ کی ٹکر سے بچتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو سب باہر پھر رہے ہیں، دیکھ لو چل کے۔"

"دیکھ لو چل کے! کیا دیکھ لو چل کے؟" فیتھ کوئی اس سے بھی سخت بات کہنا چاہتی تھی، مگر اسے تربیت اطفال کا یہ زرین اُصول اچھی طرح یاد تھا کہ چھوٹوں کے منھ نہ لگنا چاہیے، کیوں کہ اس سے وہ بدتمیز اور گستاخ ہو جاتے ہیں اور پھر کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ غصہ پی گئی، لیکن پھر بھی اس نے اپنی آواز میں احتیاط کے ساتھ خفگی ملاتے ہوئے گناہ گاروں پر اپنے خاص الطاف و عنایت کا انکشاف کیا: "چلو خیر، چل کے لیٹو۔

آج تو میں نے کر دیا ہے تمہارا بستر!"۔ جس میں یہ زیر لبی دھمکی بھی پوشیدہ تھی کہ یہ آخری مرتبہ تھا۔

اپنا بستر واقعی بچھا ہُوا پا کر شیلا کو ایسا قلبی اطمینان ہوا کہ اس نے مستقبل کے بارے میں فیتھ کی دھمکی سے بے پروا بننے کے لیے اپنا چرخا پھر چلا دیا۔ وہ کھڑی ہُوئی اپنے پلنگ کے بیچ میں زور زور سے پیر مار رہی تھی اور لہک لہک کر کہہ رہی تھی: "نام کیا بھئی جگ بگیا" — گویا اس مولود مسعود پر سب سے زیادہ خوشی اسے ہوئی تھی، اور خوشی کے اظہار کا اس سے زیادہ موزوں طریقہ ممکن نہ تھا۔ لیکن ویلری جو ہمیشہ کی طرح شیلا کے بعد داخل ہوئی تھی، ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

"شیلا کا بچھونا تُو نے کر دیا تھا، فیتھ؟" روڈا نے ویلری کو پلنگوں میں الجھتے ہوئے دیکھ کر کہا: "لاؤ اس بچاری کا میں ہی کر دوں۔"

"چل ری، پڑ چل کے۔" شیلا نے اپنے پلنگ سے پکارا۔ "ابھی مت لیٹیو۔ یہاں آ میرے پلنگ پہ۔ آم آم کھیلیں گے۔"

ویلری روڈا کی ایک آدھ دھول تو سہ بھی سکتی تھی، مگر شیلا کی صرف "اچھا دیکھا جائے گا" سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے تو وہ ذرا ٹھٹکی، لیکن وہ ایک لمحہ کی خاموشی سے اُسے ایسی بپھری ہوئی معلوم ہوئی کہ وہ چُپ چاپ کان دبائے شیلا کی پائینتی آ بیٹھی اور شیلا نے فوراً اپنی اور اُس کی مٹھیاں ایک دُوسرے کے اُوپر رکھ کر "آم والے آم دے" کہنا شروع کر دیا۔

پلنگ سے کمر لگاتے ہی فیتھ اور روڈا کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُن کے آدھے دھڑ کی جان نکل گئی ہے۔ تمام دن کی مشغولیت اور شام کو اتنی دیر ٹہلتے رہنے سے اُن کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور پنڈلیاں ایسی درد کر رہی تھیں کہ انہیں کسی کل چین نہیں پڑتی تھی۔ شیلا اور ویلری کی چیں چیں سے ان کے ماتھے کی دھڑکتی ہوئی رگیں اور پھُول آئی تھیں، مگر اب اُن میں انہیں منع کرنے اور ان کا ضدی انکار سُننے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ وہ تو خاموش لیٹی بھاری بھاری سانس لے کر اپنے جسم کو گرم کرنے اور سکون دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

شیلا نے اب اپنا کھیل بند کر دیا تھا، اور اُلٹی لیٹی ہوئی ویلری سے، جو اپنے پلنگ پر پڑے پڑے جماہیاں لے رہی تھی مگر شیلا کی مرضی کے خلاف سو نہ سکتی تھی، باتیں کر رہی

تھی۔ فیتھ کو اس کی کچھ خبر نہ تھی، وہ تو اپنے سر کی دھڑکنوں کو ایسے غور سے سُن رہی تھی جیسے انہیں گن کر حساب دینا ہو۔ ہاں روڈا، جس کی کمر میں کچھ مضبوطی آچلی تھی، کبھی کبھی گہرے سانس لیتے لیتے رُک کر ان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگتی تھی۔

"مَیں تو بس منہیار سے بیاہ کروں گی۔" شیلا کہہ رہی تھی "پھر تو میں بڑی اچھی چوڑیئیں پہنا کروں گی، بڑا مزا رہے گا اور تو کس سے بیاہ کرے گی ویلری؟"

"مَیں؟ ہاں مَیں...." ویلری نے جماہی روک کر سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "میں بھی کسی ایسے ہی سے کر لوں گی۔"

"تو تو پھل والے سے کر لیجئو ویلری۔" روڈا نے بچیوں کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا: "اپنا کھایا کیجئو خوب مزے سے کیلے۔"

"لو جی پھل والا!" شیلا نے ایسے طنز سے کہا جیسے روڈا اس کی جائیداد کے انتظام میں مداخلت کر رہی ہو، اور وہ بھی احمقانہ۔ "پھل والے سے تو بزاز اچھا۔ طرح طرح کے کپڑے تو ملیں گے پہننے کو۔ جین کرے گی بیاہ بزاز سے، وہ کہہ رہی تھی۔"

"اچھا، فیتھ سے پوچھو، وہ کس سے کرے گی بیاہ؟" روڈا چاہتی تھی کہ اب باتیں شروع ہو گئی ہیں تو کچھ دلچسپی ہی پیدا ہو۔

"تم رہنے دو بس بیاہ ویاہ کرانے کو۔ اپنا ہی کراؤ بس۔" فیتھ نے ایسی پیچ باتوں میں شامل کیے جانے پر چڑ کر کہا، اور پھر فوراً شیلا کی طرف مڑ گئی۔ "شیلا! اتنی رات آگئی اور تو ابھی تک باتیں بنائے جا رہی ہے۔ پھر سوئے گی دوپہر تک پڑی۔ اچھا ہے، صبح تیرا وار ہے، اُلٹے گی تیرا پلنگ آ کے ایولن۔"

"بڑا اُلٹنا!"

"کیوں نہ اُلٹے گی؟ کوئی وہ اکیلے کرے گی سارا کام؟"

"کرے چاہے نہ کرے۔ میں اُلٹنے دُوں گی اپنا پلنگ؟"

"دیکھ لیجئو صبح کو کہ اُلٹا جائے گا تیرا پلنگ کہ نہیں۔"

"ہاں ہاں دیکھ لوں گی!"

شیلا کو جھولے تو پہلے ہی سے آ رہے تھے، لیکن اب تو اُسے یہ طے کرنا تھا کہ وہ صبح کو کس طرح "دیکھ لے گی۔" وہ اپنے ناخونوں سے ایولن کا منہ نوچ سکتی تھی۔ بال کھسوٹ سکتی تھی، لاتیں مار سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنے انتقام کے سارے پہلوؤں پر پہلے ہی

غور کر لینا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش لیٹ گئی اور آخر تفصیلات مرتب کرتے کرتے سو گئی۔

بہت دیر تک کمرے پر مکمل خاموشی طاری رہی۔ صرف کبھی کبھی ایک آدھ آواز سنائی دے جاتی تھی، جس کے معنے یہ تھے کہ دوسرے کمروں میں بھی لڑکیاں سونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

آخر فیتھ نے چونکتے ہوئے کہا: "روڈا، تو لکھے گی گھر کو خط؟"

"کیوں، کیا تو لکھ رئی ہے اپنے گھر کو؟ ابھی تو بیس دن بھی نہ ہوئے ہوں گے تجھے خط لکھے۔ مہینہ بھر سے پہلے کیسے بھیجنے دیں گے تجھے مس ساب خط؟"

"انہہ، اس کا کیا ہے؟" فیتھ اس وقت ان دنوں کا صحیح شمار معلوم نہ کرنا چاہتی تھی۔ "تو بھی لکھ دے گھر کو خط۔ دونوں لے کے چلیں گے مس ساب کے پاس کہ ہمیں خط بھیجے مہینہ بھر ہو گیا ہے۔"

"مَیں نہیں لکھتی لکھاتی، تُو ہی لکھ۔ لو بھلا مس ساب کو خط دکھاؤ پہلے! میں تو نہیں دکھاتی اپنا خط کسی کو۔" روڈا نے اپنے اور دُوسروں کو بہکانے کے لیے خط نہ لکھنے کا یہ بہانہ بنا رکھا تھا۔ ورنہ اسے تو گھر خط لکھنے کا خیال بھی مشکل سے آتا تھا، اور نہ اُس کی ماں کو ہی اس کی خیریت معلوم کرتے رہنے کی ایسی بے تابی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اسے اپنے آٹھ آنے کی ضرورت ہو سکتی تھی، اور وہ اس کی ماں ہر مہینے ٹھیک وقت پر بھیج ہی دیتی تھی۔ دوسری لڑکیاں تو پیسے ملتے ہی لفافہ یا کارڈ لیتی تھیں مگر وہ اپنے پیسوں کے پن، سوئیاں، بندے، ریشم کی لچھیاں، اور ایسی ہی فضولیات خریدا کرتی تھی، اور پھر انہیں کبھی واپس نہ لینے کے لیے دُوسری لڑکیوں کو اُدھار دے دیتی تھی، یا اُنہیں صابونی اور کیلے کھلا دیتی تھی۔

"ہم نہیں دکھاتے ہیں کیا اپنا خط؟" فیتھ نے اسے پھسلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو دکھاتی ہے تو دکھا دے۔" روڈا نے آرام سے پھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم تو نہیں دکھاتے۔"

فیتھ کو خلاف معمول ایک نئی شرارت سوجھی جسے اس نے روکنا چاہا بھی مگر وہ رُک نہ سکی۔ اُس نے مذاق کی اناڑی اور بھدی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تو لکھتی ہو گی

ایسی ویسی باتیں؟ نکالی جائے گی تو یہاں سے بھی!" روڈا یہاں دو اور شہروں کے اسکولوں سے ہوتی ہوئی آئی تھی کیوں کہ وہاں کے منتظمین کی رائے میں اس کی ماں خانگی زندگی کا کوئی درخشاں مثالی نمونہ نہ تھی اور روڈا کے جراثیم سے دوسری لڑکیوں کے متاثر ہو جانے کا مہلک خطرہ تھا۔

"اجی نکال کے تو دیکھیں ذرا!" روڈا کے لیے اسکول سے خارج کر دیا جانا بھی ایسے ہی پرُلطف مذاق کی بات تھی جیسے کوئی اور۔ "چچا سے کہہ دُوں گی!" — یہ ایک بناوٹی تنک اور پھر ایک قہقہے کے ساتھ۔

فیتھ کو خود تعجب تھا کہ وہ اندھا دُھند اس رَو میں کیوں بہے چلی جا رہی ہے۔ "بڑے اچھے ہیں تیرے چچا؟" اُس نے روڈا کی باتوں کو گرمانے کے لیے کہا، کیوں کہ اس کے چچا — چچاؤں — کے ذکر سے زیادہ اس کی زبان کو رواں کر دینے والی چیز اور کوئی نہ تھی۔ درحقیقت اُس کے چچا دُنیا کی ہر نعمت کی طرح آنی جانی چیز تھے۔ شاید اُس کے نزدیک چچا کی تعریف یہی تھی۔ "وہ چیز جو بغیر کسی توقع کے آجائے اور جا کر پھر کبھی نہ آئے۔" وہ تعجب کیا کرتی تھی کہ اُس کے باپ کا خاندان کتنا وسیع اور دُور دُور پھیلا ہوا ہے، اور وہ کبھی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتی تھی کہ پردہ غیب سے کوئی نیا چچا ظہور پذیر نہ ہو جائے گا۔ وہ نہ معلوم کہاں سے یکایک ٹپک پڑتے تھے اور اُس کی ماں اُس سے اُن ہی مانوس لفظوں میں اُس کا تعارف کراتی تھی: "دیکھو روڈا! تمہارے چچا آئے ہیں!" اس کے بعد وہ پانچ چھ مہینے رہتے تھے، اپنی افتادِ مزاج کے مطابق روڈا کو پیار کرتے یا مارتے اور بات بات پر جھڑکتے تھے، اور آخر اُس کی ماں سے ایک گھراُلٹ جھگڑے کے بعد دُنیا کے دُوسرے کنارے کو چلے جاتے تھے۔ وہ ایسے کم سے کم چار چچاؤں کا تجربہ کر چکی تھی اور ان میں سے آخری اور موجودہ چچا کو تو وہ کچھ عرصے تک مسٹر ہیرلڈ کے نام سے جانتی رہی تھی، مگر آخر ایک دن اُن کا صحیح شجرہ نسب دریافت ہو گیا تھا۔

"میرے چچا کو کچھ مت کہیو۔" روڈا نے فیتھ کو مارنے کے لیے اپنا جوتا ٹٹولتے ہوئے کہا: "بڑے اچھے ہیں میرے چچا۔ مجھے تو گود میں بِٹھا بِٹھا کر پیار کرتے ہیں۔"

اس آتشیں رَو نے اب فیتھ کو مغلوب کر لیا تھا، اور اس کی گردن تپ رہی تھی۔ اُس نے لحاف کھول کر اپنی ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے کہا، اور اُس کی آواز ایسی پھنسی ہوئی تھی جیسے وہ آنسو روک رہی ہو یا ہنسی۔ "تو سنا روڈا، اپنی ماما کی کوئی بات۔" روڈا نے اپنے

پچھاؤں کا ایک عجیب اور بے سبب میلان دریافت کیا تھا کہ وہ اس کے سو جانے کے بعد، اور کبھی تو سوتے سوتے اُٹھ کر، اُس کی ماما سے کھسر پھسر باتیں کیا کرتے تھے، اور اُس سے غیر ضروری حدوں تک قریب ہو جاتے تھے۔ جب اُس کی ماما کو یہ احساس ہو گیا کہ اب روڈا اُس کی شبانہ مشاورتوں کے لیے اجنبی نہیں رہی، بلکہ ایک خاموش سامع تک ترقی کر گئی ہے تو اُس نے اُس کے سوتے ہونے کا یقین کر لینے کی فرسودہ رسم کو بھی اُڑا دیا تھا اور روڈا کا ضمیر بھی ان کارروائیوں کو اپنے تک محدود رکھنے کے بارے میں متردد نہ تھا — جو چیز اُس کی تھی وہ سب کی تھی۔ چنانچہ پیڑوں کے نیچے رات کو دیر دیر تک وہ لڑکیوں کو مبہوت بنائے رکھتی تھی، مگر ایسے مجموعوں میں فیتھ کو اب تک ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کرتا تھا جیسے اُسے گندی چکنائی کے گڑھے میں ڈبویا جا رہا ہو۔

"تو نہ سنا اپنی ماما کی کوئی بات!" روڈا نے معصومانہ چھیڑ کے ساتھ کہا اور کچھ اس خیال سے کہ انکار فیتھ کا اشتیاق اور بھڑکا دے۔

"میری ماما کی کیا بات؟" فیتھ کے نزدیک اپنی ماما اور روڈا کی ماما کا مختصر ترین لمحے کے لیے بھی ایک سطح پر رکھا جانا دُنیا کی شرم ناک اور ہتک آمیز بات تھی جس کے لیے وہ کسی کو بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ "میری ماما کوئی ایسی ہیں؟" اُس نے روڈا پر اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہوئے فخریہ کہا۔

"کیسی؟" فیتھ سے لطف لینے کے لیے روڈا سنجیدہ بن رہی تھی۔

روڈا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ "ایسی" اُن چیزوں میں ہے جنہیں اچھی اور صاف رہنے والی لڑکیوں کو مبہم طریقے سے سمجھ لینا چاہیے، اُن کی تعریف کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے اور وہ اس رَمز کو سمجھانے سے سمجھ تھوڑے ہی سکتی تھی۔ اس لیے فیتھ نے اپنی آواز کو زہر میں بجھاتے ہوئے کہا: "جیسی تمہاری ماما ہیں!"

"کیسی ہیں میری ماما؟" روڈا کے لہجے میں اب بھی ناراضگی نہ تھی۔

"ہوں گی کیسی ہی۔" فیتھ سے اب انتظار نہ ہو رہا تھا۔ "تو سنا کوئی بات، پھر دیر موئی جا رہی ہے۔"

"بھیا تو سنا پہلے! لے دیکھ لے۔ پھر میں سناؤں گی تجھے ایسی مزے دار بات کہ تو نے کبھی نہ سنی ہوگی۔"

وہ فیتھ کو زیادہ تنگ نہ کرنا چاہتی تھی، اور اس کے مسلسل خوشامدانہ اصرار سے

نرم پڑ چلی تھی۔ وہ کوئی چٹ پٹا واقعہ یاد ہی کر رہی تھی کہ سائبان کے فرش پر بیولا کے جوتے کی کیلیں بجیں۔ "لے وہ آ رہی ہے تیری نانی! اُس سے سینو۔" روڈا نے ایک نئے لطف کی اُمید پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"واہ ری وا۔" فیتھ نے اُس کی سنگ دِل بے پروائی پر افسوس کے ساتھ کہا "تونے یوں ہی وقت خراب کیا اور ضدیں لگاتی رہی۔"

بیولا جس نے داخل ہونے سے پہلے احتیاط کے ساتھ اپنی گردن اور ٹانگیں اکڑا لی تھیں، فیتھ کے پلنگ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اسے دیکھ کر روڈا نے چیخ کر کہا: "بتاؤ جی تم اتنی دیر میں کیوں آئی ہو؟ کیا کر رہی تھیں تم اب تک مارگریٹ کے پاس؟"

"تُو کون ہے پوچھنے والی؟ بڑی آئی ہے بن کے میری وہ!" بیولا روڈا پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت غصے میں ہے اور اگلے ہی لفظ پر منھ نوچ لے گی، تاکہ روڈا آگے نہ بڑھ سکے اور وہیں رُک جائے، مگر اُسی لمحے اُس کی نظریں اپنے پلنگ پر پڑیں، اور وہ حقیقی غصے سے تن تنا اُٹھی: "یہ میرا پلنگ کس نے ہٹایا ہے پیچھے؟"

فیتھ اور روڈا نے یہی طے کیا کہ چُپ رہنے سے زیادہ رُعب پڑتا ہے۔

"میں نہیں جانتی ہوں۔ کس نے ہٹایا ہے میرا پلنگ؟" بیولا نے دہرایا اور پھر فیتھ کے پلنگ کو دروازے کے قریب دیکھ کر: "یہ تو ہو گی فیتھ؟"

اب فیتھ کو بولے بغیر چارہ نہیں تھا، مگر پھر بھی اُس نے صلح جوئی کی کوشش میں کوئی خرابی نہ دیکھی: "ذرا سا پیچھے کو کر دیا ہے، تیرا کیا ہرج ہے؟ میرا جی گھبرا رہا تھا اندھیرے میں، میں نے دروازے کے قریب کو کر لیا اپنا پلنگ۔"

"جی گھبرا رہا تھا تو میں کیا کروں؟"

"کرو کیا، لیٹ جاؤ۔" روڈا نے صلاح دی۔

"میں تجھ سے نہیں بول رہی ہوں ری گدھی!" بیولا غضب ناک ہو کر چلائی۔

روڈا نے اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا: "نئیں بولتی میلی چھوتی چھی بلو؟.... لو مت، ہم جلدی چھے بلوا لیں گے۔" اور اُس نے بیولا کی کمر کو پیار سے تھپ تھپانا شروع کر دیا۔

بیولا تلملائی تو بہت، مگر روڈا کی گرفت میں اس کے دُبلے پتلے بازوؤں کی کچھ پیش نہ گئی۔ وہ چیختی چلاتی ہی رہی: "مَیں کاٹ کھاؤں گی.... سچ کہہ رئی ہُوں میں کاٹ کھاؤں

گی!" اور روڈا نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا اور بچوں کی طرح کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔

رات کے سناٹے میں بیولا کی چیخیں اور روڈا کے قہقہے میٹرن کے کمرے تک جا پہنچے تھے، اور وہ اپنی بوڑھی ٹانگوں پر سنبھلتی سنبھالتی، دُور سے پکارتی آ رہی تھی: "ہم کہہ رئے ہیں، یہ کیا شور و گل مچا رکھا ہے راتوں کو؟"

اندھیرے میں میٹرن کی کمزور آنکھیں ابھی تک دیکھ نہ سکی تھیں اور وہ کمرے کی چھت سے ڈانٹ کر پوچھ رہی تھی: "کیا دُند ہے یہ؟"

"یہ ہیں فیتھ اور روڈا!" بیولا نے روڈا کی گود سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"مَیں کیسے ہوں، مَیں کیسے ہوں؟" فیتھ نے اپنے آپ کو پھنستے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"اس نے میرا پلنگ پیچھے ہٹا کے اپنا بچھا لیا ہے!" بیولا نے شکایت کی اور پھر میٹرن کے اپنی طرف ہونے کے یقین کے ساتھ حکم دیا۔ "ہٹاؤ یہاں سے پلنگ۔"

"اب تو فیتھ کو بھی ضد چڑھ گئی تھی: "مَیں تو نہیں ہٹاؤں گی!"

"کیسے نہیں ہٹائے گی!"

اور دونوں نے اپنا اپنا جنگی نعرہ اتنی زور زور سے اور اتنی مرتبہ دُہرایا کہ آخر میٹرن کو ان کے بیچ میں آ کر اپنے ہاتھوں سے انہیں الگ کرنا پڑا۔ دُوسرے کمروں میں بھی اکثر لڑکیاں جاگ اُٹھیں۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ دو لڑکیوں میں لڑائی سے زیادہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے تو انہوں نے صبح سویرے اٹھنے پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اور کچی نیند میں جگا دینے والیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے پھر تکیہ میں منھ دے لیا۔

"چلو، چل کے پڑو اپنے اپنے پلنگوں پہ!" میٹرن دونوں کو دھکیل کر کہہ رہی تھی۔ وہ کسی طرف کا بھی الزام نہ لینا چاہتی تھی، کیوں کہ اُسے نیند آ رہی تھی۔ اور تیس سال تک بیچ بچاؤ کرتے کرتے وہ جان گئی تھی کہ لڑکیوں کے جھگڑے کسی اور طرح طے ہو ہی نہیں سکتے۔ بیولا نے اس سے انصاف کرنے کے ہزار مطالبے کیے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہی کہتی رہی۔ "چلو لیٹو، ہم کہہ رئے ہیں۔ مورننگ میں ہم تمہیں مس ساب کے سامنے کر دیں گے پیش، ان سے کرا لینا اپنا ججمنٹ۔"

روڈا کو بھی کچھ نہیں کہتی ہو تم؟ یہ مار رئی تھی مجھے!" بیولا نے سوچا کہ فیتھ سے تو خیر ہار ہی گئی، مگر روڈا کو تو بلوہ بچ کر نہ نکلنے دے۔

یہ تجویز میٹرن کو بھی ناپسند نہ تھی، کیوں کہ اُس کی رعایا میں سب سے سرکش روڈا ہی تھی۔ "روڈا، ہم کہہ رہے ہیں یہ کیا بات ہے؟"

"یہ وہی بات ہے جو تم کہہ رئی ہو۔" روڈا نے بھدے پلنگ پر گر کر ہوا میں ٹانگ نچاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھہرو تم۔ ہم بولیں گے مس صاحب سے کہ یہ زبان دیتی ہے ہمیں۔" میٹرن چاہتی تھی کہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہ کر اپنی دھمکی کی سنجیدگی میں وزن بڑھا دے۔

"جاؤ جاؤ، جا کے اپنی لنگڑی چماری کو پڑھاؤ۔" اب روڈا نے لحاف میں ٹانگ اڑا کر ایسی زور سے کھینچا جیسے میٹرن کی تانت بنا رہی ہو۔

"یہ چماری کی بات کیوں بولتی ہو تم بار بار، ہم کہہ رئے ہیں؟ ہم یہ بھی بولیں گے مس صاحب سے۔"

"اچھا بول دینا، ہم بھی بولیں گے تمھاری ایک بات مس ساب سے، ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔"

"ہماری کیا بات؟ کیا بولو گی تم؟" میٹرن چونکی ہو گئی تھی۔

"ہو گئی کچھ! ہم ان ہی سے کہہ دیں گے بس۔"

اس "ایک بات" کے ابہام نے جو کچن سے آلو چرا کر چماری کے ہاتھ بکوانے سے لے کر خدا جانے کہاں تک پہنچ سکتی تھی، میٹرن کو لرزا دیا اور اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ روڈا سے لڑائی مول نہ لے اور یہاں سے کھسک جائے اور وہ "چلو چلو سوؤ" کہتی ہوئی لڑکھڑاتی ڈگمگاتی چل دی۔

میٹرن کے چلے جانے کے بعد فیتھ نے بولا کو جلانے کے لیے قہقہہ لگا کر روڈا سے کہا: "تو نے خوب بھگایا بڑھیا کو! وہ کیا بات ہے جو تو کہہ رئی تھی، مس ساب سے کہہ دوں گی؟"

"ارے وہ؟ وہ بات یہ ہے کہ ایک لڑکا گزرتا ہے ادھر سے روز ہاتھ میں سائیکل لیے وے۔ ایک دن آپ پیڑوں میں چھپی وی باتیں کر رئی تھیں اُس سے میں نے دیکھ لیا۔ میں تاک میں رہی کہ دیکھوں کیا باتیں کر رئے ہیں۔ جب وہ چلنے لگا تو جیب میں سے نکال کر اس نے ایک ہرا رُومال دیا ریشمی۔ آپ نے اسے رکھ لیا اپنے کپڑوں میں چھپا کے۔ میں دیکھتی رہی کہ یہ کرے گی کیا اس کا جب اندھیرا ہو گیا تو آپ نے بلایا کونس ٹنس کو

اپنے پاس کسی بہانے سے، اور چپکے سے ہاتھ میں دے دیا وہ رومال، اور وہ اُسے لیتے ہی اپنے کمرے کو چل دی.... یہ تھی وہ بات! جو اُس نے شکایت کی مس ساب سے تو میں کہہ دُوں گی صاف صاف۔" اور واقعی روڈا پکا ارادہ کر چکی تھی، کیوں کہ سب لڑکیاں جانتی تھیں کہ دسوں احکام میں سے ساتویں کو مس صاحب سب سے زیادہ مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھتی تھیں۔

"اچھا ہے، کہہ دیجیو۔" فیتھ نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ "جبھی ٹھیک ہو گی یہ!"

"کیوں ری بیولا کہہ دُوں یہ بات؟" روڈا نے اسے منانے کے خیال سے اُس کی رائے پوچھی۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سر سے پیر تک لحاف میں لپیٹ رکھا تھا۔

"جانے بھی دے، کس سے بول رہی ہے!" فیتھ نے اپنی زبان پر ایک ہلکا سا تیزابی مزا محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بجا ہو گا اب؟" روڈا نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"دس تو بج گئے ہوں گے ضرور۔"

"تو سونا چاہیے اب تو؟"

"ہاں، اور کیا! بہت دیر ہو گئی ہے، چلو سوؤ اب۔"

روڈا اتنی جلدی خر خر کرنے لگی جیسے وہ صرف فیتھ کی اجازت ہی کا انتظار کر رہی تھی اور بیولا تو ایسے پڑی تھی جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہ تھی۔

مگر فیتھ کو کسی طرح نیند نہ آ رہی تھی، حالانکہ وہ پہلے سے شکستگی محسوس کر رہی تھی اور اپنی پانی سے بھری ہوئی آنکھوں کو ملتے ملتے اس نے اپنے سر کو اتنا ہلا ڈالا تھا کہ اُس کی رگیں اینٹھنے لگی تھیں، مگر نہ جانے اُس کی نیند کو کیا ہو گیا تھا۔ اُس کا تکیہ اتنا چھوٹا اور پتلا تھا کہ وہ اُس پر اچھی طرح اپنا سر بھی نہ رگڑ سکتی تھی اور ایسا سخت پتھر کہ اس کے کان توڑے دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ چت لیٹنے پر مجبور تھی ورنہ وہ تو چاہتی تھی کہ کروٹیں بدل بدل کر اپنے بدن کو ایسا چُور کر دے کہ اسے نیند آ جائے۔ کمرے کی سیلن نے لحاف میں ایسی نمی اور بو پیدا کر دی تھی کہ منہ پر نہ ڈالا جاتا تھا۔ حالانکہ کھلے ہوئے دروازے میں سے برفیلی ہوا سیدھی آ کر اس کی ناک پر لگ رہی تھی، اور اس کے حلق میں زکام کی خراش شروع ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ لحاف کون سا بڑا سردی سے بچا رہا تھا۔ اُس کی پرانی روئی ٹوٹ ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اور اس میں اتنے بڑے

بڑے بھنباتے کھل گئے تھے جن میں سے ہو کر ہوا کے تیز جھونکے فیتھ کے جسم میں پیوست ہوئے جارہے تھے۔ سردی ایسی ناقابلِ برداشت ہوئی جارہی تھی کہ آخر فیتھ کو اُٹھ کر چادر اور کوٹ لحاف کے اُوپر ڈالنا پڑا۔ مگر جاڑا ان ہلکے ہلکے اضافوں کے مان کا نہ تھا۔ فیتھ کے پیر اب بھی ایسے ہی جمے جارہے تھے جیسے پہلے۔ کمروں پر، کھیل کے میدان پر، سڑک پر، شہر پر، ساری کائنات پر موت کا سا لرزہ خیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے قہقہے، جن سے شام میدان گونج رہا تھا، نہ معلوم اب کہاں جا سوئے تھے۔ یہاں تک کہ اب روڈا کی خر خر بھی بند تھی۔ سڑک پر کوئی بھولا بسرا تانگہ تک نہ گزر رہا تھا۔ اس جہاں پوش تنہائی اور خاموشی میں اگر کوئی آواز تھی تو وہ اندھیرے کی گونگی بارش کی۔ ہاں کہیں دُور ایک انجن ہلکے ہلکے سانس لے رہا تھا جس کی آواز تاریکی اور تنہائی کے ظلمات میں اجنبی اور کینہ توز ہستیوں کے وجود کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ فیتھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بیولا، روڈا، ویلری، شیلا، ساری لڑکیاں، دیواریں، عمارتیں، پیڑ، سب دُھواں بن کر غائب ہو گئے ہیں اور وہ ایک بے جان، احساس کش خلا میں اکیلی لٹکی رہ گئی ہے۔ اُسے یاد بھی آیا کہ اسکول کے قاعدے اور ماما کی تاکید کے مطابق اُسے سونے سے پہلے دُعا کرنی چاہیے، مگر اس کا ہر ہر جوڑ ایسا کسل مند اور بوجھل ہو رہا تھا کہ اُس میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی اور پھر اس گھلا دینے والی تنہائی میں کہ جب زمین اس کے نیچے سے نکل کر غائب ہو گئی تھی، ہر چیز بے اثر اور بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ شاید یہ اندھی تنہائی ایک سیاہ کپڑا تھا جو کائنات کے، زندگی کے منھ میں حلق تک ٹھونس دیا گیا تھا۔ فیتھ کا صرف جسم ہی تھکا ہوا نہ تھا، بلکہ اُس کی رُوح بھی منوں بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ اُس نے شام سے لے کر اب تک سارا وقت اُلجھیڑوں، ہنگاموں، جھگڑوں کے درمیان بے سبب خوفوں، مبہم اضطرابوں، بے نام کینوں اور ملگجی مگر رسیلی خواہشوں کے درمیان بے حد مصروفیت کے ساتھ گزارا تھا، اور یہ سب اس کی رُوح کے لیے ایک بدمزہ گرانی چھوڑ گئے تھے۔ اُس نے اپنی رُوح کو بے اندازہ دوڑایا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے شل ہو چکی تھی اور اب جماہیاں لے لے کر اپنے آپ کو بے حس کر لینا چاہتی تھی اور اُسے دوڑانے سے آخر فائدہ ہی کیا ہوا تھا؟ وہ مجروح کتے کی طرح جھلائی ہوئی اور مردہ بن گئی۔ اگر کہیں روڈا اپنی ماں کی بات سنا دیتی تو فیتھ کی رُوح کا کسیلا پن اور بھی دو چند ہو جاتا اور اس کی رانوں کی نسیں کھنچ کھنچ کر ٹوٹنے لگتیں جو کچھ وہ کرتی رہی تھی اس سے آخر کیا فائدہ ہُوا تھا؟ جو کچھ بھی وہ کرتی اُس سے آخر کیا

فائدہ ہوتا؟ کچھ کرنے ہی سے آخر کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اب مثلاً وہ بیولا سے پلنگ بچھانے پر اتنا لڑی بھڑی تھی۔ کھمبے کی روشنی کے سامنے پلنگ بچھا کر اسے کیا مل گیا؟ اُسے دو جہاں کا عیش حاصل ہوگیا؟ یا اُسے کوئی ساتھی مل گیا؟ یا اُس کی تنہائی کچھ کم ہو گئی؟ یا اندھیرے کی وحشت ہلکی پڑ گئی؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہُوا۔ ہو ہی کیا سکتا تھا؟ سب ویسے ہی تھا جیسے کہ پہلے تھا، جیسے کہ رہتا — کھمبے کی گاڑھی گاڑھی زرد روشنی زمین کے تھوڑے سے ٹکڑے پر لپٹی ہوئی تھی، اور بس اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا! اندھیرے کے بھنور نے فیتھ کے حواس مختل کر دیئے تھے اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ کبھی تو اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے دُوسری طرف پہنچ گئی ہے اور اس کی عقل حیران ہے کہ اسے یہاں کون لایا؟ اور کبھی اندھیرا اُسے پھر کھمبے کی روشنی کے سامنے لا پٹختا تھا۔ فیتھ کے پلنگ پر، سب کمروں پر، گھاس کے میدان اور پیڑوں کے جھنڈ پر، ہار سنگار کی جھاڑیوں پر، سڑک اور اس کے پار ریلوے لائن پر، اس شہر سے لے کر فیتھ کے گھر تک سارے گاؤں اور قصبوں پر، اس کے گھر کے آنگن اور چھوٹے چھوٹے طاقوں پر، ان بڑے سے بڑے فاصلوں پر جن کا وہ تصور کر سکتی تھی، آفرینش کے اِس سرے سے اُس سرے تک، ہر جگہ، ہر طرف اندھیرے کی قہار لاانتہائیاں دراز تھیں۔ اندھیرے کی طغیانی نے ہر چیز کو نگل لیا تھا۔ ہر چیز نے اپنی شناخت اور شخصیت اُس کے حوالے کر دی تھی اور گھل کر ایک بے شکل سیاہ پہنائی میں مل گئی تھی۔ اندھیرا اُوپر ہمیشہ سے زیادہ دُور ہٹے ہوئے دُھندلے ستاروں تک اور نیچے گہری سے گہری تحت الثریٰ تک پھیلا ہُوا تھا اور ان کے بیچ میں فیتھ یکہ و تنہا معلق تھی۔ شاید فیتھ اندھیرے پر اُٹھتی ستاروں کے درمیان جا پہنچے، اور اُن سے اُوپر اندھیرے کو بے خوف و ہراس دیکھتی ہوئی، آسانی سکون کے ساتھ آہستہ آہستہ، ہلکے ہلکے، ایک ستارے سے دُوسرے ستارے تک، اور دُوسرے سے تیسرے تک ہمیشہ سفر کرتی رہے۔ شاید وہ اندھیرے کے ساتھ ساتھ نیچے بے ہوش گہرائیوں میں گرنے لگے، اور اس کا گرنا کبھی ختم نہ ہو۔ یا شاید وہ اسی طرح بیچ میں لٹکے ہی لٹکے ہمیشگیاں گزار دے۔ یہ سب اندھیرے پر منحصر تھا.... آخر وہ کہاں جائے گی؟ اُوپر یا نیچے؟ یا بیچ ہی میں رہے گی؟ کدھر؟ — کہاں؟

(۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء)

ایک معمولی خط

آپ کے اور میرے نزدیک تو یہ صرف ایک بے ضرر، بلکہ مزے دار حماقت ہوئی جس پر اکیلے میں کیا دوسروں کو بھی سنا کر ہنسا جاسکتا ہے، مگر اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے ان اضطراری کمزوریوں میں شمار کرنا پڑے گا جن کی یاد ہمیشہ آنکھوں کے نیچے پسینہ لے آتی ہے، کیونکہ اُس کی زندگی میں کمزوریوں کی تعداد اتنی معمولی تھی کہ وزن اور سنجیدگی کے لحاظ سے ان کو مختلف درجوں میں ترتیب نہ دیا جاسکتا تھا۔ کمزوریوں کو چھوڑیے، زور آوری ہی کون سی تھی۔ اس کی زندگی ہر قسم کے غیر معمولی اور دُور از راہ واقعات سے ایسے ہی خالی تھی جیسے — اُس کے حسب حال میں کوئی تشبیہ تک نہیں سوچ سکتا۔ ممکن ہے کہ تشبیہ برائے تشبیہ کی غرض سے میں بجلی کے کھمبے کا نام لے دُوں، مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ شریر بچے اسے اینٹ سے بجاتے ہوئے چلتے ہیں، صبح و شام ایک فاختہ اس پر بیٹھ کر کو کو کرتی ہے، کبھی کبھی گاڑیاں اس سے ٹکرا جاتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ اُس کی زندگی بالکل ایک شریف آدمی کے کپڑوں کی طرح تھی جن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ آپ انہیں یاد نہیں رکھ سکتے۔ وہ اُس مسکین اور مطمئن اقلیت کا ایک فرد تھا جو اگر کبھی اچھے نمبر نہیں حاصل کرتی تو کبھی فیل بھی نہیں ہوتی، جو ایسی ویسی باتوں میں بالکل نہیں پڑتی اور جس سے ہمیشہ نہایت خوش اخلاقی اور تہذیب سے پیش آیا جاتا ہے مگر ربط و ضبط بڑھانے کی کبھی خواہش نہیں کی جاتی۔ اپنے استادوں کی نظر میں وہ ایسا کند ذہن مگر خاموش، محنتی اور سیدھا سادا طالب علم تھا جس کا ہر فعل اتنا قابل اعتماد اور نپا تلا ہوتا ہے کہ اس کے وجود کو ذہن میں رکھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے ساتھیوں کے نزدیک اُس کی متانت اتنی بوجھل اور ٹھس تھی کہ وہ اُسے ایک بناوٹی مسکراہٹ سے زیادہ کچھ نہ دے سکتے تھے اور محلے کے والدین کے لیے وہ اولاد کی نیک سیرتی اور خوش کرداری کا ایک

مثالی نمونہ تھا۔ کسی کے خوابوں میں اُترنے کی کوشش کرنا تو فانی انسان کے لیے ایک خطرناک مہم ہے، مگر جہاں تک وثوق سے کہا جاسکتا ہے، اُس کے دِن کتابوں، امتحانوں اور چھٹیوں کے درمیان نہایت آسانی سے گزر رہے تھے اور اپنے طرز زندگی میں عیب نکالنے کی کوئی وجہ اُسے اب تک نہ ملی تھی۔

لیکن اس کی آزمائش کا لمحہ اس وقت آیا جب وہ بی اے کا امتحان دے کر گھر آگیا پہلے تو اُس کی چھٹیاں اگلی کلاس کے لیے تیاری کرنے میں کٹ جایا کرتی تھیں، مگر اس مرتبہ اُسے اپنے وقت کا ایسا کوئی مصرف نظر نہ آ رہا تھا۔ اب تک اُس کی زندگی ایک نہایت صحیح پیمانے سے کھینچی ہوئی گہری اور واضح لکیروں کے درمیان بٹی رہی تھی، اپنے سفر میں وہ اب ایک ایسے نقطے پر آ پہنچا تھا جس کے آگے کوئی لکیر نہ تھی۔ وہ رسم و رواج کے مقرر کیے ہوئے راستے پر سر جھکائے ہوئے چلتا رہا تھا۔ مگر فرصت کے ریگستان میں پہنچ کر وہ پگڈنڈی خود گم ہو جاتی تھی۔ شروع میں اُس نے چاہا کہ اپنے کورس ہی کو دوبارہ پڑھے۔ مگر امتحان کی چٹنی کے بغیر وہ اتنا پھیکا پھس پھسا ہو گیا تھا کہ اُس سے چل نہ سکا۔ اُس نے ایک کے بعد دوسری چیز میں دلچسپی لینے کی متعدد کوششیں کیں، مگر شاید مسرت دن اور رات کی سرحدوں کے باہر پرواز کر گئی تھی۔ ہر چیز پر سے ملمع اتر گیا تھا۔ ہر چیز بھوری اور بے رنگ ہو گئی تھی، اور اُس کے لیے اب اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اکتاہٹ اور بیزاری کے سمندر میں بے دست و پا غوطے لگایا کرے۔ عموماً لوگوں کو پیچھے چھوڑے ہوئے دنوں کی یاد عرصے تک بے چین رکھتی ہے، مگر یقین مانئے کہ اُس کا ایک دن خود اُس کی نظروں میں دُوسرے دن سے اتنا بے امتیاز تھا کہ وہ سب بجھتے ہوئے کوئلوں کی طرح راکھ ہوئے جا رہے تھے۔

نہ معلوم اس کے کتنے دِن اور اسی طرح جماہیاں لیتے ہوئے گزرتے، مگر ایک دن بازار سے لوٹتے ہوئے اُس نے جو کچھ دیکھا اس نے خوشی نہ سہی، اُس کے ویران دنوں اور راتوں کے لیے کم سے کم ایک رنج تو مہیا کر دیا۔ وہ اتنا معصوم نہ تھا کہ اُس کے لیے ایک لڑکی کا کھڑکی سے جھانک کر گلی میں کھڑے ہوئے لڑکے کی طرف مسکرا دینا عجوبہ روزگار ہوتا مگر اس معمولی سے واقعے کی ندرت اُس کے اندر یہ تلخ اور ہمت شکن احساس پیدا کر دینے میں تھی کہ اُس نے برساتی دنوں کے لیے کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ اپنے پڑھے ہوئے معدودے چند عشقیہ افسانوں کو اُس نے ہمیشہ کاغذی باتیں اور زندگی سے بے تعلق

سمجھا تھا اور اس حقیقت سے غافل رہا تھا کہ رُومان مکڑی کے جالے سہی، مگر ہماری زندگی کی رگوں سے یک جان ہو کر وہ انہیں کتنا مضبوط بنا دیتے ہیں، اور عشق پیچاں کی یہ ننھی ننھی بیلیں کیسے کیسے گرتے ہوئے ستونوں کو تھامے رہتی ہیں۔ طالب علمی ہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب زیادہ خطرہ مول لیے بغیر زندگی بھر کے سہارے کے لیے دو چار نگاہوں، ایک آدھ مسکراہٹوں کا اندوختہ جمع کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے نادان ہاتھوں نے موقع کا زریں دامن انتہائی بے پروائی سے پھسل جانے دیا تھا۔ لفظوں کے معنی لکھ لینے کی بے تابی میں اُس نے اپنی آنکھوں کو کتاب پر گاڑے رکھا تھا، حالانکہ وہ ان سے بہتر کام بھی لے سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے اندھا بن کر کھو دیا تھا، اب اسے دوبارہ پالینا محال تھا۔ اپنی پیش قدمی کا جواب پاسکنے کی توقع تو کجا، اُس کی سمجھ میں کوئی ایسی لڑکی بھی نہ آتی تھی جس کی طرف وہ پیش قدمی کرسکے۔ کالج کی چھ لڑکیوں میں سے ایک نہ ایک تو ضرور اُس کی طرف توجہ کرتی ہی۔ اُسے کسی اونچی اڑان کی خواہش نہ تھی۔ ہر لڑکی کے امکانات پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اور کوئی نہیں تو اس کی ساتھی اینجلا کو کس ضرور کچھ نرم پڑ جاتی۔ لڑکے اس کی سیاہ رنگت، بھاری بدن اور ڈھلی ہوئی عمر کا مذاق اڑاتے تھے مگر اس کی آنکھیں تو چمک دار، اداس اور گہری گہری سی تھیں، اور یہ بہت کافی تھا۔ اور پھر وہ سب لڑکیوں سے زیادہ سلیم الطبع اور خاموش تھی۔ کاش کہ اس نے یہ سب پہلے سوچا ہوتا۔ اسے اینجلا کے رد عمل کا اتنا یقین تھا کہ اس پر ایک دو دن تک غور کرتے کرتے اُس کی شکستگی، مایوسی اور جھنجھلاہٹ اس حد تک بڑھ گئی جیسے ملاقات کا وقت تک مقرر ہو چکا ہو، مگر وہ پہنچ نہ سکا ہو۔ وہ واقعی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے اینجلا سے وعدہ خلافی کی ہو اور اسے دھوکا دیا ہو۔ اس کا رنج اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اب اُس کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔

لیکن اُسے یہ جان کر بڑا خوش گوار تعجب ہوا کہ حالات اتنے مایوس کن نہیں تھے، جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ ابھی سہارے کے لیے ایک تنکا باقی تھا، یعنی وہ اینجلا کو خط لکھ سکتا تھا۔ کلاس کی دونوں لڑکیوں کے پتے مسرت بخش معلومات کے طور پر لڑکے اکثر دُہرایا کرتے تھے، اور وہ تقریباً سبھی کو یاد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اُسے بھی۔ چنانچہ اینجلا کو خط لکھ دینا کوئی بڑا مشکل مرحلہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں تھیں جو آنکھوں کے پیغامات میں نہ سما سکتی تھیں مگر انہیں خط میں لکھا جاسکتا تھا۔ شاید اُس کی اناڑی آنکھیں

اُس کے دِل کی لگن کو ذرا بھی ظاہر نہ کرسکتیں- شاید وہ جرات نہ کرسکتا- مگر خط کو وہ زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکتا تھا- ممکن ہے کہ وہ اس کی نگاہوں کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتی اور ا-انجلا کا استہزا نشتر کی طرح اُس کی رُوح میں اُتر جاتا- لیکن اگر خط پڑھ کر وہ ہنسی بھی تو اسے معلوم نہیں ہو سکتا تھا- یہ نہ سمجھئے کہ اُس نے صرف روشن پہلوؤں پر نظر ڈالی- اُس کے سامنے نامرادی اور مایوسی بھی آئی، وہ ا-انجلا کی برہمی کے خیال سے بھی کانپا، اُس کے تصور نے اُسے ہولناک نتائج بھی دکھائے اور اُس کے حق میں یہ کہنا پڑے گا کہ اُسے یہ بھی شبہ ہوا کہ وہ اُسے پہچان نہ سکے گی- وہ کسی جلسے میں شریک نہ ہوا تھا، اتنی بڑی کلاس میں سب سے آخر میں بیٹھتا تھا اور مضمون سنانا تو درکنار، اُسے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے بھی اُٹھنا نہ پڑا تھا- غرض کہ ا-انجلا کے اُس سے واقف ہونے کی کوئی بھی شہادت نہ ملتی تھی، لیکن جس چیز نے اسے آخری فیصلہ کرنے میں مدد دی وہ اس کی پتلی ناک تھی جس کی تعریف اس نے بچپن میں اپنی ماں کی ملنے والیوں سے سنی تھی اور جسے اس کے خیال میں کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا تھا — ا-انجلا بھی نہیں- بلکہ اسے چند ایسے موقعے یاد آتے معلوم ہو رہے تھے کہ جب ا-انجلا نے اُس کی طرف غور سے دیکھا تھا-

اُس نے دو صفحے کا خط لکھنے میں دو دِن لگائے- پہلے تو اُس کا ارادہ تھا کہ ایک محبت نامہ لکھے لیکن وہ اس فن میں اتنا بے ہنر تھا کہ اُسے اپنا سارا سوچا ہوا مضمون اُکھڑا اُکھڑا سا معلوم ہوتا تھا- دُوسرے اس کا ذہن اس قسم کے خط کو سنگین ترین جرائم سے کسی طرح متعلق سمجھتا تھا- اِس لیے اُس نے اپنے خط کو حتی الامکان پاکیزہ بنانے کی کوشش کی، حالانکہ یہ خط بھی، جیساکہ آپ اس سے توقع کرسکتے ہیں، اتنا ہی اَن گھڑ اور ناقابلِ یقین تھا- شروع میں اُس نے اس جرات کی معافی مانگی تھی اور آخر تک اُسے اتنی مرتبہ دُہرایا تھا کہ اُس کی انکساری مشکوک معلوم ہونے لگی تھی- اُس نے سن رکھا تھا کہ لوگ اپنی اپنی پسند سے دُور دُور ملکوں میں خطوں کے ذریعے سے دوست بناتے ہیں- اُس نے بھی اس نسخے کو استعمال کیا- حالانکہ اس کا ضلع ا-انجلا کے ضلع سے ایسا دُور نہ تھا مگر اُس نے لکھا کہ اسے اس حصہ زمین سے بہت دلچسپی ہے، اور وہ وہاں کوئی دوست بنانا چاہتا ہے، اور چوں کہ وہ اس کی ساتھی ہے، اِس لیے اُس کو ایسی دوستی میں زیادہ آسانی نظر آتی ہے- یہ دو دن اُس نے انتہائی ہیجان کے ساتھ گزارے تھے، اور اپنے ارادے اور خط کے مضمون بیسیوں مرتبہ بدلے تھے- خط ڈالنے جاتے ہوئے بھی اس کا دماغ لفافہ پھاڑ پھینکنے

اور اُسے ڈال دینے کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ وہ کھڑا چوروں کی طرح اِدھر اُدھر تاکتا اور لفافے کو ہلاتا رہا، لیکن یکایک اُس کے اندر ایک لہر وحشیانہ تیزی سے اُٹھی، اور وہ لفافے کو لیٹر بکس میں ٹھونس کر ایسے مڑا جیسے واقعی چوری کر کے بھاگ رہا ہو، مگر اس عمل کے ساتھ ہی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے اندر کوئی بجلی کا بٹن بند کر دیا گیا ہو۔ اس کا سارا ہیجان اور اشتعال یک لخت غائب ہوگیا، اور وہ گھر تک آتے آتے اپنی اس وقتی حماقت پر ہنس پڑا۔ اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا، اور وہ اب زیادہ آزادی سے سانس لے رہا تھا۔ یہ سارا واقعہ ایسا ماند پڑتا جا رہا تھا کہ ایک آدھ دِن ہی میں وہ اسے بھولنے سا لگا — جواب کی تو اسے پہلے بھی زیادہ اُمید نہ تھی، مگر اپنا توازن پا لینے کے بعد وہ اس سے بالکل بے پرواہ ہوگیا۔ ممکن ہے کہ یہ اس سب کو بھول جانے کی غیر شعوری کوشش ہو، مگر اب اُسے بہت سی دِلچسپیاں مل گئی تھیں۔ وہ گھر کا سودا خود لانے لگا تھا۔ سب کے بستر بھی اپنے آپ بچھاتا تھا اور محلے والوں سے بھی زیادہ ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔

ابھی کالجوں کی چھٹیاں ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے شہر میں ملازمت مل گئی۔ اُس کے باپ کے ایک دوست نے اُسے جگہ دِلوانے کا وعدہ کر لیا تھا، اور وہ ملتی ہوئی آدھی کو چھوڑ کر پوری کے پیچھے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں نہ تھا اور یوں بھی پچاس سے تنخواہ شروع تھی، چار روپے سالانہ ترقی، اور پھر موقع آنے پر ہیڈ کلرکی مل جانے کا وعدہ۔ اس کو ایک تسلی یہ بھی تھی کہ وہ صرف تیسرے درجے ہی میں تو پاس ہوا تھا۔ ملازمت کے چھ مہینے بعد ہی اُس کی شادی بھی ہوگئی ہری ہری گھاس دیکھ کر گدھا زیادہ سے زیادہ کان ہلانے لگتا ہے۔ نوکری اور بیوی پا کر شاید اُس نے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا، مگر بہرحال اب وہ ریگستان سے نکل کر پھر مقررہ راستوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ جن پر وہ سر جھکائے چل سکتا تھا۔ اب اس کی زندگی پھر گہری اور واضح لکیروں کے درمیان بانٹ دی گئی تھی۔ اس کے سامنے مستقبل میں ہیڈ کلرکی کے وعدے کا روشن مینار تھا، جس سے چندھیا کر اس کی آنکھیں آگے دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اُس کا ماضی وہ اندھا کنواں بن چکا تھا جس میں جھانکنے کی اُسے کوئی خواہش نہ تھی اور ہوتی بھی تو وہاں مشکل ہی سے کچھ نظر آتا۔ حال کی بھول بھلیوں میں بغیر کسی احساس کے گھومتے رہنا — بس یہ تھی اس کی زندگی!

حال کی بھول بھلیاں بھی بڑی پُر فریب چیز ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اسی جگہ

گھوم رہے ہیں مگر وہ خود سرکتی رہتی ہے اور آپ کو کہیں سے کہیں لا کر چھوڑتی ہے۔
اُسے اس عمل کا پتا اُس وقت چلا تھا جب وہ پانچ سال آگے نکل آیا تھا۔ اس دوران میں اُس کے دو بچے ہو چکے تھے، اور دُوسرا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہوا تھا کہ اس کی حق تلفی کر کے ایک ایسے شخص کو ہیڈ کلرک بنا دیا گیا تھا جو بی اے فیل تھا اور اس کے بعد ملازم ہوا تھا۔ پانچ چھ مہینے سے اُس کی خود اطمینانی رخصت ہو چکی تھی۔ اس کے اعضاء میں اضمحلال آگیا تھا اور وہ اپنے آپ کو ادھیڑ اور شکستہ تصور کرنے لگا تھا۔ روشنی کا مینار ڈھ جانے سے اُس کے مستقبل پر دُھندلکا چھا گیا تھا جس میں بچوں سے متعلق ذمہ داریاں، دُوسرے دُنیاوی فرائض اور ان سب کے پورا کرنے میں دشواریاں اُسے حقیقت سے کئی گنا بڑی دکھائی دینے لگی تھیں، اور اُس کا سر ان باتوں سے بھرا رہتا تھا۔ اپنے بچوں سے بھی اُسے دِل بستگی باقی نہ رہی تھی، اور وہ بیوی کو بھی فضول خرچی کا الزام دینے لگا تھا۔ باتونی بھی وہ بلا کا ہو گیا تھا اور محلے والوں میں بیٹھ کر گھنٹوں اپنی حق تلفی، ہیڈ کلرک کی بے ایمانی اور رشوت ستانی کی شکایتیں کیا کرتا تھا مستقبل سے خوف زدہ اور حال سے بیزار ہو کر وہ ماضی کی تاریکیوں میں بھی جھانکنے لگا تھا، اور اُسے پہلے تو دُھندلی پرچھائیاں اور پھر کبھی کبھی نیم روشن تصویریں نظر آنے لگی تھیں۔ بیتے ہوئے دِنوں کے لیے اُس کے دِل میں کوئی ٹیس نہ اٹھتی تھی، بس متفرق اور بے جوڑ تصویریں کوئی جذبہ پیدا کیے بغیر اس کے سامنے سے گزرتی رہتی تھیں۔ آخر خزاں کے پتوں کی طرح ہوا پر بھٹکتی رہنے والی ان ہی تصویروں کے ساتھ ایک مرتبہ یہ یاد بھی آئی کہ اُس نے ملازمت سے پہلے ایک لڑکی کو خط لکھا تھا۔ پہلے تو وہ اسے ایک ناتجربہ کارانہ حماقت سمجھ کر ہنسا مگر آہستہ آہستہ اُس کے جسم میں سنسنی پھیلتی گئی، اور وہ اتنا ہی مشتعل ہو گیا جتنا کہ وہ خط لکھتے وقت تھا۔ تعجب، مایوسی اور اُمید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے دِل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔
انجلا کو اس کا خط ملا تھا یا نہیں؟ اس نے خط سے کیا اثر لیا؟ اُس کے گھر والوں کو تو پتا نہیں چل گیا؟ کہیں انجلا کا خط ڈاک میں تو نہیں کھو گیا؟ اُس کی عقل جتنا زیادہ شک کرتی تھی، اس کا دل اتنا ہی زیادہ اپنی نسیں اس خط کے گرد لپیٹتا جاتا تھا، اور اب اتنی مُدّت کے بعد جواب پالینا اُسے بالکل یقینی نظر آ رہا تھا۔ شاید انجلا کی شادی نہ ہوئی ہو، یا اُس کی اپنے شوہر سے نہ بنتی ہو اور وہ اسی کی طرح شکستگی اور کسی ہمدم کی ضرورت محسوس کر رہی ہو۔ شاید پرانے دِنوں کی یاد اُسے ستا رہی ہو اور وہ اپنے کسی پرانے ساتھی کی تلاش میں ہو اور

وہ اپنے گزشتہ طرزِ عمل کی معافی مانگتے ہوئے اسے خط لکھے۔ غرض کہ سینکڑوں امکانات تھے اور اسے یہ سب اتنا منطقی معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے گھر بھی لکھ دیا کہ اگر اُس کا خط آئے تو فوراً اس کے پاس بھیج دیا جائے، اور اس نے بے چینی سے ڈاکیے کی راہ تکنی شروع کر دی۔ اسے خط لکھنے والا ہی کون تھا۔ بس کبھی کبھار کسی عزیز کے یہاں سے خوشی یا غمی کی اطلاع یا اور ایسی ہی معاملاتی چیزیں۔ لیکن اس سے اُس کی اُمید نہیں مرجھائی۔ اُس کے لیے ہر آنے والا کل گزرتے ہوئے سے زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اب جب کہ اس کے سامنے ایک معین چیز تھی۔ وہ انتظار کر سکتا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں، اپنے گھر اور اس کے سازو سامان میں ترمیمیں سوچا کرتا تھا تاکہ انہیں اینجلا کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔ ڈاڑھی بنانے سے وحشت کی وجہ سے پہلے اس نے ڈاڑھی رکھ لینے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اب اس نے یہ خیال چھوڑ دیا۔ وہ اینجلا سے بہت ہی پاکیزہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا، مگر ڈاڑھی پھر بھی قابلِ نمائش چیز نہ تھی۔ وہ صرف اینجلا کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ ادب اور سیاست پر ہی سہی۔ اسے اپنی کم علمی کا اعتراف تھا اور اس نے بارہا اس کمی کو دُور کرنے کا ارادہ کیا، گو اُس کی مصروفیت اُسے پورا نہ ہونے دیتی تھی۔ اینجلا کے جواب پر غور کرنا اور اُس کی بنیاد پر رنگین محل تعمیر کرتے رہنا اُس کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا تھا۔ اگر اُسے کبھی دفتر میں اس کا خیال آ جاتا تو خوشی اور مسکراہٹ اس کے چہرے سے اُمنڈنے لگتی، وہ رجسٹر پر جھک کر اُسے زور سے دبا لیتا اور عمدہ سے عمدہ کام کرنے کے جوش میں اسے بار بار لکھنا اور کاٹنا پڑتا۔ اُس کے چہرے کی سُرخی ہیڈ کلرک کی نظروں سے چھپی نہ رہتی اور وہ طنز سے مسکرا کر پوچھتا: ''کیوں مولانا، کیوں کھلکھلائے پڑ رہے ہو؟ لڑکا ہوا ہے کیا آج؟'' اور وہ جھینپ کر جلدی سے جواب دیتا۔ ''نہیں تو، کچھ بھی نہیں۔'' اور پھر یہ سوچے بغیر کہ اس کا یہ فعل اُس کے قول کی تردید کرے گا، کوٹ کی جیب سے ڈبیا نکالتے ہوئے کہتا۔ ''لو پان کھاؤ۔'' اس دن وہ ہیڈ کلرک تک سے خوش مزاجی سے پیش آتا، اور گھر لوٹتے ہوئے بچوں کے لیے مٹھائی لے جانا نہ بھولتا۔ اینجلا کے چاروں طرف سے ماضی کا کہر اچھٹنے لگا تھا۔ اور وہ اینجلا کی شکل و صورت، چال، بولتے ہوئے ہونٹوں، کپڑوں، چوڑیوں، اُس کی ذرا ذرا سی حرکت، یہاں تک کہ ہر اُس دن کو جب وہ اس کے سامنے آئی تھی، اتنی صفائی سے دیکھ سکتا تھا، جیسے یہ سب کچھ اُس کے سامنے موجود ہو۔ اینجلا کی ہستی اس کے لیے اتنی گہری اور حقیقی ہو گئی تھی گویا وہ دونوں

برسوں ساتھ رہے ہوں، اب اس کی زندگی میں اس سڑک پر قدم گونج رہے تھے جس پر وہ کبھی چلا ہی نہ تھا اور یہ گونج اتنی مدہوش کن تھی کہ اس میں اُس کی ساری پریشانیاں اور شکایتیں، یہاں تک کہ وقت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی ڈوب گئی تھی۔ چھ بھاری بھرکم سال اسے روندتے کھوندتے گزر گئے تھے، مگر وہ اپنے اُوپر اُن کا کوئی اثر نہ دیکھ رہا تھا، خوابوں کی نمی اور طراوت اُسے ہرا بھرا بنائے ہوئے تھی۔

یہ نہیں کہ اُس کی زندگی میں تلخی کا گزر ہی نہ ہوتا ہو۔ کبھی کبھی ایسے دن بھی آتے تھے، جیسے کہ آج تمام دن ہیڈ کلرک اپنے طنزیہ جملوں سے اُسے پھنکاتا رہا تھا، اور اتفاق سے کام بھی اُس کے سر بہت آ پڑا تھا۔ وہ دیر سے گھر لوٹ رہا تھا، اور بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ ہر تھکے ہوئے قدم کے ساتھ اُس کا ملازمت چھوڑ دینے کا عزم بڑھتا جاتا تھا۔ وہ بازار میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھا پکڑ کر اُسے روکا۔ وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس دُہری ٹھوڑی والے گورے آدمی کی شکل میں اپنے کلاس کے ساتھی مقبول کو اُس وقت تک نہ پہچان سکا جب تک کہ اُس نے مسکرا کر "کہو، کیسے رہے؟" نہ کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مقبول پر قسمت کی دیوی زیادہ مہربان رہی ہے، اور محض ایک شناسا کو اتنی بے تکلفی سے مخاطب کرنے کے معنی تھے کہ وہ یہی جتانا چاہتا ہے۔ بہرحال اُس نے اپنے حواس جمع کیے، اور گرم جوشی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آخاہ، آپ ہیں! یہاں کیسے؟"

ایک فیشن ایبل مصافحے کے بعد مقبول نے بتایا کہ وہ بیمے کا ایجنٹ تھا، اور اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ مقبول سے رسمی معلومات تبدیل کرنے کے دوران میں وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے گھر لے جائے یا نہ لے جائے کہ مقبول نے خود ہی تجویز کیا کہ وہ کسی ریسٹوران میں چلیں تاکہ کچھ دیر باتیں کر سکیں۔ یہاں کے اکیلے ریسٹوران "رائل ہوٹل" کے اخراجات کے بارے میں، جسے انٹر کالج کے طلبہ کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے سامنے پردے ڈال کر یہ نام دے دیا گیا تھا، اُس کے خیالات بڑے دِل ہلا دینے والے تھے۔ وہ صرف ٹوٹی ہوئی کرسیوں والی معمولی سوڈا واٹر کی دکان تک ہمت کر سکا، اور وہ بھی معذرت کے ساتھ۔ مگر مقبول اُسے نوازنے پر تلا ہوا تھا۔

اُس کے پاس باتیں کرنے کے لیے کیا تھا، اپنا وہی معمولی رونا گانا، اور اُسے بھی مقبول کے کپڑوں کی چمک نے غیر مناسب بنا دیا تھا۔ مقبول البتہ بھرے ہوئے گلاس سے،

جسے اُس نے ابھی تک اپنے ہونٹوں سے نہ چھوا تھا، کھیل کھیل کر ان پرانے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا، جن سے وہ اس عرصے میں ملا تھا۔

باتیں سنتے سنتے دفعتاً اُس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی اور اُس نے مقبول کی بات کاٹ کر لفظ چباتے ہُوئے پوچھا: "اور ہمارے ساتھ ایک لڑکی بھی تو تھی، کیا نام تھا اُس کا؟ اینجلا، اور آگے نہ معلوم کیا؟"

"اوہ، وہ اینجلا کوکس!" مقبول نے کہا: "سب سے پہلا بیمہ میں نے اُسی کے شوہر کا تو کیا تھا۔ اُس کی شادی ایک بڑے امیر ڈاکٹر سے ہوئی تھی۔ مگر کالج سے نکل کر بے چاری ایک سال بھی تو زندہ نہ رہ سکی۔ بچہ ہوا تھا اُس کے، اسی میں مر گئی۔ کیا اعتبار ہے زندگی کا! اب آفتاب ہی کو لو۔ کیسا چلبلا تھا، ساری کلاس کو لٹا لٹا دیتا تھا مارے ہنسی کے..... خوب دِن تھے وہ بھی!"

باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی

(۲۴ ستمبر ۱۹۴۲ء)

وہ تین

پتے دو منٹ بھی چین سے نہ رہے تھے کہ ہوا نے انہیں پھر کھڑکھڑانا شروع کر دیا۔ برآمدے کے کیلب والے نصف حصے کی شامیں یوں ہی کون سی کم دھندلی، اداس اور طویل ہوتی تھیں، مگر پتوں کی پیہم سرسراہٹ، جو گرمیوں میں غضب ناک جھکڑوں میں تبدیل ہو جاتی تھی، اور گرجا گھر کے گھنٹے کی غیر متوقع اور اضطراری ٹناٹن تو انہیں اور بھی بے نور افسردہ اور گراں بار بنا دیتی تھیں۔ یہ آوازیں رُکے بغیر اُن کے اندر پھیلتی ہی چلی جاتی تھیں، جو کچھ بیچ میں آئے اسے سمیٹتی، تحلیل کرتی، فنا کرتی، اور انہیں اپنے اندر کا خلا اور بھی وسیع و عریض، اور بھی عمیق، اور بھی بے کراں معلوم ہونے لگتا تھا۔ گرجا کا گھنٹہ تو خیر کبھی کبھی کی بات تھی، لیکن پیپل کے پتوں میں تو ہوائیں ہر وقت آہیں بھرتی رہتی تھیں۔ خصوصاً اس دفعہ کی آہ تو اتنی لمبی، آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی اور دِل دوز تھی کہ جیسے وہ پیڑ، خود وہ زمین، جس میں پیڑ لگا ہوا تھا، اپنا آخری سانس لے رہی ہو۔ کم سے کم ان تینوں نے تو اپنی رگوں میں سے سانس نکلتے اور اپنے آپ کو پتھر بنتے محسوس کیا تھا۔ سانس واپس لینے کے بعد بھی وہ کانوں پر زور ڈال کر یہ دَریافت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ان کے اعصاب واقعی زندہ ہیں یا نہیں، اور انہیں اپنے چاروں طرف کی دُنیا کچھ اجنبی اور ناقابلِ یقین سی معلوم ہوتی رہی۔ وہ بالکل کھوے گئے تھے جیسے انہیں کسی دُوسرے کرے میں جلاوطن کر دیا گیا ہو۔

متھیلڈا تو اتنی بے اعتبار تھی کہ اس نے اپنی ٹانگ کو اسکرٹ سے آزاد کر کے تھوڑا سا آگے پھیلایا، یہ جاننے کے لیے کہ اُس کی پنڈلی کا پلپلا اور دُکھتا ہوا گوشت کہیں ٹھنڈ کا احساس تو نہیں کھو بیٹھا، مگر خشکی کے داغوں والی اُس تھل تھل، پل پل کھال کو، جس کے ہلدی جیسے رنگ میں اب سیاہی مل چکی تھی، اُس کی آنکھیں برداشت نہ کر سکیں

اور اس نے ٹانگ کو پھر چھپا لیا۔

سامنے سڑک پر دُھوپ کے دھبوں کو جن میں زردی تو برائے نام ہی تھی اور اصل رنگ برف جیسا سفید تھا، نا امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کیلب نے اپنے آپ کو کرسی میں اُوپر کھینچا، اور سوچا: کب تک چلے گی آخر یہ سردی؟ ٹھنڈ کی اس رَو کو بیس دن ہو چکے تھے اور وہ، کسی طرح ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وہ اس کی ہڈی ہڈی میں بیٹھی چلی گئی تھی اور اب اس کے اعضاء ایسے جم گئے تھے کہ ذرا سا ہلانے میں ٹوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ روز یہی سوال پوچھتا رہا تھا، اور سردی اس کے سوال پر غور کیے بغیر چلتی چلی گئی تھی — اس کی ہڈیوں میں اور نیچے، اور نیچے۔ اس نے اپنی گردن پھر گریبان میں جھکالی، اور یہ تصور کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جاڑے کی تہیں اس کی ہڈیوں پر کیسے سفید سفید کھریا کی طرح جمتی چلی جا رہی ہوں گی، ہڈیوں کو ایک دُوسرے سے الگ کرتی ہوئی۔

پتوں کی آہ نے ان دونوں کو تو صرف سُن ہی کر دیا تھا مگر نینسی کو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مسل ڈالا۔ یہ جھونکا دُھوپ سے چمکتے ہوئے گولف کے میدان کو اس کے انگریزوں اور کیڈیوں سمیت اپنی جگہ سے اکھاڑ کر دُور فضاؤں میں اڑا لے گیا تھا، نہ معلوم کہاں، اور اب اس کی جگہ لایعنی دُھند چکر کھانے لگی تھی۔ یہی آس تھی جس نے سارے دن اُس کی کمر مضبوط رکھی تھی اور وہ اُسی کی مدد سے صبح منہ دھونے اور پڑھنے کے غیر شخصی معمول سے لے کر اسکول کے نیم تاریک کمرے، کتابوں، کاپیوں، سوالوں، تاریخوں اور ٹیچروں کی ساری بے رنگیاں سہار لے گئی تھی۔ لیکن جب اس نے وہ آہنی گھڑیاں ایک ایک کر کے کاٹ دیں اور گولف کے میدان کو اتنے قریب محسوس کر کے اس کا دل خوش یقین اُمید اور مسرت سے دھڑکنے لگا تو ان جھونکوں نے قضائے مبرم کی طرح سر پر منڈلانا شروع کر دیا۔ وہ صاف دیکھ سکتی تھی کہ اس وقت گولف کے لمبے چوڑے میدان کا ایک ایک ڈھلان، ایک ایک پیڑ، کالے پالش والا ہر ہر ڈبہ، گھاس کی ہر ہر پتی اور ہر ہر پھُول دُھوپ میں جگمگا رہا ہو گا۔ سورج کی ننھی ننھی ہنس مکھ کرنیں گھاس کی کومل ڈنڈیوں پر کھیل رہی ہوں گی، اور وہ ان کے بوجھ سے ہلکے ہلکے کانپ رہی ہوں گی۔ جب ہوا اُن کی جڑوں کو گدگداتی ہوئی چلتی ہو گی تو یہاں سے وہاں تک سارے میدان میں سفید سفید پھول جوش سے اپنے سر ہلانے لگتے ہوں گے۔ میدان کے پار میلوں تک پھیلے ہُوئے دَریا کے خشک ریت پر جگہ جگہ چاندی کے فوارے چھوٹ رہے ہوں گے، اور

مست ہو ہو کر اچھلتے ہوئے بھیڑ کے بچوں کے پیچھے زریں غبار اڑ رہا ہو گا۔ انگریز عورتوں کی زرد اور نیلی جرزیاں اور نیلے پتلون، مضبوط برہنہ پنڈلیاں اور بازو جنہیں دیکھنا نینسی کو اتنا پسند تھا، ان کے سنہرے بال اور دھوپ سے تمتمائے ہوئے رخسار، بڈھے کرنلوں کی تمباکو کے دھوئیں سے زرد مونچھیں اور چکنا صاف سر، ان سب کی چمک اور دلآویزی دوچند ہو گئی ہوگی۔ جب وہ گیند کو مارنے کے لیے اپنا کلب اٹھاتے ہوں گے تو فضا میں ستارہ سا ناچ جاتا ہو گا۔ وہاں کی نرم نرم دھوپ بدن کو گرم کر دیتی ہوگی۔ ہوا میں سردی نام کو نہیں ہوگی اور وہ ہلکے ہلکے ناک کو رگڑتی ہوئی کتنی خوش گوار معلوم ہوتی ہو گی، لیکن نینسی اور گولف کے میدان کے درمیان پیپل کے پتوں میں ہوا کی سرسراہٹ کا گرداب حائل تھا، جس میں سے چاہے وہ ہزار ہاتھ پیر مارے، کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ شاید کسی کو لوہے کی دیواریں بھی اتنا مقید نہ رکھ سکی ہوں جتنا یہ غیر مرئی لہریں نینسی کو تین دن سے اس کی شامیں اسی بے رونق برآمدے میں برباد ہو رہی تھیں۔ دروازے کی محراب پر تو خیر کچھ روشنی رہتی بھی تھی، مگر پیچھے کی طرف تو اتنا دھندلا دھندلا رہتا تھا کہ آنکھیں اس سے جدوجہد کرتے کرتے دکھنے لگتی تھیں، اور شام کے ساتھ ہی ساتھ یہ دھندلا پن اور گرانی بڑھتی ہی جاتی تھی جو اعضا اسکول میں لکڑی کی کرسی پر دن بھر بیٹھے بیٹھے درد کرنے لگتے تھے، اب لوہے کی کرسی پر بالکل شل ہو جاتے تھے۔ بے جوڑ خیالوں کی پینگ میں اونگھتے رہنے اور احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو یا ادھر اُدھر دیکھتے رہنے سے شام اور بھی اجاڑ ہو جاتی تھی اور کاٹے نہ کٹتی تھی۔ ایک اور ایسی ہی شام گزارنے کے خیال سے اسے اتنی کوفت اور جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ اپنے خون میں آگ کے پتنگے تیرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اپنا دِل ہلکا کرنے کے لیے وہ کسی پر بگڑ پڑنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ کس پر۔ صرف اس کے اندر ہوا کے جھونکوں کے خلاف ایک عداوت کا جذبہ اُبل رہا تھا۔

میتھلڈا کسی نہ کسی طرح اپنی توجہ اپنی ٹانگوں کی طرف سے ہٹا کر بنرجی لوگوں کے بنگلے کی طرف مرکوز کر دینے میں کامیاب ہو گئی تھی، گو یہ خیال بھی کبھی کبھی اپنا سر کالے پانیوں میں سے اُوپر اُبھار دیتا تھا، اور میتھلڈا ایک کر اپنے گرد و پیش کے عکسوں سے اسے پھر دبا دیتی تھی۔ آج مس بنرجی کی سہیلی آئی ہوئی تھی اور دونوں بڈمنٹن کے بلے لیے ہوئے سارے لان پر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ ان دونوں کو کبھی ایک جگہ قرار نہ آتا تھا،

پھدکتی ہی رہتی تھیں وہ برابر، اور یہ میتھلڈا کے لیے بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ کم سے کم وہ اسے پسند نہ کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ اپنے بالوں کو برابر کر کے نہ باندھتی تھیں۔ میتھلڈا کئی ایسے موقعے یاد کر سکتی تھی کہ جب اس نے مس بنرجی کی بائیبل ہسٹری کی غلطیاں پکڑی تھیں، مگر اس خیال سے نہیں جتایا جاتا تھا کہ کسی کو شرمندہ کرنے سے کیا فائدہ اور آنکھیں تو وہ ایسی پھڑکاتی تھی کہ اتنی دُور سے بھی میتھلڈا ان کی ہر حرکت کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اتنی زور سے بول رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی جیسے اپنی آواز سے خود لطف لے رہی تھی۔ اس مشاہدے سے سبق اخذ کرنے کی فکر میں میتھلڈا نے تھیکرے کی طرح، جس کا ایک ناول چند دن ہوئے اُس کے ہاتھ پڑ گیا تھا، کوئی بات کہنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا: کتنی عیار اور مغرور ہوتی ہے خُوبصورتی! اس مقولے کی گہری فراست اس کے سر کے گرد ایک ہالے کی طرح پھیل گئی، اور وہ اُس کی سچائی پر وجد کرنے لگی۔

کیا سردی سے ہڈیاں سوجنے لگتی ہیں؟ کیلب نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا وہ اس حد تک سوچ سکتی ہیں کہ وہ ایک دُوسرے سے جڑی نہ رہ سکیں، اور اُن کے جوڑ ٹوٹنا شروع ہو جائیں؟ اگر اس کی ہڈیاں چاروں طرف سے پھولتی چلی آئیں، دیواروں کی طرح بڑھتی ہوئی، اور اس کے دِل، کلیجے، پھیپھڑے، انتڑیوں، سب کو پیس کر رکھ دیا، تو؟ کیا اس شکنجے میں دَب کر اس کی آنتیں تانت کے سُوکھے ہوئے ٹکڑے بن جائیں گی؟

خوب صورتی چند روزہ ہے۔ میتھلڈا نے تھیکرے کی طرح دُوسرا جملہ سوچا۔

اپنے دماغ کی انتہائی قوت سے کام لینے کے باوجود ینسی کو اس قید سے رہائی پانے کی کوئی ترکیب نہ سوجھ رہی تھی۔ گو مس بنرجی اُس سے بات کرنے کی حد تک کبھی نیچی نہ اُترتی تھی۔ مگر ینسی اس وقت ان تمام باتوں کو درگزر کر کے اس کے ساتھ کھیل میں شامل ہونے پر تیار تھی کیوں کہ وہاں لان پر یہاں سے زیادہ روشنی اور سرسبزی تھی لیکن اس تین سال کے عرصے میں لوگوں سے ان کی راہ و رسم اتنی کم ہوتی چلی گئی تھی کہ اب تو انہیں پہچانا بھی نہ جاتا تھا، اور انہیں دیکھ کر منھ پھیر لیا جاتا تھا۔ کوئی بھی گھر قریب میں ایسا نہ تھا جہاں خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا۔ میتھلڈا ہی کسی کام کی نہ تھی، ورنہ وہ دونوں ٹہلنے جا سکتی تھیں۔ اس کی ٹیڑھی ٹانگیں اس کی مرضی کے خلاف چلتی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ سیر سے واپس آ کر ہمیشہ تھک جانے کی شکایت کیا کرتی تھی، اگر اسے اجازت دے دی جاتی تو ینسی اکیلی بھی جا سکتی تھی، بلکہ اس کا تو اسے بڑا شوق تھا۔ وہ روز کی طرح

سر لٹکائے، تھکے بیلوں کی طرح کھسکتی ہوئی نہ جاتی، بلکہ تیز تیز، آزادی سے چاروں طرف دیکھتی، اور نہ وہ گولف کے میدان کے کنارے والے ٹیلے پر بیٹھتی۔ وہ سورج کی کرنوں کو اپنے بالوں میں بنتی ہوئی گھاس پر دوڑتی، جوتا اتار کر ننگے پیر چلتی اور تلووں میں تنکوں کی گدگدی سے مسکرا مسکرا دیتی، گھاس کے سفید پھول چنتی، کوئی سُن نہ رہا ہوتا تو کچھ گنگناتی اور میدان کو طے کرتی ہوئی دَریا کی ریت میں جا پہنچتی۔ وہ ٹھنڈے ریت پر دونوں ہاتھوں میں اسکرٹ سنبھال کر ایسے چلتی تھی جیسے پانی میں سے گزر رہی ہو۔ اُس میں ٹخنوں تک پیر گاڑ دیتی اور دیر تک اسی طرح بیٹھی لوٹتی ہوئی بھیڑوں، ڈھلتے ہوئے سورج اور تیزی سے سفید ہوتی ہوئی ریت کی عظیم چادر کو دیکھتی رہتی۔ وہ اتنی دیر میں گھر لوٹتی کہ پیڑوں کی سیاہی میں سے پھوٹتی ہوئی چھاؤنی کی روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹمانا شروع کر دیتیں، اور ہوا غروب آفتاب کے بعد کی، جب کہ ببول اور شیشم تک مہک اٹھتے ہیں، شیریں خوشبوؤں سے لدی ہوتی۔ شاید وہ ستاروں سے نیم روشن آسمان کے خلاف سُرخ گرجا کو بتدریج سارے منظر پر مسلط ہو جانے والا ٹھوس سایہ بنتے ہوئے دیکھنے کے لیے پل پر ٹھہر جاتی۔ کالج کے لڑکوں کی ٹولیاں لوٹ رہی ہوتیں۔ وہ اسے دیکھ کر ہنستے، اور وہ بھی مسکراہٹ سے ان کا جواب دینے میں خست نہ برتتی۔ ہواؤں میں غیر مرئی دلوں کی لوئیں پٹ بیجنوں کی طرح چمک چمک کر اُڑ رہی ہوتیں، اور چاہے وہ لڑکوں میں مل کر نہ چل رہی ہوتی اور نہ اپنی آواز بلند کرتی، لیکن جنسوں کا سارا فرق بھول کر وہ اپنے جسم اور رُوح کے ساتھ اُن کے قہقہے میں شامل ہو جاتی۔ کیوں کہ یہ وہ عالمگیر اور ملائم قہقہہ تھا جو سورج چھپنے کے بعد زمین کی سطح پر لہریں لینے لگتا ہے، اور جسے آدمی، پیڑ، پتھر، سب ایک دُوسرے کے جسموں میں برقی رَو کی طرح بھیجتے رہتے ہیں۔ وہ شام کے نیلے آسمانوں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پر پھیلائے اُڑنے والی ابابیل ہوتی لیکن اس کے پروں کو ایک طرف تو ڈیڈی نے دبایا ہوا تھا اور دوسری طرف ان سے بھی بوجھل پھیلاتے اور وہ اس برآمدے کی دُھندلی اور بے رونق حراست سے رہائی پانے کی بے تابی میں ہوا پر اپنا سینہ دے دے مار رہی تھی —

نینسی کو اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ ڈیڈی کو اتنی سردی کیوں لگتی تھی۔ اسکول سے آتے آتے اُس کے چہرے پر پسینہ آگیا تھا اور کمر پر چنگاریاں سی لگنے لگی تھیں، اور اُس نے گھر پہنچتے ہی کوٹ اتار پھینکا تھا، مگر وہ اپنے کوٹ اور مفلر کے باوجود سکڑے جا

رہے تھے، اور باہر نکلنے کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اُن کا کوٹ پرانا سہی مگر موٹا تو تھا۔ نینسی کا خیال تھا کہ اس کی تو کھلی بانہیں بھی سردی نہیں محسوس کر رہی تھیں، اور اس کے ہونٹوں پر ناخنوں کا سرد اور منجمد لمس بہت فرحت بخش معلوم ہو رہا تھا۔ نینسی نے تجربے کے لیے اپنے سویٹر کو کمر پر سے پینچتے ہوئے کہا: "کچھ گرمی سی ہے آج تو!"

"گرمی؟ خون جما جا رہا ہے!" کیلب نے نیچی غراہٹ کے ساتھ کہا، جس کی وجہ درحقیقت اس کے سینے کا بلغم تھا۔ سردی کی شدت اس کے دِل میں ہمیشہ بیوی کے داغ کو تازہ کر دیتی تھی۔ وہ پھر اسے یاد کر رہا تھا جب وہ زندہ تھی تو اس کی ہڈیوں کو کتنا آرام ملتا تھا۔ ان دِنوں کے خیال ہی سے ان میں سکون سا پھیلتا معلوم ہوتا تھا۔ انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر تو خیر کوئی بیٹی بھی اس کے پاس رکھ سکتی تھی، لیکن یا تو اب آگ میں سے حرارت ہی نکل گئی تھی یا پھر اس کی مرحوم بیوی کے وجود ہی میں سے گرم کر دینے والی لہریں نکلا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں وہ شام کو بھی اندر ہی رہا کرتے تھے، اس کی بیوی کے گرد بیٹھے ہوئے جیسے مُرغی کے چاروں طرف اُس کے بچے اور وہ باتوں کے بیچ بیچ میں رُک کر یہ دیکھتی جاتی تھی کہ سب آرام سے ہیں یا نہیں۔ لیکن اب اندر کی شامیں کیلب سے برداشت نہ ہوتی تھیں اور اُسے اُن کے بجائے برآمدے کی سردی میں ٹھٹھرنا قبول تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اس کے کندھے دُکھتے رہتے تھے، اور اس کی ہڈیاں ایسے گھن گھن کرتی تھیں جیسے ان میں جھینگر بول رہے ہوں۔ کیا وہ اُس کی رگوں کا خون تھی؟ کیا وہ اُس کی زندگی کا سانس تھی؟

لیکن میتھلڈا کی ٹانگیں سردی سے بے خبر تھیں۔ یہ اعصاب بالکل مردہ ہو گئے ہیں، اس نے سوچا بالکل سوت کے تاگے۔ گوشت کے گھل گھل کر ختم ہو جانے کے بعد بھی یہ تاگے سوکھی ہڈیوں سے لپٹے رہیں گے۔ ہڈیاں خاک ہو جائیں گی مگر شاید یہ باقی رہیں گے — یہ گونگے تار۔ کیوں کہ موسموں کا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

کیلب کا برخاست ہو جانا اس بچاری کے لیے اتنا بڑا صدمہ تھا کہ وہ اسے برداشت نہ کر سکی اور چھ مہینے کے اندر ہی مر گئی۔ ان پریشانیوں میں اُس نے کیلب کو کتنا سہارا دیا تھا۔ اس نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر یسوع سے دُعائیں مانگی تھیں، اور لڑکیوں کو بھی پریشان نہ ہونے دیا تھا۔ ان لوگوں کی دشمنی اور دیدہ دلیری مضحکہ خیز حد تک پہنچ گئی تھی۔ رشوت کا الزام تو خیر، انھوں نے تو یہ تک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیلب کی اولاد ہی نہیں

تھی۔ اگر پادری صاحب آڑے نہ آجاتے اور سرٹیفکیٹ نہ دیتے تو بہت ممکن تھا کہ اُسے یہ تھوڑی سی پنشن بھی نہ ملتی۔ اگر یہ جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو اب اُسے پورے تین سو مل رہے ہوتے، اور وہ بھی اس سے جدا نہ ہوئی ہوتی۔

اس برآمدے کے خون چوُسنے والے زرد اور پھیکے دھندلکے میں ینسی نے سوچا، وہ پیلی پڑتی چلی جائے گی، بھوتوں کی مانند گھلتے گھلتے وہ خواب کی صورتوں کی طرح دُھندلی رہ جائے گی، اور اس کی آواز کنوئیں میں سے آتی معلوم ہوا کرے گی، وہ دیکھی بھالی شکلوں اور چیزوں کو بھی نہ پہچان سکے گی اور انہیں بے تعلق، کچھ نہ سمجھنے والی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہا کرے گی — بشرطیکہ وہ کبھی اس کے سامنے آئیں۔ اس کا تخیل ان دُھندلی زردیوں پر اپنا سر پٹخ پٹخ کر مرجائے گا اور اُسے راہ نہ ملے گی۔ اس کے دماغ کے سیمیں پردوں پر کوئی تصویر نہ ہوگی اور نہ اس کی لاتعداد اور پیچ در پیچ گزرگاہوں پر خیالوں کے زلزلہ آفریں ریلے گردوپیش کی چیزیں میتھلڈا، ڈیڈی، سب رفتہ رفتہ ہوا میں تحلیل ہوتے چلے جائیں گے، اور اُس کے اندر سر سے پیر تک لکڑی کی سی بھوری دیواریں کھڑی ہو جائیں گی جو ہر چیز کو آنے سے روک دیں گی، شاید وہ اس وقت تک ان تمام تبدیلیوں کو محسوس کرنا ہی چھوڑ دے گی۔ شاید اس کا وجود محض ایک نظری دھوکا رہ جائے گا جس کے خدوخال ہوا پر اُبھرتے معلوم ہوتے ہیں، اور دکھائی دینے سے پہلے پھر ہوا میں جذب ہو جاتے ہیں لیکن اُس کی منجمد آنکھیں پھر بھی سڑک پر سورج کی کرنوں میں کسی ان دیکھے اور ان جانے منظر کی راہ دیکھتی رہیں گی، اور اس کے بے تاب کان پھر بھی کسی نامعلوم آواز کو سن لینے کے لیے دُور سے آتی ہوئی صداؤں سے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ کیا کوئی ایسی آواز بھی ہوتی ہے جس سے ایک صدی کا طلسم باطل ہو جاتا ہو؟ کیا کوئی ایسا منظر بھی ہوتا ہے جس سے خشک جھاڑیوں پر سُرخ سُرخ گلاب مہکنے لگتے ہوں؟

ٹانگیں کیا معنی، میتھلڈا کے چہرے تک پر سیاہی کے دھبے پھیلتے جارہے تھے، اور وہ سیاہی بھی ایسی جو بالکل بھینس کی کھال کی طرح بے رونق اور بے رنگ ہو۔ اس نے پاؤڈر کو بھی آزما دیکھا تھا، مگر اس سے سیاہی اور بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔ اُس کا چہرہ اس کے بدن کی طرح روز بروز چوڑا اور چپٹا ہوتا جا رہا تھا۔ بدن پھُول جانے کے بعد بھی بعضے آدمی گولی سے لڑھکتے ہوئے برے نہیں معلوم ہوتے، مگر وہ تو ایسی لگنے لگی تھی جیسے اسے پچکا دیا گیا ہو اور یہ سب صرف چھبیس سال کی عمر میں! ابھی اس کے چہرے پر بڑھاپے کے

کوئی آثار نہ تھے مگر پھر بھی اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا تھا کہ وہ نینسی کی بہن نہیں، ماں ہے۔ ٹہلنے میں اُسے جو لڑکے ملتے تھے انہیں بھی اُس نے یہی کہتے سنا تھا۔ اگر نینسی کا رنگ زیادہ سرخ تھا، اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مسکراتی معلوم ہوتی تھیں اور میتھلڈا کے سے خدوخال، اُٹھی ہوئی ناک اور ٹیڑھی ٹانگوں کے باوجود وہ لڑکوں کی نگاہوں کو اس سے زیادہ متوجہ کر سکتی تھی تو کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگیا کہ وہ نینسی کی ماں تھی؟ دراصل اس نے کبھی دُوسری لڑکیوں کی طرح اپنے چہرے کی غور و پرداخت کا خیال ہی نہیں کیا ورنہ اُس کے چہرے پر بھی ویسی ہی آب ہوتی چھبیس سال بھی کوئی عمر تھی؟ یہ تو نوجوانی کا آغاز تھا۔ آخر ڈچز آو ونڈزر نے تو بیالیس سال کی عمر میں ایک دِل پر فتح حاصل کی تھی، لیکن میتھلڈا جانتی تھی کہ ان چیزوں کے لیے دِل دُکھانا غیر مناسب تھا کیونکہ خوبصورتی چند روزہ ہوتی ہے۔

اگر وہ زندہ ہوتی تو اُس کی خوش فہمی اور انتظامی قابلیت نے میتھلڈا کی شادی کے لیے اب تک کوئی راہ نکال ہی لی ہوتی، روپیہ نہ سہی، مگر وہ کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح سب ٹھیک کر ہی لیتی۔ خود کیلب کے بس کا تو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ لوگوں کو کیسے جتا سکتا تھا کہ اس کی بیٹی ظاہر میں اوروں کے برابر نہ سہی، مگر وہ طبیعت کے لحاظ سے ہیرا تھی۔ وہ اتنی بے غیرتی کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ جو لوگ اسے سلام تک نہ کرتے ہوں اُنہیں میں جا جا کر اڑے، سلام تو الگ رہا وہ تو منھ چھپا چھپا کر ان تینوں پر ہنستے تھے۔

کیا اب کوئی یقین کرلے گا کہ آٹھ سال بھی نہیں ہوئے جب میتھلڈا، نینسی ہی کی طرح سُرخ اور چست چالاک تھی اور ویسے ہی کانونیٹ میں پڑھتی تھی، اور وہ پڑھتی رہتی اگر وہ مقدمہ پیچھے نہ لگ جاتا۔ شاید وہ ایم اے تک تو ضرور پڑھتی۔ تب مسز بنرجی کو خوشیاں بگھارنے کا کوئی موقع نہ رہتا۔ مس بنرجی کی طرح ایک سہیلی پر اترانا کیا، اس کی کتنی ہی سہیلیاں ہوتیں، سب اسی کی طرح تعلیم یافتہ، خوش پوشاک، خوش وضع۔ مس بنرجی کی سہیلی سے بھی نازک اور خوش نما۔ وہ تو لڑکوں تک کو چائے پر بلاتی، اور اس کے بعد سب پیانو پر گانے سناتے، ایسے چھچھورے گانے نہیں جنھیں سننے کے لیے مس بنرجی اور اس قماش کی لڑکیاں چھٹی کے وقت کانونیٹ کی دیوار کے قریب جمع رہتی تھیں، انہیں کھوپسر کو اپنی مسکراہٹیں دیوار کے پار نہایت فراخ دلی سے بانٹتے ہوئے ہمیشہ دیکھا جاسکتا تھا اور ان کی وسیع مشربی رنگ و نسل کی ساری تخصیص اٹھا دیتی تھی۔ جب میتھلڈا کانونیٹ میں پڑھتی تو

اینگلو انڈین لڑکوں تک کی بیٹیاں اور (Your lady Serenade) کی باتیں اس کی آنکھوں کو متوجہ نہ کر سکی تھیں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی انہیں آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہمیشہ دیوار سے دُور رہتی تھی، اور راستے میں کتاب پڑھتی ہوئی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں Sister eucharia mother superior تھیں، وہ شروع ہی سے پاک مریم کا اخلاقی سبق ذہن نشین کراتی تھیں۔ ان کی نیلی چمکتی ہوئی آنکھیں، نورانی چہرہ اور فرشتوں جیسے سفید کپڑے دیکھ کر پاکیزہ باتوں کے علاوہ کسی اور طرف دھیان بٹتا ہی نہ تھا۔ اب نہ تو ویسی تربیت ہی رہی تھی اور نہ ویسی لڑکیاں۔ اب تو تانگے میں جا رہی ہوں یا کلاس میں پڑھ رہی ہوں، خیال سائیکل کی گھنٹیوں کی طرف لگا رہتا تھا اور تو الگ رہیں، خود اس کی بہن نینسی اس کے پیچ و تاب کھاتے رہنے اور مسلسل نگرانی کے باوجود کتابوں میں دل نہ لگاتی تھی۔ میتھلڈا کو معلوم تھا کہ نینسی ٹہلنے صحت کی غرض سے نہیں جاتی تھیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ لڑکے پاس سے گزرتے ہوئے ملتے تھے۔ اسکول میں تو خیر وہ آنکھوں سے اوجھل رہتی تھی مگر ڈیڈی تک کے سامنے اسے لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے سے لحاظ نہیں آتا تھا۔ کالجوں کے معمولی ہندوستانی لڑکوں تک کو گھورنے میں اسے باک نہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں ناچ اٹھتی تھیں، اور ہونٹ بھینچنے کے باوجود مسکراہٹ اُس کے رخساروں اور ناک پر اُمڈ آتی تھی اور میتھلڈا کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ جہاں شام کو اُن کے غولوں کے آنے کا وقت ہوا اور اس نے سڑک پر نظریں دوڑانی شروع کیں اور ٹہلنے جانے سے پہلے وہ اپنی کلائی پر سنہری گھڑی ضرور باندھ لیتی تھی، بلکہ میتھلڈا نے تو اسے تمام حدوں سے بڑھ کر لڑکوں کی طرف زبان نکال کر منھ چڑاتے ہوئے تک دیکھا۔ وہ نینسی کی رگ رگ سے واقف تھی۔

پادری صاحب، کیلب نے سوچا، وعظ میں ٹھیک کہا کرتے تھے کہ آدمی ایک تنکا ہے، اور واقعی آدمی اس سے زیادہ کیا تھا، تھا ہی کیا آدمی کے بس میں؟ ہڈیوں کا آرام چاہیے بس، اور سب تو خاک ہونے والی چیزیں تھیں۔ عیش و عشرت سے زندگی بسر کی جائے یا افلاس میں، انجام ایک ہی ہوتا تھا۔ اب مثلاً نینسی بار بار نئے جوتے کے لیے ضد کرتی تھی کیونکہ اس کا جوتا پھٹ چلا تھا اور اُس میں سے پیر نکل نکل جاتا تھا۔ فرض کیا کہ ایک نیا جوتا آ گیا، مگر چند دن بھی نہ گزریں گے کہ وہ بھی ٹوٹنے لگے گا۔ دُنیا کی ہر چیز ٹوٹنے لگتی تھی، جلدی یا دیر میں۔ وہ ہڈیاں ہوں یا جوتے۔ مگر نینسی بے چاری ابھی بچی تھی، اور

اس کا کچا دماغ ان حقیقتوں پر غور نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے ایک عمر کے تجربوں کی ضرورت تھی۔ یہ اس وقت نظر آتی تھیں کہ جب ہڈیوں کے جوڑ ڈھیلے ہو کر ٹوٹنا شروع کر دیتے تھے۔

کمپاؤنڈ میں سورج کی روشنی تو نہیں، مگر ایک غائب ہوتی ہوئی چمک ابھی تک باقی تھی جسے تھوڑی ہی دیر میں دھواں چوس لینے والا تھا۔ شام کے دو چار ریزے اب بھی جمع کیے جا سکتے تھے، اگر ینسی کو باہر نکلنے دیا جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اُس کی آواز ان اندھے کنوؤں میں نہیں گونج سکتی تھی، مگر شام اتنی تیزی سے اُس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی کہ وہ مشکوک لہجے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی: "باہر ہی ٹہلیں؟"

تو گویا ینسی اب بھی یہی تجویزیں کر رہی تھیں؟ لڑکوں کے آنے کا وقت تھا نا! وہ ان کے انتظار میں چاروں طرف ٹہلتی پھرے گی، کمپاؤنڈ کے قریب مہندی کی جھاڑیوں میں سے جھانکے گی۔ میتھلڈا کی آنکھیں بچا کر گلاب کا پھول توڑ لینے کی کوشش کرے گی۔ کمپاؤنڈ ویسے ہی اُجاڑ پڑا تھا۔ بس ایک گلاب کا پودا رہ گیا تھا اور اس میں ایک پھول۔ اسے بھی وہ نوچ پھینکنا چاہتی تھی۔ صرف میتھلڈا کی نگرانی نے اسے اب تک ینسی کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا تھا۔ شاید وہ اُسے اپنے بالوں میں لگا کر لڑکوں کو دکھانا چاہتی تھی۔ میتھلڈا اسے کتنی دفعہ اشاروں میں تنبیہہ کر چکی تھی، مگر وہ ایسی بن جاتی تھی گویا سُن ہی نہیں رہی۔ اگر کوئی اپنی بھلائی کی بات نہ سمجھنا چاہے تو میتھلڈا کو اس پر ضد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا اور نہ ضرورت۔ مگر وہ اس کو کیا کرے کہ مسز ایڈمنڈ ہر پھیرے میں اسے نصیحت کر جاتی تھیں: "اب تم ہی ہو اُس کی ماں، اور کون بیٹھا ہے۔" جب نیکی بدی کا الزام سب اس کے سر آنا تھا تو پھر یہ اس کا حق تھا کہ وہ ینسی سے اپنا کہنا منوائے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر ینسی باہر نکلی تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ پھرے گی۔ وہ ینسی کی آنکھوں کے سامنے دیوار کی طرح حائل ہو جائے گی اور سڑک کو اس کی نظر سے چھپا لے گی۔ ینسی اس کا مقصد سمجھ جائے گی مگر وہ جھجکے بغیر دونوں ہاتھ پھیلا کر ڈٹ جائے گی۔ دونوں ایک لفظ نہ بول رہی ہوں گی مگر دونوں کی آنکھوں سے چنگاریاں اُٹھ رہی ہوں گی۔ دونوں کے اندر بنیادی جانور جاگ اُٹھے ہوں گے۔ میتھلڈا انتقامانہ جوش سے پیچھا کر رہی ہوگی، اور ینسی ستم رسیدہ کی سی جھنجھلاہٹ اور وحشت ناکی سے مدافعت، ینسی سینکڑوں داؤ چلے گی، مگر وہ ان کے لیے پہلے ہی سے تیار ہوگی۔ چاہے یہ اندھی اور مجنونانہ مبازرت کتنی ہی

دیر چلے وہ ہار نہ مانے گی۔ میتھلڈا اپنی حربی تدابیر ایسے ولولے اور اعتقاد کے ساتھ سوچ رہی تھی جیسے وہ کسی مذہبی جہاد میں حصہ لینے والی ہو اور واقعی وہ اپنے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ چکر لگاتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

اس برآمدے میں کچھ بھی واقع نہ ہو گا، ان لوگوں کے سر کا ایک بال تک نہ ملے گا۔ میتھلڈا اپنے تاریک گوشے میں اور ڈیڈی ستون کے پیچھے اُس کے پروں کو دبائے بے حرکت بیٹھے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ سب مصر کی ممیوں کی طرح راکھ کی مورتیں رہ جائیں گے۔

اس کی ہر ہر ہڈی بولتی معلوم ہوتی تھی جیسے اس میں جان پڑ گئی ہو۔ وہ بے گوشت و پوست اور بدشکل ڈراؤنے بونوں کی طرح اس کے جسم میں چھپی بیٹھی تھیں جو ہر وقت ایک دُوسرے سے کھسر پھسر سازش کرتے رہتے تھے۔

اور پھر ایسی سردی میں بغیر کوٹ کے پھرنے سے نزلہ ہو جانے کا اندیشہ تھا، اور نزلہ تو نمونیا کا پہلا قدم ہے ہی۔ اگر نینسی باہر گئی تو میتھلڈا ڈیڈی سے کہہ کر اسے بلوا لے گی۔ وہ خود پکار کر کہے گی: "چلو، اندر آ کر کوٹ پہنو، کہاں پھر رہی ہو ایسی سردی میں، نمونیا ہو جاتا ہے آج کل۔"

کیا یہ لازمی تھا کہ گرجا میں گھنٹہ ضرور بجایا جائے؟ اس کی ہر ہر ضرب کیلب کی ہڈیوں پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ شاید گھنٹہ اُس کے جوڑوں کو اتنے دن بھی چلنے دینے والا نہ تھا۔

اوہ، شادی کی گھنٹیاں! جب سے میتھلڈا نے السٹریٹڈ ویکلی میں ایک مضمون "میں شادی سے نفرت کرتی ہوں" پڑھا تھا وہ جانتی تھی کہ شادی اور اس کی رسمیں کتنی مضحکہ خیز چیزیں تھیں، اور وہ اس وقت بھی ہنس سکتی تھی۔

گھنٹیوں کی آوازیں ہوا میں چمک دار فاختاؤں کی طرح قلابازیاں لگا رہی تھیں۔ نینسی اس کا کوئی سبب دریافت نہ کر سکتی تھی کہ وہ لوگ گرجا کیوں نہیں جاتے تھے۔ اسے تو یہ آوازیں اپنے پروں پر بڑے کیتھیڈرل کی طرف اڑائے لیے جا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ نشستوں کے درمیان اس تاریک اور پُراسرار راستے پر قربان گاہ کی طرف بڑھتی جائے اور ان اونچی شمعوں کے درمیان میں مصلوب یسوع کے قدموں کے قریب جا کھڑی ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ برآمدے کے دُوسرے حصے میں بیٹھی ہوئی مسز فلپ ان گھنٹیوں سے بہت لطف لے رہی تھی۔ اُس کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے، اور جب سے وہ اس برآمدے میں بیٹھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ روز شام کو اوور کوٹ میں لپٹ کر کتاب ہاتھ میں لیے آ بیٹھتی تھی، اور ہر آواز پر چونک کر دیکھ لیتی تھی کہ اُس کا شوہر آ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے آنے پر وہ ایسے انداز میں مسکراتے ہوئے اُچھل پڑتی تھی جو میتھلڈا کو ہمیشہ غیر معقول معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے شادی میں وہ کیا غیر زمینی نعمتیں تھیں جن کی وجہ سے گھنٹیوں کی آواز تک اس کے چہرے کو تمتمائے دے رہی تھی۔

کمپاؤنڈ میں سے چمک غائب ہو چکی تھی، اور جنگل کی طرف سے لوٹ لوٹ کر دُھواں اس طرف پھیلا جا رہا تھا۔ گلاب کے پودے کی ہریالی دُھندلا گئی تھی، مگر پھُول گہرا سُرخ ہو گیا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں ینیسی شام کی خوشبوئیں سُونگھ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خوشبوئیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ اُن سے دم گھٹنے لگے گا اور سڑک پر اتنا دُھواں چھا جائے گا کہ مشکل سے وہاں کچھ نظر آ سکے گا۔ اس کی آنکھیں انتظار دیکھتی رہی تھیں، مگر سڑک ویسی ہی بھوری اور بے رنگ پڑی رہی تھی۔ اس نے کان لگائے رکھے تھے مگر اس کے لیے کوئی آواز نہ گونجی تھی۔ کیا یہ اچھا نہ تھا کہ اس کے گرد ہر چیز دھوئیں میں جذب ہوتی چلی جائے اور کوئی آواز یا رنگ رہے ہی نہ جسے اس کے کان سنیں اور اس کی آنکھیں دیکھیں؟

آخر سردی نے ایک دکھائی دینے والی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ دُھواں بن کر ہر طرف سے بڑھی چلی آ رہی تھی، ہر لحہ قریب تر، نزدیک تر۔ یہ دُھواں اس کے جسم کے مسامات میں بیٹھتا چلا جائے گا اور اس کی ہڈیوں کے گرد فیتے کی طرح لپٹ جائے گا۔

میتھلڈا کی مدد کے لیے دُھواں آ پہنچا تھا۔ آج اب تک لڑکے نہ آئے تھے۔ اول تو اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اب ان کے آنے کی اُمید ہی نہ تھی، اور اگر وہ آئے بھی تو دُھواں انہیں اپنی تہوں میں چھپا لے گا اور ینیسی انہیں نہ دیکھ سکے گی۔ وہ اپنی ناکامیابی پر جھلا جائے گی اور ساری رات بے چین رہے گی۔

دُھواں ہڈیوں کے گرد جم کر لوہے کے پتروں کی طرح سخت ہو جائے گا اور پھر اس کے اعضا حرکت نہ کر سکیں گے۔ اس کے اندر سناٹا چھا جائے گا اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجسمے کی طرح ہوا کو گھورتا رہے گا، گھورتا رہے گا۔ اس آہنی دھوئیں کی وجہ سے اس

کا جسم گل کر خاک بھی نہ ہو گا، بلکہ یوں ہی ہوا کو گھورتا رہے گا برسوں — صدیوں — ہمیشگی کی ایک یادگار۔

دُھوئیں میں رات کی تاریکی شامل ہو جائے گی — تاریکی جو بھینس کے رنگ جیسے داغوں والی تھل تھل پل پل کھال اور انار جیسے رخساروں میں تمیز نہیں کرتی۔ وہاں نہ تو دُوسروں کو دیکھا جاسکتا ہے نہ اپنے آپ کو۔ وہاں ہوتا ہے وہ مکمل امن اور سکون جو سمجھ سے باہر ہے۔

دُھواں، دُھواں، دُھواں اور اس کے بعد رات کی اندھی پہنائیاں۔ لیکن..... کون کہہ سکتا تھا؟ شاید وہ جادُو کی آواز دُھندلکوں پر ہی اُڑتی ہوئی آتی ہو! شاید وہ طلسمی منظر تاریکیوں کو چیر کر ہی ظاہر ہوتا ہو۔

"ساقی" سالنامہ جنوری ۱۹۴۳ء (۸ نومبر ۱۹۴۲ء)

اِختتامیہ

جو باتیں عموماً کتاب کے شروع میں کہی جاتی ہیں، مَیں نے انھیں آخر میں کہنا پسند کیا ہے، کیونکہ ہر لکھنے والے کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ میری تعریف کریں۔ میں یہ باتیں سرے سے کہتا ہی نہ اگر میں وقتی تعریف سے مطمئن ہو سکتا۔ مجھے کچی دھاتوں کے ایک ڈھیر کے بوتے پر جوہری بننے کی خواہش نہیں ہے، ہاں اگر اُسے تپاتے تپاتے — اور میں آپ کو بھی اپنی دھونکنیاں لانے کی دعوت دیتا ہُوں — کچھ سونا نکل سکے۔ کھرا کھوٹا الگ کرنا تو درحقیقت آنے والی نسلوں ہی کا کام ہے، لیکن میری آرزو ہے کہ میری نسل کم سے کم میرے کھوٹے کو کھرا نہ سمجھے، جو بری بھلی پذیرائی میرے افسانوں کو حاصل ہوئی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے فی الحال یہی اندیشہ زیادہ ہے: اپنے کھرے کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے، اور نہ کسی لکھنے والے کو ہونی چاہیے، اگر وہ اَدب کی تاریخ سے واقف ہے — اِسی لیے میں اپنے افسانوں کے متعلق اپنی رائے محفوظ نہیں رکھتا، گو اپنے بارے میں مصنف کی رائے دُوسروں کی رائے سے لازمی طور پر زیادہ قابل وقعت نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی رائے آخر کے لیے رکھی ہے، کیوں کہ مَیں آپ کے اور اپنے افسانوں کے درمیان آنا نہیں چاہتا، اور نہ پڑھنے سے پہلے آپ کے دماغ کو ایک مخصوص تاثر قبول کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہی تاثر زیادہ قابلِ قدر ہے جو آپ آزادانہ قائم کریں۔ میری گزارشات تو محض تقابلی مطالعہ کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔

اُردو ادب کے موجودہ دَور کا الزبتھ کے زمانے سے مقابلہ کیجیے، اسے نشاۃ ثانیہ کہیے، جو دعوے کیجیے مجھے سب تسلیم ہیں۔ مَیں اس دَور کے مداحوں اور حامیوں میں سے ایک ہوں، اس لیے شاید مجھے کچھ گستاخیوں کی اجازت بھی ہوگی۔ موجودہ اَدبی تحریک کم سے کم اپنے ابتدائی زمانہ میں، اثبات نہیں بلکہ انکار کے دھارے پر آگے بڑھی ہے۔ یہ

حقیقت ہے کہ ماحول میں اس کے کافی سے زیادہ معاشیاتی، سیاسی اور اَدبی اسباب موجود تھے لیکن توجیہ معاملہ کو ختم نہیں کر دیتی، اور نہ جواز ثابت کر دینے سے کسی چیز کے نقصانات کم ہوتے ہیں۔ اس انکاری رُوح نے نہ صرف فاسد مادہ کو خارج کیا بلکہ اَدب میں نیا خون بھی دوڑا دیا اور محسوسات و مدرکات کی نئی نئی سرزمینوں کو ممکن بنایا۔ لیکن ادب اور زندگی کی بہت سی بنیادی ضرورتوں اور حقیقتوں کی طرف سے بے اعتنائی بھی پیدا کر دی، اور یہ ایسا زخم ہے جو مدت میں اور مشکل سے بھرتا ہے۔ اس تحریک کے (میری مراد کسی خاص تحریک سے نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے) رُوحِ رواں ایسے نوجوان تھے (ہیں) جو تعلیم پا رہے تھے یا ابھی تعلیم ختم کر چکے تھے۔ فطری طور پر ان نوجوانوں نے زبانِ قلم سے نہ سہی، اپنی رُوح کی گہرائیوں میں ہر چیز سے انکار کیا، سوائے اپنی عظمت کے۔ مَیں مخصوص افراد پر الزام نہیں لگا رہا ہوں بلکہ ایک عام فضا کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایک عام نوجوان جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اس احساس کے ساتھ کہ شروع سے لے کر اب تک اُردو کی اَدبی تاریخ ایک خالی صفحہ ہے، اور وہ پہلی مرتبہ اَدب پیدا کر رہا ہے لیکن عظیم اَدب پارے پیدا کرنے کے لیے ان عظیم سایوں کا احساس ضروری ہے جو ہمارا راستہ روکتے ہوئے معلوم ہوں، بلکہ عظیم اَدب پارہ پیدا کرنے کی خواہش ہی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ میں بڑی حد تک اس نئے رنگ میں رنگا ہوا تھا، لیکن خوش قسمتی سے مجھے دو رہنما ایسے مل گئے جن کے فیض سے میں نے احترام اور عظمت کے کھوئے ہوئے احساس کو دوبارہ پا لیا۔ ان میں سے ایک الہٰ آباد یونیورسٹی کے انگریزی کے ریڈر جناب ستیش چندر دیب صاحب ہیں۔ اُن کی تقریروں سے جو کچھ مَیں نے سیکھا، اس کا تو ذکر ہی کیا، قدیم اَدب کی جلیل القدر ہستیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں اور چہرے کی چمک، ابرو کا نیا شانہ تناؤ اور تقدس و احترام کے مذہبی جذبے سے آواز کی تھرتھری کہ جب خود ان کی ذات عظمت و رفعت اخذ کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی — صرف انھی چیزوں نے میرے لاتعداد شبہے اور کج خیالیاں زائل کر دیں اور یہی کچھ میں حضرت فراق گورکھ پوری کے متعلق کہہ سکتا ہوں جو آج بھی اس جنس گراں کی پرستش کر سکتے ہیں جس کا بازار میں کوئی خواہاں نہیں۔ انھی قدموں کی برکت ہے کہ میں اپنی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا۔ مَیں دیو قامت افراد کا وجود تسلیم کرتا ہوں اور ان سے اپنا قد ناپتا رہتا ہوں۔ اگر ہمیں اپنے اَدب کو انسانی ترکہ کا ایک حصہ بنانا ہے تو ہم زیادہ عرصے تک اپنے آپ کو زمان و مکان میں محدود نہیں رکھ سکتے۔ اَدب میں

ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بن سکتیں۔ اگر ہم اُردو میں صرف نئی نئی راہیں کھول دینے پر ہی مطمئن نہیں ہیں، بلکہ واقعی "سونے کی سرزمینیں" فتح کرنا چاہتے ہیں تو جلد یا بدیر ہمیں نہ صرف اپنے پیش رُووں سے بلکہ ساری دُنیا کے بڑے بڑے نثر نگاروں اور شاعروں سے اپنا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یہ کام آنے والی نسلیں تو خیر کریں گی ہی، مگر وہ ہمارے لیے بے فیض ہوگا۔ اس مقابلے اور موازنے سے پہلو بچانا گویا اپنے قد کو بڑھنے سے روکنا ہے۔

اس ہماہمی اور گہماگہمی میں ہم ایک بات اور نظرانداز کر گئے ہیں، یعنی اُردو اَدب کے روایتی دھاروں سے واقفیت — موضوعات اور اسالیب بیان، دونوں چیزوں سے متعلق۔ ہم نے لکھنا تو شروع کر دیا، مگر یہ سیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ لکھتے کیسے ہیں۔ یہ رجحان ایک طرح سے عالم گیر ہے اور اس نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کو افسوس ناک لہجے میں یہ خواہش ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے کہ کسی طرح درس گاہوں میں خطابت (Rhetoric) کی تعلیم پھر سے شروع کی جاسکتی۔ مجھے اس اندازِ نظر کی کمزوری کا احساس اس وقت ہوا کہ جب میں منجدھار میں پہنچ چکا تھا۔ میرے دِل میں اکثر یہ تمنا پیدا ہوئی ہے کہ کاش مجھے فلابیر جیسا سخت استاد ملتا جو کبھی میرے لکھے ہوئے سے مطمئن ہی نہ ہوتا بلکہ ہر دفعہ کاٹ پھینکتا اور پھر سے لکھواتا۔ تب ممکن تھا کہ میں واقعی اَدب کی تخلیق کرسکتا۔ فی الحال میرے افسانوں میں اَدب کا مواد تو بہت کافی موجود ہے مگر وہ بذاتِ خود اَدب نہیں ہیں..... روایت اور اختراع کو متعلق رکھنے کے لیے، نیوں کو پرانوں کی یاد تازہ کراتے رہنے کے لیے اور نئے رجحانات کے دَرمیان مصلح (Corrective) کا عمل انجام دینے کے لیے کسی ایسے بزرگ کا وجود لازمی تھا جس کا سب نوجوان احترام کرسکتے۔ لیکن اُس وقت اُردو میں کوئی ایسا آدمی موجود نہیں ہے، اور یہ بھی ضروری تھا کہ وہ آدمی نقاد ہوتا۔ مَیں کسی ڈکٹیٹر کی اہمیت بیان نہیں کر رہا ہُوں، بلکہ میرا مطلب صرف ایک ایسے آدمی سے ہے جس کی بات قابلِ قدر سمجھی جاسکتی۔ بس وہ حیثیت سمجھئے جو آج کل انگریزی میں ٹی۔ ایس ایلیٹ اور فورسٹر کو حاصل ہے۔ غالبًا اس فقدان کا سبب شعور کا تیزی سے اور بغیر کسی مضبوط دَرمیانی کڑی کے بدل جانا ہے۔اور یہ بھی کہ ہم ابھی تک اُردو میں کوئی قوی تنقیدی تحریک پیدا نہیں کرسکے ہیں۔ اُردو اَدب جہاں تک پہنچ چکا ہے، اُسے مجموعی حیثیت سے آگے بڑھانے کے لیے تخلیقی جوہر کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ ایک پُر از معلومات اور جان دار

تنقید کی۔ اس تنقیدی تحریک کو تازہ ترین معاشی، سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی، عمرانی اور فلسفیانہ نظریوں سے مسلح تو ہونا ہی ہوگا، لیکن سب سے زیادہ اس کے لیے مغرب اور مشرق کی اَدبی اور تنقیدی تاریخ سے پوری آگاہی لازمی ہوگی، اور ہر اَدبی کیفیت اور انداز کا منبع اور مخرج بتانا ہوگا۔ صراحتاً اس تحریک میں ڈبلیو پی کیر، ٹی ایس ایلیٹ، ارونگ بیبٹ، پول ایلمر مور، ژولیسیس باں دا، جیسے عناصر کی ضرورت ہوگی، لیکن اس تحریک کو خالص نفسیاتی تنقید، اور دُوسری طرف کروچے کی جمالیات اور اظہاریت (Expressionism) سے خطرہ لاحق ہو گا۔ ممکن ہے کہ میں ان چیزوں کو سمجھتا ہی نہ ہوں، لیکن میرے دماغ میں ان کا جو تخیل ہے، اُس کے مطابق یہ معیار قائم کرنے میں صرف ناکامیاب ہی نہیں ہوئیں بلکہ سِرے سے معیاروں کی ضرورت اور وجود ہی تسلیم نہیں کرتیں، اور تقابلی مطالعے کو مہمل قرار دیتی ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت اَدب اور آرٹ کو زندہ رکھنے میں کہاں تک معاون ہو سکتی ہے جب کہ اس قلم رو میں طوائف الملوکی کا یہ حال ہے کہ Surrealists کے نزدیک سڑک کا ہر وہ پتھر جو آپ کو پسند آ جائے، آپ کا تخلیقی کارنامہ ہے۔ یہ اگلا قدم نہیں ہوگا بلکہ ہم اس منزل تک پہنچ چکے ہیں کہ جہاں ادب اور ہذیانات میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کوئی حد فاصل نہیں رہتی۔ اَدب کی شادابی، بلکہ زندگی کے لیے معیاروں کا دوبارہ قائم کیا جانا ناگزیر ہے۔ خصوصاً اُردو اَدب میں جو درمیانی منزلیں طے کیے بغیر مغربی اَدب کی موجودہ کیفیت تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے۔ بہرحال اس مسئلے میں میری دو رائیں نہیں ہیں کہ اب اُردو اَدب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے۔ لیکن تخلیق اور تنقید Caricature اور Parody میں آ کر ایک ہو جاتی ہیں۔ اول تو ہر لکھنے والے کو خود اپنے اوپر ہنسنے کی کوشش کرنی چاہیے، ورنہ کم سے کم دُوسرے تو موجود ہوں جو اس پر ہنس سکیں، اور کسی اَدبی دَور میں Parody کا پیدا ہو جانا یقیناً صحت وارانہ علامت ہے۔ کیوں کہ ہر ہنسی کی بنیاد کینہ اور دشمنی نہیں ہوتی لیکن اس قسم کی Parody کا رجحان بھی۔ اُردو میں کنہیا لال کپور کے ایک آدھ مضمون سے باہر نہیں پایا جاتا۔ شاید ہم لوگ بہت سنجیدہ ہیں — اپنے آپ کو بہت سنجیدہ سمجھتے ہیں۔

خیر یہ تو تھا اپنے زمانہ کی اَدبی فضا کے متعلق۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں ہیت کا احساس ہے ہی نہیں۔ فنی اور ہیئتی اعتبار سے میرے افسانے عجیب کانے کھدرے ہیں۔ بالکل بے ڈول کانیں نکلی ہوئی، لیکن اس طبعی کمزوری کے باوجود مَیں کچھ ٹھونک پیٹ کر

اُن کی شکل و صورت دُرست کرنے کی کوشش کر سکتا تھا، اگر قدرت نے مجھے تھوڑا سا صبر و سکون اور اِستقلال بھی دیا ہوتا۔ یوں افسانہ سوچنے اور لکھنے میں تو مَیں مہینوں لگاتا ہوں مگر یہ اَمر مشکوک ہے کہ یہ وقت واقعی جائز طور پر صرف ہوا۔ بہت سی خامیاں ایسی ہیں جنھیں مَیں دیکھتا بھی ہوں اور نکال بھی سکتا ہوں، لیکن اگر مجھ میں اپنا مسودہ دُہرانے کی طاقت ہوتی تو پھر میں اپنے مجموعے کا مقدمہ کسی مشہور ادیب سے نہ لکھواتا؟ تخلیق کا اُصول ہی یہ ہے کہ پہلے موضوع کو پوری شدت کے ساتھ ایک چمکتے ہوئے نقطے کی طرح محسوس کیا جائے، لیکن اس کے لیے رُوحانی کاوش کی ضرورت ہے۔ جس سے بڑے بڑوں کو پسینے آ جاتے ہیں اور میں ٹھہرا سہل انگار اور تن آسان۔ پھر میرے نفس مضمون نے مجھے اور ڈھیل دے دی۔ گو اب تو میں نے محسوس کر لیا ہے کہ خالص نفسیاتی اور تحلیلی افسانہ اپنی منطقی حدوں تک پہنچ کر جاسوسی ناول بن جاتا ہے۔ اس میں دِلچسپی کے عناصر نہیں ہوتے یا Jig-Saw Puzzle کی ایک پُر تصنع شکل، لیکن میرے افسانے ابھی تک تحلیل ہی کی طرف مائل رہے ہیں اور تحلیل اور ہیئت میں بیل مارے کا بیر ہے۔ جدید نفسیات نے آرٹ میں ہیت کی بنیادیں کھود ڈالی ہیں، کیونکہ اس کے نزدیک انسانی زندگی نام ہی ہے ناہمواری، بے ترتیبی اور غیر تسلسل کا یہاں "کجا از کجا تاختن" کی پوری اجازت ہے، اور لفظ Texture کوئی معنی نہیں رکھتا، یا ہمواری، ساخت، تعمیر اور مجسمہ سازانہ ڈھلائی کا نام نہ لیجیے، یا حقیقت نگاری سے کنارہ کش ہو جائیے۔ اس نظریے میں حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کا نام لے کر ہر لکھنے والا فنی خامیوں کے الزام سے بچ سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے مواد اور مضمون کو جانچنے تولنے اور اُسے ایک وحدت کی شکل میں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، ہر بات جو آپ کو چلتے پھرتے یاد آ جائے، کھپ سکتی ہے۔ عمرو عیار کی زنبیل میں ہر چیز کے لیے جگہ ہے۔ میں اپنے ہی افسانوں میں سے ایک مثال پیش کر سکتا ہوں مگر.... جانے دیجیے، پھر آپ میرا اگلا مجموعہ نہیں خریدیں گے.... میرے افسانوں میں کم سے کم پلاٹ ہونے کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر مَیں کہتا ہوں کاش کہ ہوتا! تب شاید میرے افسانوں کی ہیئت کچھ بہتر ہوتی، کیونکہ بھرتی کی گنجائش کم رہ جاتی اور در حقیقت فنی نقطۂ نظر سے میں بہ نسبت اور افسانوں کے "ایک معمولی خط" سے زیادہ مطمئن ہوں یہ اور بہتر ہوتا اگر یہ ریڈیو کے لیے نہ لکھا جاتا۔ یہ افسانہ میں نے والٹیر، موپساں، اناطول فرانس اور استاں وال کے تازہ اثرات کے ماتحت لکھا ہے۔ چنانچہ یہاں میں اپنے مواد پر

پوری طرح قابض ہوں، حالانکہ اور سب افسانوں میں، مَیں نے اپنے آپ کو مواد کے قبضے میں دے دیا ہے۔ تجربے اور محسوسات پر یہی قادرانہ غلبہ ادب کی جان ہے۔ اگر بالزاک کے محاوروں کا ایسا ٹھیٹھ ترجمہ آپ کو گراں نہ گزرتا ہو تو مجھے کہنے دیجئے کہ کام اُسی وقت بنتا ہے جب چیخ چاخ کی پروانہ کرے، بس دبالے۔ (لیکن ذرا گنئے کہ ایسے مرد آج کل ہیں کتنے — صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی)..... اس مذکورہ افسانے کے علاوہ "حرام جادی" کے آدھے حصے کو پڑھ کر میں بھی کئی دفعہ جھوم چکا ہوں۔ شاید اس کا باقی حصہ بھی اچھا ہوتا اگر میں اپنے کردار کے خیالوں کی رَو کا پیچھا نہ کرنے لگتا، بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتا۔ لیکن مجموعی طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے افسانوں میں ہیتی حسن پیدا کرنا تو الگ رہا، باوجود اس کے متعلق بہت کچھ پڑھ چکنے کے، میں دُوسروں کی تحریروں میں سے اسے نہیں پہچان سکتا۔ ان تمام نظموں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سے، جو آج تک میں نے پڑھے ہیں، صرف ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی رُوح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں۔ اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹریس" ہے، یہ خالص موسیقی ہے اور مَیں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کر سکوں، لیکن کہیں پھٹی ڈگڈگی سے "نغمہ سیارگان" نکلا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ میرا افسانہ "حرام جادی" چیخوف کے اسی افسانے سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہے تو اسے جمال ہم نشیں کا عکس ہی سمجھئے۔ اسی طرح "چائے کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن معنوی ہو یا حسن صوری، سب رُوح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ کسی لکھنے والے میں سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کتنی گہرائی سے بول رہا ہے۔ لیکن نہ تو میرے دماغ کو باریکیوں اور لطافتوں کی سمجھ ہے، اور نہ میری رُوح میں گہرائی ہے — اور نہ قوت۔ ممکن ہے کہ آپ کو کبھی کبھی میری آواز گہرائیوں میں سے آتی معلوم ہوتی ہو۔ درست ہے۔ مگر یہ آواز ایسی ہی ہے جیسی لحاف اوڑھ کر نکلتی ہے۔ واقعی اس تمام عرصے مَیں لحاف اوڑھے ہوئے تھا — خون کی گرمی اور جوش کا لحاف — اور پھر اُوپر سے اس زمانے کی نیم گرم اور سیلی سیلی بھاپیں، جو جسم اور آنکھوں پر چربی کی طرح چھا جاتی ہیں۔ (میں لحاف کا استعارہ تو استعمال کر گیا ہوں لیکن اب مجھے

خیال آتا ہے کہ کہیں اسے عصمت چغتائی کے "لحاف" پر طنز نہ سمجھ لیا جائے۔ ایسا بالکل نہیں ہے)۔ اَدب کے موجودہ جنسی ہیجان کا جواز موجود سہی، لیکن بڑی حد تک یہ طوفان لوگوں نے خود اپنی پھونکوں سے بنایا ہے، اور اس طوفان نے درخت اور مکان نہیں اکھاڑے ہیں بلکہ — مرغی کے پر۔ اس طوفان نے فائدہ بھی پہنچایا ہو گا، مگر اس شوں شوں پھوں پھوں میں بہت سے نغمہ ہائے زیر لبی دَب گئے ہیں۔ اَدب میں جنس کا ذکر بذاتِ خود بری چیز نہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں جنسی عامیانہ پن ذہنی تندرستی کا نشان ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں چوسر جھجکے بغیر بڑھئی اور چکی والے کے قصے لکھ سکتا تھا، اور ساتھ ہی کنواری مریم کی تعریف میں ایک نظم بھی۔ ہم لوگ تعریف تو شاید جنسی فعل کی بھی نہیں کر سکتے — اس سے لطف نہیں لے سکتے — ہاں، کوئی "گندی بات" کہنے کے بعد سر پھرا پھرا کر دیکھتے ہیں کہ لوگ اس سے چونکتے بھی ہیں یا نہیں۔ (مجھے بار بار انتباہ کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ میں کہیں بھی مخصوص افراد پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں تو صرف ایک عام اَدبی فضا کی بحث ہے، ورنہ موجودہ بہترین جنسی افسانوں کی اہمیت کا میں بھی اتنا ہی قائل ہوں جتنا کہ کوئی اور) گندی سے گندی بات اچھے سے اچھا ادب بن سکتی ہے۔ مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا اَدب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ بڑے اَدب کی پیدائش کے لیے ہر قسم کا نسائی اور مجہول انفعال ایک رکاوٹ ہے، اور خصوصاً جنسی جذبے کے سامنے انفعال میں نے جنسی جذبے کی مدافعت کرنے کی کوشش تو ضرور کی ہے مگر کئی دفعہ میں اس سے دَب گیا ہوں، اور اس پسپائی میں مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش کا بھی تھوڑا سا دخل تھا۔ مگر "پھسلن" کی تہہ میں اس قسم کی کوئی پسپائی یا خواہش نہ تھی۔ یہ افسانہ میں نے اس زمانے میں لکھا ہے جب میں زولا کو بہت بڑا مصنف سمجھتا تھا اور غیر مشروط حقیقت نگاری، خارجیت اور معروضیت میرا مطمحِ نظر تھیں اور نہ مَیں نے اسے فوراً مقبول ہو جانے کی تمنا میں لکھا تھا۔ اِس قسم کی آرزو تو کجا، اُس وقت تو مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ میں افسانہ لکھ بھی سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس افسانہ کا مصنف کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں آتی لیکن "چائے کی پیالی" ضرور فحش نگاری (Pornography) کی حدود میں آ جاتا ہے۔ اس کے بعض حصے پڑھتے ہوئے مجھے خود شرم آنے لگتی ہے۔ اگر اس افسانے کی مجموعی کیفیت کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو — رُوحانی فیل پا۔ اسے پڑھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چار آنے والے تھیٹر کا مسخرا ٹانڈ پر بانس پیٹ پیٹ کر اشتہار

دینے کے لیے اپنے پاس کھڑی ہوئی عورت کے کپڑے اُتارنے شروع کردے — ایک کے بعد دُوسرا — اور دونوں میں سے کوئی بھی شرم محسوس نہ کرے، بلکہ مسکراتے رہیں۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ قمیض کے نیچے سے کپڑے کی دو گیندیں نکلیں — جو ننگی عورت سے بھی زیادہ فحش چیز ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ افسانہ غیر حقیقی ہو۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی اصلی لڑکی کے خیالات اس سے بھی زیادہ جنسیت لیے ہوئے ہوتے تو نفس مضمون میں تو کوئی سقم نہیں، مگر اس کے بیان میں کچھ میرے ہی قدم ڈگمگا گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ کچھ ہوگا، مگر اشارتاً کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی قسم کی جذباتی کیچڑ ہے جس میں گالز وردی کو لوٹتے ہوئے ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے پکڑا تھا..... یہ جنسیاتی رجحان ہی ہے جس نے اکثر جگہ میرے افسانوں میں "جھوٹے سر" (False Notes) پیدا کر دیے ہیں، اور میری تکنیکی اور ہیئتی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ شاید رگوں میں ٹھنڈک پڑنے کے بعد میں فن اور ہیئت کی طرف زیادہ کامیاب توجہ دے سکوں گا لیکن چونکہ میرا ادبی سرمایہ زیادہ تر جنسی قسم کا ہی ہے اس لیے یہ بھی اندیشہ ہے کہ خون کا دباؤ اور اعصاب کا تناؤ کم ہو جانے کے بعد میں اچھا فن کار تو ہو جاؤں گا، مگر شاید پھیکا، پھس پھسا بھی رہ جاؤں گا۔

آپ رُوح کا نام سنتے سنتے گھبرا گئے ہوں گے، کیونکہ یہ کوئی چٹپٹی چیز نہیں ہے، لیکن میں ایک مرتبہ پھر یہ لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوں، تو ان ساری کمزوریوں کی جڑ یہ ہے کہ نہ تو میری رُوح میں شدت ہے، نہ میرے جذبات میں گہرائی، اور نہ مجھے ان پر اعتماد۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں لوگوں کو صرف سادہ پانی سے مطمئن کر سکوں گا۔ اس لیے میں نے اُس میں تھوڑی سی شراب بھی ملائی ہے، کچھ تو رسیلے جذبوں کی، اور کچھ الفاظ کے شدومد کی۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ رُوح عصر کے اظہار کے لیے سرسامی اور وحشیانہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس مقولے کی سچائی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "دیوتا گہرائی چاہتے ہیں، رُوحانی آشوب نہیں" — اور خصوصاً ادب کے دیوتا جو لوگ محسوس کرتے ہیں وہ لفظوں کے زور و شور کی مدد نہیں مانگتے۔ شدتِ احساس، خلوص، جذباتی واقعیت اور بیان کی قطعیت کے لحاظ سے ورڈز ورتھ کی اس ایک لائن کے مقابلے کی مثالیں کم ہی مل سکتی ہیں:

"And Ho, The Difference to me."

مَیں اس صفت کی تعریف تو کر سکتا ہوں، مگر اسے اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا۔

کیونکہ دراصل مَیں سطحیت پسند واقع ہوا ہوں۔ مجھے کسی چیز پر کافی حد تک یقین ہی نہیں ہے۔ جب یقین نہیں تو تخلیق کہاں! اسی الہام و انکشاف کا احساس (Sense of revelation) جو ادب کے لیے اتنا ضروری ہے، میرے صفحوں میں نہیں ملتا۔ اے ای (AE) نے کسی کے متعلق کہا تھا کہ اس کے اندر اتنا ہیجان (Chaos) ہی نہیں ہے کہ کائنات (Cosmos) بن سکے۔ یہی میرے اُوپر بھی صادق ہے۔ میری رُوح میں بھی اتنا ہیجان نہیں ہے — صرف چائے کی پیالی کا طوفان۔

مَیں نے پلاٹ کے متعلق کچھ کہنا شروع کیا تھا، مگر پھر میں دُوسری طرف بھٹک گیا۔ میرے افسانوں میں پلاٹ کم سے کم پایا جاتا ہے۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی مبارک باد کے قابل چیز ہے یا نہیں۔ لیکن ایسا ہونا دو وجہ سے ناگزیر تھا۔ میرے زیادہ افسانے طالب علمی کے زمانے کے ہیں، جب انسان کی پوری طبعی عمر اور اس کے متعلقات نظر کے سامنے نہیں ہوتے بلکہ چند مخصوص کیفیتیں۔ پھر میں متوسط طبقے کا ترجمان ہوں، جہاں رُوحانی حیثیت سے فیصلہ کن واقعات ہوتے ہی کم ہیں۔ بس وہی بے رنگ ہمواری اور یکسانی — زندگی کی، اور رُوح کی۔ میرے افسانوں میں پلاٹ کم ہے۔ کیونکہ ہماری زندگی میں بھی پلاٹ غائب سا ہو گیا ہے، یعنی اُس کی جذباتی اہمیت۔

میرے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل بھی کی جائے گی، اور ان کے ساتھ میری بھی۔ میرے کرداروں کا نفسیاتی ٹائپ کافی سیدھا سادا ہے، وہی معمولی داخلیت میلانِ ہم جنسی، ماحول سے بیزاری، اور حقیقت سے فرار وغیرہ۔ اور مرکب ای ڈیپلس تو ان کے پیچھے پیچھے آتا ہی ہے۔ میرے افسانے زیادہ تر اسکول کی لڑکیوں کے مطالعے ہیں۔ میرا رُوحانی قدو قامت بھی بس اسی قدر سمجھیے، اور اگر آپ نفسیاتی تحلیل کے شوقین ہیں تو اس میں Regression اور Arrested Develop اور شامل کر ہی لیں گے، عموماً میرا موضوعِ سخن شکست Frustration اور زمانہ بلوغت کی ماحول سے بے اطمینانی اور اس کے خلاف احتجاج و گریز رہا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے مجموعے کا نام پہلے "بھن بھن" تجویز کیا تھا۔ میں تو کیا، آج کل ساری دُنیا کا ادب اسی احاطے میں محدود ہے۔ آج کل کی بڑی سے بڑی شاعری میں بس یہی ٹھن ٹھن ہے۔ مقابلے کے لیے دیکھیے ٹنی سن:

"A Child crying in the night

A child crying for the light

And in no other language than a cry."

اسپنڈر کو تو ادب کی اس بلوغت پر ناز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس کا نام بغاوت رکھا ہے۔ مگر میری پیاس محض بغاوت، محض بت شکنی سے نہیں بجھتی۔ لیکن میری، ایک فرد کی، پسند یا ناپسند سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہم سب اپنے نظامِ زندگی کی بندشوں میں اسیر ہیں۔ آج کل اپنی رُوحانی ترقی کو یہیں روکے رکھنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہماری زندگی جو نغمہ پیدا کر سکتی ہے وہ بس یہی ہے — بھن بھن۔

میرے کرداروں کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے تنہائی کا احساس یہ ہے میرے مجموعے کی وجہ تسمیہ۔ یہ نام مَیں نے میتھو آرنلڈ کی ایک نظم سے لیا ہے جہاں اس نے انسانوں کو زندگی کے سمندر میں الگ الگ جزیرے کہا ہے۔ تقریباً پونے دو سو سال سے یورپ کا ہر بڑا ادیب اور شاعر اسی ایک جذبۂ تنہائی کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ یہ حسرت اور ناامیدی بتدریج یہاں تک بڑھتی چلی گئی کہ آخر ڈی ایچ لارنس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تنہائی ہی زندگی کا اُصول ہے۔ اٹھارویں صدی میں Diderot کے اس قول میں کہ صرف ایک بدمعاش آدمی ہی اکیلا ہوتا ہے، کچھ اصلیت ہو سکتی تھی۔ لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے بہترین آدمی بلکہ آرنلڈ جیسے لوگ جنہیں اپنے زمانے کا اخلاقی شعور کہنا بجا ہے، اسی احساسِ تنہائی سے اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس کرتے رہے ہیں۔ تنہائی اور تغیر — یہ ہیں ہمارے زمانے کے دو سب سے بڑے موضوع۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے موافق کوئی علاج سوچنے کی کوشش کی ہے مگر سب بے سود۔ مارسل پروست نے تو خیر مدافعت ہی چھوڑ دی تھی اور نظامِ زندگی کے مقابل انسان کو ایک ذرۂ بے مقدار تسلیم کر کے اپنی رُوح پر رنج و حسرت، مایوسی و بے چارگی کے زہرہ گداز جذبوں کا مستقل بوجھ قبول کر لیا تھا۔ وہ سر تاپا ایک ماتمی نغمہ رہ گیا تھا۔ Ulysses میں بھی کسی ساتھی کی تلاش میں رُوح کی سرگردانی دکھائی گئی ہے، مگر آخر میں ساتھی ملتا بھی ہے تو پہچانا نہیں جاتا — اور پھر وہی سمندر دونوں جزیروں کے درمیان لہریں لیتا ہوتا ہے۔ شاید آخری پچاس صفحوں میں حقیقت نگاری نہیں کی گئی ہے، بلکہ جوئس نے اپنی رُوح کے احساسِ شکست کو ریَن بلوم کے مشتعل جذبات میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے اپنے درد کا مداوا جنس میں ڈھونڈنا چاہا لیکن اس نے آگ اور بھڑکا دی، تنہائی شاید ہی کہیں اتنی ہیبت ناک ہو جتنی لارنس کے یہاں، کم سے کم انگریزی ادب میں تو نہیں، فرانس کے کسی مصنف کے

یہاں ہو تو ہو اور تو اور ڈبلیو بی ییٹس کو بھی، جسے عوام کی رُوحانی قوت کا پورا احساس تھا، یہی عارضہ لاحق تھا، اور اُس نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ موجودہ زمانے میں پُرخلوص اور حقیقی ادیبوں کے لیے تنہائی کی زندگی بسر کرنا ناگزیر ہے۔ جن معاشی، سماجی، اَدبی اور نظریاتی اسباب نے اخلاقی اور رُوحانی تجرد کی یہ فضا یورپ میں پیدا کی تھی، ان کا عمل اب ہندوستان میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ تو مَیں کبھی نہ مانوں گا کہ ہندوستان کے عوام اس اثر کو ڈیڑھ سو دو سو سال سے پہلے قبول کر سکتے ہیں بلکہ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ دُنیا کے کسی ملک کے عوام اس ذہنیت کو اپنے اُوپر حاوی ہونے دیں گے۔ بہرحال ہمارے متوسط طبقے کی زندگی ان خارجی اسباب کے عمل سے کافی حد تک متاثر ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس رجحان نے اس وجہ سے اور بھی قبل از وقت ترقی پائی ہے کہ ہمارے ادب کے غالب عنصر کا ذہنی پس منظر اور ماحول چھہتر فی صد مغربی ہے، تاہم یہ کہنا غلط ہو گا کہ اگر مغربی اَدب نہ پڑھا جاتا تو یہ رُوحانی کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ محض معاشی حالات، سماجی تبدیلیاں، نیا سائنس اور فلسفہ اُسے جنم دینے کے لیے کافی تھے۔ مجھے اُردو شاعری کی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت نہیں ہے، اور نہ میں سوچے سمجھے بغیر کوئی رائے دینا چاہتا ہوں، لیکن اگر تاریخی اور تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ غزل کی شاعری میں بھی اس قسم کے عناصر مل سکیں — کم سے کم غالب کے یہاں تو ضرور۔ اور موجودہ شاعری میں تو کم و بیش ہر شاعر ہی تنہائی اور تغیر کے جذبوں سے اُلجھا ہوا نظر آتا ہے — خواہ یہ جذبات کسی شاعر کے یہاں ابھی تک سطح کے نیچے ہی ہوں۔ بہرحال فیض احمد فیض کی ''تنہائی'' اس سلسلے کی آخری اور قطعی چیز ہے۔ تنہائی کے جذبے کو سقیم اور مجنونانہ تو مَیں بھی بنا سکتا ہوں، مگر حسرت اور مایوسی کا ایسا متوازن اور پُروقار اظہار مشکل ہی سے مل سکے گا — ن۔ م۔ راشد تنہائی اور تغیر کا زیادہ ذکر تو نہیں کرتے، مگر اُن کی مایوسی، شکستگی اور کلیت کی تہ میں یہی جذبے کار فرما ہیں۔ میرا جی بھی قفس میں پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں، مگر اُردو افسانے میں ان جذبوں کو براہِ راست اظہار کا موقع نسبتاً کم ملا ہے۔ گو شکلیں بدلے ہوئے وہ اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ ہاں، سعادت حسن منٹو نے اکثر تنہائی کے احساس کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے اور میرے زیادہ تر افسانے بھی ان ہی محوروں پر گھومتے ہیں — علیحدگی اور تنہائی کا احساس اور سال و ماہ کی لرزہ خیز تبدیلیاں۔ اس طرح اپنا نام چھانٹ کر پیش کر دینے کو تعلی نہ سمجھیے کیونکہ ان احساسات سے متعلق ہونا مَیں اپنے لیے کوئی قابلِ فخر بات

نہیں سمجھتا..... اسے قابلِ فخریات سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے، لیکن ان کی غلامی کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ نفسیاتی تحلیل کے گرویدہ لوگوں کے نزدیک تو یہ مرکب ای ڈیپلس کی علامات ہوں گی، اور انہیں تحلیل سے دُور کرنا ممکن ہوگا، لیکن میں "پُرانے خیال کا بزرگ" رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ شاید یہ عناصر اس وقت تک ادب پر غالب رہیں گے۔ جب تک کہ دُنیا کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع نہ ہوں، اور اخلاقی اقدار پھر سے قائم نہ ہو جائیں اس وقت تک اپنی اپنی جگہ یوں ہی گڑے رہیں گے یہ جزیرے..... شاید کنولوں کا استعارہ زیادہ موزوں ہوگا، جو جھیل کی سطح پر بہتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہوا کے جھونکے انہیں ایک دُوسرے کے قریب لاتے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ جانے وہ لہر کب آئے گی جو انہیں ملا دے! اور ان دو جذبوں کے پیچھے اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں: "ناقابلِ بیان افسردگی، بے حد و حساب دیوانگی، ناقابلِ علاج مایوسی۔" بے نام خوف، مبہم تمنائیں، کبھی سیر نہ ہونے والی آرزوئیں — اور عصبی خلل۔ یہی وہ مدارج ہیں جو مغربی اَدب نے رُومانیت سے بغاوت کے بعد طے کیے ہیں۔ جو اَدبی تحریک انتہائی حقیقت پسندی کے دعووں کے ساتھ شروع ہوئی تھی، وہ انتہائی دیوانگی پر ختم ہوتی ہے۔ کم و بیش یہی رُجحان اُردو کی نئی اَدبی تحریک کا بھی ہے۔ ہم لوگ صرف اور محض حقیقت نگاری سے ہٹتے ہوئے وہاں آ رہے ہیں، جہاں محسوسات کا بیان نہیں کیا جاتا بلکہ محسوس کرنے والے اعصاب پر ان کے اثر کا جہاں جذبات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ خالص جذباتی فضا — "جذباتی میدان" سے — میں پھر اپنا نام لینے پر مجبور ہوں، مگر محض مثال کے لیے۔ اس "ترقی" کا آغاز و انجام آپ میرے موجودہ مجموعے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا پہلا افسانہ بہت ہی بیدار حقیقت نگاری ہے، اور آخری افسانہ خالص عصبی فساد۔ اس افسانے میں، مَیں نے کوشش کی تھی کہ ٹھوس زمین بالکل نظر نہ آئے، صرف فضا ہی قائم رہے، لیکن اس میں بالکل کامیاب نہیں ہوا، تاہم یہ افسانہ ایک رُجحان کی مثال تو بن سکتا ہے..... ہماری اَدبی نسلیں "ورتھر" کو مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی ہیں، لیکن دراصل ہم برابر "ووتر" کے تازہ ترین ایڈیشن پیش کرنے میں مصروف رہے ہیں۔

دراصل ہمارے نظامِ زندگی نے ہمارے اندر ایک زنانہ پن اور انفعالیت پیدا کر دی ہے، اور ہمارے وجود کی مرکزیت بالکل غارت ہو چکی ہے۔ اسی نسائیت نے ادب میں تاثریت کو پروان چڑھایا ہے۔ ہم زندگی کو ایک وحدت کی طرح سوچنے سمجھنے کی تاب نہیں

رکھتے، ہمیں پینک میں جھومتے رکھنے کے لیے صرف ایک تاثر چاہیے۔ ہم تاثر کی مدافعت نہیں کرتے، نہ جانچ پڑتال۔ ہر وہ تاثر جو ہوا میں اڑتا ہوا ہماری طرف آ جائے، ہم اسے اپنے اُوپر مسلط ہو جانے دیتے ہیں۔ ہم صرف ایک Aeolian harp رہ گئے ہیں۔ کیونکہ تاثریت اپنے انتہائی درجوں پر پہنچ کر Automatism بن گئی ہے — جو نہ صرف ادیب کی شخصیت، بلکہ اَدب اور انسانیت کے لیے ایک مہلک خطرہ ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو محسوسات کی گزرگاہ بن جانے دیا ہے اور ہمارے اندر تصادم باقی نہیں رہا۔ اسی لیے مایوسی اور شکستگی کے ان انباروں کے باوجود ہم کوئی حقیقی المیہ پیدا نہیں کرسکتے۔ بقول لارنس کے، ہماری حالت اُس مینڈک کی سی ہے۔ جو گاڑی کے پہیے سے کچل جائے۔ ہم سے جلیل القدر ادب ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ "عورت" اَدب کی تخلیق نہیں کرسکتی۔

تو جو کمزوریاں اس زمانے میں کسی ادیب کی ہو سکتی ہیں وہی میری بھی ہیں لیکن کچھ شخصی اور ذاتی بھی۔ مجھ میں زندگی سے لطف لینے کی تھوڑی سی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن کچھ تو اپنے زمانے کی ادبی انحطاط پسندی سے متاثر ہو کر اور کچھ اپنی عصبی کمزوری سے مجبور ہونے کے سبب میں اس صلاحیت سے پورا کام نہیں لے سکا۔ اگر میں لے بھی سکتا تو اس زمانے میں جو "وقت" اور "زندگی" کی چیز ہی نہیں ہے، ادب کی تخلیق کے لیے صرف یہ صلاحیت کافی نہیں ہے۔ آج کل اپنے آپ سے گہرے اور بنیادی اخلاقی سوال پوچھنے لازمی ہیں۔ میں اس ضرورت سے واقف تو تھا، مگر تن آسانی کی وجہ سے مَیں نے روحانی کاوش گوارا نہیں کی، اور بڑے بڑوں کا سر چکرا دینے والے ہمہ گیر سوالات سے جان چراتا رہا۔ میں نے ہمیشہ رُوحانی سمجھوتے سے کام لیا ہے۔ یہ چیز اتنی ضرر رساں نہ ہوتی اگر مجھے اخلاقی قدروں کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں دُوسری طرف پھیرے رکھی ہیں، جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس میں خلوص تو ہے مگر زندگی کے بنیادی مسائل سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے انسان کے لیے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے اور نہ ایسا نیا ہی ہے۔ کیونکہ جو رُوحانی کیفیتیں مَیں نے پیش کی ہیں وہ مغربی اَدب میں روزہ مرہ کی چیزیں ہیں۔ اگر اُردو کے ادیب اسی روش پر چلتے رہے تو شاید ہم کبھی کوئی نئی چیز نہیں پیش کرسکیں گے۔ ہاں، مغربی اَدب کا مشرقی ایڈیشن ضرور تیار کر دیں گے، گو یہ نقل کسی طرح جھوٹی نہیں ہوگی بلکہ پُرخلوص اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی۔ کیونکہ ان دونوں سرزمینوں کی موجودہ زندگی میں بہت سی

باتیں مشترک ہیں۔

بہتر ہو گا کہ مَیں "نئی چیز" کی تشریح بھی کر دُوں۔ اَدب اپنے فیض کے لحاظ سے تو ضرور بین الاقوامی ہے مگر اس کی اصل قومی اور نسلی ہوتی ہے۔ آم کھایا تو جا سکتا ہے، دُنیا کے ہر گوشے میں، مگر پیدا ہوتا ہے وہ ہندوستان ہی میں۔ کسی قوم کا اَدب اُن عناصر — اس مخصوص مزاج اور فضا — کو پیش کرنے کی وجہ سے قابلِ قدر ہوتا ہے جو دُنیا کی دُوسری قوم پیش نہیں کر سکتی، اور یہ مخصوص مزاج اپنی رُوح کو عوام کی زندگی میں رَسابسا لینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمیں دُنیا کے اَدب میں اپنی جگہ بنانی ہے تو دُنیا ہم سے وہ مانگے گی جو صرف ایک ہندوستانی دے سکتا ہے۔ لیکن اسے گستاخی نہ سمجھا جائے اگر میں یہ کہوں کہ ہم لوگ زندگی کی بہ نسبت کتابوں سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ ہم نے رُوحِ عصر کی ترجمانی نہیں کی، ہم صرف اُس رُوح کو نظر انداز کر گئے ہیں جو ماورائے عصر ہے، جو دَب تو ضرور گئی ہے مگر عوام میں اب بھی موجود ہے ممکن ہے کہ یہ خالص ہندوستانی عنصر اتنا دھندلا پڑ گیا ہو کہ اب نظر ہی نہ آتا ہو، لیکن تخلیقی تخیل Creative Imagination کا کام ہی یہ ہے کہ غیر محسوس تاروں کو ایک ایک کر کے چنے — چشم و گوش کی دُنیا کو پگھلا کر نامعلوم جوہروں کو تلاش کرے۔ لیکن ہم نے اپنے اس فریضے سے اب تک پہلوتہی اختیار کیے رکھی ہے۔ یہ زندگی کی بہ نسبت اَدب سے زیادہ متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہم نے مغربی شعور کو بغیر ناقدانہ نظر ڈالے کلیتاً قبول کر لیا ہے، بلکہ اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے — اور مغربی شعور بھی وہ، جو انحطاط پذیر ہو۔ یہ یقیناً رُوحانی بے چارگی کے مترادف ہے۔ ہم ہر قسم کے تجربے کر رہے ہیں، سوائے رُوحانی تجربے کے، جو سب سے اہم ہے۔ ہم نے بھی زندگی کی عکاسی کی ہے، ہم نے بھی اُردو اَدب کی ترقی میں حصہ لیا ہے، مگر سرشار، نذیر احمد، سجاد حسین، بلکہ ستم ظریف اور میر باقر داستان گو تک کو ہم پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ ہمارے بہ نسبت اس خالص ہندوستانی عنصر سے زیادہ قریب تھے۔ شعور کی تبدیلی تو خیر لازمی چیز تھی، مگر اپنی رُوح کو شعور کی ایک مخصوص کیفیت کا اسیر کر لینا بھی تو کوئی قابلِ فخریات نہیں ہے۔ جب ہم نے مغربی شعور کو قبول کر لیا تو واقعی ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ مگر اب یہ شعور خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہا ہے۔ خود مغرب ایک نئے شعور کے لیے مضطرب ہے۔ مغربی اَدب کی حالت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ اگر یہ نیا شعور کوئی فراہم کر سکتا ہے تو چین یا

ہندوستان۔ لیکن ہم خود "کالی عورتوں اور نیلی شراب" والے شعور کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔ جنسیت سے مغلوب ہو کر ہم نے قلب کی معصومیت تو کھو ہی دی ہے، مگر احساس کو وسعت دینے کے معنی بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ بیمار اور سقیم احساس کو بڑھانا، حالانکہ ان محسوسات کو جو لوگوں نے کھو دیے ہیں، دوبارہ حاصل کر لینا بھی احساس کا دائرہ وسیع کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کھوئے ہوئے محسوسات حاصل کر لینے میں موجودہ نظامِ زندگی کیا رکاوٹیں ڈالتا ہے، اور اخلاقی لڑائی بھی جو چیسٹرٹن کو تن تنہا لڑنی پڑی اور جس میں اسے بظاہر کوئی خاص کامیابی بھی نہیں ہوئی، لیکن دلِ ناتواں کا اس طرح مقابلہ کرنا، یہ پن چکیوں پر حملہ، بھی داد کے قابل ہے۔ ممکن ہے ہمیں کامیابی حاصل نہ ہو، لیکن روحانی ریاضت کی داد تو لے ہی لینی چاہیے۔

میں نے کچھ "محراب و منبر" کی سی باتیں کی ہیں اور بیسیوں دفعہ "چاہیے" اور "لازمی" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن یہ اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مجرم اپنے آپ کو ہی سمجھنے کی وجہ سے اور اپنی روحانی بزدلی جتانے کی خاطر۔ مجھے خود پتا نہیں کہ یہ خالص ہندوستانی عنصر ہے کیا چیز، لیکن میں اس کا وجود تسلیم کرتا ہوں، اور اس کا احترام کرتا ہوں۔ میرے افسانوں میں یہ احترام اس شکل میں ظاہر ہُوا ہے کہ میرے کرداروں کے نام عیسائی ہیں۔ میں اپنے کرداروں کے ہندو یا مسلمان نام بھی رکھ سکتا تھا مگر پچھتر فی صد مغربی شعور کو سو فیصدی ہندوستانی نام دینا ہندوستانی روایتی شعور کی ہتک تھی۔ میں نے عیسائی کردار محض اس وجہ سے چنے ہیں کہ میں ہندوستانی فطرت اور مزاج کی ترجمانی کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوں — وہ ایک ایسا بھاری پتھر ہے جسے میں نے چُوم کر چھوڑ دیا ہے۔ رہا ہندوستانی عیسائیوں سے واقفیت کا سوال، تو وہ مجھے اسی قدر حاصل ہے جتنی آپ کو..... ممکن ہے کہ میں کبھی ظواہر کی سطحیں توڑتا ہوا اس ہندوستانی رُوح تک بھی پہنچ جاؤں، لیکن چونکہ میں اپنے آپ کو تھوڑا سا جانتا ہوں اس لیے زیادہ اُمید تو نہیں، کیونکہ ظواہر کی چٹانیں صرف دو ہی آلوں سے ٹوٹتی ہیں، محبت اور انکساری (Love and Humility)۔ محبت تو شاید میں بھی کر لوں، مگر انکساری مجھ سے ممکن نہیں (انکساری کے معنی اپنے آپ کو سب سے چھوٹا جاننا نہیں ہے بلکہ سب کو اپنے برابر سمجھنا اپنی جگہ پہچاننا)۔

میں نے اخلاق اور رُوح کا اتنی دفعہ ذکر کیا ہے کہ آپ تنگ آگئے ہوں گے۔

اول تو میں اپنے اَدبی اثرات کے ماتحت ایسا کرنے پر مجبور ہوں اور پھر شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ آج پوری دُنیا میں جاری ہے لیکن "آزادی" کا زمانہ آنے تک کلچر کی حفاظت کے لیے سامیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے — ادب میں بھی۔

مَیں نے یہ اختتامیہ جس روا روی اور ہڑبڑاہٹ میں لکھا ہے اس نے ناگوں کو اور اُلجھا دیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ میں نے ایک آدھ بات کام کی بھی کہی ہو، مگر وہ اتنے بے ڈول اور اَن گھڑ طریقے سے کہی گئی ہوگی کہ آپ اسے میری پریشان خیالی اور ژولیدہ نگاری کے ثبوت میں پیش کر سکیں گے...... بہرحال اب ایک آخری بات اور اپنے افسانوں کے متعلق کہے دیتا ہوں، مجھے چند ایسی ہستیوں سے شرف نیاز حاصل ہے جن کی نشوونما کلیتاً اَدب ہی نے کی ہے اس لیے میرے پاس اَدب کا ایک ہی معیار ہے: "وہی چیز اَدب ہے جو ایسی ہستیاں پیدا کر سکے اور میرے افسانے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے"۔

آپ پوچھیں گے کہ پھر مجموعہ کیوں چھپوایا؟ لیکن اس کا جواب یا تو میرے ناشر دیں گے جنہوں نے میرا مجموعہ خریدا یا پھر آپ خود جنہوں نے میرے افسانے پسند کیے۔ لیکن اس کے علاوہ میرے مجموعے سے ایک اور بھی تو فائدہ ہے۔ بھائی اسے ادب سمجھ کر گھر لے جائیں گے اور بہنیں اسے فحشیات کے طور پر پڑھیں گی، اور کم سے کم اتنا تو مَیں بھی مانتا ہوں کہ میرے افسانے آٹھ آنے والے ناولوں اور ایک روپے سالانہ چندے والے رسالوں سے تو بہتر ہیں۔

اَدب کا ایک اصول اور ہے جو ادیبوں کا سرتاج بتا گیا ہے۔ اگر پڑھنے والے کا تخیل اسے سدھار لے تو بُرے سے بُرا بھی کچھ بُرا نہیں۔ اس لیے اپنے آئندہ مجموعے کے خیال سے تو میں یہی درخواست کروں گا کہ آپ ایسے ہی تخیل سے کام لیں۔

محمد حسن عسکری

۳ فروری ۱۹۴۳ء

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ذکرِ انور

سعی بلیغ فکر عمیق بندۂ کمترین حافظ محمد متین

حمد بے حد اس خدائے پاک کو نور ایماں جس نے بخشا خاک کو

بعد حمد و ثنائے واحد قصائد و نعت احمد مختار و صلوٰۃ و سلام بر آل و اصحاب حقیر فقیر کج مج زبان ننگ اسلاف بندۂ ناچیز و کمترین حافظ محمد متین خلف الصدق حضرت والد ماجد مولوی نور علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ منصرم پنشن یافتہ اسیسر و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ رئیس اعظم قصبہ چونڈھیری تحصیل کھکیڑ (سوراخ تھا اس لیے پڑھا نہ جاسکا) خدمت میں ناظرین با تمکین کے عرض کرتا ہے کہ یہ پر تقصیر مدتِ دراز سے اِس تمنا میں گھلتا تھا اور اس لگن میں جلتا تھا کہ کسی طور حالات بے کم و کاست اس خاندانِ مشہور دیار و امصار و معروف خلق و انام کے، اور اس کے واقعاتِ صحیحہ و کارہائے نمایاں جن کی بدولت اُس کو یہ عزت و افتخار نصیب ہوا مع سلسلۂ نسب محققہ اور کیفیت مولد و مسکن باضافہ چشم دید واردات حیطہ تحریر میں ضبط ہو جائیں تاکہ دشمنانِ بدانجام کی زبان بے لگام بند ہو اور چشم بینا کو نور حاصل ہو۔ مقصود اس سے آگاہی خاص و عام اور بالخصوص خیر خواہی اہل اسلام تھا۔ زمانے کی حالت دگر گوں ہے۔ نہ دِلوں میں خوفِ خدا ہے نہ رسول کی محبت، نہ چھوٹوں کو بڑوں کا پاس اور نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال۔ اپنے بیگانے ہوئے ہیں، عالم نفسی نفسی کا طاری ہے۔ دُنیا کو کیا روئیں اپنا ہی غم کھائے جاتا ہے۔ یہ خاندان جو کل تک ماویٰ و ملجا اقارب و اجانب کا تھا اور جس کی دھاک قریب و دُور بیٹھی ہوئی تھی، آج اسے نکبت نے ایسا گھیرا ہے اور ادبار نے ایسا ڈیرا ڈالا ہے کہ ہر اپنا پرایا درپے آزار بلکہ مارِ آستین بنا ہُوا ہے جو کل تک جوتیوں میں بیٹھنا فخر سمجھتے تھے، آج منہ آتے ہی وتعزمن تشاء وتذل من تشا فاعتبرو یا اولا الابصار جو ساکھ برادری میں تھی، وہ گئی تو گئی۔ دیکھیے،

جلاہے، بلکہ رعیت کے لوگ چُوڑھے چمار تک آمادہ شروفساد رہتے ہیں۔ جن کی عورتیں چوبیس گھنٹے آٹھ پہر خدمت کیلئے حاضر رہتی تھیں، اب اسے باعث شرم و عار سمجھتے ہیں اور اپنی عورتوں سے شریف زادیوں کی طرح پردہ کراتے ہیں۔ سلام کرنا تو درکنار، سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتے۔ کہاں تک لکھوں، دِل میں غم و غصہ کا دَریا موجزن ہے۔ لکھنے بیٹھوں تو دفتر کافی نہ ہوں، ناچار لہو کے سے گھونٹ پی کر چُپ رہنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ چودھویں صدی ہے۔ قیامت کا قرب ہے۔ یہ سب آثار اسی کے ہیں۔ خاندان کے نوجوانوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ خاندان کی دولت و ثروت نہیں رہی تھی تو عزت و آبرو تو برقرار رہتی، مگر انہیں اس کا ذرہ بھر خیال نہیں، سب اپنی دُھن میں مست ہیں۔ رذیلوں کی شوریدہ سری اور فتنہ انگیزی سے ایسے خائف ہیں کہ ایک لفظ منھ سے نکالنے نہیں دیتے۔ بالکل بلی کا گو بن گئے ہیں۔ اس سے تو چوڑیاں پہن کر گھر ہی میں بیٹھ رہیں، بلکہ عورت ہوتے تو کسی کا گھر تو بستا، اب تو اس کام کے بھی نہیں۔ اور باپ دادا سے تو انہیں مطلب ہی کیا۔ جیسے خود پیدا ہو گئے تھے۔ شب و روز یہی فکر دامن گیر ہے کہ آج موئے کل دُوسرا دن۔ میری آنکھیں بند ہوئیں تو کوئی یہ بھی نہ جانے گا کہ بزرگوں کی ہڈیاں کس گڑھے میں پڑی ہیں۔ یہی عجلت تھی کہ جو سانس آتا ہے اسے غنیمت شمار کیا جائے اور جس طرح بن پڑے، حالات خاندان کے جو بزرگوں سے سننے میں آئے یا خود تحقیق کیے، یک جا ضبط ہو جائیں تاکہ نام اس دودمان عالی مرتبت کا صفحۂ روزگار پر باقی رہے اور کیفیت دوام کی پیدا ہو۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، میرے بعد چاہے باپ دادا کا نام باقی رکھیں چاہے بھلادیں، لیکن مکروہات دُنیوی اور اہل بغض و عناد کی شرانگیزی اتنی مہلت ہی نہ دیتی تھی کہ اس فرض عظمیٰ کی طرف توجہ کرسکوں، بالآخر بعد کاوش بسیار انتظارِ بے شمار بہ توفیق ایزدی یہ امر خاطر خواہ و حسب مراد بمصداق کل امر مرھون باوقتھا ظہور میں آیا ہرچند کہ خاندان کا نام حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کی بدولت روشن ہوا اور ان ہی کے دَم سے یہ عزت و توقیر قائم رہی، لہٰذا اس رسالہ کا نام بھی اُن کے نامِ نامی کی مناسبت سے ذکر انور قرار پایا۔ وماتوفیقی الاباللہ

بزرگوں کا مسکن و مولد قدیم سے قصبہ چونڈھیری رہا ہے۔ یہ قصبہ بہ لحاظ آب و ہوا اور اپنی سرسبزی و شادابی کے یگانہ ہے۔ پُر رونق اور پر فضا، تین طرف بھوڑ کا میدان

ہے جس کی وجہ سے گرمیوں کی راتیں بہت سہانی ہوتی ہیں اور جاڑوں میں دھوپ علی الصباح پھیل جاتی ہے۔ دُور دُور تک کھجور کے درخت چلے گئے ہیں جو چاندنی میں عجب بہار دکھاتے ہیں۔ تربوز بکثرت ہوتے ہیں اور جھڑبیری کے بیر، اور گولر تو یہاں کے دُور دُور مشہور ہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب اس علاقے کے تحصیل دار تھے۔ عجب خوش خلق اور نیک سیرت انسان تھے۔ جب دورے پر آتے تھے، ہمارے ہی یہاں قیام کرتے تھے اور دونوں چیزیں باصرار منگوا کر کھاتے تھے۔ مَیں عرض کیا کرتا تھا کہ صاحب ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں، کچھ اور فرمایئے تو حاضر کیا جائے، مگر ہمیشہ بہ کمال خندہ پیشانی فرماتے: بھئی حافظ صاحب! یہ سب باتیں نہ کیا کرو۔ کھاتے جاتے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے جاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ قصبہ مینو سواد اور رشک جناں تھا۔ اسے راجہ چونڈھیرا مل نے آباد کیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ کورو پانڈوؤں کی راج دھانی بھی رہ چکا ہے۔ اِسلامی عہد میں بھی یہاں حاکم رہتا تھا، اور ایک مرتبہ بادشاہ شکار کھیلتے ہوئے راستہ بھول گئے تھے تو انھوں نے ایک شب یہاں قیام کیا تھا اور قصبے کو بہت پسند فرمایا تھا چنانچہ جانب شمال دو اُونچے اُونچے ٹیلے موجود ہیں جہاں پہلے شاہی قلعہ تھا۔ خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ اپنا گھر بنانے کو اس میں سے اینٹیں نکال نکال کر لے جایا کرتے تھے اور بچے کنکروں میں روپے پیسے تلاش کرتے پھرا کرتے تھے، بلکہ ایک بھنگن صبح سویرے کوڑا ڈالنے جا رہی تھی، اُسے ایک چاندی کی ہنسلی ملی، بعد میں لوگوں نے بہت کچھ ڈھونڈا ڈھانڈا، مگر پھر کوئی چیز دست یاب نہ ہوئی۔ ٹیلوں کی دائیں جانب کھیت کی مینڈھ پر محکمہ آثارِ قدیمہ کا تختہ گڑا ہوا ہے کہ جو کوئی ان عمارتوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو وہ مستوجب سزا کا ہو گا۔ اپنی یاد کی بات ہے کہ ہر قوم کے لوگ بکثرت آباد و شاد تھے۔ بازار میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ اوروں کا تو ذکر کیا، صرف بزازوں کی چار دُکانیں تھیں اور ایک عطار بھی تھا۔ قانون گو کا صدر مقام تھا اور ایک پولیس کی چوکی بھی تھی۔ اب اس عمارت میں پرائمری اسکول آ گیا ہے۔ ان گئے گزرے حالوں پر بھی رونق باقی ہے۔ آبادی ساڑھے تین سو ہے۔ باشندے مرفہ حال، پابند وضع، دین دار اور غریب مزاج ہیں۔ ایک مقام شکر کا یہ ہے کہ اس دَورِ ادبار و اِنحطاط میں بھی کہ جب اِسلام کو بلاؤں نے گھیرا ہے اور اعدائے دین کا نرغہ ہے، قصبہ میں بحمد اللہ مسلمانوں کا رُعب ہنود پر اُسی طرح قائم ہے۔ حالانکہ تعداد میں وہ مسلمانوں کے برابر ہیں اور مسلمانوں میں سے اکثر ان کے

مقروض بھی ہیں، مگر یہ ہمت نہیں کرسکتے کہ برات باجے کے ساتھ نکال لیں یا مسلمانوں کے محلّہ میں ہولی کھیل لیں، پہلے تو پالکی میں دُلہن لانے کی بھی مجال نہ تھی، مگر اس زمانہ میں جو کچھ ہے وہی بہت غنیمت ہے جب تک کھچو بھڑبونجا زندہ تھا، اس کے گڑ کے سیو بھی بہت قابلِ تعریف ہوا کرتے تھے۔

الغرض اب میں اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ کا نام قبول اسلام سے پیشتر بھلی مل تھا۔ قوم ویش، گوت..... اہل دولت و ثروت تھے اور قصبے میں ان کا بڑا اثر تھا۔ اُن کے آباد اجداد کا وطن مالوف فی الحقیقت کاشی بنارس تھا اور ذات برہمن تھی۔ بوجہ وبا وطن چھوڑنا پڑا اور یہاں آکر آباد ہوئے، چونکہ معیشت کے لیے سامانِ خورد و نوش کی دُکان کرلی تھی اس لیے رفتہ رفتہ ویشوں میں مل جل گئے اور وہیں شادی بیاہ بھی ہونے لگا۔ اسلام لانے کے بعد شیخ قبولی کے نام سے موسوم ہوئے۔ جاسوس وبدخویہ تہمت طرازی کرتے ہیں کہ حاکم کے ڈرانے دھمکانے اور لالچ دلانے سے مسلمان ہوئے۔ مگر یہ محض ان کی افترا پردازی اور بداندیشی ہے۔ شیخ قبولی ان کی افواہ کے بموجب عالم گیر کے زمانہ میں نہیں بلکہ جہاں گیر کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور تبدیلی مذہب کا سبب تخویف و تحریص قطعاً نہیں تھا۔ شیخ کو سن طفولیت ہی سے اہل اسلام سے مناسبت قلبی اور رغبت دلی تھی۔ اور ان ہی کے ساتھ مجالست و موانست کو پسند کرتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شغف بھی بڑھتا چلا گیا۔ خصوصاً اولیا اللہ سے بہت ارادت و عقیدت تھی۔ جب کبھی کسی خدا رسیدہ بزرگ کا گزر ہوتا تو فوراً حاضر خدمت ہوتے اور جتنے دن وہ قیام کرتے دونوں وقت اپنے آپ کھانا پہنچاتے۔ ایک مرتبہ علاقہ کا حاکم کہ مردم آزار و بدطینت تھا، آمادۂ مخاصمت ہوا اور کوئی طریقہ گزند پہنچانے کا نہ چھوڑا۔ شیخ کے لیے عرصہ حیات تنگ ہوا اور زندگانی وبال دوش ہوئی۔ آخر ایک شب بہت خشوع و خضوع سے دُعا مانگی اور حضرت پیرانِ پیر دست گیر سے رجوع کر کے سوئے۔ خواب میں بشارت ہوئی، اے شخص وسواس کو دل میں جگہ نہ دے، اُٹھ اور اسلام لا۔ سب مشکلیں آسان ہوں گی۔ فوراً بیدار ہو کر غسل کیا اور باقی رات توبہ و استغفار میں گزاری۔ فجر کے وقت مسجد میں پہنچ کر ایمان لائے۔ اُسی شب حاکم نے بھی خواب دیکھا کہ بزرگ نورانی شکل کے تشریف لائے ہیں۔ چہرے پر آثار غیظ و غضب کے ہیں، اور پیشانی عرق آلود ہے۔ بال ڈاڑھی کے بکھرے ہیں اور فرماتے ہیں۔ تو بے گناہوں اور معصوموں کو ستاتا

ہے۔ اس کا نتیجہ اپنے حق میں اچھا نہ پائے گا۔ وہ شخص صاحب ایمان ہے، اس سے معافی مانگ اور توبہ کر، ورنہ دِن قیامت کے دیدارِ رُسول سے محروم رہے گا۔ حاکم بہت مخوف ہوا اور اپنے انجام سے لرز گیا۔ صبح ہوتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر خواست گار معافی کا ہوا اور اپنے افعال سے تائب ہوا۔

ہرچند کہ یہاں الف سے لے کر یے تک سلسلہ بہ سلسلہ تمام افرادِ خاندان کا تذکرہ مقصود نہیں، بلکہ صرف اہم اور ضروری واقعات کو یک جا کرنا مد نظر ہے۔ لہٰذا چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر کو تو شجرے سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو بحمد اللہ بہمہ حسن وخوبی طبع ہو چکا ہے۔ اگر تفصیلات بیان کرنے بیٹھوں تو دفتر کافی نہ ہوں۔

شیخ قبولی کے پوتے شیخ مرادی شاہ عالم گیر کے ساتھ مہم دکن میں شامل ہوئے اور انتظام رسد کا اُن کے سپرد تھا ہر قسم کی تکلیفیں اور مصائب برداشت کیے یہاں تک کہ بعض وقت گھوڑے کی لید نچوڑ نچوڑ کر حلق تر کرنا پڑا مگر بادشاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس جاں فشانی اور وفاداری کے صلے میں ایک قطعہ زمین اور عہدہ پٹوار کا پایا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح آج کل اس عہدے کی قدر و منزلت نہیں رہی اور بے وقعت ہو گیا ہے یہ بات شاہی عہد میں ہرگز نہ تھی۔ اُس زمانے میں پٹواری کا رتبہ وُہی تھا جو آج کل تحصیل دار یا حاکم علاقہ کا ہوتا ہے۔ جس شخص کو یہ عہدہ ملتا اُسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا، چنانچہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ اُس میں خاندان کی تحقیر ہے، بلکہ اُس کے برخلاف تو یہ جائے فخر و ناز ہے۔ پہلے پٹواری کے اختیارات اتنے تھے کہ اب حاکم علاقہ کے بھی نہیں ہوتے، مختصراً یہ کہ پٹواری اپنے حلقہ میں مالک سیاہ وسفید کا ہوتا تھا اور اُس کے سامنے کسی کو مجال دَم مارنے کی نہ ہوتی تھی۔ یہ واقعہ ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ غدر سے پہلے شیخ دلاور بخش پٹواری تھے۔ مزاج کے بہت مغلوب الغضب تھے اور تن و توش بھی ایسا پایا تھا کہ جب شام کو اپنے دستور کے مطابق مکان کے سامنے کیکر کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا جیسے کوئی شیر نر بیٹھا ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ایک شخص بد طینت و بد اندیش تھا جو کسی طرح مخالفت ومعاندت سے باز نہ آتا تھا۔ آخر جب لاچار ہوئے تو ایک کوٹھڑی میں اُپلوں کا ڈھیر کر کے جلوا دیا۔ جب خوب دُھواں بھر گیا تو اُس شخص کو بلوا کر دو چماروں کو حکم دیا کہ کوٹھڑی میں چھت سے اُلٹا لٹکا دیں۔ دوپہر تک وہ اسی طرح لٹکا رہا اور جب اُسے اُتارا تو وہ تقریباً نیم مردہ تھا اور رو رو کر معافی مانگ رہا تھا۔ اس کے

بعد اُس کی کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ سرکشی یا حکم سے سرتابی کرے۔ اسی طرح یہ بھی مشہور ومعروف واقعہ ہے کہ یہ لال محل والے، جو اَب اتنا اِتراتے ہیں اور مشیخت بگھارتے ہیں، اُن کے خاندان میں کسی کی شادی تھی۔ جب دُلہن کی پالکی سامنے سے گزری تو حسن اتفاق سے شیخ دلاور بخش اپنے حسب معمول کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ پالکی دیکھتے ہی طیش میں آکر کھڑے ہوگئے۔ مارے غصہ کے چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آواز تو اُن کی تھی ہی بہت گرج دار، معلوم ہوتا تھا کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔ زور سے ڈانٹا۔ اچھا اب ان کی یہ ہمت بھی ہوئی کہ ہمارے سامنے سے دُلہن کو پالکی میں سوار کرکے لے جائیں۔ سڑک پر راستہ روک کر کھڑے ہوگئے کہ خبردار، جو قدم آگے بڑھایا۔ آخر ان لوگوں کو اپنی برات پھیرنی پڑی اور دُوسرے راستہ سے لے گئے۔ غرض کہنے سے یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ جب خاندان کا یہ دَبدبہ اور اثر تھا، اور آج وہی لوگ برابری کے دعوے دار ہیں، بلکہ تحقیر و تذلیل کے کوشاں رہتے ہیں۔ مگر بات کہنے کا فائدہ جب ہی ہے کہ اس سے عبرت حاصل کی جائے۔ ورنہ لاکھ طوطے کو پڑھایا پھر بھی حیوان ہی رہا، یہی بات قوموں کے حال اوران کے عروج وزوال پر صادق آتی ہے، گو عزت اور ذلت، سب خدا کی طرف سے ہے مگر خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ "نہیں بدلی ہم نے کسی قوم کی حالت مگر جب تک نہیں چاہا خود اُس نے۔" خیر اپنی تو وُہی بات ہے کہ گزر گئی گزران، کیا جھونپڑی کیا میدان۔ یہ سب نوجوانوں کو سمجھنا چاہیے، لیکن انہیں تو خدا ہی عقل دے تو دے۔ واللہ علی کل شئی قدیر اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ کیا عجب وُہی دِن پھر آئیں۔

شیخ دلاور بخش کے چھوٹے بھائی سعادت بخش تھے۔ انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ صوفی منش اور آزاد رو طبیعت پائی تھی۔ سارا وقت اہل اللہ کی خدمت اور صوفیا کے ساتھ مجالس میں گزرتا تھا۔ اسی دُھن میں پا پیادہ بنارس جا پہنچے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان کا نام شیخ بنارسی پڑ گیا تھا۔ وجیہہ صورت اور جامہ زیب تھے۔ کاکلیں بڑھا رکھی تھیں اور آخر عمر میں مہندی کا خضاب کرنے لگے تھے۔ طبع میں سخن سنجی کے ساتھ نغز گوئی کا مادہ بھی تھا۔ عجب پاکیزہ اور لطیف شعر نکال لیتے تھے۔ زمینیں ہمیشہ شگفتہ پسند کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے ایک درویش نے اپنا جھوٹا پانی دیا تھا جس کی بدولت شعر گوئی کا یہ سلیقہ حاصل ہوا۔ تخلص رِند کرتے تھے۔ ایک دیوان بھی سب رس کے نام سے ترتیب دیا تھا، جس میں یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ سعادت کے س اور بخش کی ب کو ملانے سے سب

بنتا ہے۔ نہ جانے وہ دیوان کہاں، اور کس طرح تلف ہو گیا۔ اگر موجود ہوتا تو یقیناً ایک درجۂ خاص کا مستحق ٹھہرتا۔ دُنیا سے تو کنارہ کشی اختیار کر ہی لی تھی۔ کیا تعجب ہے کہ اپنی دَریا دِلی کے جوش میں اور چیزوں کی طرح دیوان بھی کسی کو بخش دیا ہو اور اس نے اپنے نام سے طبع کرا کے ان کے طفیل بقائے دوام حاصل کی ہو۔ بزرگوں سے ان کے اکثر شعر سننے میں آئے ہیں۔ اب صرف ایک یاد رہ گیا ہے وہی تبرکاً نقل کیے دیتا ہوں:

یہ کٹی وہ کٹی بتایا کر
یار میرے پتنگ اُڑایا کر

ایک مصرع اور یاد آگیا ع

لب کی سُرخی مجھے دکھایا کر

سرکارِ انگریزی کے تسلط کے بعد بھی یہ عہدہ اسی طرح برقرار رہا بلکہ خاندان کے وقار میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ غدر میں پردادا صاحب مرحوم یعنی منشی برکت علی نے ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی۔ وہ کوئی بہت بڑا فوجی افسر تھا اور باغیانِ مردُود و شقی اُسے زخموں سے نڈھال، مردہ جان کر ایک درخت کے نیچے چھوڑ گئے تھے، مگر ابھی اس میں ایک رمق جان باقی تھی۔ زخموں کے ضعف اور پیاس کی شدت سے جان کنی کی حالت تھی اور سوکھی ہوئی زبان لبوں پر حسرت سے ملتا تھا کہ پردادا صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ آواز کراہنے کی سُن کر متوحش ہوئے اور چونکہ حالت زمانے کی مخدوش تھی لہٰذا درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھے۔ پاس پہنچے تو یہ منظر دیکھا۔ چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں ہے تو جا کر افسر کو درخت کے سہارے سیدھا بٹھایا اور حال پوچھا۔ اس کے لبوں سے سوائے لفظ پانی کے اور کچھ نہیں نکلتا تھا۔ جنگل بیابان میں پانی ملنا محال تھا۔ باغیوں کے ڈر سے کاشت کار کھیت چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آخر بعد خرابیِ بسیار ایک کچا کنواں دَست یاب ہوا۔ تو اب یہ مشکل کہ پانی کیسے نکالا جائے۔ سوچنے سے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ پیپل کے چوڑے چوڑے پتے لے کر ایک دونا تیار کیا اور اپنا صافا پھاڑ کر اُس میں بطور رَسی کے باندھا، اور اس تدبیر سے پانی نکال کر اس کو پلایا۔ پانی پی کر جان میں جان آئی اور وہ بولنے کے قابل ہوا تو کہا۔ دیکھو جلدی کرو کہ میرے زخموں سے خون بند نہیں ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب میں زِندہ نہیں بچ سکتا، تم نے میرے اُوپر بڑا احسان کیا ہے اور مَیں اس صلہ میں تمھیں ایک تحریر دینا چاہتا ہوں، کوئی چیز دو۔ کاغذ قلم تو وہاں مل نہیں

سکتا تھا چنانچہ ایک پیپل کے پتے پر اُس نے انگلی اپنے خون میں ڈبو ڈبو کر ایک سرٹیفکیٹ لکھ کر پردادا صاحب کو دیا۔ لکھتے ہی زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑا اور تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ اُس لیے اُس کا اور اُس کی اولاد و اولاد کا احسان سلطنت برطانیہ پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ سلطنت برطانیہ پر اس کی اولاد کی پرورش فرض ہوگی اور جب کبھی کوئی اس تحریر کو لے کر حاضر ہو گا اس کو فوراً ملازمت دی جائے گی۔ مگر افسوس ہے کہ دوستان دشمن صفت اور محبانِ عقرب کیش کی نیش زنی کی بدولت یہ سرٹیفکیٹ رہنے نہ پایا۔ اور ان حضرات کی مہربانی سے جو چوری ہوئی تھی اس میں منجملہ زیورات، پارچہ جات وغیرہ کے یہ نادر و نایاب سند بھی جاتی رہی کہ جو مثل ایک گنجینہ زر کے حفاظت سے رکھنے کے قابل تھی، خصوصاً اُس کی گمشدگی کا رنج اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی ضرورت آ پڑتی ہے۔ مثلاً اُس وقت کہ جب کلکٹر ضلع سفلہ پروری پر اُتر آیا تھا، اور نمبرداری لال محل والوں کی طرف منتقل کرا دی تھی۔ اگر یہ سارٹی فکٹ ہوتا اور سلطنت برطانیہ پر اپنے حقوق ثابت کیے جاتے تو ناممکن تھا کہ سخت سے سخت حاکم بھی اس تحریر کا پاس نہ کرتا۔ اسی کی بدولت پردادا صاحب کو صدر مقام میں نقل نویسی کی خدمت ملی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اسناد و سارٹی فکٹ پردادا صاحب اور دادا صاحب مرحوم و مغفور اور حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حاصل کیے جو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ اگر کسی اور کے پاس ہوتے تو بلامبالغہ لوبان کی دھونی دے دے کر رکھے جاتے۔ ان میں سے گاشن صاحب بہادر کا سارٹی فکٹ ایک ندرت خاص رکھتا ہے۔ گاشن صاحب کلکٹر ضلع تھے اور بعد میں صاحب گورنر بہادر کے ایڈی کانگ ہوگئے تھے۔ اس سارٹی فکٹ کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے اور قابل یاد رکھنے کے ہے کہ چچا صاحب مرحوم اسے لے کر کلکٹر کے پاس گئے، وہ ابھی تازہ آمد از ولایت تھا اور مزاج میں سختی باقی تھی۔ اردلی نے دروازے پر ہی روک لیا کہ صاحب کسی سے نہیں ملتے ہیں۔ بہت حجت اور تکرار کے بعد چچا صاحب نے کہا کہ اچھا مجھے نہیں جانے دیتے تو کم سے کم یہ سارٹی فکٹ ہی پیش کر دو۔ اردلی مان گیا اور سارٹی فکٹ لے کر اندر چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی صاحب نے چچا صاحب کو اندر بلا لیا بلکہ اردلی کو بہت ڈانٹا کہ تم نے انہیں آنے کیوں نہیں دیا۔ صاحب نے بڑے تلطف و مہربانی کا برتاؤ کیا اور غور سے سب کچھ سنا اور کہا کہ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ تمہاری عمر زیادہ ہوگئی ہے اس لیے جگہ نہیں دے سکتے،

البتہ اگر تمہارے کوئی لڑکا ہو تو بتاؤ۔ چچا صاحب کے کوئی اولاد نرینہ تھی ہی نہیں، اس لیے کیا ہو سکتا تھا۔ مگر صاحب آخر تک کہتا رہا کہ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ یقین ہے کہ سارٹی فکٹ کا صاحب پر اتنا اثر ہوا تھا کہ اگر چچا صاحب کے کوئی لڑکا ہوتا تو اُسے ضرور بالضرور کوئی عمدہ ملازمت مل جاتی۔ یہ سارٹی فکٹ سارٹیفیکٹوں کے مجموعہ میں چھپا ہوا شامل ہے اور ہر وقت ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ حاکموں کی اس عنایت کا راز یہی ہے کہ ہمارا خاندان ہمیشہ وفادار رہا ہے اور حاکم وقت کی فرمانبرداری کو جزو ایمان جانا ہے، بلکہ حکم حاکم کو اَمر اللہ اور اَمر رسول کے بعد برحق سمجھا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد خلافت کے فتنے یا گاندھی کی شورش سے اثر پذیر نہیں ہوا، اور ہمیشہ سرکار کا ساتھ دیا۔ خلافت والے ایک مرتبہ قصبے میں چندہ مانگنے آئے تھے مگر والد صاحب قبلہ نے صاف انکار کر دیا کہ ہم جس کا نمک کھاتے ہیں، اس کے ساتھ نمک حرامی اور غداری نہیں کر سکتے۔ نہ صرف اپنے آپ چندہ نہیں دیا بلکہ اوروں کو بھی باز رکھا۔ سوائے چند مفسدہ پرداز ہندوؤں کے جن کے یہاں وہ لوگ آ کر مقیم ہوئے تھے۔ گو اب قصبے کے زیادہ تر ہندو کانگریسی خیالات رکھتے ہیں، حتیٰ کہ لال محل والے جو خود ملازم سرکاری ہیں جب گھر آتے ہیں تو باتیں مخالفانہ کرتے ہیں، مگر وہی مثل ہے کہ کووں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔ کسی کا کیا بگاڑتے ہیں۔ اپنی دُنیا اور عاقبت دونوں خراب کرتے ہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے خاندان میں ابھی تک کسی نے یہ نمک حرامی نہیں کی، اسی وجہ سے ہمیشہ ہماری سرپرستی ہوتی رہی اور انشاء اللہ جاری رہے گی۔

دادا صاحب نے اپنے والد کی خدمات کے صلے میں گرداور قانون گو کا عہدہ پایا۔ قصبے کی عید گاہ دادا صاحب ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ اب دعوے دار پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم نے بھی چندہ دیا تھا مگر یہ سراسر جھوٹ ہے۔ سارا خرچ عید گاہ کی تعمیر کا دادا صاحب نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور ہمارا حق عید گاہ پر بہ نسبت اوروں کے زیادہ ہے، اور دراصل ہمیں ہی اس کا متولی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ثبوت چاہے تو ہمارے پاس ثبوت بھی موجود ہے۔ جتنا روپیہ عید گاہ کی تعمیر پر خرچ ہوا، دادا صاحب اُس کا تمام و کمال حساب لکھتے گئے تھے، اور وہ محفوظ ہے۔ اُس کی موجودگی میں اگر کوئی دعویٰ کرے تو وہ باطل ٹھہرے گا۔

اب میں حضرت والد ماجد کے ذکر انور، بلکہ نور علی نور کی طرف رجوع کرتا ہوں، حالانکہ انھوں نے ابتدا محض عرائض نویس کی حیثیت سے کی تھی مگر آخر میں منصری کے

عہدے تک پہنچے اور پنشن لینے کے بعد بھی سرکار نے اسیسر اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نامزد کیا۔ افترا پردازوں نے یہ بے پَر کی اڑائی ہے کہ وہ خدانخواستہ حاکم بدہن رشوت لیتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ذات بابرکات کے متعلق ایسا تصور کرنا بھی گناہ میں داخل ہے۔ خود رشوت لینا تو کیا معنے، اگر معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص رشوت لیتا ہے تو اُس سے ملاقات ترک کر دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی از راہ خلوص نذرانہ یا تحفہ پیش کرتا تو قبول کرنے میں تامل نہ کرتے کہ یہ سنت رُسول ہے۔ پابند شرع ایسے تھے کہ کبھی تہجد تک قضا نہ کی۔ ایک مرتبہ کلکٹر سے اسی بات پر اختلاف ہوگیا تھا کہ سرکاری کام چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ پھر ان کا قائل بھی بہت ہوگیا تھا۔ حضرت شاہ مبارک حسین سجادہ نشین چرنی شریف سے بیعت تھے اور اُن کے خاص الخاص مریدوں میں شامل تھے۔ سنا ہے کہ اپنا خلیفہ بھی بنانا چاہتے تھے مگر والد صاحب ہی نے عذر کر دیا۔ حضرت کے ملفوظات میں درج ہے کہ وصال کے وقت والد صاحب ہی کو یاد کر رہے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو تجہیز و تکفین کا ذمہ خود لیتا اور کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتا اور والد صاحب سے متعلق کرامتیں تو اکثر ہیں جو حضرت سے ظہور میں آئیں۔ یہ سب حضرت کے ملفوظات میں مل سکتی ہیں۔ صرف ایک بطور مثال کے پیش کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ والد صاحب زیارت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے مگر آسمان ابر آلود تھا اور کیچڑ اس قدر تھی کہ گھوڑے کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ آخر ایک جگہ گھوڑا دلدل میں پھنس ہی گیا۔ وہاں نہ آدمی نہ آدم زاد، والد صاحب حیران و پریشان کھڑے دُعائیں مانگ رہے تھے کہ یکایک بڑے زور سے بجلی چمکی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب آنکھیں کھولیں، تو دیکھا کہ گھوڑا دلدل سے باہر کھڑا ہے۔ خدا کا شکر کرتے ہوئے آگے بڑھے اور حضرت کی خدمت میں سارا ماجرا عرض کیا۔ حضرت مریدوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور خاموش ہو رہے۔ ایک مرید نے کل واقعہ سنایا کہ ٹھیک جس وقت والد صاحب اُس مصیبت میں مبتلا تھے۔ حضرتؒ پر ایک غشی کیفیت طاری ہوئی اور فوراً چادر اوڑھ لی، جب چادر اتاری تو مسکرا رہے تھے۔ لوگوں کے دریافت کرنے پر بتایا کہ ہمارا ایک مرید دلدل میں پھنس گیا تھا۔ اسے نکال کر آ رہے ہیں اور واقعی حضرت کی کمر پر گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان موجود تھے۔ یہی خصوصیت جو والد صاحب کو حضرت سے حاصل تھی اسی کی بنا پر

(رسالے کے باقی صفحے مل نہیں سکے جب ملیں گے تو پیش کیے جائیں گے)۔

(۳۰ جون ۱۹۴۳ء)

گٹھلیوں کے دام

آخر کب تک! وہ دن آ ہی گیا کہ جب اُس نے ساری ٹال مٹول اور تساہل چھوڑ کر آخری فیصلہ کر ہی ڈالا۔ دہلیز تک پہنچ کر تو وہ خیر کئی دفعہ لوٹ لوٹ آیا تھا، مگر آج اندر بھی قدم رکھ دیا۔ اُس کے آج کل، کرتے رہنے میں ممکن ہے، ذہنی عیش کوشی اور آرام طلبی کو بھی دخل ہو، مگر دراصل یہ اس کی سلیم الطبعی، متوازن مزاجی، برد باری، انصاف پسندی اور کریم النفسی تھی۔ گناہ گار کو ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔ وہ تو ایک چھوڑ بیسیوں موقعے دے چکا تھا۔ لیکن آخر کہاں تک ڈھیل دیے جاتا، کب تک رعایتیں کرتا۔ چشم پوشی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ یوں تو انصاف بھی اس کا متقاضی تھا کہ اب آخری فیصلے میں دیر نہ کی جائے، لیکن یہ محسوس کر کے تو وہ لرز گیا کہ اس کا مسئلے کو التوا میں ڈالتے رہنا درحقیقت سرمایہ داری اور متوسط طبقے کے اقتدار کے آخری اور انحطاطی دَور کی ابہام پرستی میں گرفتار ہونا تھا۔ یہ اقتدار سے بے خبری تھی، وہ دُنیاؤں کے بیچ میں بنا ہونا، صداقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا، ریت میں سر گاڑ دینا، ذہنی سمجھوتہ، رُوحانی بزدلی! تو کیا وہ بھی بورژوا بنتا چلا جا رہا تھا؟ کیا اب سورج بھی سیل چلا تھا؟..... پھپوندی لگ گئی ہو تو اسے فوراً کھرچ پھینکنا ہی اچھا، دیر کی اور سب ہاتھ سے گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ یہ فالج اس کی ساری ہستی کو اپاہج بنا دے، ایک لمحے کی بھی تاخیر و تعویق کے بغیر اس نے اپنے ذہن لخت لخت کو جمع کیا اور فیصلہ کر ڈالا۔ یہ بیانیہ الفاظ تو درحقیقت اُس فیصلے کی برق رفتاری کو کچھوے کی چال بنائے دے رہے ہیں۔ ورنہ وہاں تو بس اتنا تھا۔ کن فیکون۔ بلکہ شاید اس میں بھی کچھ دیر لگی ہو، صرف ایک چشم زدن کے وقفے میں دونوں طرف کی دلیلیں اور ثبوت بھی پیش ہو گئے، بیانات لے لیے گئے، گواہیاں قلم بند ہو گئیں، نظیریں ملاحظہ کر لی گئیں، فریقین کے وکیلوں نے خوب خوب جوہر طبع دکھا لیے،

جیوری نے بھی غور کر لیا اور فیصلہ بھی سنا دیا گیا۔ سچ پوچھیے تو یہ سارے جھنجھٹ بہت پہلے ختم ہو چکے تھے۔ یہ ضمنی کارروائیاں ایک نہیں، بیسیوں مرتبہ دُہرائی جا چکی تھیں، بس ہر دفعہ ایک فیصلے کی کسر رہ جاتی تھی سو وہ آج پوری ہو گئی، مگر مسل مقدمہ پر نظر ثانی کے بغیر نہیں۔

نتائج کی اہمیت کے اعتبار سے ممکن ہے، سبب کو حقیر اور ناقابل یقین سمجھا جائے، لیکن ہر بڑی چیز اسی طرح دُنیا میں آتی ہے۔ نہ سیب درخت سے گرتا نہ کشش ثقل کا راز معلوم ہوتا۔ یہاں بھی ایک چیز گری تھی دیا سلائی کی ڈبیا۔ لیکن نفس مضمون کے لیے اُس کا گرنا اتنی وقعت نہیں رکھتا جتنی صبح آنکھ کھلنے پر بستر پہ چاروں طرف اس کا ڈھونڈا جانا اور نہ ملنا۔ مکھی نے ذرا سا پر ہلایا اور کرما کا قانون حرکت میں آیا۔ پھر دس بیس بادشاہوں، دو چار سلطنتوں کی بھینٹ لے کر بھی مان جائے تو سمجھ لکھتے بنتے۔ ہم آپ میں سے کوئی ہوتا تو زیادہ سے زیادہ دو چار منٹ اپنا خون کھول کر چپ ہو رہتا۔ مگر یہاں تو سابقہ تھا ایسے تالاب سے جہاں ذرا سی کنکری وہ لہر پیدا کرتی ہے کہ دونوں جہان ڈھک جائیں، یہ تو آفاق گیر تخیل تھا جو کل میں جز دیکھتا ہے اور جز میں کل، جس کے لیے دُنیا علامتوں کا جنگل ہے۔ چنانچہ چوہیا نے جو پھولنا شروع کیا تو شیر بن کر ہی دم لیا۔ دیا سلائی نہ ملنے کے معنے تھے کہ وہ سگریٹ نہ پی سکے گا اور سگریٹ ہی تو وہ چیز تھی جو اسے دُنیا سے قطعاً اور کلیتاً بیزار نہ ہونے دیتی تھی۔ اسی کی شفاعت تھی جو اُس سے بار بار زندگی کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کرا لیتی تھی۔ اس کی عشوہ طرازیاں تھیں جو آخری فیصلے کے سارے ارادے بھلا کر اُس کے ہونٹوں تک مسکراہٹ کھینچ لاتی تھیں۔ دیکھیے نا، لے دے کے سگریٹ کا دُھواں ہی تو وہ چیز رہ گئی ہے جس پر انسان کو کسی قدر اختیار حاصل ہے۔ چاہیں تو اُسے داہنی طرف اڑا سکتے ہیں اور چاہیں تو بائیں طرف۔ مشق کر لی جائے تو ہوا میں چھلے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی تو وہ رُوح پرور اور جاں نواز دھوکا ہے جو آدمی کے دِل میں اتنی تقویت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ بستر میں سے نکل کر دُنیا کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکے۔ صبح کی سگریٹ کے بغیر وہ لوگوں کی نگاہوں کو کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ اب وہ دِن بھر باہر نہ نکل سکتا تھا، اور اس طرح ایک پورا دن جو شاید نہ صرف اس کے بلکہ انسانیت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا، یوں ہی ضائع ہو رہا تھا۔ صبح سویرے اس دلاسے، اس چمکار سے محروم رہ جانا یقیناً ایک سانحہ تھا، یہ اس فرد قرار داد جرم میں جو وہ مرتب کر رہا تھا، ایک اور اضافہ تھا۔ ایسی چیزوں کو لوگ

اتفاق کہہ کر ٹال دیتے ہیں، لیکن یہی تو ان کا حقیقتوں کو جھٹلانا ہے۔ اپنے آپ کو افیم دے دے کر سلاتے رہنا۔ سچ تو وہ عذاب ہے جس سے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوتا ہے، لیکن وہ اب ایک لحظہ کے لیے بھی سمجھوتا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف سچ، ہر قیمت پر سچ، اگر اتفاقات کسی کے سہارے کو ایسی بے دردی سے چھین سکتے ہیں تو اس کے صرف ایک ہی معنے ہوئے، اور وہ یہ کہ زندگی انسان کی رفیق و مددگار نہیں ہے، بلکہ اُس کی فطرت میں انسان کے لیے ایک پست، سوتیا ڈاہ، ایک انتقامی جذبہ، ایک خباثت بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی آدمی اندھے کی لاٹھی چھین کر بھاگ جائے کیا اُسے دوست کہیں گے؟ لہٰذا زندگی ناقابلِ تردید طور پر انسان کی دُشمن ہوئی۔ زندگی کی دشمنیاں اور فریب کاریاں اسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں اور رنج و غم غیظ و غضب، انسان کی مضحکہ خیز بے چارگی و مجبوری کا احساس، اُس کے مستقبل سے مایوسی، یہ سب چیزیں شیشے کی طرح اس کے دِل میں اتر گئیں اور اس نے اپنے آپ کو لحاف میں لپیٹ لیا۔

آخر دردِ زہ کی تکلیف میں کچھ افاقہ ہوا۔ اس کا چہرہ (جو تپ دِق کے مایوس مریضوں کا سا زہر خند لیے ہوئے تھا) اور بازو باہر نکل آئے اور اس ترشے ترشائے چست فقرے نے اُبھر کر اُس کے دِل کا بوجھ کچھ ہلکا کیا۔ بدی تیرا نام زندگی ہے۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس شدید اقدام کی ضرورت ہی کیا تھی پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھ لیا ہوتا لیکن وہ رفاقت، وہ ہمدردی ہی کیا جو لحاف سے نکلنے اور بدن توڑنے مروڑنے پر مجبور کرے اور نہ اس پر یک رُخا اور تشائم پرست ہونے کا الزام عائد کرسکتے ہیں۔ کائنات کی رگ رگ میں بدی تیری ہوئی سہی، لیکن اُسے بذاتِ خود نیکی کے وجود سے کب انکار تھا۔ نیکی وہ گم گشتہ فردوس ہے جو چند اہل بصیرت کے تخیل میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ یہ وہ خواب ہے جسے گنے چنے انسان (وہ کہنا تو چاہتا تھا فوق الانسان، مگر ذرا فسطائیت سے بھڑکتا تھا اور خصوصاً اسلامی فسطائیت سے) دیکھ سکتے ہیں اور پھر خواب بھی وہ رنگین، جس کے سامنے دُنیا کی ساری بھلائیاں، برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جس نے دُنیا کو خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا ہو اور ساتھ ہی اُس کی تجلی کی ایک جھلک بھی۔ تو اُس کے ہونٹوں سے اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے، بدی تیرا نام زندگی ہے۔

یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ گئی، لیکن انسان کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا وہ اپنی مجبوری اور بے اختیاری کو بے چون و چرا قبول کرلے؟ کیا وہ زندگی کے نظام کے سامنے

سرِ تسلیم خم کردے اور اتفاقات کا کھلونا بن جائے؟ ممکن ہے اور لوگ بھی یہی رائے دیں، لیکن باغی کہیں ہار مانتے ہوں گے! پھر بھی یہ سوال باقی تھا کہ اس جبر کے خلاف احتجاج کیسے کیا جائے، اس عالم گیر بدی سے اپنی بیزاری کے اظہار کا کون سا طریقہ ہو۔

لوگوں کو جمع کر کے تلقین و تبلیغ کی جائے، پمفلٹ بانٹے جائیں، بوتلوں میں بند کر کے اور غباروں میں باندھ کر انسانیت کے نام پیغام بھیجے جائیں۔ آرام و آسائش یک قلم موقوف کر دی جائے۔ برف میں ٹھٹھری ہوئی بوڑھیوں کو گود میں لاد کر لایا جائے اور اُن کی تیمار داری کی جائے۔

لیکن یہ تو خلا میں کسی بے اثر فرشتے کے چمکدار پروں کی پھڑپھڑاہٹیں تھیں۔ کہیں ایسے بدی کا مقابلہ ہوا ہے؟ دو چار دن چیخ چاخ لو۔ جب گلا بیٹھ جائے تو چپ چاپ گھر چلے آؤ۔ اچھا خاصا تماشا بننا ہے۔ لونڈے پیچھے لگ جائیں گے۔ پکارتے پھریں، لولو ہے بے لولو۔ یہ تو اُلٹا بدی کا شکار ہو جانا ہے، بدی کو اپنے اُوپر ہنسوانا۔

پھر؟

ترکی بہ ترکی۔ اگر بدی سے لڑنا ہے تو مجسم بدی بن جاؤ۔ لوگوں کو زندگی کی فطری بدی سے خبردار کرنا چاہتے ہو؟ ساتوں ہلاکت خیز گناہوں کا ناچ ناچ کر دکھاؤ۔ اگر غریبوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہتے ہو تو چابک لے کر اُن کی کھال اُدھیڑ دو..... اور سچ تو یہ ہے کہ جب زندگی کی جڑ ہی میں برائی ٹھہری تو پھر اس کو زیر کرنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔ زیادہ سے زیادہ انسان احتجاج کر سکتا ہے اور بس۔ احتجاج کا بھی وہی ایک طریقہ ہے، اپنے آپ کو بدی کے ایسے گہرے رنگوں میں رنگ لینا کہ وہ مبالغہ آمیز معلوم ہونے لگیں۔ جنہیں واقعی انسان کی کمینگی کا احساس ہے، وہ تو دروازہ کھلنے کی آواز سے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ جس کی آنکھیں چھچھورے پن اور نمائش پسندی کے مظاہرے دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہوں، وہ آخر اپنی دیوانگی میں بچے اُبال کر کھانے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے، جب دوست اتنے بدگمان ہوں کہ خلوص پر بھی شک کرنے لگیں تو ایسے سنگ دِلوں کو صرف اسی طرح یقین آسکتا ہے کہ نیک نیتی کے ثبوت میں اپنا کان کاٹ کر بھیج دیا جائے۔ گھر والے اتنے ٹھس ہوں کہ شدید ترین رُوحانی اذیت کی بھی سمجھ نہ رکھتے ہوں تو ایسوں پر تلوار لے کر جھپٹ پڑنے کو اپنے آپ سے جی چاہے گا۔ جس دُنیا میں سود لینے کی اجازت ہو، جہاں مزدوروں کی محنت کا پھل سرمایہ دار کھاتے ہوں، وہاں غلاموں کی تجارت ہی کو کون سا بڑا گناہ ہوا؟

جب اِنسانیت کے سچے عاشقوں کی قسمت میں مایوسیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہ تو پھر انہیں اس کے علاوہ اور کیا سوجھے گا کہ جو جزیرے اب تک بچے ہوں اُن میں بھی آتشک پھیلائیں۔

چنانچہ فیصلے کے ساتھ ہی سزا بھی تجویز ہو گئی۔ اب وہ بدی کا ہی بن کر دکھائے گا۔

مجھے افسانہ طرازی تو منظور نہیں جو اُس کے دِل میں بدن کو ہرا رنگ کر بازار میں ننگے نکل کھڑے ہونے کی خواہش پیدا کر دوں، یا اُسے جعلی سکے بنا کر غریبوں میں بانٹنے پر تیار دکھاؤں۔ سب سے پہلے بدی کی جو شکل اس کے ذہن میں آئی وہ اتنی تسلی بخش تھی کہ اس نے دُوسری اصناف پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ فوراً دانت بھینچ کر اور مضبوطی سے مٹھیاں باندھ کر یہ طے کر لیا کہ وہ کسی کنواری کی عصمت لے گا۔

لیکن جناب، کنواریاں کوئی بنولیوں کی طرح پیڑوں سے تو جھڑتی نہیں کہ گئے اور بٹور لائے۔ ہاں اتنا آرام ضرور ہے کہ انہیں کھڑکیوں سے بڑا لگاؤ ہے، اور کم سے کم میں تو اس اصول کو احمقانہ نہیں کہہ سکتا کہ پیڑ کے نیچے منہ کھولے کھڑے رہو، شاید کوئی جامن ٹپک ہی پڑے۔ اتنا انتظار تو خیر وہ کر سکتا تھا، مگر جب کسی کے سامنے سے ہٹنے پر پوچھنا پڑے۔ "مجھے توڑ کر کھا لے چلیں؟" جب آنکھیں چندھیا جائیں اور ہاتھ پر جم کر رہ جائیں، جب آنکھ اُوپر اٹھنے سے شرمائے اور جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی تک نوبت پہنچ جائے، تو سمجھئے کہ اس مرض کی علامتیں نمودار ہوئیں جسے بورژوا ڈھکوسلا کہتے ہیں۔ دبوا۔ نہ کے ہے تو ایک ہو بہت تھی، لیکن عزت کا سوال بھی آن پڑا۔ فلسفیانہ بدکاری تو ایک استقرائی مشغلہ ہے، بازاری حرکتیں کر کے اسے مبتذل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کسی طرح اپنے آپ کو ہوا میں بوسے اُڑانے، مسکراہٹیں بکھیرنے اور آنکھیں جھپکانے پر راضی نہ کر سکا، اور کھڑکیوں کے چہرے بھی اسی طرح بت بنے رہے۔ وہ انسان کو ایسا کوڑھ مغز بھی نہ خیال کرتا تھا، مگر یہ لڑکیاں اس کی طرف ہر وقت گھورتے رہنے کے باوجود اس کے چہرے کی آتشیں قنوطیت، بغاوت پسندی اور شاعری کو بالکل نہ سمجھ سکیں۔ یہ ایک تازہ زخم تھا اوروں سے کہیں گہرا!

لیکن اچھا ہوا کہ وہ وقت پر سنبھل گیا۔ بدی تو جب کامل ہوتی ہے کہ اس میں بدی کا احساس ہو۔ رسم و رواج کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ پھینکنے اور نیکی پر کاری ضرب لگانے کا احساس بھی شامل ہو۔ بفرض محال اگر کوئی احساس مند اور وسیع تخیل رکھنے

والی لڑکی اُس کے لیے اپنے زینے کے اندھیرے کونے میں اُتر بھی آتی تو کیا تھا؟ وہ تو یہی سمجھتی رہتی کہ مجھے ایک گورا چٹا، پتلون پہننے والا دولہا مل رہا ہے، اور پھر اُوپر سے "بس یہ نہیں" منت سماجت، قسما قسمی، ٹسوے! یہ سب کس سے برداشت ہوتے؟ بھلا قاضی جی کی ڈاڑھی اور نکاح والوں کی سفید اچکنوں کو بدی سے کیا واسطہ؟ متوسط طبقہ، اور پھر اُس کی لڑکیاں! اگر یہ سمجھ لیں بدی کی عظمت تو شدید بھینیں بھی اُڑنے لگیں۔ ان ڈرپوکوں، ان مردہ دِلوں، ان زرد لاشوں میں، جن کا سارا خون رسم و رواج اور اخلاقیات کی جونکوں نے چوس لیا ہو، یہ جرات رندانہ کہاں! اس کے لیے تو بڑی جان، بڑے یقین، زندگی کے بڑے رَچے ہوئے احساس کی ضرورت ہے، جو صرف نچلے طبقوں ہی کو میسر ہے۔

اب کے اُس نے کنواری کی بھی شرط اُڑا دی۔ اس کے علاوہ اُس نے دھوبن اور بھنگن کے ساتھ یہ رعایت بھی برتی کہ اُن سے آنکھیں ملا کر بات کر لی اور ایک آدھ دفعہ مسکرا بھی دیا۔ لیکن کنبھ کرن کو جگانے کے لیے تو سو ہاتھیوں کا بل چاہیے مختصر یہ کہ رہے یہاں بھی وہی ڈھاک کے تین پات۔

وہ مایوس ہوتا چلا گیا، اور آخر اُسے یقین ہوگیا کہ اگر انسان کنوئیں میں بھی گرنا چاہے تو بھی زندگی اُسے اپنی خواہش پوری نہیں کرنے دیتی۔ وہ اس شخص تجربے پر جتنا غور کرتا تھا اتنا ہی یہ احساس اندھیروں کی طرح اُس پر جھکتا چلا جاتا تھا کہ انسان کی قسمت میں ہی تنہائیاں ہیں۔ نہ کوئی اپنے اندر کسی کو جگہ دے سکتا ہے اور نہ کسی کے اندر جگہ پا سکتا ہے۔ بس اکیلے، تن تنہا، چلتے چلے جاؤ یہاں تک کہ رات ہو جائے۔

اس مرہم سے وہ زخم تو بھرنے لگے، مگر یہ مرہم بھی مرچوں سے کم نہ تھا، تاہم اس خیال میں یہ سکون کا پہلو ضرور تھا کہ وہ ذاتی شکوہ و شکایت سے بہت بلند تھا، اور اِتنا وسیع اور کائنات سمیٹ کر اُس کے پھیلان میں ان لونڈیوں اور بھنگنوں کا وجود ہی غائب ہو جاتا تھا، بلکہ خود اُس کا بھی۔ اس لیے بہت ممکن تھا کہ وہ انسان کے اندیشے میں اپنا ارادوں اور عزائم کو بالکل بھول ہی جائے اور فکر مطلق و مجرد کے بے نور خلاؤں میں معلق رہے۔

لیکن ایک دن نہ جانے کیسے یاد آیا کہ "ڈینڈی" (بانکے) کے جملہ اوصاف میں ایک قوتِ ارادی بھی ہے، اور اس کسوٹی پر اپنے آپ کو کستے ہوئے وہ اپنی کمی کے احساس سے چونک پڑا۔ ساری عمر میں اُس نے صرف ایک ارادہ کیا تھا۔ مقصد یہ کہ ایسا ارادہ جو اُسے اُس نادار الوجود اشرافیہ کی رُکنیت کا مستحق بنا دے اور اُسے بھی پورا نہ ڈالا۔ پہلی ہی

ٹھوکر سے ڈر کر پلٹ پڑے۔ حالانکہ قوتِ ارادی تو ہونی چاہیے کہ پہاڑوں سے چیں بلوا دے۔ ہار ماننا کہیں "بانکوں" کا شعار ہے۔ دُنیا کی ساری بدکاریاں ختم ہو جائیں، تب بھی نہ تھکو اور کچھ نہیں تو اس شان سے صوفے پر لیٹو کہ پیر آتش دان پر رکھے ہوں اور سر نیچے لٹکتا ہو۔ اگر یوں ہمت ہارنی تھی تو بدی کرنے ہی کیوں نکلے تھے، اپنا آرام سے گھر میں نماز پڑھتے مصلے بچھا کے، جو محلّہ بھر تعریف کرنے لگتا۔ مرد آدمی، کنواریاں اور بیاہیاں نہیں ملتیں تو نہ سہی، رنڈیاں تو کہیں نہیں گئیں؟

واقعی ساری بات کتنی آسان تھی۔ سماجی رائے سے تو خیر وہ کیا گھبراتا، اُسے اب تک خیال ہی نہیں آیا تھا، مگر اب وہ بھی بدی کے پھول چن سکے گا۔ اب وہ بھی ایک موسم جنہم میں بسر کرے گا!

انتقام، اے انتقام، اے انتقام!

چلنے سے پہلے اُس نے ایک حفاظتی تدبیر اختیار کرنی مناسب سمجھی۔ جہاد میں شامل ہونے والے غازی سر پہ کفن باندھ کر جایا کرتے تھے، اُس نے کوٹ کے بجائے چمڑے کی جیکٹ پہنی اور اُس کا ذکر نہ بھولنا چاہیے کہ اُس میں Zip Fastener لگا ہوا تھا۔ اس سے آدمی ذرا ایسے لگنے لگتا ہے کہ جو کہہ رہا ہے وہی کر گزرے گا۔ دِل کو تو اس سے تقویت پہنچتی ہی ہے مگر لوگوں کی متجسس اور عجیب جو نظروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلا تو اُس کی زبان پر بے اختیار ریں بو کا ایک شعر آ گیا:

"لو وہ آئی رنڈیوں کی سرخ و سفید ٹولی جن کی رانیں اینٹھی جا رہی ہیں۔ پاگل ہو جاؤ، تمہارے وحشت زدہ چہروں سے دِل لگی میں کچھ اضافہ ہی ہو گا۔"

ایک اور شعر تھا جس میں آتشکیوں کو پکارا گیا تھا، لیکن اُس وقت اُسے یاد نہ آ رہا تھا کہ اُن کے دُوسرے جوڑی دار کون تھے۔ بہرحال وہ اپنے آپ سے بے حد مطمئن تھا اور پتلون کی جیبوں میں مٹھیوں کو زور دے دے کر اس احساس کو بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے خیالوں کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ وہ قصداً سڑک پر ایڑیاں بجا بجا کر چل رہا تھا۔ جن کی ہر آواز اُسے بتاتی تھی کہ وہ تمام رکاوٹوں کو کچلتا ہوا دلیرانہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ رات کے اندھیرے میں سڑک کی روشنیوں کی چھینٹیں ملی ہوئی نہیں، جس سے فضا میں ایک کیف پیدا ہو گیا تھا، اور وہ اُسے

کے جوش کو مدھم نہ ہونے دے رہا تھا۔

کچھ لوگ اپنے آپ کو ان سے بے تعلق ثابت کرنے کے لیے طوائفوں کے مکانوں کے سائے سے بھی بچ بچ کر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں اوورکوٹ کا کالر اُلٹے ہوئے یا ٹھوڑی تک مفلر لپیٹے ہوئے آدمی ایک ستون کے پیچھے سے نکل کر دوسرے کے سائے میں جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہی تھے یہ متوسط طبقے کے لوگ! کیا مجسم فریب تھی اُن کی زندگی۔ ایک شفیقانہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں تک آگئی اور وہ مکانوں کے قریب ہو کر چلنے لگا۔ اگر کسی کوٹھے پر کوئی طوائف نظر آ جاتی تو وہ کھڑا ہو جاتا اور اسے دیکھنے کے بعد آگے بڑھتا۔ آخر وہ ایک ایسے زینے پر چڑھا جس کے سامنے خوب روشنی ہو رہی تھی اور برابر والے پنواڑی کی دکان پر کچھ لوگ بھی جمع تھے، لیکن اس نے ان کی طرف بالکل نہیں دیکھا، بس چھلانگ مار کر چڑھ لیا۔

ایک آواز میں بنو، شبو چھبو، سب کی لینڈوری لگ گئی۔ اس کے دِل میں جھجک یا گھبراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا، اور وہ بڑے سکون اور دلچسپی سے انہیں اپنی نظروں میں تول رہا تھا، جیسے بڑا پرانا منجھا ہوا تماش بین ہو۔ خود اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُس میں کسی کمال کی اخلاقی جرات موجود ہے وہ تو تقریباً چھانٹ چکا تھا، لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ اپنی لوح کی تصویر سے تو ان کی شکلیں ملا کر دیکھیے۔ اب جو دوبارہ جائزہ لیا تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ تو ان کے بازو دہک رہے ہیں، نہ چھاتیوں میں سے شعلے اُٹھتے ہیں، نہ رانوں میں اینٹھن ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہ ذرا کوئی گدرہی ہو، کچھ پھولی پھلی، بغل گیر۔ ایک سے ایک مریل، ہڈیوں کا ہار، کلے پچکے، بجو کی سی آنکھیں، اور یہ پاؤڈر، سرخی، سینٹ، بندے، ریشمی کپڑے، یہ سب چہ معنی دارد؟ یہ بدی ہوئی؟ بدی تو ہونی چاہیے ننگ دھڑنگ، سر جھاڑ، منہ پھاڑ۔ گاؤ یے جیسی رانیں، پستان بھیلیا کدو، آنکھیں لال انگارہ، شہوت کے مارے منہ سے رال بہتی ہوئی۔ جو چیخ مار کر دبوچ لے۔ جس کی ہم آغوشی میں ابدی نیند ہو۔ جس کے سینے پر نسلوں کی نسلیں ہلاک ہو جائیں۔ یہ ہے بدی کی شان! نہ کہ یہ چھوکریاں، جو بار بار شرما کر ناک کی کیل دیکھنے لگیں۔ بات یہ ہے کہ یہ سارا متوسط طبقے کا کھیل ہے۔ یہ انہیں کی گڑیاں ہیں، بدی بھی کریں گے تو سرخی پوت کر، ریشم میں چھپا کے۔ اور بدی وَدی کون کرتا ہے، اس کے لیے چاہیے جگرا۔ یہاں تو آتے ہیں اپنی محرومیوں کی تلافی کرنے، انہیں بھلانے۔ اگر تم کلرک ہو اور ایک سفید چمڑی کی (اگر ناک پکوڑا اور دانت کھرپے ہیں تو

کوئی پروانہیں) اور ہندوستانی میں انگریزی لفظ ملا کر بولنے والی بیوی نہیں رکھ سکتے، جس پر قیمتی جھولیں لٹکا کر اپنے ساتھ لیے بازار میں سے نکل سکو تو یہاں چلے آؤ۔ بجلی کی روشنی میں چونی کے بندے بھی ویسے ہی چمکتے ہیں جیسے دو ہزار کے، اور جاپانی ریشم کا رنگ بھی سرخ ہو سکتا ہے۔ نہ اُس کے چھونے سے ہاتھ چھلتا ہے۔ دس منٹ تک احساسِ مالکانہ کے مزے لوٹ لیے اور خوش خوش گھر چلے آئے، اٹنی کا ہار لے کر، واہ رے بورژوا واہ! فریبی کے طریقے تو بس کوئی تجھ سے سیکھے!!

چند منٹ تک تو وہ ایک چہرے سے دُوسرے چہرے تک دیکھتا رہا۔ آخر جب اُن میں سے ایک نے پوچھا۔ "پھر بولو، کیا کہتے ہو؟" تو وہ کچھ کہے سنے بغیر دفعتاً مڑا اور ایسا اندھادُھند بھاگا کہ شکر ہے زینے میں لڑھکنی نہیں کھائی۔ پیچھے سے پکاریں پڑتی رہیں۔ "چلو آؤ نا تین روپے پہ ہی سہی۔" مگر شاید اُس نے سنا بھی نہیں اور سن بھی لیتا تو کیا تھا؟ اُسے تو بدی چاہیے تھی، عورت تھوڑے ہی۔

اُس کے حواس ایسے غائب تھے کہ جھونک میں وہ گھر کی طرف پڑ لیا لیکن کچھ دُور جانے کے بعد جب اس بے ربط فرار کا ہیجان ذرا دھیما ہوا تو اُسے پتا چلا کہ وہ کدھر جا رہا تھا۔ خواہ وہ وقتی طور سے ہڑ بڑا گیا ہو، لیکن اب وہ اپنے ارادے سے ٹلنے والا نہ تھا۔ یہاں سے تو وہ ضرور خالی ہاتھ لوٹا تھا، لیکن ابھی دمڑیوں کو آزمانا باقی تھا۔ شاید وہاں اُسے بدی کا مثالی نمونہ مل سکے جو گناہوں کی آگ میں سلگ رہی ہو اور جس کا بدن فاسفورس کی طرح جل رہا ہو، جو اُن ریشمی گڑیوں کی طرح مصنوعی شرم و حیا سے اپنے آپ کو شریف ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اُس نظم کی مٹلو بھد۔سل کی طرح پیٹھ پر دھموکا رسید کر کے کہہ سکے۔ "ارے میرے بادلوں کے عاشق، شوربا پینا ہے کہ نہیں؟"

پارہ جو کچھ اُترنے لگا تھا پھر چڑھ گیا۔ اُس نے اپنی رفتار دُگنی کر دی اور ایڑیاں بھی زیادہ زور سے بجنے لگیں۔

نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا کہ ہر آدمی اسے اپنی طرف ہی گھورتا معلوم ہوتا تھا اور وہ بھی بدن پھوڑ نظروں سے، واقعی اُس کے اعصاب میں بار بار تشنج پیدا ہوتا تھا جیسے نگاہیں جگہ جگہ چٹکیاں کاٹ رہی ہوں اور ان سے بچنے کے لیے اس نے اپنی رگ رگ کو ایسا اکڑا لیا کہ بہت دیر تک تو اُسے سوائے چمکتی ہوئی لالٹینوں، لال پیلی قمیضوں اور بے شمار کالے کالے سروں کے اور کچھ نظر ہی نہ آیا، اور وہ جیبیں کھرچ کھرچ کر یہ یاد کرنے کی

بے سود کوشش کرتا رہتا کہ وہ کہاں کے ارادے سے چلا تھا اور کہاں آنکلا ہے۔ آخر اُس نے اپنے اعصاب کو سمجھا ہی لیا کہ یہاں اُس کا جاننے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ تب جا کر اُس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک اچھے خاصے جمگھٹ کے قریب کھڑا ہے، یہ لوگ ایک لونڈیا کی دُکان گھیرے ہوئے تھے جو ایک آدمی کو داخل کر کے کواڑ بھیڑنے والی تھی اور حاضرین کے فائدے کے لیے بڑی بڑی ڈال کی ٹوٹی گالیاں بے تول بھشارہی تھی۔ عاشقوں کی صف میں سے دو چار منہ چڑھے نمائندے اوروں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ "ارے یہ گالیئیں ہی تو سُننے کو آتے ہیں میری جان، اور کاہے کو آتے ہیں!" جو بول نہیں رہے تھے وہ اپنے قہقہے سے تائید کر رہے تھے، دُوسرے لوگ ایسے لہک کر رائے دیتے تھے کہ ان کی خواہش صاف جھنجھناتی تھی۔ "کاٹ کھاؤ! دیکھ کیوں رہی ہو؟ کاٹ کھاؤ۔" اتنی بات تو اُس نے بھی تسلیم کی کہ اُس کے منہ سے گالیاں واقعی چٹپٹی معلوم ہوتی تھیں، خصوصاً اُس کا گنواری لہجہ ان میں ایک بھولا پن پیدا کر دیتا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کمر لچکا کر ایسے مبارزت خواہ اور طعن آمیز انداز میں سینہ اُوپر اُچھالا جیسے ایک اشارے میں سب کو پچھاڑ دے گی۔ یہ کمر تھی اس کی پسند کے مطابق جو بازو میں ذرا بھر کے تو آئے اور سینے کا تو کہنا ہی کیا جس کے بیچ میں سراوندھائے آنکھیں میچے پڑے رَٹا کرو: یہ ہے میرا گھر، میرا گھر تو یہ ہے۔ گول مٹول کندھے، پھدکتا سا قد، دھاڑتا ہوا سینہ، بازوؤں کی مچھلیاں وہ تنی جکڑی کہ ہونٹوں سے رال پھسلی پڑے۔ پھولے پھولے کچوری سے گال۔ اچھے خاصے گندمی رنگ پر پاؤڈر اس بدسلیقگی سے پتا ہوا کہ اُلٹا پیار آنے لگے۔ بوٹی بوٹی میں چلبلاہٹ، ہر بات میں ایک انوٹ، چال میں ٹھمکا! اور اُس کی آخری حرکت پر تو بس وہ لپک ہی اُٹھا تھا۔ دروازہ بند بھی ہو گیا اور اُس کی زبان چٹخارے لیتی رہی، لیکن ایک آدمی آگے بڑھ کر کواڑ دھڑ دھڑانے لگا۔ "ہو گئیں بند کٹھ گھر میں اپنے چاہنے والے کے ساتھ؟" ایک پٹ کھول کر اُس نے دھڑ باہر نکالا، اور چھیٹر مانگ نظروں سے سب چہروں کا جائزہ لیا، پھر اس آدمی کو پہچان کر مسکرائی، اور اُس کی طرف تہدیدانہ سرہلاتے ہوئے بچوں کی سی معصوم آواز بنا کر کہا۔ "ناں، بس یہ ہیں اِک ہمارے چاہنے والے تو!" اور دروازہ بند کر لیا۔

جب ایک ٹانگ تھک گئی تو وہ دُوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور وہ اسی طرح دَروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہتا۔ لیکن ایک تہمد اور چگی ڈاڑھی والے آدمی نے جو شکل سے چھبڑی

فروش معلوم ہوتا تھا، بڑے اظہارِ موانست، بلکہ تکریم کے ساتھ جگہ خالی کرتے ہوئے کہا: "بابو جی، آؤ، آگے آجاؤ۔" اگر اُس کا جاننے والا کوئی مقطع شخص یکایک نمودار ہو جاتا اور اسے پکڑ کر کہتا۔ "میاں؟ شریف باپ دادا کی اولاد ہو۔ یہ جگہ اور تم؟" تب بھی شاید وہ اتنا نہ بھینپتا جتنا اس تکریمی لہجہ نے اسے بوکھلا دیا اور وہ آگے کھسک لیا۔

یوں تو چودہ پندرہ برس کی لڑکیاں بھی تھیں، لیکن کیا جوان کیا بوڑھی، اس سرے سے لے کر اُس سرے تک سب بے ہنگم، بدقطع۔ شکل دیکھے سے بھوک بھاگے، معلوم ہو منھ چڑا رہی ہیں۔ کلونس بھی وہ جس میں چمک کی جھائیں نہ ہو، اور اس میں سے زردی کا اُبھار! دبلی ہو تو جیسے قصائی کی گائے، اور موٹی دیکھو تو تھوے کا تھوا۔ چکٹے ہوئے بال، منھ پر روگ بہتے، کپڑوں پر چکنائی کے سے داغ اور اُن کی دُکانیں تو وہ غلیظ، کہ معلوم ہو سوروں کی کوٹھری میں پہنچ گئے۔ جھلنگی چارپائیاں، جن کے بان کالے پڑے ہوئے۔ تکیوں اور پردوں پر دو دو انگل چیکٹ، دیواروں پر پان کی پیکیں اور نہ معلوم کاہیں کاہیں کے لیپ، ہر طرف سے گندگی کی لپٹیں اُٹھتی ہوئی۔ قریب جانا تو الگ، اُن کے خیال سے ابکائی آئے۔ سب سے زیادہ کراہیت انگیز اور خوف ناک تو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کا سر ہلانا تھا۔ جب ایک چیچک رُو، کالی بھجنگ ادھیڑ عورت نے سر ہلا کر اُسے پکارا: "بات سنو۔" تو وہ ڈرا کہ اب اُس نے اُٹھ کر گریبان پکڑا۔ لیکن ایسی کوئی سنسنی خیز بات نہیں ہوئی اور اس کا دماغ اتنا ٹھنڈا ہو گیا کہ وہ ان لوگوں پر اقتصادی اور عمرانیاتی پہلو سے غور کرنے لگا۔ انہوں نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟ مزے کی خاطر یا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے؟ بھیک مانگنی کیوں نہ شروع کی؟ کیا اخلاقی حیثیت سے وہ بہتر ہوتا؟ کیا ان کا وجود ضروری تھا؟ ان کی اصلاح کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جاسکتے تھے؟ مشنری انہیں عیسائی کیوں نہیں بنا لیتے؟ انہیں کام دینے کے لیے ایک کارخانہ بھی تو کھولا جاسکتا ہے؟

سرمایہ داری کی لعنتوں پر دانت پیس چکنے کے بعد اب وہ نئے نظام کی برکتوں کے تصور میں غرق تھا کہ اسے دُور سے کچوری کے (اُس نے لوگوں سے یہی نام سنا تھا) ماتھے کی ساری بندیاں لالٹین کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کرتی نظر آئیں۔

وہ کچھ رُوٹھی ہوئی سی کرسی پہ کڑک مرغی کی طرح پھولی بیٹھی تھی۔ زیادہ تر لوگ خاموش تھے۔ دو چار کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ایک من چلے نے پکارا "لے کھوٹا پیسہ!"

جواب ملا: "اپنی بھینا کو دیجو۔"

عاجزی برتی گئی۔ "کیسے ہی تو مان جاؤ۔"

بھوں نیچے نہ اُتری۔ "مینو اماں کو گھر جا کے۔"

"تم ہی ہو ہماری اماں لو!" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"اچھا تو لو۔" اور ہاتھ چلا پانی کے ڈونگے کی طرف۔ لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے لیکن ایک منٹ میں پھر وہیں کے وہیں آ جمے۔ اب انہوں نے فرداً فرداً آگے بڑھ کر ہل من مبارز کہنا شروع کیا، لیکن جہاں کوئی قریب آیا اور اُس نے ساتوں پیڑھیاں اُدھیڑیں، مگر کیا مجال جو پیشانی پہ شکن پڑ جائے۔ اُلٹے گڑگڑاتے تھے، پیروں پر سر رکھنے کو تیار تھے اور ٹھٹھاریاں تو وہ ایسی بھرتی تھی کہ ہمارے حضرت بھی ریشہ خطمی ہوئے جا رہے تھے۔ آخر وہ اتنی تنگ ہوئی کہ جھلا اٹھی۔ "ارے جاؤ، میری چھاتی پہ کیوں چڑھے دے ہو، جاؤ، میرے کاکا، میرے چچا، میرے دادا، میرے تاؤ۔" مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے کہاں مانتے۔ اُس نے بھی وہ ڈونگے پہ ڈونگا پانی چھڑکا ہے کہ ستھراؤ کر دیا۔ جب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی تو پھر سب وہیں موجود۔

آخر کب تک! لوگ اُکتا کر چلنے لگے اور جو رہ گئے ان کے بھی گلے تھک چکے تھے۔ وہ باہر باہر منڈلا رہا تھا، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کرے، اتنے آدمیوں کی موجودگی اسے چہرہ چھپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ آگے بڑھا اور تالیاں پیٹیں اور پھر کیا خبر وہ اُس کی بھی ایسی ہی تواضع شروع کر دے! لیکن اُسے یہ بھی منظور نہ تھا کہ دوبارہ اپنے لجلجے پن کا ثبوت دے، یا محض ایک مجمع سے ڈر کر بچک جائے۔ اس کے علاوہ کچوری کا سینہ اور بازو بھی اُس کے پیروں کو ہلنے دے رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو انہیں تھوڑی دیر اور دیکھ ہی لے۔

سر فروشی کی جرات آتی ہے تو بے اطلاع کیے، بس پیروں سے سر تک سنسناتی چلی جاتی ہے۔ اس نے سر جھٹک کر جیبوں سے ہاتھ نکال لیے اور اپنے ایک ایک رُوئیں کو احتیاط سے گونگا بہرا بنا کر لوگوں کو ہٹاتا ہوا صاف اُس کے پاس جا پہنچا، لیکن دِل میں وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید ایسا نہیں ہوا، کم سے کم اس کی آنکھیں کسی چیز کو نہیں پہچان رہی تھیں۔ ایک لرزتی ہوئی آواز نکلی۔ کیا.... "اور باقی لفظ حلق میں کھوئے گئے۔ اُس کے پیچھے اٹھتے ہی طوفان کی سی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔

کچوری نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا لیکن شاید اس بتا

دیکھنے میں ہرج بھی نہیں تھا۔ "بارہ آنے۔" اُس نے آواز میں چاہے لوچاہے نہ لو والی اکڑ پیدا کرنی ضروری سمجھی۔

اُس نے "پھنس گیا! پھنس گیا!!" اور بلیاں بلانے کی ذرا پروا نہیں کی۔ (ایک لمحے کے لیے یہ ضرور سوچا کہ اُس کا چھبڑی فروش دوست بھی اُن میں شامل تھا یا نہیں) اور ایسے فتح مندانہ چڑھ گیا جیسے کور۔ٹرڈین میں کسی چوٹی پر۔

لیکن اندر پہنچ کر اُسے فوراً پردے کی پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ اُس کا دماغ بالکل سن تھا، اَور دِل پر ایک نامعلوم ہول چھایا جا رہا تھا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے اندر آئی تو اسے سر جھکائے دانتوں سے انگلی کاٹنے میں منہمک پایا۔ لالٹین ٹانگنے کی آواز سے وہ چونکا۔ اور کچھ تو سوجھا نہیں، جیب سے روپیہ نکال کر اُسے پکڑا دیا لیکن ایسی احتیاط سے کہ ہاتھ نہ چھو جائے۔

وہ اِدھر اُدھر ٹٹولنے کے بعد بولی۔ "بابو جی، ٹوٹے ہوئے پیسے تو ہیں نہیں۔" حالانکہ جھنک سنائی دی تھی۔

"تو کہیں سے لے دینا۔"

"کہاں سے لے دُوں گی؟..... ایک آدھ پیسے کی کیا بات ہے بابو جی..... اِتی تو بکس ہی دیتے۔"

ایک تو جھوٹ، پھر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش، اور سب سے زیادہ خود داری کا یہ فقدان! لیکن ڈر تھا وہ جھگڑنے نہ لگے، لہٰذا اُس نے فی الحال معاملہ گول رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ "خیر بعد میں دے دینا۔" اور اس نے بھی اقرار کر لیا۔

تنت کے وقت کو کچھ اور ٹالنے کے لیے اُس نے پوچھا:

"کتنی دیر..... ؟ یعنی کتنے منٹ دیتی ہو ایک آدمی کو؟ کتنی دیر رہ سکتا ہے ایک آدمی یہاں؟"

"بس یہی جتنی دیر میں..... اور کتنی دیر؟"

"پھر بھی اندازاً کتنے منٹ؟"

"یہی دس پانچ، اور کیا۔"

لیکن اس کے بعد بھی نہ جنبد گل محمد۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ کچھ سمجھی، اور دری کو تہ کرتے ہوئے بولی۔ "اسے تو لو میں اُلٹ دُوں گی۔ اب بیٹھ جاؤ ہٹا دی میں نے۔"

وہ یہ گمان بھی نہ ہونے دینا چاہتا تھا کہ اُسے یہاں کوئی چیز ناپسند ہوئی۔ کسی کی دِل خراشی سے فائدہ؟ اس نے بدگمانی دُور کرنے کے لیے جلدی سے کہا: "نہیں، اس کی تو کوئی بات نہیں تھی۔" اور پائینتی پر ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اب پردہ تقدیر سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

جب وہ لیٹنے لگی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے ترمرے آگئے۔ اُوپر کا سانس اُوپر، نیچے کا نیچے۔ وہ ایسا سہم گیا تھا جیسے بچے ختنوں کے وقت۔ اس کے ہاتھ کو جو ساڑھی کی طرف بڑھنے کی دھمکی دے رہا تھا اُس نے اضطرارانہ بے چینی کے ساتھ بیچ ہی میں روک لیا اور خوف زدہ آواز میں کہا: "نہیں نہیں، یہ نہیں؟"

وہ اس کا مطلب ٹھیک طرح سے نہیں سمجھی، لیکن اُس نے پہیلی کو اپنے طریقے سے بوجھا۔ "نہیں، چنتا مت کرو تم۔ آکھر کو پیسے لیے ہیں تم سے، ایسی ویسی بات نہیں ہوگی۔"

"میرا مقصد ہے..... یعنی یہ کہ یہ نہیں..... بیٹھ جاؤ۔"

اب کے سٹپٹانے کی باری اُس کی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور اسے مشتبہ اور متعجب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی: "پھر"؟

یہ بتانا اُس کے لیے بھی ذرا مشکل کام تھا۔ لیکن لڑکی کی سراسیمگی نے اسے کچھ مطمئن کیا تھا اور وہ کھل سا گیا تھا۔ اُس نے معاملے کو غیر اہم بناتے ہوئے کہا: "میں تو یوں ہی آیا تھا ذرا....."

لیکن لڑکی کو "یوں ہی" کی گہرائیوں میں کچھ نظر نہ آیا اور اُس نے دُہرایا "پھر؟" وہ بالکل سناٹے میں آگئی تھی۔

کئی منٹ تک دونوں احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہے۔ لڑکی اُسے تک رہی تھی اور وہ زمین کو۔ اُس پر اذیت خاموشی کو توڑنے کے لیے اُس نے کوئی بات کرنی چاہی، لیکن بہت دماغ کھجانے کھرچنے پر بھی کچھ نہ سوجھا۔ پہلے تو اُسے خیال آیا کہ پوچھے، اُس نے پیشہ کیوں شروع کیا، اور وہ شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ لیکن یہ تو بندھا ٹکا سوال تھا۔ متوسط طبقے کی ریاکاری کا نمونہ۔

لڑکی کے اس طرح مبہوت ہو کر رہ جانے سے اُس کا ہراس کچھ دُور ہونے لگا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا توازن واپس آنے لگا تھا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ

اس موقع کو سماجی تحقیقات کا ذریعہ بنائے۔

"کتنا کما لیتی ہو گی تم؟" اُس نے پُر وقار اور عالمانہ انداز سے پوچھا۔

لڑکی نے اپنی غنودگی میں جواب دیا، لیکن حوالاتیوں کی سی لجاجت کے ساتھ "جی، ہمارا کیا کمانا وماناہ بس پیٹ کو روٹی مل جائے۔"

عجب بے سمجھ لڑکی تھی! اُسے ایک علمی تحقیق میں مدد دینے سے انکار تھا۔ شاید مذاق سے اس کی جھجک دُور ہو جائے۔ اپنی مسکراہٹ سے دوستی کا یقین دلاتے ہوئے اُس نے کہا: "یہ گالیاں کہاں سے سیکھیں تم نے؟"

اب کے تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کی آواز میں اُن مجرموں کو التجائے ترحم تھی جنہیں اپنے سزا پا جانے کا یقین ہو۔

"ہم کیوں دیتے بابو جی، گالیئیں کسی کو؟ ہم تو نہیں دیتے کسی کو بھی گالیئیں۔"

لیجئے صاحب، اب یہ بھی اپنے آپ کو شریف ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اُس نے کب کہا تھا کہ وہ گالیوں کو برا سمجھتا ہے، بلکہ اُس کی تو خواہش تھی کہ وہ اُسے بھی ایک آدھ مسالے دار گالی سنائے۔ لیکن جانور سمجھ لیں بھلا آدمی کی بات! اُس نے اپنے دوستانہ ارادوں کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "تمہیں تو بڑی چالاکی سے کام لینا پڑتا ہو گا؟" وہ اُس کا دِل نہ دکھانا چاہتا تھا، مگر اس وقت کوئی دُوسرا لفظ ہی سمجھ نہ میں آیا۔

وہ اضطرارانہ تکیے پر چڑھ گئی۔ جیسے اس کے پاس کوکین ہو اور اپنے آپ کو پکڑے جانے سے بچانا چاہتی ہو۔ "ہمیں کیا کام چالاکی سے؟ ہمیں تو روٹی کمانی ہے بابو جی۔ چالاکی سے کیا کام ہمیں؟"

وہ اُس کی وحشت زدگی پر ہنس پڑا۔ "تو میں تمہیں کچھ کہہ تھوڑی رہا ہوں۔ بھئی..... تم گھبرا کیوں گئیں؟ میں تو یوں ہی آ گیا تھا..... یوں ہی بیٹھا ہوں میں۔"

اُس کے دِل کی بے چینی دُور ہوئی یا نہیں، یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے لیکن وہ اسے ناراض نہ کرنے کے خیال سے بڑی نرمی سے بولی۔ "ہاں ہاں، بیٹھو بابو جی۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اُس نے چاہا بھی کہ اور نہیں تو کم سے کم اُس کی کمر میں وہی ہاتھ ڈال کر بیٹھ جائے۔ لیکن اس خیال سے باز رہا کہ وہ اُسے کہیں غیر سنجیدہ نہ سمجھ لے۔

آخر لڑکی نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "اچھا بابو جی اب جاؤ۔"

یہ غیر کاروباری سلوک اُسے کچھ ناگوار گزرا۔ "کیا دس منٹ ہو گئے؟"

لڑکی نے پھر دُہرایا۔ "بس اب جاؤ۔"

تھی تو یہ حرکت خلافِ معاہدہ، لیکن بے چاری کو اپنی روزی کی بھی تو فکر تھی۔ اس خیال سے اُس نے یہ بدمعاملگی معاف کر دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

جب وہ پیر دھو رہی تھی تو اُس نے سوچا کہ پیسے خرچ کیے ہیں تو ایک بوسہ ہی لیتے چلو۔

اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا..... وہ....." یہ لفظ کسی طرح اُس کی زبان سے نکل نہ رہا تھا۔ آخر اُس نے آنکھیں بند کر کے کہہ ہی ڈالا: "میں تمہیں پیار کر لوں؟"

ساڑھی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے لڑکی نے تختے کی طرح جھٹ سے اپنا چہرہ اُوپر اٹھا دیا۔ پہلے تو وہ گالوں اور ہونٹوں کے درمیان منڈلاتا رہا، پھر اپنے ہونٹ جھکا دیے جو آدھے اُس کے ہونٹوں پر پڑے اور آدھے بائیں گال پر۔

اُسے اتنا ہی مزا آیا جتنا کوئی تختہ چومنے سے آتا۔

کواڑ کھلتے ہی اُس نے وہ چھلانگ لگائی کہ اُس کے پیروں نے بازار وازار سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر بیس گز ادھر زمین کو چھوا۔ چال اُس نے پھر بھی کم نہیں کی۔ وہ کندھے جھٹک کر وہاں جانے کے سارے نشان جھاڑ دینا چاہتا تھا۔ جب وہ دُوسری سڑک پر مڑ گیا تب کہیں اس کے دل میں پہلا خیال آیا: وہ چونی لینا بھول گیا تھا۔ ویسے تو چونی کی بساط ہی کیا لیکن ایک سگریٹ کی ڈبیا ضرور آ سکتی تھی۔ بہرحال اب چونی لینے واپس جانا تو بالکل ناممکن تھا۔

پچھلے آدھ گھنٹے کے واقعات و حادثات کی جگالی کرتے ہوئے اُسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ باہر تو وہ کیا زور شور دکھا رہی تھی لیکن اندر تو بالکل بھیگی بلی بن گئی۔ اللہ میاں کی گائے۔ ممکن تھا کہ یہ اس کی شخصیت کا رعب ہو (اور یہ ایک تسلی بخش چیز تھی) لیکن ویسے بھی وہ چالاک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ظاہر میں چاہے کیسی ہی ہو مگر دل کی نیک تھی۔ شریف اور معصوم۔ اُسے اُن لوگوں کی سہل انگاری اور کم بینی پر غصہ آنے لگا جو رنڈیوں میں مکر و فریب کے سوا اور کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ بدی میں سے بھی تو نیکی نکل سکتی ہے جیسے گناہ گار باپ سے پاک باز بیٹا۔ اس نے خود دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کیسی نرمی سے پیش آئی۔ اس میں کیسی رفاقت، کیسا خلوص تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے بوسے کی بھی

اجازت دے دی تھی جو شاید رنڈیاں نہیں دیتیں۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ دست گل چیں نہیں تھا بلکہ دیدہ بلبل۔ اُسے بھی اس ہم نشینی میں لطف آ رہا تھا۔ اگر اقتصادی مجبوریاں نہ ہوتیں تو ابھی وہ اُسے اٹھنے نہ دیتی۔ اُس کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔ اُسے بھی تو احساسِ تنہائی ستاتا ہوگا نا۔ آج اُس نے اپنا ساتھی پایا تھا، لیکن بے چاری زندانی اسباب تھی..... یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے انسان کے سینے میں ایسا سچا دِل دیکھا تھا۔

اس احساس کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے کہ یہ تو صرف ایک نمونہ تھی، ایک علامت، کیا درحقیقت انسانیت بھی اُسی کی طرح نیک دِل، شریف اور معصوم نہ تھی؟ — تھی! اُس کا سارا خون کنپٹیوں میں جمع ہوگیا تھا اور دِل سینے سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ اس جلیل الشان جذبے کی ہیبت سے اُس کا وجود ایسے لرز گیا تھا جیسے طوفان میں سرکنڈے۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ہوا میں تحلیل ہو جائے، اور کائنات کے طول و عرض میں اس صداقت عظمیٰ کا اعلان کر دے۔

جب انسان دراصل نیک اور معصوم تھا تو اس کے مستقبل سے کیسے مایوس ہوا جاسکتا تھا؟ پھر کیوں نئی دُنیا کی تعمیر کے لیے اپنا تن من دھن سب وقف کر دیا جائے؟

اُس نے اِنسان سے مایوس ہو کر کیسی زبردست غلطی کی تھی، لیکن وہ غار میں گرنے سے بچ گیا تھا۔ اُس کی مثالیت پرستی اسے واپس مل گئی تھی..... اِنسانیت اور زِندگی پر اُس کا یقین پھر زندہ ہوگیا تھا۔ اس کے اندر ایک نئی روح پیدا ہو رہی تھی۔ وہ ایک بہتر اور زیادہ شریف النفس آدمی بن کر لوٹ رہا تھا۔ وہ اُس نورانی گروہ میں شامل ہوگیا تھا، جو کہتا ہے: برکت والی ہے زندگی!

وہ لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا چلا۔ سب سے راضی، ہر چیز کا دوست۔ سایوں سے ہاتھ ملاتا۔ اندھیرے سے بغل گیر ہوتا۔ انسانیت، زندگی اور آنے والے زریں زمانے کی حمد میں اُس کی رُوح ایسا ناچی کہ اسے گھنی چڑھ گئی۔

یہ تھی ایک رُوح! اُس نے کہا: اے رُوح، میں تحت الثریٰ میں گر رہا تھا۔ تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا! تو نے مجھے دائمی لعنت سے بچا لیا۔ تو نے میرے سامنے اَبدی اَنوار کے سرچشمے کھول دیے۔ آہ، اے حسین رُوح!!

(۲۲ دسمبر ۱۹۴۳ء)

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

(۱)

مسز جیکسن نے اپنا وعدہ حرف بحرف پورا کیا۔ حالانکہ اُس کی خاطر انہیں اپنا کام کلج ادھ بیچ میں چھوڑنا پڑا، اور جو اُوپر سے باگ دوڑ رہی وہ الگ۔ صحن تو خیر جھنگو چماری نے صاف کر دیا تھا، لیکن ابھی دالان پڑا تھا، اور وہاں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیے بغیر انہیں اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا، پھر ابھی برتن مانجھنا، ترکاری چھیلنا، روٹی ہنڈیا کرنا، بیس دھندے باقی تھے۔ جھنگو بھی تو اس گت کی نہیں تھی کہ اُن کی نگرانی کے بغیر کوئی کام ڈھنگ سے کر لے۔ ذرا سا کام بتاؤ، بس جہاں آنکھ چوکی اور اُس نے گھی کو گھڑا کیا۔ خاص طور سے ہنڈیا بھوننے کی تو اُسے آج تک تمیز نہیں آئی تھی۔ سمجھاتے سمجھتے مسز جیکسن کا مغز پچی ہو گیا، مگر اسے لال اور کالے ہی کے فرق کا پتا نہ چلا۔ ہنڈیا اُس پہ چھوڑی اور اُس نے جلا کے کوئلہ کی۔ لیکن آج انہیں یہ خطرہ بھی مول لینا پڑا۔ احتیاطاً انہوں نے ساری ہدایتیں بار بار دُہرا دیں، اور چلتے چلتے یہ بھی جتا دیا کہ اگر جھنگو نے اب کے ہنڈیا جلا دی تو آج اس کی خیر نہیں۔ جھنگو اس منصب پر آج بہت دِنوں بعد فائز ہوئی تھی۔ اس نے چمچے اور دیگچی پر اپنا تسلط قائم کرتے ہوئے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "اچھا اچھا، تم جاؤ تو..... میں سب سنبھار لوں گی؟"

مسز جیکسن ابھی دوباری میں ہی پہنچی تھیں کہ جھنگو نے آواز دی: "اجی، میم صاحب، میں کہوں اب کہاں جا رئی ہو، پادری ساب آتے ہوں گے گاؤں سے!"

"آتے ہوں گے تو آنے دے۔ میں کوئی زر خرید ہوں تیرے پادری صاحب کی، جو پلنگ کے پائے سے بندھی بیٹھی رہوں۔" مسز جیکسن نے جواب دیا اور داد طلب نظروں سے پادری صاحب کی تصویر کی طرف دیکھا جو اُن کے منجھلے بیٹے نے کھریا سے پھاٹک پر بنا

دی تھی۔

خیر یوں تو بھنگو کو بر سر اقتدار آنے کے بعد معزول ہونے کی اتنی جلدی بھی نہیں تھی، لیکن کبھی نہ کبھی تو ایسا موقع آتا تھا کہ وہ میم صاحب کی بھلائی کے لیے کوئی نیک اور مفید مشورہ دے سکے، کم سے کم یہ تو اس کا فرض تھا ہی کہ کنوئیں کھائی سے بروقت آگاہ کر دے۔ "میں تو یوں کہوں تھی کہ آتے ہی کھانے کو مانگیں گے...... کبھی بگڑن لگیں۔"

"کہہ دینا پادری صاحب سے کہ انہیں نہیں ملنا کھانا وانا۔ ذرا دیر لیٹیں کپڑے وپڑے اتار کے۔"

مسز جیکسن نے گھر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ چن چن سڑک پر کھیلتا کھیلتا اُن سے آ لپٹا کہ میں بھی چلوں گا۔ اُنہوں نے اسے ہزار چمکارا، دلاسے دیے، بیڈ بوائے کہہ دھمکایا، مگر وہ کہیں سننے والا تھا۔ اُس نے وہ فیل مچایا کہ انہیں ہار مانتے ہی بنی۔ "خیر، آج تو جو ہوا سو ہوا۔ آگے سے جو تم نے ایسا فساد کیا تو ہم تمہیں نوٹی بوائے کہا کریں گے، سمجھے......" سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں۔ اُس وقت تو وہ فکر فردا سے بے نیاز ہو کر گود میں ٹنگ ہی گئے۔

یوں تو فاصلہ کچھ ایسا تھا بھی نہیں، لیکن ایک تو اپنے کام دھندے میں وہ بڑی دیر سے چک پھیری بنی ہوئی تھیں، دُوسرے چلنا پڑا لاد کے بوجھ، اور اُوپر سے گبرڈن کے سائے نے آگ لگا رکھی تھی۔ پہنچتے پہنچتے بے چاریوں کا سانس چڑھ گیا۔ انہیں ڈر تھا کہ شاید اب وہ اپنی آواز میں وہ ڈرامائیت پیدا نہیں کر سکیں گی جس کی وہ تیاری کرتی رہی تھیں، اور جس کے بغیر ایسے موقع پر پورا لطف آ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال جہاں تک اپنے بس میں تھا، انہوں نے مکمل تاثر انگیزی کے انتظامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پہنچنے سے ایک منٹ پہلے اپنی چال دھیمی کر دی، دو چار گہرے گہرے سانس لیے، جو بالوں کی لٹیں منہ پر جھول رہی تھیں، انہیں گھیر گھار کے پیچھے کیا اور ڈیوڑھی ہی میں چن چن کر گود میں سے نیچے پھسلا دیا۔ اب بھی اتنا اندیشہ ضرور تھا کہ ممکن ہے لوگ اِدھر اُدھر ہوں، اور ان کا پہلا اعلان یوں ہی ہوا میں مرجھا کے رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ دُوسری دفعہ میں وہ استعجاب، وہ جوش و خروش، وہ تازگی اور اعتماد کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ بہرحال پانسہ نہ پھینکتیں، تو کیا کرتیں۔ کھینچ تان کے انہوں نے چہرے پہ مسکراہٹ کی دو تین لکیریں اِدھر اُدھر بانٹیں اور نفس لخت لخت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہی بولیں، بولیں کیا، سانس چڑھ جانے سے وہ کچھ ایسی بوکھلا گئی تھیں کہ آخری لمحہ میں اپنی آواز پر

فن کارانہ قدرت پا لینے اور موقع کے اعتبار سے مناسب قسم کی شگفتگی اور چھنک پیدا کرنے سے ناامید ہو کر انھوں نے اپنی دانست میں تو بالکل سر سے بوجھ سا اتار پھینکا کہ لو، سپردم بتو مایہ خویش را۔ بہرحال انھوں نے کہہ ڈالا۔ "لو بھئی افروز، کل آ رہی ہیں تمہاری گلیڈس۔ تیرہ کو۔"

اگر مسز جیکسن تین دن سے اپنی آواز کو سدھاتی رہی تھیں اور اپنے جملے کو تیر بہدف بنانے کے لیے اسے بار بار پگھلا کے نئے سرے سے ڈھالتی رہی تھیں تو ان کی محنت، مشقت رائیگاں بھی نہیں گئی، حالانکہ ان کا سانس کچھ ایسا بگڑا تھا کہ وہ تو راضی برضا ہو چکی تھیں۔ بہرحال چاہے یہ اُن کی ہنر مندی کا صلہ ہو یا بہ نفس نفیس خود موضوعِ بیان کی دِل پذیری، نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ مسز جیکسن کا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ افروز کے ہاتھوں سے آٹا پھسل کے پٹاخ سے کونڈے میں گرا اور رُکتے رُکتے بھی اُس کے منھ سے حیرت و انبساط کے مارے چیخ نکل پڑی۔ اپنے اس بے اختیارانہ مظاہرے پر اسے کچھ شرم سی بھی آئی کہ آخر مسز جیکسن کی بیٹی ایسی کون سی نعمت ہے کہ اُس کے دیدار کی اُمید میں کوئی پھڑک اُٹھے۔ تھوڑی سی جھینپ اُسے یوں تھی کہ اپنی بیٹی کے بارے میں مسز جیکسن کا جارحانہ جوش و خروش دیکھ دیکھ کر انھیں گھٹانے کے خیال سے افروز نے تہیہ کر لیا تھا کہ اور نہیں تو کم سے کم اُن کے سامنے گلیڈس کی باتوں سے بالکل دِلچسپی کا اظہار نہیں کرے گی، مگر اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اسی لیے اُس نے اپنی بے ساختہ غلط روی کا کفارہ گلیڈس سے ملاقات کے وقت تک ملتوی کر دیا اور اپنی گرم جوشی میں ترمیم کیے بغیر پوچھا: "اچھا، آ رہی ہیں؟"

"ہاں، کل، تیرہ کو۔ ابھی دوپہر ہی کو تو خط آیا ہے کہ میں بدھ کے دِن، تیرہ تاریخ کو صبح کے وقت یہاں سے چلوں گی اور تیسرے پہر تک گھر پہنچ جاؤں گی۔ میں نے کہا، بھئی چل کے بتا آؤں افروز کو۔ میں نے تم سے وعدہ کر ہی لیا تھا کہ جب گلیڈس آئے گی تو ایک دن پہلے خبر کر جاؤں گی۔ جب سے ڈاکیا خط دے کے گیا ہے، میں اسی فکر میں تھی کہ کسی طرح افروز کو خبر کر پاؤں۔ کیا کروں، اتنی دیر سے فرصت ہی نہیں ملی۔ برتن بھانڈے سب یوں ہی پڑے ہیں۔ چلو، میں نے کہا، کام وام تو روز ہوتا ہی رہتا ہے، افروز شکایت کرے گی کہ ماما نے کیا وعدہ کیا تھا۔ پھنگو کو بٹھا آئی ہوں ہنڈیا کے پاس۔ میں نے تو منھ بھی نہیں دھویا، یوں ہی بھاگی چلی آئی۔ دیکھو نا، کیا گت بن رئی ہے۔"

"تو کیا ہے؟ کہیں غیر جگہ تھوڑی آئی ہو؟" افروز کی اماں نے دلاسہ دیا۔

"خیر، یہ تو مہربانی ہے آپ کی۔ دیکھیے جی، بات یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کی محبت سے کیا بتاؤں، کتنا دل خوش ہوتا ہے۔ آپ کہیں گی، سب منھ دیکھے کی باتیں ہیں۔ بائی گوڈ میں سچ کہتی ہوں کہ جیسی میرے لیے گلیڈس ہے ویسی ہی افروز ہے۔ اب دیکھو، اس وقت مجھ سے گھر میں ٹھہرا ہی نہیں گیا۔ میں نے کہا۔ چاہے کام ہو چاہے پڑا رہے۔ افروز کو بتا کے ضرور آؤں گی۔"

"شکریہ شکریہ!" جب سیتا دیوی کے لیے کوئی کونا خالی نہ ملا تو افروز کے چھوٹے بھائی خورشید نے البم بند کر کے انگڑائی لیتے ہوئے کہا، اور غضب یہ کہ آواز بھی تو نیچی نہیں کی۔ افروز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہہ کی کہ بھئی دیکھو، یہ زیادتی ہے۔ ہر بات اپنی حد کے اندر ہونی چاہیے، اور اس ڈر سے کہ مسز جیکسن نے کہیں سن نہ لیا ہو، اس نے فوراً خواہ مخواہ ایک سوال ہی پوچھ لیا: "اچھا تو کل آ رہی ہیں؟"

"ہاں، کل آ جائیں گی تیرہ کو۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ تیرہ کو آئے گی، پادری صاحب کہنے لگے کہ نہیں، پندرہ کو آئے گی۔ اسکول بند ہونے کے بعد ایک دن تو رُکے ہی گی۔ میں نے کہا کیا دیوار کونوں سے باتیں کرنے کو ٹھیرے گی، لڑکیاں تو سب بھاگ جائیں گی چھٹی ہوتے ہی، سب کو اپنے اپنے گھر پہنچنے کی جلدی ہوگی۔"

"بڑا معقول جواب دیا آپ نے! چپ ہو کے رہ گئے ہوں گے پادری صاحب اس پہ تو۔" خورشید نے لقمہ دیا۔

مسز جیکسن سمجھیں مجھے واقعی داد مل رہی ہے۔ "اجی، وہ کہیں چپ ہونے والے ہیں، اُن کی تو عادت ہو گئی ہے فضول بحث کرنے کی۔ یہی کہتے رہے کہ نہیں جی، کوئی بات ہے، پندرہ کو آئے گی۔ میں نے کہا کہ اچھا بھئی لو، ناک ناک تو میں بدتی ہوئی جو وہ پندرہ کو آئے۔ اب تو شرط ہو گئی، دیکھو آنے دو، آج میں انہیں کیسا شرمندہ کرتی ہوں۔"

"آج آیا ہے آپ کا موقع، ہاتھ سے نہ جانے پائے!"

افروز نے پھر نیم خفگی اور نیم پسندیدگی سے خورشید کی طرف گھورا کہ یا اللہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، اور جو وہ سمجھ جائیں تو؟ بے چاری نے پھر ایک سوال ڈھونڈ ڈھانڈ کے نکالا: "تو کیا اسکول بند ہونے کے بعد بھی لڑکیاں ٹھہر جاتی ہیں؟"

"اجی نہیں، پھر کون رُکتا ہے! چھ سات کو امتحان ختم ہوتا ہے، بس اسی دن سے

لڑکیوں کو گھر بھاگنے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہ معلوم کیسے کاٹتی ہیں..... ہاں، لو یہ تو میں بتانا بھول ہی گئی، ہماری گلیڈس بھی پاس ہو گئی ہیں، اپنی کلاس میں تیسرے نمبر پر آئی ہیں۔"

"چلو، مبارک ہو۔" اماں نے کہا۔

"لاؤ، تمہاری طرف سے ہم مبارک باد دے دیں۔ افروز کی ہچکچاہٹ سے فوراً خورشید نے فائدہ اٹھایا۔

"ویسے تو تیسرے نمبر آئی ہے مگر انگریزی میں اُس کے کلاس بھر میں سب سے زیادہ نمبر ہیں، اور انگریزی ہی کیا، وہ تو سب چیزوں میں ہوشیار ہے۔ کسی میں بھی کمزور نہیں۔ اب کے تو وہ بڑی خوش ہو رہی تھی کہ ماما اِس سال میں نے خوب محنت کی ہے۔ اب کے تو میں فسٹ آ کے دکھاؤں گی۔ پر وہ بے چاری کرے بھی کیا۔ ایک ٹیچر ہے، وہ اُس کے پیچھے پڑ گئی ہے خواہ مخواہ۔ زیادہ نمبر بھی آتے ہوں تو کاٹ لیتی ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا دشمنی ہو گئی اُسے؟" افروز نے دِل ہی کی۔

"بس بات بے بات کے، خواہ مخواہ بیر باندھتی پھرتی ہے۔ خیر جی ہم تو کہتے ہیں جو کیا اچھا کیا۔ چلو تمہیں خوش سہی۔ ہمیں تو پاس ہونے سے مطلب ہے تو وہ پاس ہو ہی گئی۔ ہمیں نہیں چاہیے تمہارا فسٹ وسٹ۔" انہوں نے بڑے فخر سے دُنیا پر قناعت کی نظر ڈالی اور کمر ڈھیلی کر کے اطمینان سے ہو بیٹھیں۔

"بس ڈٹی رہیے گا آپ اسی بات پر!" خورشید نے شُشکارا۔

افروز کو پھر بیچ میں کودنا پڑا۔ "تو امتحان کون سی تاریخ کو ختم ہوا ہے گلیڈس کا؟"

"سات کو، سات تاریخ کو ختم ہوا ہے امتحان۔"

خورشید کا چہرہ اب بھی دھمکی دے رہا تھا، اس لیے افروز رُکی نہیں۔ "امتحان ختم ہوتے ہی کیوں نہیں چلی آئیں؟ اِتنے دِن وہاں کیا کرتی رہیں؟"

"یہ تو اسکول کے قاعدے ہیں بیٹا۔ امتحان کے بعد ایک ہفتہ اور رُکنا پڑتا ہے۔ جب تک نتیجہ نہ نکل آئے، کوئی لڑکی گھر نہیں جا سکتی، نہیں تو اُس کی غیر حاضری لگ جاتی ہے۔ کیا کریں بے چاری لڑکیاں، پڑی رہتی ہیں۔"

"جی تو بہت گھبراتا ہو گا ان کا، سب کو گھر چلنے کی لگی رہتی ہو گی۔"

"ہاں، مگر یہ بات بھی ہے کہ لڑکیوں کے اصلی مزے تو امتحانوں کے بعد ہی آتے

ہیں، ایک ہفتے تو ان کے بڑے ٹھاٹ رہتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" افروز نے باورچی خانے میں سے پوچھا۔

"بھئی، بیٹھو تو بتاؤں۔ تم تو کبھی باہر کبھی اندر۔" مسز جیکسن نے کچھ مصنوعی خفگی سے کہا، اور بات بھی ہے کہ جب سامعین کے چہرے اور ان پر داستان گوئی کے اثرات زیر مشاہدہ نہ ہوں، بھلا کیا خاک لطف آسکتا ہے۔

"نہیں، نہیں، اب مجھے بالکل نہیں اُٹھنا، اب تو میں تو ارکھ رہی ہوں۔"

تسلی پا کر مسز جیکسن نے قصے کی مناسبت سے طبیعت میں کچھ فرحت پیدا کی اور گویا ہوئیں۔ "ہاں، تو میں کہہ رہی تھی کہ امتحانوں کے بعد آتے ہیں لڑکیوں کے تو مزے۔ آٹھ آٹھ بجے سو کے اُٹھ رہی ہیں، نہ ہاتھ کی خبر نہ منھ کی۔ بس اُٹھیں اور دوڑ بھاگ میں لگ گئیں۔ کبھی اس کمرہ میں گھس، کبھی اس کمرہ میں گھس۔ ایک دھما چوکڑی، ہاہا ہو ہو۔ دن بھر اسی میں گزر جاتا ہے۔ پھر یہ بھی تو نہیں کہ رات ہی کو ذرا دیر آرام کرلیں۔ بارہ بجے تک یہی غل غپاڑہ مچاتی رہتی ہیں۔ ڈانٹیں پڑتی ہیں، سب کچھ، مگر ذرا جو اثر ہو۔ تھک تھکا کے پلنگ پر پہنچیں گی تو بھی باتیں بند نہیں ہوں گی۔ گھنٹوں باتیں چلتی رہیں گی۔ پٹی سے پٹی ملی ہوئی ہے اور کھسر پھسر ہو رہی ہے۔"

"گلیڈس بھی کھیل کود میں شامل ہوتی ہیں یا نہیں؟ وہ تو بڑی سیدھی سی معلوم ہوتی ہیں۔ ہم نے انہیں ایک ہی دفعہ دیکھا ہے۔ چپ چاپ بیٹھی رہیں سر جھکائے۔"

"اوہو، جب تم اس سے ملو گی تو پتا چلے گا۔" گلیڈس کی اس تعریف سے مسز جیکسن مطمئن تو بہت ہوئیں مگر وہ اُس کے دُوسرے پہلوؤں کو نظرانداز ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ "وہ تو سب سے آگے رہتی ہے، یہ بات نہیں ہے، بڑی خوش مزاج ہے اور ہنستی تو اتنا ہے کہ بس ڈھیر ہو ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی شوق اُسے تاش کا ہے۔ گھر آتی ہے تو اپنے پاپا اور بڑے بھائی کو گھیرے رکھتی ہے، بس تاش تاش، چوبیس گھنٹے کھلائے جاؤ اُسے تو تاش۔ وہ دونوں بھی تنگ آ جاتے ہیں مگر ہاں، ایک بات ہے، اُچھل کود چاہے جتنا لے، کیچ گارے کے پاس نہیں پھٹکتی۔ تم جانو، لڑکیاں تو ایک شیطان، ایک دوسرے کے اُوپر مٹی پھینکتی ہیں، منھ پہ کیچڑ ملتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا سوانگ کرتی ہیں۔"

"پاگل ہی ہیں بالکل۔" اماں کو بہت دیر سے گفتگو میں شامل ہونے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

"اجی، اب لڑکیاں ہی جو ٹھیریں، مگر ہماری گلیڈس ان باتوں سے بارہ پتھر الگ رہتی ہے۔ جہاں کوئی لڑکی اس کی طرف بڑھی اور اُس نے کہا کہ بس بھئی، اس کی دوستی نہیں پالتے، چاہے برا مانو، چاہے بھلا، صفائی کی تو اُسے لت ہے۔ اسکول تو اسکول، گھر پہ بھی اُس کا یہ حال ہے کہ پیالی میں ذرا سا دھبا نظر آ جائے بس پھر چائے نہیں پیئے گی، چھوڑ دے گی۔ اسی طرح بھائی کے ساتھ کرتی ہے۔ چن چن سے اُسے بڑی محبت ہے، سب کچھ ہے لیکن ذرا مٹی میں سنا ہو گا تو ہاتھ نہیں لگانے کی۔ وہ باہر سے کھیلتا کھیلتا دوڑا ہوا آئے گا تو دُور ہی سے چلائے گی۔ "نا بھیا، مجھے مت چھونا، جاؤ ماما کے پاس جاؤ۔ پہلے ذرا منہ وونہ دُھلوا کے آؤ، پھر مجھ سے بات کرنا۔"

"یہ خوب ہے، ارے بھئی کوئی غیر ہو تو ایک بات ہے اپنے بھائی....." ایکا ایکی میں اماں کہہ تو گئیں مگر پھر انہیں خیال آیا کہ مسز جیکسن برا نہ مان جائیں۔

"بس کچھ ایسی دھت ہے اُسے صفائی کی، میں تو کہہ دیتی ہوں اُس سے کبھی کبھی، گلیڈس، تو تو پاگل ہو گئی ہے صفائی کے پیچھے بالکل..... انعام مل چکا ہے اسے اپنے اسکول سے صفائی کے اُوپر۔ چار قلم اور بارہ پنسلیں ملی تھیں۔"

"ارے، آپ نے اب تک ہمیں دکھائی بھی نہیں۔" خورشید ایسا موقع بھلا کب چھوڑنے والا تھا۔ "ایسی چیزیں تو آپ کو چھپا کے نہیں رکھنی چاہئیں۔"

"ارے بیٹا، دکھاؤں تو جب، جب وہ ہوں۔ وہاں تو انعام ملنا نہ ملنا، سب برابر ہو گیا۔ اُدھر وہ انعام لے کے لوٹی اور ادھر لٹس پڑ گئی۔ پنسلیں ونسلیں سب لڑکیوں نے چھین کے آپس میں بانٹ لیں۔ جب گلیڈس نے مجھے سارا قصہ سنایا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے اسے ڈانٹا بھی کہ واہ، ایسی بالکل ننھی بچی بن گئی کہ جو چاہے، ہاتھ سے چیز چھین لے جائے۔ ذرا گھر لے کے تو آتیں، ہم بھی ایک نظر دیکھ لیتے کہ کیا انعام ملا ہے۔ ویسے ہمیں کیا کرنا تھا تمہارے انعام کا، دیکھ لیتے تو ہم بھی ذرا دیر کو خوش ہو لیتے۔ پھر چاہے رکھتیں چاہے سہیلیوں کو بانٹ دیتیں۔ گلیڈس کہنے لگی کہ "ماما، تمہیں خبر تو ہے نہیں، فضول میں بگڑ رہی ہو، سبھی کے انعام لڑکیوں نے چھین لیے، ایک میرا ہی کیا۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔ ارے بھئی، جس کا انعام ہے اسی کے پاس رہنا چاہیے۔" کچھ تو اماں کو افسوس ہوا بھی تھا، اور کچھ انہوں نے ہمدردی جتائی۔

لیکن مرور ایام نے مسز جیکسن کے زخم بھر دیے تھے، اور انہیں کسی مرہم کی

ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے اپنا توازن دوبارہ حاصل کر لیا، اور مسئلے کے پیچ و خم کی ماہرانہ تفسیر شروع کر دی۔ "اجی، بات یہ ہے کہ اُس وقت لڑکیاں بالکل بن سری ہوتی ہیں۔ امتحانوں کے بعد تو انہیں اور کچھ سوجھتا ہی نہیں، بس شرارت، شرارت، شرارت۔ ذرا جو کسی کا کہنا سنتی ہوں، چھ سات دن یہی آفت رکھتی ہیں اور کچھ نہیں تو انعام ہی چھیننا شروع کر دیے۔ بس جدھر چل پڑیں، چل پڑیں۔ اب انہیں کون ہے روکنے والا۔ امتحانوں کے بعد کی تو بات ہی اور ہوتی ہے، ورنہ ویسے تو لڑکیاں گلیڈس کا بڑا کہنا مانتی ہیں۔ ذرا سا ناراض ہو جائے گی تو اُس کے پیچھے پیچھے پھریں گی خوشامدیں کرتی ہوئی۔ جب تک وہ....."

"گھر، ماما گھر....." مسز جیکسن کو تو اپنی باتوں میں لمبے لمبے جھونٹے لینے کا مزہ آ رہا تھا کہ چن چن نے اُن کا گریبان پکڑ پکڑ کے کھینچنا شروع کر دیا۔

"چن چن صاحب، بیٹھو ابھی۔" افروز نے چمکارا۔ "ابھی تو آئے ہو، چلے جانا۔"

"چلتے ہیں، ابھی چلتے ہیں۔" مسز جیکسن نے پیار سے اس کا منھ دبایا۔ "دیکھو بھئی، اب چن چن مت کہا کرو، اب تو بڑا ہو گیا ہے، ایڈورڈ کہا کرو، مسٹر ایڈورڈ۔"

"کیا بتائیں، ہر دفعہ بھول جاتے ہیں۔" افروز جھینپ سی گئی۔ "بات یہ ہے کہ آپ جو چن چن کہتی ہیں تو ہمارے منھ سے بھی وہی نکلتا ہے۔"

"اچھا ہم کہا کریں گے ایڈورڈ۔" خورشید نے ذمہ داری لی۔

"ہاں، کچھ عادت ہی ایسی پڑ گئی ہے، چن چن کہنے کی۔ گلیڈس کو بڑا برا لگتا ہے۔ وہ بہت خفا ہوتی ہے کہ ماما تم نے بے چارے کا اچھا خاصا نام بگاڑ دیا اور مزہ یہ کہ اپنے آپ بھی چن چن ہی کہتی ہے۔"

"وہ عادت جو ہوئی۔" اماں نے توجیہ کی۔

مسز جیکسن نے بولنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ چن چن نے پھر مچلنا شروع کر دیا۔ چن چن کا یہ نام کیوں پڑا، اس کا قصہ بڑا مزے دار تھا، اور اس وقت تو انہیں کئی بھولی ہوئی تفصیلات بھی یاد آ گئی تھیں، لیکن مجبور ہو کے انہیں اپنی حکایت ملتوی کرنی پڑی۔

"اچھا، بھئی، چلتے ہیں، چلتے ہیں۔ تم نے تو ناک میں دم کر دیا۔ ٹھیرے رہو، کل آئے جاتی ہے گلیڈس، وہ کرے گی تمہیں ٹھیک، تم نے بہت سر اٹھایا ہے۔ سڑک پہ لڑکوں میں کھیل کھیل کے اُن کی باتیں سیکھ گئے ہو۔ اب دیکھنا کیسے نکلتے ہو گھر سے باہر۔"

مسز جیکسن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر اماں نے ٹوکا: "پان تو کھاتی جاؤ۔ اتنی دیر سے یاد ہی نہیں آیا باتوں میں۔"

"جی، اب تو چلنے دیجیے۔ لڑکا ضد کر رہا ہے، اُدھر سارا کام پڑا ہے کرنے کو۔ اُن کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ آتے ہی کھانا مانگیں گے۔ چل کے دیکھوں، جھنگو نے تو گھر کا گھروا کر دیا ہوگا اتنی دیر میں۔"

"آپ تو کچھ بھی نہ بیٹھیں، ابھی آئی تھیں ابھی چل دیں۔"

"کل کو بیٹھوں گی بہت دیر۔" انہوں نے افروز کی دِل جوئی کی۔ "کل تمہاری سہیلی کو لے کے آؤ گی، اس سے باتیں کرنا۔ ہم بڈھوں ٹھڈوں کی باتوں میں تمہیں کیا مزہ آئے گا۔ اب اپنی سہیلی کو بٹھایا کرنا جتنی دیر چاہے۔"

اماں نے بہت اصرار کیا کہ پان کا پتہ موڑنے میں دیر ہی کتنی لگے گی، مگر مسز جیکسن چن چن کی انگلی پکڑ کے چل ہی پڑیں۔ "بس اب تو چلتے ہیں، ایسا ہی آپ کو وہ ہے تو کل ایک کے بجائے دو پان کھلا دیجیے گا..... اچھا گڈ نائٹ، افروز گڈ نائٹ۔" انہوں نے دروازے سے باہر نکل کے پکارا۔

"گڈ نائٹ۔" صرف خورشید نے جواب دیا اور وہ بھی جواب دینے کی غرض سے نہیں۔

(۳)

مسز جیکسن کے دروازے سے نکلتے ہی خورشید کی آنکھوں نے صاف صاف بغاوت کا اعلان کر دیا کہ بس بھئی، بہت دیر ہنسی کا گلا گھونٹا۔ اب اسے روکنا بس کی بات نہیں۔ پہلے تو افروز کی آنکھوں نے بھی ڈھیل دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، بلکہ انہیں تو اور اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ لیکن ابھی پانی سر سے اُونچا نہیں ہوا تھا کہ اُسے اپنے اقدام کے سارے خطرات نظر آ گئے۔ مسز جیکسن قہقہے کی آواز سن لیتیں یا اُس کا مطلب سمجھ جاتیں، تو خیر اس میں بھی کوئی ایسی برائی نہیں تھی۔ ارے بھئی، برا لگتا تو اپنی بلا سے، دو روٹی اور زیادہ کھاتیں، اچھا تھا۔ ذرا گھر تک تپتی ہوئی جاتیں۔ لیکن مستقبل جن لذائذ کی اُمیدیں بندھا رہا تھا، ان کے ضرور کھٹائی میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ہنسی کے ابل پڑنے سے پہلے ہی افروز نے پانی کے دو تین چھینٹے دے دیے اور خورشید کو بھی یہی صلاح دی کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مصلحت بینی کا فلسفہ یوں تو خورشید کو ایسا کچھ عزیز

بھی نہیں تھا مگر وہ تو کہیے کہ ذرا بھلی گھڑی میں تھے کہ بات مان گئے اور صبر بھی کوئی سال چھ مہینے تھوڑی کرنا ہے۔ یہاں تو ابھی نشیب و فراز ہی سوچ جا رہے تھے کہ مسز جیکسن کے جوتوں کی موٹی موٹی کیلیں سڑک پر بجنے لگیں۔

"لو اب تو سڑک کٹ رہی ہے۔" کئی سیکنڈ سے خورشید کے کان اُدھر لگے ہوئے تھے۔

افروز نے ذرا بھوؤں پہ زور ڈال کے سنا اور لائن کلیئر دیتے ہوئے کہا، جس میں خورشید کے بیان کی تصحیح بھی مد نظر تھی: "ہاں، اب تو سڑک کٹتی ہوئی جا رہی ہے۔"

روک ہٹی تھی کہ ہنسی کا ریکارڈ چل پڑا۔ قہقہوں کو دو منٹ گلے میں انتظار تو ضرور کرنا پڑا تھا لیکن اس توقف سے نہ تو اُن میں سیلن آئی تھی نہ پھپھوندی لگی تھی۔ دونوں پہ کچھ ایسا دورہ پڑا کہ آخر افروز کو تو دوپٹے سے آنکھیں پونچھنی پڑیں، اور خورشید نے دیوار کا سہارا لیا۔ کہیں تب جا کے حواس بجا ہوئے اور وہ بھی دراصل اماں کے ٹوکنے سے۔ کئی منٹ تو بے چاریوں نے ضبط کیا، لیکن آخر کار اولاد کو بگڑتے ہوئے نہ دیکھا جا سکا اور انہیں بولنا ہی پڑا: "لو، لو، ہنسے ہی چلے جا رہے ہیں..... اور نہیں تو، باؤلی باتیں!" — آخری فقرے تک پہنچتے وہ ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکی تھیں۔

اب تو ہمیں قوم کی تعمیر کرنی ہے اور اپنا مستقبل سنوارنا ہے، اس لیے کہیں گے کہ خدا کے یہ وہ گناہ گار بندے تھوڑی دیر کے لیے صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے تھے مگر ماں کی زجر و توبیخ سے ان کا قلب لرز اٹھا اور وہ اپنے افعالِ شنیعہ سے فوراً تائب ہوئے لیکن جس زمانے میں ہنسنے والے افراد کا مستقبل قوم کے ہاتھوں سے محفوظ تھا اُس وقت یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ ہنسی کا آخری سلسلہ اماں کی شان میں نازل ہوا۔ لیکن اماں نے قومی کردار کے ماہرین تعمیرات سے زیادہ حوصلہ دکھایا اور وہ بھی ہنسنے والوں کے ساتھ ہنس پڑیں: "واہ رے، باولو، واہ۔ بالکل ہی ڈوب گئے تم تو —" لیکن حزنیہ لہجہ اماں سے خاطر خواہ سنبھلا نہیں۔

ڈوبے ہوئے باولوں نے ہاتھ پیر مارنے شروع کیے کہ اور کچھ نہیں تو کم سے کم ہنسی کے سیلاب سے ہی باہر نکل آئیں۔ اماں کا دل رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اب تو واقعی پیٹ دُکھ چلا تھا۔ چنانچہ افروز بجھتی ہوئی لکڑیوں کی طرف متوجہ ہوگئی اور خورشید کو بھی اس نے کام میں لگایا کہ چلو، چل کے اولے میں اینٹ ڈالو، ساری "آگ" پیچھے نکلی جا رہی

ہے۔

دماغ کی ہلکی ہوئی چولیں دو ایک منٹ میں ذرا ٹھیک ہوئیں تو اُسے مسز جیکسن کی اگلی پچھلی حکایتیں، ان کی گھبراہٹیں، اُن کے بولنے کا انداز، یہ سب باتیں یاد آنے لگیں، اور اُسے اپنی دونوں کی سفاکی پر خفیف سی شرمندگی بھی ہوئی۔ "بھئی ایک بات ہے" اُس نے مسز جیکسن کے نقصان کی تلافی کرتے ہوئے کہا۔ "ہیں آدمی اچھی!"

"ہاں صاحب، کیوں نہ ہوں گی! آپ کی سہیلی جو ٹھیریں۔" مگر ویسے خورشید کو بھی اصل تجویز سے زیادہ اختلاف نہیں تھا۔

"نہیں، مذاق کی بات نہیں، ہیں آدمی مزے دار۔" افروز نے ان کا حصہ رُسد انہیں پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

اب کے خورشید کا بھی دِل پسیج گیا۔ "ہاں، ہنسا تو جاتی ہی ہیں، چلو۔"

خورشید نے اس کے نقطہ نظر کے ساتھ رعایت برتی تو افروز نے بھی اُس کے زاویہ خیال کے لیے تھوڑی سی گنجائش نکال لی۔ "اور سب باتیں تو اچھی ہیں، بس ایک ذرا شیخی بہت بگھارتی ہیں۔"

"اجی شیخی؟ وہ کیا اُن کا سارا خاندان شیخی خورا ہے..... اُن کے بیٹے تو چرونے آل انڈیا میوزیکل کانفرنس میں گا چکے ہیں۔ ایک میڈل اور ایک سرٹیفکیٹ ملا ہے اور پانچ کپ فٹ بال میں جیتے ہیں۔" یہ فہرست انعامات پچھلے پندرہ دن سے دونوں کو محظوظ کر رہی تھی۔

"اب دیکھو، بیٹی کیسی نکلتی ہیں؟ انہیں ابھی دیکھنا باقی ہے۔"

پچھ ماں کو نہال کر دیا اب پچھ بیٹی کو نہال کر دو گی!" اماں کا غصہ ابھی تک پوری طرح ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔ "کون جھانکے گا تمہارے گھر آ کے جو تمہارے یہی ڈھنگ رہے تو؟"

"چاہے کوئی آ کے جھانکے یا نہ جھانکے، ہماری مسز جیکسن تو رُک نہیں سکتیں، ان کا تو کھانا ہضم نہیں ہو سکتا ہمارے یہاں آئے بغیر۔" خورشید تو شرط ملانے کو تیار تھا۔

"جبھی یہ بدلہ دے رہے ہو انہیں۔"

"تو وہ کوئی برا تھوڑا ہی مانتی ہی ہنسنے کا۔ افروز کی سہیلی ہیں، کوئی ایسی ویسی بات تھوڑائی ہے..... اور لو، اب تو دو دو سہیلیں ہو جائیں گی آنے والی۔ ایک سہیلی کل آ رہی

ہیں۔"

"سہیلی تو آ رہی ہیں لیکن ہم نے اپنی سہیلی کو دیکھا ہے بھی نہیں ٹھیک طرح۔ اماں نے دیکھنے ہی نہیں دیا۔"

"لو، میں نے کیا روک دیا؟" وہ چچ چچ چڑ گئیں۔ "میں نے کیا آنکھیں بند کر لی تھیں تمہاری؟ یہ اچھی کہی۔"

"آنکھیں تو بند نہیں کی تھیں، ذرا دیر اُسے بٹھاتیں تو۔ میں تو باورچی خانہ میں تھی، میں نے کہا ذرا برتن مانجھ لوں تو چلوں گی، اتنے میں دیکھا تو وہ دونوں چل بھی دیں، تھوڑی دیر روکا تو ہوتا۔"

"لو، وہ بیٹھی بھی ہو، کہیں اُس کا دِیدہ لگے تھا۔ پھولی وی بیٹھی رہی، ایک بات تک تو کی نہیں اُس نے۔ آئے وے دیر نہیں ہوئی تھی کہ چلو چلو کی رَٹ لگا دی۔ اب میں کیا اُسے باندھ کے بٹھا لیتی، کوئی بچی تھی ذرا سی..... ماں نے اُسے ایک سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ بھئی آئی تھیں تو ذرا دیر بیٹھتیں، باتیں کرتیں۔ نہیں وہ تو بیٹی کے منھ سے نکل گیا۔ چلو، اب ماں کی مجال ہے کہ رُک جائیں۔"

اماں کی خفگی سے افروز نے اتنی دیر تو لطف اُٹھا ہی لیا تھا۔ اب اس کا لہجہ بیانیہ ہو گیا۔ "مجھے تو اُن کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی جب مسز جیکسن کے بولنے کی آواز آئی تو میں نے جھانک کے دیکھا۔ سامنے موڑھے پہ گلیڈس بیٹھی تھی سر جھکائے۔ پہلے تو میں ذرا اس میں ہوئی کہ یہ کون ہے، پھر سمجھ میں آیا کہ اوہو، یہ اُن کی بیٹی ہے۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ ذرا چل کے دیکھوں تو میں بھی، اتنے میں وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے کہا، اب کیا فائدہ، اب تو چل ہی دیں، کل ول کو آئیں گی ہی۔ میں انتظار کرتی رہی کہ آج آئیں کل آئیں، مگر سات آٹھ دن تو وہ آ کے جھانکیں تک نہیں۔ ایسی باولی ہوئیں بیٹی کے پیچھے، بس دیکھ لیتے تو اُس دن دیکھ لیتے۔ پھر موقع ہی نہیں ہوا۔"

تو چلو، اب دیکھ لینا پیٹ بھر کے۔" اماں اپنی صفائی پیش کیے جا رہی تھیں۔ "ایسی ہی بڑی طلب لگ رہی ہے دیکھنے کی، تو ایک دن اور صبر کر لو۔ کل کو تو وہ آ ہی جائے گی۔ پھر میں اُسے لا کے بٹھا دُوں گی تمہارے پاس کہ لو اب اچھی طرح دیکھ لو۔ پھر تو کوئی شکایت نہیں رہے گی تمہیں۔"

"کل کو تو دیکھ ہی لیں گے، ذکر تو اب کا ہو رہا ہے، کل کا کیا؟"

"ہاں جی، کل کا کیا؟" خورشید نے اماں کو ابھارا۔ "کل کو تو اپنی نئی سہیلی کے ساتھ تاش اُڑ رہا ہو گا۔"

"اجی نہیں، خیر کل کو تو کیا تاش اُڑے گا۔" افروز کا ذہن بھی انہیں امکانات پر غور کر رہا تھا۔ "فوراً کے فوراً ہی تھوڑی بالکل وہ ہو جائیں گے، دو ایک دن تو لگیں ہی گے۔"

"اجی واہ، دو ایک دن کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے شرمانے میں رہے تو بس اسی بھر کے ہو رہے۔ آتے ہی صاف کہہ دیں گے کہ صاحب، آپ کی ماما سے آپ کی بڑی تعریفیں سنی ہیں کہ آپ تاش بہت عمدہ کھیلتی ہیں، آج تو دو دو ہاتھ ہو جائیں، ذرا دکھایئے اپنی بانگی۔"

"اچھا رہے گا مزا، خورشید۔ دو تین گھنٹے تو تاش رہا ہی کرے گا۔ آج کل تو اُسے بھی فرصت ہوگی، گلیڈس کو؟"

"ارے امتحان دے کے تو آ رہی ہے چھٹیوں میں، اب کیا بیٹھ کے کتابیں گھوٹے گی؟..... اب تو ہمارے ساتھ تاش کھیلا کرے گی تین چار گھنٹے" — یہ اماں کی ضیافت طبع کے لیے تھا۔

"بس تو چلو تمہاری بھی چھٹیں ہیں، ہم بھی اُس کے آنے کے وقت تک جلدی جلدی روٹی توے پہ ڈال کے فارغ ہو جایا کریں گے۔ پھر اُڑا کرے گا دوپہر بھر تاش!" اماں نے اب کے بھی وار خالی دیا۔

"جی، دوپہر بھر کیسے؟ اور ابا جان؟"

"ہاں، یہ ذرا وہ ہے..... خیر ہم اُس سے کہیں گے کہ تمہیں دو وقت آنا پڑے گا، ایک صبح کو اور ایک شام کو۔"

"ہاں باقاعدہ حاضری ہوا کرے گی، اور غیر حاضری کا جرمانہ ہو گا۔ باقاعدہ رجسٹر بنے گا۔"

"ارے سن تو۔" خوشی کے مارے افروز ایسی دہک اٹھی تھی کہ اُس نے توے پر اپنی انگلیاں بھی جلالیں۔ "یہ کیوں نہ کریں کہ اُدھر والا کمرہ ٹھیک کرلیں اپنے بیٹھنے کو..... چلو، بس یہ طے ہوگیا۔ میں کل صبح ہی سارا کاٹھ کباڑ نکال کے پھینکتی ہوں۔"

"بھیا، میں ہاتھ نہیں لگانے کا ہوں، صاف سن لو۔ چاہے کمرہ ٹھیک کرو چاہے نہ کرو، یہاں ایسی علت نہیں پالتے۔"

افروز کو بھی صرف اخلاقی ہمدردی چاہیے تھی۔ "ہاں ہاں، تم ہاتھ مت لگانا، تم سے کہہ کون رہا ہے، یہ سب میرا ذمہ ہے۔ کل ہی لو سب کام ٹھیک۔"

"اچھا تو بس کل ہی شروع ہو جائے کام۔ کم سے کم ایک بازی تو ضرور ہونی چاہیے۔ آتے ہی کہہ دینا کہ آیئے صاحب، ادھر دیکھیے ہم نے آپ کے لیے کتنا عمدہ کلب گھر تیار کیا ہے۔"

"مگر ایک بات ہے یہ تو ابھی تک سوچا ہی نہیں کہ چوتھا آدمی کون ہوگا۔ ہم تو تین ہی ہوئے، ایک میں، ایک تم، ایک گلیڈس۔"

"نہ سہی چوتھا آدمی۔" راستہ کے روڑوں کو تو خورشید کبھی خاطر میں لایا ہی نہیں۔ تپتیا کھیلیں گے۔"

"بس تپتیا چوپتیا ہی کھیلتے رہو۔" اماں نے دیکھا کہ یہاں تو اتنی باتیں میرے بغیر ہی طے ہوئی چلی جارہی ہیں۔ "یہ نہیں کہ کوئی کام کی بات کریں۔ اب ایک اور وہ آرہی ہیں، چلو چھٹی ہوئی، جیسے تھے گھر کے، ویسے آئے ڈولی چڑھ کے۔"

"نہیں صاحب، یہ تو نہ کہیے۔" خورشید نے وار روکتے ہوئے بھی دوسری طرف چوٹ کردی۔ "جو ڈولی چڑھ کے آئے ہیں وہ تو بہت اچھے ہیں۔ انہیں تو انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر ملے ہیں۔"

"اور صفائی پہ چار قلم اور بارہ پنسلیں بھی تو۔" افروز نے جلدی سے یاد دلایا۔

"ہاں بارہ پنسلیں!"

ہنسی کے جملہ فرائض سے بطریق احسن فارغ ہونے کے بعد افروز نے کہا۔ "ہم تیاریاں تو بہت کر رہے ہیں خورشید، کہیں کلب گھر بن رہا ہے کہیں کچھ، اور جو اُس نے اکڑ بازی دکھائی تو پھر؟...... جو کہیں بننے لگی اور نہ آئی تو ہمارا سارا کیا کرایا اکارت جائے گا۔"

"اجی بننے کیسے لگے گی؟" خورشید کی خود اعتمادی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ "بنے گی تو ہم صاف کہہ دیں گے، بس جناب، یہ بناوٹنا اُٹھا رکھیے، کوٹ تو آپ پہنتی ہیں پھٹا اور بنتی ہیں میم صاحب؟"

"نہیں، بھئی، انصاف کی بات کرو، کوٹ تو پھٹا نہیں تھا، ذرا سا کالر خراب ہو رہا تھا۔"

"ارے لو، انہیں دیکھو اور واقعی سہیلی بن جاتیں اور پھر طرف داری کرتیں تو خیر

ایک بات بھی تھی۔ سارا تو جیبوں کے پاس سے پھٹ رہا تھا، اور وہ کہتی ہیں کہ پھٹاوا نہیں تھا۔"

"تو میں نے تو پیچھے سے دیکھا تھا، مجھے کیا معلوم، آگے سے پھٹاوا تھا کہ نہیں۔"

"تو پھر ویسے ہی اپنی سہیلی کی حمایت کرنے لگیں!..... ذرا اُن کی جرابیں بھی تو دیکھی ہوتیں، چت کبری، آدھی گلابی اور آدھی سفید..... ایسی تو ہیں آپ کی سہیلی، اور آپ ہیں کہ اُن پر لٹو ہیں۔"

"واہ! میں کیوں ہوتی لٹو!" افروز کھسیانی سی ہو گئی۔ "اور ابھی وہ آئی نہ بات، تم نے میری سہیلی ہی بنا ڈالا! سوت نہ کپاس، جلاہے سے ٹھم لٹھا۔ پہلے آ تو لینے دو جبھی سہیلی کا طعنہ دینا۔"

"طعنے کی کیا بات ہے؟ وہ تو ہے سہیلی، نہ بنے گی تو ہم زبردستی بنا دیں گے۔"

"اے کون؟ کیسے؟" تیلن کی مقبولن چھتوں چھتوں ہوتی ہوئی منڈیر پر آ بیٹھی تھی اور باتیں سن رہی تھی۔ آخر اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ "کس کی باتیں کر رئی ہو؟"

"کون؟" اماں نے چونک کے اُوپر دیکھا۔ "اچھا، مقبولن ہے..... کچھ نہیں، یہ جو ہیں نا عیسائی، یہی تمہاری پادرن، اُن کی بیٹی کا ذکر ہو رہا ہے۔ کل کو آ رہی ہیں نا۔"

"پادرن کی بیٹی؟ کل آ رہی ہے؟" مقبولن نے ایسی بے تابی سے پوچھا جیسے مدتوں سے اِنتظار میں سوکھ رہی ہو۔ "اے جلو کڑی ہے میری ساس۔"

کردار نگاری کے اس اختصار اور جامعیت نے خورشید اور افروز دونوں کو بہت محظوظ کیا۔

"اچھا، مقبولن تو بھئی بہت خفا ہے! کیوں، ایسی کیا بات ہو گئی؟ کس بات پہ ناراض کر دیا اُس نے؟" افروز نے تفصیلات مانگیں۔

"جلو کڑی ہے، نکھرباج!" مقبولن کا منھ پھول گیا تھا اور ہونٹ نیچے لٹک آیا تھا۔

"کوئی بات بھی کہے گی کہ ویسے ہی گالیئیں کوسنے دیے جائے گی۔" اماں بولیں۔

"سچ کہوں ہوں بوا، بڑی نکھرباج ہے۔" مقبولن کی آواز اپنے سامعین کو پچکار پچکار کے اُن کے شبہات رفع کر رہی تھی۔

"ہمارے گھر تو ایک دفعہ آئی تھی اپنی ماں کے ساتھ۔ دیکھیو، ویسے ہی کھڑی رہی پادرن کے گھٹنے سے لگی ہوئی، پلنگ پہ بیٹھی نہیں۔ بھابی نے کہا اے بیٹھ جاؤ، کوئی ہمارا پلنگ

گندا ہے، لو، وہ تو پھر بھی اسی تریوں کھڑی چپ چاپ، گوم متھون، اور اپنی ماں کا کندھا پکڑ لیا جیسے کوئی چھوٹی سی بچی ہووے ہے۔ بھلا پوچھو، کوئی اُسے پکڑے لے تھا جو یوں گھسی جا رہی تھی ماں کی گود میں۔ ایسا ہی تھا تو گھر سے نکل کے ہی کیوں آئی تھی؟..... رانڈ نے پان بھی نا کھایا۔ اماں نے پان بنا کے دیا کہ اچھا، لو بیٹھو مت، پان تو کھالو۔ اجی، اس کے نکھرے کہاں ملنے والے تھے۔ ایسے منھ پھیر لیا جیسے کوئی بڑی دُلھن ہووے نئی نویلی۔ بولی، میں نہیں کھاتی ہوں پان۔ اےئی نا کھاتی ہے تو جا چولھے بھاڑ میں، ہاں اور نہیں تو، آئی کہیں سے بڑی میم صاحب بن کے!"

"خیر بات تو اُس نے ہمارے یہاں بھی نہیں کی۔" اماں نے گلیڈس کی طرف سے معذرت پیش کی۔

"اے وہ ہیئی ایسی جلی بھنی۔" مقبولن سمجھی میری تائید ہو رہی ہے۔ "اُس کی کیا کہو ہو بوا۔ اُس کے تو مجاز ہی نا ملتے ہیں۔ اب پہلے پادری بھی تو تھے۔ ان کی بیٹیوں نے تو کبھی بھی نا کیے ایسے مجاز۔ برابر ہمارے آویں جاویں تھیں، ہنسنا بولنا سبھی کچھ ہوتا تھا۔"

"تو انہیں یہاں ہو بھی تو گئے تھے بہت دِن رہتے ہوئے۔" اماں نے مقبولن کا تعصب دُور کرنے کی پھر کوشش کی۔

"ناں بوا، اُس کی کوئی بات نا ہے۔" آخر مقبولن کو بھی تو فلسفیانہ مفروضہ سازی کا حق حاصل تھا۔ "یہ تو آدمی آدمی کا مجاز ہووے۔ کسی کا اچھا، کسی کا برا۔ پہلے پادری کی بیٹیں تو جو دو، کھالیں تھیں، کبھی انہوں نے نا نہیں کی۔ گھنٹوں ہمارے گھر گل پوا کھیلتی رہی تھیں..... اب یہ اک آئی ہے، انوکھی حور کی پری، بات تک کی نہیں کرتی۔"

"خیر خیر، جانے دو، غصہ تھوک دو۔" خورشید نے ٹوکا۔ "ہم ڈانٹ دیں گے۔"

"تمہاری ڈانٹ سے کون سی وہ سیدھی ہو جائے گی۔ اوروں کو وہ آدمی ہی کب سمجھے ہے۔ اُتری ہے نا، اِس لیے بہت ساتویں آسمان سے!..... دیکھیو، چلے گی بھی تو یوں دوسروں کی طرف کمر کر کے، کہیں نظر نہ لگ جائے۔ مجھے نا اچھی لگی ہے اتراتی وی..... آنے دو، اب کے اکڑی تو مَیں ٹھیک کروں گی سسری کو۔ بہت وہ بنی ہے۔"

"ضرور ٹھیک کرنا مقبولن۔" خورشید نے کمر ٹھونکی۔ "ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"نہیں بھئی، دیکھو ہماری سہیلی کو کچھ مت کہو۔" افروز نے سفارش کی۔

"کہیں کیسے نا؟ تمہاری تو سہیلی ہے، مقبولن کی تو سسری ہے، ہم تو اُس کا ساتھ ضرور دیں گے۔"

"تم تو چہلی باتیں کرو ہو۔" مقبولن نے کندھا منھ کے سامنے لا کے تنکتے ہوئے کہا۔ "ہم تو چلیں ہیں۔"

"چلیں کہاں، پہلے پورا پروگرام تو بنالو کہ اپنے سسرال والوں کا استقبال کس طرح کرو گی۔ تمہاری سسری کے ساتھ ان کی اماں جان بھی تو ہوں گی، سب کا بندوبست کرلو۔"

"اے ہٹو، تمہیں یہی باتیں ہو رہی ہیں، کچھ اور بھی آوے ہے کہ نہیں؟" مقبولن جاتے جاتے بھی ٹھنک رہی تھی۔

"ہاں ہاں، اور جو پوچھو اور کیا حال سنائیں تمہاری سسرال کا۔"

افروز نے بہت یقین دلایا کہ اچھا اب سسرال کی باتیں نہیں کریں گے، مگر مقبولن رُکی نہیں۔

"خورشید، تم نے ٹھہرنے نہیں دیا بے چاری کو۔" افروز نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ "کیسی تو مزے دار باتیں کر رہی تھی!"

لیکن خورشید نے نہ تو کبھی آتے ہوئے کو ہاتھ سے دیا اور نہ جاتے ہوئے کا غم کیا۔ "اجی، چلو اب باتیں سن کے کیا کرو گی، کل اصل ہی کو جو دیکھ لینا۔"

خیر، افروز کو بھی زیادہ دیر افسوس نہیں کرنا پڑا۔ ایک تماشا ہاتھ سے گیا تو کیا ہے، دُوسرا آموجود ہوا۔ افروز سوچ ہی رہی تھی کہ ابھی کونڈے میں آٹا تو کافی ہے، کوئی بات ہی چھیڑنی چاہیے، اتنے میں باہر سے ننھے کے غل مچانے کی آواز آئی۔ "چھنگو، انگوٹھا دکھاوے، انگوٹھا دکھادے چھنگو!" یوں تو خیر چولھا بنانے کو کالی مٹی منگانے کے لیے بھی چھنگو کا انتظار ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت چھنگو کی آمد افروز کو اس خیال سے اور مزہ دے گئی کہ چلو، چھنگو سے کچھ پادرن اور گلیڈس کی باتیں رہیں گی اور یہ بھی پتا چلے گا کہ ان کے گھر کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ افروز نے ایک سوال نامہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

ایک منٹ بعد چھنگو اندر داخل ہوئی تو ہنسی کے مارے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑتی تھی، کبھی سنبھل کے ایسی تالی بجاتی تھی جیسے اب ٹھمکنا شروع کرنے والی ہو اور ننھے میاں تو واقعی اُس کے آگے پیچھے ناچ رہے تھے اور وہی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ "چھنگو، انگوٹھا دکھادے!" — کبھی ڈانٹ کے، کبھی گڑگڑا کے،

کبھی التجا کے ساتھ اور کبھی بناوٹی خفگی سے۔ اور جب کچھ بس نہ چلا تو انہوں نے اماں سے اپیل کر ڈالی: "دیکھو اماں، چھنگو انگوٹھا نہیں دکھاتی ہے۔"

اماں کے پلنگ کے سامنے پہنچ کے چھنگو پر ہنسی کا ایک نیا دورہ پڑا، اُس نے پیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، اور جب پیٹ کہنا مان گیا تو اس طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے پھر تالی بجائی اور بولی:

"اے دیکھو ہو بو اجی، ان ننے میاں کو!..... یہ میرا انگوٹھا ہی دیکھت رہے ہیں۔ جب سامنے بج جاؤں گی، بس سر ہو جاں ہیں، چھنگو، انگوٹھا دکھا..... کہا رکھا ہے میرے انگوٹھا میں؟..... لو، دیکھو۔"

ننھے میاں ٹانگیں پھیلا کے اور ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کے بڑے اطمینان سے کھڑے ہو گئے، اور کچھ استعجاب، کچھ تجسّس، کچھ مبہم خوف اور کچھ دلیری کے ساتھ بڑے غور و خوض سے چھنگو کے ہاتھ کا مشاہدہ کرتے رہے۔ چھنگو نے بھی ہاتھ آگے کو پھیلا دیا تھا اور ایسی غیر متعلق سی کھڑی ہوئی تھی جیسے اُس کا ہاتھ ہی نہ ہو، یا جیسے کہہ رہی ہو کہ اچھا، چلو یوں ہی سہی، آج پیٹ بھر کے دیکھ لو، کسی طرح چھٹی تو ہو۔ ایک منٹ تک ٹکٹکی باندھ کے دیکھتے رہنے کے بعد ننھے میاں کی آنکھوں میں ایک نئی دریافت یا کسی زبردست انکشاف کی چمک لہرائی اور انہوں نے فوراً افروز کو اس اطلاع سے نوازا: "دیکھا، آپا! چھنگو کے دو انگوٹھے ہیں!"

"ارے ہاں، دیکھ لیا، اب کتی دفعہ دیکھیں گے۔" افروز کو اس فضول تاخیر پر جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ "چھوڑ تو اسے چھنگو، کہاں اُلجھ رہی ہے بھلا۔"

"ناں، آج انہیں دیکھن دو جی بھر کے، میں بھی تو دیکھوں ان کا پیٹ بھتت ہے کہ نا بھتت ہے دیکھت دیکھت۔" اصل بات یہ ہے کہ اس وقت چھنگو ذرا مگن ہو رہی تھیں، کیوں کہ میم صاحب نے تسلیم کر لیا تھا کہ ہاں بھئی، آج تو تو نے مسالہ نہیں جلنے دیا۔

"خیر یہ تو ہوتا رہے گا، ذرا یہ تو بتائیے۔"..... افروز نے اپنے طنزیہ لہجے کی مدد سے چھنگو کی سرگرمیوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تین چار دن سے ہیں کہاں؟ یہاں روز انتظار ہو رہا ہے اور چھنگو ہیں کہ اُن کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

"اب چھنگو کے مزاج کا ہے کو ملیں گے، اب تو اُن کی چھوٹی میم صاحب آ رہی

ہیں؟" اماں نے تصریح کر دی۔

چھنگو نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا: "اے ہاں، آ تو رہی ہیں کل کو — ڈھس..... کہا نام ہے، مو پہ تو آتا بھی نہیں....."

"گلیڈس۔" افروز نے مدد کی، مگر لہجہ اب بھی شکایت آمیز تھا۔

"ہاں، وہی گلے ڈھس..... دیکھو، کل کو آ تو رہی ہیں۔" نہ معلوم چھنگو نے اتنا شک آمیز لہجہ کیوں اختیار کیا تھا۔

پہلے تو افروز نے انتظار کیا کہ اب چھنگو کوئی بات سنائے گی، لیکن جب اس نے بالکل ہی چپ سادھ لی تو پھر افروز نے براہِ راست ہی سوال کر ڈالا۔ "اور سنا چھنگو..... تمہارے یہاں تو بڑی تیاریں ہو رہی ہوں گی؟"

"کہا تیاریں ہیں بی بی، مرن ہے ہماری تو۔" چھنگو کا نکھتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"کیوں؟" اماں نے پوچھا۔ "بہت کام ہو رہا ہے۔"

"کام؟ اجی، کہا کام ہے، بوا جی؟..... کام ہے بھی اور ہے بھی نا۔" چھنگو کو شبہ ہوا کہ اس کی پہیلی لوگوں کے پلے نہیں پڑی۔ "سانچ کہوں ہوں، ہے بھی اور ہے بھی نا..... کام تو ہو جرا سا اور بھاگ دوڑ اِتی۔ دوڑاوت دوڑاوت مار ڈالے ہیں موئے تو..... ایک دن..... ناں، ڈیرھ دن تو ہمارے ہی جھاڑت جھاڑت لگ گو، دو دن جو میں دوپہری میں آئی گھر سے، تو بولیں کہ چل چھنگو، نیم کی ڈارئیں کاٹ کے لا، جارے جھڑنگے۔ اچھا جی، تو میں گئی جنگر دوپہریا میں جرتی برتی۔ اب بتاؤ، بوا جی، بھلا کون کاٹن دے ہے اپنا نیم۔ میری تو کہن سن بھی ہو گئی باگ والے سے۔ میں جو پہنچی پیاؤ والے باگ پہ، تو وہاں وہ بیٹھا تھا اور جھونپڑی میں..... وہ ہے ناکسائی کا اللہ دیا، جیسے ہی میں نے لکھی اُوپر کو اٹھائی تو دیکھیو، وہیں سے چیکھا، چل چل، چمریا، آئی وہاں سے پتے توڑنے، میرے ہی باگ میں رہ گیا ہے تیری بکریوں کا چارہ؟ اور دیکھیو، یہ پوچھے کہ تو بو گئی تھی نیم جو پتے توڑن آئی ہے؟ میں بولی۔ بس رے کسائی کے، جیادہ جبان مت بولیو، کیسی ہو ہے چمریا؟ چمریا ہوگی وہ جو تیرے گھر بیٹھی ہے! کوئی گھنٹہ بھر جھک جھک ہوتی رہی میری وا سو۔ پہ میں بھی توڑ کے ہی لوٹی پتے۔ میں نے بھی کہہ دیا، اچھا آج توئے بھی دیکھنا ہے، کیسے نا توڑن دے گا۔"

افروز اور خورشید کو تو خیر دلچسپی ہوتی ہی، ننھے میاں کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ حیرت سے اُن کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ پلنگ کی پٹی پہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹیکے آگے کو جھکے

بیٹھے تھے، مگر اماں کو جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ بات نہ ہوئی شیطان کی آنت ہو گئی۔ جواب وہی سے بچنے کے لیے یہ پھنگو کا مخصوص طریقہ کار تھا، چنانچہ انہوں نے فوراً اس کی گردن ناپی۔ "اچھا، تو چار دن سے جالے ہی جھاڑ رہی ہو گی؟ ہم تو روز یاد کرتے ہیں کہ بھئی پھنگو کو نہیں دیکھا کئی دِن سے، اور پھنگوا اپنا اور ہی ہواؤں میں ہیں۔"

"تو میں کہوں تو ہوں بوا جی، ڈیڑھ دن تو جارے جھاڑن میں لگے گا، پھر سارے گھر کی لپائی لھسائی کی۔ مٹی لات لات کمر بھی ٹوٹ گئی میری تو۔ سانچی جانیو اب بھی دو مار رَو ہے۔" پھنگو نے کانکھ کے دکھایا۔

"کیا ٹھیک ہے! ایسے گھر سج رہا ہے جیسے بیٹی نہیں آ رئی کوئی مہمان آ رہے ہیں۔" اماں نے قدرے تعجب کے ساتھ کہا۔ جس میں صرف تاسف ہی نہیں شکایت بھی شامل تھی۔

"اجی میمان بھی ایسی باتیں نا کرتے ہیں، بوا جی، جیسی اُن کی بیٹی کرے ہے۔ دِن چڑھے تو بسترے پہ سے اُٹھے ہے، یہ ناکہ سوتی رہے، جاگ تو جاگی، پہ اک ہاں بسترے پہ سے نا اُٹھے ہے۔ وہیں اُسے بلالے گی اپنے چھوٹے بھیا کو، چن چن کو، اور بیروں پہ جھولا جھلات رہے گی۔ میں کہوں، بوا جی، سرم بھی تو نہ آتی ہے اُسے۔ باپ بھئے سب آت جات رہے ہیں اور وہ یوں ہی ننگی ٹانگوں سندا پڑی رہے ہے۔ ایک تو پہنے ہی ہے بھیاں تک کا اِتنا اِتنا جا نگھیا۔"

"ارے انہیں کس بات کی شرم؟ افروز نے دُوسری طرف کا نقطہ نظر پیش کیا۔ "جب وہ باہر ننگی ٹانگوں سے نکلتے ہیں تو پھر گھر میں کیا ہے؟"

"اے بی بی، نکلے تو ہیں، پہ اِتی بری لوٹھا کی لوٹھا ایسے پڑی رہے باپ بھین کے سامنے! ہمیں تو نا اچھا لگتا ہے۔ ایسی باتیں تو ہم چمارن وھمارن میں بھی نا ہوتیں..... تم کہا پوچھو ہو اُس کی باتیں؟ ایک ہو تو سناؤں بھی..... ماں کو تو وہ بس ایسا سمجھے ہے جیسے کوئی باندی ہو ہے آگے کی۔ صبح سویرے اُٹھ کے آگ بھی ماں باریں گی۔ ہاتھ منہ دھون کو پانی بھی وہی گرم کرنگی، جو کبھی میں پہنچ گئی تو میں نے کر دینا۔ جب بھئے سے کھوب کھیل لے گی تو وہیں سے پکارے گی، ماماہ ماماہ چا ہو گئی۔ یہ ناکہ اب بھی اُٹھیائے۔ نہیں، وہیں سے پوچھے گی، ماماہ چا ہو گئی۔ ماں بے چاری جباب دیں گی، ہاں، بیٹا، لائی۔ پھر ماں چالے کے پہنچیں گی بیٹی کے ہجور میں۔ بیٹی وہیں لیٹی لیٹی چا پئیں گی، جو ماں نے کچھ حلوا پلوا راندھا

ہو گا وہ کھائے گی۔"

"دیکھا، ایسی ہوتی ہیں مائیں!" افروز نے بھنوؤں سے خورشید کو اشارہ کیا۔

"ہاں، بس ایک ظالم تو میں ہوں!" اماں کو اپنی قسمت سے بڑی شکایت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چھنگو کے اندر ایسی کوک بھری ہوئی تھی کہ اپنی رَو میں سب کو بہائے لیے چلی گئی۔ "وہ ماں تو بے چاری اتنی ٹہل کرنگی اور بیٹی کو اتنا نہیں کہ جرا سیدھے منھ بات کر لے ماں سو۔ ایک دِنا یوں ہوا کہ ماں نے ویسے پیالے میں چاوے دی، وہ کہا ہو ہے..... ہاں، تام چینی، لو..... بس جی تو بولی کہ پیالی میں کیوں نہیں لائیں چا۔ ہم کوئی گمار دھمار ہیں کہ جو یوں پئیں چا..... گئیں ماں، پیالی دھو دھا کے لائیں، جب جا کے پی۔ ایسا تماسا رہے ہے روج! ماں سے بات بات پہ کہے ہے، تم کیا جانو گام کی رہنے بالی۔ اب پوچھو، جو ماں بھی گمار ہو گئی۔ تو پھر کون رہ گوا اسرا بھ!"

"بیٹی جو ہیں سب سے بڑی اشراف، سب کے بدلے کی!" اماں نے جواب دیا۔

"چھنگو، یہ سنا اُن کے گھر منھ کیسے دھوتے ہیں؟ ننھے میاں نے موقع ملتے ہی سوال داغا۔

"اے بیٹ ہی نا بھرتا ہے تمہارا سنت سنت!"

"خیر چھنگو، سنا دے۔ ان کا بھی کہنا ہو جائے گا۔" اصل میں سننے کی مرضی افروز کی بھی تھی۔

"تم نے بھی انہیں کی سی بات سیکھ لی، بی بی!" اتنا تکلف تو خیر جائز بھی تھا۔ "اے، کہا سناؤں، ہنسی آت ہے موئے تو..... دیکھیو، پہلے تو تسلے میں پانی بھل لو اَوپت تک، پھروا میں سو پانی لے لے کے منھ پہ ڈالت رہے، اور پانی تسلے میں گرت رہا۔ اچھا جی، پھر ساتھن پہ، منھ پہ، سب یوں سابن مل لو..... پھر؟" ..... چھنگو نے حافظے پر زور ڈالا تو باقی عمل بھی یاد آ گیا۔ "ہاں، پھر تسلے میں سو پانی لے لے کے منھ دھوت گئے، اور پانی میں سابن ملت گو، پھروا پانی کو منھ پہ ڈال لو....."

"اور سب میل کچیل بھی پانی میں ملتا گیا؟" افروز نے حسب معمول اپنا سوال پوچھا۔

"گند گھچول ہے، یہ کوئی منھ دھونا ہے؟" اماں نے اپنی رائے بتائی۔

"اور کلا بھی وائی پانی سے کریں ہیں!" چھنگو نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔ "ایک دِنا

میں کہا بھی، میم صاحب تمہیں گھن نا آت ہے۔ ہنسن لگیں کہ تو تو پگلی ہے، انگریج ایسے ہی دھووت ہیں منھ۔"

"ہاں، تمہاری میم صاحب تو خاص ولایت کی ہیں نا!" اب کے خورشید سے صرف ہنسنے پر اکتفا نہ ہو سکی۔

"اور وہ جو ہے نا گلّے ڈس، وہ تو دِنا میں تین چار دپھا ہی دھوت ہوگی منھ۔ بس میرے پیچھے پکار ڈارے رکھے ہئی، چل پھنگو، پانی رکھ۔ پھنگو پانی بھر کی ہوگئی..... اور سیسہ تو ہر بکھت اُس کے سامنے رہا ہے۔ جب دیکھو کنگھا کر رہی ہے بالن میں۔ میں نے کہا۔ بی بی، سیانی بچی اِتا بناب سنگار نا کرت ہیں، اِتی بات کئی تھی بوا، لو وہ تو پھاڑ کھان کو آئی موئے، چل چل تجھے کیا۔ میں نے کہا، ہاں بی بی، ہمیں کہا ہوتا، ہم تو تمہارے ہی پھائدے کو کہہ رہے ہیں۔"

"خیر پھنگو، تم برا مت مانو۔ اب کے ہم تم دونوں مل کے سمجھائیں گے۔" خورشید نے پروگرام بنایا۔

"مکھول کرو ہو تم بھی!..... تمہاری تو جرور مانی!" پھنگو تو ٹکر لے چکی تھی نا۔ "اب دیکھو، آتو رئی ہے، مرن رہے گی سو میری! پھنگو یہ کر، پھنگو وہ کر۔ پھنگو سے کام کرائے جاؤ، یہ مت کرو کہ پھنگو کے ہاتھ پہ کائی دن پیسہ دھیلا رکھ دو، کہ لے پھنگو، آج تو گڑ کھا لیجو۔"

"تو مانگتی کیوں نہیں ہے تو؟" اماں نے صلاح دی۔ "صاف کہہ دے کہ بھئی اِتا کام کراؤ تو اِتے پیسے بھی تو دو۔"

"اب کہا مانگوں..... کہا نہ مانگوں!..... کیوں، بی بی جی؟" پھنگو نے افروز سے اپنے رویے کی تصدیق چاہی۔ "وہ تو بس کام کران بھر کی ہیں، اور بات سو نہیں کچھ متبل نا ہے..... اب وہ آجاگی تو دو دو دپھا تو جھاڑو لگوا گی گھر بھر میں۔ اب دیکھنا بی بی، گھٹا پر جا نگے میرے ہاتھن میں برتن مانجھت مانجھت۔ ایک دپھا کے مانجھے وے تو وا کی پر سند ہی میں نا آتے ہیں۔"

"کیوں آئیں گے! مفت کی تو نوکر جو لگی وی ہے۔" اماں نے پھنگو کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"موپہ تو ہر بکھت پلے ڈارے رکھے ہے، اور کھد یہ نا جو اُٹھ کے پانی بھی پی لے۔

بڑے دِناں پہ آٹھ دس دناں رہے کے گئی ہے، سانچ مانیو، بوا جی، میری تو دیی دُکھن لگی کام کت کت..... اور کہا سوجھو ایک دِنا، اپنے بڑے بھیا کے سنگ گیند برا کھیلن لاگی، اور موئے کھڑا کل لینو کہ پھنگو، تو گیند اٹھا اٹھا کے دیت جا، اے بولو، تو اِتی بڑی ہو گئی کڑا کی کڑا، اب تیرے گیند برا کھیلن کے دِن ہیں!..... ٹھیچ جاؤ ایک دو دِنا، اب آئی جاہے، دیکھ لیجو کا کرت کی ہے۔"

"کیا اچھی لگتی ہو گی پچھرا سی کودتی وی!..... ماں بھی نہیں منع کرتیں؟"

"منع کرنگی اماں باوا تو دونوں ٹھٹے مارت ہیں وائے کھیلت دیکھ کے، ایک ترہے سو باوا چلاں گے، سا باس، ساباس، دُوسری ترہے سو اماں۔ پادری سات سکھات ہیں کھیلنا کہ یوں پکڑت ہیں برا، یوں پکڑ۔"

"ہاں تو اچھا تو ہے! کھیلنے سے تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔" افروز نے اماں کے فائدے کے لیے بتایا۔ "خورشید، ہم بھی کھیلا کریں گے، تینوں مل کے ایک ٹیم بنالیں گے۔"

"ہاں جو بات سیکھو، بری سیکھو۔ کوئی اچھی بات سیکھو۔" یکایک اماں سخت پڑ گئیں۔ "مَیں صاف کہہ دُوں گی، بھئی یہ باتیں یہاں مت پھیلاؤ، ویسے آنا ہو تو آؤ، تمہارا گھر ہے۔"

اتنی مکمل کامیابی پر خوشی سے ہنستے ہوئے افروز نے پھنگو کو پھر اکسایا: "ہاں، کچھ اور سنا پھنگو۔"

"سناؤں تو بی بی، پہ ابیر ہوئی جارئی ہے۔ میم ساب نے ہردی منگائی ہے دو پیسا کی، رہا دیکھ رئی ہوں گی بے..... پھر روٹی بھی کنی ہے گھر پہنچ کے، وہ مٹلو کوئی ہاتھ تھوڑائی لگا دے گی میر بگیر۔"

مٹلو کا نام بھی کوئی اسم اعظم سے کم تھوڑئی تھا۔ منجملہ اور شکایتوں کے پھنگو کو اپنی بہو سے یہ گلہ بھی تھا کہ جہاں اس نے اپنے بیٹے اور بہو کی زیادتیوں کا ذکر چھیڑا اور وہ آموجود ہوئی۔ چنانچہ اس وقت بھی نام لیتے ہی اُس کے بچھوے دروازہ کے باہر بولنے لگے۔

"اماں، چل!" وہ اندر تو آئی مگر کواڑ سے کندھا چپکا کے وہیں کھڑی ہو گئی۔

"آ گئے، بلُات ہیں۔"

"اَری آ جا، اندر کیوں نہیں آتی ہے؟" افروز نے کہا۔

اُس نے اور آنچل منھ پہ کرلیا اور پھر اپنی ساس کو پکارا۔ "جلدی چل، مکالائے ہیں، کہہ رئے ہیں دریا راندھ دے!"

"اچھا ری، اچھا۔" چھنگو کراہتی ہوئی بڑی مشکل سے اُٹھی: "بیٹھن مت دے تو مجھے کہیں!"

"دیکھا بوا جی۔" ایک قدم چل کے چھنگو پھر لوٹ آئی۔ "پھر تم کہہ دو گی، چھنگو تیری تو آدت پڑ گئی ہے بھونکن کی! اب تمھی دیکھ لویاں کی باتن کو..... اب مکالایو ہو تو یہ ناکہ اپنی بہو کو دے کہ لے، چکی میں ڈار کے دریا پیس دے۔ ناں..... یہ بھی اماں کرے!"

"اَری، جلدی چڑ!" بہو نے بے تاب ہو کر کہا۔ "گل مچاں گے کہ اتنی دیر لگا دئی آت آت۔"

"اری، ہاں چھنگو۔" چھنگو دروازے میں پہنچ لی تو اماں کو یاد آیا: "ذرا کل کو تھوڑی سی مٹی لادے، چولھا بالکل ٹوٹ گیا۔"

"چھنگو، صبح کو آئیو ضرور، سمجھی۔" چھنگو سے دست بردار ہوتے ہوئے افروز نے وعدہ لے لیا۔ "کتنے دن سے چولھا یوں ہی پڑا ہے۔"

"ہاں، بی بی، کل آؤں گی، پھر سناؤں گی ساری باتیں۔" چھنگو بھی پیرانِ پارسا کو خوب پہچانتی تھی۔ "اب تو سانجھ ہو گئی۔"

"باتیں سنانا چاہے مت سنانا، مٹی لا دینا۔" امروز نے لیپ پوت کی "میرا چولھا ٹوٹا پڑا ہے۔"

"نہیں نہیں جھینپو مت!" خورشید بھی غافل نہیں تھا۔ "ہم بھی سنیں گے تمھاری سہیلی کی باتیں۔ جھینپو مت!"

"ہونہہ! سہیلی نہ ہوئی، میری چڑ ہو گئی!" افروز نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہر وقت سہیلی کا ہی طعنہ رہے گا۔"

"اجی واہ، تو کوئی سہیلی ایسی مفت میں ملتی ہے! سہیلی بناؤ گی تو طعنہ بھی سننا پڑے گا۔"

"اے بہنن کو ناتنگ کیا کت ہیں!" رخصت ہونے سے پہلے چھنگو نے نصیحت کی۔ "چار دنا باد پرائے گھر کی ہو جا ہے بہن! بہن سے تو بڑا لاڈ پیار کریں ہیں۔"

(۳)

"ایں ری، اماں، پادرن کی بیٹی آ رئی ہے؟" چھنگو کی بہو نے راستہ میں اُس سے پوچھا: "پادرن کے ہو کے آ رئی ہوں میں۔"

"دیکھ ری، ایک بات کہوں تس سو۔" چھنگو نے اپنی تجویز کے مقابلہ میں بہو کے سوال کو کوئی اہمیت نہیں دی، کیونکہ کہ اُسے ڈر تھا کہیں بات ذہن سے نہ اُتر جائے۔ "جب وہ آ جاوے ناؤناں کی بیٹی، تو دس سو کچھ اترن پترن مانگیو...... کبھی کوئی دیئی دے پھڑاک وڑاک، تیرے تو آ جاگی۔"

بہو نے تجویز کا خیرمقدم نہ کیا اور چُپ چاپ رہی تو چھنگو نے نئے سرے سے کوشش کی: "اے مانگ کے تو دیکھو...... کام کرات ہیں تو پھٹا پرانا لتا بھی نادیں گے؟ ہم کوئی بھیک مانگت ہیں۔ دو دِنا سے جنگر دورت دورت بیرن میں چھارے پر گئے۔ اب یا سو بھی گئے؟ پیسا کوڑی نا دیتے ہیں تو پھٹے چھ ماہے گرے میں ڈارنے کو پرانا دُھرانا کپڑا بھی نادیں گے میری سسری کے؟"

"موئے تو سرم لگے ہے مانگت میں۔" بہو نے شرما کے دکھایا۔

"سرم پلے پر گئی!...... سرم لگے ہے یائے تو! اری، ہک مانگن میں کاہے کی سرم۔"

"ناں ری اماں، مو سو تو نا مانگا جائیگو۔" بہو تو لاڈ پر اُتر آئی۔

ساس بھی ذرا خوش ہو کے بولیں: "اچھا، تو تو کھڑی تو رہیو میرے پاس، کہ یہ بھی نا کرے گی؟ مانگ میں لوں گی، کہ دُوں گی یہ تو رَہا دیکھ رئی تھی کہ بی بی آویں تو کپڑا لتا ملے۔"

"اے، ہے تو اچھی، اماں، پادرن کی بیٹی بات چیت میں۔" بہو نے ایسے بے اختیار ہو کے کہا جیسے بہت دیر سے کسی نے اُسے روک رکھا ہو۔ "ہنسی مجاک بہت کرے ہے۔ جاڑن میں آئی ہی نا جب، تو دیکھیو، اماں کہا پوچھے ہے موسو...... بولی، چندو، ایک بات پوچھوں، بتاوے گی۔ میں نے کہا پوچھو، کہا بات ہے؟...... تو، دیکھیو، پوچھے ہے...... چندو سچی سچی بتائیو، تو ئے اپنا دُولھا پرسند ہے کہ نا؟" یہ کہتے ہی بہو نے آنچل میں اپنا منھ چھپا لیا۔

چھنگو ہنس پڑی — ہو سکتا ہے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا اثر ہو۔ "دیکھو تو کہا پوچھے ہے...... پھر تو نے کا جباب دینو؟" چھنگو بھی ترنگ میں آ گئی۔

بہو نے شرمانے، لجانے، مسکرانے، بدن چرانے کے تمام لوازمات۔ بڑی تیزی سے

پورے کرکے بات کا رُخ پلٹ دیا۔ "ایک دِنا موئے اُدھر دُھوپ میں کو لے گئی دِوال کے پیچھے کو، وہاں موئے بٹھائے کے میرے منھ پہ وہ ملو کا کہت ہیں وائے، پوڈھر اور کھوب سُرخی لگائی، اور کاکا تماشے کرت رہی جانے۔ بولی موسو کہ چندو، یوں ہی گھر جائیو۔ موئے لگن لگی سرم، میں نے لے کے چادر سب رِگڈ ڈارو۔"

"اور یوں بھی تو کہہ رہی ہے، اماں" بہو نے کچھ رُکتے ہوئے بتایا "کہ جب میں گرمین میں آؤ گی تو، چندو تجھے پڑھاؤں گی۔"

"ارے سب پڑھ لینو، تو اپنا کام دیکھ!" جھنگو کو واقعی خطرہ پیدا ہو چلا تھا "تو وا کی باتن میں کہا لے گی، وہ تو پائی کھیل تماسن میں رہے ہے۔"

"ناں، میں تو اُس کی بات سنا رہی ہوں۔" بہو نے فوراً بدظنی رفع کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ بات وات نا ہے، تو تو بس یوں کہیو کہ لاؤ بی بی جی، کوئی پھٹا پرانا جمپھر ہو تو دو، میرے پاس نہ رہیا۔"

"توئی کہہ دیجیو، اماں؟" بہو گڑگڑائی۔

"اے رنگھے!..... کھیلن کو دُن بھرے کی تو ہے، یہ ناں کہ اِتی سی بات کہہ دے..... واسو آت ہے سرم تو پادرن سو کہہ دیجو کہ اب تو بی بی آ گئیں، اِنہی کا کوئی پھڑاک ہو وے تو دے دو..... ارے ہاں کہہ دیجو! سرم کائے بات کی یا میں!"

(۴)

گلیڈس کے آنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ پھندینا بھنگن کو ایک پان کا ٹکڑا بھی ملا تو اُسے تو خوش ہونا ہی ٹھہرا۔ اُس کے خلوص میں شبہ کی گنجائش یوں بھی نہیں رہتی کہ اُس نے مسز جیکسن سے گلیڈس کے آنے کا وقت معلوم کرنے کے بعد یہ وعدہ کر لیا کہ میں کل چار بجے آ بیٹھوں گی جو بی بی میرے سامنے ہی آئیں، مگر اُس کی کیفیت اُس وقت سے بدلنی شروع ہوئی جب راستہ میں لالہ کیچڑو مل مِل گئے اور اُنہوں نے تقاضا ٹھونک دیا کہ اری پھندینا اب بہت دِن ہو گئے ہیں، اپنی ہنسلی چھڑانی ہو تو چھڑا لے، نہیں تو مَیں بیچے ڈالوں ہوں۔ خیر لالہ سے تو اُس نے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کے تھوڑے دِنوں کی مہلت لے لی، مگر آگے چلی تو سوچتی ہوئی کہ اب انتظام آخر ہو گا کیسے؟ پہلے تو اُسے اپنے شوہر پہ غصہ آیا کہ تین مہینے سے جو بمبئی جا کے بیٹھا ہے تو رسید تک نہیں دی۔ یہ بھی خبر نہیں لی

کہ جی رہی ہے کہ مر رہی ہے۔ وہاں بھی اس کے وُہی کرتوت ہوں گے، شراب پینا اور جوا کھیلنا، کچھ بچتا ہو تو بھیجے۔ اسی شرم سے تو خط نہیں لکھتا، چنانچہ اُس سے تو روپے کی اُمید رکھنا فضول تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ پھندینا خود کوئی بندوبست کرے تو کس طرح؟ گھر سا میں بھینس کا دُودھ بھی تو کم رہ گیا تھا نہیں تو دو چار روپے ہر مہینے ادھر سے بچا لیا کرتی۔ سوروں اور مرغیوں کا بھاؤ اتنا گر رہا تھا کہ یوں اونے پونے بیچتے ہوئے پھندنیا کا دِل دُکھتا تھا۔ رہے ججمان، تو اُن کا یہ حال تھا کہ اُوپر سے کچھ دینا دلانا تو الگ رہا، مہینے کے پیسے بھی بڑے جھنکا جھنکا کے دیتے تھے، بہرحال پھندنیا نے حساب لگانا شروع کیا کہ کس کس پہ کتنے کتنے پیسے چڑھے ہوئے تھے۔ جب نام گنتے گنتے پادرن کا نمبر آیا تو پھندینا ایک دَم چونک سی پڑی۔ اُسے یاد آیا کہ جب پادرن اس مکان میں آ کے بسی تھیں تو اُن سے بڑی حجت رہی تھی۔ پھندنیا تو آٹھ آنے ماہوار مانگ رہی تھی اور پادرن کہتی تھیں کہ واہ، مجھے نیا سمجھ کے لوٹ رہی ہے۔ میں تو چار آنے دُوں گی، میں نے تو شہر میں بھی کبھی چھ آنے سے زیادہ نہیں دیے۔ بڑی بحث و تکرار کے بعد آخر پادرن نے وعدہ کیا تھا کہ اچھا جب گرمیوں میں میرا بڑا لڑکا اور لڑکی آ جائیں گے تو میں چھ آنے کر دُوں گی، یہ انصاف کی بات ہے۔ پھندنیا اُس وقت تو خیر مان گئی، اور مانتی نہ تو کرتی بھی کیا اور گھروں سے بھی تو اُسے چونی ہی ملتی تھی، بلکہ بعض گھروں سے تو دونی مہینہ اور تیسرے دِن کی ایک روٹی، مگر اُسے پادرن کے وعدے پر بالکل اعتبار نہیں آیا۔ چنانچہ دو چار دن بعد تو اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ پادرن نے کیا کہا تھا کیا نہیں۔ البتہ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ پادرن پیسے ویسے تو خیر کیا بڑھائے گی، اُن کی تو بس باتیں ہی باتیں ہیں، مگر انہیں آزمایا تو چاہیے کہ واقعی سچ بولتی ہیں یا اُسے یوں ہی بسلا رہی تھیں۔ یہ طے کر کے اُس نے پورا نقشہ ذہن میں مرتب کر لیا کہ وہ گلیڈس کے انتظار میں پہلے سے جا بیٹھے گی۔ باتیں واتیں کرتی رہے گی، پان کھائے گی پادرن سے مانگ کے۔ اتنے میں گلیڈس آ جائے گی، کچھ دیر اُس سے بات چیت رہے گی۔ گلیڈس آتے ہی ضرور پوچھے گی کہ پھندنیا، کہہ تیرے سسر کا کیا حال ہے، گالیئیں دیتا ہے کہ نہیں۔ پھندنیا کہے گی، ہماری کیا پوچھو ہو، تم سناؤ، کیسی رہیں، تمہاری سہیلیاں تو اچھی ہیں سب۔ یا خیر، سہیلیوں کی باتیں تو پھر فرصت سے ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو گلیڈس دو مہینے رہے گی۔ اس وقت تو پھندنیا بس اتنا پوچھ لے گی کہ ہمارے لیے کیا لائیں، کچھ لائیں کہ یوں ہی خالی ہاتھ چلی آئیں؟ اس کے بعد پھندنیا اُسے ٹلا دے گی کہ اچھا

جی، اب تو منہ ہاتھ دھوؤ۔ ہماری تمہاری باتیں تو اب روز ہوا ہی کریں گی۔ جب گلیڈس ذرا اِدھر اُدھر ہو جائے گی یا اپنے چھوٹے بھائی کو پیار کرنے میں لگ جائے گی تو پھندنیا پادرن سے کہے گی، ہاں میم صاحب، یاد کرلو تم نے کیا کہا تھا۔ پادرن پوچھیں گی، کیا کہا تھا، کس بات میں؟ تب پھندنیا بتائے گی کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب گرمیوں میں بچے آ جائیں گے تو وہ دونی بڑھا دیں گی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ انہیں یاد بھی آتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ مکر ہی جائیں اور یاد بھی آ جائے تو کیا خبر کہ پیسے بڑھائیں کہ نہ بڑھائیں۔ خیر جو کچھ بھی ہو، یہ تو پھندنیا نے ارادہ کر ہی لیا تھا کہ کہوں گی ضرور، مانیں تو، نہ مانیں تو البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ اگر گلیڈس اِدھر اُدھر نہ ہٹی اور وہیں جم گئی تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ جب گلیڈس جاڑوں میں آئی تھی تو روز شام کو وہ اُسے اپنے اسکول کے حالات اور فلموں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی اور اس کے معاوضے میں پھندیا اپنے سسر کے جھگڑے قصے بیان کیا کرتی تھی۔ انہیں تعلقات کا خیال کر کے اسے گلیڈس کے سامنے پیسوں کی بات چھیڑتے ہوئے لحاظ ہو رہا تھا۔ لیکن یہ اَمر بھی غور طلب تھا کہ اگر اسی طرح دو ایک دِن ٹل گئے تو بس بات گئی، پھر تو پادرن کہہ دیں گی کہ ارے پھندنیا ایک ایک دو دو آنے پہ جھگڑا کرتی ہے۔ اب اس کے جانے ہی میں کے دِن رہ گئے ہیں جو تو پیسے بڑھوا رہی ہے۔ ان سب خرخشوں سے ڈر کے پھندنیا نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر مجبوری ہوئی تو وہ گلیڈس کے سامنے بھی کہنے سے نہیں جھجکے گی۔ جس نے کی شرم، اُس کے پھوٹے کرم۔ اور پھر شرم بھی کس بات کی؟ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، واجبی ہے، خود گلیڈس کی ماما ہی نے تو وعدہ کیا تھا۔ پھر گلیڈس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کرنے میں ایک صورت فائدے کی یہ بھی ممکن تھی کہ شاید وہ اپنی ماں سے پھندنیا کی سفارش ہی کر دے اور نہ بھی کرے تو کیا ہے۔ اب وہ اپنے پیٹ کی فکر کرے کہ گلیڈس کی رضامندی اور نارضامندی کو دیکھتی پھرے۔

(۵)

جب پھندنیا نے لالہ کشن لال کے گھر پہنچ کے یہ خبر سنائی کہ پادرن کی بیٹی کل آ رہی ہے تو اُسے تو لیلا نے یہ کہہ کے ٹال دیا: ”آ رہی ہے تو آن دے، ہم سو کیا؟“ لیکن اُس کے دِل میں پادرن کی بیٹی سے ملنے کا شوق چٹکیاں لینے لگا۔ گلیڈس کو اُس نے دو چار دفعہ اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بات چیت کا تو ذکر ہی کیا، بلکہ پہلی دفعہ تو جب اُس نے ایک گوری سی لڑکی کو

نیلا کوٹ پہنے ہوئے اور پادرن کے آگے کھٹ پٹ کھٹ پٹ تیز چلتے دیکھا تھا تو اُسے بڑا تجسّس ہوا تھا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی یہاں، اور پادرن کی کون ہے۔ جب اُس نے پھندنیا سے رجوع کیا تو اُس کی دقت رفع ہوگئی، گلیڈس کو دو ایک دفعہ مسلمانوں کے گھروں میں جاتے ہوئے دیکھ کر لیلا کو اُمید ہوئی کہ شاید پادرن اپنی بیٹی کو کسی دن اُس کے گھر بھی لے آئیں۔ وہ کئی دن تک برابر انتظار کرتی رہی، اتنے میں ایک دن پھندنیا سے معلوم ہوا کہ وہ تو گئی بھی اپنے اسکول۔ اپنے پادرن کے اتنے اِترانے پر غصہ تو آیا لیکن اس گوری سی چست و چالاک، اسکول میں پڑھنے والی عیسائی لڑکی میں کچھ ایسی پر اسرار اجنبیت تھی کہ اُس سے متعارف ہونے کے اشتیاق پر اُسے کوئی شرمندگی نہیں محسوس ہوئی اور اُس نے دِل ہی دِل میں یہ اعتراف کر لیا کہ اُن کے گھر سے پادرن کے بے نیازی برتنے کی اصل ذمہ داری اس کی ماں پر ہے۔ پادرن شروع میں کئی دفعہ آئیں لیکن اُن کی زیادہ ہمت افزائی نہ ہوئی تو وہ بھی گاہے ماہے آنے لگیں، بہرحال اب کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہیے کہ یا تو گلیڈس اُن کے گھر آ جائے یا لیلا کسی بہانے اُن کے گھر جائے۔ ایک ابتدائی غلطی اُس سے یہ ہوگئی کہ اُس نے پھندنیا کی ہمدردیاں اور خدمات فوراً حاصل نہ کر لیں، ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ صاف پھندنیا سے کہہ دیتی کہ اچھا اب کسی دِن لے کے آئیو اپنی میم صاحب کی بیٹی کو، پھر تو پھندنیا ضرور لے آتی کسی دِن، نہیں تو پادرن سے کہہ دیتی کہ چلو انہیں بھی لے چلو۔ مگر اب تو وہ کہہ بیٹھی کہ آ رہی ہے تو ہمیں کیا۔ اب اگر پھندنیا سے دوبارہ سلسلہ جنبانی کی جائے تو خواہ مخواہ جھینپنا پڑے گا۔ خیر اُس کی بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ پھندنیا کی مدد حاصل کر لینا کون بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسا بہانہ ہاتھ آ جاتا جس میں پھندنیا کے سامنے جھینپنا نہ پڑتا تو اچھی بات ہوتی۔

یہ کہنا تو خیر مبالغہ ہوگا کہ لیلا اسی اُدھیڑبن میں رہی، لیکن ہاں، اتنا ضرور ہے کہ شام سے لے کے سونے کے وقت تک اُسے کئی دفعہ خیال آیا کہ کوئی ترکیب سوچنی چاہیے پادرن کی بیٹی سے ملنے کی، ذرا دیکھا تو جائے کس قسم کی ہے۔

جب سب لوگ اپنے اپنے پلنگوں پر آ لیٹے تو لیلا اپنی چھوٹی بہن کو تھپکتے تھپکتے ایسی آواز بنا کے بولی جیسے یوں ہی اتفاقیہ خیال آ گیا ہو: ”کیوں ری اماں، اب کے تو للی کا سوٹر گرمین میں ہی بن لوں؟“

”اری، ابھی سو کیا پڑی ہے، ابھی تو کئی مہینا ہیں، بن لیجیو آہستے آہستے۔“ اماں کو

لگ رہی تھی گرمی۔

"ناں، میں تو یوں کہوں تھی کہ پھر تو ہوگی مارا مار، اب لگا لگاتی تو جاڑن سے پہلے پہلے ہو جا تو تیار۔"

"اچھا تو میں کچھ کہوں ہوں؟..... تیرا جی چاہ راہے بننے کو تو بن لے۔" بحث سے بچنے کے لیے منظوری دینی پڑی۔

"اب کے تو اچھا سا بنوں گی للی کا سوٹر!" جب اس پر اماں کے اندر کوئی جوش پیدا نہ ہوا تو اُس نے اور دِل فریب تفصیلات بتائیں۔ "پھول بناؤں گی اب کے تو بڑے بڑے۔"

"ویسے ہی بناؤ گی! آویں بھی ہیں بنانے؟" اماں نے تو اپنی طرف سے طعنہ دیا تھا لیکن لیلا مطمئن ہوئی کہ اب بات ڈھب پر آنی شروع ہوئی: "یئی تو میں سوچوں ہوں کہ سیکھوں کس سے پھول بنانے۔ ایک دپھا کوئی سکھا دے موئے، پھر تو میں آپ بنالوں گی۔"

"اب کوئی آوے گا تجھے سکھانے وہاں سے!..... نا آتے ہیں پھول بنانے تو سیدھا سادا بن لے۔"

لیکن لیلا کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ "کیوں ری اماں، یہ نا سکھا دے گی پادری کی بیٹی؟ کل کو تو آرئی ہے۔ یہ تو جانتی ہوگی، اسکول میں پڑھے ہے۔"

"جانتی ہوگی تو کوئی سکھاتی پھرے ہے وہ!" اماں نے سختی سے کہا۔

"ناں، میں چلی جاؤں گی وا کے گھر، وہ نا آئے گی تو۔"

"چل چل، پرے ہٹ۔" اب کے تو ڈانٹ پڑ گئی۔ "آئی بڑی جانے بالی! ہر بکھت تو آدمی بھرے رہے ہیں اُن کے۔ چلی ہے سیکھنے!"

"ماں نا جانے دیتی ہے تو میں بلوا لوں گی وائے ہیاں۔" لیلا نے اب بھی ضبط سے کام لیتے ہوئے ملائمت برتی۔

"اری تو تو جد کیا کرے ہے بھول بے بھول میں!" اب اماں نے مصلحتاً سمجھانے کا انداز اختیار کر لیا۔ "جانتی تو ہے نا تو..... ویسے ویسے لوگن سے میل جول اچھا نا ہوتا ہے۔"

پہلے تو لیلا کا جی چاہا کہ اماں سے "اسے ویسے لوگوں" کی تعریف پوچھے اور پھر اُن سے میل ملاقات رکھنے کے حسن و قبح پر تفصیلی اور پر زور بحث کرے، لیکن پھر اُسے یقین

ہو گیا کہ اماں ماننے والی اسامی نہیں۔ کم سے کم اُس وقت کہ جب گرمی زور دکھا رہی ہو اور ساتھ ہی نیند بھی دماغ میں سرسرا رہی ہو، اماں کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی جملہ کوششوں کو لیلا نے ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ شاید دو ایک دِن میں اماں کے ہموار ہونے کی صورت نکل آئے۔ ورنہ بصورت مجبوری اپنی پھندنیا تو موجود ہی تھی۔

(۶)

چھدن سنار کی دُکان پہ عزیز، مولو، عنایت سب موجود تھے۔ یہاں تک تو حالات سازگار رہے تھے اور قسمت نے اُس کی توقعات سے زیادہ یاوری کی تھی، کیونکہ یہ تو مولو کے بزار کا وقت تھا، لیکن صدیق وہاں دس منٹ تک بیٹھا انتظار کرتا رہا اور کسی نے بھی نہ پوچھا، کیوں بے، یہ آج پان کیوں کھا رکھا ہے، کہیں سے سگائی آئی ہے کیا؟ سگرٹ بھی اُس نے بالکل اُس وقت پھینکی جب اس کی انگلیوں میں چھکا لگنے لگا، لیکن کسی نے یہ تک نہ دیکھا کہ آج وہ بیڑی کے بجائے ہاتھی کی سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ لوگ اِسی بات پہ اُلجھ رہے تھے کہ وہ جو پرسوں رات شیخوں میں کی ایک لونڈیا بھاگ گئی ہے، دیوار پہ کیسے چڑھی ہوگی۔ ارے بھئی بھاگ گئی تو بھاگ گئی، اب اس سے کیا لینا کہ نچانے میں کو چڑھی تھی کہ چولھے پہ پیر رکھ کے؟ یہ نہیں کہ کچھ اپنی کہیں کچھ اُس کی سنیں، وہ تو اپنے کام کا ہرج کر کے آیا تھا۔ پادری صاحب کے یہاں سے لوٹتے ہی اس نے بھاگم بھاگ جو دو چار گھر ضروری تھے، وہاں پانی ڈالا، اور باقی گھروں کو تیسرے پہر پہ ٹال دیا۔ نو بجتے بجتے اس نے فراغت حاصل کر لی اور مشک سمیت کلو بنیے کی دُکان پر پہنچا کہ لاؤ لالہ آج تو ایک پان کھلواؤ کرارا سا، اور ایک پیسے کی سگریٹ دو۔ اس طرح سج سجا کے وہ چھدن کی طرف روانہ ہوا اور دِل میں سوچ لیا کہ پہلے خوب دِق کروں گا پھر بات بتاؤں گا۔ چنانچہ پہلے تو اُس نے کسی سے بات نہیں کی، بس سیدھا جا کے دُکان کے تختے پہ ٹک گیا۔ پیر زمین پر گڑے ہوئے، مشک بائیں کندھے پہ جھولتی ہوئی، منہ سڑک کی طرف، ایک ہاتھ کمر پر اور دُوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اندر کو مڑی ہوئیں، انگوٹھا اُوپر تنا ہوا اور دو انگلیوں میں سگرٹ۔ کبھی تو وہ ناک سے دُھواں نکالتا تھا اور کبھی ہونٹوں سے سگریٹ ہٹا کر دُھوئیں کی پچکاری چھوڑتا تھا۔ لیکن جب اُس کی شانِ بے نیازی کوئی خراجِ تحیر وُصول نہ کر سکی تو اُس نے بے چینی سے پہلو بدلنے شروع کر دیے بلکہ جب سگریٹ دو انگل کے قریب رہ گئی تو

اُس نے اُن لوگوں کی طرف رُخ بھی کر لیا۔ لیکن جب اس پر بھی انہیں شیخوں میں کی لونڈیا نے اُسی طرح اُلجھائے رکھا تو اسے احساس ہونے لگا کہ واقعی بندر کیا جانے ادرک کا سواد! آخر وہ اپنی نادانی اور ان کی محرومی پر افسوس کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا، بھیا، چلے!'' اُس نے مشک ٹھیک کرتے ہوئے دھمکی دی۔

''چھدن نے اپنی بات بیچ میں روک کے بڑے اطمینان سے آدھے منٹ اُس کی طرف دیکھا اور کہا: ''چلے رانڈ کا چرخہ برے کا پیٹ۔ تو تو بیٹھ۔''

اس مذاق پر صدیق کا دل تھوڑا سا پسیجا تو لیکن پھر اُسے اپنی شکست یاد آ گئی۔

''چلیں کام پڑا ہے۔''

''کیا کام پڑا ہے؟'' عنایت نے پوچھا۔ ''جاتا ہوگا وہی پھلاس کھیلنے! ابے بیٹھ، ابھی تو تیرے یاڑی آئے بھی ناہوں گے۔''

اپنی مصروفیتوں کا ذکر سن کے تو اُس کی رہی سہی ناراضی بھی کافور ہو گئی، لیکن پھر بھی اُس نے ایک دَم سے پھوٹ پڑنے میں احتیاط برتی اور ہونٹ پر سے پان کی سرخی کو رگڑ، رگڑ کے مٹاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھتے تو، کیا کریں، اب کام بڑھ گیا ہے۔''

''کیا، میر ساب کے سے جو الگ ہو گیا ہے تو؟''

اُس وقت تو وہ عنایت کے طنز سے اُلٹا اور خوش ہوا۔ ''ابے ناں، وہ آج سے پانی ڈالنا پڑے گا نازادا پادری ساب کے گھر۔''

''کیوں، کیا غوطہ لگائیں گے پادری اور پادرن پانی میں؟'' اصل میں پادری صاحب نے ایک دفعہ عزیز کو قمیصوں کی سلائی کم دی تھی، اِس لیے وہ ذرا بھنایا ہوا تھا۔

''دو ایک مشک روز کی تو ڈالنی ہی پڑیں گی زادا۔'' صدیق نے سوچا ذرا دیر چک پھیری ہی دو۔

''کوئی بھینس ویس پال لی ہے پادری صاحب نے؟'' مولو واقعی سنجیدہ تھا۔ ''لے آئے ہوں گے کوئی سستی سی گاؤں واؤں سے۔''

''بھینس تو نا، ایک بچھیا منگوائی ہے یوں نوک دار سینگوں والی، بالکل ہنی کے مافک!'' صدیق نے ایک پتھر سے دو چڑیاں ماریں۔

''ابے بتا وے گا کہ یوں ہی مخول بازی کیے جاوے گا۔'' چھدن نے ہتھوڑی سنبھال کے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جانے کی دھمکی دی۔

"تجھے معلوم نا ہے؟" صدیق نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "آج وہ آرئی ہے نا پادری ساب کی بیٹی!"

"پادری ساب کی بیٹی؟ چھدن نے ہتھوڑی رکھ دی اور صدیق کی طرف کو پھر گیا۔ انتظار کی شگفتگی اوروں کے چہرے پر بھی آگئی تھی۔ "کتی بڑی ہے؟"

"ارے، لو اِس نے نہیں دیکھا!" صدیق نے چھدن کی بے بصیرتی پر تعجب کا اظہار کیا۔ "آئی تو تھی جاڑوں میں کشمش دِن پہ۔"

"ہاں ہاں، آئی تھی، میں نے دیکھا تھا بزار میں۔" مولو نے تصدیق کی تو عزیز اور عنایت اپنی کم مائیگی پر جھینپ گئے۔ "اچھا۔ تو وہ بیٹی تھی پادری ساب کی!"

"ہے کتی بڑی؟" چھدن کو بے صبری ہو رہی تھی۔

"یہی ہوگی کوئی بارہ تیرہ برس کی۔" مولو نے آنکا۔

"ابے الگ ہٹ، تلیرا! تجھے کیا کام ان باتوں سے۔" لیجئے بھلا وہ مفت میں ہی صدیق کی جگہ غصب کیے لے رہا تھا۔ "پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو کدرت کے کھیل۔" تیلیوں کے بارے میں اُس وقت اسے یہی مثل یاد آئی۔

"اُسے نہیں بتانے دیتا تو تو ہی بتا کتی بڑی ہے؟" عنایت کا شکوہ بجا تھا۔ وہ تینوں تو بے چارے انتظار میں تھے۔ یہاں دو ملاؤں کے بیچ میں مرغی حرام ہو رہی تھی۔

"پوری جوان ہے!" صدیق نے مولو کو کفرانِ نعمت پر ڈانٹتے ہوئے جوہر شناسانہ انداز میں کہا۔ "پندرے سولے سال کی ہے۔"

مولو کچھ ایسا خفیف سا ہو گیا جیسے اپنے ساتھیوں سے غداری کی ہو، اور بعد میں پکڑا گیا ہو۔ چھدن، عزیز اور عنایت، تینوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، تینوں کی آنکھوں نے پوچھا کہو بھئی کیا صلاح ہے، کچھ بات جچتی ہے؟ آخر ترجمانی کے لیے چھدن منتخب ہوا: "ہے کیسی؟..... ہے کچھ ڈھیلی سی کہ یوں ہی ہے اپنی کلسا کی طرح ڈھونڈو کات؟"

"اچھا، ماٹھو گل قند! مزے ہی میں آگئے تم تو!" صدیق بے اعتنائی کا انتقام لے رہا تھا۔ "اب سبھی پوچھ لوگے ایک دَم!"

"ابے بتا تو۔" چھدن نے چمکارا۔ "تجھے میری جان کی قسم!"

"ہاں بے، یہ اکیلے اکیلے ٹھیک نہیں!" عزیز نے روغن قاز کا پچارا پھیرا۔ "یاروں

کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔"

"ابے، کیا پوچھتے ہو!" صدیق اپنی ساری احتیاط بھول کے ایک دم سے کھل کھلا اُٹھا۔ "ابھی تم نے دیکھا کیا ہے!"

"ہاں ہاں، نا دیکھا۔" عنایت نے یقین دلایا کہ چلو یوں بھی سہی۔ "تو تو بتا تو نے کیا دیکھا ہے۔"

"کیا پھرنے پھرو ہو اُس سالی مالن کی لونڈیا کے پیچھے۔" صدیق کے لہجے میں بڑی حقارت تھی۔ "اُسے دیکھ لیا ایک دفعہ تو سب بھول جاؤ گے۔"

"خیر تو دکھا دے گا تو دیکھ بھی لیں گے۔" چھدن نے چاپلوسی کی۔ "پہلے تو بیٹھ تو جا، کھڑا کیوں ہے میرے یار؟"

صدیق بیٹھنے لگا تو عزیز اور عنایت نے پیچھے سرک کے فوراً جگہ کی۔ "آرام سے بیٹھ آگے کو۔" مولو نے کہا۔

"ارے سب آرام ہی ہے۔" صدیق کو اور بہت سی نعمتیں جو حاصل تھیں۔ "اب رہے گی دِل لگی تو..... اب دیکھنا ذرا رنگ!"

"ابے، لگے تو ہے سچ مچ میں بڑی بھولی بھالی!" مولو نے بڑی دیر میں فیصلہ کیا۔

"یہی تو تمہیں نہیں معلوم! ہم سے پوچھو اس کا بھولا پن..... ارے، بھولی نہیں ہے، بڑی شریر ہے۔ ایک دن چپکے چپکے اپنے بھائی سے کہہ رہی، یہی جو پھرے ہے نیکر ہلاتا، کہ سدیخ کی مشک میں سوئی گھسا دُوں؟ وہ تو اُس کے بھائی نے منع کر دیا، نہیں تو ہو گئے تھے میرے تو آٹھ دس روپے ٹھنڈے۔"

"واہ بے واہ، بس راتے ہی تھے!" عزیز نے چڑایا۔ "مرد تھے تو کہہ دیتے، ہو جانے دو نقصان آٹھ دس روپے کا، کوئی بات نہیں ہے!"

"ارے، آٹھ دس روپے کیا چیز ہیں، یہاں تو جان تک حاضر ہے، اُس کے لیے..... کوئی تم جیسے تھوڑی ہیں کہ اُس نے گو بند پور والے نے اٹھنی کا رُومال مانگا ریشمی تو بھاگ لیے۔"

"ارے چھوڑ، کیا جھگڑا لے بیٹھا!" چھدن کو اپنی ذہنی تصویر مکمل کرنے کی جلدی تھی۔ "تو اُس کی بات سنا۔"

"اب بات سن کے کیا کرو گے، اُسے ہی جو دیکھ لیجو!" مگر پھر صدیق کو کچھ ترس

آگیا۔ "جب وہ نکلے ہے نا ذرا پوڈر ووڈر لگا کے، خوب بنی سنوری، یوں بائیں طرف کو مانگ نکلی وی، اونچی ایڑی کا جوتا، منہ پر سرقی لگی وی۔ جب دیکھو اُس کی بہار تو..... وہ تیرس کے تھیٹر آیا تھا نا منڈی میں، اس میں ایک لونڈا تھا چکیا، وہی جو سریمتی منجری کا پاٹ کرے تھا..... ابے وہی جسے گود میں بھر کے پیچھے کو لے جایا کرے تھا..... بس این میں بالکل ویسی ہی لگے ہے۔ جب پوڈر اور سرقی لگا لے ہے تو..... بھئی، جو ذرا بھی فرق ہو!"

کئی لمحے سکتے میں رہنے کے بعد چھدن للچائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہاں بھئی، گھرے ہیں سدیخ کے تو اب!"

"ارے، کیا گھرے ہیں!" کوئی صدیق ایسا چھچورا تھوڑا ہی تھا کہ اپنے منہ سے اپنی دولت کی شیخیاں بگھارتا۔ اس لیے مبارک بادیاں سننے کے بجائے اس نے معروضی واقعات پیش کرنے شروع کر دیے: "آج صبح جب میں مشک لے کے پہنچا تو پادری صاب بولے، ارے بھئی صدیق، آج سے روز ایک مشک زیادہ پڑا کرے گی۔ میں نے کہا، کیوں، پادری ساب، ایسا کیا کام پڑ گیا؟ تو بولے، بھئی آج ہماری لڑکی آ رہی ہے، اب پانی زیادہ چاہیے۔ میں نے کہا، اچھا، یہ بات ہے، فکر مت کرو، پڑ جایا کرے گا پانی۔ کہنے لگے، صدیق! ہم پیسے بڑھا دیں گے۔ میں نے کہا۔ جی واہ پادری صاحب، تم نے بھلی فکر کی۔ ایک مشک لو، دو لو، چار لو، جتی مشکیں کہو گے پڑ جائیں گی۔ پیسوں کی تم نے اچھی فکر کی؟"

"ہاں بیٹا، کیوں فکر کرو گے پیسوں کی؟..... مال ہے نا سامنے کھرا!" عزیز نے چٹکی لی: "اور جو ہم کہیں تو ایک گھونٹ پانی نہ پلاؤ گے!"

صدیق نے اپنے کاروباری اصولوں کی رنگا رنگی پر خوش ہوتے ہوئے آگے قصہ سنایا۔ "پادری ساب بولے، اصل بات یہ ہے کہ اب وہ آ جائے گی تو نہانے وہانے میں بہت پانی خرچ ہوگا، وہ نہاتی ہے روز گرمیوں میں۔ میں نے دِل میں کہا کہ اجی لاؤ، میں نہلا دیا کروں گا مشک سے اور جو کہو گے تو مل مل کے سب میل کچیل بھی اتار ڈالا کروں گا! روز کہو گے تو روز!"

"کیوں بے، مجھے بھی بھجوا دے۔" مولو نے سفارش کی۔ "میں تیل مل دیا کروں گا۔ اچھا ہے، بدن چکنا رہے گا۔"

"خالص ہو، بے!" چھدن نے گوشمالی کی۔ "ترے وَرے کا نہیں۔"

"نہیں، بالکل کھرا، پیلی سرسوں کا۔ اور چاہیے تو کچی گھانی کا۔"

"چلو یار، ہم کوئی جمفر ہی سی دیں گے، اور نہیں تو کیا۔ عزیز نے بھی قربانی کی۔ "کہہ دیجو بے، میں ناپ لیاؤں گا۔"

"واہ بیٹا، یہ اچھا بٹوارہ رہا!" چھدن کو ان لوگوں کی خود غرضی کی سخت شکایت تھی۔ "تم ناپ لیاؤ گے، یہ نہلا دیں گے، وہ تیل مل دیں گے! ہمارے حصے میں بس انگلی ہی آئے گی؟..... اچھا، خیر چلو، انگلی ہی سہی، ہم انگوٹھی بنا دیں گے!"

"انگوٹھی کیوں بناوے ہے، ہار بنا!" عزیز نے سمجھایا۔ "مگر ناپ پہلے لے لیجو، کبھی بعد میں چھوٹے بڑے کی شکایت ہوتی پھرے۔"

"اور تو کدھر رہا بے سالے، تیر گر کے؟" صدیق نے اس ٹھاٹ سے کہا جیسے اسی نے باقی سب انتظام کیا ہو۔ "تو یوں ہی ٹائیں ٹائیں پھس؟"

"اَرے ہماری کیا ہے۔" عنایت میں بھی کافی خود اعتمادی موجود تھی۔ "ہم بھی جا پہنچیں گے تمہارے پیچھے پیچھے، دو چار انار، دو چار سری پٹاخے لے کے!"

"اِس بھلائے میں مت رہیو کہ پہنچ جائیں گے تمہارے پیچھے پیچھے! ہاں واقعی، میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے سالے، اِتنے جوتے پڑیں گے کہ اماں سے سکل بھی نہ پہچانی جانے گی ہے!..... وہ کوئی تیلی تنولیوں کو پاس بٹھاویں ہیں؟"

"دیکھ لے بے، دیکھ لے۔" عنایت نے مولو کو آگاہ کیا۔ "تجھ پہ کر رہا ہے چوٹ!"

"اچھا بھئی، کر لینے دے اسے بھی چوٹ۔" مولو نے اُس وقت درگزر کرنا ہی کچھ مناسب سمجھا۔ "اب تو اُس کی چڑ بنی ہے..... کبھی آئے گا ہمارا بھی موکا!"

"جھوٹی بات ہے بھیا مولو!" چھدن کو رشک آئے چلا جا رہا تھا۔ "ایسا موقع نہیں آتا تمہارا۔ اس نے بڑی زور کا ہاتھ مارا ہے۔"

"یار کیا ہاتھ مارا ہے۔" داد تو مل ہی چکی تھی، اب سنانے میں کیا مضائقہ تھا۔ "جب وہ جاڑوں میں آئی تھی نا تو میں روز وِس میں رہا، بات کروں کسی طرح اس سے، پہ بول کے ہی نا دی سالی۔ ایک بات یوں بھی ہے کہ جب میری پادری ساب سے ایسی وہ نا تھی، اب تو بہت گھٹنے لگی ہے۔ اب کے دیکھو کیا رہے ہے۔"

"اب کے تو تم نہلانے ہی جایا کرو گے!" مولو کا نہ سہی، عنایت کا تو موقع آ ہی گیا۔

صدیق اپنے تصور میں ایسا مگن تھا کہ اُس نے عنایت کے فقرے کا کوئی خیال نہیں کیا۔ "اب کے تو میں نے سوچ لیا ہے، چاہے کچھ ہو جائے، وہیں پڑا رہا کروں گا دِن بھر ڈھائی یا آٹا باندھے۔"

"اب، کیا رکھا ہے، تو بھی ہو جائیو تھوڑے دِنوں کو اِسائی۔" عزیز نے صلاح دی۔

"نا، میں تو یوں کہوں گا، لو، بی بی جی، مجھے بھی پڑھا دو اپنی بی سی ٹی۔ بولو، کون سی کتاب لاؤں، پہلی کو دُوسری..... اے بس پانی بھریا یا جلدی جلدی" سب بکھے اور آ بیٹھا پڑھنے۔ اور ہاں یہ بھی تو پوچھوں گا کہ بی بی جی، جب میں نہیں پڑھوں گا تو میرے کان بھی کھینچ دے کروں گی تم کہ نہیں؟"

"اور جد دن بی بی جی نے نہ پڑھایا تو پھر کس کے کان کھینچیں گے؟" چھدن کو اس سوال نے پریشان کیا۔

"ارے، وِد دن ہم پچھلا سبک دُہرا لیا کریں گے، ایف ٹی ٹی، ملا جی نے گدھیا پٹی!"

"اب چھوڑ سالی لونڈیا کا چکر! تو تو اُس سے دوستی گانٹھ۔" عزیز نے راہ بتائی۔ "اس نیکر باز سے، وہ جو اُس کا بھائی ہے۔"

"گھبراتا کیوں ہے، شیر، دونوں سے لے دوستی گنٹھی وی!..... سدیخ ہے میرا نام، کوئی ایسی ویسی بات تھوڑی ہے!"

صدیق چند کارنامے گنوانا چاہتا تھا جن کی وجہ سے اُس کے نام کی ساکھ قائم ہوئی تھی، لیکن اُسے دُور سے پشاوری خان مع اپنے سونٹے کے آتا نظر آیا۔ چھ مہینے سے خان اپنے بیس روپوں کا تقاضا کر رہا تھا، اور جب سے وہ منھ چھپاتا پھرتا تھا، چنانچہ صدیق فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، بلکہ ایسے چل دیا جیسے بڑی دیر سے تلا بیٹھا ہو۔

جب چاروں کی متفقہ عرض داشت سے بھی صدیق نہ رُکا تو چھدن نے پکار کے یاد دلایا: "اب دوستوں کو مت بھولیو!" صدیق گلی میں مڑتے مڑتے رک گیا اور پیچھے پلٹ کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "واہ! سب سے پہلے!"

(۷)

مراری، فاخر، وشنو سب ٹھیک وقت پہ حکیم محبوب علی کی بیٹھک میں پہنچ گئے تھے۔ انتظار کرتے کرتے بھی انہیں آدھ گھنٹہ ہو گیا تھا، لیکن اشرف کا ابھی تک کوئی پتا نہ

تھا۔ وشنو کو خاص طور سے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ ٹھیک دوپہر میں جلتا بلتا تو وہ وہاں پہنچا اور اشرف کو دیکھو تو غائب ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کے وہ تو یہ سوچنے لگا تھا کہ لاؤ تھوڑی دیر کو حکیم جی کو ہی بٹھالیں، دیکھتے دیکھتے انہیں پتے چلنا تو آ ہی گیا ہو گا، جب اشرف آ جائے گا تو حکیم جی کو چھوڑ دیں گے۔ لیکن ابھی اُس نے منھ سے بات بھی نہ نکالی تھی کہ اشرف آ پہنچا۔ مگر آیا بھی تو پہیلیاں بجھواتا ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی فاخر اور مراری دونوں نے ایک ساتھ ڈانٹا: "کیوں بے، کہاں پھر رہا ہے دوپہر میں خاک چھانتا وا؟ مگر یہ نہیں کہ ٹھیک طرح جواب دے، پانچوں سے معافی مانگے، اُلٹا کہتا ہے، یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ، اب بھلا اس سے کوئی کیا سمجھے!"

مراری نے پوچھا: "لا دکھا، کیا دکھا رہا ہے۔" پھر بھی وہی جواب دیتا ہے: "یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ!"

جب تین چار دفعہ یہی اُلٹ پھیر ہو چکی تو فاخر نے جھنجلا کے کہا: "ہٹاؤ بے، یہ تو گھاس کھا گیا ہے!..... گرمی بہت پڑ رئی ہے، سر پہ برف رکھ، بھئی برف!"

جب اُسے شکست دینے کے ارادے سے سب نے اُدھر منھ پھیر لیا تو اشرف کو ذرا مصالحت آمیز رویہ اختیار کرنا پڑا۔ "بھئی ایک سیمپل تو دیکھ چکے، لو اب دُوسرا دیکھو!"

"کہیں سے بنوا کے لایا ہے سیمپل، جو آیا ہے بڑا زور دکھاتا؟" مراری نے کچھ تجسس اور کچھ بیزاری کے ساتھ کہا۔

"اجی، بنا بنایا منگوایا ہے، اب آیا جاتا ہے شام تک!"

"شام کی شام کو دیکھی جائے گی۔" وشنو نے ڈبے میں سے پتے نکالتے ہوئے کہا: "تو بیٹھ مراری کے سامنے۔"

"اچھا تو پھر نہیں سنتے ہو خوش خبری؟" اشرف نے للچایا۔ "اچھا، جانے دو، مت سنو، تمہاری مرضی۔"

"اچھا چل سنا۔ اس سے بھی نمٹ کسی طرح۔" آ تو گیا تھا فاخر بھی لالچ میں، لیکن اُس نے اشرف پر احسان رکھ دیا۔

"ابھی جب میں یہاں آ رہا تھا نا۔" اشرف نے مزے لے لے کے سنانا شروع کیا۔ "تو راستہ میں پادری صاحب مل گئے۔ بڑی دیر اُلجھائے رکھا۔ انہوں نے باتوں میں، بتا رہے تھے کہ آج شام کو تو وہ آ رئی ہے اُن کی بیٹی!"

"ابے، بس یہی تھا تیرا سیمپل؟" مراری کو تو کچھ نااُمیدی سی ہوئی۔ "ویسی ہی ہوگی جیسا اُن کا لونڈا ہے بانگڑو، موٹی موٹی ناک والا، کلیٹر۔"

"نہیں بھئی، سانولا تو ہے، لیکن ہے نمکین!" فاخر نے انصاف پروری کا تقاضا کیا۔

"کیوں بھئی، حکیم جی، تمہاری کیا رائے ہے؟"

"حکیم جی تھوڑی دیر سوچتے رہے کہ کسے خوش کروں۔ پھر بولے: "یار نمکین بھی سہی، لیکن ایسی کیا بات دیکھ لی ہے تو نے اُس میں جو رات دِن اُسی کے پیچھے پھرے ہے؟"

"وفا — دا — ری بشرطے — اُست واری۔ اصلے ایمان ہے مرے بت خانہ میں تو — کابے میں — گاڑو — برہمن کو۔" وشنو نے بڑے سنبھال سنبھال کے پڑھا جیسے کوئی بھرا ہوا گھڑا لے کے چل رہا ہو اور احتیاط تھی بھی لازمی، اتنی مشکل سے تو یاد کیا تھا اعلیٰ قابلیت کے امتحان کے لیے۔

"ارے، بات ہو رئی تھی کہاں کی، اور پہنچ گئے کہاں!" اشرف نے جھنجھوڑا۔

"کیا بات کریں، ہمیں تو کچھ پسند نا آئی۔" مراری کی بدیقینی بدستور قائم تھی۔

"پہلے دیکھ تو لو لالہ جی، کہ یوں ہی کہہ دیا پسند نا آئی۔" اشرف کو مراری سے ہمیشہ بدمذاقی کی شکایت رہی تھی۔ "ذرا فاخر سے تو پوچھو، پھر کہنا۔"

"واقعی، یہ تھوڑی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پادرن کی بیٹی ہے۔" فاخر نے فوراً سند لکھ دی۔ "بڑی گوری ہے، ناک نقشہ بھی بالکل الگ ہے..... میں نے تو ڈیوڑ کے گھر دو ایک دفعہ جھلک سی دیکھی ہے..... ہے یار، بڑی زور دار!"

"ارے، ذرا اُس کی ادائیں دیکھو، کیا لچکتی ہے چنبیلی کی طرح!" اشرف نے آگ پہ تیل چھڑکا۔

"ارے، ابھی سے کیا دَم دیئے دے رہے ہو؟" پنڈت وشنودت نے فلسفیت اختیار کرلی۔ "ابھی تو بالکل سپاٹ ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جراتِ رندانہ پہ ہنسے۔

"آنکھیں ہیں تمہاری منھ پہ پنڈت جی، کہ کچھ اور؟" اشرف کو غصہ آ رہا تھا کہ لو، یہ ساری اُمیدوں کا خون کرنے پہ ہی تل گئے۔ "کہیں امتحان کے دِنوں میں تو نہیں دیکھا تھا؟ کہہ رئے ہیں سپاٹ ہے! ارے، دیکھو گے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

بھئی ایک ہی دفعہ تو دیکھا ہے ہم نے۔" وشنو نے عذرِ گناہ پیش کیا۔ "پادرن اور وہ جاری تھیں کہ میں گھر میں سے نکل پایا۔ وہ دونوں آگے نکل گئی تھیں جب میں باہر نکلا

ہوں تو..... اچھا، ایک بات ہے، یہ تو ماننی پڑے گی۔ فراک پیچھے سے پھٹ رہا تھا، میں نے خود دیکھا تھا۔"

"خیر، یہ بات تو معاف ہو جائے گی۔" حکیم جی نے بیچ بچاؤ کیا۔ "تمہیں آم کھانے ہیں کہ پیڑ گننے ہیں..... ویسے بھی اپنے صاحب بہادر ذرا ہیں بے چارے پھینچر۔"

"پھینچر تو ہیں۔" اتنی بات پر تو مراری کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ "کبھی اُن کی ڈینگیں بھی سنی ہیں؟ کیسی کیسی چھوڑی ہی لمبی، میں نے کلکٹر صاحب سے یہ کہہ دیا اور گورنر صاحب سے وہ کہہ دیا، فلاں جگہ یوں پہنچا اور ڈھمکی جگہ یوں گیا۔"

فاخر بے چین ہو کے بولا۔ "ارے اُس کا حال تو میں سناؤں گا۔ بارھویں دفعہ یا تیرھویں دفعہ؟ ایک پادری صاحب ہی کیا، اُن کا تو گھر بھر ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اُن کے ہاں بیٹھے ہو تو اماں اپنے بیٹے کو پکاریں گی، ڈیوڈ، کہو بھئی آج کیا پروگرام ہے؟ بیٹے صاحب جواب دیں گے، ماما آج تو پسندے لیاؤں؟ اماں کہیں گی، اچھا تو پھر جلدی کر لو، میں مسالہ پیستی ہوں۔ دوپہر کو جا کے دیکھو تو مسور کی دال کھا رہے ہوں گے بیٹھے۔"

بہرحال اس دفعہ بھی سب لوگ ہنس پڑے۔

"اور انگریزی بولنے کا کیسا شوق ہے اُن کی ماما کو!" مراری بھی شاید کوئی قصہ سنانا چاہتا تھا۔

"مگر یار۔" اشرف بیچ میں بول اٹھا۔ "اُن کی بیٹی بڑی نفیس انگریزی بولتی ہے۔ ایک دن اُسے کرسی چاہیے تھی، باہر دھوپ میں بیٹھنے کو، میں نے اُسے اپنی کرسی دے دی کہ لیجیے یہ لے لیجیے۔ کرسی لے کے کہنے لگی، "تھینک یو۔"

"اچھا، تو یہ انگریزی ہو گئی؟" حکیم جی نے آگے بات سننے کا انتظار کیے بغیر اعتراض جڑ دیا۔ "ابے، اِتی تو مجھے بھی آتی ہے۔"

"جبھی تو ہم منع کر رئے تھے تم عربی مت پڑھو!" اشرف بگڑ اٹھا۔ "عقل چکرا گئی نا تمہاری! آدمی پوری بات سُن لے جبھی بولے..... میں تو کہہ رہا تھا کہ وہ بالکل ایسے بولی جیسے انگریز بولتے ہیں۔" اشرف کی طبیعت بڑی جلدی بحالی پر آ گئی۔ "مجھ سے تو بڑی باتیں رہی ہیں نا اُس کی! کہہ رہی تھی کہ آپ کی باتوں میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

"دیکھ رئے ہو بھئی، دیکھ رئے ہو!" فاخر نے سب کو جگایا۔ "گئے یہ بھی ہاتھوں سے اب!..... کیوں، بے، ہم بھی تو جاویں ہیں وہاں، آخر ہم سے کیوں نہ بولی؟ ہمارے تو

پاس بھی نہ پھٹکی، دُور ہی دُور سے جھلک دکھاتی رہی۔"

"ارے، تم جھوٹ سمجھ رہے ہو؟" اشرف نے معصوم بن کے یقین دلانا چاہا۔ "میں تو پان مانگ مانگ کے کھاتا ہوں اُس سے!"

"کبھی کبھی پیار بھی تو مانگ لیتے ہو گے!" مراری نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اچھا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے نہیں بولتی تو دُنیا بھر سے نہیں بولتی؟..... وہ ستے کا ہے نا صدیق، اُس سے تو باقاعدہ ہنسی مذاق ہوتا ہے۔"

"اچھا، تو تم بیٹھے سنتے رہتے ہو گے؟" مراری نے بیزار ہو کے سر ہلایا "پرائی ویٹ سکڑی ہونا تم تو!"

"میں کیوں بیٹھا سنتا، وہ خود جو بتا رہا تھا صدیق..... اُس سے تو اور یہ کہتی ہے کہ لے، میں جھولے پہ بیٹھوں تو مجھے جھونٹے دیتا جا!"

"لو بھئی۔ دو چھانٹے اس نے سارے قصبے میں گبرو!" فاخر نے نتیجے کا اعلان کیا۔ "یہ اور صدیق! اچھی جوڑی ہے!..... خیر کوئی بات نہیں ہے بیٹا، کما کھاؤ گے۔"

"اچھا، یہی بات ہے تو شرط بدلو اسی وقت پانچ پانچ روپے کی!" اشرف کی ایسی شکی طبیعتوں سے بڑی کراہت ہو رہی تھی۔ "یا تو تم اس سے پان مانگ کے دکھا دو یا میں دکھا دُوں..... بولو، مارتے ہو ہاتھ پہ ہاتھ؟"

"پان مانگنے میں کیا ہے۔" وشنو ایسے بول اُٹھا جیسے بڑی دیر سے مقابلے کی شرائط پر غور و خوض کرتا رہا ہو، اور یکایک کوئی نکتہ سمجھ میں آگیا ہو۔ "مل جائے جب بات ہے۔"

"ہاں ہاں! مل جائے!..... بولو، ہے ہمت؟"

"ناں بھیا ناں، ہم میں نا ہے ہمت!" مراری نے مشترکہ جواب دیا۔ "تو ہی بڑا سہی! تیری تو چمارنیں بھی تعریف کریں ہیں جنگل جاتے ہیں۔"

اشرف اتنا بدمزہ ہوا کہ اُس نے سگریٹ نکال کے سلگائی اور تھوڑی دیر صرف ہوا سے کھڑکیوں کے کواڑ چرچرانے کی آواز آتی رہی۔

"اُس کے ہاتھ سے پان کھانے کی..... اچھا، ہم نے بھی ایک ترکیب سوچ لی ہے۔" فاخر نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ڈیوڈ سے ہم نے یہ تو طے ہی کر لیا ہے کہ بھئی، تم ہمیں گانا سکھاؤ اور ہم تمھیں اُردو پڑھائیں۔ اب اُس سے کہیں گے کہ لاؤ ساتھ ساتھ تمھاری بہن کو بھی پڑھا دیں۔ اچھا ہے، چھٹیوں میں اُردو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کون! تم پڑھاؤ گے اُردو؟" اشرف نے قہریلی نظروں سے اپنے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگرٹ کی طرف دیکھا۔ "اُس دِن کیا مطلب بیان کر رہے تھے، غالب کے اُس شعر کا؟"

"اَرے حجت باجی سے کیا لینا میرے یار۔" مراری نے فاخر کو روکا۔ "ایسا ہی تجھے پان کھانا ٹھہرا اُس کے ہاتھ سے تو کون سی مشکل بات ہے! روز لے جاویں ہیں پادری صاحب کو مفت اپنی لاری میں، اب یہ نا کرسکتے ہیں کہ اُن کی بیٹی سے پان مانگ کے کھا لیں؟"

"بولو، حکیم جی تمہیں بھی لے چلیں؟" کامیابی اور ظفر مندی کی فضا وشنو میں بھی سرایت کر گئی تھی۔

"واہ، ہم کیوں نہ چلیں گے؟ ہم تو تم سے بھی چار قدم آگے ہوں گے۔"

"ڈاڑھی سمیت، مولانا ڈاڑھی سمیت!" فاخر کے ہونٹوں سے تو ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ارے، ہم نے تو پہلے ہی سارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے، ڈاڑھی رکھ کے!" پھر حکیم جی نے اشرف کو منانے کی کوشش کی۔ "یار تجھے بھی لے چلیں گے، تو کیوں رنج کرتا ہے فضول!"

"ابے، پہلے خود تو جاؤ، پھر اَوروں کو لے جانا!" یہ کہتے ہوئے اشرف اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا بھئی وشنو یار، اب چل دیے۔ کتاب ختم کرنی ہے۔"

"کیوں بھئی، برا مان گیا؟" مراری نے پوچھا۔ "دیکھ، یہ نہیں بدی ہے۔"

"نہیں، برا کس بات کا ماننا تھا..... یہ تو ویسے ہی عادت ہے تم لوگوں کی، بے کار بحث کرنے کی۔"

اشرف کے جانے کے بعد پہلے تو بڑی مضطرب سی خاموشی طاری رہی پھر فاخر نے کچھ مجرمانہ انداز میں کہا۔ "واقعی برا مان گیا!"

سب کی آنکھیں کچھ شرما سی گئیں، اور پھر سب چپ ہوگئے۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہر آدمی کو ایک نہ ایک کام یاد آگیا۔

جب مراری باہر نکلنے لگا تو فاخر نے جھجکتے اور رُکتے ہوئے کہا۔ "یار مراری، اب کے تمہاری لاری کو کسی دن چھٹی ہو تو کہیں سیر کو چلو..... پادری صاحب کے گھر والوں کو

بھی لے چلیں گے، ہرج کیا ہے؟ ذرا سیر ہو جائے گی۔"

"اچھی بات ہے، سب دیکھی جاگی۔" مراری نے مبہم سے لہجہ میں کہا۔ "پہلے آنے تو دے سالی کو!"

(۸)

اگلے دِن صبح کو —

شیخ حفاظت علی صدیق کو گالیاں دے رہے تھے کہ ایک تو کل دِن بھر پانی نہیں لایا اور آج بھی حرام خور غائب ہے۔

کریما آٹا لینے کو جھکا تو اُسے مٹکے کے پیچھے چمیلی کے تیل کا نیا پوا نظر آیا۔ تب جا کے اُس کی سمجھ میں آیا کہ یہ آٹھ انار کیوں غائب تھے اور رات کو عنایت چادر اوڑھ کے کیوں نکلا تھا۔

عزیز کا دھیان تو بالکل اپنے کام کی طرف تھا، لیکن بار بار اُس کے ہاتھ میں سوئی چبھ جاتی تھی، حالانکہ ماسٹر اُسے کئی دفعہ ڈانٹ بھی چکے تھے کہ قمیص پہ خون کے دھبے پڑے جا رہے ہیں، گاہک ناراض ہو گا۔

مولو کی ماں کو تعجب تھا کہ آج یہ اتنے سویرے کیسے اُٹھ بیٹھا، اور بزار کو بھاگا بھی ایسے تیزی میں کہ آدھ پا تیل تو یوں ہی چھلک گیا۔

چھدن کے پاس ایک دھوبن کے جھانجن ٹھیک ہونے کو آئے تھے۔ اُس نے دو ایک گھونگروؤ اُٹھا کے اپنے صندوقچے میں ڈال دیے کہ دھوبن کوئی گھونگروؤں کو گنے گی تھوڑی، اچھا ہے کبھی کوئی تعویذ یا ایسی کوئی چھوٹی موٹی چیز بنانی ہو تو کام آ جائیں گے۔

حکیم محبوب علی نے نو بجے ہی اپنے مطب کے مریضوں کو رخصت کر دیا کہ میرے دو تین نمونیا کے مریض پڑے ہیں، انہیں دیکھنے جانا ہے۔

لالہ مٹھن لال پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ مراری نہ تو کل شام لاری کے آنے کے وقت اڈے پہ پہنچا، نہ صبح لاری جانے کے وقت۔ نہ معلوم ڈرائیور اور کلینر نے کتنے پیسے اڑا لیے ہوں گے؟

وشنو نے اپنے شاگردوں کو چھ اُٹھے بیالیس بتائے اور یوپی کی راج دھانی کلکتہ۔

اشرف نے حجامت بنانی شروع کی تو گھنٹوں اسی میں لگ گئے۔ اماں چیختی رہیں کہ چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے، سب پی پلا بھی چکے، لیکن اُس نے جواب دیا تو یہ کہ میرے

دونوں پتلون گھس گئے، آج ہی مجھے کپڑا منگوا کے دو، میں کیا پہن کے آؤں جاؤں کہیں
— ؟

رات کو بارہ بارہ بجے گھر لوٹنا، اور پھر صبح کو آٹھ بجے تک پڑے سونا! یہ لچھن ہیں
تو اس سال بھی پاس ہونا معلوم! فاخر کے والد خوب سمجھتے تھے کہ اصل فساد کی جڑ وہی
پادری کا لونڈا ہے۔ رات کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کی بہن بھی آگئی ہے۔ چلیے، بس اب تو اللہ
ہی مالک ہے!

(۹)

۱۳ مئی ساڑھے بارہ بجے رات۔

چاندنی ہے یا کہ سیلاب جنوں، سونے ہی نہیں دیتی۔ کروٹوں پہ کروٹیں بدلیں،
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ رکھ کے لیٹا، لیکن چاند کے مضمحل اور غم زدہ چہرہ کو نیم کی سوکھی ہوئی
شاخ نے اس طرح آغوش میں لے رکھا ہے کہ دیکھے بغیر چین ہی نہیں آتا اور جب نظر
بھر کے دیکھتا ہوں تو دِل میں ایک ٹیس اُٹھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چاند کی سرزمین تو مُردہ ہو
چکی ہے، پھر کیوں اس کے چہرے پر حسرت برستی ہے۔ وہ کون سی تمنائیں ہیں، جنھوں نے
اُسے گھلا گھلا کے زرد کر دیا ہے؟ وہ کون سے خواب تھے جو پورے نہ ہو سکے؟ وہ کون سی
نامرادیاں تھیں جنھوں نے اُس کی صورت ایسی الم ناک بنا دی جیسے کسی نوخیز دوشیزہ کا دم
واپسیں؟..... ان تمام حسرتوں اور نامرادیوں کا بوجھ تجھے اپنے سینے پر اٹھانا تو پڑ رہا ہے، لیکن
یہ تو سوچ اے چاند، کہ یہ قربانی کر کے تو کتنا بڑا کام سرانجام دے رہا ہے۔ آدھی رات
کے تاریک آسمانوں پر تو کبھی کبھی نمودار نہ ہو جایا کرتا تو دُکھے ہوئے دِل ایک ہمدم اور ہم
نفس سے بھی محروم رہ جاتے!

ہاں، تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ چاند نے میری نیند حرام کر دی اور میں مجبور ہو گیا کہ
اُٹھ بیٹھوں، اور دو ایک صفحے لکھ کر اپنی وحشت کو دُور کروں یا کم سے کم تھوڑی دیر کے
لیے بھول ہی جاؤں، لیکن اب لکھنے بیٹھ گیا ہوں تو یہ اُلجھن ہے کہ لکھوں کیا؟ جب ساز ہی
ٹوٹ گیا تو اُس میں سے آواز کیا نکلے؟ جب شمع بجھ ہی گئی تو رُوشنی کیسے ہو؟ ابھی کچھ دِنوں
پہلے کی بات ہے کہ لکھنے بیٹھتا تھا تو صفحے کے صفحے کالے کر ڈالتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ
قلم چل کے ہی نہیں دیتا ۔

تھی وہ اِک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

یہ پہلا مصرع میں نے غلط لکھا، اصل بات یہ ہے کہ جس دِل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل

نہیں رہا۔ اب نہ وہ چبھن، وہ کھٹک، وہ خلش ہوتی ہے، نہ اس میں وہ مزہ آتا ہے۔ دو سال پہلے جب میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ میری زندگی ایک نرم رَو چشمے کی طرح ہوگی جس کے کنارے پھولوں کی بوچھار کرنے والے درخت سایہ فگن ہوں گے اور وہاں چڑیاں آ آ کر اپنے شیریں نغمے سنایا کریں گی۔ لیکن اب اُس زمانہ کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کتنا جذباتی تھا میں اُس وقت! سب ناپختگی کی باتیں تھیں۔ اب جا کے پتا چلا ہے کہ زندگی تو ایک سراب ہے — ایک لق و دق ریگستان، جس میں حیران و سرگرداں پھرے جاؤ، کسی مونس و غم خوار کی شکل تک نظر نہیں آئے گی، کوئی ملا بھی ہو تو ہولناک عفریت اور گھناؤنی رُوحیں! جب سے آنکھوں نے یہ حقیقت دیکھی ہے، سیسے کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب دل میں کوئی آرزو ہی نہیں پیدا ہوتی۔ زندگی ایک خلا بن کے رہ گئی ہے، لیکن اب تو اُسے پُر کرنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ چنانچہ مثال کے طور پر آج ہی کا واقعہ ہے۔ چھ مہینے پہلے یہی بات پیش آتی تو میرا دِل بلیوں اچھلنے لگتا۔ ایسی بے کلی رہتی کہ رات کو گھنٹوں چھت پہ ٹہلتا، لیکن اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ دِل میں تھوڑا سا تموج تو ضرور ہوا مگر اطمینان سے دس بجے پلنگ پہ آلیٹا۔

آج ہوا یہ کہ میں باہر ٹہل ٹہل کے شیلی کی نظمیں پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں دیکھتا ہوں تو مسز جیکسن چلی آ رہی ہیں، اور اُن کے پیچھے ایک لڑکی ہے، ہرے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے چہرے پر ایسی صباحت کہ معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی دیوی نے اپنا سارا نور اُس پر نچھاور کر دیا ہے، پھر ناک کے اِدھر اُدھر تھوڑی سی سرخی، جو مجھے دیکھتے ہی شرم کی وجہ سے اور تمتما اُٹھی تھی، جیسے ایک دَم سے دیے جل گئے ہوں۔ ہوا نے ایک طرف سے ساڑھی کو بدن سے چپکا دیا تھا اور وہ بازو کے رُوح پرور گداز کی غمازی کر رہی تھی۔ حیا کے مارے وہ سکڑی سمٹی جا رہی تھی، بدن چرا رہی تھی۔ نگاہوں تک کے لمس سے بچنا چاہ رہی تھی مگر اُس کی جلوہ سامانیاں اور افسوں خیزیاں تھیں کہ انتقاماً اور نمایاں ہو رہی تھیں — اور نمودار ہو رہی تھیں۔ میں نے دِل میں کہا — مگر اُس وقت ہوش کسے تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں رہی تھی کہ میں کسے دیکھ رہا ہوں، کیا دیکھ رہا ہوں — ہاں البتہ جب برق جمال کوند کر نکل گئی تو بے اختیار یہ شعر میری زبان پر آگیا:

نگاہوں کو دے دے مجالِ تماشا
کہ جلوے ترے رائیگاں جا رہے ہیں

دامن کو سر پہ اچھی طرح سے اوڑھ کے اُس نے ساڑھی کو ٹھوڑی کے قریب ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا اور اس طرح اُس کے چہرے کے گرد ایک سبز رنگ کا ہالہ بن گیا تھا جیسے ہری ہری پتیوں کے بیچ میں سرخ گلاب! ہاں، اس کے سوا میں اسے اور کیا کہہ سکتا ہوں — گلاب!..... ساڑھی میں سے جو تھوڑے سے بال نکلے ہوئے تھے وہ بھونرے جیسے کالے اور چمکیلے تھے، بائیں طرف کو شفاف دُودھیا مانگ نکلی ہوئی تھی، روشنی کا عکس جو پڑ رہا تھا تو بالوں پر پٹ بیجنے سے اڑ رہے تھے۔ ہری ساڑھی اور چنبیلی جیسے ماتھے کے بیچ میں یہ سیاہ چمک دار بالوں کا حاشیہ عجب بہار دکھا رہا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی کالی پلکیں جب اُوپر اٹھتی تھیں تو اُس کے بھولے بھولے معصوم حسن میں وقار اور متانت کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور نامعلوم گہرائیاں تو اُن میں کس بلا کی تھیں — ازلی اور اَبدی گہرائیاں! ناپیدا کنار گہرائیاں! مدہوش کن گہرائیاں۔ مجھے تو ایسی گھنی سی چڑھی کہ جی چاہا بس دونوں جہان سے غافل ہو کے آنکھیں بند کر لوں اور ان گہرائیوں میں غوطہ لگا دُوں، ڈوبتا چلا جاؤں — اور نیچے، اور نیچے — نہ معلوم کہاں! یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو ان پہنائیوں میں غرق کر دُوں، اور پھر کبھی میرا کوئی سراغ نہ ملے..... میں تجھے کیسے بتاؤں، اے میری زندگی، کہ تو نے مجھے ایک نگاہ میں کن وسعتوں سے ہم کنار و ہم آغوش کر دیا..... جب اُس کی ماں ذرا آگے بڑھیں تو وہ بالکل میرے سامنے آگئی۔ مجھے اس طرف اپنے مقابل پا کر وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گئی اور آنکھیں اُٹھا کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ذرا غیریت نہیں تھی، اور نہ یہ حیرت کہ میرے سامنے کون آگیا۔ بلکہ اُس کی نگاہوں سے تو یہ ٹپکتا تھا جیسے اسے مجھے یہاں پانے کی توقع ہو، اور اب یہ حیرت ہو رہی ہو کہ سچ مچ توقع پوری ہوئی۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میری آنکھوں سے کوئی مسرت یا اشتیاق ظاہر نہ ہونے پائے، لیکن میں اُس وقت آپے میں کب تھا؟ نہ جانے میری آنکھوں نے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہو — بے چین اور بے صبر آنکھیں!..... اُس نے میری طرف نظر بھر کے تو دیکھا — مجھے تو درحقیقت یہ لمحہ صدیوں کے برابر معلوم ہوا — مگر پھر اُس نے فوراً آنکھیں نیچی کر لیں، گویا مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میری رُوح نے تمہاری رُوح کی سرگوشیاں سُن لی ہیں۔ تم نے اس وقت جو آتشیں نغمہ گایا ہے اُس سے میرے بھی دِل کے تار لرز اٹھے ہیں، لیکن یہ تو سوچو کہ میں رسوم و قیود کی زنجیری ہوں، مَیں نیلی نیلی فضاؤں میں اڑنے والی سنہری چڑیا نہیں ہوں، بلکہ رسم و رواج کی قیدی ہوں، سماج کے سنگین قلعہ میں زندانی ہوں۔ مجھے

لینے کے لیے تو تمہیں ہزار خطروں سے گزر کر آنا پڑے گا، اپنی چھوٹی سی کشتی میں یکہ و تنہا ذخار و مواج اور ہلاکت خیز سمندروں کا مقابلہ کرنا پڑے گا، آہنی پہاڑوں سے سر ٹکرانا ہو گا، تب کہیں میری دیوار کے نیچے پہنچ سکو گے! مگر میری روح تیرے ساتھ رہے گی اے میرے جاں باز، میں اپنی کھڑکی سے لگی بیٹھی رہوں گی اور ویران سمندر کی ہیبت ناک موجوں کو تکتی رہا کروں گی۔ میں صدیوں تیرا انتظار کروں گی، میرے دلاور سپاہی! اور جب تو ساری مشکلات پر فتح یاب ہو کر آ پہنچے گا تو میں ہوا کے نرم جھونکے کی طرح تجھ سے آملوں گی۔ ہمارے پیروں میں پر لگ جائیں گے اور ہم ساتھ ساتھ اُڑتے ہوئے رسم و رواج کی پابندیوں سے روایت اور قانون کی غلامی سے، مذہب اور سماج کی گرفت سے دُور نکل جائیں گے — بہت دُور، اُن گم نام سرزمینوں میں، جہاں حسن و شباب جاودانی ہیں، جہاں آدمی آزادی سے سانس لے سکتا ہے، جہاں صرف ایک معبود ہے — محبّت!

یہ تھا وہ پیغام جو اس کی محویت اور سرشاری سے بند آنکھوں نے مجھے دیا ایک لمحے کے لیے اس کا سارا جسم تفکر میں ڈوب گیا اور وہ اپنی جگہ جم کے رہ گئی۔ پھر اس نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو وہاں سے الگ کیا، اور اپنی ماں کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔

میرے اوپر بڑی دیر ایک سکتے کا سا عالم طاری رہا، اور میں اُس کی خوشبو ہوا میں سے چن چن کر اپنے سانس میں جذب کرتا رہا۔ آخر میرا سارا وجود ایک مبہم سی ہنسی کے سرسرانے سے لرز اٹھا، اور میں نے یہ محسوس کیا جیسے میری رُوح کے دروازے کھل گئے ہوں، پھر میں ٹہل ٹہل کے کچھ گنگنانے لگا لیکن میری ذہنی کیفیت میں جو فرق پچھلے چھ ماہ میں واقع ہوا ہے، وہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے تو ایسے موقع پر میں حافظ کا شعر گن گناتا:

اِلا اے سارباںِ محمل دوست
الی رُکبا نکم طال اشتیاقی !

لیکن اس موقع پر کوئی شعر میری زبان پر آیا بھی تو کیا۔ بائرن کی اُس نظم کا ایک بند، جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے:

تھی بنی رات پیار کرنے کو
اور دن لوٹتا ہے کتنے جلد
چاند کی رَوشنی میں لیکن ہم
اب ٹہلنے کبھی نہ جائیں گے !

لیکن مجھے اس کیفیت سے زیادہ ڈر نہیں ہے کیونکہ یہ تو بالکل عارضی چیز معلوم ہوتی ہے اور پھر اب تو مجھے ایک سہارا بھی مل گیا ہے۔ (ہاں، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسز جیکسن کی بیٹی ہے اور اس کا نام گلیڈس ہے)۔ اس کے چہرے سے جو ذہانت آشکار ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ بھی میری تمناؤں کا خیر مقدم کرے گی، بلکہ اُسے جو کچھ جواب دینا تھا وہ تو اُس کی نگاہوں نے مجھے آج ہی دے دیا۔ آخر اُس کی رُوح بھی تو ایک ہم نفس کی متلاشی ہوگی اور آمنا سامنا ہوتے ہی پہچان گئی۔ اب میری زندگی میں دوبارہ بہار آئے گی۔ میری زندگی کے سوکھے ہوئے سرچشمے دوبارہ پھوٹ نکلیں گے! وہ مجھے مل جائے گی تو میں کیا کیا نہ کر ڈالوں گا، اور میرے ساتھ رہ کر اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی بر سر کار آئیں گی۔ میں اُس کے دماغ کی تربیت کروں گا۔ حقیقت اور صداقت کا نور اُس کی رُوح میں داخل کروں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ رسم و رواج نے، قانون اور سماجی اداروں نے، حکمرانوں اور پروہتوں نے انسان کو کیسا غلام بنا رکھا ہے، انسان کی رُوح کو کچل رکھا ہے۔ ہمیں ان بندھنوں کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ پھینکنا ہے۔ ہمیں انسان کو پھر وہی آزادی دینی ہے جو فطرت نے اُسے بخشی ہے۔ ہمیں ایک نئی دُنیا تعمیر کرنی ہے جہاں سونے چاندی کی، نفع و ضرر کی پرستش نہیں ہوگی، جہاں جھوٹے خدا نہیں پوجے جائیں گے، اور اگر کوئی چیز ایسی ہوئی جس کے سامنے سر جھکایا جائے، تو وہ ہے انسانیت اور مُحبّت! اس دُنیا میں سب برابر ہوں گے، نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا۔ انسان کے دماغ سے ہر قسم کی جہالت اور حماقت کی دُھند دُور ہو چکی ہوگی، بس ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگی۔ ہر طرف مُحبّت کا دَور دورہ ہوگا اور صحیح معنے میں دُنیا کا زریں دَور آجائے گا۔ میں اُس سے کہوں گا آؤ گلیڈس! ہم اس دُنیا کی تعمیر کے لیے دوش بدوش جدوجہد کریں۔ وہ جان و دِل سے راضی ہو جائے گی۔ ہم تکلیفیں اٹھائیں گے، مصیبتیں جھیلیں گے اور ضرورت پڑی تو ایک دُوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے پھانسی کے تختے پر چڑھ جائیں گے، لیکن ہمارا قدم پیچھے نہیں ہٹے گا۔ ہماری کوششوں سے جو انقلاب رُونما ہوگا، اس سے دُنیا کی کایا پلٹ جائے گی اور مُحبّت بھرے دِل ہمیشہ ہمارا نام وردِ زبان رکھیں گے، لیکن ہم تحسین و آفرین کی خاطر جدوجہد نہیں کریں گے، بلکہ مُحبّت کی خاطر — صرف مُحبّت کی خاطر!

تو میرے ساتھ ہو تو میں کیا نہیں کر سکتا! میں تجھے ضرور حاصل کر کے رہوں گا میری جان، میری رُوح! میرا انتظار کر، میں آ رہا ہوں، میں آ کر تجھے رسم و رواج کے پنجے

سے چھڑاؤں گا، میں تیرے لیے ہر خطرے کا مقابلہ کروں گا۔ مَیں راتوں کو تیری کھڑکی کے نیچے دیوانہ وار پھروں گا، جب ساری دُنیا سوتی ہوگی تو میرا سرودِ شبانہ فضا میں گونجا کرے گا۔ میں چمپا کی مہک میں گھل مل کر تیرے بستر پر جا پہنچوں گا، میرے جلتے ہوئے بوسے تیرے اندر ایک طمانیت کا احساس پیدا کر دیں گے، تیرا نیم رَس سینہ میرا تکیہ ہو گا اور تیرے سانس کی خوشبو میرے مشامِ جان کو معطر کر رہی ہو گی، ایسے میں مجھے موت بھی آ جائے تو ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

مگر نہیں تو تو مجھے زندگی دے گی — ترو تازہ زندگی، ہری بھری زندگی..... اس وقت تو نیند کی آغوش میں ہو گی میری محبوبہ! اچھا سوئے جا خوب میٹھی نیند سو، اور پیارے پیارے خواب دیکھ! میں اپنی آرزوؤں اور تمناؤں سے تجھے اس وقت پریشان نہیں کروں گا۔ اب تو میرا مستقبل اور تیرا مستقبل ایک دُوسرے سے وابستہ ہے!

---

۱۴ مئی، دس بجے صبح۔

میری بے بصری بھی حد سے گزر گئی۔ آخر میں کب تک سرابوں کے پیچھے دوڑا پھروں گا؟ میں کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے دھوکا کھا جاتا ہوں۔ دراصل میں اپنے خوابوں میں ایسا کھویا رہتا ہوں کہ حقیقت کا غور سے مشاہدہ اور مطالعہ کیے بغیر کوئی رائے قائم کر لیتا ہوں، اور اس کی بنیاد پر سربفلک عمارت کھڑی کر دیتا ہوں، بعد میں جب وہ عمارت کی عمارت ایک دم غائب ہو جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ میں تو پانی پر بنیاد رکھ رہا تھا۔ کتنی دفعہ دُودھ سے جل چکا ہوں لیکن پھر بھی پھونک کے نہیں پیتا۔ دیکھ چکا ہوں کہ ہر دفعہ ہوتا ہے وہی، شروع میں تو دعوتِ نظارہ دینا، کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کے اُکسانا، نگاہِ غلط انداز کی چاٹ پر لگانا، اور آخر میں بے رُخی اور بے التفاتی! — لیکن یہاں تو اتنی خوش فہمی کی بھی گنجائش موجود نہیں تھی، اور میں نے ٹھاٹھ باندھ دیے کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ نہ معلوم کل شام میں کیسے سمجھ بیٹھا کہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تو میرے لیے۔ آج صبح تو اس نے مجھے درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھا، بلکہ جان بوجھ کے بے اعتنائی برتی۔ صبح ہمارے مکان کے سامنے سے گزری تو مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا اور بھاگ کے اپنی ماں کے برابر پہنچ گئی۔ کیا اس نے مجھے ایسا ندیدہ سمجھا کہ میں اُس کی مرضی کے بغیر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کروں گا؟ ایسے سرپڑ کے مُحبّت تو میں نے کبھی کی ہی نہیں، یہ تو

خوشی کا سودا ہے اور وہ سمجھی کہ میں بھی اور لوگوں کی طرح اسے محض اپنی ہوس کا آلہ کار بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن اب میں اپنا دِل کیسے نکال کے کسی کے سامنے رکھ دُوں جو اسے یقین آئے؟ اور لڑکیاں اتنی سی بات سمجھ نہیں سکتیں، وہ تو بس یہ جانتی ہیں کہ جو کوئی اُن کی طرف گھورتا ہے، اس کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں مجھے تو بس یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اپنے حصے میں تو ازل سے محرومی آئی ہے۔ لڑکیاں مجھ جیسے آدمی کو سمجھ نہیں سکتیں، اور میں اپنے اصول ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا۔ قصہ ختم۔ میرا حال بے رنگ اور مستقبل دُور سے مذاق اڑاتا معلوم ہوتا ہے۔ رہا ماضی تو وہ بھی اب لوٹ کے آنے سے رہا اور ویسے بھی اس میں دھرا ہی کیا ہے، سوائے چند نامکمل یادوں کے۔ اور وہ بھی اب ماند پڑتی جا رہی ہیں، کب تک ساتھ دیں گی اور مجھے ساتھ رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جب میں نے دیکھ ہی لیا کہ زندگی محض ریت ہے، تو اب اس ریت میں کنواں کھودنے کی کوشش فضول ہے۔ بلکہ میں تو اس کوشش میں ہوں کہ میری زندگی زیادہ سے زیادہ بے رنگ بنتی چلی جائے، میری دِلچسپیاں کم سے کم رہ جائیں، میرے دِل میں کوئی تمنا رہے ہی نہ جو مجھے ستائے۔ میرا دماغ افیون کی پینک میں جھونٹے کھاتا رہے، اور بالکل کند ہو جائے اور میں ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح زندگی بسر کروں! اب یہ ہیں میرے عزائم تو!..... اب میری ساری ہمت اس پر صرف ہوگی..... تو پھر بھئی گلیڈس، تم مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟

---

۱۴ مئی، گیارہ بجے رات

صبح نہ معلوم میں کسی سے چڑا ہوا تھا یا کیا تھا، اُس بے چاری معصوم بچی معصومانہ سی حرکت پر اتنا بگڑ بیٹھا۔ مجھے اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ بھئی، آخر کو ہندوستانی لڑکی ہے، کچھ تو اُس کے اندر شرم و لحاظ ہونا ہی چاہیے۔ اب کیا وہ سڑک پہ مجھے گلے لگا لیتی؟ اس نے تو اچھا ہی کیا، مصلحت اندیشی برتی، اب اگر وہ میری طرف گھورنے لگتی تو نہ جانے کون دیکھتا، کون نہ دیکھتا، اور نہ جانے کیا کیا شبہے لوگوں کے دِل میں پیدا ہوتے۔ اس موقع پر تو بے اعتنائی کا اظہار ہی مناسب تھا اور میں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا! یہ خواب مجھے لے ڈوبیں گے ایک دن..... اب وہ کوئی میری طرح ذہنی طور پر آزاد تو ہے نہیں۔ اُس کی تربیت اُسی روایت زدہ ماحول میں ہوئی ہے، جہاں دِلوں پہ پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اب اس تربیت کا کچھ تو اثر ہونا لازمی ہے۔ سڑک پر اس نے ضرور بے رُخی برتی اور یہ بات تھی

بھی قاعدے کی، لیکن شام کو جب وہ ہمارے یہاں آئی تو اس کا رویہ بالکل دُوسرا تھا۔ میرے قریب سے گزری تو نہ تو جھجکی اور نہ اُس نے بدن چرایا، بلکہ دو دفعہ میری طرف نظر بھر کے دیکھا اور بغیر کسی جھینپ کے آج پھر اُس کی نگاہوں میں وُہی مانوسیت تھی، بلکہ آج تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مانوسیت اتنی پرُانی ہو چکی ہے کہ اب تو عادت بن گئی ہے۔ مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا کہ بڑی نرم و نازک سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی ہے۔ غرض کہ شام مجھے ثبوت مل گیا کہ میں نے اس کی نظروں میں جو حکایتیں پڑھی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ آج تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ قول و قرار کرتے ہوئے اُس کے دِل میں اپنی طرف سے جو شبہات تھے، ان پر بھی اُس نے قابو حاصل کر لیا ہے اور اُسے اپنے اُوپر پورا اعتماد ہے..... آج اس کا حسن کل سے زیادہ متین اور پرُوقار تھا۔ اس نے صوفیانہ رنگ کی بادامی ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس گرمی کے موسم میں بڑی سہانی معلوم ہو رہی تھی اور اُس کے دیکھنے سے آنکھ میں ٹھنڈک آتی تھی۔ آج وہ ساڑھی میں اتنی لپٹی لپٹائی نہیں تھی۔ میں نے اس کی گردن بھی دیکھی کیوں کہ اس کا گریبان وی (v) کی شکل کا تھا۔ نیچے سے گردن کا رنگ بڑا بے نظیر ہے، بیچ میں ایک شکن سی پڑی ہوئی ہے جس میں پسینے سے پاؤڈر جم گیا تھا۔ آج تو بازو بھی کھلے ہوئے تھے۔ باہوں پر بڑا خفیف سا رُواں ہے، جیسے آڑو پر ہوتا ہے۔ بائیں بازو کی مچھلی کے قریب شاید کسی مچھر نے کاٹ لیا تھا کیونکہ خون کی ننھی سی بوند جھلک رہی تھی۔ میرا تو جی چاہا کہ وہیں منھ گاڑ دوں اور ایسا شدید بوسہ لوں کہ میرے ہونٹوں کے دباؤ سے کھال زرد پڑ جائے۔ جب سے میں نے یہ منظر دیکھا ہے، میرے اندر ایک ہیجان برپا ہے اور بے پناہ عیش کا اَرمان اُمنڈ رہا ہے، بار بار مجھے ن، م، راشد کے وہ مصرے یاد آ رہے ہیں:

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں

مگر میَں تو اپنے ہی بستر پہ پڑا ہوں اور کچ کچا کچ کچا کر رہ جاتا ہوں، خیر، اتنی تسلی تو ہے کہ میں نے جو اُمید باندھی تھی، وہ بے بنیاد نہیں ہے..... دیکھو گلیڈس! اپنی بات سے مت پھرنا! سمجھیں، شاباش، یوں ہی ڈٹی رہنا!

---

۱۵ مئی، پونے دس بجے رات۔

بس اپنی کور چشمی سلامت رہے! ذرا سی اُمید بندھتی نظر آئے تو بس میں پھولے نہیں سماتا۔ پھر میں ایسا مگن ہو جاتا ہوں کہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ اتنے تجربوں سے بھی تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ پہلے میں بڑا جذباتی تھا، مگر اب میری اصلاح ہوگئی ہے، لیکن اصلی بات یہ ہے کہ میں ہوں بالکل ویسے کا ویسا ہی، جیسا پہلے تھا۔ ارے بھئی، اب تو تینوں کو دیکھ چکے، اب تو سنبھل جاؤ۔ ایک نے اتنے دن پینگیں بڑھنے کے بعد آخری دن کمر پھیرلی، دوسری نے آنکھوں کے رِشتے کا بھی لحاظ نہ کیا اور اگلی گلی سے جانا شروع کر دیا، تیسری ایک ہفتے تک پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی رہی اور پھر ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ دو تین آدمیوں کے سامنے خفیف ہونا پڑا۔ علیٰ ہذالقیاس۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے آپ کو اسی جھمیلے میں پھنسا لیا۔ اول تو مجھے یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ شکل و صورت سے بھولی سہی، لیکن آ رہی ہے شہر سے، ہوسٹل میں رہنے والی، کھیلی کھائی ہوگی۔ خیر یہاں بھول چوک ہوگئی تھی تو کم سے کم تھوڑا سا صبر کرتا، دو چار دِن دیکھتا، کس قسم کی ہے، کس قسم کی نہیں، میری طرف سے اس کا رویہ کیا ہے، یہ سب باتیں دیکھ بھال کے آگے چلتا۔ لیکن نہیں، میری تو عادت ہے کہ ہر چیز کو اپنے خوابوں کی دُھند میں سے دیکھتا ہوں، بات ہوتی ہے کچھ اور مجھے نظر آتی ہے کچھ۔ کل شام میں نے پھر خیالی پلاؤ پکانے شروع کر دیے اور اب چکھنے کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ کڑوا زہر۔ آج شام تو اس کا انداز بالکل ناقابلِ برداشت تھا۔ اتنی بات تو میں نے بڑی بڑی حسیناؤں کی نہیں سہی، وہ تو مال کیا ہے؟ جب وہ آئی تو میں نے ذرا اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ لیا تو وہ ایسے بھڑکی، اور ایسے نتھنے پھلا کے اُدھر کو ہوگئی جیسے مَیں نے نہ جانے کیا کر دیا۔ یہ ناز نخرے اور ایسی شکل صورت پر؟ کچھ ٹھیک سی ہوتیں تو نہ جانے کیا قہر ڈھاتیں! خواہ مخواہ دو تین دِن سے میں نے اُسے آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ کبھی گلاب کہتا ہوں کبھی کچھ، کبھی کچھ، غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بس پوڈر ووڈر لگا کے چمک اٹھتی ہے، ویسے ہے کچھ بھی نہیں۔ نتھنے پھیلے ہوئے ہیں جیسے کسی نے ناک آگے سے پکڑ کے دبا دی ہو۔ ماتھا تو بس دو انگل کا ہے اور تکونی شکل کا۔ کان آگے کو جھکے ہوئے۔ نیچے کا ہونٹ موٹا ہے، پہلے تو مجھے شہوت انگیز سا معلوم ہوا تھا لیکن اب تو گھن آتی ہے، اور چال تو ایسی عجیب و غریب ہے کہ ہزار میں

ایک۔ ایسے چلتی ہے جیسے دونوں پیروں میں عدم تعاون ہو رہا ہو، ایک قدم آگے رکھ دیا تو دُوسرا کہتا ہے میں تو نہیں چلتا، اب اُسے مناؤ تو کھسکے، غرض کہ کچھ عجیب ہی ہیولا ہے۔ اس پر تو خیر مجھے ہنسی آتی ہی ہے لیکن اپنے اُوپر اس سے بھی زیادہ۔ بھلا اسی کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر کمر کس رہا تھا۔ کیا کہنے ہیں ہماری خوش مذاقی کے بھی۔ اس شکل و صورت پر تو یہ کہنا چاہیے کہ ہماری خوشامد کرو، جب نظر اٹھا کے دیکھیں گے اور ہم ہیں کہ اس کے لیے سر سے کفن باندھ کے گھر سے نکلے جا رہے ہیں، خیر، شکل صورت کو بھی چھوڑو۔ اسے تو یہ سمجھ لو کہ اچھا بھئی، ہمیں پسند آگئی۔ اب یہی ہمارے لیے پریوں کی شہزادی ہے، لیکن بات تو ذرا تمیز کی کرے اور وہ کہ پاکباز اور معصوم ہی بنے چلے جا رہی ہے۔ ایسی عشق بازی سے ہم بھرپائے۔ ہم تو تیسرے ہی دِن مستعفی ہوتے ہیں۔ ہمارے بس کا یہ روگ بھلا کہاں ہے کہ چوبیس گھنٹے مزاج کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھیں..... اصل بات یہ ہے کہ ذرا یہاں آکے بنتی ہے، سمجھتی ہوگی کہ یہاں میری قدر ہوگی۔ واللہ، کالج میں تو ایسی لونڈیوں کی طرف کوئی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا کہ کدھر پھرتی ہیں وہ تو اتنے دِن یہاں دیہات میں پڑے پڑے میرا مذاق بگڑ چلا ہے جو میں نے اتنی توجہ بھی کرلی۔ خیر چلو، یہ بھی دو تین دن اچھی دِل لگی رہی۔ ذرا منھ کا مزہ بدل گیا۔ شکر یہ ہے کہ بڑے سستے چھوٹے اور بڑی جلدی۔ تیسرے ہی دِن آنکھیں کھل گئیں۔ ممکن ہے ابھی اسے یہ پتا نہ چلا ہو کہ میں دو ڈھائی دن اس کے لیے کتنا بے قرار رہا ہوں۔ اسے معلوم ہو جاتا تو اور زیادہ اکڑتی، اور بہت ناچ نچواتی۔ عورت ذات ہے، اس سے بارہ پتھر الگ ہی رہنا اچھا۔ فرض کرو کہ وہ محبّت کا جواب بھی دیتی تو کیا ہے، پہلے چکر کتنے دیتی۔ دِن رات پڑے سلگا کرتے، طرح طرح کے شک شبہے، وسوسے، خطرے، بے ثمر تمنائیں، لاحاصل خواہشیں، مفت میں جان گھلتی، اور زیادہ سے زیادہ حاصل اتنا ہوتا کہ ڈرتے ڈرتے کسی دِن ایک بوسہ لے لیتے یا ممکن تھا کہ وہ اتنی نوبت بھی نہ آنے دیتی۔ بس نظربازی پر ہی معاملہ ٹلتا۔ اتنی سی بات کے لیے اتنی مصیبت مول لینا کون سی عقل مندی ہے۔ پھر اوپر سے نخرے برداشت کرنے پڑتے وہ الگ۔ اور اصل بات تو یہی ہے کہ وہ بے وقوف بنانے کی فکر میں تھی۔ بہرحال ہم اچھے وقت سنبھل گئے۔ اب زیادہ سے زیادہ یہی تو ہے نا کہ ہم وہی موپچی کے موپچی رہیں گے، جیسے پہلے تھے۔ لیکن اب محرومیوں سے اتنی تکلیف ہوتی بھی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایسی ہمدم و دم ساز عورت مل جاتی تو میری زندگی میں کوئی معنی

پیدا ہو جاتے۔ لیکن اب اوروں کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری زندگی میں بھی معنی پیدا ہونے چاہئیں۔ میں انہیں تخیل مستعار تو دے نہیں سکتا، ان کی خامیوں کی پاداش البتہ مجھے بھگتنی پڑے گی، اس کے لیے بھی میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ جب میرا دماغ اتنا مفلوج ہو جائے گا تو اُس میں یہ خلش پیدا ہی ہو گی کہ اپنی زندگی میں کوئی معنی پیدا کیے جائیں اور میری زندگی میں معنی پیدا ہو ہی گئے تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی؟ خود زندگی ہی میں کون سی ایسی عمیق معنویت ہے جس کے حصول کی آرزو کی جائے؟ زندگی کو اتنا کچھ دیکھ چکنے اور برت چکنے کے بعد اب تو میں زندگی سے کسی بات کا مطالبہ نہیں کرتا، اب تو میں بھی بائرن کی طرح یہ چاہتا ہوں کہ میرے دِل کی حرکت بند ہو جائے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

۱۶ مئی ۱۹۴۴ء

روزی ڈارلنگ،

یہ مت سمجھنا کہ مَیں گھر پہنچ کے تمہیں بھول گئی۔ مجھے معلوم ہے تم میرے خط کا روز انتظار کر رہی ہوں گی۔ لیکن بائی گوڈ میں سچ کہتی ہوں، مجھے بالکل فرصت نہیں ملی۔ یہاں آئے ہوئے مجھے چوتھا دِن ہے، لیکن بات یہ ہے کہ روز ماما مجھے کسی نہ کسی کے یہاں ملانے لے جاتی ہیں۔ اس وجہ سے کپڑے وپڑے بدلنے میں بالکل وقت ہی نہیں ملتا۔ آج میں نے سوچا کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہی کروں گی کہ تمہیں خط لکھوں۔ دیکھو روزی، ناراض مت ہونا، مجھے ماف کر دینا۔

تم نے کہا تھا کہ راستے کا سب حال لکھنا، تو راستے میں تو کوئی خاص بات ہوئی نہیں۔ بس وہ آدمی جو تھا نا ہر اسٹیشن پہ اُتر کے ہمارے ڈبے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ تم جانتی ہو فلس کتنی شریر ہے۔ اُس نے کئی دَفا اس آدمی کا منہ چڑایا لیکن وہ برابر اسی طرح ٹہلتا رہا، اور مانا نہیں۔

یہاں کی بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا خط میں کیا لکھوں۔ یہاں تو کوئی سینما بھی نہیں ہے جو اُسی کی باتیں لکھ دُوں۔ تمہارے تو مزے ہیں، روزی، آج کل تو خوب فلمیں دیکھ رہی ہوں گی، تمہارے تو بھائی سینما میں ہیں، تم تو مفت میں دیکھ لیتی ہوں گی۔ لکھنا کہ جب سے تم پہنچی ہو تم نے کتنی فلمیں دیکھیں؟ فلموں کے نام

بھی لکھنا۔

مجھے تو دن بھر ماما اپنے ساتھ گھسیٹے پھرتی ہے۔ مجھے تو گھبراہٹ ہوتی ہے ہر ایک آدمی کے گھر جاتے ہوئے۔ لیکن کیا کروں، وہ مانتی ہی نہیں۔ میں تو کہیں جا کے بولتی بات کرتی نہیں، تھوڑی دیر بیٹھ کے ماما سے کہہ دیتی ہوں کہ اب چلو۔ ہاں تم نے کہا تھا کہ وہاں کوئی نئی سہیلی بناؤ تو مجھے ضرور لکھنا۔ نئی سہیلی تو مَیں نے ابھی کوئی نہیں بنائی۔ ایک لڑکی ہے افروز، کبھی کبھی اس کے گھر تھوڑی دیر بیٹھ کے تاش کھیل لیتی ہوں۔ ایک تو میں ہوتی ہوں، دُوسرے وہ افروز، اور تیسرے اُس کا بھائی خورشید۔ کبھی کچھ اور مت سمجھ لینا، اُس کا بھائی ابھی تو چھوٹا ہے۔ یہ میں نے اس وجہ سے بتا دیا کہ تم کبھی اور اور باتیں سوچنے لگو۔ ابھی تو میری ان دونوں سے زیادہ باتیں ہوتی بھی نہیں، بس تاش کھیل لیتی ہوں بیٹھ کے۔ تم ڈرو مت، تم جیسی پیاری سہیلی تو میری اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی، اور پھر یہاں میں کسے سہیلی بنا سکتی ہوں، کبھی کبھی چھٹیوں میں تو آتی ہوں۔ سہیلی تو وہاں بنائے جہاں آدمی رہے۔

ہاں، ہمارے ڈیوڈ بھیا نے بہت دوست بنا رکھے ہیں۔ دن بھر ہمارا گھر گھیرے رکھتے ہیں اور بہت غل مچاتے ہیں۔ میں تو کسی سے بولتی چالتی نہیں۔ بالکل باؤلی باتیں کرتے ہیں، اور کچھ نہیں تو یہی سوجھ گیا ہے کہ بات بات پہ کہتے ہیں، یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ، ہمارے ڈیوڈ بھیا نے بھی اُن سے یہ بات سیکھ لی ہے۔ باہر تو کہتے ہی ہیں، بھیا جب گھر میں آتے ہیں تو یہاں بھی یوں ہی کہتے رہتے ہیں۔ "یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ۔" میں نے اُن سے پوچھا بھی کہ لاؤ دکھاؤ، کیا دکھا رہے ہو۔ بس یہی کہے جاتے ہیں یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ۔ میں نے کہا کہ بھیا! تم بھی باؤلے ہو گئے اپنے دوستوں کے ساتھ رہتے رہتے۔ بھلا پوچھو کیا دیکھ؟ کوئی چیز ہو تو دیکھیں بھی۔ اور کیا سناؤں میں تمہیں ان پگلوں کی باتیں۔ دیکھنا روزی، جب میں کبھی سامنے آ جاتی ہوں تو ایسا گھورتے ہیں میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے، کہ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے اور میں فوراً سامنے سے ہٹ جاتی ہوں۔ دو لڑکے تو بہت چیچ چیچ کے انگریزی بولتے ہیں، میں بھی دِل میں سمجھتی ہوں کہ مجھے سنانے کو بولتے ہیں یہ انگریزی۔ میں کہیں جاتی ہوں گی اور کوئی مل جائے گا تو دیکھنا راستے میں بھی تو گھورتے ہیں میری طرف۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ میں نے ماما سے کہا بھی کہ ماما یہ لوگ تو بڑا شور مچاتے ہیں، انہیں روکو یہاں آنے سے۔ ماما کہنے لگیں کہ تمہارے بھیا کے دوست ہیں، میں

انہیں کیسے منع کروں۔ ان لوگوں کی وجہ سے میں اور بھی گھر سے باہر نکلتے ہوئے گھبراتی ہوں۔ سب سے زیادہ مجھے ان کا گھورنا برا لگتا ہے۔

یہاں ایک لڑکا بڑا عجیب قسم کا ہے۔ ہمارے گھر تو کبھی آیا نہیں ہے، میں نے اُسے دو تین دفا ویسے دیکھا ہے، کبھی اس کے گھر جاتے ہوئے، کبھی ویسے۔ اُسے جب کبھی دیکھو کتاب ہاتھ میں لیے ٹہلتا رہتا ہے اور زور زور سے پڑھتا جاتا ہے۔ پڑھتا ہے ہمیشہ انگریزی کی کتاب، مجھے تو بڑا بے وقوف سا معلوم ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے اُس پر۔ پڑھنا ہے تو کہیں بیٹھ کے پڑھے، یہ کیا کہ ہاتھ میں کتاب لیے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ وہ بھی میری طرف بڑے غور سے دیکھتا ہے، لیکن ان لوگوں کی طرح گھورتا نہیں۔ مجھے دیکھ کے وہ رک جاتا ہے اور کتاب پڑھنا بند کر دیتا ہے۔ مجھے دیکھ کے تو وہ بس گم سم کھڑا رہ جاتا ہے اور میری طرف تکتا رہتا ہے، کچھ کہتا سنتا نہیں۔ کبھی کبھی ماما کو سلام کر لیتا ہے، معلوم ہوتا ہے بے چارا سیدھا سادا۔ تم کہو گی کہ یہ کیا جھگڑا لے بیٹھی۔ بات یہ ہے کہ مجھے اُسے دیکھ کے ہنسی آتی ہے، اسی وجہ سے میں نے تمہیں اُس کا حال سنا دیا۔

اب اور کیا لکھوں، مجھے تو اور کوئی بات یاد نہیں آتی لکھنے کو۔ تم نے کہا تھا کہ بہت بڑا خط لکھنا۔ اب تمہاری فرمائش کیسے پوری کروں۔ چلو، ہمارے یہاں جو سقا پانی ڈالتا ہے، اس کا حال سن لو۔ ہمارا سقا بہت مزے دار باتیں کرتا ہے۔ ماما سے گھنٹوں کھڑے ہو کے باتیں کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کی شادی کا قصہ سناتا ہے، کبھی کسی کے گھر چوری کا۔ مگر بڑے مذاقیانہ طریقے سے سناتا ہے۔ سن کے بڑی ہنسی آتی ہے۔ تم بھی ہوتیں تو تمہیں بھی سنواتے۔ تمہارے بھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔

وہ جس لڑکے کا حال مَیں نے اُوپر لکھا ہے نا، اس کا رنگ زرد پڑا ہوا ہے۔ شاید اتنا پڑھنے سے پڑ گیا ہو گا۔ پتا نہیں اتنا کیوں پڑھتا ہے، اپنی تن دُرستی کا خیال کیوں نہیں رکھتا۔ تم کہو گی کہ لو، پھر وہی بات شروع کر دی۔ مجھے یوں ہی بیچ میں خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا تمہیں بھی لکھ دوں۔ کسی طرح خط کو تو لمبا کرنا ہے ہی۔

ابھی تک ہم ٹہلنے نہیں گئے۔ جب میں یہاں جاڑوں میں آئی تھی تب تو ہر روز سب ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ رات پاپا کہہ رہے تھے کہ ہم نے لاری کا انتظام کیا ہے۔ تم سب کو بجلی کا کارخانہ دکھانے لے چلیں گے نہر پہ۔ بھیا اپنے ایک دوست سے کیمرہ لائیں گے، پھر وہاں تصویریں کھینچیں گی۔ میں تمہیں بھی بھیجوں گی۔ کسی طرح تم بھی یہاں ہوتیں تو سیر

میں بڑا مزہ آتا۔ نہر میں پیر لٹکا کے بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے رہتے۔ خیر اب تو تم سے چھٹیوں کے بعد ہی ملنا ہو گا۔

دیکھو روزی اب تو میں نے تمہیں بہت بڑا خط لکھ دیا، تم بھی اتنا ہی بڑا خط لکھنا۔ نہیں تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ پھر بڑی مشکل سے منوں گی۔ تم بھی اپنا، راستے کا سب حال سنانا اور سب باتیں لکھنا۔ یہ ضرور لکھنا کہ اس بات کا کیا ہو رہا ہے۔ تم سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ اس بات سے میرا کیا مطلب ہے۔ اشارے کے لیے لکھتی ہوں کہ وہی نیلا کاغذ۔ اب تو تم سمجھ گئی ہوں گی۔ دیکھو، ضرور لکھنا کہ اس دفعہ کیا رہا۔ بھولنا مت نہیں تو پھر تم جانتی ہو کہ میں تمہیں کیا سزا دوں گی۔ ضرور لکھنا۔ ضرور، ضرور، ضرور۔ اچھا روزی، اب میں خط ختم کرتی ہوں۔ اب تو بس یہ انتظار ہے کہ چھٹیاں ختم ہوں اور کب تم سے ملنا ہو۔ تم تو ہمیں بھلا کیوں یاد کرتی ہوں گی؟ نیلا کاغذ، خیر کبھی کبھی تو یاد کر لیا کرو، بالکل مت بھول جانا۔

خط کا جواب بہت جلدی دینا اور بہت بڑا خط لکھنا، جتنا بڑا میں نے لکھا ہے۔ تاکید ہے جواب بہت جلدی دینا۔ میں روز انتظار کروں گی۔

تمہاری پیاری سہیلی

گلیڈس

روزی ایک بات پوچھتی ہوں..... یوں ہی مذاق میں۔ جس لڑکے کا حال میں نے اپنے خط میں لکھا ہے اُس پر تمہیں بھی ہنسی آتی ہے کہ نہیں۔ مجھے تو بہت ہنسی آتی ہے۔ پتا نہیں تمہیں بھی آئے گی کہ نہیں۔ ضرور لکھنا کہ تمہیں اس کا حال میرے خط میں پڑھ کے ہنسی آئی کہ نہیں آئی۔ لکھنا۔

گلیڈس

پیاری سہیلی روزی کو گلیڈس کی طرف سے بہت بہت پیار۔

(۱۶ فروری ۱۹۴۷ء)

تخلیق عمل اور اسلوب

تاریخی شعور

ایک ادب ہی کیا، اس وقت پاکستان کی پوری ذہنی زندگی پر ایک جمود سا طاری ہے۔ نہ تو زور شور سے افسانے لکھے جا رہے ہیں، نہ نظمیں ہو رہی ہیں اور تو اور ادبی یا نظریاتی بحث مباحثے بھی پھیکے پڑ گئے ہیں۔ جن دنوں فسادات کا زخم ہرا تھا، لوگ کم از کم یہ تو محسوس کرتے تھے کہ ہمیں ان واقعات پر کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہیے، لیکن اب وہ بات بھی نہیں رہی — کمیونسٹوں تک نے بحث کرنی چھوڑ دی۔ یہ ذہنی جمود کی انتہا ہے۔ ایک جوان قوم میں ایسی بے دلی بڑی تشویش ناک چیز ہے۔

اس جمود کے اسباب سیاسی بھی ہو سکتے ہیں، معاشی بھی، مگر منجملہ اور باتوں کے ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اہل فکر سے جو مطالبات زمانہ کر رہا ہے، وہ ان کے لیے بڑے غیر متوقع ہیں، چنانچہ وہ شش و پنج میں پڑ گئے ہیں، ہر طرف سے یہ آواز آ رہی ہے کہ ایک نئی قسم کا دستور بنے، ایک نیا معاشی نظام ہو، ایک نیا ادب پیدا ہو، مگر "نئے" کی تعریف واضح اور معین الفاظ میں کوئی نہیں کرتا، غالباً ایسی تعریف ممکن بھی نہیں، مگر اندیشہ ناک بات یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر کوئی ایسی کوشش نہیں ہو رہی جس سے اور کچھ نہ سہی، ایک چلتی ہوئی سی تعریف ہی مہیا ہو جائے۔ اس "نئے نئے" کی رٹ نے بات کو اور مبہم بنا دیا ہے۔ ہماری موجودہ سیاسی حیثیت نئی سہی مگر ہم یہ بات بھولے ہی جا رہے ہیں کہ ہم "نئے" سے زیادہ "پرانے" ہیں۔ محض اتنی سی بات کا شدید اور ہمہ گیر احساس نہ رکھنے کے باعث یا احساس سے غفلت برتنے کے باعث ہماری ذہنی دشواریاں خواہ مخواہ بڑھ گئی ہیں۔

مگر جو لوگ ہمیں ہمارا "پرانا پن" یاد دلاتے رہتے ہیں، وہ اور بھی قیامت ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں "اصلی اسلام" کو از سر نو زندہ کرنا چاہیے۔ ان کے نزدیک خلافت راشدہ

کے بعد سے لے کر آج تک کی تاریخ ایک مسلسل بے راہ روی کی داستان ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے صحابیوں کے بعد اب ہم نے اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے، چنانچہ پاکستان میں ہر کام ہماری تفسیر و تشریح کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ باطل ہو گئی اور اس عرصے میں مسلمانوں نے انسانیت کے کلچر میں جو گراں قدر اضافے کیے ہیں، وہ بھی سوختنی قرار پائے۔ اس رجحان کو ایک اور سمت سے بھی مدد ملتی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اسلام چونکہ بنیادی طور پر جمہوری مذہب ہے اس لیے بادشاہت کا قیام ارتداد کے برابر ہے اور مسلمان بادشاہوں کے زیرِ اثر جو کچھ ہوا ہے، وہ اسلام کی تاریخ سے خارج ہے اور جمہوریت پاکستان کے کلچری ترکے میں شامل نہیں ہے۔ اس استدلال کی لپیٹ میں الحمرا اور تاج محل سے لے کر الف لیلہ اور میرو غالب کی شاعری تک سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ عرب بادشاہوں نے جو کچھ کیا، وہ تو پھر بھی تھوڑا بہت انگیز کرنے کے قابل ہے کیونکہ وہ بادشاہ عرب تھے مگر ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں جو تخلیقی کارنامے ہوئے وہ تو بالکل ہی خارج از بحث ہیں کیونکہ یہ بادشاہ ہندوستانی تھے۔ امیر خسرو جیسے عالم اور صوفی کی تخلیقی کوشش بھی اسی ذیل میں آجاتی ہیں کیونکہ اسلام کو نہ تو امیر خسرو سمجھتے تھے اور نہ حضرت نظام الدین اولیا، اصلی اسلام، تو اب جا کے دو چار آدمیوں کی سمجھ میں آیا ہے۔

یہ نظریہ صرف ''اسلامی'' جماعتوں ہی کا نہیں، ہماری حکومت کے بعض اہم شعبے تک اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں، مثلاً ریڈیو پاکستان ایک پاکستانی موسیقی پیدا کرنا چاہتا ہے، چنانچہ خیال ہے کہ کچھ لوگوں کو عراق بھیج کے موسیقی ''منگوائی'' جائے۔ ہندوستانی موسیقی پر مسلمانوں نے جو کچھ محنت پچھلے چھ سو سال میں کی ہے، وہ گئی بٹے کھاتے میں، تاریخی احساس نہ ہونے کے طفیل آج ہمارا ریڈیو اس پر آمادہ ہے کہ ہمارا کیا دھرا خاک میں مل جائے اور ہم پھر ایک سے گنتی شروع کریں۔ مسلمانوں کی تاریخ سے ایسی ہی بے رُخی برتی گئی تو نہ جانے اور کیا گل کھلیں گے۔

اسی ایک واقعہ پر غور کیجیے تو کتنی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے دو تاریخی لمحے ہیں۔ ایک تو امیر خسرو کا زمانہ، دوسرے اپنا زمانہ۔ خسرو کے زمانے میں قوم کا اہلِ فکر طبقہ زندہ تھا۔ اس کی تخلیقی اہلیت بیدار تھی، اسے اپنی اقدار کا علم تھا اور ان پر کامل یقین تھا۔ ان کے لیے سب سے پہلی چیز تخلیق تھی وہ لوگ مذہب کو کچا گھڑا نہیں

سمجھتے تھے کہ ذرا سی ٹھیس میں پھوٹ جائے۔ امیر خسرو ترک تھے مگر وہ ہندوؤں کی موسیقی سے نہیں ڈرے۔ انہوں نے ہندوؤں کی موسیقی پر ایسا قبضہ جمایا کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے ہی نکال لے گئے اور آخر وہ دن آیا کہ مسلمان استاد ٹھہرے اور ہندو شاگرد اور مسلمان، ہندوؤں کو طعنہ دینے لگے کہ یہ تو ہمارا فن ہے، تم کیا جانو، یہ تو تھا اس زمانے کا حال جب قوم کی تخلیقی صلاحیتیں پورے زور پر تھیں۔

اس کے مقابلے میں ہمارا زمانہ ہے جب اہل فکر طبقے پر بے دلی طاری ہے، اپنی اقدار پر پورا ایمان نہیں، اپنی قوم سے واقفیت نہیں، قوم کی محبت نہیں مگر قوم سے علیحدہ رہ کر بھی زندگی بسر نہیں کر سکتے اس لیے کوئی بات منہ سے نکالتے ڈرتے ہیں کہ قوم ناراض نہ ہو جائے۔ یہ سن رکھا ہے کہ اسلام پر قوم کا اعتقاد ہے اس لیے اسلام کا نام لے لے کر قوم کو خوش کرنا چاہتے ہیں جب تخلیقی کام کرنے والوں کا یہ رنگ ہو تو ظاہر ہے کہ موسیقی بھی عراق سے منگانی پڑے گی، بلکہ

آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

جس قوم نے الحمرا اور تاج محل جیسی عمارتیں، الف لیلہ اور طلسم ہوشربا جیسی داستانیں، حافظ اور میر کی سی شاعری اور امیر خسرو جیسے موسیقار پیدا کیے ہوں، وہ آخر تخلیق سے کیوں ڈرے؟ قوم تو شاید نہیں ڈرتی، البتہ ایسے لوگ ضرور ڈرتے ہیں جن کے اندر زندگی گھٹ کے "جوئے کم آب" رہ گئی ہے اگر واقعی قوم بھی ڈرتی ہے تو اسے بھی مسلمانوں کی تاریخ سنانے کی ضرورت ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے ساتھ ساتھ "اصلی اسلام" بھی ختم ہو گیا تو اس طرح یہ لوگ اسلام کو ایک چھوٹی سی چیز بنا دیتے ہیں۔ اگر اسلام کوئی ادبی تحریک ہوتا تو خیر، یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ بیس تیس سال کی عمر بھی ایسی تحریکوں کے لیے عمرِ نوح ہے، مگر ایک ایسا خیال جو زندگی کا عالمگیر نظام بن کر سامنے آئے اور اس پر عمل ہو بس چھتیس سال، تو وہ خیال ہی کیا ہوا، اگر خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں بے راہ روی آ گئی تو یہ تعجب کی بات نہیں، تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہزار خرابیوں کے باوجود مسلمان آج تک زندہ رہے اور بڑے ٹھاٹ سے جینے کی لگن اب بھی سینے میں رکھتے ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بے راہ روی کے باوجود مسلمانوں نے لاکھوں کو تخلیق کی راہ پر ڈالا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہی کے باوجود اسلام کی بنیادی جمہوریت کو جہاں بھی موقع ملا چمک

اٹھی۔ جو لوگ اسلام کو مسلمانوں کی تاریخ سے الگ کرنا چاہتے ہیں، وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ اسلام نے خیال اور عمل کو ایک کر دیا تھا۔ یہ لوگ اسلام جیسی زندہ حقیقت کو محض ایک عقیدت بنا دینا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور اشتراکی روس کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ تم نو دولت ہو اور تمہارا کوئی ماضی نہیں اس لیے تمہیں اپنے مستقبل کا بھی پتا نہیں۔ ہمارے پاس تیرہ سو سال کی تاریخ موجود ہے اور یار لوگ ہمیں صلاح دیتے ہیں کہ اسے طاقِ نسیاں پر رکھ دو۔ اپنی قوم کے اجتماعی تجربے سے اگر ہم فائدہ اٹھا سکے تو یوں ہی اندھیرے میں بھٹکتے پھریں گے، بلکہ غیروں سے آنکھیں مانگیں گے۔ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں ہماری قوم نے نہ جانے کیا کیا دیکھا ہے۔ بنی بھی ہے بگڑی بھی ہے، ہنسی بھی ہے روئی بھی ہے، پاک باز بھی رہی ہے اور عیاش بھی۔ غرض وہ کون سا کام ہے جو ہم نے کر کے نہیں دیکھا۔ ان سب چیزوں کا اثر ہماری رگ و پے میں اتر چکا ہے۔ ہم اس اثر سے پیچھا چھڑانا چاہیں تو بھی نہیں چھڑا سکتے۔ ہم صرف عمر بن عبدالعزیز ہی کے جانشین نہیں ہیں، واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے بھی جانشین ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ ہماری تاریخ ہے تو ہمیں اس تاریخ کو مجموعی طور پر قبول کرنا پڑے گا۔ اس تاریخ کے کسی دور کو ہم اچھا بُرا کہہ سکتے ہیں، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر پاکستان کو ایک عظیم الشان ملک بننا ہے تو ہر پاکستانی کو اپنی پوری تاریخ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ محسوس کرنا پڑے گا کہ عمر بن عبدالعزیز کی اچھائیاں میری اچھائیاں ہیں اور واجد علی شاہ کی برائیاں میری برائیاں ہیں، اور ان سب اچھائیوں برائیوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تاریخ میں بہت سی شرمناک باتیں ضرور ہیں مگر ان کو شرمناک کہنے سے ہمیں اسی وقت فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جب ہم یہ سمجھتے ہوں کہ یہ شرمناک باتیں ہم سے سرزد ہوئی ہیں اور ویسے بھی اگر ہم اپنے مستقبل پر یقین رکھتے ہیں تو ان باتوں پر ضرورت سے زیادہ شرمانا بھی نہیں چاہیے۔ جو قوم قرنوں کی عمر لے کر آئی ہو، اُسے پچاسوں سال پستی اور ذلت کی زندگی بھی بسر کرنی پڑ جاتی ہے۔

غرضیکہ اس وقت پاکستانیوں کے سامنے جو سب سے بڑا ذہنی مسئلہ ہے، وہ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو اپنے شعور میں رچانے کا ہے۔ ہمارے سینکڑوں سوالوں کا جواب اس ایک چیز میں ملے گا۔ ہمیں اپنی تاریخ کو از سرِ نو سمجھنا ہے، اور اپنی قومی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں اسے اپنا رہنما بنانا ہے جب قوم کے ذہنی مسائل انتہا سے زیادہ

پیچیدہ نظر آنے لگتے ہیں تو یہ سوچ کے مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ میری قوم ۱۸۵۷ء یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں نہیں پیدا ہوئی۔ ہم نے تیرہ سو سال میں بہت سے کام کیے ہیں اور اب وہی کام پھر سے نئے حالات کا لحاظ رکھ کے کرنے ہیں۔ ہمارے سامنے نمونوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ سے بس یہ سوال پوچھنا ہے کہ اسلام چند ٹھس عقائد کا مجموعہ بن کر دنیا میں آیا یا ایک زبردست تخلیقی تحریک بن کر۔ جدھر بھی نظر ڈالیں ہمیں یہی دکھائی دے گا کہ مسلمانوں نے اپنی بنیادی اقدار کو تو ضرور پیش نظر رکھا مگر تخلیق کی دھن میں یہ سوچنے کے لیے کبھی نہیں رکے کہ فلاں چیز ہماری ہے یا غیروں کی۔ انہیں جہاں سے بھی خام مواد ملا بے کھٹکے لیا اور اس سے اپنی مرضی کے مطابق چیزیں بنائیں۔ انہوں نے یونانیوں سے سیکھا، ایرانیوں سے سیکھا، ہندوؤں سے سیکھا، ہر ایک سے سیکھا، مگر آخر میں ان کی انفرادیت ہر جگہ ابھر آئی۔ اسی طرح وہ انسان کی نفسیات سے بھی نہیں ڈرے۔ جنس کا نام آتے ہی ان کا وضو نہیں ٹوٹا۔ سعدی نے پھکڑ سے بھی گریز نہیں کیا مگر پھر بھی رحمتہ اللہ علیہ بنے رہے۔ مسلمانوں نے ڈرنا اس وقت سیکھا جب تخلیقی لہر کمزور پڑ گئی۔

قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان بننے سے انسانی روح آزاد ہو گئی ہے کہ اپنی تخلیقی جدوجہد میں پوری سرگرمی دکھائے مگر یہ کیا قید ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ خود اپنی تاریخ سے گھبرا رہے ہیں؟ اگر ہماری روح میں تازگی اور توانائی ہے تو ہمارے دور انحطاط کی تاریخ بھی ہمیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے وہ کہتے ہیں نا کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، مسلمان بگڑتا بھی ہے تو اپنے انداز میں بگڑتا ہے، اس میں بھی ایک الگ ادا ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی زندگی جو بناوٹی رنگ اختیار کر گئی تھی، اُس کے جتنے بھی نام رکھے جائیں بجا ہے لیکن تکلفات کی ورزشوں میں انسانی روح کے بعض حصے واقعی سنور گئے تھے اور ہمیں ایسی چونکا دینے والی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ کی نفاست کپڑوں تک محدود نہیں رہی تھی، مثلاً آتش کا یہ شعر دیکھیے ؎

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری!

یوں تو لکھنؤ کی شاعری بڑی بدنام ہے، مگر یہ شعر دلی والوں کے بس کا نہیں۔ محبوب کے "ہرجائی پن" کی شکایت اگر اس لطافت اور نفاست، اس احتیاط اور شرافت کے ساتھ ہو سکے تو میں تو اسے کلچر میں ایک زبردست اضافہ کہوں گا۔ یہ شعر انحطاطی دور کا

سہی، مگر جمہوری پاکستان کو کیا روحانی نفاست کی ضرورت نہیں؟ اور اگر شاہی درباروں کی رنگ رلیاں نتھر اور نکھر کے یہ بن جائیں ؎

دماغ اپنا بھی اے گُل بدن معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بُو تیری

تو کیا تازہ دم اور جواں سال پاکستان اس شعر کے ذریعے اپنے نفس کی تربیت کرنے سے انکار کر دے گا؟

ایک اور وجہ سے بھی تاریخی احساس ہمارے لیے لازمی ہے۔ واقعات کا جب تک آگا پیچھا نہ ہو، ان میں معنویت ہوتی ہی نہیں۔ اگر ہماری قومی زندگی میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے، اور ہمیں اس کی نظیر اپنی تاریخ میں بھی مل سکتی ہے تو ہم اس کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ پھر وہ واقعہ ایک علامت بننے لگتا ہے۔ ہماری زندگی میں معنویت ہمارے ماضی کی بدولت آتی ہے۔ اس کی مثال بھی میں شاعری ہی سے دوں گا۔ فسادات ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہیں، مگر ہمارے ادب میں قرارِ واقعی طور پر فسادات نے کوئی جگہ نہیں پائی۔ سعادت حسن منٹو نے فسادات پر کچھ کامیاب افسانے ضرور لکھے ہیں، مگر فسادات ہمارے ادب میں اس طرح حل نہیں ہوئے کہ وہ محض واقعات نہ رہیں، اُن کی تفصیلات بھی یاد سے مٹ جائیں، مگر وہ ایک اجتماعی تجربہ بن کر ہمارے قومی شعور میں جذب ہو جائیں، ہمارا افسانہ ابھی یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ ہم نے اپنی نثر کی روایت سے رشتہ توڑ دیا تھا یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب ماضی کے تجربات اور حال کے تجربات ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ یہ بات الفاظ کے ذریعے ہوا کرتی ہے، مگر ہمارے الفاظ دوسرے ہیں۔ اُردو کے حقیقی نثر نگاروں کے الفاظ دوسرے تھے۔ یہی حال نظم میں بھی ہے؟ البتہ غزل فسادات کو ہمارے شعور میں جذب کر سکتی ہے، اور غزل نے یہ کام شروع بھی کر دیا ہے۔ غزل نے الفاظ بھی وہ جامِ جہاں نما قسم کے پائے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے غزل فسادات کے بیان ہی کے لیے وجود میں آئی تھی یا فسادات اس لیے ہوئے تھے کہ غزل میں پھر سے جان آ جائے۔ اس کا احساس مجھے پہلے تو حفیظ ہوشیارپوری کی ایک غزل اور پھر نوجوان شاعر ناصر کاظمی کے شعر سن کر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی تنگ دامانی کی شکایت اصل میں شاعرانہ عجز کی وجہ سے ہے یا غزل میں ڈوبے ہوئے نہ ہونے کی وجہ سے ورنہ غزل تو زمان و مکاں کی طنابیں کھینچ کے رکھ دیتی ہے۔ اب ناصر کاظمی کے دو شعر

سنیئے۔

دیتے ہیں سراغ فصل گُل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

یہ شعر جس طرح ماضی، حال، مستقبل کی سرحدیں ملا دیتے ہیں، وہ افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ یہ شعر فسادات کے تجربے کی پیداوار ہیں، مگر فسادات کے بارے میں نہیں ہیں۔ غزل کی روایت نے غزل میں جو اجتماعی تجربہ محفوظ کیا ہے، اس نے اس نوجوان غزل گو سے کیا کام لیا ہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ فسادات کے معنی ہمارے شعور نے سمجھنے شروع کر دیے ہیں، مگر یہ اسی وقت ممکن ہوا ہے جب شاعر کے وجدان نے ماضی اور حال کے تجربات کو ایک دوسرے میں گھلا دیا۔

اگر ہمارے فن کاروں نے ہمارے حال اور ماضی کی اس طرح ترجمانی شروع کر دی تو قوم میں تاریخی شعور بڑی آسانی سے پیدا ہو جائے گا، مگر خود فنکاروں کی توجہ بھی تو اس طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے شعوری کوشش ہونی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کام کے لیے بڑا علم چاہیے، اور اس سے بھی زیادہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے جو اس وقت موجود نہیں۔ ہم لکھنے والے چھوٹے چھوٹے لوگ ہیں، مگر ممکن ہے، ہماری مشترکہ کوشش، ایک زندہ قوم کے ارادے کی مدد سے، ایک بڑے آدمی کا کام کر لے۔ بہرحال، مسلمانوں کی فلاح تاریخ کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ قرآن پہلی مذہبی کتاب ہے جس نے تاریخ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

(جنوری ۱۹۴۹ء)

ادبی روایت اور نئے ادیب

دنیا کے ہر ملک میں عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ادب میں کوئی نئی تحریک شروع ہوتی ہے تو پہلے کچھ دن اپنے پیش رووں سے کشتم کشتا رہتی ہے، پھر کہیں جا کے نئے لوگوں کو جمنے کا موقع ملتا ہے۔ نئے ادیب پچھلی نسل کے خلاف تو ضرور ہوتے ہیں، مگر ان سے بھی پرانی نسلوں کا احساس بعض دفعہ انہیں بہت شدید ہوتا ہے۔ بعض اوقات نئی تحریکوں کا مقصد صرف پرانی روایتوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے، مگر ہمارے یہاں "نئے ادب" نے ایسے چپ چپاتے آ کے قبضہ جمایا کہ بس مار پیچھے پکار رہی ہوتی رہی۔ ایک طرح دیکھیں تو نئے ادب والوں نے ادب میں کوئی بغاوت کی ہی نہیں۔ بغاوت تو آپ اس چیز کے خلاف کرسکتے ہیں جس کا تسلط آپ کے اوپر ہو۔ اس کے برخلاف مجموعی اعتبار سے نئے ادیبوں کو اُردو ادب کی تاریخ کا احساس تھا ہی نہیں۔ ان کی پشت پر اُردو ادب نہیں تھا بلکہ یورپ کا ادب — خواہ انہوں نے اسے اچھی طرح پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو۔ نئے ادیبوں کے لکھنے کا انداز تو کچھ ایسا تھا جیسے اُردو میں پہلی دفعہ ادب پیدا ہو رہا ہو۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا تھا اس کا احساس انہیں صرف اس وقت پیدا ہوتا تھا جب کوئی ان کی مخالفت کرتا تھا۔ نظم چونکہ نثر سے زیادہ روایت کی پابند ہوتی ہے اس لیے شروع کے دو ایک شاعروں کو تو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم روایت کے خلاف چل رہے ہیں مگر فیض اور راشد کے بعد جو لوگ آئے ان کے لیے تو ایک نئی روایت قائم ہو چکی تھی۔ رہے مجاز اور جذبی تو کم سے کم الفاظ کی حد تک انہوں نے پرانی روایت سے کوئی انحراف کیا ہی نہیں، البتہ میراجی کو بغاوت کے باوجود روایت سے تعلق قائم رکھنے کا بڑا خیال تھا۔ ایک مختار صدیقی کوشش کرتے تھے کہ پرانے سے پرانے الفاظ اور اسالیب بیان کو پھر سے رواج دیا جائے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی ہماری نئی شاعری پرانی شاعری سے بالکل علیحدہ ہوگئی تھی۔ نثر میں تو یہ علیحدگی

انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ نثر لکھنے والے تو الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں نسبتاً آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تو قافیہ ردیف اور بحر کا جھگڑا بھی نہیں ہے۔ اس لیے نثر نگاروں نے پرانی اُردو نثر سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہاں نئے ادب اور پرانے ادب کے دو گروہ بن گئے، ایسے گروہ نہیں جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں۔ یوں تو خیر چھیڑ خانی ہوتی رہتی تھی مگر دراصل دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ عیسیٰ اپنی راہ، موسیٰ اپنی راہ، پرانے ادب والوں کو آگے دیکھنے سے انکار تھا، نئے ادب والوں کو پیچھے دیکھنے سے پرانے ادب والے صرف اپنے آپ کو دیکھتے تھے، نئے ادب والے بس ایک اپنے آپ ہی کو نہیں دیکھتے تھے۔

یہ صورت حال انگریزوں کے زمانے میں تو خوب چلی۔ ہم اپنی زندگی کے مالک ہی نہیں تھے۔ اس لیے جو آدمی چاہتا، دوسروں سے بے تعلق ہو کے رہ سکتا تھا، مگر اب یہ کام مشکل ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ہمیں آزادی نئی نئی ملی ہو۔ انگلستان یا فرانس جیسا کوئی ملک ہوتا اور ہر چیز جمی جمائی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ دو چار آدمی ایک کونے میں الگ تھلگ پڑے رہیں تو کسی کا کیا بگاڑتے ہیں، مگر جو ملک ابھی آزاد ہوا ہو۔ ایک تو وہاں والوں کو یہ دیکھنے کی بے تابی ہوتی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے، اور وہ ہمارے لیے مفید مطلب بھی ہے یا نہیں۔ پھر ویسے بھی نئے ملک کی تعمیر کے لیے پوری آبادی کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں اس لیے لوگ کسی کو بھی فالتو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اس لیے دونوں ادبی گروہوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔

پرانے ادب والوں کے پاس روایت ہے مگر انہیں یہ نہیں معلوم کہ روایت زندہ کس طرح رہ سکتی ہے، اور روایت کی زندگی کے کیا معانی ہیں۔ نئے ادب والوں کے پاس روایت کو زندہ رکھنے کے ذرائع ہیں مگر روایت کی اہمیت کا احساس نہیں۔ ادبی روایت کتنی ہی جامد کیوں نہ ہو، شعور کی تبدیلیوں کو نہیں روک سکتی کیونکہ خارجی محرکات کو نظرانداز بھی کر دیں تو بھی انسانی شعور ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتا۔ روایت کو اگر زندہ رہنا ہے تو ان تبدیلیوں کے لیے کسی نہ کسی طرح جگہ نکالنی پڑے گی ورنہ روایت مر جائے گی۔ دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ شعور کی کوئی کیفیت بذات خود نہ تو بڑی اہم ہوتی ہے نہ معنی خیز۔ اسے معنی خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مقابلہ اور موازنہ دوسری کیفیتوں سے

کیا جائے۔ معنی تصادم ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا معنی آفریں تصادم روایت کے اندر رہ کر ہی واقع ہو سکتا ہے، اور روایت ہی کے پاس اتنی مختلف کیفیتوں کا ذخیرہ ہوتا ہے کہ نئی کیفیت کو ایک پس منظر مل سکے، اس لیے روایت کے اندر رہنا اور روایت کو وسعت دینا دونوں باتیں ضروری ہیں۔

مگر قومی ادب کے لیے وسیع ہونا کافی نہیں، گہرائی بھی لازمی ہے۔ یہ گہرائی محض انفرادی تفکر سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اپنی ادبی روایت کے مرکزی رجحان کے قریب رہنے سے روایت شعور کی ہر تبدیلی کے لیے جگہ تو نکالتی ہے مگر اس کی ایک بنیادی رو بھی ہوتی ہے جس کا تعلق پوری قوم کی روحانی جستجو سے ہوتا ہے۔ ادب کو اپنی ساری قوت اور ساری شدت اسی اجتماعی تلاش میں شامل ہونے سے ملتی ہے۔ ادب کی زندہ روایت ہر کیفیت کو اپنے اندر سمیٹتی ہے، ہر دور کی عکاسی کرتی ہے مگر اس مرکزی چیز کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ مثال کے لیے دو چار ایسے ادب لیجئے جو انسانی "انا" کا مطالعہ کرتے ہیں۔

کسی ادب کی مرکزی روایت کے متعلق کچھ کہنے کی جرات کرنا میرے لیے تو چھوٹا منہ، بڑی بات ہے مگر یہ بہانہ اچھا ہے کہ میں ٹھہرا قصے کہانی لکھنے والا، عقلی گدے لڑانا تو میرا پیشہ ہے، ویسے بھی سوچنا بند کر دینے سے تو یہ بہتر ہے کہ کوئی غلط بات ہی سوجھ جائے، لگ جائے تو تیر نہیں تو تکا — خیر، تو پہلے جرمن ادب لیجئے۔ اس ادب سے میری واقفیت بس واجبی ہی واجبی ہے، تسلی مجھے بس اتنی ہی ہے کہ عذرا پاؤنڈ کی رائے کے مطابق جرمن ادب سے واقفیت چنداں ضروری نہیں ہے۔ بہرحال جو دو چار چیزیں میں نے پڑھی ہیں یا جن کے نام سُن رکھے ہیں، ان کی بنیاد پر اندازہ لگانے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمن ادب انسانی "انا" اور فطرت یا حیات یا موت جیسے مطلق اور مجرد تصورات کے تعلق کا مطالعہ کرتا ہے۔ روس کا کلاسیکی ادب دکھاتا ہے کہ "انا" پر کوئی ایک خیال یا جذبہ مسلط ہو جائے تو وہ اس کی دھن میں کن حدوں تک پہنچ سکتا ہے۔ فرانسیسی ادب بنفسہ "انا" کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ انسانی زندگی میں اس کی کیا جگہ ہے۔ "انا" جو باتیں محسوس کرتا ہے انہیں واقعی محسوس بھی کرتا ہے یا اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ سماج کی ظاہری شکلیں بدلتی رہیں مگر فرانسیسی ادب کو ہمیشہ یہی کھرچن لگی رہی۔ بودلیئر نے جو اپنے قاری کو ریاکار اور اپنا بھائی بتایا تھا، وہ صرف ایک اتفاقیہ کیفیت نہیں تھی، نہ انحطاط

پذیر سماج میں رہنے کا اثر۔ وہ فرانسیسی روح کی مخصوص جستجو کا اظہار ایک نئے طریقے سے کر رہا تھا۔ فرانسیسی ادیب اور شاعر اپنے ادب کی روایت پر جس شدت سے قائم رہے ہیں، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آج کل دنیا کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں قسم کے لوگ ژاں پال سارتر اور ان کے ساتھیوں کو گالیاں دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ الزام ان پر یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ انحطاط پذیر بورژوا انسان ہی کو انسان سمجھتے ہیں اور اس بات کو کوئی نہیں دیکھتا کہ فرانسیسی ادب کی روایت انسان پر کس حیثیت سے غور کرتی رہی ہے۔ اگر سارتر نے یہ کہا ہے کہ "جہنم کے معنی ہیں دوسرے لوگ" تو یہ قول فرانسیسی ادب کی روایت کا منطقی نتیجہ ہے۔ دو چار ادیبوں کے نام کہیں سے لے لیجئے۔ سلسلہ بندھتا نظر آنے لگتا ہے۔ روش فوکو نے پتہ چلایا تھا وہ خود پسندی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آتا۔ بودلیئر نے مزید تحقیقات کے بعد معلوم کیا کہ یہ خود پسندی بھی تو ڈھنگ کی نہیں، انسان اپنے آپ کو مسلسل فریب دیتا رہا ہے۔ اب سارتر کے لیے یہ دریافت کرنا لازمی تھا کہ انسان اس فریب میں کیوں گرفتار ہوتا ہے، اس غلامی سے کس طرح نجات ممکن ہے، آزادی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے اور آزادی کے کیا معنی ہیں۔ اب یہ باتیں چاہے رجعت پسندی ہوں یا انقلاب دشمنی، بہرحال سارتر اپنی روایت کے سامنے بے دست و پا ہے۔ چونکہ اس کا ذہن خلاق ہے، اس لیے آزاد نہیں ہے۔ اس کے لیے ادبی روایت نے پہلے ہی سے کام مقرر کر دیا ہے۔ فرانس کی روح کا حکم ہے کہ سارتر یہی کام کرے، بین الاقوامی ترانے لکھنے کے لیے اور بہت سے نیک اور رقیق القلب انسان موجود ہیں۔

اطالوی ادب کے بارے میں میں جو کچھ کہہ سکوں گا وہ تو اور بھی ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ بہرحال چالیس پچاس نظمیں پڑھنے کے بعد میرے اوپر جو مجموعی اثر ہوا ہے، اُسے سمجھنے کی کوشش کرنا تو میرا حق ہے ہی۔ اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اطالوی ادب میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ جذبات کو عقل اور اکتسابی علوم کی مدد سے سمجھا جائے۔ رہا انگریزی ادب کی روایت کا مسئلہ، تو یہ ایسی چیز ہے جس نے بڑے بڑے انگریز نقادوں کو چکرا رکھا ہے، میں بچارا کیا کھا کے بولوں گا۔

یورپ کی ادبی روایتوں کے ذکر سے میرا مطلب اپنی علمیت کا اشتہار نہیں تھا۔ مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ ادبی روایت کا مرکزی رجحان کس قسم کا ہو سکتا ہے۔ اب آیئے

اُردو کی طرف، بچاری اُردو کی عمر ہی کیا، بہت سے بہت تین سو برس۔ اس عرصے میں کوئی نمایاں رجحان پیدا نہ بھی ہوتا تو ایسے تعجب کی بات نہیں تھی، مگر اُردو کو ایک بڑا فائدہ رہا۔ اُردو ادب پیدا ہونے سے کئی صدیاں پہلے ہندو اور مسلم کلچر کا تصادم شروع ہو چکا تھا۔ تصادم سے میرا مطلب سر پھٹول نہیں ہے بلکہ مڈبھیڑ، یعنی ایک دوسرے کی ہستی سے آگاہ ہونا، ایک دوسرے پر اثر ڈالنا ہے، اس تصادم سے ایک خاص قسم کا رجحان پیدا ہوا جو مفت میں اُردو ادب کو مل گیا۔ اب اس رجحان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندو فلسفے یا مذہب کے متعلق کوئی بات کہنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ یہ ایسا پیچ در پیچ معاملہ ہے کہ ہر بات صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ بہرحال اب مضمون لکھتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات کہنی ہی پڑے گی — ہندوؤں کا تفکر بڑا مطلق اور مجرد قسم کا رہا ہے۔ گیان دھیان کے لیے یا تو خاص آدمی الگ کر دیئے گئے تھے ورنہ عمر کا ایک خاص حصہ، پھر اس کام کے لیے آدمی کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ ہو کر خلوت میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے برخلاف اسلام نے اجتماعی زندگی پر زور دیا ہے، اور نیک عمل کا درجہ تفکر سے بڑا یا اس کے برابر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے زیرِ اثر ہندوؤں میں جو اصلاحی یا مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں، ان میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ روحانیت اور دنیاویت کو کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ کبیر، تلسی داس وغیرہ کی شاعری میں ایک نئی دنیاویت اور روزمرہ زندگی کی ضرورتوں کو شدید احساس نظر آتا ہے۔ شاعر اس قسم کی مثالی زندگی کا تصور کرتے ہیں جہاں آدمی زندگی سے تعلق بھی رکھے اور بے تعلق بھی رہے، یعنی ایک بڑا لطیف قسم کا روحانی اور ذہنی توازن حاصل کر لے مثلاً تلسی داس کا یہ شعر (یہ اس وجہ سے کہ مجھے صرف ایک ہی یاد ہے):

تلسی داس کھڑے بجار میں مانگیں سب کی کھیر
ناں کاہو سے دوستی، ناں کاہو سے بیر

روحانی توازن کی یہ تلاش اُردو ادب کو بھی ورثہ میں ملی — یعنی ایسا توازن کہ نہ تو انسان کی روحانیت زائل ہو نہ دنیا کے دکھوں میں فرق آئے۔ اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ یہ روایت بھی پلتی بڑھتی رہی اور جب اُردو کو اپنا سب سے بڑا شاعر (یعنی میر) مل گیا تو اس روایت نے ایک ایسی واضح شکل اختیار کر لی جو صرف اُردو ادب سے مخصوص ہے۔ اُردو کی مرکزی روایت انسان کو اس طرح دیکھتی ہے کہ ایک طرف تو فرد کے اعلیٰ ترین

اور لطیف ترین احساسات ہیں جو لازمی طور پر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اجتماعی زندگی سے بے تعلق ہو کر ان سے مستفید ہو، دوسری طرف روزمرہ زندگی کے مطالبات ہیں جن سے اگر یہ حساس فرد آزاد ہو جائے تو راہب یا پاگل یا قیس عامری بن کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ تو اب مسئلہ یہ ہے کہ ایسے متضاد مطالبات کس طرح پورے کیے جائیں کہ دنیاوی معمولات میں بھی فرق نہ آئے اور ہماری شخصیت کے اعلیٰ ترین عناصر بھی زنگ آلود ہو کے نہ رہ جائیں۔ اس مسئلے کا جو حل ہے، اسے تنقید کی زبان نہیں بیان کرسکتی بلکہ بڑا ادب اُسے بیان کیے بغیر ہمیں وہ توازن عطا کر دیتا ہے۔ یہ نازک توازن میر کے شعروں میں ہمیں ہر جگہ ملتا ہے۔

میر کے متعلق یہ بات تسلیم کر لینے میں غالباً آپ کو زیادہ تامل نہیں ہوگا البتہ اعتراض یہ وارد ہوسکتا ہے کہ میں نے میر کی شاعری کو اُردو ادب کی مرکزی روایت کیسے سمجھ لیا۔ یہ جرات میں نے صرف اس بنا پر کی کہ اُردو کے باغی سے باغی شاعر نے میر کی عظمت تسلیم کی ہے، اور میر کے رنگ میں شعر کہنے کو اپنے لیے فخر کا باعث سمجھا ہے اور شاعری چھوڑیے، نثر کو لیجیے، میرامن سیدھی سادھی عبارت لکھتے ہیں نہ کلیاں لگاتے ہیں نہ پھندنے۔ ان کے انداز سے کسی گہرے روحانی مسئلے سے دو چار ہونے کا ثبوت نہیں ملتا مگر ان میں وہ سستا پن بھی نہیں جو روحانی مسائل سے بالکل بے نیاز ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی باتوں کو وہ جس طمانیت قلب کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اس سے صاف جھلکتا ہے کہ انہیں اس بیان میں ایک سکون سا مل رہا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ توازن ان جیسے آدمی کی جدوجہد سے حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا، یہ تو انہیں پیش روؤں سے ملا ہے، اور دنیاوی اور روحانی کاروبار کی ایک عملی آہنگی انہوں نے ترکے میں پائی ہے۔ اسی وجہ سے توازن کی نثر کی سطح ایسی ہموار ہے اور اُس پر روحانی کشمکش کی سلوٹیں نہیں ملتیں۔ میرامن تو دُور رہے، اس توازن کے نشان "طلسم ہوش ربا" تک کی نثر میں ملتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ سکون کا احساس اب لذت کا احساس بن گیا ہے۔ یہی لذت سرشار اور سجاد حسین میں چٹخارہ بن جاتی ہے، مگر اُس میرامن والے سکون کا رنگ میر باقر علی داستان گو کی نثر میں جھلکتا ہے۔ وہی کیا، وہی کیا، دلی کے لکھنے والوں میں بھی اس کا اثر ہے، البتہ جب سے ابوالکلام آزاد وغیرہم نے اُردو نثر کی طرف توجہ فرمائی، رنگ بے رنگ ہی ہوتا چلا گیا۔

تو آج پاکستان میں جب ہم اپنی زندگی از سرِ نو تعمیر کر رہے ہیں (مگر پرانے اینٹ گارے سے) وہ چاہے پرانے ادب والے ہوں یا نئے ادب والے، ہم سب کا فرض یہی ہے کہ ہم اُردو کی مرکزی روایت کو اپنے اندر جذب کریں اور اپنے آپ کو اسی کے اختیار میں دے دیں۔ مجھے یہ ضد نہیں ہے کہ اُردو کی مرکزی روایت وہی ہے جو میں نے بتائی ہے، ممکن ہے کوئی دوسری عمدہ ہو۔ اس میں تو بحث و تمحیص کی بہت گنجائش ہے۔ بہرحال روایت جو بھی ہو، ہمیں اس روایت کو اپنے افسانوں اور اپنی نظموں میں نئی زندگی دینی ہے، کیونکہ ہماری تخلیق اسی وقت سب سے زیادہ قابلِ قدر ہو سکتی ہے جب وہ ہمارے ادب کی بنیادی جستجو میں شریک ہو۔

یہ صرف میری ذاتی خواہشات نہیں ہیں نہ کسی کے کہہ دینے سے نئی ادبی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ہماری ادبی روایت واقعی زندہ ہو رہی ہے اور نئے حالات کی تفسیر و ترجمانی کرکے انہیں بھی اپنے دائرے میں لے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام سب سے پہلے اسی صنفِ ادب میں شروع ہونا چاہیے جو روایت کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ یوں تو آج سے دس سال پہلے بھی میراجی، حفیظ ہوشیارپوری اور مختار صدیقی میر کے رنگ میں غزل کہنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر اب تو ہر نوجوان غزل گو کے شعروں میں میر گونج رہا ہے۔ خصوصاً ناصر کاظمی کے یہاں جس طرح میر کی آواز اُبھر آتی ہے، اس پر خود انہیں حیرت ہے کیونکہ وہ شعوری طور پر تو غالب کے مقلد ہیں۔ مثلاً ان کے دو تازہ شعر یہ ہیں ؎

ان کا پیغام بھی ضروری ہے
اور مجھے کام بھی ضروری ہے
ہے بڑا کام عشق میں جینا
اور یہ کام بھی ضروری ہے

تو یہ رجحانات تو بغیر کسی کے کہے سنے، اپنے آپ سے اپنے آپ پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ان پر بھی غور و فکر ہوتا چلے تو ہمارے تخلیقی کام کرنے والوں کو بڑا سہارا ملے گا اور وہ سازگار فضا میں اپنا کام جاری رکھ سکیں گے۔

(فروری ۱۹۴۹ء)

معروضیت اور ذمہ داری

ایک فرانسیسی ناول کا ہیرو ہر قسم کی بداعمالیوں کو آزما آزما کر اکتا جاتا ہے تو مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے اور معرفت کی تلاش میں تھوڑے دن کے لیے ایک خانقاہ میں جا کے ٹھہرتا ہے۔ یوں تو اُسے مذہب پر پورا اعتقاد ہے مگر یقین عین الیقین نہیں بن پاتا۔ جب یہ منزل قریب آتی معلوم ہوتی ہے تو ہر دفعہ اندر سے کوئی یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ مذہبی رسمیں ڈھکوسلا ہیں، تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہو، وغیرہ وغیرہ۔ وہ ایک راہب سے شکایت کرتا ہے تو راہب اسے سمجھاتا ہے کہ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے، اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ تم شیطان سے بات ہی نہ کرو۔

صرف تصوف ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے اور کئی شعبوں میں بھی یہ اصول بڑا کارآمد ہے مگر فرانسیسی قوم فطرتاً اس مشورے پر عمل کرنے سے معذور ہے۔ اگر اسے شیطان سے بات کرنے کا لپکا نہ ہوتا تو ایسی نادر ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ تو آج یہ قوم دنیا کی سب سے مستحکم اور طاقت ور قوم ہوتی لیکن اگر شیطان سے بات چیت بالکل ہی بند ہو جائے تو انسان کا بُرا حشر ہو۔ بہرحال اس کی قیمت ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس گفت و شنید میں فرانس کی جو حالت بھی ہو گئی ہو، اس سے قطع نظر فرانس بیسویں صدی میں انسانیت کا ضمیر بلکہ شعور بن گیا ہے۔ ساری انسانیت کی طرف سے فرانس قربانیاں دیتا ہے، مصیبتیں جھیلتا ہے تاکہ انسان کی حقیقت دریافت کی جا سکے، انسان کے بارے میں سچ بولا جا سکے۔ یہ کوئی خوش گوار فرائض نہیں ہیں۔ حقیقت کی دریافت میں جس تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے وہ تو الگ رہی، سچ بولنے کے بعد دوسرے انسانوں کی نفرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ذمہ داری خوشی خوشی کون اپنے سر لیتا ہے۔ فطرت نے ایک کام سر ڈال دیا ہے، ہار جھک مار کے فرانس کو کرنا پڑتا ہے۔ اب چاہے کسی کو بُرا لگے یا بھلا۔

اب سنئے کہ دو فرانسیسیوں کے کان میں شیطان نے کیا پھونکا۔ آندرے ژید اور ژاں پال سارتر دونوں کے دونوں اپنے ملک کی محبت میں کسی سے کم نہیں ہیں (البتہ اُنہیں حق اور صداقت سے ذرا زیادہ پیار ہے) فرانس کو جرمنوں کے پنجے سے آزاد کرانے کے لیے ادیبوں نے جو جماعت بنائی تھی، اُس میں یہ دونوں شامل تھے مگر اپنے احساسات کے تجزیے سے جدوجہد کے زمانے میں بھی غافل نہیں ہوئے چنانچہ جرمنوں کے دورانِ تسلط میں انہوں نے یہ عجیب بات محسوس کی کہ اب زندگی غیروں کے اختیار میں چلی گئی اور ذمہ داری براہِ راست ہمارے اوپر نہیں رہی تو ہمارے اندر ایک نئی معروضیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب ہم خود اپنی زندگی پر اس طرح غور کر سکتے ہیں جیسے یہ ہماری زندگی ہی نہ ہو، ہماری محبتیں اور نفرتیں خارجی چیزیں بن گئی ہیں۔ یہ بات ان لوگوں نے محسوس کی اور بڑی ایمانداری سے کہہ دی حالانکہ بہت ممکن ہے سچ بولنے کے بدلے میں انہیں کسی دن چوراہے پہ زندہ جلا دیا جائے۔

خیر، فی الحال مستقبل کی فکر چھوڑ کے یہ دیکھیے کہ ان کے اس قول سے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں تھوڑی بہت معروضیت ہو، مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذمہ داری آئی اور معروضیت رخصت ہوئی، ورنہ کم ہوگئی۔ معروضیت بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو عمل انسان کی معروضیت جو یہ بتا سکے کہ مقصد کے حصول میں کون سی بات مفید ہوگی کون سی غیر مفید۔ دوسری معروضیت ہے فن کار یا مفکر کی جو مفید اور غیر مفید کے معیار سے بلند ہو کر چیزوں کو دیکھتی ہے۔ مثالی کامیابی کا تصور کرنے کے لیے فن کار کی معروضیت ضروری ہے۔ مگر عملی کامیابی میں یہ معروضیت سد راہ بھی بن سکتی ہے۔ زندگی کے نازک مرحلوں پر، کم سے کم قوم کے رہنماؤں میں، وقتی طور پر شاید اس معروضیت کا معطل رہنا ہی ٹھیک ہو مگر ایسے نازک موقع پر رہنماؤں کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ فن کار اور مفکر کی معروضیت عرصے تک عمل میں رہ چکی ہو۔ عام حالات میں اس معروضیت کا معطل رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

پاکستان میں ہماری قومی زندگی کا سب سے اندیشہ ناک پہلو یہی ہے کہ اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ہمارے یہاں فنکارانہ اور مفکرانہ معروضیت بالکل حرکت ہی میں نہیں آئی۔ ہمارے یہاں ذہنی جمود کا یہ عالم ہے کہ ''ڈان'' اخبار تک گھبرا کے چیخ اٹھا کہ ہندوستان علم و فن اور فکر کی دنیا میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے مگر ہم اُلٹے تنزل پذیر ہیں۔

اس انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں سیاسی اور معاشی معاملات میں تو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو چلا ہے مگر ابھی تک ہم اس بات کا تعین نہیں کر سکے کہ افکار کی دنیا میں ہماری بنیادی ذمہ داری کیا ہے۔ مجرد اور مطلق تفکر کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دیجیے، مگر ہم نے ابھی تک اتنی بات بھی نہیں سمجھی کہ سیاسی ضرورت، سیاسی عمل اور سیاسی تفکر الگ الگ چیزیں ہیں۔ معاشی اصلاح فوراً ہونی چاہیے۔ مان لیا، مگر اس سے پہلے کہ ایک آدھ آدمی کوئی ایسا بھی تو اٹھتا جو ہمیں بالکل غیر جذباتی اور معروضی طریقے سے یہ سمجھاتا کہ معاشی اصلاح کس چڑیا کا نام ہے۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں اور ہر ایک کے اچھے برے پہلو کون کون سے ہیں جب تک ہماری زندگی انگریزوں کے اختیار میں تھی، ہم سوچنے سمجھنے کی بری بھلی کوشش تو کرتے ہی تھے، اپنی سیاست کے بارے میں، اپنی معاشیات کے بارے میں، اپنے ادب کے بارے میں، لیکن جس دن سے ہمیں سیاسی اختیار ملا، ہمارا دماغ ہمارے اختیار سے باہر ہو گیا — خارجی دنیا کی ذمہ داری داخلی دنیا میں غیر ذمہ داری بن گئی۔ خارجی زندگی کو متاثر کرنے کی اہلیت حاصل ہوتے ہی ہم یہ بات بھول گئے کہ اگر اپنی داخلی زندگی اپنے قابو میں نہ رہی تو خارجی زندگی پر بھی اپنا اختیار قائم نہیں رہ سکتا۔ غلامی کے زمانے میں چونکہ ہمارا عمل اتنا بار آور نہیں ہو سکتا تھا، اور اب ہمیں اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا ہے، اس لیے غالباً سب سے پہلی کرامت یہ ظہور میں آئی ہے کہ ہماری آنکھیں ہی خیرہ ہو گئی ہیں اور فکر و عمل کے درمیان جو حد فاصل ہونی چاہیے وہ مٹ گئی ہے۔ ہم نئے نئے آزاد ہوئے ہیں اس لیے ہم اتنی بات سے مطمئن نہیں ہوتے کہ اپنے عمل کے امکانات کا تصور کریں اور دل ہی دل میں خوش ہو لیں۔ ہم جلد سے جلد یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ بیرونی حقیقت ہمارے عمل سے کس حد تک متاثر ہوئی ہے۔ اس رجحان کا اثر لکھنے والوں پر بھی پڑا ہے جنہیں پیشے کے اعتبار سے تو بیرونی حقیقت کو براہ راست متاثر کرنے نہ کرنے کی فکر سب سے کم ہونی چاہیے مگر ہمارے یہاں لکھنے والوں میں بھی معروضی غور و فکر کی عادت اتنی گھٹتی جا رہی ہے کہ اُردو میں الفاظ اپنے وسیع ترین اور مبہم ترین معنوں میں اس فراخدلی سے شاید ہی کبھی استعمال ہوئے ہوں جیسے آج کل ہو رہے ہیں۔ ہم خارجی حالات کو تو اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں مگر جس چیز کے ذریعے ہم یہ مہم سر کر سکتے تھے، وہ بے قابو ہوئی جا رہی ہے۔ ہمارے لکھنے والے اپنے آپ کو لفظوں کے سپرد کرتے جا رہے ہیں خصوصاً ایسے لفظوں میں جو سیاسی مصلحات کی شکل اختیار کر

چکے ہیں اور جن کے مناسبات مختلف سیاسی جماعتوں کے ذہن میں مختلف ہیں۔

بظاہر تو یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ جب ملک کے سامنے ایسے زبردست مادی مسائل درپیش ہوں تو لکھنے والے بیٹھے لفظوں کے معنی ڈھونڈتے رہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ مادی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی کسی نہ کسی حد تک لفظوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ اگر لفظوں کے معنی ہی متعین نہیں ہیں تو ہمارے مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ جائیں گے۔ پھر خصوصاً لکھنے والے کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے خیالات اور محسوسات کا اظہار ایسے انداز میں کرے جو زیادہ سے زیادہ معین ہو خواہ اس طرح لوگوں کے دلوں پہ تحریر کا اثر ہو یا نہ ہو اگر لکھنے والے کو اپنے پیشے سے ایسی ہی دلچسپی ہو جیسے موچی یا بڑھئی یا لوہار کو اپنے اپنے پیشوں سے ہوتی ہے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں لیکن اگر لکھنے والے کی دلچسپی کا مرکز لکھنے کے علاوہ کوئی اور چیز ہو تو معاملہ صاف ہے جرمانہ نہ شکرانہ۔

لفظوں کے استعمال میں لاابالی پن برتنے کی وبا ہمارے ملک ہی تک محدود نہیں، ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، اور کئی لکھنے والے اس کا رونا رو چکے ہیں۔ فی الحال تین آدمیوں کے خیالات پیش کرتا ہوں تاکہ اگر ان کی بات آپ کو پسند نہ آئے تو کم سے کم میری علمیت کا تو اشتہار ہو ہی جائے۔ تین آدمی میں نے ایسے چھانٹے ہیں جن کے رجحانات و میلانات میں، طبیعتوں میں، ذہنی تربیت میں، سیاسی خیالات میں، زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان میں جو دو فرانسیسی ہیں وہ تو ایک دوسرے کے نام سے چڑتے ہیں، اور کبھی کسی محفل میں یکجا ہو جائیں تو شاید تو تو میں میں کے بغیر نہ اٹھیں، البتہ ان تینوں میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ ادب ہی کو ساری زندگی نہیں سمجھتے، زندگی کے اور شعبہ پر بھی بڑے جوش و خروش سے لکھتے ہیں، مگر لکھنے کو ایک الگ فن سمجھتے ہیں جس طرح جوتے بنانا ایک الگ فن ہے جیسے جوتے بنانے والا رانپی کو پھاوڑے کی طرح استعمال نہیں کرتا۔ اس کے آلات اس پر چند شرطیں عائد کرتے ہیں، اسی طرح لکھنے والوں کے آلات بھی چند شرطیں عائد کرتے ہیں چنانچہ یہ تینوں لکھنے والے بھی مجبور ہیں کہ اپنے تمام اختلافات کے باوجود ان شرطوں کو تسلیم کریں جو تینوں کے لیے یکساں ہیں، البتہ عام لکھنے والے شاید شرطیں ماننے میں آنا کانی کریں کیونکہ اگر موچی جوتا ٹیڑھا بنائے تو فوراً نظر آجاتا ہے، خیالات ٹیڑھے بھینگے ہوں تو جلدی پتہ نہیں چلتا، اس لیے خواہ مخواہ کی ذمہ داری کون

مول لے خیراب تینوں آدمیوں کی باتیں سنیے:

عذرا پاؤنڈ کو سیاست اور معاشیات سے بڑی دلچسپی ہے خواہ فسطائیت والی سیاست ہی ہو۔ ان کی نظموں کا بہت بڑا حصہ سرمایہ داری اور سود خواری کی مذمت سے متعلق ہے لیکن ان بنیادی دلچسپیوں کے باوجود جب وہ لکھنے کے فرائض پر غور کرنے بیٹھتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ ادیب خطرے کی گھنٹی تو ضرور ہے، آگ بجھانے والا انجن نہیں ہے۔ اگر آپ گھنٹی میں پانی بھر بھر کر آگ پر ڈالیں تو نتیجہ ظاہر ہے اُن کے خیال میں لکھنے والے کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنی بات مختصر ترین اور صحیح ترین الفاظ میں کہے اور الفاظ کے مفہوم کو مبہم یا مسخ نہ ہونے دے۔ یہی ادیب کی سب سے بڑی سماجی خدمت ہے کیونکہ اگر الفاظ کا مفہوم مسخ ہو گیا تو آوے کا آوا ہی بگڑتا چلا جائے گا یہاں تک کہ قانون بھی ٹھیک طرح نہیں بن سکیں گے اور نہ ان پر ٹھیک طرح سے عمل درآمد ہو سکے گا۔ ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ پاؤنڈ نے شاعروں کو آزاد نہیں چھوڑا، انہیں بھی اسی زنجیر سے باندھا ہے۔

دوسرے صاحب ہیں ژولیاں باندا پچھلے ڈیڑھ سو سال میں فرانس نے جتنا ادب پیدا کیا ہے، یہ اس سب کو سوختنی سمجھتے ہیں اور "خالص ادب" کے سخت دشمن ہیں۔ اب تو ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ادب کے نام سے چڑنے لگے ہیں اور لفظ "ادیب" کو گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، خصوصاً سارتر اور ان کے ہمنوا تو انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے، اُن سے چھوت چھات برتتے ہیں خیر تو ان حضرت نے کوئی بیس سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے "عالموں کی غداری" میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر پاکستان کے سنجیدہ طبقے کو آنکھیں کھول کر چلنا منظور ہے تو اس کتاب کو پڑھنا ناگزیر ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے بنیادی خیال یہ پیش کیا ہے کہ متوازن سماجی نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس کی چند بنیادی اقدار ہوں جو قطعی غیر مادی اور غیر مرئی ہوں اور جنہیں بغیر کسی شرط کے قبول کیا جاتا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے دکھایا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد سے کس طرح غیر مادی اقدار ختم ہوتی چلی گئیں اور طبیعتوں پر مادیت غالب آتی چلی گئی۔ اس مادیت نے بڑے بڑے خوبصورت نقاب اوڑھے۔ عقلیت پرستی بنی، فطرت پرستی بنی، ترقی پسندی بنی، آمریت بنی، جمہوریت بنی، افادیت اور اضافیت کا قالب اختیار کیا، اکتسابیت اور تجرباتیت کا روپ دھارا۔ اس مادیت کی بنیاد پر جو سیاست تعمیر ہوئی وہ تو ہونا ہی چاہیے تھے نور علیٰ نور،

غضب یہ ہوا کہ ادیبوں اور مفکروں نے بھی غیر مادی اقدار کی دھن چھوڑ اسی مادیت کے آگے سر جھکایا- محض تجرباتی اور اضافی فلسفے اور سیاست کو ادیبوں کا تخیل مل جائے تو پھر انسانیت کی تباہی کے لیے کسی اور سامان کی ضرورت نہیں- ادیبوں وغیرہ کے طبقے نے ایک اور ظلم یہ ڈھایا کہ سیاسی جماعتوں نے اپنی ضرورتوں کے پیش نظر جس لفظ کو جو معنی دینے چاہے، وہ ان لوگوں نے بے چون و چرا قبول کر لیے- مادیت کا مقابلہ کرنے کے بجائے یہ لوگ مادیت کے غلام بن گئے- یہی عالموں کی غداری ہے- اس غداری کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اور بڑی باتیں تو الگ رہیں، ایک ایک لفظ کے چھ چھ مفہوم ہوگئے ہیں، اور وہ بھی مبہم چنانچہ انسانوں کے درمیان گفت و شنید ناممکن ہوگئی ہے- ایک کہتا ہے آم کی تو دوسرا سمجھتا ہے املی کی- اس کے بعد انسانیت کی شکست و ریخت میں کیا کسر رہ جاتی ہے؟ باندا کے نزدیک لکھنے والے اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی کر سکتے ہیں کہ غیر مادی اقدار کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کریں- اس معاملے میں سب سے پہلا قدم یہی ہے کہ لفظوں کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ہم ایک دوسرے کی بات تو سمجھ سکیں- اب تو یہ حال ہے کہ جو لفظ مقبول ہو جائے، اسی کو ہر جماعت اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتی ہے- بذاتِ خود لفظوں کی کوئی ہستی باقی ہی نہیں رہی- لفظ بھی تجرباتیت کی لپیٹ میں آگئے ہیں-

تیسرے ژاں پال سارتر ہیں جو خالی فلسفی اور ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ فرانس کی آزادی کے لیے لڑ بھی چکے ہیں- ایک طرف تو انہوں نے فلسفہ زیست کا ڈھونگ رچایا ہے جسے بعض حضرات انحطاط پذیری کی انتہا کہتے ہیں بلکہ سارتر تو اقراری ملزم ہیں، بس انتظار یہ ہے کہ کب آراگوں صاحب کو ناخن ملیں اور کب ان کی ہولی جلے- خیر، دوسری طرف انہوں نے "ذمہ دار ادب" کا شاخسانہ نکالا ہے- اپنے خیالات کی وضاحت انہوں نے ایک دو سو صفحے کے مضمون میں کی ہے جس کا نام ہے "ادب کیا ہے؟" یہ سارا مضمون ادبی خلوص، انسانی ایمانداری، مفکرانہ گہرائی اور شدت کا تاج محل ہے- شعر کی ماہیت کے متعلق ایسے چونکا دینے والے خیالات آج تک میری نظر سے تو گزرے نہیں- اس مضمون میں انہوں نے شعر کو تو بالکل ہی خارج از بحث قرار دے دیا ہے کیونکہ شاعر لفظوں کو استعمال نہیں کرتا، لفظ اسے استعمال کرتے ہیں- نثر نگار لفظوں کے اندر پہنچ جاتا ہے، شاعر باہر کھڑا رہتا ہے- نثر نگار چیزوں کی ماہیت بیان کرتا ہے- شاعر ایک نئی چیز تخلیق کرتا

ہے، چنانچہ ہم شاعر پر پابندیاں عائد نہیں کرتے البتہ نثر نگاروں پر ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد سارتر نے ازمنہ متوسطہ سے لے کر آج تک کی ادبی تاریخ کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ ہمارے زمانے میں ادیب کے پاس سامعین نہیں رہے، وہ بالکل اکیلا اور بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔ ادب کو موثر اور جاندار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ادیب عوام کی زندگی میں دلچسپی لیں، جو بے انصافیاں زندگی میں نظر آئیں، ان کے خلاف احتجاج کریں اور اپنے قلم سے انقلاب کی خدمت کریں۔ غرضیکہ جو باتیں ترقی پسند کہتے رہتے ہیں، وہی سارتر نے بھی کہی ہیں بلکہ خود اس قسم کے ڈرامے لکھے ہیں — مثلاً "شریف رنڈی" جو امریکی جبشیوں کے مسئلے سے متعلق ہے، پھر سارتر نے اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ جب ادیب کی ذمہ داری کے یہ معنی ہوئے تو پھر کمیونسٹ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ آج کل کمیونسٹ، انقلاب کے لیے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں بلکہ روس کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے اور روس بھی وہ جو کم سے کم ظاہری طور پر انقلاب کی راہ سے ہٹ گیا ہے اور جس کی سیاست سامراجیوں سے بھی زیادہ مصلحت کی قائل ہو گئی ہے، تو ادیب کسی جماعت میں بھی شامل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا سوال سارتر یہ کرتا ہے کہ یہ انقلاب کیا چیز ہے جس کی حمایت ادیب کے لیے ضروری ہے۔ اب اسے نظر آتا ہے کہ اس لفظ کے بھی بیسیوں معنی ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ جو چیز جیسی ہے، اسے قائم رکھنے کے معنی انقلاب ہیں۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ پیداوار بڑھانا انقلاب ہے۔ اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد سارتر سوچتا ہے کہ ادیب کو لفظوں کے معنی ہی نہیں معلوم تو وہ انقلاب کی خدمت کیا خاک کرے گا۔ اس لیے ادیب کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہونی چاہیے کہ وہ لفظوں کو جھاڑ جھنکار سے پاک کر کے ان کی حد بندی کرے اور ان کے مفہوم کو روز شکلیں بدلنے سے بچائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ادیب ہر قسم کی جماعتی پابندیوں سے آزاد ہو اور صرف اپنے کام کا غلام ہو۔ یہی اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ تو فی الجملہ سارتر کا نصب العین یہ قرار پایا: "انتہائی ذمہ دار اور انتہائی آزاد ادب"۔

یہ تین ایسے آدمیوں کی رائیں ہیں جن کے دل میں ادب کی عزت بغیر ثانوی شرائط کے ہے اور جو ادب کی عزت کرنے کے باوجود اسے زندگی کی متعدد سرگرمیوں میں سے ایک سمجھتے ہیں، سب نہیں یہ تین آدمی اپنے اپنے راستے پر چلتے چلتے ایک جگہ آملے

ہیں۔ ادبی ایمانداری سے کام لیا جائے تو ان کی بات سے انکار ممکن نہیں۔ جس قسم کی ذہنی کاہلی ان لوگوں کو یورپ کے لیے خطرناک نظر آتی ہے، وہ ہمارے لیے تو مہلک ہے۔ یورپ میں کم سے کم زندگی کا ایک ڈھرا تو ہے ہمیں تو اپنی قومی زندگی میں ہر ہر چیز کے لیے ایک معیار مقرر کرنا ہے۔ ہمارے ذہنوں کو اگر اس آرام طلبی کی عادت پڑ گئی اور ہم مقبول ترین لفظوں کے مبہم ترین مفہوم قبول کر کے چلے گئے تو یہی انجام ہو گا کہ آنکھیں مانگتے پھریں۔ ٹھیٹ معروضی تفکر کی مدد سے قائداعظم نے پاکستان بنایا ہے۔ پاکستان کے لیے جس شاندار مستقبل کا خواب انھوں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر بھی معروضی تفکر کے بغیر ممکن نہیں، ادب تو پھر بھی چھوٹی چیز ہے۔

(مارچ ۱۹۴۹ء)

قراردادِ مقاصد اور پاکستان

یوں تو عام طور سے بھی میرا مضمون، بقول ایک بزرگ کے "احسان" اخبار کا ایڈیٹوریل ہوتا ہے (مجھے یہ اخبار دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا، مگر یہ بات سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس کے شذرات میں زندہ انسانوں کے زندہ مسائل کے متعلق زندہ انسانوں کی طرح لکھا جاتا ہو گا) مگر اب کے تو میں نے ایسا موضوع انتخاب کیا ہے جو ٹھیٹ اخباری ہے، جس پر تشفی بخش طریقے سے یا تو شدید احساس کی زبان میں بحث ہو سکتی ہے یا پھر اخبار کی رسمی، گھسی پٹی، پنچایتی اور قدرے بے خلوص زبان میں تیسرا انداز میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ موضوع ہی ایسا بے ڈھنگا ہے — یعنی اللہ میاں!

ویسے بھی سرکاری ادیب کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ حکومت کے گن گاتا رہوں۔ اگر حکومت بیٹھے بٹھائے ایک اخباری چیز — یعنی اللہ میاں — کو پاکستان کے دستور میں گھسیٹ لائے تو مجبوراً مجھے مضمون لکھنا ہی پڑے گا، بندگی بیچارگی، اگر حکومت کائنات کا سارا اختیار خدا کے سپرد کر دے تو مجھے اپنے فرائض منصبی بجا لاتے ہوئے خوشی کا اظہار کرنا ہی چاہیے، لیکن اپنے منفی رجحانات کے تحت مجھے ذاتی طور سے بھی بڑی خوشی ہوئی ہے، اور وہ اس بات پر کہ زمانے کے فیشن کے مطابق سارے اختیار و اقتدار کا واحد مالک عوام کو نہیں سمجھا گیا۔ میری رجعت پسندی کو اس پر بھی صبر نہیں ہے میں اسے ایک انقلابی اقدام کہنا چاہتا ہوں بلکہ میری عوام دشمنی مجھے اقبال کا یہ شعر پڑھنے پر اکساتی ہے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

بعض لوگوں نے قراردادِ مقاصد پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ خدا کو مختار کل بنانے نہ بنانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس قرارداد کے باوجود پاکستان کی سیاست

مذہب سے الگ رہ کر اپنے ڈھرے پر چل سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو، شاید ہماری سیاست اس بنیادی اصول سے متاثر نہ ہو لیکن اگر پاکستان کے عام باشندوں کے عقائد میں زبردست تبدیلیاں واقع نہ ہوئیں۔ (جس کی فی الحال کوئی اُمید نہیں ہے) تو اس قرارداد کا اثر ہماری معاشرت، ہماری تہذیب، ہمارے ادب پر، ہماری ذہنیت اور ہمارے سوچنے سمجھنے کے طریقوں پر بہت گہرا پڑے گا۔ اس کے بعد یہ بہت مشکل ہے کہ ہماری سیاست اس اثر سے محفوظ رہے۔

بعض حضرات کو خدشہ ہے کہ خدا کو مختار کُل ماننے سے آمرانہ رجحانات کو تقویت پہنچے گی اور کوئی ایک آدمی یا چند آدمی خدا کے نائب بن بیٹھیں گے، مگر یہ خطرہ کچھ اس عقیدے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ناجائز فائدہ اٹھانے والے ہر عقیدے سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے ملک موجود ہیں جہاں عوام کو مختار کل سمجھا جاتا ہے، مگر چند لوگ عوام کے نائب بن بیٹھے ہیں۔ یہ اعتراض بجا ہے کہ خدا تو ایک مبہم داخلی تصور ہے۔ ہم اس کی مرضی کا تعین براہِ راست نہیں کرسکتے، مگر دراصل عوام کا تصور بھی کچھ ایسا غیر مبہم، غیر داخلی اور غیر مثالی نہیں ہے۔ ایمانداری کے ساتھ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ عوام کی مرضی کا حقیقی تعین ممکن ہے۔ تقسیم سے پہلے ہم روز دیکھتے تھے کہ مسلم لیگ کہتی تھی، عوام پاکستان چاہتے ہیں، کمیونسٹ کہتے تھے کہ نہیں عوام پاکستان سے زیادہ روٹی چاہتے ہیں۔ آج بھی پاکستان کی حکومت کہتی ہے کہ عوام سب سے پہلے اپنے ملک کو دشمن سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ نہیں عوام کے ذہن میں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے، عوام روٹی مانگتے ہیں۔ اب بتائیے کہ عوام کی خواہشات کا فیصلہ کیسے ہو؟ سیاست میں جس چیز کو عوام کی مرضی کہتے ہیں وہ ایک ایماندارانہ یا نیم ایماندارانہ یا غیر جانبدارانہ مفروضہ ہے۔ اگر عوام کا مطلب ایک اجتماعی نامیاتی جسم اور شخصیت ہے تو اس کی اندرونی تحریکات کا فیصلہ یوں دو لفظوں میں نہیں ہوسکتا، البتہ عملی سیاسیات میں بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی ان تحریکات کے بارے میں مفروضے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ یہ ایک عملی ضرورت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اب ان مفروضوں کو سیاسی لوگ اپنی شخصی یا جماعتی اغراض کے لیے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ سب مفروضوں میں فریب کاری کی گنجائش موجود ہے، البتہ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ بعض مفروضوں میں فریب کاری کی گنجائش زیادہ ہے۔ دوسرے مفروضے تو ایسے ہیں جن میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کو فریب دیتا ہے اور اس کی

گنجائش باقی رہتی ہے کہ فریب خوردہ طبقہ ایک نہ ایک دن ہوش میں آجائے گا۔ مگر اس مفروضے میں تو ہر آدمی اپنے جال میں پھنستا ہے اور ایسی مطلق خود پرستی کے جال سے نکلنا ناممکن ہے۔ یہ جادو اس وقت تک نہیں ٹوٹتا جب تک کہ آدمی کو متواتر ناکامیوں کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور آدمی دس پانچ مرتبہ اپنا اور کائنات کا مقابلہ و موازنہ نہ کرلے۔ اب تک انسان نے جتنی بھی شہنشاہیاں ایجاد کی ہیں، ان میں عوام کی مطلق شہنشاہی روحانی سکون کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے۔

مجھے معلوم ہے یہ بات آپ کو بُری لگی ہوگی کیونکہ آپ اور میں سب عوام میں شامل ہیں اور ہم سب کو اپنی (خودی نہیں) خود پرستی عزیز ہے، مگر ناراض ہونے سے پہلے اس پر غور کر لیجیے کہ عوام کی شہنشاہی کے تصور کے ساتھ ساتھ اور کون کون سے تصورات اور احساسات شامل ہیں۔ ایک تو یہ بات نظر میں رکھیے کہ آج کل عوام سے اوپر اور کوئی طاقت نہیں مانی جاتی، پھر یہ سوچیے کہ عوام کی خصوصیات کیا بتائی جاتی ہیں۔ عوام کی شہنشاہی کے پہلو بہ پہلو انسان کی فطرت کے متعلق بھی ایک ایسا نظریہ رائج ہے جس میں زندہ انسانوں کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کرکے انسان بلکہ انسانیت پر ایک مطلق و مجرد تصور کی حیثیت سے غور کیا گیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان فطرتاً انتہائی معصوم، پاک صاف، نیک طینت، تمام ممکن اچھائیوں کا مالک اور بے حد و حساب صلاحیتوں کا مخزن ہے۔ ان دونوں نظریوں کا ناگزیر نتیجہ آمریت ہونا چاہیے اور روس میں ایسا ہو بھی رہا ہے۔ عوام مختارِ کل سہی مگر وہ اس اختیار کا استعمال اصالتاً نہیں بلکہ وکالتاً ہی کرسکتے ہیں، اس لیے عملی طور سے اصلی اختیار کے مالک "عوام کے نمائندے" ٹھہرے۔ پھر چونکہ عوام انسان کی حیثیت سے معصوم ہیں اور نہ ان سے کوئی غلطی سرزد ہوسکتی ہے، چنانچہ کامریڈ اسٹالن ہر قسم کی لغزشوں سے ماورا ہیں چونکہ وہ عوام کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ اس لیے وہ گویا مجسم عوام ہیں اور ان کی ذات میں جملہ برکات نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ فارسی کے ایک قصیدے میں تو ہم نے بس اتنا ہی پڑھا تھا کہ:

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیرِ پا
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

مگر اس بات پر نہ تو بادشاہ کو یقین آیا ہوگا نہ خود شاعر کو۔ دونوں جانتے تھے کہ یہ تو لفظوں کا کھیل ہے، مگر روس کے ادیبوں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ

"عظیم اسٹالن کے عظیم الشان عہد میں دنیا کا عظیم ترین ادب پیدا ہوگا۔" ایسی چاپلوسی اور ایسی ذہنی غلامی کی مثال دنیا کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔ اسے چاپلوسی بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ — میں گواہی دے سکتا ہوں کہ ان حضرات کو اپنے ایک ایک لفظ پر پورا یقین ہوگا اور انہوں نے یہ بات پورے خلوص کے ساتھ کہی ہوگی کیونکہ اسٹالن تو روسی قوم کا للذا ہر روسی کا خارجی اور مثالی مظہر ہے۔ لہٰذا ان کی تعریف کرتے ہوئے ہر روسی یہ محسوس کرتا ہے جیسے اپنی تعریف کر رہا ہو، اور اس طرح نفس کو خوراک ملتی رہتی ہے۔ البتہ ایک بات سے میں واقعی مرعوب ہوتا ہوں۔ روس کے معاشی اور سماجی نظام میں کوئی تو ایسی بات ضرور ہوگی جس سے ان لوگوں کے اندر ایسی خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ ایسا زبردست دعویٰ کر سکے، مگر یہ خود اعتمادی حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں نے اپنا دل، دماغ، روح سب چیزیں بیچ دی ہیں۔

مگر کیا ایسی خود اعتمادی انسان کے لیے جائز ہے، کیا انسان اسے قائم رکھ سکتا ہے، کیا یہ رویہ صحت مندانہ ہے؟ یہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد سے اب تک روس کے کئی بڑے بڑے ادیبوں اور فن کاروں کو خودکشی کرنی پڑی ہے (اور ایسے لوگوں کو جنہیں آخر تک انقلاب کی بنیادی اقدار پر یقین تھا، مگر یہ اقدار اب ان کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھیں) اور کئی اچھے ادیبوں کا منہ حکومت کو بند کرنا پڑا ہے۔ بات یہ ہے انسانیت پرستی سے جو خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، اس کی عمر چار دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انسان کی طاقتوں کو لامحدود ماننے سے کیا ہوتا ہے، ہر آدمی کا ذاتی تجربہ تو اس عقیدے کو جھٹلاتا ہے۔ اس باب میں اجتماعی تجربے کی کیفیت بھی ایسی دل خوش کن نہیں۔ یوں لوگ دل بہلانے کو جو جی چاہے، کہتے رہیں۔ آدمی کی امیدیں جتنی زیادہ ہوں گی، اس کی مایوسی بھی اتنی ہی زبردست ہوگی۔ جو تہذیبیں یہ سمجھتی ہیں کہ ہم انسان کو یا عوام کو کائنات کی سب سے بڑی طاقت سمجھ کر دو تین سو سال تک متوازن طور پر ترقی کر سکتے ہیں وہ جھوٹے اور طفلانہ نظریوں کے نشے میں ہیں۔ بیس تیس سال میں اس بات کا پتہ نہیں چلتا، ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ انسان کی ہستی کو کائنات پر مسلط کر دینے کا خیال بڑا مبارک ہے، مرداں چنیں کنند، مگر کائنات ہماری خواہش کا احترام نہیں کرتی۔ ایسی خود اعتمادی کا نتیجہ ہمیشہ زندگی سے محرومی ہوتا ہے۔

پاکستان میں اس قرارداد کے بعد اس قسم کی انسانیت پرستانہ خوش فہمیوں کے لیے

گنجائش باقی نہیں رہی۔ جہاں تک عوام کی اہمیت کا سوال ہے، وہ اپنی جگہ مسلم ہے، انسان کی ہمت افزائی بھی درست ہے، مگر پاکستان میں اس نئے بت یعنی عوام (بحیثیت ایک مطلق و مجرد تصور کے) یا اس دوسرے بت یعنی انسان کی پرستش نہیں ہوگی۔ جب تک ہمارے عوام اسلامی عقیدوں پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو نہیں پوج سکتے۔ ہم نے موجودہ زمانے کی سامریت سے محفوظ رہ کر واقعی بت شکنی کی ہے اور ہم اسے ایک انقلابی فعل سمجھ سکتے ہیں جو دراصل تیرہ سو سال پرانا ہے، مگر جس کی تجدید برابر ہوتی رہنی چاہیے ورنہ انسان ہر وقت جھوٹے خداؤں کو پوجنے پر آمادہ رہتا ہے اور جس بت کو پوجنے کی ترغیب سے بچنا اس کے لیے سب سے مشکل ہے، وہ خود انسان ہے۔

ہم نے انسان پرستی سے بچ کر ایک صالح زندگی کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم نہ رہ سکیں یا ان اصولوں کی تمام شرائط پوری نہ کر سکیں، بہرحال ہماری قومی زندگی کی حدیں تو مقرر ہوگئیں۔ اس کے بعد صالح زندگی کی تعمیر کا دارومدار ہماری ہمتوں اور ہمارے تخیل پر ہے۔

(اپریل ۱۹۴۹ء)

استعجاب اور ادب

ایک صاحب جو بڑے زبردست "پروبونو پبلیکو" واقع ہوئے ہیں، لاہور کے انگریزی اخباروں میں اردو کتابوں پر اٹرم سٹرم تبصرہ کرتے ہوئے منٹو صاحب کا نام لیے بغیر دو تین دفعہ "گھٹیا افسانہ نگاروں" کے متعلق یہ شکایت کر چکے ہیں کہ یہ لوگ افسانے تو کیا چٹکلے، لکھتے ہیں اور افسانے کے آخر میں استعجاب پیدا کر کے پڑھنے والے کو بیوقوف بناتے ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ منٹو کی مدد کے لیے فوراً کمک لے کر چڑھ دوڑوں۔ ویسے بھی اگر منٹو صاحب اپنے پڑھنے والوں کو بیوقوف بناتے رہے ہیں تو یہ کام ہمیشہ چلنے والا نہیں ہے۔ اگر ان کی "چٹکلے بازی" کا جواز خود ان کے افسانوں کے اندر موجود نہیں ہے تو دنیا کا بڑے سے بڑا نقاد بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا، مگر یہ مسئلہ بذاتِ خود بڑا دلچسپ ہے کہ ادب میں استعجاب انگیزی اور چٹکلے بازی جائز ہے یا نہیں کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چٹکلے بازی جائز ہو مگر منٹو صاحب اس کا صحیح استعمال نہ کر سکتے ہوں۔ اسی مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر میں آج اس پر لکھنے بیٹھا ہوں۔ ایک طرح دیکھیے تو ادب استعجاب کا دوسرا نام ہے۔ ادب براہِ راست استعجاب کے جذبے سے پیدا ہوتا ہے اور براہ راست استعجاب پیدا کرتا ہے۔ جو چیز بھی عام زندگی کی سطح سے اوپر، عام چیزوں سے زیادہ بامعنی یا زیادہ حسین ہوگی یا جس میں فن کار کا تخیل یہ کیفیتیں پیدا کر دے گا وہ لازمی طور سے استعجاب کا باعث بنے گا۔ استعجاب نہیں تو ادب بھی نہیں۔ اس دعوے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں رومانی تنقید کا شکار ہو گیا ہوں۔ رومانی تحریک کے نقادوں نے حیرت کے عنصر پر زور تو واقعی دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلاسیکی ادب میں حیرت کے جذبے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ رومانی لوگ تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ یہ لوگ پھول یا سمندر یا اسی قبیل کی کوئی چیز دیکھ کر بہہ نکلتے تھے تو ان سے پہلے پوپ، ڈرائڈن اور سیموئیل بٹلر کے اندر انسانی کردار،

انسانی افعال اور انسانوں کی سیاسی اور مذہبی رائیں تحیر کا جذبہ بیدار کرتی تھیں۔ اسی طرح شیکسپیئر کے لیے اگر ایک طرف ہملٹ کی ذہنی کشمکش تحیر کا باعث تھی تو دوسری طرف اتنی سی بات کہ چھوٹے چھوٹے پھولوں میں بھی قوت نمو کا ایسا جوش اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کا ایسا ولولہ ہوتا ہے کہ وہ مارچ کی ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے باہر نکل آتے ہیں۔ اس تحیر سے شیکسپیئر نے دنیا کا سب سے زیادہ انقلابی اور باغیانہ شعر تخلیق کیا ہے۔ یا پھر غالب کا شعر ہے:

تو اور آرائشِ خمِ کاکل

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

اس میں محبوب کا حسن اور عاشق کا داخلی ردعمل غالب کے لیے حیرت کا موجب بنا ہے۔ اسی طرح میر کا شعر ہے:

صبر بھی کیجئے بلا پر میر صاحب جی کبھی!

جب نہ تب رونا ہی دھونا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

یہاں جو چیز استعجاب پیدا کرتی ہے، وہ خارجی زندگی کے مطالبات اور حساس آدمی کی داخلی زندگی کے مطالبات کی کشمکش ہے۔ غرضیکہ آپ کو ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ادبی تخلیق میں حیرت کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور ملے گا۔ اس کے بغیر تخلیق ناممکن ہے۔ لیکن جب آدمی کو ادب کے اس بنیادی عنصر کا احساس ہو جائے تو پھر اسے یہ ترغیب ہو سکتی ہے کہ اِسے ٹیکنیک بنا دے اور اپنی تخلیق کو نمایاں بنانے کے لیے شعوری طور پر یہ ترکیب استعمال کرے، جس طرح میلوں میں تھیٹر والے منہ کالا کر کے بانس پیٹنے لگتے ہیں، تو اب سوال ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے، وہ یہ کہ استعجاب کو ادبی پینترے کے طور پر سے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جب کوئی ادب سو پچاس سال پرانا ہو جائے تو اُس میں اپنے آپ سے اپنے آپ ادبی پینترے پیدا ہو جاتے ہیں جس طرح بڑھئی، لوہار، سنار سب کے کام میں کام کرنے کے طریقے مقرر ہو جاتے ہیں۔ پینترے کی موجودگی نہ اچھی بات ہے نہ بری بات۔ اس کا انحصار تو استعمال کے طریقے پر ہے۔ استعجاب بہرصورت ایک خوش گوار چیز ہے خواہ اس کا اثر وقتی ہی کیوں نہ ہو، مگر جو چیز استعجاب کو وقیع یا غیر وقیع بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ استعجاب کی کیفیت گزرنے کے بعد ہمارے پاس کیا باقی بچتا ہے۔ ادب میں بھی یہی بات دیکھی جاتی

ہے اور عام زندگی میں بھی۔ اگر آپ اندھیرے میں کمرے کے اندر داخل ہوں اور کوئی یوں ہی مذاق میں آپ کو ڈرا دے تو آپ اس واقعے سے لطف تو لیں گے مگر آپ کو تھوڑا سا تکدر بھی ہو گا جس کی منجملہ اور باتوں کے ایک وجہ یہ بھی ہو گی کہ استعجاب اپنا کام کر کے وہیں کا وہیں مر گیا، اس نے آپ کو ایک لمحے کے لیے چونکا تو دیا مگر آپ کو کوئی اور قابل قدر چیز حاصل نہیں ہوئی، لیکن فرض کیجئے کہ آپ کو اپنے کسی عزیز کے آنے کا سخت انتظار ہے، ایسی حالت میں آپ کو کوئی تار لا کے دیتا ہے کہ لیجئے وہ اب نہیں آرہے ہیں، مگر آپ تار پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بس دو گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ اس صورت میں آپ کو بالکل تکدر نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو آپ کو اپنے عزیز کے آنے کی خوشخبری ملی، دوسرے آپ کو ایک نفسیاتی تجربہ بھی حاصل ہوا، یعنی آپ کو پتہ چلا کہ آپ کو اپنے عزیز سے واقعی محبت ہے۔ اس طرح آپ کے یقین کی جذباتی تصدیق بھی ہوئی، اور آپ کی محبت پھر سے تازہ ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ استعجاب کی کیفیت کے پیچھے جو چیزیں ہوتی ہیں، وہ اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے — زندگی میں بھی اور ادب میں بھی۔

اب ادب سے دو چار مثالیں ایسی لے کے دیکھتے ہیں جہاں استعجاب بہت ہی نمایاں صورت میں ظاہر ہوتا ہے جہاں استعجاب محض بنیادی عنصر کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس طرح پھٹتا ہے جیسے ڈائنامیٹ کی طرح اندر دبا ہوا ہو۔ پہلی چٹکلے بازی تو خود اللہ میاں ہی کی دیکھئے۔ کائنات کی تخلیق کے بارے میں وہ کہتے ہیں کُن فیکون۔ ایک طرح دیکھئے تو بالکل مداری کا سا تماشا ہے۔ بازو اوپر اٹھا کے کہا کہ آجا، اور ہاتھ میں سیب آگیا، یا دوسری طرح دیکھیے تو مداری خدا کے اسی تخلیقی عمل کی نقل اتارتے ہیں۔ آخر یہ اللہ میاں کو کیا سوجھی کہ سارا معاملہ ایک لطیفے میں ختم کر دیا؟ کائنات کے وجود میں آنے کا بیان انہوں نے غلام عباس کے "آنندی" کے انداز میں کیوں نہ لکھا کہ یہ مزدور مٹی کھود رہے ہیں۔ سقے گارے میں پانی ڈال رہے ہیں، راج کرنی بسولی ہاتھ میں لیے کھٹ کھٹ کر رہے ہیں، مگر عدم کے وجود میں بدل جانے کا واقعہ ایسی ہیبت ناک حقیقت ہے اور ممکن و ناممکن کے منطقی تصورات سے اتنی دور ہے کہ اس کا بیان صرف ایک چٹکلے کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ جب ہمیں حقیقت کی ایک سطح سے فوراً دوسری سطح پر زمان و مکاں کی معمولی العباد سے گزر کر غیر معمولی العباد میں پہنچنا ہو تو سیدھا سادا بیان کام نہیں دیتا۔ ہم یکایک پٹڑی بدل لیں اور جھٹکا نہ لگے، یہ کیسے ممکن ہے؟

اسی طرح متی، لوقا، یوحنا اور مرقس کی انجیلوں میں چٹکلے بازی کی انتہا ہو گئی ہے۔ قدم قدم پر پٹاخے چھوٹتے، چلتے ہیں۔ مثلاً یسوع مسیح کے مقدمے کا حال پڑھتے ہوئے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میں جگہ جگہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں یہ افسانہ لکھ رہا ہوتا تو یہاں ختم کر دیتا۔ رومی گورنر مسیح کو بے قصور سمجھتا ہے مگر یہودی مصر ہیں کہ انہیں سولی پر چڑھایا جائے، چنانچہ سامراج کے نمائندے کی حیثیت سے وہ مقامی لوگوں کے مذہبی تعصبات کے معاملے میں غیر جانب دار رہنا چاہتا ہے اس لیے یہودیوں کو اپنی من مانی کرنے دیتا ہے لیکن ساتھ ہی پانی لے کر اپنے ہاتھ دھو ڈالتا ہے کہ تم جانو اور تمہارا کام، اس آدمی کا خون میری گردن پر نہیں ہے — یا جب یسوع مسیح گورنر کو بتاتے ہیں کہ میں دنیا میں سچائی پھیلانے آیا ہوں تو وہ پوچھتا ہے کہ سچائی کیا چیز ہے — یا جب سپاہی مسیح کو مذاق ہی مذاق میں یہودیوں کا بادشاہ بناتے ہیں اور سر پر کانٹوں کا تاج رکھتے ہیں تو گورنر یہودیوں کو ایک بار سمجھانا چاہتا ہے کہ تم ایک بے ضرر آدمی کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ وہ انہیں اسی حالت میں لوگوں کے سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے: "ذرا اس آدمی کو دیکھو تو۔" غرض کہ اس ذرا سے واقعے میں ان لوگوں نے لطیفے ہی لطیفے بھر دیے ہیں۔ ایک اناطول فرانس کا لطیفہ ہے جسے بعض اناڑی لوگ دنیا کے عظیم ترین افسانوں میں شامل کرتے ہیں۔ وہ چٹکلہ یوں ہے کہ جب یہ رومی گورنر بڈھا ہو چکا ہے اور اس کا اثر و اقتدار سب ختم ہو گیا ہے تو ایک دن اس کا ایک دوست اس سے پوچھتا ہے کہ بہت دن ہوئے تمہاری گورنری کے زمانے میں ایک شخص نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس کا کیا حشر ہوا؟ گورنر جواب دیتا ہے کہ مجھے وہ واقعہ بالکل یاد نہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ بے حس ہوتے ہیں کہ طوفان سر پر سے گزر جائے اور ان کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لیے چٹکلے سے زیادہ موثر ذریعہ اظہار کونسا ہو سکتا ہے؟ اگر دو حقیقتیں ایسی متضاد ہیں اور انہیں ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو دھماکا ہونا بھی ٹھہرا چاہے کسی کے کان پھٹیں چاہے کچھ ہو۔

اب ایک گھٹیا سا لطیفہ مارسل پروست کا بھی سن لیجیے۔ پروست کے ناول کا ہیرو عنفوان شباب کے زمانے میں ایک لڑکی کا بوسہ لینا چاہتا ہے۔ وہ نئے سے نئے منصوبے گانٹھتا ہے مگر لڑکی طرح دے جاتی ہے۔ آخر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ کچھ دن بعد وہ لڑکی ایک روز اچانک اس سے ملنے آجاتی ہے اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال

دیتی ہے۔ مگر اب اسے پتہ چلتا ہے کہ جس چیز کی خاطر وہ اتنا بے قرار تھا، وہ دراصل کتنی بے مزا ہے جب وہ بوسہ لینے لگا تو لڑکی کے رخسار سے اس کی ناک بھنچی اور سانس رکنے لگا۔ پھر جو کھال دور سے چکنی اور بے داغ معلوم ہوتی تھی، قریب سے دیکھنے پر اس میں ہزارہا مسامات اور چتیاں نظر آنے لگیں۔ اب ایک طرح دیکھیے تو پروست نے بہت ہی گھٹیا قسم کا استعجاب پیدا کیا ہے مگر اس واقعے کو ہیرو کی پوری زندگی اور اس کی نفسیاتی افتاد کے ساتھ ملا کر دیکھیے تو اس کی زندگی کی ساری ٹریجیڈی یہیں نظر آ جاتی ہے۔

اور استعجاب کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ اخباروں میں تبصرہ کرنے والے تک اسے گھٹیا سمجھنے کی جرات کر سکتے ہیں۔ رہا منٹو کے یہاں چٹکلے بازی کا سوال تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر یا کسی خارجی یا داخلی مجبوری کی وجہ سے آنکھیں بند کر لے تو دنیا کے بارے میں بڑے نئے نئے انکشافات کر سکتا ہے۔ منٹو کے کئی بڑے بڑے افسانے لے لیجئے "نیا قانون"، "ہتک"، "بابو گوپی ناتھ" جو میرے نزدیک اُردو کا عظیم ترین افسانہ ہے اور دوسرے لوگوں کے افسانے جس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے، ان میں سے کون سا افسانہ چٹکلہ ہے، یا کس میں استعجاب کو پینترے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ لیکن جہاں منٹو نے واقعی استعجاب کی بنیاد پر سارے افسانے کی عمارت کھڑی کی ہے وہاں بھی ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک دفعہ چونکنے کے بعد ہمارے ذہنی تجربات میں کوئی اضافہ ہوتا ہے یا ہم واقعی یہ محسوس کرتے ہیں کہ افسانہ دھماکے کے ساتھ ہی ساتھ ختم ہو گیا۔ "کالی شلوار" بڑے واضح طور پر ایک لطیفہ ہے مگر جس انداز سے یہ افسانہ آگے بڑھتا ہے، جس طرح یہ افسانہ لکھا گیا ہے اور اس پورے افسانے میں زندگی کا ذکر جس لب و لہجہ کے ساتھ ہوا ہے، کیا یہ سب باتیں ہمیں آخر میں یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں کرتیں کہ زندگی انسان کو کیسے کیسے چکمے، طفل تسلیاں، بھلاوے دیتی ہے۔ یہ افسانہ صرف اتنی سی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ شلوار اور بندوں کی اچھی تھیٹرا بدلائی ہوئی ہے۔ اس پٹاخے کی آواز ہیروئن کے شعور میں بڑی دیر تک گونجتی ہے۔ اس لطیفے کی بنیاد پر ہمارا تخیل نئے نئے افسانے تعمیر کرنے شروع کر دیتا ہے۔ ہم بہت شدت سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہیروئن کا رد عمل کیا ہوا ہو گا۔ اس نے اس واقعے کو لطیفہ سمجھ کے قبول کر لیا ہو گا، یا اپنے دوست پر غصہ آیا ہو گا یا وہ زندگی کی ستم ظریفیوں کے آگے بے بس ہو کر رہ گئی ہو گی؟ یہ افسانہ ان افسانوں میں سے نہیں ہے جنہیں پڑھ کر ہم فوراً زندگی کے متعلق ایک خاص رویہ اخذ کر لیتے ہیں۔

اس افسانے کی چوٹ بھیتری ہے۔ پہلے تو ہمیں ہنسی آتی ہے مگر کسک ذرا دیر کے بعد محسوس ہوتی ہے، اور اس افسانے کا مجموعی تاثر کانٹے کی طرح ہمارے دل میں چبھتا رہتا ہے۔ خالی خولی چٹکلوں کا اثر اس قسم کا نہیں ہوا کرتا۔

اور "کھول دو" میں تو منٹو نے پٹاخہ نہیں اخلاقی ایٹم بم چھوڑا ہے۔ فسادات پر یوں تو کھانچیوں افسانے لکھے گئے ہیں مگر یہ واحد افسانہ ہے جسے پڑھ کر مجھے فسادات سے ڈر لگا ہے۔ افسانے کی ہیروئن کے ساتھ مختلف قسم کی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں اور ہم نیم گرم قسم کی انسانی ہمدردی کے ساتھ سارے واقعات دیکھتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ شائبہ تک نہیں گزرتا کہ اس کے اندر کیا تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ آخر میں ہمیں اس کے ہاتھ کی ذرا سی حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ جس چیز کو ہم انسانی دماغ کہتے ہیں اور جو ہزارہا سال کی تعلیم و تربیت، غور و فکر اور سینکڑوں شاعروں، فلسفیوں اور مصلحتوں کی محنت کا نتیجہ ہے، اب اس کے اندر باقی نہیں رہا۔ انسان نے اپنے بارے میں جتنی خوش فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں، منٹو نے سب کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ ہیروئن کے ہاتھ کی حرکت جملہ انسانی اقدار پر حیاتیات کی فتح ہے۔ بذاتِ خود منٹو انسانی اقدار کی طرف ہے، اور وہ انسان سے یہی پوچھ رہا ہے کہ آخر تمہارے اندر وہ کون سی کمزوری ہے جس کی وجہ سے حیاتیاتی قوتیں اپنی تمام خود غرضانہ وحشتوں کے ساتھ تمہاری بنائی ہوئی اخلاقی اقدار کی گرفت سے نکل جاتی ہیں۔ فسادات میں انسانوں نے انسانی فطرت کو مسخ ہونے کے جو مواقع بہم پہنچائے ہیں ان پر اس سے زیادہ زہرناک طنز ابھی تک نہیں ہوا۔ یار لوگوں نے نہ معلوم یہ رضاکاروں کا شاخسانہ کہاں سے لا کھڑا کیا۔ اس افسانہ میں رضاکاروں کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے، یہ تو ایک بے مقدار سی تفصیل ہے۔ افسانے میں اصل بات جو کہی گئی ہے، اس کی بنیاد پر تو اخلاقیات، تہذیب اور انسانیت کے بارے میں بڑی طویل بحث ہو سکتی ہے۔ کم سے کم مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ یہ افسانہ جس کا تعلق فسادات کے چند واقعات سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کی بنیادی باتوں سے ہے، پاکستان میں لکھا گیا، اور اس بات پر نہ افسوس ہے نہ شرم کہ ہماری حکومت نے اس افسانے کو ضبط کر لیا کیونکہ ادب کے معاملے میں ہر ملک کی حکومت احمق ہوتی ہے یہاں تک کہ فرانس کی بھی — خیر، ہمارا اصل موضوع استعجاب تھا۔ اگر منٹو صاحب یہ ساری باتیں اتنے ہی پُر اثر طریقے سے کہنا چاہتے تو کیا وہ چٹکلے بازی کے بغیر کہہ سکتے تھے؟ اگر منٹو استعجاب سے کام لینے کے بعد اتنا کچھ کہہ دیتا ہے تو پھر اسے

استعجاب سے کام لینے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

یہاں میں نے مثال کے طور پر منٹو کے دو افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں کہیں منٹو نے استعجاب سے کام لیا ہے، وہاں اتنے ہی زیادہ معنی نکل آئیں گے، ہر لکھنے والے کی طرح منٹو نے ہلکے افسانے بھی لکھے ہیں اور بھاری بھی۔ کہیں معنویت زیادہ ہو گئی، کہیں کم ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض جگہ کورا لطیفہ ہی ہو، مگر استعجاب کا استعمال بذاتِ خود کوئی مکروہ چیز نہیں ہے بلکہ اپنے تازہ ترین افسانوں میں تو منٹو نے اس صنعت کو اور بھی پرکاری کے ساتھ استعمال کر کے دکھایا ہے بلکہ مجھ سے پہلے ممتاز شیریں صاحبہ اس بات کا ذکر بھی کر چکی ہیں۔ اگر آدمی کام لے سکے تو ہر ٹیکنیک جائز ہے ورنہ ہر ٹیکنیک ناجائز۔ اس میں استعجاب اور استحقاق کی کوئی شرط نہیں۔

(مئی ۱۹۴۹ء)

پاکستانی ادب

آج کل ہر قسم کے تجارتی مال کے ناموں میں "پاکستان" کا استعمال بڑی فیاضی سے ہو رہا ہے۔ پاکستانی تیل اور پاکستانی صابن سے لے کر پاکستانی فلم تک ہر چیز مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے پاکستان کے نام میں عام لوگوں کے لیے جو کشش ہے، اسے تاجر اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہی کام وہ اقبال اور قائداعظم کے ناموں سے لے رہے ہیں لیکن خریداروں کی طبیعت پر جو اثر "پاکستانی صابون" کہنے سے ہوتا ہے، وہ "جناح سوپ" کہنے سے نہیں ہوتا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے پاکستان کے مطالبے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں میں ایک قوم کی حیثیت سے خود آگاہی پیدا ہو رہی ہے اور وہ اپنی ہستی کو دوسروں سے الگ برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ اپنی قومی انفرادیت کا یہ احساس محض اکڑ یا شیخی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ حیات آگیں اور حیات بخش تھا۔ اب پاکستان بننے سے اس انفرادیت کے استحکام کی خارجی شرائط پوری ہو گئی ہیں؛ چونکہ یہ احساس قوتِ نمو سے لبریز ہے، اس لیے ابھی اس کا عمل ختم نہیں ہوا، بلکہ اس میں اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی ہستی کے استحکام کی طرف سے مطمئن ہو کر قوم اب اس ہستی کے امکانات کا اندازہ کرنا چاہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر بڑی بڑی چیزوں تک ہر بات میں ہماری قوم یہ جاننا چاہتی ہے کہ ہم صابن اور تیل بھی بنا سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر بنا سکتے ہیں تو ہمارے بنائے ہوئے تیل اور صابون کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں اور وہ دوسری قوموں کے بنائے ہوئے تیل اور صابن سے کس طرح مختلف ہیں۔ یہی حال اور بڑی بڑی چیزوں میں بھی ہے۔ یہ بات جاننا قوم کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس سے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوتا ہے اپنے زندہ رہنے کا جواز ملتا ہے؛ ترقی کرنے اور خامیاں دور کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی خودبینی اور خود نمائی زندہ قوم کے لیے ضروری ہے۔ یہی قوم کی زندگی کا سب سے

بڑا ثبوت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قوم اپنی صلاحیتوں سے واقف ہونا، اور ان سے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتی ہے اور جب اپنی صلاحیتوں کے خارجی مظاہرے نظر کے سامنے آتے ہیں تو قوم کی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے، اور پھر خود اپنے اوپر سبقت لے جانے کی فکر ہوتی ہے۔

تاجر لوگ چاہے قوم کی توقعات پوری کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، چاہے انہیں اپنے فائدے کے سوا کسی اور بات سے مطلب نہ ہو مگر انہوں نے یہ بات تاڑلی ہے مگر یہ بات ہمارے ادیبوں کی سمجھ میں اب تک نہیں آئی کہ ہماری قوم کے دل میں خود بینی اور خود نمائی کی صحت مندانہ آرزو کس حد تک ہے، اور اس آرزو کو پورا کیے بغیر ہم ایسا ادب نہیں پیدا کر سکتے جس سے ہمارے ملک کی اکثریت کو دلچسپی ہو یا جسے ہماری قوم اپنا ادب سمجھ سکے۔ ممکن ہے بعض لوگ تجارتی مقاصد کے پیش نظر پاکستانی ادب کا مطالعہ کرتے ہوں مگر پاکستانی ادب محض ایک تجارتی تصور نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ قوم کی زندہ شخصیت کا بنیادی مطالبہ ہے۔ جس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں ایک دم سے یورپ کے کارخانوں کے مقابلے کا صابون تیار نہیں ہو سکتا، اسی طرح ہم بجا طور پر یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ قوم کی زندگی میں جو نئے عناصر پیدا ہوئے ہیں، انہیں ادیبوں کی شخصیت میں جذب اور ادب میں رونما ہوتے ہوتے کچھ دن لگیں گے خصوصاً ایسی حالت میں کہ قوم کی داخلی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ہمارے ادیبوں کو اپنے کئی بنیادی رجحانات میں تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ ہم قوم کو انتظار کرنے کا مشورہ تو دے سکتے ہیں، مگر یہ کہنے کا حق ہمیں نہیں پہنچتا کہ قوم کو پاکستانی ادب کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے یا ایسا مطالبہ ناجائز ہے۔ ہاں، اپنے آپ کو بدلنے میں جو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اس سے بچنے کے لیے بعض لوگ اس مطالبے سے انکار کرنا چاہیں تو اور بات ہے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، ایک دو کے سوا پاکستان کے وہ تمام ادیب اور شاعر جن کا شمار نئے ادب کی صف اول میں ہوتا رہا ہے، پاکستانی ادب کے تصور کے خلاف نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس معاملے میں زیادہ گرم جوشی سے کام نہ لیتے ہوں یا صراحتاً اپنی رائے کا اظہار نہ کیا ہو۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر جس طرح ہمیشہ سے لکھتے چلے آئے تھے، اسی طرح لکھتے چلے جا رہے ہیں اور انہوں نے نئے قسم کا ادب پیدا کرنے کی عملاً کوئی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ پاکستانی ادب کے تصور پر بھی کوئی تفصیلی بحث اب

تک نہیں ہوئی ہے، البتہ مختلف لوگوں نے اس ضرورت کا اظہار ضرور کیا ہے، مگر اتفاق سے (ایک آدھ کے سوا) ان کی ادب میں کوئی مستقبل جگہ نہیں ہے جو دوسرے ادیب ان کے نقطہ نظر سے متاثر ہوتے البتہ پچھلے سال منٹو صاحب نے متعدد کوششیں کیں کہ ترقی پسندی کے مروجہ تصور کو بدلا جائے اور ادیب اسلام کو اپنے تصور حیات کی اساس بنائیں اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر سماجی اور معاشی انصاف کا مطالبہ کریں۔ منٹو صاحب ادیبوں سے گھنٹوں اس بات پر جھگڑتے رہے ہیں کہ ہمارے لیے خالی انسانیت پرستی کافی نہیں ہے، ہمیں انسان کا وہ تصور قبول کرنا ہوگا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ منٹو صاحب نعروں سے ایسا ڈرتے ہیں کہ اب ان کے ذہن میں خالی نعروں سے مطمئن ہو جانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے، چنانچہ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کی گرم جوشی لفظوں تک محدود نہیں تھی۔ اس زمانے میں خلافت راشدہ کا تصور اس طرح ان کے دماغ پر مسلط تھا کہ وہ چاہتے تھے بس آج ہی پاکستان خلافت راشدہ کا نمونہ بن جائے اور سارے صاحب اقتدار لوگ حضرت عمرؓ کی تقلید کرنے لگیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پاکستان محض رہنماؤں کی دانش مندی کے طفیل نہیں ملا ہے بلکہ پوری قوم کی متحدہ قوت اور عوام کے جذبہ ایثار کی بدولت حاصل ہوا ہے، لہٰذا انہوں نے چند ایسے افسانے بھی سوچے تھے جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ہمارے عوام میں اپنی مدد آپ کرنے کی صلاحیت اور تخلیقی اہلیت کتنی زبردست ہے، مگر اتفاق سے انہی دنوں منٹو صاحب اپنی فلم میں مصروف ہو گئے، اور وہ افسانے لکھے نہیں۔ ان کے ذریعہ، جو لوگ پاکستانی ادب تخلیق کرنا چاہتے ہیں مگر نمونوں کی غیر موجودگی سے مجبور ہیں، انہیں بڑی مدد ملتی۔ ابھی تک منٹو صاحب ایسا ادب تو پیش نہیں کر سکے جو کھلم کھلا پاکستانی ہو، غالباً ان جیسے فن کار کے لیے یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ نعروں کو پھیلا پھیلا کر افسانے بنائیں۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ادیب نعروں کے بغیر چونکتے ہی نہیں۔ اس لیے ادب میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے سے پہلے شاید تھوڑی سی نعرہ بازی لازمی ہے۔ بہرحال منٹو صاحب نے ابھی تک افسانوں میں نعرے لگانے سے گریز کیا ہے، مگر پاکستان بننے کے بعد ان کی افسانہ نگاری میں شدید تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ممکن ہے کہ ان تبدیلیوں کے محرکات ایک سے زیادہ اور گوناگوں ہوں، مگر میرے خیال میں پاکستان کے وجود میں آنے کا اثر بھی ان کی طبیعت پر بہت گہرا پڑا ہے۔ مثلاً ایک تو ان کی اخلاقی حس بڑی شدید ہو گئی ہے اور وہ سطح پر رہ کر نہیں بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں پہنچ

کر نیک و بد کے متعلق واضح فیصلے کرنے لگے ہیں۔ اس کی ایک شہادت ہم نے "کھول دو" میں دیکھی ہے، دوسری طرف "سیاہ حاشیے" میں انہوں نے ظالم اور مظلوم کی سطحی اصطلاحات سے گزر کر دونوں کی شخصیت کا اندر سے جائزہ لیا ہے اور ان کے خارجی افعال کو بالکل نئے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ عصمت چغتائی نے ان لطیفوں کو احمقانہ کہنے کے باوجود اعتراف کیا ہے کہ بعض لطیفوں کو پڑھ کر رونا آ جاتا ہے چونکہ محترمہ بھی فن کارانہ طبیعت رکھتی ہیں، اس لیے سیاسی نعرے انہیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے نہیں روک سکے۔ فسادات کے متعلق یہ لطیفے لکھ کر منٹو نے یہ ثابت کر دیا کہ قومی حادثات کو ہضم کرنے کی صلاحیت ان میں اوروں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پھر فنی طور پر بھی منٹو کے یہاں زیادہ اختصار، زیادہ جامعیت، نکیلا پن آگیا ہے۔ منٹو کے نئے افسانوں میں ایک نئی آب و تاب کا احساس ہوتا ہے جہاں تک فحش نگاری کا تعلق ہے، میں اس وقت اس کے بارے میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ مبحث ہی دوسرا ہے۔ لیکن اگر فحش نگاری کے الزام کو درست بھی تسلیم کر لیں، تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ یہ فحش نگاری اس قسم کی نہیں جتنی منٹو نے پہلے کی ہے۔ منٹو کی نئی فحش نگاری دھوئیں اور بھاپ میں لپٹی ہوئی نہیں، اس میں کسی قسم کی گھٹن یا جھجک یا خود بینی نہیں۔ اب منٹو کے انداز میں زیادہ آزادی اور اعتماد ہے، یہ احساس بھی نہیں کہ میں کوئی ایسی بڑی بات کہہ رہا ہوں جس سے لوگ چڑیں گے، بلکہ اب تو منٹو بڑی صاف دلی اور وضاحت سے اپنی بات کہہ دیتا ہے۔ یہ سولہ سال کے لڑکے کی فحش نگاری نہیں جس سے نفسیاتی مجبوری ٹپکتی ہے بلکہ اب تو ایک نئی ذمہ داری جھلکتی ہے۔ فی الجملہ منٹو کی نئی فحش نگاری توانائی، قوت اور صحت مندی کے عناصر سے خالی نہیں۔ اگر یہ انداز تحریر برا ہے تو برا ہی سہی، مگر ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس میں بھی پوری قوم کی توانائی اور صحت مندی کی جھلک موجود ہے کیونکہ قوت نمو قوم کے صرف نیک اور شریک افراد ہی تک اپنا اثر محدود نہیں رکھتی بلکہ بدمعاشوں کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع دیتی ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ بدمعاش اس قوت نمو سے غلط قسم کا کام لیتے ہیں۔ تو چاہے آپ منٹو کو ایک قسم کا "ادبی بدمعاش" سمجھ لیں، مگر یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ پاکستان بننے کے بعد سے منٹو میں کئی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں مثلاً "زندگی" میں شاید پہلی بار منٹو نے ایسی عورتوں کا کردار پیش کیا ہے جن کے اعصاب تھکے ہوئے اور ڈھیلے نہیں ہیں بلکہ جو نفسیاتی اعتبار سے بھی نشاط

کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جن کے لیے زندگی محض خانہ پُری کا نام نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ منٹو کی "بدمعاشی" میں بھی صحت مندی کا ایک پہلو پیدا ہوگیا ہے۔ منٹو کے افسانے کی دنیا اب اتنی تھکی ہاری نہیں بلکہ اب کمر میں دم آچلا ہے۔

تو پاکستان بننے کے بعد سے ایک تبدیلی تو منٹو کے یہاں نظر آئی ہے۔ دوسرے، دو چار نوجوان غزل گو شاعروں کے یہاں فسادات کے زمانے میں ہماری قوم کو اجتماعی طور سے جس تجربے سے دوچار ہونا پڑا ہے، اسے اب تک صرف ہماری غزل نے جذب کیا ہے۔ عام طور سے مشہور ہے کہ غزل فرد کے لمحاتی تاثرات اور واردات کے لیے اچھا ذریعہ اظہار ہے، لیکن دراصل اُردو میں غزل کی اعلیٰ ترین روایت بالکل دوسری قسم کی ہے۔ فارسی میں اگر کوئی دوسری صورت ہو تو میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ فارسی تغزل سے میری طبیعت اس طرح ہم آہنگ نہیں ہوتی جس طرح میر اور مصحفی کی غزلیہ شاعری سے ہوتی ہے تو اُردو میں تو غزل اجتماعی زندگی کے احساس سے بھرپور رہی ہے، یعنی کم سے کم ہماری بہترین غزلیہ شاعری بلکہ مَیں تو یہاں تک دعویٰ کروں گا کہ اُردو غزل انفرادی تجربات سے زیادہ اجتماعی تجربات کے اظہار کے لیے موزوں ہے۔ دو مصرعوں میں کائنات کی وسعتیں اسی طرح سما سکتی ہیں کہ شاعر اپنے انفرادی تجربات کو اجتماعی تجربات کے ساتھ یک جان کرنے کی کوشش کرے اور غزل کے بارے میں مجھے اس سے بڑا دعویٰ کرنا ہے اور غزل افراد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی تخلیق ہے، اور ان معنوں میں دنیا کی کوئی دوسری شاعری اُردو سے لگا نہیں کھاتی۔ ہمارے یہاں تشبیہ و استعارات، الفاظ، ردیف، قافیے، بحریں، موضوعات بلکہ بعض معنوں میں احساسات تک پہلے سے مقرر رہے ہیں، اور انہی پابندیوں کے ساتھ بڑے بڑے شاعروں سے لے کے دیہاتی شاعروں تک سب انی گنی دو چار باتوں کو شعروں میں باندھتے رہے ہیں، یہ مبالغہ نہیں ہے، بھڑبونجے تک ان ساری شرائط کے ساتھ شاعری کرتے رہے ہیں۔ بظاہر تو یہ بڑی حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے مگر اعلیٰ ترین کلچر کی تخلیق میں شاید کسی اور تہذیب نے نچلے سے نچلے طبقوں کو اس طرح شامل نہیں کیا ہوگا جو بات کہنی ہے، وہ مقرر ہے، کہنے کے طریقے مقرر ہیں۔ اب اوپر سے نیچے تک سب طبقوں کے افراد یہ کوشش کر رہے ہیں کہ شعر میں زیادہ سے زیادہ جان ڈال دیں۔ چنانچہ ان بچارے دیہاتی شاعروں کی محنت بیکار نہیں جاتی تھی۔ اتنے شاعروں کے دماغ میں سے گزرنے کے بعد اصلی موضوع میں طرح طرح کی لطافتیں پیدا ہو جاتی تھیں

اور مجموعی طور سے زبان بھی منجھتی جاتی تھی، چنانچہ اُردو غزل اور اس کی زبان مجموعی طور سے ایک پوری معاشرت کی تخلیق ہے جس میں تھوڑا بہت ہر طبقے کا حصہ ہے۔ اسی کے پہلو بہ پہلو اُردو کے عظیم ترین شاعروں نے اُردو غزل میں وہ لچک بھی پیدا کر دی ہے کہ وسیع سے وسیع اجتماعی تجربے بڑی آسانی سے اس میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

تو اگر سب سے پہلے غزل نے فسادات کے اجتماعی تجربے کو اپنے تمام گزشتہ تجربات کے ساتھ گھلا ملا کر ایک کر دیا تو تعجب کی بات نہیں، البتہ ہمیں نیاز فتح پوری، مجنون اور فراق کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے زبردست کوششوں سے اُردو غزل کی ٹھیٹ روایت کو زندہ کیا اور نوجوان غزل گو شاعروں کی تخلیقی صلاحیت کو ٹھیک راستے پر ڈالا۔ چنانچہ نئی اُردو غزل میں تین باتیں بہت نمایاں طور پر نظر آ رہی ہیں۔ ایک تو عام زندگی کا احترام اور اس کے مطالبات کا اعتراف، دوسرے محبت کی پیچیدہ نفسیاتی کیفیتوں سے دلچسپی۔ تیسرے، محبوب کو عام انسان بلکہ پُرخلوص، نیک نیت اور شفیق و رفیق سمجھنا۔ مجموعی طور سے یہ نئی اُردو غزل فارسی غزل سے الگ تاثیر رکھتی ہے۔ اس کی ایک بڑی مزیدار شہادت مجھے اس دن ملی جب مَیں نے سب سے اچھے "نئے" غزل گو شاعر ناصر کاظمی کو یہ سوال کرتے سنا کہ صاحب، تغزل کیا چیز ہے۔ ہماری نئی غزل پر سب سے واضح اثرات میر اور فراق کے ہیں اور بالواسطہ مومن کے۔ اگر ہمارے نئے غزل گو تھوڑی سی توجہ مصحفی کی طرف بھی کرتے تو ہماری نئی غزل میں ایک اور لطیف عنصر کا اضافہ ہو جاتا۔

ان غزل گو شاعروں میں سے ناصر کاظمی کا تعارف تو میں پہلے بھی کرا چکا ہوں۔ اس دفعہ ایک اور غزل گو سلیم احمد کا کلام اسی پرچے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں صفائی اور روانی زیادہ ہے اور ان کی چوٹ بھی کاری پڑتی ہے۔ یہ بات ابھی سلیم میں نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی فسادات کی آگ میں تپ کر نکلتے ہیں، انہیں اپنی انفرادی واردات کو اجتماعی تجربے سے تطبیق دینے کا موقع جلدی مل گیا۔ اس کے برخلاف سلیم ابھی تک اپنے انفرادی احساسات کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے میں مصروف ہیں، چونکہ نئے نفسیاتی زاویوں کی کاوش ابھی ان کے یہاں نمایاں ہے، اسی لیے بیان میں کہیں کہیں جھول سا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک فراق صاحب کی شخصیت ان کے کلام پر حاوی ہے اور ان کے اشعار میں ایک مستقل شخصیت کا احساس اس طرح نہیں ہوتا جیسا ناصر کاظمی کے یہاں ہوتا ہے۔

بہرحال غزل گو شاعروں نے دوسرے ادیبوں کو ایک راہ ضرور دکھائی ہے کہ اپنے ادبی ورثے کی بنیادوں پر ہم ایک پاکستانی ادب تعمیر کر سکتے ہیں جس میں فرد اور قوم، دونوں کی شخصیتوں کے لیے اظہار کی گنجائش ہو گی مگر جس قوم کے حالات سے ہم آج کل ادب میں دو چار ہیں اور ادیبوں میں غور و فکر کی جو کمی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ نیا ادب کب پیدا ہو گا۔ ہمارے ادب میں جو افراتفری مچی ہوئی ہے، اُس کے پیشِ نظر مَیں بھی منٹو صاحب کی اس رائے کا قائل ہو چکا ہوں کہ ابھی دس سال تک ہمارے ہاں ادب کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اگر ادیب خود اپنے آپ کو بدلنا نہ چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں نہیں بدل سکتی، مگر اپنے آپ کو بدلے بغیر ادب میں تازگی بھی نہیں آ سکتی اس لیے پاکستان میں ادب کے مستقبل کے بارے میں خوش فہمیوں کی گنجائش ذرا کم ہے۔

(جون ۱۹۴۹ء)

پاکستانی قوم، ادب اور ادیب

اس وقت پاکستان میں ادب کے سامنے بھی بڑے بڑے مسائل ہیں اور ادیبوں کے سامنے بھی، ادب کے ضمن میں تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارا ادب پچھلے دس بارہ سال سے جس ڈھرے پر چل رہا ہے اسی پر چلتا رہے، یا چند تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اور وہ تبدیلیاں ہوں تو کیا ہوں؟ یوں تو یہ سارے مسئلے بھی ادیبوں کے ہی ہیں مگر اس وقت ادیبوں کے سامنے ایک قدرے غیر ادبی مسئلہ بھی ہے، وہ یہ کہ پوری قومی زندگی میں ادیبوں کی کیا جگہ ہے۔ اول تو یہ سوال آج ساری دنیا کے ادیبوں ہی کو پریشان کر رہا ہے (سوائے روس کے کیونکہ وہاں کی حکومت نے ادیبوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ میاں، خدمت ہی سے راحت ہے، اور ادیب لوگ بھی اس نقطے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں) مگر پاکستان کے ادیبوں کو تو اس سوال کی اہمیت کا اندازہ پاکستان بننے کے بعد ہی ہوا ہے۔ پہلے تو ہماری زندگی کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ فرد اپنی جماعت سے الگ رہ سکتا تھا، چند ادیب اوروں کی زندگی سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا الگ بنا سکتے تھے، مگر اب ایک مرکز ثقل نمودار ہو گیا ہے۔ اب ہمیں صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ شخص یا یہ فعل مرکز سے قریب ہے یا دور ہے۔ اب کسی فعل یا کسی خیال کی معنویت اور قدر و قیمت کا تعین بجائے خود اور برائے خود نہیں ہو سکتا بلکہ چند مرکزی تصورات کی روشنی میں یہ صورت حال ہم ادیب لوگوں کے لیے ایک طرح سے بڑی پریشان کن ہے۔ خارجی حالات اور مطالبات ایک دم سے بدل گئے ہیں، مگر شعور کی تبدیلیاں اتنی جلدی وقوع پذیر نہیں ہو سکتیں۔ یہ میں الزاماً نہیں کہہ رہا ہوں، سب سے پہلے تو مجھے اپنے بارے میں ہی اعتراف کرنا ہے کہ میں قومی مطالبات کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا، بڑی جلدی ہانپ جاتا ہوں۔ اب تک یہی عادت رہی تھی کہ مختلف شاعروں یا ادیبوں کو فرداً فرداً پڑھ لیا یا زیادہ سے زیادہ ایک خاص ادبی روایت کا

حصہ سمجھ کر اس بات کی کبھی زیادہ کاوش ہوئی ہی نہیں کہ ان ادیبوں کا اپنے سماج کی مجموعی زندگی سے کیا رشتہ ہے۔ مجموعہ زندگی سے میری مراد سیاسی اور معاشی حالات نہیں ہیں۔ ان چیزوں سے ادب کا رشتہ معلوم کرنے سے کسی خاص وقت نظر کی ضرورت نہیں پڑتی، اور میرے نزدیک ان رشتوں کی اتنی زبردست اہمیت ہے بھی نہیں جتنی آج کل کے فیشن کے مطابق سمجھی جاتی ہے۔ میرا اشارہ کسی تہذیب کے معتقدات، نظریہ حیات اور نظام اقدار یعنی غیر مرئی زندگی کی طرف ہے، مگر اب پاکستان بننے کے بعد جو ادب کو ایک نئے انداز سے پڑھنا پڑ رہا ہے، تو نہ تو ادب سے واقفیت پوری طرح مدد کرتی ہے نہ ادبی احساس ساتھ دیتا ہے۔ لیکن طرزِ احساس کو بدلے بغیر بھی مفر نہیں، اس لیے میں کوئی نہ کوئی بات سوچنے اور کہنے کی جرات بھی کر لیتا ہوں چاہے وہ بات سو فیصد غلط ہو یا ایک آدھ فیصد بھی ٹھیک بھی ہو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ادیبوں کے سامنے اس وقت اور بڑے بڑے سوالوں کے ساتھ ساتھ ایک یہ بھی بڑا اہم سوال ہے کہ اپنے ملک کی پوری زندگی میں ہماری حیثیت کیا ہے۔ جب ہم ادیب کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئیں تو اپنے آپ کو اربابِ نشاط کی ایک ذرا بہتر قسم سمجھیں یا اربابِ اقتدار کا ثنا خواہ سمجھیں، مصلح اور انقلاب کا علمبردار سمجھیں، اپنے آپ کو سماج کا باغی تصور کریں یا وہ فرشتہ جسے دنیا والے پہچان ہی نہیں سکتے، فوراً گولی مار دیتے ہیں، یا بقول بودلیئر کے وہ سمندری چڑیا جس کے پر اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ وہ زمین پر چل ہی نہیں سکتی یا بقول رومیو کے برفانی ملکوں کا وہ پرندہ جو اپنا کلیجہ کاٹ کاٹ کے اپنے بچوں کا پیٹ بھرتا ہے یا بقول ڈرگئی کے وہ بھیڑیا جس سے لوگ ڈرتے ہیں، جو آبادیوں سے دور زندگی بسر کرتا ہے اور تنہائی ہی میں جان دے دیتا ہے — آخر کیا؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ نئے ادیبوں کو قوم اس طرح نہیں پہچانتی جس طرح اب سے تیس چالیس سال پہلے اپنے ادیبوں اور شاعروں کو پہچانتی تھی۔ قوم اور ادیب میں یہ فصل کس طرح اور کیوں شروع ہوا اور کیسے بڑھتا گیا؟ اس کا خاکہ میں نے سال بھر ہوا ایک مضمون میں پیش کیا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا، مگر یہاں اتنا کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ یہ فصل واضح اور بین طور سے اُس دن نمودار ہوا جس دن میرامن، طلسم ہوشربا، نذیر احمد اور سرشار کی پیدا کی ہوئی اُردو نثر کی جاندار روایت پر مسٹر ابوالکلام آزاد نے کاری ضرب لگائی اور اپنے زمانہ کے نوجوان ادیبوں کو گمراہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مسٹر آزاد کا اثر بیس سال کے اندر ہی اندر

زائل ہو گیا اور اُردو نثر زندہ بچ گئی۔ مسٹر آزاد کا ذکر کرتے ہوئے میرے لہجے میں جو تلخی آجاتی ہے، اس کی وجہ محض سیاسی اختلاف نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے ادب سے جو بُرا بھلا اثر میں نے لیا ہے، اس کے پیش نظران کی پوری شخصیت اور ذہنیت میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ سنتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کی جا رہی ہے۔ میری تو بس یہی دعا کہ خدا پاکستان کے نوجوانوں کو فاسد اثرات سے محفوظ رکھے۔

خیر، اب تک جو کیفیت بھی رہی وہ، اب پاکستان میں ادب کی نشوونما بلکہ زندگی تک کے لیے ضروری ہے کہ ادیب، قوم کی مجموعی زندگی سے تعلق پیدا کریں اور اجتماعی زندگی میں اپنی جگہ بنائیں۔ اس کے لیے ہمیں یہ بات دریافت کرنی ہوگی کہ ہماری ہیئت اجتماعی میں ادب کی حیثیت کیا ہے، اس کا فریضہ اور منتہا کیا ہے۔ میری زبان سے یہ فقرہ شاید آپ کو عجیب سا معلوم ہو گا کیونکہ میں کبھی کبھی ادب برائے ادب کی حمایت کرتا رہتا ہوں، مگر میں لمبا چوڑا مضمون اس بات پر بھی لکھ چکا ہوں کہ خالص ادب ایک مہمل اصطلاح ہے۔ بنیادی اعتبار سے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ فن کار کا مقصد اور منشا صرف فن پارے کی تخلیق ہوتا ہے، یا البتہ فن کا مقصد غیر جمالیاتی بھی ہوتا ہے جو ایک مخصوص تہذیب اس کے اوپر عائد کرتی ہے، چونکہ ادب پارہ کبھی "خالص" نہیں ہو سکتا، اور اگر ہو سکے تب بھی، اس سے قاری کے پورے اعصابی نظام پر چند ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جنہیں جمالیاتی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جن کا عمل حیاتیاتی قسم کا ہو سکتا ہے۔ عذرا پاؤنڈ یوں تو فلوبیر کے پرستار ہیں اور انہیں ادب میں اتنی دلچسپی اور باتوں سے نہیں جتنی اسالیب بیان سے ہے، مگر اس کے باوجود انہوں نے ادب کا ایک فریضہ بالکل غیر جمالیاتی قسم کا قرار دیا ہے، یعنی انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش قائم رکھنا۔ یہ فریضہ "خالص ترین" ادب کا بھی ہو گا، چونکہ انسان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ میں زندہ رہوں اور اس کے بعد اس خواہش کا نمبر آتا ہے کہ ایک خاص انفرادیت اور شخصیت قائم رکھتے ہوئے زندہ رہوں، اس لیے ادب کے لیے یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک خاص ہیئت اجتماعی کی گہری سے گہری اور وسیع سے وسیع زندگی کی ترجمانی کرے، بلکہ یوں کہیے کہ تشکیل اور تجسم کرے۔ اس طرح ادب ہیئت اجتماعی کی کشمکش حیات میں براہ راست حصہ لیتا ہے، اور زندگی کی قوتوں کو مدد پہنچاتا ہے۔ ادب صرف اتنا ہی کام کر کے نہیں رہ جاتا کہ جماعت جیسی کچھ بھی ہے اس کی عکاسی کر دے۔ جماعت کی

شخصیت میں نشوونما کے جتنے امکانات ہوتے ہیں، ان کا اندازہ اور تجربہ وہ پہلے ادب اور فن ہی کے ذریعہ کرتی ہے تو جب تک ادب یہ سب مطالبات پورے نہ کرے جماعت کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا خواہ وہ کتنا ہی "خالص" یا کتنا ہی "ترقی پسند" کیوں نہ ہو۔

سماج میں ادب کی حیثیت کا یہ تو ایک عمومی تصور ہوا۔ اب پاکستان کی طرف آیئے۔ ادب کے مقصد کے متعلق آج کل ہمارے ادیبوں میں تین قسم کی رائیں ملتی ہیں۔ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ ادب کو صرف معاشی بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ اس گروہ کے نزدیک ادب کو پاکستانی یا اسلامی بنانے کے معنی رجعت پسندی اور عوام دشمنی ہیں۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ادب کو "بس" ادب ہونا چاہیے حالانکہ ادیب اپنی عام زندگی میں پاکستان کے زبردست حامی ہیں، مگر ادب میں پاکستان یا اسلام کے ذکر کو ایک قسم کی سیاست بازی سمجھتے ہیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ چند بکھرے ہوئے افراد ہیں جو مختلف رجحانات کے تحت اور مختلف مفاہیم کے ساتھ پاکستانی یا اسلامی ادب کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان افراد کی مختلف قسمیں گنوانے سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ آخر پہلے دو گروہوں کو پاکستانی ادب پر اعتراض کیا ہے۔ اگر پاکستانی ادب کے تصور پر نہیں بلکہ جو لوگ یہ تصور پیش کرتے ہیں، ان پر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان کی نیت خراب ہے اور وہ سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر معاشی انصاف کی جدوجہد میں کھنڈت ڈالنا چاہتے ہیں تو چلئے میں اس مفروضے کو بھی تسلیم کر لوں گا، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر اتفاق سے دو چار مخلص لوگ پیدا ہو جائیں جو محمد حسن عسکری یا ممتاز شیریں یا صمد شاہین یا قدرت اللہ شہاب کی طرح سرمایہ داروں یا پاکستان کی حکومت کے آلہ کار نہ ہوں اور ایسا پاکستانی ادب پیدا کرنا چاہیں جس میں معاشی بے انصافی کے خلاف شدید احتجاج بھی شامل ہو تو پھر ان حضرات کو ایسے ادب پر کیا اعتراض ہوگا؟ البتہ اگر پاکستان یا اسلام ہی کو معاشی انصاف کے منافی سمجھا جاتا ہو تو اور بات ہے۔

رہا دوسرا گروہ تو ان لوگوں کے پاکستانی ادب کے نام سے کترانے کی وجہ بھی سمجھنی مشکل ہے۔ اگر پاکستانی ادب محض قصیدہ خوانی یا سیاست بازی نہ ہو بلکہ اُن معنوں میں اسلامی ادب ہو جن معنوں میں رومی، حافظ، میر اور اقبال کا کلام ہے یا جن معنوں میں الحمرا، تاج محل اور دلی کی جامع مسجد اسلامی فن کے نمونے ہیں تو پھر اسے قبول کرنے میں کیا تامل ہوگا؟ آپ کہہ سکتے ہیں اگر ایسا ادب پیدا ہوا تو ہم اسے بخوشی قبول کر لیں گے۔ لیکن اگر

ہمارے ادیبوں نے ایسا ادب پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی یا اپنے نقطۂ نظر میں وسعت اور جامعیت پیدا نہ کی تو یہ "اگر" ہمیشہ "اگر" ہی رہے گا۔ اس گروہ کی یہ خواہش تو بڑی مستحسن ہے کہ ادب کو ادب ضرور ہونا چاہیے، مگر یہ حضرات یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کوری "ادبیت" سے کبھی ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب پاکستان کی محبت ان کی شخصیت کا ایک قومی عنصر ہے تو پھر ادب میں اس عنصر کو دبانے کے کیا معنی؟ اصل خرابی یہ ہے کہ ہمارے نئے ادب میں چند خاص قسم کے موضوعات اور احساسات ہی کو بجائے خود ادب سمجھنے کا فیشن چل پڑا ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر نئے شاعر اپنی طبیعت میں اضمحلال یا خستگی پیدا کرنے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں، ہم شاعری کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے یہاں ناکام نظموں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے تو اس گروہ کی احتیاط پسندی ادب کے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ پہلے تھوڑی سی جرات رندانہ سے کام لیا جائے ورنہ احتیاط کو تعطل بنتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

اب ان لوگوں کا جائزہ لیجئے جو ادب میں "پاکستانیت" چاہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک کسی نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ آخر پاکستانی یا اسلامی ادب ہے کیا۔ چند لوگوں نے ادب میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور اس خواہش کو پاکستانی یا اسلامی ادب کا نام دے دیا۔ ایک طرح دیکھیے تو جس ڈھرے پر ہماری زندگی چلتی آئی ہے اس کے پیش نظر یہ کوئی غیر متوقع بات بھی نہیں ہے کہ ہم اسلامی ادب کے لازمی عناصر کو تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے نہ سمجھ سکتے ہیں، مگر دوسری طرح دیکھیے تو تفصیلی بحث اتنی لازمی بھی نہیں ہے کیونکہ ہمارے سامنے اسلامی ادب کے نمونے موجود ہیں۔ غالب، اقبال، میر امن، سرسید، نذیر احمد وغیرہ وغیرہ جو حضرات اسلامی ادب کے مطالبے کو مذہبی جنون کی ایک قسم سمجھتے ہیں، اُنہیں یہ سن کر قدرے اطمینان ہو گا کہ خیر، اگر غالب بھی اسلامی ادب ہے تو کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے لیکن اس کے برخلاف اسلامی ادب کے بعض علمبرداروں کو اس معاملے میں میر امن، غالب بلکہ امیر خسرو اور حافظ تک کا ذکر کفر کے برابر معلوم ہو گا۔ یہ طبقہ ہے تو مخلص مگر اس غلط فہمی میں گرفتار ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ اسلام کا جز نہیں ہے۔ اگر اسلام نے اپنے آپ کو محض ایک مابعد الطبیعیاتی فلسفے کے طور پر پیش کیا ہوتا تو خیر ہم مان لیتے کہ اسلام چند عقائد کا نام ہے، لیکن اگر اسلام انسانیت کی تاریخ میں ایک تہذیبی قوت بن کر آیا ہے تو ہم مسلمانوں کی تاریخ کو اسلام کے مفہوم سے خارج نہیں

کر سکتے۔ اسلام کو ابدی حقیقت سمجھنے کے اور کوئی معنی نہیں ہیں۔ اسلام اسی لیے ابدی حقیقت ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی رو سے الگ ہٹ کر کونے میں نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تاریخ کی ہر نئی قوت کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "خالص اسلام" کا مطالعہ دو ہی قسم کے رد عمل پیدا کر سکتا ہے، اور دونوں کے دونوں بڑے نقصان رساں قسم کے۔ یا تو آپ تیرہ سو سال کی پوری تاریخ کو باطل اور غیر اسلامی ٹھیرا دیں یا پھر یہ کہنے لگیں کہ جو مذہب تیس پینتیس سال سے زیادہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکا اس سے آئندہ کیا امید کی جاسکتی ہے۔ یہ باتیں کہنے والے حضرات خیالات کو پیش نظر رکھتے ہیں، مگر انسان کی نفسیات کو بھول جاتے ہیں۔ مذہب تو الگ رہا، ایک عام آدمی کا ذہن کسی خیال کو بھی خالص اور بے میل شکل میں قائم رکھ سکتا ہے؟ ہر آدمی کی نفسیاتی ضروریات اور جذباتی تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ ان کے مطابق ہر خیال میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور کرتا ہے، پھر اس کے بعد نسلی اور جغرافیائی اثرات خیال میں تھوڑا بہت رودبدل کرتے ہیں۔ ان چیزوں سے بچنا انسان کے لیے ناممکن ہے، کسی اور مخلوق کے لیے ممکن ہو تو ہو۔ اگر تیرہ سو سال کے دوران میں مسلمان کسی چھوٹی یا بڑی بات میں اسلامی اصولوں سے ہٹ گئے ہوں تو اب چوبیس گھنٹے اس پر افسوس کیے چلے جانے یا لعنت ملامت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو "اصل" اسلامی اصولوں سے محبت ہے تو انہیں اپنی شخصیت میں رچائیے، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام تو اصلی حالت پر قائم رہ ہی نہیں سکا، اب اسلام کا نام رٹنے سے فائدہ ہی کیا ہے، وہ یہ بتائیں کہ دنیا کا کون سا مذہب یا کون سا نظریہ ایسا ہے جو تیس سال بھی بے میل رہ سکا ہو۔ مارکسیت تو عملی صورت میں آنے کے بعد پانچ سال بھی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکی اگر اسلامی تہذیب میں ایران کی سی شہنشاہیت پیدا ہوگئی تو مارکسی تہذیب میں بھی جرمنی کی سی آمریت ابھر آئی (یہ الگ سوال ہے کہ یہ آمریت موجود حالات میں ضروری ہے یا نہیں) مسلمانوں میں اخوت کے عقیدے کے باوجود نسلی تعصب پیدا ہو گیا تو مارکسی تہذیب میں بھی نسلی تفاخر کا جذبہ اور اسلاف قوم کی برتری کا خیال پیدا ہو چکا ہے اور مارکسیت اسلافیت کا تتمہ بن رہی ہے۔ چونکہ یورپ کے بعض مفکر لادینی کے نتائج سے خائف ہو کر نئے مذہب کی تلاش میں کچھ بدھ مذہب کی طرف مائل ہوگئے ہیں، اس لیے ہمارے یہاں بھی بعض اصحاب بدھ مذہب سے بے انتہا مرعوب ہیں حالانکہ بے میل رہنے کے معاملے میں بدھ مذہب کا حال بھی کچھ

بہتر نہیں ہے۔ مہاتما بدھ کا ایک انقلابی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو اُپنشد والی مابعد الطبیعیات کی بھول بھلیوں سے نکال لیا اور الہیات کے بجائے انسانی زندگی پر زیادہ زور دیا۔ مگر ان کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے بدھ مت میں اُپنشد کا فلسفہ پھر لا داخل کیا اور الہیات کا سارا کھڑاگ پھر شروع کر دیا۔ اگر اسلام اور بدھ مت دونوں اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکے تو پھر سارا نچوڑ اسلام ہی پر کیوں ہے، بدھ مذہب سے مایوسی کا اظہار کیوں نہیں کیا جاتا؟

تو جناب، بے میل ذات تو بس ایک اللہ کی ہے، انسانی دماغ تو "خالص" بن نہیں سکتا۔ البتہ ذرا بے تعصبی اور انصاف سے کام لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی مذہب کے پیروؤں کو "بے میل" اور "خالص" رہنے کی اتنی فکر (بلکہ پریشانی) نہیں رہی جتنی مسلمانوں کو رہی ہے۔ اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمان رُک رُک کر اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیتے رہے ہیں اور یہ سوچتے رہے ہیں کہ ہم اسلام کے راستے سے ہٹ تو نہیں گئے۔ صرف مفکرین یا علمائے دین ہی نہیں بلکہ معمولی سے معمولی آدمی بھی۔ اس بات کی مثال اور کون سی تہذیب پیش کر سکتی ہے؟ کمیونسٹ تہذیب میں تو تیس سال کے اندر یہ حال ہو گیا ہے کہ اسٹالن نے جو بات کہہ دی، لوگ ایمان لے آئے کہ ہاں اصل مارکسیت یہی ہے اور ہمارے یہاں تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی لوگوں کو دُھن ہے کہ "اصل" اسلام کو پھر سے زندہ کرو۔ یہ فرق کچھ معنی رکھتا ہے۔ ایک اور فرق دیکھنے کے لائق ہے۔ یوں ہونے کو تو مسلمانوں نے ایرانی طرز کی شہنشاہیت قبول کر لی، مگر خلافت راشدہ کے زمانے کی یاد ان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ عوام اس زمانے کی جمہوریت اور عدل و مساوات کو یاد کریں تو کریں، خود مسلمان بادشاہوں میں اس زمانے کی پیروی کا رجحان موجود رہا ہے اور بار بار ایسے مسلمان بادشاہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے غریبوں کی طرح زندگی بسر کرنا اپنا فرض سمجھا ہے، یہ باتیں اُنہوں نے محض اپنی "افتادِ طبع" کے مطابق نہیں کیں بلکہ اس احساس کے ساتھ کہ ہمارے سامنے اصول بھی موجود ہیں اور عملی نمونہ بھی۔ ناصر الدین محمود اور عالمگیر خود ہمارے یہاں دو ایسے بادشاہ ہوئے ہیں۔ پھر کم سے کم نظریاتی طور پر مسلمان بادشاہوں نے اپنے آپ کو اسلامی اصولوں سے آزاد بھی نہیں سمجھا۔ مذہبی امور میں تو بادشاہوں کی مرضی کا زیادہ دخل کبھی بھی نہیں رہا بلکہ بعض دفعہ دنیاوی معاملات میں بھی اُنہیں دین سے دبنا پڑا۔ علاء الدین خلجی نے

میکاویلی کے طرز کا مطلق العنان فرماں روا بننے کی کوشش کی تھی، مگر جب وہ حد سے بڑھنے لگا تو علماء ہی نے اُسے روکا اور قاضی عطاء الملک نے اُسے سرزنش کی کہ تم رعایا پر خلاف شرع سختیاں نہیں کرسکتے۔ اسی طرح محمد تغلق نے خلاف شرع مال گزاری بڑھا دی تھی، نئے محصول لگا دیے تھے اور نظم و نسق میں اسلامی اصول کی خلاف ورزی کی تھی تو علماء نے اُس کی مخالفت کی۔ یہ مثالیں دینے سے میرا مقصد یہ ہے کہ خواہ مسلمان عمل میں اسلامی اصولوں سے دور ہٹ گئے ہوں، مگر یہ اصول ان کے دل سے محو نہیں ہوئے اور اُنہیں اپنی خامیوں کا ہمیشہ رنج رہا۔ یہ بات آپ کسی اور تہذیب میں نہیں دکھا سکتے۔ مسلمان کی روح کو ہمیشہ ''طہارت'' کی جستجو رہی ہے۔

اگر ''خالص'' اسلام کے معنی اسی جستجو کے ہوں تب تو ٹھیک ہے، مگر بعض لوگ مسلمانوں کی پوری تاریخ ہی کو سرے سے رد کر دیتے ہیں جب یہ لوگ اسلامی ادب کا نام لیتے ہیں تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اب تک جتنا ادب پیدا کیا ہے، حافظ، خسرو، سعدی، میر، مصحفی، غالب، میرامن، طلسم ہوشربا سب کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک ادب کا واحد مقصد اخلاق کی درستی ہے یا موعظت حسنہ، اور وہ بھی خاصے کھلے کھلے لفظوں میں انسان کی پوری شخصیت پر آرٹ کا جو اثر ہوتا ہے اس سے یہ لوگ بالکل واقف نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو احساس ہے کہ ادب آسانی سے نہیں مٹ سکتا، اس لیے سوچتے ہیں کہ چلو ادبی عنصر جتنا کم رہ جائے، اتنا ہی غنیمت ہے۔ یہی بات زیادہ نقصان رساں ہے۔ اگر کوئی صاف کہہ دے کہ ادب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، مگر ادب کے نام سے ''غیرادب'' کا مطالبہ کرنا غلط ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ ادب کی ماہیت سے باخبر نہیں ہیں اور نہ ادب سے محبت کرتے ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ ایک صاحب اپنے دوست کے باپ کی موت پر تعزیت کرنے پہنچے تو اپنے دوست سے کہنے لگے کہ صاحب بڑا افسوسناک حادثہ ہے، خدا آپ کو نعم البدل عطا کرے۔ یہی بات ایک طرف تو ترقی پسند اور دوسری طرف ''اسلامی ادب'' کے بعض حامی ادب سے کہہ رہے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ادب کا بھی کوئی نعم البدل اول ہو ہی نہیں سکتا، یا تو ادب ہوگا یا نہ ہوگا۔ تو اسلامی ادب والوں کو بھی سب سے پہلے یہ بات طے کرنی ہوگی کہ ہمیں ادب چاہیے یا نہیں چاہیے۔

اگر تمہیں واقعی ادب چاہیے تو پھر ''اسلامی ادب'' کی نوعیت معلوم کرنے میں

ایسی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب میں بھی ہم اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کو رد نہیں کرسکتے۔ ہر معاملے میں ہمارا آئندہ عمل بڑی حد تک ہمارے ماضی پر منحصر ہے تو پاکستانی یا اسلامی ادب کی نئی روایت قائم کرنے کے لیے بھی ہمیں یہی دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے فنی کارناموں میں اسلامی روح کس طرح ظاہر ہوئی ہے۔ تاج محل کو ہم اسلامی عمارت صرف اس وجہ سے نہیں کہتے کہ اس میں جابجا آیتیں لکھی ہیں۔ تاج محل کے پورے نقشے میں وہ عقلیت پائی جاتی ہے جو اسلام کے بنیادی عناصر میں سے ہے۔ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے کہ انسان فطرت سے اُوپر اٹھے اور غیر مادی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ تاج محل بھی فطرت کے خطوں کی پیروی نہیں کرتا بلکہ اپنی وضع ان اصولوں کے مطابق تراشتا ہے جو فطری جبلتوں کو نہیں بلکہ عقل محض کو مطمئن کرتے ہیں۔ اسی لیے تاج محل میں فطری قوتوں کی ہیبت نہیں (جو ہندو مندروں میں ہوتی ہے) بلکہ انسانی وقار ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر ہم تاج محل کو اسلامی مزاج کا مظہر کہتے ہیں یا حضرت میر تقی میر کے چند اشعار دیکھئے:

صبر بھی کیجئے بلا پر میر صاحب جی کبھی
جب نہ تب رونا ہی دھونا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

یہ شعر پڑھ کر ہم بجاطور پر سوچ سکتے ہیں کہ میر کے یہاں جو روزمرہ کی معمولی زندگی کا اتنا خیال، عام انسانی رشتوں کا اتنا لحاظ اور محبوب تک کے معاملے میں اپنائیت کا ایسا احساس ملتا ہے، اس میں اسلام کی اجتماعیت اور خصوصاً تصوف کی عالمگیر قبولیت کا تو ہاتھ نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ جو کاوش میر کے یہاں ملتی ہے کہ بھرپور زندگی کے بلند ترین اور لطیف ترین احساسات کو روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے تو یہ تو ٹھیٹ اسلامی مزاج کے بنیادی مطالبات میں سے ایک ہے۔

ممکن ہے کہ میرا یہ تجزیہ غلط ہو، مگر ایسا ادب پیدا کرنے کے لیے جو بیک وقت ادب بھی ہو اور اسلامی بھی، ہمیں اپنے پورے ادب اور فن کی چھان بین اس نقطہ نظر

سے کرنی پڑے گی کہ اس میں اسلامی مزاج کس طرح ظاہر ہوتا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ عربی ادب سے تو میں بالکل ہی واقف نہیں ہوں، فارسی ادب سے بس یونہی سی یاد اللہ ہے، اور اُردو ادب میں بھی مجھے درک حاصل نہیں ہے۔ بہرحال، یوں ہی اٹکل پچو ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ادب نے ایک بہت بڑا فریضہ سرانجام دیا ہے: اسلام جب بھی زمان و مکاں کی نئی کیفیتوں سے دوچار ہوا ہے — یعنی کسی نئے علم یا نئے فلسفے یا نئے نسلی مزاج سے — تو ادب نے ان دونوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی بنیادی روح بھی صحیح سالم رہے اور نئے تقاضے بھی پورے ہو جائیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اسلامی اصول ابدی اور زندہ حقیقتیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان اصولوں کو محسوس کرنے یا ان کو اپنی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کا بس ایک ہی طریقہ ممکن ہے جو خلافت راشدہ کے زمانے میں مقرر ہوگیا۔ ابدی حقیقت کوئی شکنجہ نہیں کہ آدمی چاہے مرے چاہے جیئے، مگر بندھا پڑا رہے۔ ابدی حقیقت کا تو فائدہ ہی یہی ہے کہ آدمی کو زندہ رہنے میں، اور پوری رچاوٹ کے ساتھ زندہ رہنے میں مدد دے۔ کسی حقیقت کو ابدی کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ زمان و مکاں یا شعور کی تبدیلی کے ساتھ نہیں مرتی بلکہ اُن تبدیلیوں کو بھی بالآخر اس حقیقت کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ مگر چونکہ یہ حقیقت زمان و مکاں سے ماورا ہوتی ہے اس لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ زمان و مکان کی ہر تبدیلی کے ساتھ اُسے نئے سرے سے محسوس کیا جائے تاکہ ہم ابدی حقیقت اور عارضی حالات میں بھی کوئی ربط اور ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ اصل حقیقت تو ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے، مگر جب وہ انسانوں کے تجربے میں آتی ہے تو زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے گرد محسوسات کا جو مرکب ہوتا ہے، وہ بھی بدل جاتا ہے۔ اگر یہ محسوسات کا مرکب نہ بدلے تو یہ حقیقت زمان و مکان کے بدل جانے کے بعد لوگوں کے لیے ناقابل قبول نہیں رہے گی یا اگر لوگوں نے اسے قبول کر لیا تو انھیں اس ماحول میں زندہ رہنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس لیے ابدی حقیقتوں کو اپنے شعور میں گھلانے کے لیے ہر بار نئی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے محض واقفیت کافی نہیں ہوتی۔ ادب بھی اس معاملے میں بڑی مدد کرتا ہے، اور محسوسات کے بہت سے نئے مرکبات ادب ہی تیار کرتا ہے یا ان کی تیاری میں ادب کا خاص حصہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ کام ادب نے متعدد بار کیا ہے، یونانی فلسفے، ہندوستانی مابعد الطبیعیات، ایرانی مزاج یا ہندوستانی مزاج

اور اسلام کے بنیادی عقائد کے درمیان ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں فارسی اور اُردو شاعری نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پھر جب مغرب کے علوم اور شعور کو مسلمانوں کے احساسات میں جذب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اقبال پیدا ہوئے اور یورپ کی انیسویں صدی کو اپنے شعور میں سمیٹ کر ہمارے وجدان کو یہ سکھایا کہ اس شعور کے ذریعے ہم اسلام کی ابدی حقیقتوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ (عربی دان حضرات کو یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یورپ کے متصوفین کے خاص وطن سپین کے ملکی مزاج سے ابنِ عربی اور ابنِ رشد کا کیا تعلق ہے)۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مجھے ذرا بھی اصرار نہیں ہے کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں، وہ درست ہیں۔ میں تو یہ معلوم کرنے کی فکر میں ہوں کہ پاکستان کی مجموعی زندگی میں ادب کا فریضہ کیا ہو سکتا ہے، چنانچہ جو کوئی الٹی سیدھی بات مجھے سوجھی ہے، وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تا کہ پاکستانی ادب کی بات آگے چل سکے۔ جو بات میں نے ابھی اوپر کہی ہے، وہ اگر صحیح ہے تو پاکستانی ادب کا ایک فریضہ تو طے ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ ہمارا ادب بیسویں صدی کے مغربی علوم، فلسفے، وجدان اور شعور کو اپنا کر اُن کے ذریعے اسلام کی ابدی حقیقتوں کو ازسرِ نو محسوس کرنے کی کوشش کرے۔ بظاہر یہ بات مہمل سی نظر آتی ہے کہ آخر یورپ کے شعور کو قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ یہ شعور ایک زوال پذیر تہذیب کا ہے اور ہماری قوم ازسرِ نو جوان ہوئی ہے، مگر قصہ یہ ہے کہ جب نئے علوم وجود میں آتے ہیں تو وہ انسانی دماغ میں خاص قسم کا ردِ عمل پیدا کرتے ہیں اور انسان کے اندر سوتے ہوئے بہت سے بھوتوں کو جگا دیتے ہیں۔ ان بھوتوں کو پکڑ کے قابو میں لانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ سوچ لیں کہ آنکھیں بند کر لینے سے یہ بھوت غائب ہو جائیں گے تو یہ نری خود فریبی ہے۔ روس کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ روس کے اربابِ اقتدار سمجھتے ہیں کہ ایک خاص قسم کا ادب یا شعور صرف زوال پذیر بورژوا سماج ہی میں ممکن ہے، چنانچہ اس قسم کے ادب کی وہ اپنے یہاں اجازت ہی نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شدید احساس اور ضمیر رکھنے والے فنکار خود کشی کر لیتے ہیں یا حکومت ان کا منہ بند کر دیتی ہے اور اب تو خیر وہاں کی حکومت نے عملی تحقیقات پر بھی پابندیاں لگانی شروع کر دی ہیں، جبھی تو آج کل روسی ادب کی حالت زار ہے۔ ہمیں اتنی کم ہمتی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بیسویں صدی کے علوم ہمارے اندر جیسا بھی ردِ عمل

پیدا کریں، ہمیں ان علوم کے پیدا کیے ہوئے شعور سے گھبرانا یا بچنا نہیں چاہیے کیونکہ اگر ہم اس کا وجود تسلیم نہیں کریں گے تو وہ کسی اور طرح بدلہ لے گا۔ البتہ ہمیں اس کے فاسد اور حیات کش عناصر کو قابو میں لا کر اور ان عفریتوں کی مزاحمت کو ختم کر کے اسلامی حقائق تک پہنچنا ہوگا۔ ہمارے ادب کو یہ ثابت کر کے دکھانا ہے کہ بیسویں صدی کے مخصوص حالات میں بھی اسلام کی ابدی حقیقتیں اسی طرح کار آمد اور کارگر ہیں، اتنی ہی جاں بخش ہیں جتنی آج سے تیرہ سو سال پہلے تھیں۔ ہمارا ادب صرف اس بات کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ اس حقیقت کو حیاتی طریقے سے زندہ شکل میں پیش کرے گا۔ میرے ذہن میں جس پاکستانی یا اسلامی ادب کا تصور ہے، وہ ڈرا، سہما یا گٹھل یا کٹ حجت نہیں ہوگا بلکہ دلیر، بے باک، حساس، نئے تجربوں کا شوقین، ہر قسم کی ذہنی اور اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کو تیار کیونکہ اسلامی کردار یا اسلامی سماج کی تخلیق فن کار کے شعور کی خوفناک روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ خوفناک میں نے اِس لیے کہا کہ اس روشنی میں واقعی بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی نہیں رہ سکتیں۔ جبھی تو بعض لوگ منٹو کے افسانے "کھول دو" کو پاکستان کے خلاف بتاتے ہیں۔

اب بحث کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے۔ دو ایک حضرات نے پاکستانی یا اسلامی ادب کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے پاکستانی ادب کی سب سے پہلی شرط ریا کاری ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک پاکستانی ادیب کا فرض یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو نظم یا افسانے کی شکل میں پیش کرتا رہے، خواہ ان کی سچائی کا جذباتی تجربہ اُسے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو چاہے خود ان اصولوں پر یقین ہو یا نہ ہو، مگر دوسروں کو یقین دلانے کی کوشش کرے۔ یا پھر یوں ہو سکتا ہے کہ ادیب دس پانچ سال خاموش بیٹھا رہے اور جب اُسے حقائق کا عرفان حاصل ہو جائے تو اٹھ کے اعلان کرنے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہمارے ادیب ریا کاری برتیں اور یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہمیں عرفان حاصل ہو گیا ہے، ورنہ پھر کئی سال تک ادب میں خاموشی رہے اور جب ادیبوں کو عرفان حاصل ہو جائے تو پھر دیکھا جائے۔ کسی پیغمبر یا ولی یا صوفی کا معاملہ ہوتا تو خیر دوسری بات تھی، مگر ادیب اپنے عرفان کا ایسا حتمی اعلان کرے تو نہ ادب کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ ادب پڑھنے والوں کو۔ ہمارے لیے تو وہ آخری منزل اتنی اہم نہیں ہے جتنا کہ اس منزل کی طرف سفر، اور اس سفر کا ہر قدم۔ اگر آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کل عرفان حاصل ہو گیا تو میں آپ کو مبارک باد تو دے

سکتا ہوں مگر مجھے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میرے لیے تو یہ بات زیادہ ضروری ہے کہ آپ کو کتنی دشواریاں پیش آئیں، آپ کدھر کدھر بھٹکے اور ٹھیک راستے پر کس طرح پہنچے۔ اگر آپ مجھے یہ ساری باتیں بتائیں تو مجھے اپنی جستجو میں واقعی مدد مل سکتی ہے۔

چنانچہ پاکستانی یا اسلامی ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ریاکاری کو مطلق دخل نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے کسی اصول پر ایمان نہیں لاسکے ہیں تو اپنے افسانے یا نظم میں اپنا پورا ذہنی اور روحانی تجربہ پیش کیجئے کہ فلاں فلاں نفسیاتی محرکات مجھے ایمان نہیں لانے دیتے۔ جاندار اسلامی ادب پیدا ہونے کے لیے لازمی ہے کہ ادیب خواہ مخواہ اسلامی ادب پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنے ساتھ ایمانداری برتیں۔ ہماری ذہنی کاوشوں کی ایک سمت ہونی چاہیے۔ شروع شروع میں یہ بہت کافی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ سچے اور صالح اسلامی ادب کے رونما ہونے سے پہلے ایسا ادب بھی ہماری مدد کرسکتا ہے جس میں پوری سنجیدگی ذمہ داری اور خلوص کے ساتھ اسلام کی مخالفت کی گئی ہو۔ ہمارے لیے اصل میں جو چیز خطرناک ہے، وہ اسلام سے بے اعتنائی ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ مخدوش بات یہی ہوئی ہے کہ ہمارے ادیب مذہب سے بے پروا ہو کے رہ گئے، انہوں نے کبھی اسلام کی شدید مخالفت نہیں کی۔ اگر مخالفت کی ہوتی تو شاید اب تک اسلامی ادب پیدا بھی ہوگیا ہوتا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے انگلستان اور فرانس کی مثال مفید ہوگی۔ انگلستان میں تو چونکہ مذہب رسماً اور تکلفاً ہی رہ گیا ہے، اس لیے وہاں کے عام ادیبوں کے ذہن میں جو کشمکش ہوتی ہے، اس میں نہ تو زور شور ہوتا ہے، نہ شدت نہ مختلف عناصر کی شکل و شباہت واضح ہوتی ہے، نہ کوئی دو ٹوک فیصلہ ہوتا ہے، اس کے برخلاف فرانس میں اب بھی مذہب مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہاں کے ادیب کا ذہنی ہیجان بڑی جلدی طوفان بن جاتا ہے۔ فرانس کا ادیب مذہب کے بارے میں بے پروائی نہیں کرسکتا۔ مذہب کی عزت نہیں کرے گا تو گالیاں دینے لگے گا۔ بلکہ گالیاں دینے کے بعد وہ عموماً آکے پھر صلیب کے سامنے جھک جاتا ہے۔ چنانچہ مذہب پر دوبارہ ایمان لانے کی نفسیات کو فرانسیسیوں نے اپنی نظموں اور ناولوں کا موضوع اکثر بنایا ہے۔ مذہب کے بارے میں فرانسیسی ادیبوں کے اس سنجیدہ اور ذمہ دارانہ رویہ سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، اور یہ بھی اندازہ کرسکتے ہیں کہ موجودہ حالات میں کس قسم کا "مذہبی" ادب درکار ہے۔

ایک بات "اسلامی" ادب کے حامیوں کو یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس ادب کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب اور مغربی شعور کے فاسد عناصر کو قابو میں لائے تو یہ ناممکن ہے کہ ہمارے ادب میں فاسد عناصر موجود نہ ہوں۔ فاسد

عناصر کے خلاف جو لڑائی ہمارے شعور کو لڑنی ہے، وہ آنکھوں کے سامنے لڑی جانی چاہیے۔ اصل میں جو لوگ اسلامی ادب پڑھنے کے خواہش مند ہیں، اُنہیں پہلے ادب پڑھنا سیکھنا چاہیے۔ ویسے بھی اسلامی ادب کسی محکمہ احتساب کا نام نہیں ہے کہ اس کے عائد کردہ قوانین سے کوئی سرمو تجاوز کر ہی نہ سکے۔ ہماری اصل ضرورت تو یہ ہے کہ ایک مرکزی روایت ادب میں قائم ہو جائے جو غیر شعوری طور پر ادیبوں کو متاثر کرتی رہے۔ اس کے بعد پھر ادیبوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اگر ہم نے "خالص" اسلامی ادب پر ضرورت سے زیادہ زور دیا تو ادب بھی ختم ہو کے رہ جائے گا۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ ترقی پسندوں کے ہاتھوں ادب کی کیا گت بنی، اور ادب سیاسی فارمولوں میں تبدیل ہو کے رہ گیا۔ اگر اسلامی ادب کے علمبرداروں نے بھی اسی تاریخ کو دہرایا تو بڑی اندوہناک بات ہوگی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات اسلامی ادب کے نام کو تخلیقی تحریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ محتسب کے کوڑے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس رجحان کے پھیلنے کا احتمال اس وجہ سے اور بھی ہے کہ ہمارے ذمہ دار ادیب ابھی تک پکنک میں پڑے ہوئے ہیں۔

غرض جو صاحب اسلامی ادب لکھنا یا پڑھنا چاہتے ہوں، اُنہیں پہلے تو اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ دو دو منٹ کے بعد لال پیلے ہونے سے کسی قسم کا بھی ادب پیدا نہیں ہوگا۔ اسلامی ادب منہ کا نوالہ نہیں ہے، اسے پوری بیسویں صدی کو اپنے اندر سمیٹنا ہوگا۔ یہ کام ہلڑ بازی سے نہیں ہوگا، اس سے تو فن کار کی شخصیت ہی نمٹ سکتی ہے۔ ادیبوں کو اسلامی ادب کی طرف بلانے کا طریقہ بھی یہ نہیں ہے کہ تخلیقی کام سے پہلے احتسابی کام شروع کیا جائے اور ادب کو سیاست بنا دیا جائے۔ ہمیں تو ادیبوں سے بس عیشی کی زبان میں یہ کہنا ہے ؎

کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

یا سلیم احمد کی طرح یہ پوچھنا ہے کہ ؎

ازل سے گوش بر آوازِ پا ہیں ویرانے
جنوں کی کون سی منزل میں اب ہیں دیوانے؟

(جولائی، اگست ۱۹۴۹ء)

جدیدیت، غالب اور میرجی

یہ بات اب واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ہماری غزل پر غالب کے بجائے میر کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ محض تنوع پسندی نہیں ہے۔ اب ہمارے غزل گو نئی ذہنی اور روحانی ضرورتیں محسوس کر رہے ہیں جو غالب کی شاعری سے پوری نہیں ہوتیں — اب ان کے سامنے ایسے مسئلے ہیں جنہیں میر نے زیادہ شدت سے محسوس کیا تھا اور ایک ایسا "مزاج" پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جو زندگی سے ہم آہنگی قائم رکھنے میں مدد دے سکے۔ یہ مسئلہ صرف ہمارے ہی شاعروں اور ادیبوں کے سامنے نہیں بلکہ پوری دنیا کا ادب آج کل اسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس اعتبار سے میر، غالب سے زیادہ "جدید" ہے اور نئے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے غالب کو جدید کیوں کہنا شروع کیا تھا۔ غالب کی جدیدیت کا احساس شاید سب سے پہلے عبدالرحمٰن بجنوری کو ہوا تھا۔ وہ اس لیے کہ مروجہ اقدار سے بے اطمینانی کا جو عمل یورپ میں اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں شروع ہوا تھا، وہ ہمارے یہاں انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا، اور اسے شعوری شکل اختیار کرتے کرتے بیسویں صدی کے بھی دس بیس سال گزر گئے پھر انگریزی تعلیم پانے والے نے رومانی شاعروں کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوا، اور سماج کی اقدار سے انحراف ذہین اور حساس آدمی کا امتیازی نشان قرار پایا۔ واقعی اُس وقت یہی جدیدیت تھی، اور ایک حد تک آج کل بھی ہے، مگر یہ جدیدیت ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتی تھی، اسے کسی نہ کسی طرف چلنا ضرور تھا۔ چنانچہ اگر شاعری کے لیے جدیدیت کوئی لازمی صفت ہے تو ہم غالب اور میر کے درمیان اس وقت تک کوئی معقول فیصلہ نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم یورپ کی جدیدیت کے اندازِ رفتار سے واقف نہ ہوں۔

اس جدیدیت کا آغاز تھا مروجہ اقدار سے انحراف۔ اگر اس ذہنیت کو منطقی طور پر نشوونما پانے دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، پھر اس کے بعد مروجہ علوم صحیحہ تک کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی قدر کو غلط اور ناکارہ ثابت کیا جائے، مگر کسی چیز کو غلط یا ناکارہ کہنے کے لیے لازمی ہے کہ آپ کے پاس فیصلے کے لیے کوئی معیار بھی ہو۔ ایک معیار تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مروجہ اقدار میں سے چند کو تسلیم کر لیں اور اس کسوٹی پر کس کس کے باقی اقدار کو کھوٹا ثابت کر دیں، مگر اس طرح مکمل انحراف ممکن نہیں ہو گا۔ اس لیے جدیدیت کا سب سے بڑا معیار ذاتی پسند یا انفرادیت قرار پایا۔ جب "جدید" شاعر ہر خارجی اصول کو رد کر چکا تو نفی کے لیے بس ایک چیز باقی رہ گئی — اپنی شخصیت — اب شاعر اس طرف متوجہ ہوا اور اس نے اپنی شخصیت کو تکا بوٹی کرنا شروع کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اندرونی مرکزیت تو ختم ہو ہی گئی تھی، خیالات اور جذبات کو بھی فریب سمجھ کر چھوڑا جا سکتا تھا، مگر لوگ اپنے اعصابی ارتعاشات کو بھی مشکوک سمجھنے لگے۔ مختصر طور سے جدیدیت کا عمل یہ رہا ہے، اور کئی معنوں میں اب بھی جاری ہے، مگر یہ سب شاخسانے ہیں۔ مکمل نفی خودی کے بعد اگر آپ کسی بسیط حقیقت سے دوچار ہو جائیں تو ایک نیا تخلیقی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ورنہ پھر خاموشی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ فلسفہ زیست والوں کے یہاں کوئی ایسی بات نہیں جو بودیلیئر، ملارمے یا راں بو کے یہاں پہلے سے موجود نہ ہو۔ یہ لوگ تو صرف تفصیلات پیش کر رہے ہیں۔

مگر جدیدیت نے ہر چیز کی نفی کر دینے کے بعد ایک اور پلٹا کھایا ہے۔ فن کار نے اپنے آپ تک کو گھلا دینے کے بعد یہ سمجھا کہ اب ہر چیز ختم ہو گئی، مگر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی دوسرے لوگ باقی ہیں جنہیں مٹانا آسان نہیں، چنانچہ فنکار اپنی روحانی جدوجہد کی انتہا پر پہنچ کے پھر اثبات کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل آپ مارسل پروست اور جوئس کے یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ تخریبی عمل ٹومس مان کے یہاں شاید اتنی اچھی طرح پیش نہ کیا گیا ہو، مگر تعمیری عمل کی تفصیلات اُن کے یہاں زیادہ ہیں۔

اس سارے عمل اور ردِ عمل کی تہ میں بنیادی کشمکش یہ ہے کہ فن کار اور دوسرے انسانوں میں کیا رشتہ ہو۔ انصاف، صداقت اور فن کے اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق اپنی روحانی زندگی کو ڈھال لینے کے بعد بھی آدمی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر

سکونِ قلب کے ساتھ رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اب تک اس سوال کا جواب ادیب اور شاعر یہ دیتے رہے ہیں کہ نہیں۔ مگر جدید ترین فن کاروں نے دریافت کیا ہے کہ ایک چیز انصاف، صداقت اور حسن سے بھی بڑی ہے — حیاتِ محض۔ اگر آدمی حیاتِ محض کو قبول کرلیتا ہے تو دوسروں کے ساتھ اشتراک کی کم سے کم ایک وجہ تو نکل آتی ہے، بلکہ ایسا اشتراک حیاتیاتی طور پر لازمی ہو جاتا ہے۔ زندگی کی اس قوت کا احساس فن کاروں کے اس نئے اثبات کا موجب ہوا ہے۔

میر کی بھی روحانی کشمکش کا ماحصل یہی ہے کہ اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ اس اعلیٰ ترین زندگی کا نام ان کے یہاں عشق ہے۔ وہ عشق کو دنیا کے معمولات سے الگ نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ ان میں سمو دینا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش، بقول فراق صاحب، یہ رہی ہے کہ مادیت میں تھوڑی سی روحانیت اور روحانیت میں تھوڑی سی مادیت پیدا کی جائے (عجیب بات ہے کہ فرانس کے سور ریلسٹ اپنے بارے میں بالکل یہی بات کہا کرتے تھے) میر کا عاشق زندگی کے سینکڑوں انسانی رشتوں کے اثرات اپنی طبیعت پر لیے ہوئے محبوب کی طرف مائل ہوتا ہے ۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

یہاں جو لہجہ کا بھول پن ہے، وہ خالی طرز بیان کی بدولت نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کی زندگی میں شرکت کرنے سے حاصل ہوا ہے۔

مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میر کو کبھی تنہائی کا احساس ہوا ہی نہیں یا انھوں نے دوسرے انسانوں کے متعلق احمقانہ خوش فہمی میں عمر کاٹ دی۔ اگر ظاہری حالت دیکھیے تو غالب کی زندگی میں بڑی چہل پہل تھی اور انھیں اپنے زمانے کے حساس ترین انسانوں کی دوستی میسر تھی۔ اس کے برخلاف میر کا زمانہ اور ان کا مزاج اس معاملے میں سازگار ثابت نہیں ہوا۔ اُنھیں خوب تجربہ تھا کہ جس آدمی کی زندگی میں اعلیٰ ترین معنویت پیدا ہونے کے انداز موجود ہوتے ہیں، اس کے ساتھ کیا گزرتی ہے۔

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگا ہوں دور سب سے، میں کس کا آشنا ہوں

تیری چال ٹیڑھی، تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

مگر دیکھیے شکایت کرتے ہوئے بھی میر اعتراف کر گئے کہ آدمی خود ہی روکھا پھیکا ہو تو بچارے دنیا والے بھی کیا کریں۔ بہر صورت انہوں نے اس احساس کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا کہ میں کوئی نادر الوجود ہستی ہوں اور مجھے سمجھنے کی کوئی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ اندازِ فکر غالب کی رگ و پے میں بس گیا ہے۔ مومن یہاں تک آتے ہیں ؎

بے سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی
اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ وہ عشق کی سرمستی تو باقی نہیں رہی، یا کم ہو گئی، چلو دنیا کی رنگا رنگی سے ہی دل بہلا لیں۔ مگر میر کے یہاں عاشق اور دنیا والوں کے درمیان ایسی زبردست خلیج حائل نہیں ہے۔ ان کے کلام کی دنیا میں دوسرے لوگ عاشق سے بے پایاں ہمدردی رکھتے ہیں، اس کی زندگی جس معنویت کی حامل ہے، اس کا احترام کرتے ہیں، گو خود اس کی تقلید کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر اس کا درجہ پہچانتے ہیں ؎

جی میں تو ہے کہ دیکھیے آوارہ میر کو
لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو

یہ جو لوگ میر سے ملنے کے مشتاق ہیں تو اس لیے نہیں کہ چلو بھئی ذرا مذاق اڑائیں گے یا اُلّو بنائیں گے۔ یہ لوگ تو اس انداز سے میر کا ذکر کرتے ہیں جیسے اس کی محبت سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہوں، مگر ساتھ ہی ساتھ اُنہیں حیرت اس بات پہ ہے کہ میر جیسے لوگ کچھ عجیب سے کیوں ہو جاتے ہیں، اور اس بات پہ خود میر کو بھی حیرت ہے، بلکہ بعض وقت تو افسوس ہوتا ہے کہ میں دوسروں سے مختلف کیوں ہوں۔ بہر حال میر کی شخصیت دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے، اور دوسرے بھی اس شخصیت کے اسرار کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ؎

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

اسی طرح میر کے یہاں چارہ گر بھی محتسب صفت نہیں ہوتے۔ وہ میر کی روحانی کیفیت کو سمجھتے ہیں، اُسے عشق کی راہ سے باز بھی رکھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہ اسے اعلیٰ

ترین زندگی کا مظہر مانتے ہیں، مگر میر کی تکلیفیں نہیں دیکھی جاتیں۔ اس لیے اس طرح شفقت سے سمجھاتے ہیں جیسے کوئی ماں یا بڑی بہن سمجھاتی ہے۔ وہ اس انداز سے نصیحت کرتے ہیں جیسے خود بھی ان تجربات سے واقف ہوں یا میر کے ساتھ خود اُن کا دل بھی دکھ رہا ہو۔

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب، طاقت جی میں آنے دو

بُرا حال اس کی گلی میں ہے میر
جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

وجہ کیا ہے میر منہ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا

ہم کو تو دردِ دل ہے، تم زرد کیوں ہو ایسے
کیا میر جی تمہیں کچھ بیماری ہو گئی ہے

دانستہ اپنے جی پر کیوں تو جفا کرے ہے
اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے!

اگر دوسرے لوگ کہیں تنقیدی روش اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی اس لیے کہ میر نے انسانی تعلقات میں کمی کردی یا انسان کی بساط سے بڑھ کر دکھ برداشت کرنے کی کوشش

کی ۔

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں، اختیار رکھتے ہیں

رہا تُو تو اکثر المناک میر
ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

اور جب نصیحتوں کا میر پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر بھی لوگوں کے لہجے میں تلخی نہیں آتی بلکہ انہیں یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ میر کی زندگی جس طرح مکمل ہو سکتی تھی، اس کا قرینہ نکل آیا ۔

آتے کبھو جو واں سے تو یاں رہتے تھے اُداس
آخر کو میر اُس کی گلی ہی میں جا رہے

اگر میر کی موت دوسروں کے لیے عبرت کی چیز بنتی ہے تو اس طرح نہیں کہ اچھا ہوا، اسی قابل تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ایسی تکلیفیں اٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

لگا نہ دل کو کہیں، کیا سنا نہیں تُو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

غرض میر کے عشق کے لیے دنیا میں اور دنیا والوں کے درمیان جگہ موجود ہے۔ میر کے لیے عشق عام انسانی تعلقات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اُنہیں کی لطیف اور رچی ہوئی شکل ہے چنانچہ جب وہ محبوب سے توجہ کے طالب ہوتے ہیں تو اس لیے نہیں

کہ ان کے جذبات میں اوروں سے زیادہ شدت اور گہرائی ہے یا وہ توجہ کے زیادہ مستحق ہیں بلکہ انسانی تعلقات کے رشتے سے۔

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں خوب، کوئی بات کرو

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا، چلنے ہار ہیں ہم بھی

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

جب کہ اس آخری شعر سے ظاہر ہے، اُن کی شکوہ شکایت بھی انہیں عام انسانی تعلقات کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوتی ہے، عاشق کے تقاضے نہیں ہوتے۔

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

جفائیں دیکھ لیاں، کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

غرض اعلیٰ ترین زندگی اور عامیانہ ترین زندگی میں جو خلیج ہے، میر نے اپنی شاعری میں اسے پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں نہ تو عام آدمی اتنا بے حس ہے کہ عاشق سے دشمنی یا مغائرت برتے نہ عاشق اتنا جلے تن اور حال مست ہے کہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لائے۔ ان کے یہاں عام آدمی اور عاشق الگ الگ مخلوق نہیں ہیں۔ زندگی عام آدمی کی سطح سے آہستہ آہستہ بلند ہو کر لطافت، معصومیت، شدت، گہرائی اور گیرائی کی اس سطح تک پہنچتی ہے جس سے عاشق مراد ہے۔ ایک دم سے چھلانگ نہیں مارتی۔ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان حد نہیں ہے، ایک زینہ ہے، اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کے لیے۔ غالب کے نزدیک انسانی تعلقات کو ترک کرنا ضروری ہے، میر کے نزدیک ان تعلقات کو چھوڑنا تو الگ رہا، اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کے بعد بھی ان سے بے نیاز نہیں رہا جاسکتا۔ میر کے عشق میں بہت سا درد، نرمی، گھلاوٹ، ہمہ گیری انہیں انسانی تعلقات کے طفیل آتی ہے۔ غالب عاشق کی زندگی اور عام زندگی کو اس شکل میں دیکھتے ہیں ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

یعنی اُن کے لیے ان دونوں میں تضاد اور تقابل کا علاقہ تھا۔ میر کے نزدیک لطافت دراصل کثافت ہی کی نکھری ہوئی شکل ہے۔ یہ کثافت اگر لطافت کے جسم میں خون نہ پہنچاتی رہے تو لطافت مرجھا کے رہ جائے۔

پروست اور جوئس کے سامنے بھی شروع میں لطیف و کثیف کا یہی تضاد تھا مگر آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لطافت خود اپنی ذلت تک محدود ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی، کم سے کم تخلیقی قوت نہیں بن سکتی، استلذاذ بالنفس میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ (یہ الزام لارنس نے ان دونوں پر لگایا تھا مگر اس نے پروست اور جوئس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھا) چنانچہ یہ دونوں کثافت کو یعنی عام انسانی تعلقات کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ جدیدیت کی تازہ ترین منزل ہے۔ آپ مجھے یاد دلائیں گے کہ جوئس کے بعد سارتر آتا ہے جس کا قول ہے کہ جہنم کے معنی ہیں دوسرے لوگ۔ مگر ایک بات تو یہ ہے کہ نفی کی وہ کون سی منزل ہے جہاں پروست اور جوئس نہ پہنچے ہوں اور سارتر پہنچ گئے ہوں۔ وہ دونوں نفی کے سارے مدارج طے کرنے کے بعد اثبات پر جا پہنچے تھے۔ ان دونوں کو چھوڑیے، فرانسیسی سوررئیلسٹوں کی ساری کاوش بنیادی طور سے اثباتی ہی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ سارتر نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ میں تو انسانی دماغ کے صرف ان گوشوں کی

سیاحت میں مصروف ہوں جو انحطاط پذیر ماحول میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس روحانی تفتیش کے علاوہ ادیب کا یہ بھی فریضہ بتایا ہے کہ وہ سماجی مسائل میں حق کی حمایت کرے۔ آزاد ترین اور ذمہ دار ترین ادب والے نظریے کے یہی معنی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ تو مان لیا ہے کہ ادیب کو معاشیاتی اور سیاسی مسائل سے دلچسپی ہونی چاہیے، ابھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ ادیب کی روحانی کاوش اور زندگی کے ٹھیٹ اور ابتدائی مطالبات میں بھی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ پروست اور جوئس نے اس ہم آہنگی کی ضرورت کا اعتراف کیا ہے۔ میر نے یہ ہم آہنگی پیدا کر کے دکھائی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں میر کو ان دونوں سے بڑھائے دے رہا ہوں۔ جن روحانی معرکوں سے یہ دونوں گزرے ہیں، اگر میر کو ان سے دو چار ہونا پڑتا تو نہ معلوم کیا صورتِ حال پیدا ہوتی۔ یہ دونوں اگر اثبات کی منزل ہی تک پہنچ گئے تو بڑی بات ہے۔ میں تو صرف ایک امرِ واقع بیان کر رہا ہوں کہ میر کے یہاں یہ ہم آہنگی اور توازن مستقل طور سے موجود ہے۔

چنانچہ میر کے یہاں جدید ترین جدیدیت کے عناصر غالب سے زیادہ ملتے ہیں اور ۱۹۴۹ء کی دنیا کے لیے میر کی شاعری کہیں زیادہ معنی خیز ہے۔ اس لیے نئے غزل گوؤں کی طبیعت کو میر سے ایک فطری علاقہ ہے اور میر کے اثرات روزبروز بڑھتے جا رہے ہیں حالانکہ میر کے متعلق بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ فراق صاحب نے بھی ابھی تک کوئی تفصیلی مضمون میر کے بارے میں نہیں لکھا۔

دراصل میر کے یہاں غزل کے معنی وہ ہیں ہی نہیں جو فارسی میں ہیں۔ اسی لیے جو لوگ فارسی شاعری کے زیادہ گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ میر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ سوائے مرزا یگانہ کے میرے خیال میں تو اب ہمیں اُردو غزل کو محض فارسی غزل کا ضمیمہ سمجھنے کی عادت ترک کر دینی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا تھا، مجھے تو ناصر کاظمی کی زبان سے یہ سوال سن کر بڑا اطمینان ہوا کہ صاحب، تغزل کیا چیز ہوتی ہے؟

جیمز جوئس نے شاعری کی اصناف کے متعلق چند خیالات پیش کیے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر اُردو غزل کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ خیر صاحب، یار زندہ صحبت باقی!

(ستمبر ۱۹۴۹ء)

کچھ صوبہ سرحد کے بارے میں

یہ تو خیر آپ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ مجھے پاکستان کی حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ اس مضمون سے انشاء اللہ آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اب سرحد کی وزارت بھی مجھے نوازنے لگی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے، مگر میری احسان فراموشی دیکھیے کہ میں تین ہفتے سرحد میں رہا اور اس دوران میں قیوم خان کی وزارت سے میری دلچسپی ہر روز کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ میں نے تو لاہور کے اخباروں سے اندازہ لگایا تھا کہ صوبہ سرحد اچھا خاصا مقتل ہو گا، جہاں بازار میں چار سے زیادہ آدمی اکٹھے ہوئے اور پولیس نے گولی چلائی۔ کسی کے منہ سے ایسی ویسی بات نکلی اور پولیس نے آ دبایا، بیوی نے ذرا زور سے کہہ دیا کہ راشن میں چینی کم ملتی ہے تو سی آئی ڈی والے دو وقتہ گھر کا چکر لگانے لگے۔ عوامی لیگ کے کسی لیڈر کے مکان کی طرف سے نکل گئے تو تھانے میں ہسٹری شیٹ کھل گیا۔ غرض میں تو نہ معلوم کیسے کیسے سنسنی خیز تماشے دیکھنے کی اُمیدیں لے کے گیا تھا مگر بڑی بے لطفی رہی۔ گاڑی صوبہ سرحد میں داخل ہوئی تو دو چار نئے مسافر چڑھے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ جب سے دن میں صرف ایک گاڑی چلنے لگی ہے بڑی پریشانی ہو گئی ہے۔ اس پر ایک نوارد خاں صاحب بولے کہ "پاکستان میں ایک ہی گاڑی چلتا ہے تو بھی اچھا ہے۔" اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس ایک گاڑی کو بھی غنیمت سمجھو۔ میں نے دل ہی دل میں اُن کی ہمت کی داد دی کہ قیوم خان سے نہیں ڈرتے، کھلم کھلا پاکستان پہ چوٹ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی افسوس بھی ہوا کہ ابھی پولیس اُنہیں آ کے گرفتار کر لے گی اور بچارے سال چھ مہینے کو بھیج دیے جائیں گے۔ میں انتظار ہی کرتا رہا، نہ پولیس آئی نہ کسی سی آئی ڈی والے نے ٹوکا۔ اس کے بعد میں تین ہفتے یہی دیکھتا رہا کہ شہر میں، دیہات میں، لاریوں میں، ریلوں میں، بازاروں میں، لائبریری میں، نجی صحبتوں میں، سرکاری ملازموں کے سامنے

ہر جگہ اور ہر وقت کوئی پاکستان کی حمایت کر رہا ہے، کوئی خرابیاں گنوا رہا ہے، کوئی قیوم خاں کو گالیاں دے رہا ہے، کوئی عوامی لیگ کو، غرض ہزار منہ ہیں، ہزار باتیں، جس کے جو جی میں آتا ہے بڑی بے تکلفی سے کہتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ اول تو مجھے ویسے بھی سرحد کی سیاست سے کوئی خاص شغف نہیں تھا، البتہ دیکھنے کا ضرور شوق تھا کہ استبدادی حکومت کیسی ہوتی ہے، مگر سرحد کا رنگ دیکھ کر میری رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ ایسی پھس پھسی وزارت مستحق بھی اور کس سلوک کی ہے؟

یہ میں طنزاً نہیں لکھ رہا ہوں، سرحد پہنچ کے وہاں کی سیاست واقعی میرے لیے بالکل غیر دلچسپ بن گئی۔ سیاسی لوگوں سے ملنے کا ارمان تو میرے دل میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا، یہ اور بھی اچھا ہوا کہ مجھے سرحد کے متوسط طبقے سے بھی واسطہ نہیں پڑا۔ تین ہفتے کلھم اجمعین پانچ چھ پڑھے لکھے سرحدیوں سے میں نے بات چیت کی ہوگی۔ شہر بھی میں نے صرف ایک ہی دیکھا، کوہاٹ، پشاور بس یوں ہی منہ چھونے کے لیے ہو آیا۔ پشاور کا صرف اتنا سا تاثر میرے دل پر باقی ہے کہ وہاں کا قصہ خوانی بازار واقعی بازار لگتا ہے۔ انار کلی کی طرح صرف خرید و فروخت کی جگہ نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ پشاور ریڈیو کے لوگ واقعی جاگ رہے تھے جو ریڈیو پاکستان کے لیے بڑی غیر معمولی بات ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شہر دیکھنے کو جی ہی نہ چاہا۔ زیادہ تر میں ضلع کوہاٹ کے دیہات میں پھرتا رہا اور ایک جگہ تو کئی دن رہا بھی۔ کسانوں اور مزدوروں سے باتیں کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان لوگوں کو دراصل صوبے کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور نہ اس سے مطلب ہے کہ کون سی وزارت رہتی ہے، کون سی نہیں رہتی۔ دیہات کے لوگوں نے مجھ سے ہر موضوع کے متعلق بڑی بے تکلفی اور آزادی سے بات چیت کی۔ اگر وہاں اسی ظلم و استبداد کا دور دورہ ہوتا جس کا حال میں لاہور کے اخباروں میں پڑھ کے گیا تھا، تو لوگوں کو ایک اجنبی سے سیاست سے متعلق باتیں کرتے ہوئے جھجکنا چاہیے تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں کون ہوں، کون نہیں۔ سی آئی ڈی کا آدمی ہوں یا کیا ہوں۔ مگر میں نے جس سے بھی بات کی کسی کے چہرے پر خوف یا جھجک کے آثار نہیں دیکھے۔ لوگوں کو موجودہ وزارت سے جو شکایتیں تھیں وہ انہوں نے صاف صاف کہیں۔ زمیندار طبقے میں تو عوامی لیگ کی مقبولیت کے آثار میں نے ضرور پائے مگر کسی کسان یا مزدور سے عوامی لیگ کا نام

بھی نہیں سنا۔ سرحد کے عوام کی (اس لفظ کی ایسی مٹی پلید ہوئی ہے کہ اب تو جب یہ لفظ میرے قلم سے نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کی جیب کاٹ رہا ہوں) اصل سیاسی رائے کے متعلق میں نے جو اندازہ لگایا تھا اس کی تصدیق خود ایک کسان کے منہ سے ہو گئی۔ اس نے ٹھیٹ اُنہی لفظوں میں مجھ سے کہا کہ قیوم کی وزارت رہے یا جائے، ہمیں اس سے کیا۔" ہمیں تو بُس اتنا چاہیے کہ اناج سستا ہو جائے، کپڑا آسانی سے حاصل ہو اور کام ملے — اور ہاں چینی ملے۔ (خدا جانے پٹھانوں کو چینی سے اتنا شغف کیوں ہے۔ وزارت سے لوگوں کو ایک بنیادی شکایت یہ بھی ہے کہ قیوم خاں چینی بہت کم دیتا ہے) ان معاشی مشکلات سے پاکستان دشمن عناصر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور غریب مسلمانوں کو طرح طرح سے بھڑکا رہے ہیں۔ پرانے کانگریسی، غفار خاں کے آدمی، غیر مطمئن مسلم لیگی، دوسرے ملکوں کے ایجنٹ، خال خال کمیونسٹ، یہ سب عناصر بڑی شدت سے سرحد میں کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خاصے دلیر ہیں اور ان کی سرگرمیاں کچھ ایسی ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ میں پورے صوبے پر تو حکم نہیں لگاتا کیونکہ میں نے صرف ایک ہی ضلع دیکھا ہے۔ ممکن ہے بعض ضلعوں میں قیوم خاں نے واقعی ظلم کیا ہو، میں بغیر جانے بوجھے اور بغیر تفتیش کیے وزارت کو کیسے بے گناہ بتا دوں، مگر جس حد تک میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میرا یہی اندازہ ہے کہ وزارت نے پاکستان دشمن عناصر کو کافی ڈھیل دے رکھی ہے اور تو اور خاص، شہر کوہاٹ کے بازار میں آپ یہ منظر عام طور سے دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی صاحب کھڑے لوگوں کو بھڑکا رہے ہیں اور پولیس والے بھی سن رہے ہیں۔ کم سے کم میں نے تو کسی کو سیاسی وجوہات کی بنا پر گرفتار ہوتے دیکھا نہیں۔ یہ درست ہے کہ میں نے سیاسی کارکنوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی لیکن سرحد میں گرفتاریوں کی ایسی ہی ریل پیل ہوتی جیسی اخبار بتاتے ہیں تو ایک نہ ایک واقعہ تو مجھے بھی نظر آتا ہی۔ اپنے قیام کے دوران میں، میں نے دو قبائلی گاوؤں کی بندوقوں سے لڑائی تک تو دیکھ لی، مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ سیاسی استبداد کی کوئی مثال میرے سامنے نہ آئی، ممکن ہے سرحد میں گرفتاریاں اس طرح ہوتی ہوں کہ آدمی کسی تاریک سی گلی میں جا رہا ہے، پیچھے سے کمبل پڑا اور اڑن چھو!

یہ حقیقت ہے کہ سرحد کے معاملے میں ہمارے اخباروں کا رویہ بڑا غیر ذمہ دارانہ رہا ہے۔ جن اخباروں کا مسلک ہی تخریب ہے، اُن کی تو شکایت ہی فضول ہے۔ وہ تو اپنا

فرض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں، مگر دوسرے اخباروں کو نہ جانے کیا ہوا ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ مصدقہ خبریں شائع کرنے کی بجائے سنسنی خیز باتیں زیادہ لکھتے ہیں، اور اس کا ذرا خیال نہیں رکھتے کہ سرحد کے لوگوں پر اس مبالغہ آرائی کا اثر کیا ہوگا۔ یوں تو پنجاب کی سیاست کے بارے میں بھی اخباروں نے قومی مفاد کا خیال نہیں رکھا بلکہ بعض اخباروں نے صوبہ جاتی جھگڑے بھی پھیلانے چاہے، مگر پنجاب کے لوگوں کو اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ اُن پر ایسی باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا، یہاں تک کہ بعض اخباروں کو تو زچ ہو کر یہ لکھنا پڑا کہ ہمارے عوام تو بھیڑیں ہیں۔ مرکزی حکومت نے جدھر ہانک دیا ہنک گئے۔ پنجاب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرنے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابیوں کے لیے تو پاکستان جزو ایمان بن گیا ہے۔ اُنھیں پاکستان بغیر کسی شرط کے قبول ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ پنجاب میں معاشی اصلاحات کی ضرورت نہیں یا لوگ اس کا مطالبہ نہیں کرتے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پنجابیوں کو پاکستان کے تصور سے ایسی گہری عقیدت ہے جو ہر قسم کے جائز ناجائز مفادات سے بالا اور بے نیاز ہے۔ پھر عام پنجابیوں کا سیاسی شعور خاصا بیدار ہو چکا ہے۔ وہ پہچان لیتے ہیں کہ کون سی چیز ملک کے فائدے کی ہے۔ کون سی نقصان کی، اور اُن میں قومی مفاد کو ہر دوسرے مفاد پر ترجیح دینے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ غرض پاکستان میں پنجابیوں کی وہی حیثیت ہے جو تقسیم سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں میں یورپ والوں کی تھی۔ اس لیے قومی معاملات میں پنجابیوں کو بہکانا آسان نہیں رہا۔ مگر سرحد کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اول تو وہاں تعلیم کی بڑی کمی ہے، لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ قومی حکومت کیا ہوتی ہے، اور جمہوریت میں عام آدمی کے حقوق و فرائض کیا ہوتے ہیں۔ وہاں دیہات کے ننانوے فیصد آدمی یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں کسی مسلمان بادشاہ کی شخصی حکومت ہے۔ یہ صرف میرا ہی خیال نہیں بلکہ کئی حضرات نے اپنے آپ یہ بات مجھے بتائی۔ جس کسان کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا کہ صاحب پاکستان کے بادشاہ کراچی میں رہتے ہیں نا؟ جب میں نے اسے جمہوری حکومت کا مطلب سمجھایا تو وہ بڑی حسرت سے کہنے لگا کہ صاحب ہم پٹھان لوگ تو بالکل بے پڑھے لکھے ہیں، ہمیں دنیا کی کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ ہمیں تو جو جس طرح چاہے بہکا لے۔ ظاہر ہے کہ سرحد میں بہکانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ غفار خاں کے بعض آدمی ظاہر میں تو مسلم لیگی بن گئے ہیں مگر درپردہ اُن کی سرگرمیاں جاری

ہیں چنانچہ اسی قسم کے ایک بزرگ کا یہ مقولہ سننے میں آیا کہ ہم تو تربوز ہیں تربوز، اُوپر سے ہرے اندر سے سُرخ۔ غرض مختلف قسم کے فسادی لوگ ہیں جو عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سرحد کے لوگ پاکستان سے عقیدت تو رکھتے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی مادی حالت ایک دم سے بدل جائے۔ اُنہیں اس کا بالکل احساس نہیں کہ ایسی کایا پلٹ تو بس الہ دین کے چراغ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ پٹھانوں کے مزاج میں ایسی جلد بازی ہے کہ وہ چاہتے ہیں ہر بات فوراً ہو جائے اور جب نہیں ہوتی تو پھر وہ شکایت شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ پٹھانوں میں مخالفت برائے مخالفت کا جذبہ بھی خاصا تیز ہے۔ میرے ایک مشفق ماہر نفسیات نے بڑی ٹھیک بات بتائی کہ پٹھانوں میں بچوں سے بڑی بے پروائی برتی جاتی ہے، بچوں کو ماں کی مُحبت پوری نہیں ملتی چنانچہ ان کی شخصیت میں کئی پیچ پیدا ہو جاتے ہیں، مزاج میں ضد اور ہٹ آجاتی ہے، دوسرے لوگ اور خارجی دنیا کی ہر چیز دشمن معلوم ہونے لگتی ہے، کسی کا اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا، توڑ پھوڑ کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہو جاتی ہے۔ یہ تجزیہ واقعی بڑا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پٹھانوں میں ذرا سی بات پر مشتعل ہو جانے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ دشمن اس بات سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں چنانچہ لاہور کے اخباروں میں سرحد کی خبریں جس انداز سے شائع ہوتی ہیں اس سے فتنہ انگیز عناصر کو بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ وزارت کوئی بڑی بات کرے تو خبر دبا دی جائے یا احتجاج نہ کیا جائے، مگر احتجاج کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اخبار تو آگ پر تیل چھڑکتے ہیں۔ ہمارے اخبارات کا تو فرض یہ تھا کہ سرحد کے عوام کی سیاسی تربیت میں حصہ لیتے، انہیں جمہوریت کے معنی سمجھاتے، آزاد ملک کے باشندوں کے حقوق و فرائض بتاتے، مگر سرحد سے اخبارات کی دلچسپی بس ہنگامہ آرائی تک محدود ہے۔ لطف یہ ہے کہ سرحد میں جو تھوڑا بہت تعمیری کام ہو رہا ہے، اس کی خبریں گول کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ میں کسی اخبار میں یہ تبصرہ پڑھ کے گیا تھا کہ مالاکنڈ کی بجلی والی سکیم بس ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں، مگر کوئی سو میل تک تو میں اپنی آنکھوں سے بجلی کے کھمبے اور تار لگتے دیکھ کے آیا ہوں، اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے پہاڑی علاقے میں کام کتنی تیزی سے ہو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دیہاتی لوگوں کو بجلی لگنے سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور وہ بڑی بے چینی سے بجلی آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ میں سنی سنائی نہیں کہتا، آنکھوں دیکھی بات ہے۔ بجلی لگنے

سے سرحد کے لوگوں کی معاشی حالت میں خاصا فرق پڑے گا۔ غریب لوگ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور بجلی کے کھمبوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں نور آتا ہے۔ مگر ہمارے بعض کرم فرماؤں کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر روس میں بجلی لگے تو کمیونزم کی بنیادی شرط پوری ہوتی ہے، اور پاکستان میں لگے تو ڈھونگ — کوہاٹ کے ضلع میں ایک اور اسکیم جاری کی گئی ہے جس کی کامیابی کا انحصار بھی بجلی پر ہے۔ اس ضلع کا زیادہ تر حصہ بنجر ہے۔ میلوں تک کالی کالی پہاڑیاں کھڑی ہیں جن پر سبزے کا نام و نشان تک نہیں۔ اب ایک علاقہ میں یہ تجزیہ کیا جا رہا ہے کہ زمین کو کیمیاوی طریقوں سے قابل کاشت بنایا جائے اور ٹیوب ویلوں کے ذریعہ آب پاشی کی جائے۔ اس قسم کے کھیت بھی میں نے سڑک کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے دیکھے۔ غرض حکومت اپنی بساط پر صوبے کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ کر تو رہی ہے، مگر رفتار ست ہے۔ میرے خیال میں سرحد کے مسائل کا حل بھی یہی ہے کہ جلد از جلد ایسا انتظام ہو جائے کہ ہر آدمی کو تھوڑا بہت کام ملنے لگے، اور تعلیم پھیلے۔

اب سرحد کے دیہاتی لوگوں کی سیاسی دلچسپیوں کا تھوڑا سا حال سنیے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، عام لوگوں کو کسی خاص وزارت یا آدمی سے نہ محبت ہے نہ نفرت۔ اُنہیں تو صرف اپنے معاشی مسائل کا احساس ہے، لیکن چونکہ حالات ہی ایسے ہیں کہ بہترین سے بہترین حکومت بھی ایک دم سے لوگوں کو خوشحال نہیں بنا سکتی، اس لیے جو وزارت بھی ہوگی وہ تھوڑی بہت غیر مقبول ضرور ہو گی۔ اس لیے جو بھی تکلیف ہو لوگ قیوم خاں کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سرحد کے عام لوگوں کو سب سے زیادہ انہماک کشمیر کے مسئلے سے ہے۔ اٹھتے بیٹھتے کشمیر کا نام زبان پر ہے، اس میں شہر اور گاؤں کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ آپ جس سے بھی ملیں، دو چار رسمی باتوں کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ صاحب، کشمیر کا کیا ہو گا؟ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں جتنی بے چینی سرحد میں ہے، اتنی شاید ہی کسی اور صوبے میں ہو، خاص طور سے دیہاتیوں کو پاکستان کی حکومت سے بڑی شکایت ہے کہ کشمیر کے معاملے میں اتنی بے نیازی سے کیوں کام لے رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ کشمیر کے واقعہ نے پٹھانوں کی آنکھیں کھول دیں، اور اُنہیں اتنی شدت سے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہندوستان کے عزائم کیا تھے اور غفار خاں اُنہیں کس کے ہاتھ بیچ رہے تھے۔ جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے، انہیں تو ہندوستان کے متعلق کوئی

غلط فہمی باقی نہیں رہی۔ کشمیر کے علاوہ حیدر آباد سے بھی لوگوں کو خاص دلچسپی ہے، نظام کو بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی سرحدی عوام نہیں بھولے ہیں۔ ان پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کا پٹھانوں کو بڑا رنج ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں یہ بھی خبر پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جائیدادیں چھینی جا رہی ہیں۔ دیہاتی لوگ یہ سوال بڑی بے چینی سے پوچھتے ہیں کہ دلی کی جامع مسجد باقی ہے یا شہید کر دی گئی۔ ایک آدمی نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ آگرہ پاکستان میں آیا ہے یا ہندوستان میں اور جب اُسے معلوم ہوا کہ تاج محل بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو اس نے کئی ٹھنڈی آہیں بھریں۔ جتنا علاقہ میں نے دیکھا ہے، کم سے کم وہاں افغانستان کے پروپیگنڈے کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔ یو پی یا پنجاب کے جو لوگ دیہات میں ملے، میں نے ان سے کھود کھود کر پوچھا، مگر انہوں نے بھی یہی بتایا کہ گاؤں والوں کو تو اس کا پتہ بھی نہیں۔ دیہات میں کئی آدمیوں نے باتوں باتوں میں، اپنے آپ مجھ سے پوچھا کہ صاحب یہ کابل والا کیا کہتا ہے۔ آفریدیوں کے آزاد علاقے میں گیا تھا۔ وہاں ایک آدمی نے سنایا کہ ہمارے ملک لوگوں کو کابل والا بلا رہا ہے، خدا جانے کیا کہے گا۔ سرحد ہی کے ایک صاحب تھے جو وزیرستان سے ہو کر آ رہے تھے۔ انہوں نے قصہ سنایا کہ ایک زمانہ تھا جب کوئی بیمار پڑتا تو فقیر اپی سے غائبانہ مدد مانگی جاتی تھی اور اب یہ حال ہے کہ فصل کے وقت کسان لوگ کہہ رہے تھے کہ جلدی جلدی گیہوں اٹھالو، فقیر کے آدمی خیرات مانگنے آتے ہوں گے۔ اسی طرح ایک صاحب پارا چنار کے ملے، وہ بتا رہے تھے کہ ان کے علاقے میں دو آدمیوں کو کہیں سے رشوت ملی اور انہوں نے پٹھانستان کا جھنڈا لگانے کی کوشش کی تو خود اس گاؤں کے لوگ رائفلیں لے کر جمع ہو گئے اور آخر جھنڈا نہیں لگانے دیا۔

سرحد کے تعلیم یافتہ طبقے سے ملنے کی مَیں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ طبقہ ہر جگہ ایک سا آزاد خیال اور بے روح ہے۔ البتہ یو پی اور پنجاب کے جو لوگ مجھے وہاں ملے، ان سے میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ سرحد میں یہ شور و شر کیوں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے جو لوگ کانگریس کے حامی ہو جاتے تھے، کانگریس انہیں ہر طرح سے نوازتی، کیونکہ اس کا تو مقصد ہی مسلمانوں کو توڑ کے اپنے ساتھ ملانا تھا۔ بعض زمینداروں اور جاگیرداروں کو مسلم لیگ سے بھی یہی توقع تھی، مگر پاکستان کے پاس فالتو روپیہ کہاں؟ ویسے بھی جو حکومت عوام کی مرضی پر قائم ہو، اُسے رشوت بانٹنے کی کیا ضرورت۔ چنانچہ اب یہ

لوگ سخت ناراض ہیں اور فتنہ انگیزی پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس طبقے کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو قیوم خاں سے ہی نہیں، پاکستان سے بھی ناراض تھے۔ پہلے تو انھوں نے اپنی خدمات سنائیں کہ میرے خاندان نے مسلم لیگ کے لیے اتنی قربانیاں کی ہیں اور میں جیل میں رہ کر آیا ہوں۔ اس کے بعد ان کی شکایتوں کا دفتر کھلا کہ ہمیں تو اُمید تھی کہ ہماری خدمات کا خیال رکھا جائے گا، اگر انگریز ایک پیسہ دیتا ہے تو پاکستان سے دو پیسے ملیں گے مگر یہاں الٹے نئے نئے ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ جو آدمی پہلے آٹھ ہزار مالیانہ دیتا تھا۔ اب اُسے اٹھارہ ہزار دینا پڑ رہا ہے، یہ کیسا پاکستان ہے؟ ہندوستان کی پالیسی مسلم کش ہے، اس سے میل ناممکن ہے، انگریز سالا اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ اب واپس نہیں آسکتا، کریں تو کیا کریں؟ تو اب عوامی لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ بالکل انہیں الفاظ میں انھوں نے اپنی بپتا سنائی۔ ایسے زمیندار اور جاگیردار سرحد میں کافی ہیں۔ دیہات کے چھوٹے چھوٹے ملک لوگوں کا تماشا میں نے خوب دیکھا ہے وہ چاہتے یہ ہیں کہ پاکستان عام کسان اور مزدوروں کی معاشی حالت درست کرنے کی کوشش کرے یا نہ کرے، انہیں روپیہ اور اعزاز دے، مگر پاکستان کی مرکزی حکومت کو اس بات کا احساس معلوم ہوتا ہے کہ غریب طبقوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی فکر کی جائے۔ نئی صنعتوں اور نئی تعلیمی اسکیم سے سرحد میں ایک خاموش انقلاب واقع ہوگا، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کی سیاسی تربیت کا انتظام کیا جائے اور اُنہیں جمہوریت کے معنی سمجھائے جائیں تا کہ وہ ملک لوگوں کی خود غرضیوں کا شکار نہ بنے رہیں۔ خود وہ لوگ یہ سب باتیں سمجھنے کے لیے بیقرار ہیں۔ پٹھان ناخواندہ تو ضرور ہیں مگر ان کا دماغ جاہل نہیں (جیسا تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لوگوں کا بعض دفعہ ہوتا ہے) بات بڑی جلدی سمجھتے ہیں، اور جہاں ان کے مزاج میں ضد ہے، وہاں معقولیت پسندی کی بھی کمی نہیں ہے۔

سرحد میں مجھے ایک جاہل ترین آدمی ملا۔ وہ ایک گریجویٹ تھا۔ موجودہ کالجوں کی کچی پکی تعلیم، آزاد خیالی اور ترقی پسندی نے اسے عجیب چیز بنا دیا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی مرکزیت باقی نہیں رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ انسانی زندگی کے لیے کن کن باتوں کی ضرورت ہے اس کے دماغ نے اتنے انمل، بے جوڑ اثرات قبول کیے تھے کہ بالکل باؤلی ہنڈیا بن کر رہ گیا تھا۔ مستقل بے اطمینانی اور ہر چیز سے مخاصمت اس کی

فطرتِ ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب اس قسم کی بے اطمینانی بڑی مقدس چیز بن سکتی تھی کیونکہ اس کا عمل اور چیزوں کے ساتھ ساتھ خود آدمی کی اپنی ذات پر بھی بڑی شدت سے ہوتا تھا۔ اس قسم کی بے اطمینانی کے نمونے دوستوفسکی نے بڑی فراوانی سے پیش کیے ہیں، مگر جب سے یہ عقیدہ رائج ہوا ہے کہ اصل خطا ماحول کی ہے، آدمی اپنی ذات سے معصوم واقع ہوا ہے، اس وقت سے یہ اندازِ نظر خود پسندی کی ایک شاخ بن گیا ہے۔ آدمی ہر چیز سے غیر مطمئن رہتا ہے، سوائے اپنے آپ کے۔ چنانچہ اس نوجوان کی آنکھوں سے ایک مہلک بے گانگی ٹپکتی تھی۔ کسی چیز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اپنایت کی چمک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ہر چیز کی مخالفت کرنا اور ہر چیز سے غیریت محسوس کرنا اس کے نزدیک گویا سب سے بنیادی جمہوری حق تھا۔ اگر اُسے میر کا یہ شعر (وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں) سُنایا جاتا تو اُسے انتہائی مہمل معلوم ہوتا۔ یہ آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا المیہ — اور یہ صاحب عوامی لیگ کے حامی تھے۔

اگر سرحد کے سیاسی شور و شر کو بھول کر غور کریں تو ہر ایماندار آدمی کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ عام پٹھانوں کی زندگی میں پاکستان ایک اخلاقی انقلاب بن کر آیا ہے۔ ایک موٹی سی بات تو یہی ہے کہ قبائلیوں کے حملوں کا خطرہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ لوگوں کی زندگی زیادہ محفوظ اور پُرامن ہے۔ پھر غریب لوگوں کو پاکستان سے یہ توقع پیدا ہو چکی ہے کہ پاکستان ان کے معاشی مسائل حل کر سکتا ہے۔ اگر بعض لوگ کبھی کبھی پاکستان کی شکایت کرتے ہیں تو دراصل اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ انہیں پاکستان سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور پاکستان کو صداقت اور عدل و انصاف کی ایک قوت سمجھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے پٹھانوں کو اپنی خامیوں کا بڑا شدید احساس پیدا ہوا ہے۔ پٹھان خود اپنے آپ کو ہزاروں گالیاں دیتے ہیں اور اپنے کردار کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جذبہ ہر ہر گاؤں، ہر ہر گلی اور ہر ہر طبقے میں پھیل چکا ہے، یہاں تک کہ بچے بھی اس سے متاثر ہیں۔ مَیں نے ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا دیکھا جس کا باپ مدت ہوئی مر چکا ہے، ماں پاگل خانے میں ہے، چھوٹی بہنوں کا گزارہ محلے والوں کی خیرات پر ہے۔ نہ گھر ہے نہ در۔ یہ لڑکا بڑے شوق سے پڑھ رہا ہے اور محنت مزدوری کر کے اسکول کا خرچ نکالتا ہے۔ پٹھانوں میں لڑکیاں بیچنے کا جو رواج ہے، اس کے سخت خلاف ہے۔ سارے محلے والوں سے اس موضوع پر بحث کرتا ہے، اور اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ مَیں اپنی بہنوں کو نہیں بیچوں گا۔ اسی طرح ایک چھ سات سال کی

لڑکی دیکھی جو ایک موچی کی بیٹی ہے۔ باپ نے کسی کے چاقو مار دیا تھا، بہت دن سے جیل میں ہے۔ ایک دن آ کے کسی نے خوش خبری سنائی کہ لے تیرا باپ چھٹ گیا، تو اس نے جواب دیا کہ نیک ہو تو چھٹ جائے نہیں تو جیل میں ہی رہے۔ یہ لڑکی نوکری بھی کرتی ہے اور پڑھنے بھی جاتی ہے۔ ایک دن اس کی دادی نے دھمکی دی کہ تجھے مدرسے سے اٹھا لوں گی تو اس نے کہا تمہیں فکر کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنے آپ پیسہ پیسہ جمع کر کے پڑھ لوں گی۔ یہ ایسے بچوں کی مثالیں ہیں جن کے ذاتی حالات اس سے اور زیادہ کیا خراب ہوسکتے تھے۔ خارجی ماحول کو قادرِ مطلق سمجھنے والے فلسفے کے مطابق تو انہیں اب تک گرہ کٹ بن جانا چاہیے تھا مگر پاکستان نے لوگوں میں جو نئی اخلاقی رَو دوڑا دی ہے، اس کا فیضان ہے کہ ایسے لاوارث بچے بھی ترقی کی طرف مائل ہیں۔

جلدی سے جلدی تعلیم پانے کی جیسی بے چینی سرحد کے عام لوگوں کو ہے، ویسی شاید ہی اور کہیں ملے۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے لوگ اپنی جہالت کا ذکر بڑے رنج اور حسرت کے ساتھ کرتے ہیں اور اسے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ ہماری جاہلیت کی وجہ سے جو چاہے ہمیں جا و بے جا بہکا سکتا ہے۔ اس بات سے لوگ بڑے مطمئن ہیں کہ حکومت ابتدائی تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ کر رہی ہے۔ صوبے کی حکومت نے یہ کام ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اوپر نہیں چھوڑا بلکہ براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ایک گاؤں کے پرائمری اسکول کو میں دو دفعہ دیکھنے گیا۔ لڑکوں کو تو میں نے ذہین اور چاق چوبند پایا ہی، مگر بڑی بات یہ تھی کہ ماسٹر صاحب اپنا کام بڑی تن دہی اور شوق سے کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فرض کو صرف سبق رٹوانے تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ بچوں کو پاکستانی بننا بھی سکھا رہے تھے۔ میں نے ہر جماعت کے بچوں سے اُردو کی کتاب بھی پڑھوا کر سنی۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ بچوں کا اردو تلفظ، شین، قاف، لب و لہجہ اتنا اچھا تھا کہ مجھے اس کی بالکل توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سنا ہے کہ قبائلی علاقے میں تعلیم کا اور بھی زور شور ہے۔ ایک دن آفریدی علاقے میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھری پکی عمارت میں لڑکے پڑھ رہے ہیں اور بڑی چہل پہل ہے چنانچہ ایک دن میں خاص طور سے قبائلی علاقے کا اسکول دیکھنے گیا، مگر اس دن جمعہ تھا اور اسکول میں چھٹی تھی تو اسکول میں نہیں دیکھ سکا۔ مگر ایک بڑی دلچسپ بات سنی جس سے سرحد کے تہذیبی مستقبل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک آفریدی مجھے بتا رہا

تھا کہ یہ اسکول تو اب کھلا ہے، اس کے علاوہ بھی مسجدوں میں ملا پڑھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ملا تو بس قرآن شریف پڑھاتے ہوں گے۔ اس بات کا اس نے ایسا بڑا مانا جیسے میں نے اس کے قبیلے کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہو، اور کچھ شکایت اور کچھ فخر کے ساتھ کہا کہ نہیں صاحب، اُردو بھی پڑھاتے ہیں۔

اب آپ پوچھیں گے کہ سرحد میں اُردو کی کیا حالت ہے۔ یوں تو آج کل چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی آپ کو دو چار اردو بولنے والے ضرور مل جائیں گے، اُردو سمجھنے والے تو بہت، مگر سرحد میں اُردو کا مستقبل تو بہت ہی امید افزا معلوم ہوتا ہے۔ دس سال کے اندر اندر وہی حالت ہو جائے گی جو مشرقی یو۔ پی میں ہے کہ لوگ مقامی زبان اور اُردو دونوں یکساں روانی سے بولتے ہیں۔ پاکستان میں اُردو پھیلنے کے یہی معنی ہیں اس میں نہ کوئی مقامی زبان ہلاک ہوتی ہے نہ کچھ ہوتا ہے۔ اس قسم کے شبہات تو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ ہدایت پھیلائے جا رہے ہیں اور اسی قسم کی تخریب کے لیے ایک صاحب کو "پاکستان کمیونسٹ پارٹی" کا سیکرٹری بنا کے ہندوستان سے بھیجا ہے۔ میں گاؤں گاؤں پھر آیا مگر میں نے ایک دفعہ بھی پشتو ریکارڈ بجتے نہیں سُنا، نہ کسی کو گلی یا بازار میں پشتو گانا گاتے ہوئے سُنا۔ پٹھانوں کو گراموفون کا بڑا شوق ہے۔ گاؤں کی کسی نہ کسی دکان پر گراموفون ضرور ہو گا۔ صبح، دوپہر، شام تینوں وقت بھیڑ لگ جاتی ہے اور لوگ اُردو کے فلمی گانے سنتے ہیں، اور اُنھیں گانوں کو خود گنگنانے کی مشق کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ اُردو سمجھ بھی نہیں سکتے، وہ بھی اُردو گانے خوب گاتے ہیں۔ یہ بات صرف چلتی ہوئی دھنوں کی بدولت نہیں ہے۔ پشاور ریڈیو نے بالکل انہی دھنوں کے ساتھ ان گانوں کو پشتو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر "راشا راشا" کوئی نہیں گاتا۔ سب کی زبان پر "آجا آجا" ہے۔ ریڈیو والوں سے معلوم ہوا کہ اور تو اور افغانستان تک سے صرف اُردو گانوں کی فرمائشیں آتی ہیں۔ پاکستان میں تو خیر یہ کہئے کہ "حکمران طبقہ" تہذیب کے معاملے میں جبر سے کام لے رہا ہے اور جیسا قائدِاعظم کی برسی کے موقع پر ایک "آزاد خیال" اخبار نے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ متوسط طبقے کے مفاد کو محفوظ رکھنے کے لیے جناح نے ایک قوم، ایک زبان کا نعرہ بلند کیا، مگر افغانستان میں کون لوگوں کے سر پر خنجر لیے کھڑا ہے۔ بہرحال سرحد کے ہر گاؤں کی ہر گلی میں پٹھان اپنے تہذیبی حق خودارادیت کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں اور تو اور سکولوں کی لڑکیاں تک۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحد

کے شہروں میں پانچویں چھٹی جماعت کی لڑکیوں تک میں "مثنوی زہر عشق" پہنچ گئی ہے۔ اب تو سمجھئے کہ اُردو نے بازی مار لی۔ یہ مثنوی یو۔ پی کی عورتوں میں سب سے زیادہ مقبول تھی۔ عورتیں جمع ہو ہو کر پڑھتی تھیں اور سبک سبک کے روتی تھیں۔ اس رقت کا انحصار کہانی پر نہیں ہے بلکہ زبان و بیان پر ہے۔ اگر سرحد کے پڑھے لکھے گھرانوں میں یہ نظم پہنچ چکی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اُردو نے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور لوگ صرف نفس مضمون ہی سے نہیں خالص بیان کی خوبیوں اور زبان کی لطافتوں سے بھی لطف اندوز ہونے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ سرحد میں مشاعرے کی "وبا" خاصی پھیل چکی ہے اور لوگوں میں اُردو شعر کہنے کا بڑا شوق پیدا ہو گیا ہے کہ سرحد کے شاعروں کو اس بات کی بڑی تمنا ہے کہ ہم یوپی والوں کے مقابلے کی اُردو لکھ لیں۔ چنانچہ سرحد والوں کا میلان "ٹھیٹ زبان" سیکھنے کی طرف بہت ہے۔ تلفظ سرحد والوں کا پہلے ہی سے کافی شستہ ہے۔

یہ لب و لہجہ کا مسئلہ بھی پورے پاکستان کے لیے بڑا دلچسپ سوال ہے۔ چونکہ بعض لوگوں کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ ایسے ایسے قضئے کھڑے کیے جائیں جن کا وجود ہی نہ ہو، اس لیے دو چار لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ لب و لہجہ کوئی چیز نہیں ہے، ہمارا جیسا جی چاہے گا بولیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یو۔ پی میں ایک لب و لہجہ رائج نہیں تھا، ہر ضلع کا الگ تھا۔ البتہ دہلی یا لکھنؤ کا لب و لہجہ معیاری ضرور مانا جاتا تھا۔ ہر زبان کے لیے معیاری قواعد کی طرح معیاری لہجہ بھی لازمی ہے، مگر نہ تو اسے جبراً رائج کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے، بلکہ لہجوں کے اختلاف سے زندگی میں رچاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سرحد کے جو لوگ ہندکو زبان بولتے ہیں ان کا لب و لہجہ ایسا شیریں اور معصومانہ ہے کہ میں تو نہیں چاہتا یہ لب و لہجہ کبھی ضائع ہو۔ اُردو زبان اختیار کرنے کے بعد بھی یہ لوگ اپنا لہجہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ نہ تو معیاری لب و لہجہ ان لوگوں کی اس آزادی میں حائل ہوتا ہے اور نہ ان کی آزادی سے معیاری لہجہ کا کوئی نقصان ہے۔ جب تک لوگ معیار کو معیاری چیز سمجھتے ہیں، انہیں انحراف کرنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح ایک سوال یہ ہے کہ صوبہ سرحد کی زندگی کا اظہار اردو میں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک نئی اُردو بنانی پڑے گی۔ قصہ یہ ہے کہ جو لوگ یو۔ پی سے واقف نہیں ہیں، انہوں نے یو۔ پی کے تکلفات کے قصے سن کر اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ یو۔ پی والوں میں نسائیت ہے لہٰذا اُردو زبان میں بھی ہے۔ اُردو زبان اور ادب کی نسائیت کا افسانہ

اگر میر اور آتش کی شاعری اور میر امن کی نثر کے باوجود قابلِ یقین ہے تو پھر یہ مرض لاعلاج ہے۔ خیر اس وقت میں یو۔ پی کے متعلق دو چار باتیں عرض کرتا ہوں۔ یو۔ پی کے اور مسلمان باشندوں کو چھوڑیے، وہاں ایسے پٹھانوں کی بیسیوں بستیاں ہیں جو سرحد سے جا کے اُدھر بس گئے تھے۔ قائم گنج، ملیح آباد، شاہجہاں پور، رام پور بریلی۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں پٹھانوں کے کچھ نہ کچھ گاؤں ضرور ہوتے ہیں۔ یو۔ پی کے جس پٹھان سے پوچھیے وہ اپنے آپ کو یوسف زئی سے تو کم بتائے گا ہی نہیں۔ پھر چونکہ یہ لوگ اپنے اندر ہی شادی بیاہ کرتے رہے۔ اس لیے ان کی نسل بھی خاصی محفوظ رہی ہے۔ یو۔ پی کے پٹھانوں کا چہرہ مہرہ، بیٹھنے، اٹھنے کا انداز، آنکھیں، بہت سی عادتیں، مزاج بالکل وہی ہے جو سرحد کے پٹھانوں کا۔ سخت گیری میں بھی یہ لوگ سرحدیوں سے کچھ ایسے بہت کم نہیں ہیں اور ساتھ ساتھ مہذب بھی بلا کے ہیں۔ ملیح آباد میں یہ عام بات ہے کہ دن کو خاں صاحب ڈنڈا چلاتے ہوں گے اور رات کو مشاعرے میں غزل پڑھتے ہوں گے، اور ان کی حرکات و سکنات سے آپ پہچان نہیں سکیں گے کہ یہ وہی صاحب ہیں۔ سرحد کے لوگوں میں بھی مردانگی اور نسائیت کا یہی امتزاج ملتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ کندھے پر رائفل ہو گی اور کان میں پھول۔ دراصل سرحد کے لوگ مجھے بڑے مانوس معلوم ہوئے جیسے میں برسوں ان کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ بات یہی ہے کہ یو۔ پی کے پٹھانوں کا اور ان لوگوں کا بڑا قریبی رشتہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان اور ادب کی تخلیق میں پٹھانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اور پٹھان اس زبان میں اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ اس لیے یہ اُمید بے جا نہیں ہے کہ جب پٹھان اپنے گھر بیٹھ کے اپنے کوہستانوں کی زندگی کو اُردو میں منتقل کریں گے تو ان کی تخلیقی کوششوں کا درجہ اس پہلے والی تخلیق سے کم نہیں ہو گا۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ یو۔ پی کے پٹھان علاقوں میں اُردو جس طرح بولی جاتی تھی، اس طرح اور علاقوں میں نہیں بولی جاتی تھی۔ پٹھانوں کی اُردو کے تیور ہی اور تھے۔ ان کی زبان ان کے مزاج کا مظہر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب میں اس اُردو کی تصویر موجود نہیں، مگر پہلے ادب میں مرکزی روایت اور طرز احساس اس طرح حاوی تھا کہ ادب کی تخلیق کرتے ہوئے ہر علاقے کا آدمی اسی سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ اب اس زمانہ میں ہر علاقہ کے لوگوں کو اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی پیدا ہوئی تو عظیم بیگ اور عصمت چغتائی کے یہاں آگرے اور علی گڑھ کی اُردو بولی، اختر اورینوی کے بعض افسانوں میں پٹنہ کی اُردو بولی، انتظار حسین

کی افسانہ نما چیزوں میں میرٹھ اور بلند شہر کی اُردو بولی۔ ہو سکتا ہے کل روہیل کھنڈ سے بھی کوئی ایسا لکھنے والا پیدا ہو جائے۔ غرض یہ ہے کہ اُردو کی ایک ایسی قسم بھی موجود ہے جو پٹھانوں کے مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کا ہر علاقہ اُردو میں نئے الفاظ اور نئے عناصر کا اضافہ کرے گا، مگر ہر علاقہ کے لیے ایک نئی اُردو گھڑنے کا خیال بالکل مہمل ہے جسے دنیا کی لسانی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، اور دراصل تخریبی کوششوں کے سلسلہ میں ایجاد کیا گیا ہے۔ بڑی زبان میں بہت سے مزاجوں کے اظہار کی گنجائش ہوتی ہے اور اُردو ادب نہ سہی تو اُردو زبان اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے علاقہ کا صحیح اظہار چاہتا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ دل میں مرکزی روایت کا بھی احترام ہو اور اپنے علاقے کی زندگی کا بھی اور دونوں چیزوں سے تخلیقی دلچسپی ہو۔ آئرلینڈ کے لکھنے والوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انگریزی زبان کی مرکزی روایت کے اتنے پابند نہ تو ویلز والے ہیں نہ اسکاٹ لینڈ والے مگر آئرلینڈ کا جیسا مکمل اظہار انگریزی زبان میں سولفٹ، برنرڈ شا اور جوئس نے کیا ہے، ویسا یہ دوسرے لوگ اپنے علاقوں کا نہیں کر سکے۔

اگر مَیں یہ کہوں کہ سرحد کے متعلق بڑے اچھے افسانے لکھے جاسکتے ہیں تو یہ ایسی ہی فضول بات ہو گی جیسے یہ کہنا کہ پانی پیا جاسکتا ہے، مگر سرحد کے عام لوگوں کو اپنی زندگی سے اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے کہ اب اُردو میں سرحدی ادب پیدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ سرحد کے بنجر پہاڑوں سے بھی نئے نئے احساسات اور کیفیتیں پیدا ہوں گی اور آزاد پاکستان میں سرحد سے جو ادب تخلیق ہو کر ہمارے سامنے آئے گا اس میں ہمیں ایک نیا احساس ملے گا اور تو اور سرحد کے پہاڑ دیکھ کر افسانوں اور نظموں کی نئی نئی اوضاع اور ہیئتیں سمجھ میں آتی ہیں مثلاً — مگر میں اپنے "کاروباری راز" کیوں بتاؤں کم سے کم میں تو سرحد کے لوگوں سے ایسا متاثر ہوا ہوں کہ اگر تین مہینے بھی سرحد میں رہ جاؤں تو سرحد کے متعلق افسانے لکھنے لگوں۔

اس طرح سرحد میں مصوری کے لیے بڑا اچھا میدان ہے۔ ایک تو وہاں کی پہاڑیاں دن میں اتنے رنگ بدلتی ہیں کہ تاثراتی مصوروں کے لیے وہاں بڑا نادر موقع ہے، اس کے علاوہ سیزان کے انداز کی یا مکعبی طرز کی تصویروں کے لیے سرحد کے خشک پہاڑوں اور پہاڑی گاوؤں کی اوضاع میں بڑا سامان موجود ہے۔ خاص طور سے دیہاتی مکانوں کی ڈبے نما شکل اور سپاٹ چھت دیکھ کے فوراً سیزان کی بعض تصویریں یاد آتی ہیں۔

ہاں صاحب، قبائلی علاقہ بھی دیکھا۔ قبائیلوں کا جو تصور سرحد سے باہر لوگوں کے ذہن میں ہے، وہ محض فسانہ طرازی ہے۔ کم سے کم آفریدی لوگ تو ایسے ہی ہیں جیسے سرحد کے اور لوگ، اسی طرح کھیتی باڑی کرتے ہیں، ویسے ہی گاؤں ہیں، ویسے ہی لوگ ہیں۔ قبائلی علاقوں میں آپ کو خوشبو دار صابن بھی مل جائے گا اور انگریزی تیل بھی البتہ ہر پانچ منٹ بعد آپ ایک فائر کی آواز ضرور سُن لیں گے۔ ان لوگوں کو خالی وقت گزارنے کا آسان ترین نسخہ یہی معلوم ہے۔ رائفل کی گولیاں شیشے کے مرتبانوں میں اس طرح بکتی ہیں جیسے ہماری طرف بچوں کی مٹھائی۔ سوئی دھاگہ اور رائفل آپ ایک دکان سے خرید سکتے ہیں۔ رائفل بنانے کا کارخانہ بھی دیکھا۔ انتہائی معمولی قسم کی مشینوں سے ایسی عمدہ رائفل بناتے ہیں کہ ولایتی معلوم ہوتی ہے۔ کارگیروں میں صرف قبائلی لوگ ہی نہیں، پنجاب اور یو۔ پی تک کے آدمی ہیں۔ کارخانے کے مہتمم نے بڑی صاف اُردو میں مجھ سے باتیں کیں۔ قبائلی لوگوں کو پاکستان بننے کا احساس باقی سرحدیوں سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے اور بات بات میں ان کے منہ سے "ہمارا پاکستان" نکلتا ہے۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ پٹھانوں میں تو خیر اُردو کا چرچا ہے ہی مگر جو یو پی والے سرحد پہنچ گئے ہیں، انہیں بھی پشتو سیکھنے کا خاصا شوق معلوم ہوتا ہے۔ دیہات میں تو خیر مَیں نے یو۔ پی والوں کو خاصی تیز پشتو بولتے سنا ہے بلکہ بعض عورتیں بھی پشتو سیکھ گئی ہیں۔ مگر کوہاٹ شہر میں جہاں پشتو جاننے کی کوئی خاص ضرورت پیش نہیں آتی، مَیں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا جو پانچ منٹ تو اُردو بولتے تھے اور پانچ منٹ پشتو۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ دونوں کے دونوں اجمیر کے ہیں۔

آخر میں ایک علاج مَیں ان لوگوں کا بھی تجویز کروں گا جو سرحد کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو آدمی سرحد سے "ہمدردی" کرتا ہے۔ اسے پکڑ کے تین مہینے کے لیے سرحد کے کسی گاؤں میں بھیج دیا جائے کہ وہاں بچوں کو پڑھائے۔ سرحد کے لیے اس وقت سب سے زیادہ ضرورت معاشی نظام میں اصلاح اور تعلیم کی ہے۔ تعلیم کا انتظام خالی حکومت کے بس کا نہیں، کچھ نہ کچھ رضاکارانہ طور پر کام ضرور ہونا چاہیے۔ پروفیسروں، استادوں اور طالب علموں کو چھٹیوں میں کافی فرصت ملتی ہے۔ اگر ہر آدمی دو دو مہینے کے لیے بھی جائے تو خاصا کام ہو سکتا ہے اور ادیب لوگ کس مرض کی دوا ہیں، یہ کون سے بیٹھے پان چیرتے ہیں۔ زبان سے ترقی پسندی بگھارنے کے بجائے اگر یہ لوگ

عوام کی ترقی میں بھی عملی حصہ لیں تو کیا ہرج ہے۔ مگر ہمارے ملک میں تو زبان کے مرد لاکھوں ہیں، کام کرنے والے نہیں نکلتے حالانکہ اس وقت ملک کی تعمیر کے لیے رضاکارانہ کام کی اشد ضرورت ہے۔ خاص طور سے سرحد کے لوگوں کو تو تعلیم اور سیاسی تربیت جلد از جلد ملنی چاہیے۔ سرحد کے سیاسی مسائل کا سب سے بڑا حل تعلیم ہی ہے۔

(اکتوبر ۱۹۴۹ء)

ا۔ تلفظ کا مسئلہ

ب۔ آزادیِ اظہار

ان سے مجھے نیاز تو حاصل نہ ہو سکا، مگر سنا ہے کہ میرٹھ میں ایک صاحب تھے جن کی محبوب ترین کتاب غیاث اللغات تھی۔ خاص طور سے وہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی معمولی سے لفظ کا عجیب و غریب تلفظ یا ایسے معنے ہاتھ آجائیں جو اردو تو اردو، عربی، فارسی میں بھی شاذ ہی استعمال ہوئے ہوں۔ فرض کیجئے کہ انہیں پتہ چلا کہ قمیض کے ایک معنی پجامہ بھی ہوتے ہیں۔ بس جناب، شام ہوتے ہی گھنٹہ گھر پہنچے اور شکار کی تلاش میں ٹہلنے لگے۔ جہاں کوئی جان پہچان کا آدمی نظر پڑا، فوراً اسے پکڑ کر چائے پلائی، تھوڑی دیر سیر کرائی اور آخر موقع پاتے ہی سوال داغ دیا کہ صاحب، بتائیے قمیص کے معنی کیا ہیں، ظاہر ہے کہ معقول آدمی تو وہی ایک معنی بتا سکتا ہے۔ اب یہ ہیں کہ اس سے الجھ رہے ہیں، شرطیں بدی جارہی ہیں، غرض اپنے ساتھ اچھے بھلے آدمی کو بھی تھوڑی دیر کے لیے خبطی بنا دیا۔

خدا معلوم یہ صاحب وہیں ہیں یا پاکستان آ گئے ہیں۔ پہلے تو لوگ انہیں خواہ مخواہ لولو بنایا کرتے تھے، مگر ان کی قدر کا زمانہ تو اب آیا ہے۔ ریڈیو پاکستان والوں کو پتہ لکھ بھیجیں تو گھر بیٹھے روٹیوں کا بندوبست نہ سہی تو پان کا خرچ تو نکل ہی آئے گا۔ پرانے لوگوں کو فخر تھا کہ ہم نے سالہا سال کی محنت سے اردو زبان کو مانجھ کے نکھارا ہے۔ لفظوں کو ہموار، سبک اور رواں بنایا ہے، سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی سے لیے ہوئے لفظوں میں ایک نئی شیرینی اور آہنگ پیدا کیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے منتظمین نے سوچا یار، اردو کی تو بہت خدمت تو آخر ہم بھی کر رہے ہیں، دن بھر فلمی گانے اور غزلیں گاتے بجاتے

ہیں، ہمارا بھی کوئی نہ کوئی نقش اردو پر قائم رہنا چاہیے۔ سنوارنے کا سلیقہ خدا نے نہیں دیا تو بگاڑنا تو اپنے بس کی بات ہے۔ چنانچہ ایک "اصلی" تلفظ کا پروگرام شروع ہوا ہے، اور خبروں وغیرہ میں بھی اسی تلفظ کی پابندی کی جاتی ہے، نہ صرف یہ بلکہ جو لوگ تقریریں کرنے آتے ہیں، ان سے بھی "شدھ" تلفظ کا مطالبہ ہوتا ہے، اور بعض دفعہ بڑے توہین آمیز انداز میں۔ ایک دن میں جو تقریر کر کے اٹھا تو ایک ریڈیو کے افسر صاحب فرمانے لگے کہ صاحب، آپ نے تلفظ کی گیارہ غلطیاں کی ہیں۔ میں نے کہا حضرت، خیریت تو ہے، کیسی غلطیاں؟ انہوں نے دو ایک مثالیں دے کے بتایا کہ فلاں لفظ کا تلفظ فارسی میں یوں ہے، میں نے عرض کیا جناب، نہ تو میں فارسی بول رہا تھا نہ عربی، سیدھی سادی اردو بول رہا تھا۔ جب فارسی بولوں گا تو وہی کہوں گا جو آپ فرما رہے ہیں، مگر اردو بولوں گا تو اردو کی طرح۔ اس موضوع پر ان سے بڑی دیر تک جھک جھک رہی، مگر ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آیا کہ اردو الگ زبان ہے کیونکہ محکمے کی ہدایت ہی ایسی تھیں۔ آخر مجھے یہی کہنا پڑا کہ جہنم میں جائے آپ کا محکمہ اور اس کی ہدایات، میں آپ کے پیچھے اپنی زبان کیوں خراب کروں، چنانچہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مجھ سے شدھی کے لیے کہا گیا تو میں ریڈیو پاکستان سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔

دیکھیے، خدا لگتی کہیے گا۔ کل تک ہمیں ہندوؤں سے شکایت تھی کہ یہ لوگ سیدھے سادے اور آسان لفظ چھوڑ کر سنسکرت کے مغلق لفظ اور جناتی تلفظ رائج کرنا چاہتے ہیں اور "سورج کی کرن" کو "سوریہ کی کرنٹر" بنانے پر مصر ہیں۔ آج بھی ہمارے اخبار مذاق اڑاتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں شہروں کے اچھے خاصے نام بگاڑ کے دو ہزار سال پرانے نام رکھے جا رہے ہیں "اجودھیا"، "ایودھیا" ہو گیا ہے اور "جمنا"، "یمونا" لیکن کیا خود ہمارا ریڈیو پاکستان اسی قسم کی حرکت نہیں کر رہا ہے؟ اول تو زبان ادق بولی جاتی ہے کہ عام سننے والوں کو جگہ جگہ جھٹکے لگتے ہیں، پھر تلفظ تو وہ رائج کیا جا رہا ہے کہ باید و شاید عربی فارسی میں چاہے جو کچھ ہو، مگر اردو میں تو یہ تلفظ اتنا بے ڈول معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ریڈیو والے تلفظ کی مثالیں تک یاد نہیں آ رہی ہیں۔ اگر عربی فارسی کے احترام کی وجہ سے یا دوسرے اسلامی ممالک کے قریب آنے کی غرض سے اردو میں یہ تحریف کی جا رہی ہے تو یہ کھڑاگ ہی ختم کیجیے اردو کی بجائے سیدھی طرح عربی کو قومی زبان بنائیے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

یہ سمجھنے کے لیے تو ذرا سی خوش مذاقی کی ضرورت ہے کہ ہر زبان کا ایک خاص آہنگ ہوتا ہے، اور اگر لفظوں کی ہیئت بدل دی جائے تو نثر کی چال اُوبڑ کھابڑ ہو جاتی ہے اور نیا آہنگ پیدا ہوتے ہوتے بہت عرصہ لگتا ہے، مگر یہ بات تو معمولی پڑھے لکھوں سے بھی معلوم کی جا سکتی تھی کہ اگر اس طرح لفظوں کا تلفظ بدل گیا تو بیسیوں شعر وزن سے خارج ہو جائیں گے۔ دنیا کی ہر زبان نے دوسری زبانوں سے لفظ مستعار لیے ہیں، مگر کہیں بھی اصلی تلفظ برقرار رکھا ہے؟ ہر جگہ اپنے مزاج اور لب و لہجہ کے مطابق تبدیلیاں کی جاتی ہیں، البتہ اگر ریڈیو پاکستان والے کوئی نئی بدیا پڑھ کے آئے ہیں تو ہمیں بھی بتائیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ یونانی یا لاطینی کا ایک ہی لفظ فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، انگریزی سب میں رائج ہے، اور تلفظ ہر زبان میں الگ ہے۔ ریڈیو پاکستان کوئی علمی ادارہ نہیں ہے نہ کوئی ادبی انجمن ہے۔ اسے قومی زبان کے بارے میں اتنے فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ حالانکہ انگریزی زبان کی مستند لغت موجود ہے، اور بی۔بی۔سی میں دو چار پڑھے لکھے آدمی بھی موجود ہیں، مگر تلفظ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے ادیبوں اور عالموں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ ہمارے ریڈیو نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے کے ناطق فیصلہ بھی صادر کر ڈالا۔ اصل خطا ریڈیو والوں کی بھی نہیں ہے۔ ہماری حکومت کی ہے جو ریڈیو کے لیے کوئی معین لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکتی، بس یوں ہی کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ عام طور سے تو میں حکومت کی قصیدہ خوانی ہی کرتا رہتا ہوں، مگر مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری حکومت خاص "کلچر بلائنڈ" واقع ہوئی ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہم لوگ تو کہا کرتے تھے کہ ہمیں سب سے زیادہ فکر اپنے کلچر کو بچانے کی ہے، اور ہندو کہتے تھے کہ اصل مسئلہ تو معاشی ہے، مگر اب یہ حال ہے کہ ہندوستان والے تو اپنے معاشی حالات کا ذکر کرتے جھینپتے ہیں، بس کلچر ہی کلچر لیے پھرتے ہیں، اور ہم نے کلچر وغیرہ سب تہ کر کے رکھ دیا، جوٹ اور روئی پر فخر کرتے ہیں۔ زبان، ادب، کلچر، ان سب کو تو حکومت پیٹ بھرے کی باتیں سمجھتی ہے، چنانچہ انجمن ترقی اردو کو بیس ہزار روپیہ سالانہ کی مدد دی گئی۔ عذر یہ ہے کہ دفاع کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ حکومت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی کہ پاکستان میں اُردو کی ترویج اور استحکام دفاع کے برابر ہی ضروری ہیں۔ اگر تخریبی عناصر کی مسلسل کوششوں کا اثر ہونا شروع ہو گیا اور ہر چھوٹے چھوٹے علاقے کے باشندے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے لگے تو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کچھ

نہیں کہا جاسکتا اور حکومت کی بے توجہی کا یہ حال ہے کہ روپیہ خرچ کرنا تو الگ رہا۔ زبان ہلاتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے وزیر دنیا جہان کی باتوں پر بیان دیتے رہتے ہیں چھٹے چھ ماہے کچھ لسانی اور تہذیبی مسائل کے متعلق بھی دو چار لفظ کہہ دیا کرتے تو ایسی زبان گھس نہ جاتی۔ اس گومگو پالیسی کا نتیجہ ہے کہ ریڈیو پاکستان کوئی خاص ذمہ داری محسوس نہیں کرتا، جو چاہتا ہے اپنے آپ کر لیتا ہے، نہ کسی سے مشورہ لیتا ہے نہ کچھ۔ تلفظ کا معاملہ تو اتنا اہم تھا کہ اس کے لیے باقاعدہ کمیٹی مقرر کی جاتی جو پورے غور و خوض کے بعد کوئی فیصلہ کرتی۔ اب اس جلد بازی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ریڈیو جو تلفظ رائج کرنا چاہتا ہے، وہ عام لوگوں میں تو قیامت تک رائج نہیں ہو گا، البتہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ہر وقت یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ ہم غلط بول رہے ہیں۔ چنانچہ ہم دو چار آدمیوں نے تو ریڈیو کے تلفظ کا راز یہی سمجھا ہے کہ جو تلفظ سب سے غلط معلوم ہوتا ہو وہی کہو، انشاء اللہ سو فیصدی درست نکلے گا۔ یہ اصلاحی کوشش کتنی مہمل ہے، اس کا ایک نمونہ ہم اخبار "امروز" کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں۔ پہلے اس اخبار کا نام "امروز" رکھا گیا تھا مگر عام لوگوں نے ہمیشہ "امروز" ہی کہا، یہاں تک کہ میاں بشیر احمد صاحب نے اخبار والوں کو سمجھایا کہ تمہارا اخبار اردو میں ہے، نام بھی اردو میں ہونا چاہیے، فارسی میں نہیں، چنانچہ تلفظ بدلا گیا۔

اگر ریڈیو پاکستان کو تلفظ کا ایسا ہی خیال ہے تو اس کے لیے باقاعدہ مشاورتی کمیٹی بنائی جائے جس میں ریڈیو کا کوئی آدمی نہ ہو، بلکہ علم اور ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات ہوں، چونکہ ایک آدھ حضرات ایسے بھی نکل آئیں گے جنہیں شکایت ہوگی کہ یو۔ پی کا تلفظ ہمارے سر منڈھا جا رہا ہے، اس لیے میرے خیال میں یو۔ پی کا کوئی آدمی اس کمیٹی میں نہ رکھا جائے یا زیادہ سے زیادہ مولانا عبدالحق۔ باقی سب آدمی پنجاب کے ہوں، مگر صرف ایسے حضرات جن کے دل میں اردو کا درد ہو جو اردو زبان اور ادب کی روایت سے واقف ہوں اور جنہوں نے اردو کی ترویج اور ترقی میں حصہ لیا، مثلاً سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، میاں بشیر احمد، حامد علی خاں صاحب، چراغ حسن حسرت صاحب، صلاح الدین احمد صاحب، افسانہ نگاروں کی نمائندگی منٹو صاحب کریں۔ ہو سکے تو غلام عباس صاحب کی رائے بھی منگالی جائے۔ پھر ملک کی واحد ادبی انجمن حلقہ اربابِ ذوق کا بھی ایک آدھ نمائندہ ہو۔ ان سب کے مشورے سے تلفظ کی پالیسی کا تعین ہونا چاہیے۔

رائٹنگ" میں شائع ہوتے رہے ہیں، یہ رپورتاژ ان سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ ہاشمی صاحب نے اسے رپورتاژ کہہ کر خاکساری برتی ہے، ورنہ اچھا خاصا افسانہ ہے۔

انسانی زندگی اور انسان کے متعلق ادیبوں کا رویہ جس طرح بدل رہا ہے، رومانی خوش فہمیاں دور ہو کر جس طرح ایک متوازن اور حقیقت آگیں تصور ادب میں جگہ پا رہا ہے، اس کا اندازہ سلیم احمد صاحب کے مضمون "زندگی ادب میں" سے ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اب ادیب نظریات سے آزاد ہو کر زندگی کو براہ راست محسوس کرنے اور سمجھنے کی طرف مائل ہیں۔

مجموعی حیثیت سے "نیا دور" کے اس پرچہ میں ایک ایسی ادبی متانت اور ذہنی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا گیا ہے جو پاکستان بننے کے بعد ہمارے ادب سے غائب ہو چلی تھی۔ اس پرچے کو دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے، اور امید ہوتی ہے کہ پاکستان میں جاندار ادب پیدا ہونے کے امکانات بڑھ گئے ہیں اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

اس آزادی نمبر میں خاص مسئلہ آزادیِ رائے کا پیش کیا گیا ہے۔ ممتاز شیریں صاحبہ اور اختر حسین رائے پوری صاحب نے اس موضوع پر دو بڑے خیال افروز مضمون لکھے ہیں۔ اختر صاحب نے ادیبوں سے اپیل کی ہے کہ ہر قسم کے احتساب کی مخالفت اور آزادیِ خیال کی حمایت کریں۔ لاہور کے ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقے اس اپیل کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ دراصل ضرورت بھی اسی بات کی تھی کہ جن حضرات نے ترقی پسند تحریک شروع کی ہے، وہ صاف صاف الفاظ میں اپنے رویے کا اظہار کریں اور گومگو میں نہ پڑے رہیں۔ اختر صاحب نے آخر جرات کی اور واضح طریقے سے مکمل آزادیِ رائے کی اہمیت کا اعلان کر دیا۔ اس سے بڑے مفید نتیجے برآمد ہوں گے، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی اس مسئلے پر واضح طور پر سوچ سکیں گے۔

اتفاق کی بات ہے کہ بعض ایسے حضرات جو خود ادبی احتساب کے سختی سے قائل ہیں، آج کل حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ پبلک سیفٹی ایکٹ منسوخ کر دیا جائے، مگر صحیح قسم کی شخصی آزادی کے قیام کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے آدمی کو خود اپنے اندر جھانک کے دیکھنا چاہئے کہ میں بھی دوسروں کی آزادی کا احترام کر سکتا ہوں یا صرف اپنے لیے یہ حق مانگتا ہوں۔ سوال صرف آزادی طلب کرنے کا نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ آزادیِ رائے محض سیاسی مصلحت کے تحت طلب کی جا رہی ہے، یا ہم آزادیِ خیال کو

یہ بڑی نقصان دہ بات ہے کہ ریڈیو نے اس مسئلے کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ اگر ہندو لوگ ادبی احساس اور خوش ذوقی سے بے نیاز ہو کر سنسکرت تلفظ رائج کرنا چاہیں تو یہ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی اندھا دھند ان کی پیروی میں اپنی زبان کے بنے بنائے آہنگ کو بگاڑ دیں۔ ہم ہمیشہ ان سے کہتے آئے ہیں کہ زبان کے بارے میں ہمارا رویہ زیادہ جمہوری ہے، مگر ریڈیو پاکستان بے سوچے سمجھے جو حرکتیں کر رہا ہے، اُس کے بعد ہمارا کیا منہ رہ جاتا ہے۔

اسی طرح خبروں کی زبان پر بھی نظرثانی ہونی چاہیے۔ اگر ہم اپنے عوام کی ذہنی اور سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو زبان ایسی ہونی چاہیے جسے وہ آسانی سے سمجھ سکیں۔ ضرورت بے ضرورت عربی فارسی کے موٹے موٹے لفظ لڑھکانے سے ریڈیو پاکستان صرف اپنی ذہنی تسکین کا سامان کر سکتا ہے، عام لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے چراغ حسن حسرت صاحب نے اردو کے ہلکے پھلکے اور جامع لفظوں کی ایک فہرست تیار کی تھی، آخر اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا جاتا۔

"نیا دور" کا آزادی نمبر حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس پر مجھے مفصل تبصرہ منظور نہیں، مجھے تو کچھ اس مسئلے کے بارے میں کہنا ہے جو اس پرچے میں پیش کیا گیا ہے، مگر ضمناً اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ادبی روایت کی تجدید اور پاکستانی ادب کی خواہش اب حقیقت بنتی جا رہی ہے۔ ہمارے ادبی شعور کا رخ بدل رہا ہے اور پاکستانی ادب بحث مباحثے کی حد سے آگے بڑھ کے تخلیق کی سرزمین میں داخل ہو چکا ہے۔ محمود ہاشمی صاحب کا طویل رپورتاژ "نفرت کے درمیان" اسی حقیقت کا مظہر ہے۔ اس میں قوم اور قوم کے مفاد سے بیگانگی کا وہ پہلو موجود نہیں جو نئے ادب میں عام ہے مگر ساتھ ہی فنی توازن اور معروضیت بھی قومی جذبے پر قربان نہیں ہوئی۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہو، وہاں ایک مسلمان کے جذبات کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے، مگر ہاشمی صاحب نفرت کی رَو میں نہیں بہے، انہوں نے اپنے فنی ہوش و حواس قائم رکھے ہیں اور ذاتی جذبات سے بچ کر حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک نیک دل اور نیک نیت ہندو کے ذہنی مسئلے اور جذباتی کشمکش کو بھی بڑی ہمدردی اور ایمانداری سے پیش کر دیا ہے اردو کے ادیبوں کو مغربی ادیبوں کے برابر بتانا میری عادت نہیں، مگر سچ یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں جس قوم کے رپورتاژ "نیو

انسانی زندگی کی ایک اہم قدر بھی سمجھتے ہیں۔ اگر حکومت پبلک سیفٹی ایکٹ منسوخ کر دے مگر اس کے بجائے کمیونسٹ پارٹی یا جماعت اسلامی (سنا ہے کہ آج کل ان دونوں پارٹیوں کا قارورہ مل گیا ہے) اپنے اپنے ذرائع استعمال کر کے آزادیِ رائے ختم کر دیں تو کیا فرق پڑتا ہے، بات وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ شاید حکومت بھی تشدد برت رہی ہو، مگر ان دونوں جماتوں میں سے کسی ایک کے برسر اقتدار آجانے کے بعد جس قسم کا ہسٹیریا اُبلے گا اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہی چیز جس پر آج لعنت ملامت ہو رہی ہے، ان لوگوں کے عہد میں حکومت کا مقدس فریضہ بن جائے گی۔ ان جماعتوں کا ذکر کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ آزادیِ رائے کی حمایت کرتے ہوئے ہمیں جماعتی نعروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمیں کچھ ایسا بندوبست کرنا ہے کہ آزادی رائے کا حق صرف وقتی اور ہنگامی مطالبہ نہیں بلکہ مہذب زندگی کی لازمی شرط سمجھا جائے، اور یہ حقیقت ہمارے عوام کے دل میں جاگزیں ہو جائے کیونکہ مادی فائدوں کا لالچ دے کر ہماری آزادی رائے چھیننے والے بہت ہیں، ہمیں صرف آج آزادیِ رائے نہیں چاہیے، بلکہ کل بھی اور پرسوں بھی ہمیں اس حق کو پاکستان میں ایسی ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس حق کو صرف حکومت کی دست اندازی سے ہی محفوظ نہیں رکھنا ہے بلکہ شیریں صاحبہ سے بھی اور اختر صاحب سے بھی، مجھ سے بھی اور آپ سے بھی!

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آزادیِ رائے کو خیر مطلق سمجھتا ہوں یا دیوتا بنا کر پوجتا ہوں۔ یہ تو وہ لوگ بھی نہیں کرتے جن کا خوشہ چیں مجھے بنایا جاتا ہے۔ روس کے رسالوں میں بندروں، بھیڑیوں وغیرہ کی جو فہرست ہر دفعہ شائع کی جاتی ہے، اس میں ممعون دیودار کا نام بھی شامل ہے، استعداد کے سلسلے میں ایک طرح روس کی حمایت کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ امریکہ میں حبشیوں پر ظلم اور روس میں حکومت کے مخالفوں کی گرفتاری بالکل مختلف نوعیت کی چیزیں ہیں۔ پہلی چیز مطلق طور پر بری ہے اور دوسری مشروط طور پر کیونکہ جب روس کی حکومت اپنے مخالفین پر ظلم کرتی ہے تو غلط یا صحیح، اپنے خیال میں وہ ایک نیک مقصد کے ماتحت ایسا کرتی ہے۔ بعض صورتوں میں اس قسم کا استبداد زندگی کی لازمی شرط بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ تلقین کرتا پھرے کہ پاکستان کی بنیاد غلط ہے یا اسے ختم ہو جانا چاہیے یا کشمیر کی جنگ عوامی نہیں ہے یا جہاد نہیں ہے تو اس کی گرفتاری پاکستان کی بقا کے لیے لازمی ہے۔ یہ آزادیِ رائے کا سوال نہیں ہے مگر اس قسم کی سخت گیری کا

جواز صرف وہیں ہو سکتا ہے جہاں قوم کی فنا اور بقا کا معاملہ آ پڑے۔ باقی باتوں میں شخصی آزادی کا غصب ہونا روا نہیں رکھا جاسکتا۔ مگر کمیونسٹ لوگ اور ان کی ذہنیت رکھنے والی جماعتیں اس اصول کو زندگی کی ذرا ذرا سی باتوں میں بھی استعمال کرتی ہیں اور بلند بانگ مگر موہوم مقاصد کے پیش نظر بُری سے بُری بات اپنے لیے حلال کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ اس منطق کی بڑی ٹھوس مثال بھی محترمہ نے پیش کی ہے۔ ایک امریکن ناول میں مزدوروں کی اسٹرائک کا قصہ ہے۔ چند مزدوروں کو پھانسی کی سزا ملتی ہے۔ اب کمیونسٹ پارٹی کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو عدالت سے رحم کی درخواست کی جائے، اس صورت میں ان کی جان بچنے کی پوری امید ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ بین الاقوامی عدالت میں اپیل کی جائے اور دنیا بھر میں بیانات شائع کیے جائیں۔ اس طرح مزدوروں کی جان بچنے کی کوئی امید نہیں، مگر کمیونسٹ پارٹی کا خوب پروپیگنڈہ ہوگا۔ اب کیا کیا جائے؟

ہم آپ تو کہیں گے مزدوروں کی جان بچانی چاہیے، خالی پروپیگنڈے سے کیا فائدہ؟ مگر کمیونسٹ پارٹی کہے گی کہ دو تین آدمیوں کی جان جاتی ہے تو جائے، پروپیگنڈہ ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح انقلاب کا دن نزدیک آتا ہے، یعنی ایک دور دراز اور مبہم مستقبل کے سامنے چند آدمیوں کی زندگی ان لوگوں کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اسی غیر انسانی منطق کے تحت کمیونسٹوں کے یہاں ادیبوں پر احتساب عائد کیا جاتا ہے اور ان پر شدید ترین پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اسی منطق سے آپ بدترین خود غرضی اور کج فہمی کو انسانیت پرستی ثابت کر سکتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ، فریب، قتل، زنا، جھوٹ جس چیز سے چاہیں انقلاب نکال سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو انسانیت کا قائم مقام بنا لیجیے، ہر حرام چیز آپ کے لیے حلال ہو جائے گی۔ یہ صرف میری خیال آرائی نہیں ہے۔ حال ہی میں ایک اردو نظم دیکھنے میں آئی جس میں ایک چھیل چھبیلی، البیلی پنواڑن کو ہدایت کی گئی ہے کہ تیرے یہاں جو لوگ آتے ہیں، انہیں آوارہ مت سمجھ، یہ لوگ انقلاب کے سپاہی ہیں، ذرا ان کا دل بہلا، جب سرخ سویرا ہوگا تو یہ تجھے کندھوں پر چڑھائے پھریں گے۔ یہی اصول زندگی کے اور شعبوں پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ پنواڑن کو لھے مٹکا کر انقلاب کی خدمت کر رہی ہے تو کوئی صاحب جیبیں کاٹ کے پارٹی کے لیے روپیہ جمع کر رہے ہیں۔ ایک صاحب آزادیِ رائے پر پابندی عائد کر کے معترضین کا منہ بند کرنے کی فکر میں ہیں۔ ذرائع کچھ بھی ہوں، اصلی چیز تو مقصد ہے۔

ہمیں جس چیز کے خلاف لڑائی لڑنی ہے، وہ یہی ذہنیت ہے خواہ یہ ذہنیت پاکستان کی حکومت میں ظاہر ہو، یا کمیونسٹ پارٹی میں، یا جماعت اسلامی میں پبلک سیفٹی ایکٹ تو اس کے مقابلے میں بڑی ذرا سی چیز ہے۔ یہ سوال چند بنیادی اقدار کے قیام کا ہے جن کا کسی مصلحت سے سمجھوتا نہیں ہو سکتا، اور جو سوائے انتہائی مجبوری کے ہر حال میں قائم رہنی چاہئیں۔ "نیا دور" کا یہ پرچہ اسی جدوجہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پاکستان کے دو ذمہ دار ادیبوں نے آزادیِ رائے کی ضرورت کا اظہار اتنی تفصیل سے اور اتنے بے لاگ طریقے سے کیا ہے۔ امید ہے کہ اور ادیب بھی اختر حسین صاحب کی طرح اپنے خیالات کا اظہار صاف الفاظ میں کریں گے کیونکہ اس آزادی کے بغیر ہمارے ادب کا کوئی مستقبل نہیں رہ جاتا ہے۔ جہاں تک "نیا دور" والوں کا تعلق ہے، مَیں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے آزادی رائے کو آج ہی سے نہیں، ہمیشہ سے عزیز رکھا ہے اور اس معاملے میں نظریات تو الگ رہے ذاتی تعلقات تک کا لحاظ نہیں رکھا۔ اس رسالے میں ہر مکتبہ خیال کو جگہ ملتی رہی ہے، بشرطیکہ وہ سنجیدہ ہو۔ ان لوگوں کو پچھلے تین سال سے دھمکیاں دی جا رہی ہیں، مگر انھوں نے بڑی پامردی اور ثابت قدمی سے کام لیا ہے، اور اپنے رسالے کو کسی طرح کی ادبی آمریت کا شکار نہیں ہونے دیا، چاہے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑا ہو۔ یہ رسالہ صرف دوسروں کو نصیحت نہیں کرتا بلکہ پہلے خود عمل کر کے دکھا چکا ہے۔

(نومبر ۱۹۴۹ء)

آزادیٔ رائے

جب سے پاکستان کی حکومت نے سیفٹی آرڈی نینس جاری کیا ہے۔ آزادی فکر اور شخصی آزادی کا بڑا چرچا ہے۔ بیانات دیے جا رہے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں، تجویزیں پاس کی جا رہی ہیں، شہری آزادی کے تحفظ کے لیے انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ شخصی اور جماعتی رقابتیں اس مسئلے پر آ کے ختم ہو گئی ہیں۔ غرض وہ ہنگامہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس وقت ملک کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں آزادی فکر کا اتنا ہی احترام پیدا ہو چکا ہے تو بڑی مبارک فال ہے اگر کمیونسٹ پارٹی اور آمرانہ ذہنیت کی دوسری جماعتیں بھی آزادی فکر پر ایمان لے آئیں تو یہ ایک عہد آفریں واقعہ ہو گا۔

دراصل آزادی فکر صرف یہیں معرض خطر میں نہیں، بلکہ دنیا کے ہر ملک کی حکومت اس کی جان کی لاگو ہو رہی ہے۔ اب یہی دیکھیے نا روز خبریں آ رہی ہیں کہ چیکوسلواکیہ، ہنگری، پولینڈ، رومانیہ وغیرہ میں درجنوں آدمی گرفتار کیے جا رہے ہیں، نہ مقدمہ چلتا ہے نہ عدالت میں پیشی ہوتی ہے، بعض دفعہ تو جرم تک نہیں بتایا جاتا، بس پکڑ کر بند کر دیا جاتا ہے۔ ایسے مخدوش حالات میں یہ بات بڑی امید افزا ہے کہ ہمارے ملک میں بالکل متضاد اور متخالف رجحانات رکھنے والی جماعتیں بھی شہری آزادی کے تحفظ کے لیے متحدہ محاذ بنا رہی ہیں۔ ہمیں تو فخر ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک کے سیاسی لوگوں میں آزادی رائے کی حمایت کا ایسا شدید جذبہ اتنی جلدی پیدا ہو گیا۔

مگر ایک بات ذرا کھٹکتی ہے۔ وہ "آزاد خیال" اخبار (اور افراد) جو آزادیٔ فکر کے جہاد میں اتنے سرگرم ہیں، اور پاکستان کی حکومت سے بجا طور پر بدظن ہیں۔ مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں کے بارے میں احتجاج کا ایک لفظ تک نہیں کہتے۔ شاید وہ دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا چاہتے ہوں، لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہی اخبار

امریکہ، انگلستان اور اسلامی ممالک کے اندرونی معاملات جو سخت سے سخت الفاظ میں نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں، اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر اشتراکی ممالک میں استبدادی کارروائی ہو تو ان حضرات کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شاید ان کے لیے اشتراکی حکومتوں کا یہ عذر قابل قبول ہے کہ ہم ملک کے استحکام اور بھلائی کے لیے اور سرمایہ داروں کے جاسوسوں کو سزا دینے کے لیے استبداد سے کام لے رہے ہیں، کیونکہ ہمارے دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، مگر اتفاق سے پاکستان کی حکومت بھی یہی جواز پیش کرتی ہے، البتہ یہ عذر ان حضرات کو قبول نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک موجودہ حکومت عوام کی نمائندہ نہیں۔ پاکستان اور اشتراکی ممالک کے بارے میں ان حضرات کے متضاد رویے پر غور کرنے سے کچھ اس قسم کا اصول مرتب ہوتا ہے کہ شہری اور شخصی آزدی کوئی ایسی مقدس چیز نہیں کہ ہر حالت میں اس کا احترام کیا جائے، البتہ اسے ختم کر دینے کا حق صرف عوام کی نمائندہ حکومت کو حاصل ہے۔ یعنی ان لوگوں کو جو چیز اصل میں ناپسند ہے، وہ سیفٹی آرڈی نینس نہیں بلکہ پاکستان کی موجودہ حکومت ہے۔ خیر مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں۔ جمہوری ملک میں یہ ہر آدمی کا بنیادی حق ہے، اگر اسے کوئی حکومت ناپسند ہے تو دوسرے شہریوں کو اپنے ساتھ ملائے اور حکومت کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اگر کمیونسٹ پارٹی یا دوسری چھوٹی موٹی جماعتیں اس حکومت کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لینا چاہتی ہیں تو یہ بالکل فطری خواہش ہے، اور جمہوری قانون اس کی اجازت دیتا ہے، مگر یہ خلط مبحث کیوں؟ اگر آپ کو حکومت کی مخالفت کے لیے متحدہ محاذ بنانا ہے تو بسم اللہ ضرور بنائے، مگر یہ آزادی فکر اور جمہوری حقوق کو کیوں گڈا بنائے پھرتے ہیں؟ مسلم لیگ کو تو طعنے دیے جا رہے ہیں کہ ایک دن مسلم لیگ شہری آزادی کے لیے انگریز سے لڑتی تھی، اور آج اُسی کو ختم کر رہے ہیں لیکن کیا کمیونسٹ پارٹی یا دوسری جماعتیں ایمان داری سے اعلان کر سکتی ہیں کہ ان کے دورِ حکومت میں شہری آزادی کو ہر حالت میں برقرار رکھا جائے گا؟ دشمنوں اور جاسوسوں کی موجودگی تو بڑی بات ہے، کمیونسٹوں کو تو یہ تک گوارا نہیں کہ ایک شاعر یا ادیب سیاست سے کنارہ کش ہو کر وضعی حسن کی جستجو کرے، بلکہ یہ چیز تو ان کے یہاں گناہ کبیرہ سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ حکومت شاید اپنے مخالفوں کو برداشت نہ کر سکتی ہو لیکن ادب اور کلچر کے بارے میں اس کا رویہ فی الجملہ بے پروائی کا ہے۔ اُسے ادب کی ترقی سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن اگر کسی کے پاس

فالتو وقت ہو اور وہ پتنگ بازی، مرغ بازی کے بجائے ان باتوں میں پڑنا چاہتا ہو تو حکومت روکتی بھی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔

مرا بخیر تو امید نیست، بد مرساں

لیکن ذرا بھی کمیونسٹوں کو برسر اقتدار آنے دیجیے، پھر دیکھیے کتنے ادیب زندہ جلائے جاتے ہیں۔ پھر یہ شہری آزادی کے مطالبات وغیرہ سب رفو چکر ہو جائیں گے، کیونکہ عوام کی "نمائندہ حکومت" کے لیے ہر بُری بات روا ہے۔ "عوام" کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہیں نا؟ اُن سے اوپر تو کوئی اصول ہو ہی نہیں سکتا اور یادش بخیر، جماعت اسلامی کا دور دورہ ہوا تو زندہ تو زندہ مرے ہوؤں کی بھی کم بختی آئے گی۔ الف لیلہ، طلسم ہوشربا، کلیات میر، دیوانِ غالب ان سب نحش اور فضول کتابوں کو آگ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ہماری موجودہ حکومت تو بیچاری بڑی مسکین واقع ہوئی ہے۔ جو چیز اس کے شعور میں نہیں سما سکتی، اس کی وہ فکر ہی نہیں کرتی، لیکن آمرانہ ذہنیت کی جماعتوں کو تو گرم ہی یہ خواہش رکھتی ہے کہ جو چیز ہمارے شعور کے قبضے میں نہ آسکے، اسے زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ (کمیونسٹوں کا مطالعہ نفسیات کی رو سے تو ہو چکا ہے، لیکن فلسفہ زیست کی رُو سے بھی ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کی شخصیتیں اس خواہش کا شاہکار ہوتی ہیں کہ ہمارے شعور میں کم سے کم چیزوں اور ہیتوں کا بار پڑے۔ جس چیز کو شعور ختم نہیں کر سکتا اُسے یہ لوگ ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن جس چیز کو مٹانے کا خیال دل میں پیدا ہو گیا اس نے شعور میں جگہ پائی۔ اب اُسے جسمانی طور پر مٹا کے اپنے شعور سے خارج نہیں کیا جا سکتا) غرض ان جماعتوں کے دورِ حکومت میں شہری، شخصی اور فکری آزادی کی یہ کچھ گت بنے گی، مگر فی الحال یہ سب پیرانِ پارسا آزادی کے مجاہد بنے ہوئے ہیں، اور ہم سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ چوں بخلوت می روند والے معاملات کا خیال تک دل میں نہ آنے دیں، سر منبر جو کچھ ارشاد ہوتا ہے اُس پر ایمان لاتے چلے جائیں۔

جہاں تک شہری آزادی اور اظہار کی آزادی کا تعلق ہے، میں اسے مقدس ماننے کے باوجود اتنا مقدس نہیں سمجھتا کہ جس وقت قوم کی موت اور زندگی کا سوال ہو، اس وقت بھی چند ضروری پابندیوں کو گوارا نہ کروں۔ کسی اخبار میں کوئی ایسا مضمون شائع ہو گیا تھا جس میں پاکستان کے قیام اور کشمیر کے جہاد کے متعلق چند نازیبا باتیں کہی گئی تھیں۔ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے چراغ حسن حسرت صاحب اپنے اخبار "امروز" میں لکھتے ہیں

"ہم پریس کی آزادی کے پرُزور حامی ہیں، لیکن پریس کی آزادی کی حمایت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس قسم کی ناپاک تحریروں کو گوارا کر لیا جائے۔ اگر کوئی اخبار ہندوستان یا ہندوستان کے مرغ دست آموز یعنی شیخ عبداللہ کے نقطۂ نگاہ کی حمایت میں اس قسم کے مضامین چھاپتا ہے اور پاکستان کے وجود کو سرے سے ناجائز قرار دیتا ہے تو اس کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔" میں حسرت صاحب کی رائے سے حرف بہ حرف متفق ہوں، بلکہ یہی بات میں نے پچھلے مہینے خود بھی کہی تھی۔ حکومت اگر کسی کو یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے تھا یا پاکستان کو ختم ہو جانا چاہیے یا کشمیر کی لڑائی جہاد نہیں ہے تو وہ اپنے فرائض سے غفلت برتتی ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو شہری آزادی کے تحت نہیں آتیں، کیونکہ اگر ایسی باتیں باقاعدگی سے جاری رہیں تو سارے شہریوں کی زندگی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج سے پچاس سال بعد جب پاکستان پوری طرح مستحکم ہو جائے تو ہم ایسی باتیں سننا بھی گوارا کر لیں، لیکن ایسے حالات میں کہ جب پاکستان کے خلاف اقتصادی جنگ زور شور سے جاری ہے اور باقاعدہ جنگ کا امکان بھی موجود ہے، ہمیں شہری آزادی میں تھوڑی بہت ترمیم طوعاً و کرہاً قبول کرنی ہی پڑے گی۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت کو پابندیاں عائد کرنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں، کیونکہ یہ اصول مجھے بھی تسلیم ہے کہ صرف نمائندہ حکومت ہی پابندیاں عائد کر سکتی ہے لیکن اس سوال میں سے دوسرا پیچیدہ سوال یہ نکلتا ہے کہ نمائندہ حکومت کیا ہوتی ہے، اور نمائندہ حکومت کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مابعدالطبیعیات کا ہے، یہ میں نے طنزاً نہیں کہا بلکہ حقیقت ہے۔ نمائندگی کی آپ جو بھی تعریف مقرر کریں، عملاً یہی ہو گا کہ ایک حکومت کو ایک گروہ تو نمائندہ بتاتا ہے اور دوسرا گروہ غیر نمائندہ۔ اس مقام پر پہنچ کر یہ بحث چھڑ جانی لازمی ہے کہ حقیقت کیا چیز ہوتی ہے اور شبہ حقیقت کیا۔ اس سے بہتر یہ ہو گا کہ جس حکومت کو عوام کی اکثریت منتخب کرے، وہ نمائندہ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ عوام کا سیاسی شعور بیدار ہوتا تو وہ کس قسم کی حکومت منتخب کرتے۔ بہر صورت ہماری مرکزی حکومت کے ارکان عام مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہو کر دستور ساز مجلس میں آئے تھے، اور اگر آج بھی انتخاب ہوں کہ کم سے کم مرکزی حکومت کے وزیروں کا دوبارہ منتخب ہونا یقینی ہے۔ یہ بات حکومت کے سیاسی مخالفین مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ نمائندہ حکومت کی دوسری پہچان یہ ہے کہ عام لوگ خوشی سے اس کے

ساتھ تعاون کرتے ہوں۔ اس بات میں بھی کمیونسٹوں وغیرہ کا تجربہ مجھ سے زیادہ شدید ہے۔ یہ لوگ ابھی تک کوئی بڑی اسٹرائک کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ خواہ عوام اپنی سادہ لوحی یا حماقت یا جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے ہوں، بہرحال انھوں نے بھی ابھی تک حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار نہیں کیا۔ موجودہ حکومت میں بہت سی خرابیاں ہیں، مگر اس کے باوجود عام لوگ اس حکومت کو کام کرنے کا وقت اور موقع دینا چاہتے ہیں۔ جبھی تو کمیونسٹ اور دوسرے لوگ زچ ہو کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے عوام تو بھیڑوں کی طرح ہیں، حکومت نے جدھر ہانک دیا اُدھر ہنک گئے۔ لیکن جب عوام اس حکومت کو اپنا سمجھ کر اس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں تو ہم اسے نمائندہ حکومت کیسے نہ سمجھیں؟ شکایت تو ہمیں دراصل عوام کی کرنی چاہیے جو ایسی خراب حکومت کو بھی اپنا سمجھ لیتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ فرد کی طرح قوم کی شخصیت کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو تو وہ ہے جو سیاسی اور معاشی انصاف چاہتا ہے چونکہ ہماری حکومت کو معاشی عدل کے قیام کی اتنی تشویش نہیں جتنی ایک اسلامی ریاست کی حکومت کو اشتراکیت کے زمانے میں ہونی چاہیے تھی، اور وہ غیر منصفانہ معاشی اداروں کو ختم کرنے کے معاملے میں انتہائی غفلت سے کام لے رہی ہے، اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکومت ہماری قومی شخصیت کے اس پہلو کی نمائندگی بالکل نہیں کرتی یا بہت تھوڑی نمائندگی کرتی ہے۔ ہماری قومی شخصیت کا دوسرا پہلو وہ ہے جس نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ پاکستان کی بنیادی اقدار پر حکومت ایمان تو رکھتی ہے مگر عملاً ان کی ترویج کے لیے پورے جوش سے کام نہیں کرتی مثلاً اردو ہی کے معاملے میں حکومت افیمیوں کی طرح اونگھتے ہوئے کہتی ہے کہ ہاں صاحب، اطمینان رکھیے انشاء اللہ بیس سال کے عرصے میں ہم اُردو کو اس قابل بنا لیں گے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اسے رواج دیا جا سکے۔ چنانچہ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکومت اس پہلو کی نمائندگی تو کرتی ہے، مگر فرائض بجا لانے میں کوتاہی کر رہی ہے۔ تیسرا پہلو وہ ہے جو پاکستان کا دفاع اور استحکام چاہتا ہے۔ اس کے لیے حکومت بہت کچھ کر رہی ہے۔ نتائج ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ ہمارے سکے کی قیمت نہیں گھٹی، اناج اور دوسری ضروری چیزیں پہلے سے سستی ہیں۔ دشمن کے سب وار خالی جا رہے ہیں اور اسے ہمارے اوپر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی، دنیا پر ہماری اہمیت واضح ہوتی جا رہی ہے — یہاں تک کہ مکرمی جناب اسٹالن صاحب پر بھی جنھوں نے پاکستان کے قیام کے

وقت مبارک باد دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی۔ یہ چیزیں پاکستان کے ہر باشندے کے تجربے میں آ رہی ہیں، اور یہی بات حکومت پر اعتماد پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ حکومت کم سے کم اس پہلو کی نمائندگی تو ضرور کرتی ہے، اور اسے ایک حد تک نمائندہ حکومت کہا جاسکتا ہے۔ (دل لگی کی بات یہ ہے کہ کمیونسٹ برابر وہی رٹے جا رہے ہیں کہ پاکستان کے لوگوں کی معاشی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ پاکستان کی دوسری سالگرہ کے دن پاکستانی ایسے خوش تھے کہ اتنے تو عید کے دن بھی نہیں تھے، مگر کمیونسٹوں نے اپنی نظموں اور مضمونوں میں لکھا کہ لوگ رو رہے تھے۔ سمجھدار پروپیگنڈا کرنے والوں کو اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف وہی جھوٹ کامیاب ہو سکتا ہے جس کا لوگوں کے ٹھوس تجربے سے تھوڑا بہت تو علاقہ ہو)

قومی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ذکر سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ یہ پہلو ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہیں، مگر مسائل کو سمجھنے کے لیے ان کا الگ الگ بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ جنگ کے وقت یا کسی نازک مرحلے پر ان پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا عملی طور پر لازمی ہو جاتا ہے۔ کشمکش حیات اس چیز کو ناگزیر بنا دیتی ہے یعنی بالکل وہی بات ہے جس طرح جنگ کے دوران میں انگلستان کے سب لوگوں نے چرچل کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔

اگر یہ حکومت جو کسی نہ کسی حد تک نمائندہ حکومت ضرور ہے، موجودہ حالات میں خصوصی اختیارات حاصل کرنا چاہتی ہے تو جو لوگ اسے نمائندہ سمجھتے ہیں، وہ اس قسم کے مطالبے کو یک قلم رد نہیں کر سکتے بلکہ انہیں اس بات پر سنجیدگی سے اور ہمدردی کے ساتھ غور کرنا پڑے گا۔ جو لوگ اس حکومت کو سرے سے نمائندہ مانتے ہی نہیں، ان کے لیے تو خیر فیصلہ آسان ہے ہی چونکہ نہ تو مجھے کبھی اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑا ہونا ہے اور نہ ایک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت یا غیر مقبولیت میرے لیے کوئی معنی رکھتی ہے، اس لیے میں بے تامل کہہ سکتا ہوں کہ سیفٹی آرڈی نینس نافذ کر کے حکومت نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو روس کے سلسلے میں جائز نہ سمجھی گئی ہو۔

لیکن اگر میں سیفٹی آرڈی نینس کو جائز سمجھوں تب بھی یہ تشویش باقی رہتی ہے کہ جو لوگ مرکزی حکومت کی طرف سے ان خصوصی اختیارات کا نفاذ کریں گے، وہ انہیں کس طرح کام میں لائیں گے۔ بذاتِ خود یہ آرڈی نینس ایسی خطرناک چیز نہیں ہے،

لیکن اس حکم سے جو فضا اور ذہنیت پیدا ہو گی، وہ بڑی مہلک شکل اختیار کر سکتی ہے۔ یعنی جس طرح روس میں ہوا ہے کہ ملک کے استحکام کے لیے حکومت نے خصوصی اختیارات سے کام لینا شروع کیا، اور یہ بات اس کے لیے ایک حد تک جائز بھی تھی، لیکن تھوڑے ہی دن میں یہ تمیز بالکل اٹھ گئی کہ کون سی چیز ملک کے لیے کس حد تک نقصان رساں ہے۔ اشتراکی رہنماؤں پر بم پھینکنا اور اپنی نظم میں وضعی حسن کا خیال رکھنا ایک ہی نوعیت کے جرم بن گئے۔ حکومت نے یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ کس فعل کا عمل کس دائرے میں، کس طرح اور کس رفتار سے ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال پاکستان میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا اندیشہ اس وجہ سے اور بھی ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں مختلف انسانی سرگرمیوں کا تعین درجہ بدرجہ نہیں ہوا ہے۔ کم سے کم جو لوگ ملک کے نظم و نسق سے متعلق ہیں، انہیں ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ زندگی میں کس چیز کا کیا مقام ہے۔ پھر اوپر سے ایسے افراد اور جماعتیں بھی موجود ہیں جن کا دائرۂ اثر محدود سہی، مگر جو ادب اور فن کو فسق و فجور سمجھتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امکان بھی موجود ہے کہ اگر حکومت خصوصی اختیارات کو ضروری سمجھتی ہے تو معمولی سے معمولی سرکاری ملازم بھی انتہائی دیانت داری اور خلوص کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگے کہ ملک کے استحکام کے لیے مجھے بھی تھوڑے بہت خصوصی اختیارات سے ضرور کام لینا چاہیے۔ یہ چیز شاید ہمارے دفاع کے لیے تو مفید ثابت ہو، مگر اس سے ہماری قوم کی ہر جہتی ترقی کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی مجھے کسی فرد کی شکایت منظور نہیں، صرف ایک رجحان کی مثال کے طور پر یہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میں ریڈیو سے ایک ناول پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اس کی اجازت نہ ملی، اور نہ وجہ بتائی گئی، گویا یہ بات بھی رموز مملکت میں شامل تھی۔ میں چھ سال سے ریڈیو پر تبصرہ کر رہا ہوں، مگر ایسا واقعہ آج تک پیش نہیں آیا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ریڈیو خاص حدود کے اندر کام کرتا ہے، اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی کتاب میں ایسے سیاسی خیالات ہوں جن سے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہو یا کوئی انتہائی فحش کتاب ہو تو پابندی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس ناول میں سیاست یا عریانی کا شائبہ تک نہیں تھا بلکہ آدھی کتاب بچے کی بیماری اور موت کے بارے میں تھی۔ شاید اس کتاب پر پابندی لگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مصنف کو ریڈیو کے کنٹرولر صاحب نے کسی بنا پر معطل کر دیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریڈیو

مجھے کسی حیثیت سے تقریر کرنے کے لیے بلاتا ہے۔ کیا ریڈیو ادب کے نام سے کچھ خانہ پُری کرنے کے لیے مجھے بھی اپنا یونہی للو جگدھر سمجھ کے بلالیتا ہے؟ یا ریڈیو ادب کو اہم چیز سمجھ کر مجھے ایک ذمہ دار نقاد کی حیثیت سے بلاتا ہے؟ اگر خانہ پری ہی مقصد ہے، تب تو ٹھیک ہے۔ اگر میری خود داری کو ٹھیس نہ لگے گی تو میں پچیس روپلی کے لیے تقریر کرنے حاضر ہو جایا کروں گا لیکن اگر ریڈیو مجھے ذمہ دار نقاد سمجھتا ہے تو میری پسند پر یہ پابندی کیسی؟ کیا اس ناول پر تبصرہ ہوتا تو ملک کا دفاع خطرے میں پڑ جاتا؟ اس طرح تو کل آپ میر کے اشعار پر بھی پابندی لگا سکتے ہیں اور بڑی ٹھوس منطق کی بنا پر میر شاہ اودھ تک خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اگر ان کا کلام ریڈیو پر پڑھا گیا تو لوگوں کا ذہن اس خصوصیت کی طرف منتقل ہوگا اور ان کے دل میں تحریک پیدا ہوگی کہ سرکاری افسروں کا کہنا نہ مانیں۔ اس طرح دفاعی انتظامات میں خلل پڑے گا۔ چنانچہ میر کا کلام ملک کے لیے خطرناک ہے۔ اس کے بعد پھر یہ ہوگا کہ جو آدمی کنٹرولر صاحب کو سلام نہ کرے، اس کی کتاب پر تبصرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں بھی وہی خطرہ ہے۔ یہ منطق مضحکہ خیز تو ہے، مگر ہمارے زمانے میں کئی ملکوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسی ذہنیت پیدا ہونے کا خطرہ اور بھی زیادہ ہے کیونکہ ہمارے ملک کی اکثریت ابھی تک آزادی فکر کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ سیفٹی آرڈی نینس کو میں ایک حد تک جائز سمجھتا ہوں، مگر اس سے جو ذہنیت ہمارے زمانے کی مخصوص فضا میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ بڑی ہولناک اور غیر انسانی ہے۔

ہمارے دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کوئی چیز مقدس نہیں ہے، کوئی چیز مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ کسی چیز کو کسی اور چیز پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ مختلف گروہ مختلف اوقات میں مختلف ضرورتوں کے ماتحت جس چیز کو جو مقام چاہیں دے سکتے ہیں۔ یہ عمل جس ہمہ گیر پیمانے پر جاری ہے اس کے سامنے آزادی فکر تو الگ رہی، انسانی زندگی کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ آزادی فکر کے موجودہ مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک بہت وسیع پس منظر کو سمجھنا پڑے گا۔ آندرے مالرو کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ موجودہ زمانے کے ناولوں میں افعال کی بذات خود کوئی قدر و قیمت نہیں رہی، اور نہ ان سے کردار کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی ابتدائی سی مثال ہمیں اردو کے معمولی افسانوں میں بھی مل سکتی ہے۔ اگر کوئی آدمی چوری کر رہا ہے تو نئے افسانے میں اسے لازمی طور پر بے ایمان نہیں

سمجھا جائے گا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ وہ چوری کیوں کر رہا ہے، اور شاید آخر میں وہ بڑا معصوم اور نیک آدمی ثابت ہوگا۔ اس طرح افسانہ نگار ہم سے اپیل کرے گا کہ ہم اپنے اخلاقی تصورات کو بدلیں اور اضافی حالات کا لحاظ رکھ کر فیصلے کریں۔ اخلاقیات کے اضافی تصور کو رواج دینے میں ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بقول مادام مالرو "فعل" کی اہمیت کو سب سے پہلے دوستوفسکی نے ختم کیا۔ یہ عمل ایک حد تک ضروری تھا، اور تہذیب اور شائستگی کی نشانی، حالانکہ محترمہ کے نزدیک عیسائی مذہب فعل کو مستقل حیثیت دیتا ہے، لیکن آخر سینٹ پال کے خطوط میں ہمیں یہ بحث ملتی ہی ہے کہ نجات عمل کے ذریعے ہوتی ہے یا ایمان کے ذریعے ہر مذہب اور ہر تہذیب نے نیت کے لیے کچھ نہ کچھ گنجائش رکھی ہی ہے لیکن داخلیت کو غیر مشروط طریقے سے خارجیت پر ترجیح دینے کا رجحان روسو کی کوششوں سے فروغ پذیر ہوا۔ ابتدا تو اخلاقی اضافیت کا خیال فرد سے متعلق تھا اور ایک طرح سماج کے خلاف احتجاج تھا۔ جب اس اضافی اخلاقیات نے ادب، فلسفیانہ نظریات اور انسانوں کی داخلی زندگی میں اچھی طرح جڑ پکڑ لی تو اجتماعیت کا زور ہوا۔ پرانے اجتماعی نظام مذہب یا کسی مافوق الفطرت تصور کی بنیاد پر قائم ہوتے تھے جن کی حیثیت مستقل سمجھی جاتی تھی، مگر نئی اجتماعیت کی بنیاد ایک جسمانی ضرورت یعنی بھوک پر تھی جو کوئی ہمہ گیر تصور نہیں ہے چنانچہ نئی اجتماعیت نے مروجہ اخلاقی قدروں کو قبول کر لیا، بس کیا اتنا کہ جو حقوق افراد کو دیے گئے تھے، وہ ہیئت اجتماعی کی طرف منتقل کر دیے گئے۔ پہلے سب سے بڑی حقیقت خدا تھا، پھر یہ درجہ فرد کو ملا، اور اب معاشرے کے حصے میں آیا۔ جس طرح اضافی اخلاقیات نے فرد کے معاملے میں فعل کی مستقل حیثیت ختم کر دی تھی، اب معاشرے کے معاملے میں ختم کر دی ہے۔ نئے اجتماعی فلسفوں میں فرد کا فعل مستقل حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اس کا خیال بھی فعل کے برابر اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً روس میں اگر کسی مزدور سے مشین کا پرزہ ٹوٹ جائے تو وہ یہ کہہ کے نہیں بچ سکتا کہ میں تین راتوں سے نہیں سویا تھا اس لیے ذرا اونگھنے لگا تھا۔ اس کے اس فعل کو ارادی تخریب سمجھا جائے گا اور سزا دی جائے گی۔ اگر کوئی یہ سوچے کہ فن کی ایک الگ حیثیت بھی ہے تو یہ خیال ملک سے غداری کے مترادف شمار ہوگا۔ لیکن اگر معاشرہ (یا بالفاظ دیگر حکومت) درجن بھر آدمیوں کو بغیر مقدمہ چلائے گولی سے اڑوا دے تو کہا جائے گا کہ اس فعل کو ایک مستقل چیز سمجھ کر غور کیجیے، یہ دیکھیے کہ حکومت کی نیت کیا تھی۔ یہ ہے وہ اخلاقی پس منظر اور فضا جس کو

ذہن میں رکھ کر ہمیں آزادی کے مسئلے پر غور کرنا ہے۔

میں پھر وہی بات دہراتا ہوں کہ فکری آزادی کا مسئلہ بہت چھوٹا ہے، اور ایک بہت بڑے اخلاقی ہیجان کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس دفعہ میں روس کی مثال نہیں دوں گا کیونکہ روس میں تو نئے اجتماعی فلسفے کو حکومت کی طاقت بھی میسر ہے۔ اب کے فرانس کے کمیونسٹوں کی طرف آیئے، کیونکہ مجھے روس پر اعتراض کرنا منظور نہیں، بلکہ چند اخلاقی تصورات سے بحث ہے۔

دو ڈھائی سال ہوئے نظر بندوں کے کیمپ کی زندگی پر دو ناول شائع ہوئے تھے۔ ایک تو تھا داوید رُوسے کا "ہماری موت کے دن" اور دوسرا تھا ژاں لافیت کا "جو لوگ زندہ ہیں"۔ ان دونوں کتابوں پر فرانس میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ کمیونسٹوں نے لافیت کی بے انتہا تعریفیں کیں، اور رُوسے کو گالیاں دیں کہ اسے تو انسان کی تذلیل میں مزا آتا ہے اور انسانی تکلیفوں میں جنسی لذت ملتی ہے۔ اب سنئے کہ اس خفگی کا سبب کیا تھا۔ جرمنوں نے کمیونسٹوں، جمہوریت پسندوں اور چور اچکوں سب کو ایک ساتھ کیمپوں میں نظر بند کر رکھا تھا۔ جب انہیں خندقیں کھودنے یا دوسرے کاموں کے لیے مزدوروں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے نظر بندوں کو بھیجنا شروع کر دیا، مگر محنت اتنی سخت لی جاتی تھی کہ آدمی کا زندہ بچنا مشکل تھا۔ ان نظر بندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ بھی تھے جن کے مرنے سے پارٹی کو سخت نقصان پہنچتا۔ چنانچہ کمیونسٹ کیمپوں کے منتظموں کے ساتھ مل گئے اور یہ کوشش کرنے لگے کہ دوسرے لوگ مزدوری کے لیے بھیجے جائیں۔ کمیونسٹ بچ جائیں یا اگر دو چار کمیونسٹ جائیں بھی تو ایسے جو پارٹی کے لیے اتنے اہم نہ ہوں۔ اُنہیں جان کا ڈر نہیں تھا بلکہ واقعی خلوص کے ساتھ یہ لوگ انقلاب کی خاطر یہ حرکت کر رہے تھے، مگر سوال یہ ہے کہ مقصد کتنا ہی بلند سہی، لیکن ایک مبہم مستقبل کی خاطر انہیں دوسروں کی زندگی کے بارے میں اتنی سرد مہری سے فیصلے کرنے کا اخلاقی حق پہنچتا ہے یا نہیں؟ رُوسے نے کمیونسٹوں کی بلند کرداری کی تعریف تو کی تھی، لیکن اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے برخلاف لافیت نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ہم جن لوگوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں، ان میں سے جو لوگ ہیئت اجتماعی کے لیے نسبتاً کم کارآمد ہیں، ہمیں ان کی مدد سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اسی صاف گوئی کی وجہ سے لافیت کی تعریف ہوئی اور رُوسے کے مبہم رویے پر گالیاں پڑیں، یعنی احتجاج تو دور کی بات ہے جو

شخص اس غیر انسانی منطق کی پر زور تائید نہ کرے وہ فوراً رجعت پسند، انسانیت کا دشمن، بندر، بھیڑیا، گیدڑ بن جاتا ہے۔ یہ ہے کہ کمیونسٹوں کے یہاں آزادی فکر کا تصور۔ اگر فرانس کے کمیونسٹوں کے پاس حکومت کی طاقت بھی ہوتی تو وہ ایسے مصنف کو سزا بھی دیتے۔ یہ کوشش تو وہ کئی دفعہ کر چکے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم پابندی لگا دیں، ان کی چیزیں کہیں نہ چھپ سکیں، لیکن فرانس میں ایسی باتیں ممکن نہیں۔

آزادی فکر صرف پاکستانی حکومت کے سیفٹی آرڈی نینس، ہی سے ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے اور بھی طریقے ہیں، مثلاً یہ کہ آزاد ادیبوں کے خلاف جھوٹے الزام تراشے جائیں اور اتنا غل غپاڑا مچایا جائے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ روس کے سرکاری رسالوں سے لے کر اردو کے دو ورقے اشتہاروں تک میں آپ تقریباً ہر مہینے پڑھیں گے کہ ژید اور سارتر وغیرہ فرانسیسی مصنف عوام کے دشمن اور ملک کے غدار ہیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جرمنوں کے خلاف مدافعت کے لیے انھی لوگوں نے ادیبوں کو منظم کیا تھا اور ادیبوں کی کمیٹی بنانے والے کوئی کمیونسٹ صاحب نہیں تھے، بلکہ ژاں پال جو کمیونسٹوں کی احتسابی سرگرمیوں کے سخت خلاف ہیں، مگر جھوٹ کو بار بار دہرایا جائے تو اس میں بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، یعنی مَیں بھی اس شبہے میں پڑ گیا کہ شاید یہی لوگ ٹھیک کہتے ہوں اور مجھے یاد نہ ہو، چنانچہ میں ثبوت کی تلاش میں رہا۔ ایک دن یوں ہی ایک رسالے کو اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ ادیبوں کی قومی کمیٹی میں جو بڑے بڑے لوگ شامل تھے، ان کی فہرست مل گئی، چونکہ اردو کے کمیونسٹ رسالوں میں بھی ہر مہینے ان حضرات پر گالیاں پڑتی ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حوالے بھی لکھ دوں جن صاحب کو شک ہو وہ رسالہ "پاریو" بابت جولائی ۴۷ء صفحہ ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیں۔ جرمنوں کے خلاف مدافعت کرنے والے ادیبوں میں تقریباً سارے ہی تو رجعت پسند جمع ہو گئے تھے —— موریاک، مالرو، کامیو، سارتر، ژید، برنانو، ماری تاں، ان لوگوں نے مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا انتخاب بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ ادیبوں کے خفیہ اخبار کے شذرات کون لکھتا تھا، کامیو جنھیں روسی رسالے گیدڑ اور لگڑ بگڑ بناتے ہیں۔ مزا یہ ہے کہ ان لوگوں کو گالیاں بھی دی جاتی ہیں مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ جرم کیا ہے۔ اپنے طور پر میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تو ذرا سا سراغ ملا —— وہ بھی کمیونسٹوں کی تحریروں سے نہیں۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے، اس سے مقصد اور ذرائع کی عجیب و غریب منطق پر بھی

روشنی پڑتی ہے اور آزادی رائے کے مسئلے پر بھی۔

جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ تھا تو فرانسیسیوں کے چھاپہ مار دستے جرمن افسروں کو چن چن کر مارا کرتے تھے۔ جرمنوں نے یہ حرکت شروع کی کہ وہ ایک جرمن افسر کے بدلے میں ایک پورے گاؤں کو جلانے لگے۔ اس پر چھاپہ دستوں کے رہنماؤں کا ردعمل یہ ہوا کہ سینکڑوں فرانسیسیوں کی جان تو ضرور مفت میں جاتی ہے، مگر خیر کوئی بات نہیں ہے، جرمن جتنا زیادہ ظلم کریں گے، لوگوں کو اتنا ہی غصہ آئے گا اور مدافعت کا جذبہ بھڑکے گا۔ ادیب اس زمانے میں خاموش رہے اور اپنی تحریروں سے برابر آزادی کی جدوجہد میں مدد کرتے رہے لیکن جب فرانس آزاد ہو گیا تو اپنے تجربات پر ادیب کی حیثیت سے غور کرتے ہوئے بعض لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ اس قسم کا استدلال اخلاقی اعتبار سے بھی درست تھا یا نہیں؟ کیا سینکڑوں انسانوں کو (جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے) اتنی سرد مہری سے قربان کر دینا جائز تھا؟ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ یہ لوگ خود قربانی دینے سے نہیں گھبرائے، لڑائی کے زمانے میں بھی انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچے، بلکہ عملی جدوجہد کا زمانہ گزر جانے کے بعد انہوں نے اس مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے سوچنا شروع کیا۔ ممکن ہے کہ یہ تشویش غلط یا فضول ہو، لیکن اگر ادیب اپنے آپ سے مشکل اخلاقی سوالات نہ پوچھے تو اس کے وجود کا فائدہ ہی کیا ہے؟ غرض یہ بات ان کے منہ سے نکلنی تھی کہ کمیونسٹوں نے غل مچانا شروع کر دیا کہ یہ غدار ہیں، ہمارے شہیدوں کی توہین کرتے ہیں، ان کا منہ بند کرو، اگر فن کار اس طرح سیاسی جماعتوں کی سہولتوں کا لحاظ کر کے اپنے ہونٹ سی لیں تو حکمرانوں کے ہاتھوں (خواہ حکمراں فسطائی ہوں یا سرمایہ دار یا کمیونسٹ یا مسلم لیگی یا کوئی اور، اس سے بحث نہیں) ان اخلاقی اقدار اور احساسات کا کیا حشر ہو گا جو نسل انسانی نے صدیوں کی ذہنی جدوجہد کے بعد پیدا کی ہیں؟

یہ آخری مثال مسلمانوں کے لیے بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ ہمارے نظام زندگی میں شہادت کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل ہے، بلکہ منٹو صاحب تو کہا کرتے ہیں کہ میں شہادت کے تصور ہی کی وجہ سے اسلام پر ایمان لایا ہوں۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ کہیں کہ اگر قوم کے لیے سو پچاس گاؤں جل گئے تو کیا ہوا، لیکن سوال محض جان دینے کا نہیں ہے، بلکہ یہ بات بھی دیکھنی ہے کہ کس طرح جان دی گئی۔ خلفائے

راشدین جب جہاد کے لیے فوج روانہ کرتے تھے تو سپہ سالار کو خاص طور سے ہدایت کرتے تھے کہ دیکھو، ایک مسلمان کی جان بھی فضول ضائع نہ ہو، بلکہ حضرت عمرؓ، حضرت خالدؓ کو اسی لیے ناپسند کرتے تھے کہ وہ جوش جہاد میں سپاہیوں کی جان کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں (خالی اسلام میں نے اس وجہ سے نہیں کہا کہ میں اس موقع پر مسلمانوں کی تاریخ کو بحث سے خارج نہیں کرنا چاہتا) مقصد اور ذرائع کے تعلق کا فلسفہ قطعاً وہ نہیں ہے جو "نئی میکیاویلیت" کے زیر اثر آج کل ہماری دنیا میں رائج ہے۔ اس بات کا ذکر یوں ضروری معلوم ہوا کہ کون جانتا ہے کہ کل ہمارے یہاں کوئی ایسی آمریت ابھرے جو اسلام کے نام پر ہماری ساری آزادیاں چھین لے۔ اگر بعض مولوی جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اسلام کی رو سے جائز ثابت کر سکتے ہیں تو اور بھی عجوبے ممکن ہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ کمیونسٹوں کی آمریت تو خیر بری ہے ہی لیکن آمریت کی ایسی بھی قسمیں ہیں جو اس سے بھی بری ہیں۔ اگر شخصی آزادی قربان کر کے معاشی عدل ہو سکے تو چلیے صبر کی گنجائش ہے لیکن جس دنیا میں دونوں میسر نہ ہوں، اس کا تصور بھی ہولناک معلوم ہوتا ہے۔

اب آزادیِ رائے کے مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب معمہ ہے کہ فرد کی حیثیت سے عمل کرتے ہوئے آدمی جن باتوں کو ناجائز سمجھتا ہے، گروہ کی حیثیت سے عمل کرتے ہوئے اُنھی باتوں کو جائز سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرا معمہ یہ ہے کہ آدمی کو یقین آجائے کہ میں راستی پر ہوں تو پھر وہ یہ بات سننا پسند نہیں کرتا کہ سچائی کے کئی پہلو بھی ہو سکتے ہیں یا اس سچائی کے علاوہ اور قسم کی سچائیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا شکار آزادی رائے بنتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دیکھیے —— کسی فرد پر اعتراض منظور نہیں ہے۔ کراچی کے چند صحافت نگاروں کے ساتھ اخبار کے منتظمین اور پولیس نے زیادتی کی تھی۔ لاہور کے صحافت نگاروں نے خواہش ظاہر کی کہ حلقہ اربابِ ذوق بھی اس موقع پر ایک قرارداد کے ذریعے اس واقعے کی مذمت کرے۔ حلقے والوں نے جواب دیا کہ آپ سخت سے سخت بیان لکھ کے دیجیے، ہم سب انفرادی حیثیت سے دستخط کر دیں گے لیکن حلقہ ایک ادارے کی حیثیت سے کسی غیر ادبی مسئلے پر کوئی رائے ظاہر نہیں کرتا، اور نہ آج تک کوئی قرارداد منظور کی ہے۔ اس پر صحافت نگاروں کے نمائندے نے (جو کوئی مخدوش آدمی نہیں تھا، بلکہ صرف ہمارے انتظار حسین صاحب تھے) کہا کہ اگر

آئندہ سے اخبار نویس حلقے کے ساتھ تعاون نہ کریں تو؟ حلقے والوں نے بڑا معقول جواب دیا کہ بسم اللہ ہم کوئی سیاسی آدمی تو ہیں نہیں جن کا انحصار بیانات پر ہو۔ ہمارا کام تو لکھنا ہے، ہمیں بھیڑ بھڑکے سے کیا غرض۔

یعنی اس موقع پر صحافت نگار سو فیصد راستی پر تھے، لیکن انہیں یہ پسند نہیں تھا کہ حلقہ جس چیز کو راستی سمجھتا ہے، اس پر ثابت قدم رہ سکے۔ ان لوگوں کی ضد تھی کہ ہر قسم کی سچائی ان کی سچائی میں ضم ہو جائے۔

غرض آزادی رائے کو اندیشہ صرف حکومت ہی کی طرف سے نہیں بلکہ مختلف گروہوں اور افراد کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ آزادی رائے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں صرف حکومت سے نہیں لڑنا چاہیے بلکہ چند فکری رجحانات اور انسانی نفسیات کے چند بنیادی عناصر سے بھی جنگ کرنی ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں آزادی کی بنیاد کو وسیع سے وسیع تر اور مستحکم سے مستحکم تر بنانا ہے۔ اس کے لیے ہمیں داخلی اور خارجی، دونوں قسم کے عوامل کا جائزہ لینا ہوگا۔ خالی قانونوں کے بننے یا نہ بننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر قانون ہمیں پوری آزادی دیتا ہے لیکن ہمارے اندر آزادی کی طلب نہیں تو بات برابر ہے۔ سوریلسٹوں کے امام آندرے برتوں نے کہا ہے —— صحیح ترجمہ کرنے سے ڈر لگتا ہے —— کہ آزادی تو ایک مسلسل جنسی ہیجان کی طرح ہے اور واقعی جب تک ہمیں آزادی کی ایسی شدید لگن نہ ہو، ہماری آزادی ہر وقت غصب کی جا سکتی ہے۔ حکومت تو بڑی چیز ہے، بااثر افراد تک ہماری آزادی چھین سکتے ہیں۔

جہاں تک ادیبوں کا تعلق ہے، انہیں بہت زیادہ آزادی چاہیے اور مہذب حکومت کا فرض ہے کہ اس بات کا ذمہ لے لیکن صاف اور کھری بات یہ ہے کہ نہ کوئی ہمیں آزادی دے سکتا ہے اور نہ کوئی ہماری آزادی چھین سکتا ہے۔ اگر ہمارے اندر سچی اور گہری تخلیقی لگن ہوگی تو ہم ہزار پابندیوں کے باوجود غاروں میں چھپ چھپ کر لکھیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ ہمارے ہمعصر ہماری تحریریں نہیں پڑھ سکیں گے۔ لیکن اگر ہماری تخلیق میں جان ہوگی تو وہ خود زندہ رہے گی۔ آخر سقراط نے اپنی بات اس بھروسے پر نہیں کہی تھی کہ ریاست کا دستور مجھے اجازت دیتا ہے، یا فلاں انجمن میری حمایت کرے گی۔ وہ اس لیے بولا تھا کہ بولے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے دل میں جو صداقت کی لگن اور سچائی کی دُھن تھی، وہ اسے مجبور کر رہی تھی کہ اپنی بات کہے۔

دستوروں، قانونوں، تحریکوں اور انجمنوں کا سہارا بے بنیاد ہے۔ آزادی رائے کے معاملے میں اولیں اور آخری ذمہ داری فرد کی ہے۔ اگر فن کار کو اپنی اندرونی لگن پر اعتماد ہو تو وہ اکیلے بھی بڑے سے بڑے استبداد کا مقابلہ کر سکتا ہے، ورنہ دنیا کا سب سے جمہوری دستور بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ یوں تو خیر فن کار بھی ایک عام انسان ہے۔ اگر فضا ساز گار ہو تو اُسے اپنے تخلیقی کام میں آسانی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اُسے کسی خارجی طاقت سے آزادی مانگنے کی ضرورت نہیں، اس بجلی کا کارخانہ خود اس کے اندر موجود ہے۔

اس زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کا وجود بسا غنیمت ہے۔ یہی ایک انجمن باقی رہ گئی ہے جہاں ایک ادیب اپنی ادبی حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے اور اس سے کوئی اور چولا بدلنے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ یہی ایک جگہ ہے جہاں آپ بغیر کسی ہیجان یا اضطراب کے نہایت سکون سے بحث کر سکتے ہیں، اور اس سے انسانیت کا مستقبل خطرے میں نہیں پڑتا۔ ممکن ہے حلقے میں "جان نہ ہو" —— یعنی غیر ادبی بحثیں نہ ہوتی ہوں، لیکن ایک ایسی "بے جان" انجمن کا وجود اشد ضروری ہے جو ادیبوں کی حیثیت سے ادیبوں کی آزادی پر ایمان رکھتی ہو —— تا کہ دوسرے کو دیکھ کر ہمارا ایمان تازہ ہوتا رہے۔

مَیں میراجی کے انتقال کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر بعض حضرات چاہتے ہیں کہ مَیں میراجی جیسے غیر رسمی آدمی کے بارے میں رسمی طور سے کچھ نہ کہوں، بلکہ پورا مضمون لکھوں، یہ مضمون میں سالنامے میں پیش کروں گا۔"

(دسمبر ۱۹۴۹ء)

اَدبی تجربے

ہم پاکستانی ادب پیدا کرنا چاہتے ہوں یا اسلامی ادب یا پرولتاری ادب، لیکن ہمیں غرض ادب سے ہے، سیاست سے نہیں تو ہم ادبی تجربوں سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ تجرباتی روح کے بغیر ادب کی زندگی ہی ناممکن ہے۔ ادیب کس قسم کے تجربات کرے گا، یہ اپنے اپنے زمانے اور شخصی مزاج پر منحصر ہے۔ معاشرے میں بد نظمی اور بے آہنگی ہو تو ادیب موضوع اور ہیت دونوں میں غیر معمولی جدتیں پیدا کرتا ہے جو بعض لوگوں کو بے ڈھنگی اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔ معاشرے میں ہم آہنگی ہو تو یہ تجرباتی روح اور کسی بات میں نہیں تو لفظوں کی تراش خراش، فقروں کی نشست، جملوں کی ترکیب اور حرفوں کے صوتی مرکبات سے اثر اور معنویت پیدا کرنے میں اپنی طاقت صرف کرتی ہے۔ اگر ادیبوں میں یہ تجرباتی روح معطل یا مضمحل ہو کے رہ جائے تو کم سے کم ایک دو نسلوں تک تو ادب ہی معطل ہو کے رہ جاتا ہے۔ اتفاق سے آج کل ہمارے ادب کو منجملہ اور بیماریوں کے یہ عارضہ بھی لاحق ہے۔ تجرباتی روح آج کل کسی بڑے پیمانے پر ہمارے یہاں کام نہیں کر رہی ہے، اس کا اظہار بس انفرادی طور پر یہاں وہاں ہوتا ہے، لیکن چونکہ ادب لکھنے والوں اور ادب پڑھنے والوں، دونوں کی طبیعتیں بجھی ہوئی ہیں اس لیے ان انفرادی مظاہروں کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں کی جاتی۔

تجرباتی روح کے اس اضمحلال کی بہت بڑی وجہ تو یہی ہے کہ نئے ادیبوں نے اپنے لیے جس قسم کا بُرا بھلا نظامِ اقدار ترتیب دے لیا تھا، اس میں پاکستان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی دنیا میں جس قسم کی منطق رائج تھی، اس کے اعتبار سے پاکستان ان ہونی بات تھی، چنانچہ ہمارے ادیبوں کے لیے پاکستان ایک روحانی سانحہ بن کے آیا۔ ان کے لیے یہ واقعہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے کرۂ زمین سے کوئی ستارہ آ کے ٹکرا جائے اور طبیعیاتی قوانین

درہم برہم ہو جائیں۔ دوسری طرف مختلف وجوہات کی بنا پر ہمارے معاشرے میں ادب کی قدر گھٹ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب نواب اودھ نے میر کا کلام توجہ سے نہیں سنا تھا تو وہ بگڑ کے چلے آئے تھے اور نواب کو اپنی اس غفلت پر ندامت ہوئی تھی یا خواجہ میر درد کی محفل میں شاہ دہلی درد کی وجہ سے پیر پھیلا کر بیٹھ گئے تھے تو میر درد نے بڑی صفائی سے کہہ دیا تھا کہ حضرت ٹانگ میں درد تھا تو تکلیف کرنے ہی کیا ضرورت تھی۔ اس زمانے میں بادشاہ تک کو یہ نازک مزاجی برداشت کرنی پڑتی تھی کیونکہ اس زمانے میں سماج کی نظر میں زندگی اور انسانی تجربات کی معرفت حاصل کرنا ہی بذاتِ خود قابل قدر چیز تھی، لیکن آج کوئی شاعر اس قسم کی حرکت گورنر جنرل کے ساتھ کرے تو اس کے ساتھ بہت بڑی رعایت یہ ہوگی کہ سرپھرا سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آج کل کا گورنر جنرل پرانے زمانے کے بادشاہ سے زیادہ مغرور یا خود پرست ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمارا معاشرہ شاعر یا عارف کی حیثیت سے شاعر کی اہمیت اور ضرورت تسلیم نہیں کرتا، اپنے نظامِ حیات میں اس کے لیے کوئی مستقل اور ممتاز جگہ نہیں رکھتا بلکہ اسے مد فاضل میں ڈال دیتا ہے، چنانچہ جو لوگ پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے میں پیش پیش اور سرگرم تھے، ان کے تصور حیات میں شاعر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اقبال کو بھی وہ اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ ان کے ہاں چند ایسے خیالات مل جاتے ہیں جو معاشرے کی ترقی اور استحکام کے لیے مفید ہیں۔ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے اگر کوئی ادیب پاکستان کو اپنے تصو۔ حیات میں جذب کر بھی لے تب بھی اس کی مشکل دور نہیں ہوتی، بلکہ جو ادیب پاکستان کو قبول نہیں کرتے ان کے لیے تو معاملہ ایک حد تک آسان بھی ہے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہماری منزل ابھی نہیں آئی، ہمیں تو صرف انگریزوں اور سرمایہ داروں نے دھکا دے کر سڑک سے ہٹا دیا ہے۔ ان کی تخلیقات عموماً تجربے اور حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یہ الگ بات ہے لیکن ان کو یہ تسلی تو ہے کہ ہماری تخلیق کا ایک مصرف ہے اور ہم اپنے افسانے اور نظمیں لکھ کر منزل کے قریب آ رہے ہیں لیکن جو ادیب پاکستان کو قبول کر لیتا ہے، اس کے لیے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ادب کا انقلابی مقصد تو پاکستان کو قبول کرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ مختلف خامیوں اور بُرائیوں پر طنز کر کے انہیں دور کرنا چاہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی چیز کو اور اچھا بنانا چاہتا ہے۔ یہ انقلاب نہیں ہے۔ جس چیز کو وہ قبول کرتا ہے اسے ختم کر کے

اس کے بجائے کوئی اور چیز بنانے کی خواہش وہ نہیں کر سکتا۔ محض سماجی اصلاح کے جذبے سے بڑا ادب پیدا ہونے سے رہا۔ کوئی معقول ادیب اسے اپنا مطمع نظر بنا نہیں سکتا۔ جب کوئی ادیب پاکستان کو قبول کر لیتا ہے تو وہ جس قسم کے افسانے یا نظمیں اب تک لکھتا رہا تھا، اسی قسم کی چیزیں لکھنا جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ اب اسے نئے نئے اور عظیم الشان روحانی عوامل کا احساس ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے فن میں سمیٹنا چاہتا ہے، مگر یہ کام کوئی منہ کا نوالہ نہیں۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لیے اسے بہت ادھ کچرے تجربات کرنے پڑیں گے جو بہت سی باتوں میں اس کی پرانی تحریروں سے مماثل ہوں گے اور بہت سی باتوں میں مختلف ہوں گے۔ اس وقت جس ادیب کو پورے معاشرے کی نئی ذہنی اور روحانی تحریکات کا احساس نہیں ہے، وہ احمق اور بے حس ہے لیکن اگر وہ ایک دم سے ان تمام تحریکات کا مظہر بننے کی کوشش کرتا ہے یا اپنی فنی شخصیت کو قوم پرستی کی رو میں بہہ جانے دیتا ہے تو اس کا فن جھوٹا، بے خلوص اور ناکام ہو جائے گا، خواہ وقتی طور پر واہ واہ ہو جائے، چنانچہ ادیب کے لیے صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ پرانے تعصبات سے پیچھا چھڑا کے فن کار کی سی معروضیت کے ساتھ انسانی زندگی اور انسانی ذہن کا مطالعہ کرے، اور اگر اسے چند ایسے عوامل نظر آئیں جن کا اسے پہلے سے علم نہیں تھا یا جنہیں وہ محض افسانہ سمجھتا تھا تو اُن سے آنکھیں نہ چرائے۔ لیکن یہ راستہ اختیار کرنے میں ادیب کو ایک بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کی ان ادبی اور فنی سرگرمیوں کو معاشرہ کس نظر سے دیکھے گا، چونکہ یہ ادیب پاکستان کو اور جو تصورات اس سے متعلق ہیں، ان سب کو قبول کر چکا ہے، اس لیے وہ محض باغی بن کے زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ معاشرے سے ہم آہنگی کا متلاشی ہے۔ لیکن چونکہ فی الحال معاشرہ اس کے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتا، اس لیے یہ ہم آہنگی اسے نہیں ملتی، چنانچہ ادیب عجیب گومگو کے عالم میں مبتلا ہے، چونکہ وہ معاشرے کو واضح طور سے قبول کر چکا ہے، اس لیے معاشرے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن فی الحال معاشرہ ادیب سے قطعاً بے نیاز ہے۔ ادیب بچارے کا یہ حال ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اگر ادیب یہ سوچ لے کہ مجھے معاشرے کی قطعاً ضرورت نہیں، مَیں بجائے خود ایک مکمل ہستی ہوں، محض اپنے لیے اور اپنے بل بوتے پر اپنا فن تخلیق کروں گا تب بھی کچھ نہ کچھ حرکت اور گرمی پیدا ہونے کی امید ہے کیونکہ دس بیس ادیب یہی بات کہنے لگیں تو وہ ایک حد تک ایک الگ ہی معاشرہ

بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن پورے معاشرے کو تسلیم کر لینے کے بعد اپنے فنی اور تخلیقی کام میں اُس سہارے سے محروم رہ جانا جو صرف معاشرے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ادیبوں کے لیے بہت بڑی نامرادی ہے۔ (روس کے کئی اشتراکی ادیبوں کو جو خود کشی کرنا پڑی، اس میں کچھ اس بات کا بھی دخل ہے) سہارے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادیبوں کے جلوس نکالے جائیں اور انہیں دیوتا بنا لیا جائے۔ یہ سب تو سیاسی مصلحتوں کی خاطر ہوتا ہے۔ ایسی باتیں چنگیزی حیلے ہیں، ادب کی ترقی سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ ادیب کو تو اصل میں یہ سہارا چاہیے کہ معاشرے میں اس کی کوئی نہ کوئی جگہ ہو، معاشرہ اسے توجہ کے قابل سمجھتا ہو اور اس کی سرگرمیوں کو کسی سستی افادیت کی وجہ سے نہیں بلکہ بجائے خود اور برائے خود قابلِ قدر تسلیم کرتا ہو۔ پاکستان میں ادب دو ہی طریقے سے ترقی کر سکتا ہے۔ یا تو معقول ادیبوں کی اکثریت یہ سمجھ لے کہ ہمیں معاشرے سے کوئی واسطہ نہیں، ہمیں صرف اپنے ذہنی اور روحانی تجربات سے مطلب ہے، یا پھر معاشرہ ادیبوں کے لیے کوئی جگہ بنائے جس طرح آج سے سو سال پہلے تھی۔ فی الحال نہ تو ادیب اتنے بے حس ہیں، نہ معاشرے میں اتنی وسعت نظر ہے، اس لیے دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہو رہی اور ادیب ایک مہمل بے یقینی کا شکار ہیں۔ ادیب معاشرے سے باہر بھی نہیں نکل سکتا اور اندر رہتا ہے تو بالکل ناخواندہ مہمان معلوم ہوتا ہے۔ جب ادب، ہی کی حیثیت غیر متعین ہو تو ادبی تجربے کرنے کی ضرورت کسے محسوس ہو گی۔

تجرباتی روح کے کمزور پڑ جانے کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ دوسرے سبب کا تعلق پاکستان سے نہیں، نئے ادب کی تحریک سے ہے۔ یوں تو نئے ادب کی پوری ہی تحریک ایک تجربہ تھی اور جو افسانہ یا نظم لکھی جاتی تھی۔ وہ ایک تجربے کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن ہمارے نئے ادب ادیبوں کی ذہنی دنیا بڑی محدود تھی۔ ان کا ذوق شوق اور تجسّس بڑی جلدی ختم ہو گیا اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے تجربوں ہی سے مطمئن ہو کے بیٹھ گئے۔ ہمارے یہاں سب سے قیامت کا تجربہ آزاد نظم سمجھا جاتا ہے، مگر ہمارے کسی شاعر یا نقاد نے آج تک یہ معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ آزاد نظم ہوتی کیا بلا ہے۔ بس یوں ہی ایک ابتدائی سا تصور ذہن میں ہے، اسی کے بل پر کھینچے چلتے ہیں۔ پھر جب ادیبوں کے ذہن پر ایک خاص جماعت کی سیاست مسلط ہو گئی تو ادبی تجربے اور ہیئت کی تلاش کے

معنی عام طور سے یہ رہ گئے کہ ایک مہینے باپ کی طرف سے بیٹے کو خط لکھا، دوسرے مہینے بیٹے کی طرف سے باپ کو۔ مضمون دونوں دفعہ واحد اگر زیادہ باریکی پیدا کرنی منظور ہوئی تو بیٹے کو الگ کرکے بے ٹے لکھ دیا۔ اس قسم کی بازی گری ادبی تجربے کے نام سے ہمارے یہاں رائج ہے۔ ادبی تجربے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کوٹھی کا ناج اس کوٹھی میں کرتے رہیں۔ ہیئت کا تجربہ ایک نیا ذہنی اور روحانی تجربہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ تجربہ ہی کیا جو ہمیں ادب اور زندگی، دونوں کو ایک نئے انداز سے محسوس کرنے میں مدد نہ دے، لیکن اس قسم کے ادبی تجربے اردو میں کمیاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں جو تجربے افسانے میں ہوئے ہیں، انہیں یاد کرنے کی کوشش کریں تو تین چار سے زیادہ نام ذہن میں نہیں آتے۔

حالانکہ غلام عباس صاحب نے کوئی ایسے بہت واضح تجربے تو نہیں کیے، مگر دو باتوں کی وجہ سے میں سب سے پہلے انہی کا نام لوں گا۔ ہمارے ہاں کچھ تو گروہ بندی ہو گئی ہے اور کچھ افراتفری کا عالم، اس لیے کوئی غلام عباس کا ذکر ہی نہیں کرتا، یوں ہونے کو تو ایک گروہ ان کا بھی ہے، لیکن اس گروہ کو اب ادب میں کوئی پوچھتا نہیں۔ خیر، اوروں کا تو کیا نقصان ہوا، وہ لکھتے ہی کیا تھے، لیکن بچارے غلام عباس صاحب مفت میں مارے گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا ادب جن حالوں کو پہنچ گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے تو اگر کوئی صاف ستھری عبارت ہی لکھ لے تو اسے بھی ادبی تجربے کا رتبہ دینا چاہیے اور پھر غلام عباس تو اپنے فن کے بارے میں اتنے محتاط بلکہ شکی واقع ہوئے ہیں کہ ایک ایک فقرہ اس طرح لکھتے ہیں جیسے کوئی نازک تجربہ کر رہے ہوں۔ کم سے کم نئے اردو افسانے کی تاریخ میں تو یہ ایک نادر تجربہ ہے کہ ایک افسانہ نگار اپنی حد سے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا، جو چیز اپنے بس کی نہیں اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا، اس کے بجائے اپنی صلاحیتوں سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کرتا ہے، پورے افسانے کی ہیت سے لے کر ایک ایک فقرے تک ہر چیز پر پوری توجہ صرف کرتا ہے، اور جس کا عقیدہ ہے کہ ہیت کے لیے ایک جملہ بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو افسانے کا خاکہ یا افسانے کے مختلف حصوں کا ایک دوسرے سے تعلق۔

منٹو صاحب نے بھی اِدھر جو افسانے لکھے ہیں انہیں واضح طور پر ادبی تجربہ تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن ان افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی اور فنی نشوونما رکی نہیں،

جس طرح اردو کے بیشتر افسانہ نگاروں کا ارتقا ایک مقام پر پہنچ کے ختم ہوگیا ہے۔ ان کے نئے افسانے پہلے سے زیادہ گٹھے ہوئے ہیں۔ یوں فضول الفاظ تو وہ پہلے بھی استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن اب تو وہ یہ کوشش کرنے لگے ہیں کہ مطلب کو کم سے کم لفظوں میں ادا کیا جائے اور جو باتیں پڑھنے والا خود سمجھ سکتا ہے انہیں اس پر چھوڑ کے صرف اشارہ کر دیا جائے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ منٹو صاحب ایک ایسا ادبی تجربہ کرنا چاہتے ہیں جس کی توقع عام پڑھنے والوں کو ان سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک ایسا افسانہ لکھنا چاہتے ہیں جو شروع سے آخر تک لفظوں کا کھیل ہو۔ ان کا خیال ہے کہ ضلع جگت، رعایت لفظی وغیرہ قسم کی چیزیں جو پہلے ہمارے ادب میں رائج تھیں، اب انہیں پھر سے رواج دینا چاہیے اور ان سے نئے نئے کام لینے چاہئیں۔ (ہمارے ادبی حلقوں پر جس قسم کی سطحیت چھا گئی ہے، اس کے پیشِ نظر اندیشہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو اس قسم کی خواہش انتہائی مضحکہ خیز اور مہمل معلوم ہوگی۔ لیکن جوئس کی آخری کتاب کے پڑھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان "تصنعات" کو کتنا معنی خیز بنایا جاسکتا ہے (یہاں یہ تصریح ضروری ہے کہ منٹو صاحب کے دل میں یہ خیال جوئس کی کتاب پڑھ کر پیدا نہیں ہوا) چنانچہ منٹو صاحب اکثر افسوس کیا کرتے ہیں کہ لغت سے میری واقفیت اتنی محدود کیوں ہے، ورنہ میں ایک ایک لفظ کو الٹ پلٹ کر کئی کئی معنوں میں استعمال کیا کرتا۔ منٹو صاحب کے اس نئے رجحان کا اظہار ابھی تک صرف اِدھر اُدھر فقروں میں ہوا ہے، پورے پیمانے پر نہیں ہوا۔ ہاں منٹو صاحب کا ایک نیا تجربہ وہ لطیفے بھی ہیں جو انہوں نے فسادات کے متعلق لکھے ہیں۔ یوں تو یہی کوشش کیا کم ہے کہ دس پندرہ فقروں میں گہرا اور ہمہ گیر اثر پیدا کیا جائے، لیکن منٹو صاحب کی جدتِ طبع نے ایک نئی بات یہ پیدا کی ہے کہ لطیفے اور عنوان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، دونوں چیزیں مل کر معنی دیتی ہیں۔ ان کے نئے افسانوں میں ایک تازہ خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ جنسی گھٹن اور بھنچن کا احساس ختم ہوگیا ہے اور اب انہوں نے اپنے افسانوں میں ایسی عورتیں پیش کی ہیں جن کے جنسی احساسات تنومند اور بے جھجک ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ منٹو صاحب ایک تجربہ یہ کرنا چاہتے تھے کہ چند افسانے ایسے لکھیں جن کا صریحی مقصد تعمیری ہو اور جن میں قوم کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا ہو، بلکہ ایک دفعہ تو ان کا ارادہ ہوا تھا کہ اقبال کے مشورے پر عمل کریں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی سے واقعات لے کر ان کی مدد سے افسانے لکھیں، لیکن سال بھر

سے انہوں نے کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔ اس موضوع پر میری کبھی ان سے گفتگو تو نہیں ہوئی ہے، لیکن خیال یہ ہے کہ حکومت نے جس انداز سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی داد دی ہے، اس سے وہ کچھ بددل ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے پاکستان میں ادبی تجربوں کی کمی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، غالباً وہ منٹو صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔

ادبی تجربے کرنے کے معاملے میں تو ہمارے یہاں بس ایک عزیز احمد صاحب ہیں جو تھکنے ہی میں نہیں آتے۔ خواہ ان کا تجربہ ناکام رہے یا کامیاب، وہ اپنے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ان کی ناکامی کی مثالیں تو وہ افسانے ہیں جن میں انہوں نے خواب یا سرسام یا اس سے ملتی جلتی ذہنی کیفیت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال یہاں بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے حقیقت کو غیر معمولی شکلوں میں ترتیب دینے کا تجربہ ضرور کیا ہے، اور اس حد تک توجہ کے قابل ہے۔ ان کی کامیابی کی بہترین مثال "تصورِ شیخ" ہے۔ اس افسانے میں جو قصہ ہے وہ تو بالکل معمولی ہے اور بہت سے لوگوں کو پہلے سے معلوم ہے لیکن عزیز احمد صاحب نے اس میں دکھایا یہ ہے کہ آدمی کے معتقدات کا اثر اس کے جنسی تجربات پر کیا پڑتا ہے، یہ معتقدات اور یہ جنسی احساسات ایک دوسرے کی رہنمائی اور مدد کس طرح کرتے ہیں اور ان دونوں کی شکلیں ایک دوسرے سے کس حد تک منحصر ہوتی ہیں۔ یوں "نفسیاتی" افسانے لکھنے کا دعویٰ تو اردو میں بہت سے کرتے ہیں، لیکن اردو میں اگر کسی نے نئی نفسیات سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھایا ہے تو عزیز احمد صاحب نے، اس افسانے میں۔ انہوں نے اپنے کردار کے جنسی تجربات کو تصوف کی رسوم کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور افسانہ لکھا بھی ہے تصوف کی اصطلاحات میں کوئی عام افسانہ نگار ہوتا تو وہ اس کردار کے تصوف کو جنسی خواہشات کا پردہ بنا کے رکھ دیتا لیکن عزیز احمد صاحب نے ایسا چھچھورا انداز اختیار نہیں کیا۔ اس تصوف کو صرف پردہ سمجھ کر پورے کردار پر غور کیا جائے تو یہ افسانہ کسی انسان کا افسانہ نہیں بلکہ مشین کا افسانہ بن جاتا ہے۔ عزیز احمد صاحب کے ہیرو میں انسانیت اسی وجہ سے آتی ہے کہ اس کے ذہنی رجحانات سیدھے سادھے نہیں بلکہ پیچیدہ ہیں، ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ضرور ہیں مگر اپنی ایک مستقل ہستی بھی رکھتے ہیں۔ عزیز احمد صاحب نے جہاں معروضی انداز اختیار کیا ہے، وہاں ایک سرور اور کیف بھی برقرار رکھا ہے۔ حالانکہ وہ کہا کرتے ہیں کہ میرا کوئی طرزِ تحریر نہیں ہے۔ ان

کے عام افسانوں کے بارے میں یہ بات ٹھیک ہے، مگر اس افسانے میں تو انہوں نے ایک رچاوٹ پیدا کر کے دکھائی ہے، اور ان کا طرز تحریر غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی خشک نہیں ہے۔ یہاں ان کا پڑھا لکھا عزیز احمد صاحب کے بہت کام آیا ہے، اور صاف بات یہ ہے کہ یہ افسانہ ان کے علاوہ آج کل کے کسی اور افسانہ نگار کے بس کا تھا بھی نہیں۔ ایک اور تجربہ انہوں نے اپنے افسانے "زریں تاج" میں کیا ہے، اور اسی سے ملتا جلتا تجربہ "مدن سینا اور صدیاں" میں بھی کر چکے ہیں۔ عزیز احمد صاحب کو مختلف تہذیبوں اور ادبوں کے تقابلی مطالعے سے خاصی دلچسپی ہے، اور یہ بات معلوم کرنے کا انہیں بہت شوق ہے کہ کوئی تہذیب یا قوم یا نسل یا ادارہ زمانے کے ساتھ ساتھ کس طرح بدلتا چلا گیا اور اس نے کیا کیا شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کا اظہار ان کے ناول "ایسی پستی ایسی بلندی" میں بھی ہوتا ہے اور وہ خاندانوں تک کی تاریخ کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی اس دلچسپی کا بہترین مظہر یہ دو افسانے ہیں جہاں وہ ایک "تصور" کو لے کر چلے ہیں، اور مختلف صدیوں، ملکوں اور قوموں میں سے گزرتے چلے گئے ہیں اور فی الجملہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ کون سی چیزیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور کون سی اضافی ہیں۔ یعنی ان افسانوں میں ان کی تفتیش کا مرکز براہ راست انسانی زندگی کے بنیادی عناصر ہیں۔ میں کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں کر سکتا کہ یہ افسانے کس حد تک کامیاب ہیں لیکن یہ کوشش ہی کیا کم شاندار ہے، اور اس سے افسانہ نگار کی وسیع ذہنی دلچسپیوں کا پتہ چلتا ہے۔ عزیز احمد صاحب —— اردو کے ان ایک ڈیڑھ افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی افسانہ نگاری بڑی حد تک ان کے علم کے سہارے چلتی ہے۔ وہ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ چونکہ میں اس معاملے میں بالکل کورا ہوں، اس لیے عزیز احمد صاحب سے کم سے کم یہاں مرعوب ہوں۔ اپنی اس واقفیت سے انہوں نے ان دو افسانوں میں خوب کام لیا ہے، بلکہ میرا خیال ہے کہ ان افسانوں کی ہیئت پر بھی ازمنہ وسطیٰ کی "سائیکلز" اور "ٹیپنچوریز" کا اثر نظر آتا ہے۔ اگر "زریں تاج" لکھنے کے بعد بھی وہ کہیں کہ مجھے لکھنا نہیں آتا تو یہ شکایت بے جا ہے۔ اس افسانے کے طرز تحریر میں انہوں نے فارسی غزل کی تر و تازگی، نکھار، رنگینی اور شیرینی نچوڑ لی ہے۔ یہ کام بھی فی زمانہ صرف انہی کے بس کا تھا۔ ان کا ناول "ایسی پستی ایسی بلندی" بھی ایک نیا تجربہ ہے، لیکن میں اس کے بارے میں کہیں اور لکھ چکا ہوں اس لیے یہاں انہی باتوں کو کیا دہراؤں!

ایک نیا تجربہ ممتاز شیریں صاحبہ نے کیا ہے۔ میں تو سمجھتا کہ ان کا ایک انداز بن گیا ہے اور وہ اس سے باہر نکل ہی نہیں سکتیں، لیکن جب ان کا افسانہ "دیپک راگ" دیکھا تو حیرت ہوئی کہ وہ اتنا تنوع بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ ایک طرح سے ان کا تجربہ بھی عزیز احمد کے بعض تجربوں سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی وہ بھی ایک "تصور" لے کر چلی ہیں اور اس کو مختلف شکلیں اخذ کرتے ہوئے دکھایا ہے، بعض شکلیں ایک دوسرے کے متوازی ہیں، بعض متضاد ہیں، لیکن ممتاز شیریں اپنے زمانے کی حدود سے باہر نہیں نکلتیں، بہرصورت انہوں نے "کاؤنٹر پوائنٹ" والی ترکیب کو خاصی کامیابی سے استعمال کیا ہے، بعض لوگوں کو اس افسانے پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں وہ کہیں کہیں بہت جذباتی ہوگئی ہیں، مگر یہ اعتراض قطعاً غلط ہے۔ شیریں صاحبہ نے ہر حصے میں موقع کی مناسبت سے اپنا اندازِ تحریر بدلا ہے۔ اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب انہیں اردو پر پہلے کی نسبت بہت زیادہ قدرت حاصل ہوگئی ہے اور وہ نثر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا سیکھ گئی ہیں۔ اس افسانے کی نثر اتنی رواں اور جاندار ہے کہ پہلے پہل تو مجھے یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ یہ افسانہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک دم سے اتنی ترقی کی ہے کہ تعجب ہونا ہی چاہیے تھا، لیکن انہوں نے آزادی رائے کے متعلق جو مضمون لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترقی اتفاقیہ چیز نہیں تھی، بلکہ مستقل ہے۔

احمد علی صاحب نے پچھلے ڈھائی تین سال میں کچھ لکھا ہی نہیں، لیکن ان کا ذکر اس وجہ سے ضروری ہے کہ انہوں نے جو تجربہ کیا ہے، ایک معنی میں کوئی اردو افسانہ نگار اس سے آگے پہنچا ہی نہیں ہے۔ کافکا کا تتبع ایک طرح جوئس کی پیروی سے بھی دشوار ہے۔ یہاں خالی علم یا مہارت یا جدت پسندی سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے ایک خاص قسم کے مزاج کی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کافکا کی کتابیں اردو لکھنے والوں نے اول تو پڑھی نہیں، اور جو پڑھی ہیں تو مطلب عام طور سے بالکل غلط سمجھا ہے۔ کافکا کی کتابوں سے خود مصنف کی نفسیاتی الجھنوں کے بارے میں جو چاہے رائے قائم کر لیجیے، مگر یہ سمجھنا کہ وہ اپنے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کافکا کی توہین ہے، اس کی کرب انگیز تفتیش کا مرکز یہ مسئلہ ہے کہ کہ پوری کائنات اور زندگی کی طاقتوں کے مقابلے میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ اسی تشویش کا نتیجہ ہے کہ اس کے ناولوں میں ہر معمولی سے معمولی چیز اور چھوٹے سے چھوٹا فعل پر اسرار اور ہیبت ناک بن گیا ہے۔ احمد علی

صاحب نے اسی بات سے اثر لیا ہے اور افسانے "موت سے پہلے" میں یہی اثر پیدا کرنا چاہا ہے۔ یہ افسانہ میں نے بہت دن ہوئے پڑھا تھا، اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ افسانہ کامیاب ہے یا نہیں۔ مگر مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ اس میں کافکا کا لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کافکا کی قسم کا کامیاب ناول صرف وہی آدمی لکھ سکتا ہے جو ذہنی اعتبار سے اتنا ہی مریض ہو۔ اگر احمد علی اس افسانے میں ناکام رہے ہوں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بہرصورت اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے کافکا کے مرکزی احساس کو اپنانا چاہا ہے اور ایک آفاق گیر لگن کو تجسم دینے کی کوشش کی ہے۔ احمد علی صاحب کافکا کے برابر حساس نہ سہی مگر وہ اس قسم کے احساس سے بالکل بیگانہ بھی نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے انگریزی ناول "شام دہلی" سے ہوتا ہے، ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ ناول اچھا نہ لگتا ہو، لیکن میرے دماغ پر تو یہ ناول بری طرح مسلط ہے، اور جب کبھی مجھے یاد آتا ہے تو اس طرح جیسے کسی کو اپنی ذاتی زندگی کا کوئی المناک تجربہ یاد آتا ہے۔ ویسے تو اس ناول میں نہ کوئی خاص قصہ ہے نہ کچھ، مصنف نے غیر ملک والوں کو دہلی کی تہذیب کے آخری زمانے سے روشناس کرانا چاہا ہے لیکن احمد علی صاحب کے فنی احساس نے ان کے مقصد پر فتح پائی ہے۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے تاثر بکھرا بکھرا نہیں رہتا، بلکہ مرتکز اور شدید ہوتا چلا جاتا ہے اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو ہم کسی ایک آدمی یا ایک شہر کے افسوسناک انجام سے دوچار ہونے کے بجائے بذات خود زندگی کے روبرو کھڑے یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے، کدھر سے آئی ہے، کہاں جا رہی ہے، اور اس کے معنی کیا ہیں۔ اس ناول میں احمد علی صاحب نے چھوٹی چھوٹی چیزوں اور واقعات کو ایک علامتی وجود عطا کر دیا ہے جن کا اثر مجموعی تاثر پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انہوں نے کافکا کی پیروی کرنی چاہی، مگر یہ بات میں پھر کہوں گا کہ کافکا کے رنگ میں صرف وہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے جو خود ذہنی مریض ہو۔

یزدانی ملک صاحب نے کوئی ہیت کا تجربہ تو نہیں کیا، مگر انہوں نے افسانے کے موضوع میں ضرور وسعت پیدا کی ہے۔ انہوں نے اردو میں پہلی بار ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں دیہات کے پنجابی مسلمان صحیح معنوں میں نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں کے بارے میں بھی میں کہیں اور لکھ چکا ہوں۔ اب تو انتظار یہ ہے کہ خود ملک صاحب اور دوسرے پنجابی ادیب بھی اس رنگ میں لکھیں، بلکہ پاکستان کے اور صوبوں میں بھی اس قسم کا اردو

ادب پیدا ہو۔

تنقیدی مضمون تو اس زمانے میں لکھے ہی بہت کم گئے ہیں، تنقیدی تجربے تو کیا ہوتے، البتہ عزیز احمد صاحب نے اقبال کے کلام کو ایک بالکل نئے انداز سے پڑھنا اور پیش کرنا شروع کیا ہے اور اقبال کی تنقید میں نئی راہیں کھولی ہیں۔ قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی نے میراجی کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں، وہ تنقیدی تو نہیں ہیں اور نہ انہیں تجربہ کہا جاسکتا ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ عصمت چغتائی کے مضمون "دوزخی" کے بعد اس انداز کے مضمون اب آئے ہیں۔ ان مضمونوں میں ذاتی طور سے مجھے قیوم صاحب کا مضمون سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ انہوں نے اثر انگیزی کی مطلق کوشش نہیں کی، صاف اور سیدھے انداز میں لکھا ہے۔ سلیم احمد صاحب کا مضمون "زندگی ادب میں" ضرور ایک تجربہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے چند ایسے رجحانات کا پتہ چلتا ہے جو ادیبوں کی تازہ ترین نسل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک رجحان یہ ہے کہ لکھنے والے کو اپنے مضمون کے معنی خود بھی معلوم ہوں اور پڑھنے والے بھی سمجھ سکیں۔

نظم میں تو تجربے بند ہی ہو گئے۔ ادھر کسی نے کامیاب نظمیں لکھی ہیں تو مختار صدیقی صاحب نے، باقی سب خیر سلا ہے۔ سنا ہے کہ انہوں نے میر کے رنگ میں بڑی اچھی غزلیں کہی ہیں، مگر غالباً وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ قیوم نظر صاحب اور یوسف ظفر صاحب تو نظم کے بجائے اب غزل کی طرف زیادہ مائل ہیں، اور غزل میں بھی انہوں نے پرانے استادوں کی پیروی میں زیادہ دسترس حاصل کی ہے یہاں تک کہ اگر نام بتائے بغیر شعر سنایا جائے تو آپ کبھی کہہ ہی نہیں سکتے کہ کسی نئے شاعر کا شعر ہے۔ جو نوجوان غزل گو اُبھرتے آ رہے ہیں، ان میں سے ناصر کاظمی اور سلیم احمد کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں، ایک تیسرے صاحب ہیں اختر ہوشیار پوری یوں تو مدت سے لکھتے ہیں، لیکن اب نظم چھوڑ کر غزل کی طرف آ رہے ہیں پہلے تو ان کی غزلوں پر بھی نظم غالب رہتی تھی لیکن اب غزل کا رنگ نکھرتا آ رہا ہے۔ تین شعر آپ بھی سنئے ؎

ہمیں نے جب نہ سمجھا عاشقی کو
تمہاری بے وفائی کا گلہ کیا

یہ سب ہیں اتفاقاتِ زمانہ
وگرنہ تم کہاں، میں کیا، وفا کیا

ہمیں فرصت نہ تھی اپنے ہی غم سے
تمہارا حال کوئی پوچھتا کیا

حفیظ ہوشیار پوری صاحب کا نام میں نے جان بوجھ کے نہیں لیا کیونکہ وہ تو شروع ہی سے غزل کے رسیا ہیں۔ ان کا رنگ تو پہلے ہی ظاہر ہوچکا تھا البتہ اس دوران میں انہوں نے اپنے رنگ کو نکھارا اور سنوارا ہے، اور غالباً یہ کوئی مبالغے کی بات نہیں ہوگی کہ اس وقت حفیظ ہوشیار پوری صاحب پاکستان کے بہترین غزل گو ہیں اور ہندوستان میں بھی اب حسرت موہانی تو غزل کہتے ہی نہیں، فراق صاحب کو الگ کردیں تو حفیظ صاحب کے مقابلے کا غزل گو کون سا ہے؟

(جنوری ۱۹۵۰ء)

غالب کی انفرادیت

ملکی اور قومی سرحدوں کے پار خیالات کی آمدو رفت کے بعض ایسے طریقے بھی ہیں۔ جن کی توجیہہ نہ تو معاشیات کی مدد سے ہو سکتی ہے نہ اجتماعیات کی رو سے نہ نفسیات کے ذریعے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں اخبار اور کتابیں آتی جاتی ہوں، دونوں جگہ کے باشندے ایک دوسرے سے مل کر زندگی کے اہم ترین مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے ہوں اور پھر ایک جگہ کے خیالات دوسری جگہ جا پہنچیں تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن بعض دفعہ ایسی عجوبے بھی ظہور میں آتے ہیں کہ آمدورفت کی آسانیاں نہیں، ایک ملک کی زبان دوسرے ملک میں سمجھی نہیں جاتی، دونوں جگہ کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو تبادلہ خیالات کے لیے نہیں بلکہ زندگی کی اور مجبوریوں کی وجہ سے لیکن اس کے باوجود بعض بنیادی خیالات دونوں جگہ بیک وقت پیدا ہو جاتے ہیں، ممکن ہے کہ روح عصر کوئی پراسرار اور زبردست قوت ہو اور اس کے عمل کے طریقے بھی پراسرار ہوں۔ بہرصورت یہ باتیں ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ خیر اب اس کے عمل کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ انیسویں صدی میں مغربی فلسفے اور ادب میں رومانی تحریک اور انفرادیت پرستانہ رجحانات مخصوص سیاسی، سماجی، معاشی اور فکری کیفیات کے ماتحت اور ان کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئے۔ ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجیے کہ ایک مخصوص سیاسی اور معاشی نظام اس عالم انتشار میں تھا لیکن جن محرکات سے یورپ کی رومانی تحریک پیدا ہوئی، ان میں سے بیشتر ہمارے ہاں موجود نہیں تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یورپ میں اتنی شدید انفرادیت پرستی کی وبا روسو کے زیر اثر پھیلی۔ اگر ہم اسے درست مان بھی لیں تب بھی بتایئے کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ہمارے یہاں کس نے روسو کا فلسفہ پڑھا تھا جو کوئی اس سے متاثر ہوتا؟ لیکن اس کے باوجود یہ بڑی عجیب حقیقت ہے کہ

یورپ کے رومانی شاعروں کے کئی مخصوص اور بنیادی خیالات، جذبات اور احساسات ہمیں حرف بحرف غالب کے ہاں ملتے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں غالب کے کلام سے اندرونی شہادت طلب کرنے سے پہلے اس بات پر غور فرمایئے کہ جب ہمارے ہاں انگریزی تعلیم پھیلی اور ہم انگریزی ادب کی اقدار کو عالمگیری ادبی اقدار سمجھنے لگے تو پہلے تو ہم میں سے بہت سے مغرب زدہ لوگوں کا رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے اردو شاعری کو شاعری سمجھنا ہی چھوڑ دیا۔ دراصل اس طبقے نے پورا انگریزی ادب بھی نہیں پڑھا تھا۔ بس لے دے کے ان لوگوں کا شعری تجربہ رومانی شاعروں تک محدود تھا۔ پھر دوسرا دور وہ آیا کہ جب اس طبقے نے رومانی شاعری کی اقدار کو خضر راہ بنا کر اردو شاعری میں بھی دو چار اچھائی کے پہلو ڈھونڈنے چاہے، چنانچہ اس جستجو میں انہیں سب سے پہلے ایک غالب ایسا ملا جس میں انہیں کچھ شاعری کی بُو باس معلوم ہوئی۔ ہمارے انگریزی داں طبقے نے جس کی ذہنی تربیت رومانی ادب کے ذریعے ہوئی تھی اگر غالب کو شاعر کی حیثیت سے پہچان لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رومانی شاعروں کے یہاں اور غالب کے یہاں کوئی قدر مشترک ضروری تھی، اور غالب کے کلام میں چند ایسے خصائص موجود تھے جن کا یہ طبقہ رومانی شاعری پڑھ پڑھ کر عادی ہو چکا تھا۔ اسی مماثلت کی وجہ سے بیسویں صدی میں ہمارے یہاں غالب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھا گیا۔ اس مماثلت کی تفصیلات بتانے کا تو خیر یہ کوئی موقع نہیں ہے، میں تو صرف جتنا چاہتا ہوں کہ یہ مماثلت ایک روحانی معمہ ہے۔ آپ چاہیں تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دیں لیں کہ ایک مخصوص سماجی اور معاشی نظام کے انحطاط نے یورپ میں رومانی تحریک پیدا کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مشرق کی زندگی کسی نہ کسی پیمانے پر کئی دفعہ سماجی انتشار کا شکار بن چکی ہو گی، مگر غالب سے پہلے اس قسم کے مخصوص رجحانات کسی اور شاعر میں کیوں نہ پیدا ہوئے؟ دوسرے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس زمانے میں غالب نے شاعری کی ہے، اس وقت تک ہماری معاشرت میں اندرونی طور پر جاگیردارانہ نظام اور صنعتی نظام کا تصادم شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ گتھی کسی مادی نظریے سے نہیں سلجھ سکتی۔ آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسی ناقابلِ تعریف قوت کے کرشمے ہیں جسے ہم اپنی آسانی کے لیے روحِ عصر کہہ لیتے ہیں۔ یہ بے تار برقی کا سلسلہ بڑے شاعروں اور مفکروں کے درمیان جاری رہتا ہے۔ یا پھر یوں کہیے کہ بڑا شاعر اتنی بڑی روح کا مالک ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری نسل انسانی کی مجموعی کیفیت کا احاطہ کر سکتا

ہے۔ اگر غالب میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو انہیں بڑا بنانے کے لیے یہی بات کیا کم تھی کہ انھوں نے اپنے زمانے اور اپنے بعد کے سو سال تک والے زمانے کے اہم ترین اور غالب ترین روحانی عناصر کو اپنے اندر محبوس کر لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ انہیں محسوس کرنے کے بعد ان کی شعری تجسم اور تشکیل بھی کی۔ اچھا ان عالمگیر عوامل کی تفتیش سے کنارہ کش ہو کر آیئے اب غالب کو شاعر کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کا مطلب بڑی حد تک یہ ہو گا کہ ہم ان کی انفرادیت پرستی کی نوعیت سمجھنے کی فکر کریں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ غالب کا زمانہ سماجی انتشار کا زمانہ تھا۔ لیکن ایسے زمانے میں انفرادیت پرستی کی ایک شکل اور غالباً سب سے آسان اور سستی شکل یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ آدمی صرف اپنی خواہشات کی تکمیل سے مطلب رکھے، اسے اور کسی بات سے غرض نہ ہو اور یہ بھی لازمی نہیں کہ ایسی شاعری لامحالہ مکروہ اور ناخوشگوار رہی ہے۔ اس قسم کی شاعری بڑی نہ سہی تو کم سے کم دلچسپ اور قابل مطالعہ تو ہو ہی سکتی ہے۔ اس ضمن میں ایک حد تک داغ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دوسری شکل انفرادیت پرستی کی یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی خواہش پرستی نہ کرے بلکہ اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا مطالعہ کرتا رہے، یہ پہلو تھوڑا بہت غالب کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، مگر اصل میں یہ رنگ مومن کا ہے، غالب چونکہ مومن سے بڑے شاعر تھے؛ اس لیے وہ اور آگے جاتے ہیں۔ اپنی کیفیات پر غور و خوض اور ان کا تجزیہ تو خیر وہ کرتے ہی ہیں، لیکن ان میں یہ بات زائد ہے کہ وہ عموماً تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کیفیات سے کیف و سرور بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اس کیف اندوزی کا اثر اپنے شعر میں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بار بار اپنی انفرادی شخصیت کو پوری اجتماعی زندگی بلکہ پوری کائنات سے ٹکرا ٹکرا کر دیکھتے ہیں خواہ نتیجہ کچھ بھی برآمد ہو کبھی تو اس تصادم کے خیال سے ان میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے کہ وہ کہنے لگتے ہیں ؂

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

اور کبھی وہ اپنے آپ کو صرف اپنی شکست کی آواز محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں مومن شاذ و نادر ہی پہنچتے ہیں۔ غالب اپنی روحانی کاوش میں مومن سے آگے جاتے ہیں۔ مومن کو یہ فکر زیادہ نہیں ستاتی کہ جس شخصیت کی کیفیات میرے زیر مطالعہ ہیں، آخر اس کی کائنات میں حیثیت کیا ہے۔ اس کے برخلاف غالب کو ہر قدم پر

یہی فکر کھائے جاتی ہے خواہ وہ ظاہر میں اثبات خودی کر رہے ہوں یا نفی خودی۔ سچ پوچھئے تو یہ مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے کہ بڑا شاعر کیسا ہوتا ہے، لیکن چونکہ انسان کا سب سے اہم مسئلہ بقا کا ہے، اس لیے جو شاعر انسانی زندگی کے سب سے بنیادی سوالوں سے الجھ رہا ہو، اس میں ہم بڑائی کے آثار دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اسی بنا پر ہمیں غالب بڑا شاعر نظر آتا ہے۔ اب غالب کی انفرادیت پرستی کا ایک اور پہلو ملاحظہ فرمائیے۔ انفرادیت پرستی کو بعض دفعہ داخلیت پسندی کے ہم معنی بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہنا تو تحصیل حاصل ہوگا کہ غالب کے یہاں داخلیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غالباً میر اور اقبال کے علاوہ ہر اردو شاعر سے زیادہ ہے۔ میں نے یہاں میر کا جو نام لے دیا ہے، اس سے شاید آپ متفق نہ ہوں لیکن کم سے کم مجھے تسلیم کرنے میں عذر ہے کہ میر کے اس شعر میں غالب کے کسی شعر سے کم داخلیت ہے ۔

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

خیر صاحب اس بیش و کم کے قصے کو چھوڑیے، بات مجھے صرف اتنی کہنی ہے کہ غالب کی داخلیت کو سمجھنے کے لیے بھی یہ لازمی ہوگا کہ آپ غالب کی داخلیت کا مقابلہ میر کی داخلیت سے کر کے دیکھیں۔ میر کی داخلیت میں آپ ایک ہمہ گیر کیفیت پائیں گے۔ وہ اپنی داخلیت کو عام انسانی زندگی کی داخلیت کے ساتھ یک جان کر دینا چاہتے ہیں۔ غالب کے یہاں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ممکن ہے وہ حیات محض سے ہم آہنگ ہونا چاہتے ہوں، مگر اپنی داخلیت میں عام انسانی زندگی کی پرچھائیں تک دیکھنا انہیں گوارا نہیں۔ میر عام زندگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہیں۔ غالب اسے اپنے اندر سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز انہیں ایک کھوٹ، ایک ملاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر لیجئے جو شاید غالب کا لطیف ترین اور پاکیزہ ترین شعر ہے ۔

تُو اور آرائش خم کاکُل
مَیں اور اندیشہ ہائے دور دراز

یعنی غالب روحانی بلندی کا صرف ایک ہی طرح تصور کر سکتے ہیں کہ تعینات کو نیچے چھوڑ کر اوپر اٹھیں۔ میر انہی تعینات میں رہ کر اور ان تعینات کی تہ میں جا کر وہ روحانی درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی داخلیت کے اس پہلو کو اور وضاحت سے سمجھنا چاہیں تو ایک ٹھوس اور موٹی سی مثال لیجئے، یعنی یہ دیکھیے کہ غالب روتے کس طرح ہیں۔ ایک طرح تو واقعی رونا دھونا ذرا نامناسب سی بات ہے مگر اس کا بھی زندگی میں ایک مقام ہے وہ کہا ہے نافراق نے ؎

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو
اے اہل دل یہ کارِ عبث بھی کیے چلو

رونا صرف ایک انفرادی فعل نہیں ہے، صرف تکلیف کا بے ساختہ اظہار نہیں ہے، اس کی ایک سماجی حیثیت ہے۔ جب آدمی روتا ہے تو وہ اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ دوسرے انسان میری تکلیف کے اظہار کو سمجھ سکیں گے اور مجھے ہمدردی حاصل ہو سکے گی۔ آنسو اجتماعیت پر اعتماد کی دلیل ہیں، مگر غالب اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں جب انسان کے اندر سے یہ اعتماد زائل ہو رہا تھا، چنانچہ اردو میں غالب ایک ایسے شاعر ہیں جو رونا جانتے ہی نہیں۔ غالب نے جب کبھی رونے کا مضمون باندھا ہے تو محض خانہ پری کے لیے وہ رونے سے اس طرح بچتے ہیں جیسے اس حرکت سے ان کی خودی کو ٹھیس لگتی ہو۔ انھوں نے رونے کے متعلق جو شعر قافیہ پیمائی کے سلسلے میں کہے ہیں، ان میں آپ ایک خصوصیت پائیں گے میر جب رونے کا ذکر کرتے ہیں تو ایک پورا انسانی ڈراما نظروں کے سامنے آتا ہے۔ ان کے رونے کو دیکھنے والے بھی موجود ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں پر ان کے رونے کا کچھ نہ کچھ ردِ عمل بھی ہوتا ہے مثلاً ؎

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

غالب بالکل تن تنہا روتے ہیں۔ ان کے رونے کا انسانوں پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا، ویسے چاہے عناصر زیر و زبر ہو جائیں۔

یہ باتیں کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی نقص نکالنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد غالب کی شاعری کی نوعیت واضح کرنا ہے، ہم ایک رویے کو دوسرے رویے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے، لیکن اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے کلام میں یہ خصائص اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ روح عصر نے انہیں اپنی ترجمانی کے لیے چھانٹا تھا اور وہ اردو کے پہلے بڑے شاعر تھے جنہیں روحِ عصر نے اس طرح چھانٹا اور یہ درحقیقت ایک شاعر کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

(مارچ ۱۹۵۰ء)

نظریۂ افادیت اور ادب

پچھلی دفعہ کے "ساقی" میں سلیم احمد صاحب نے ایک مضمون ادیب کی ذمہ داریوں کے متعلق لکھا تھا، وہ پڑھنے میں آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سلیم احمد صاحب کو اتنا سنجیدہ، سلجھا ہوا اور ضروری مضمون لکھنے پر داد دوں یا اُنہیں کوسوں کہ انہوں نے میرے خیالات کا سلسلہ منتشر کر دیا۔ اس دفعہ میں نے ایک ایسا موضوع چھانٹا تھا جس پر لکھنا میرے بس میں ہو یا نہ ہو، پڑھنے والوں پر رعب تو پڑتا ہی۔ اس کے علاوہ مَیں نے اُس چیز کا بھی اچھا خاصا بندوبست کر لیا تھا جو میری تحریروں کی جان ہے، یعنی ایسے اجنبی ناموں کی فہرست جنہیں پڑھا نہ جا سکے۔ یہ سب ضروری مراحل طے کر چکا تھا کہ سلیم صاحب کا مضمون دیکھا۔ سلیم صاحب نے اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بات بڑی کام کی کہی ہے جس کا موجودہ ادبی ماحول سے گہرا تعلق ہے، مگر انہوں نے اس ضمن میں دو ایک جملے کہے اور آگے نکل گئے۔ چند باتوں سے اُنہوں نے ایک خاص نتیجہ نکالا۔ اس نتیجہ سے چند اور نتائج بر آمد ہوتے ہیں جن پر سلیم صاحب عجلت میں بحث کرنا بھول گئے۔ یہ کام مجبوراً مجھے کرنا پڑ رہا ہے، چنانچہ ان چند صفحوں کو سلیم صاحب کے مضمون کا ضمیمہ سمجھیے۔

حالی کی ذہنی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے سلیم صاحب نے بتایا ہے کہ غدر کے بعد مسلمان قوم کو جن حالات سے دو چار ہونا پڑا، ان سے نمٹنے کے لیے شاعری بڑی کمزور اور حقیر سی چیز نظر آتی تھی اور معاشرہ شاعری کو کوئی حیات بخش قوت سمجھنے سے معذور ہوتا جا رہا تھا، چنانچہ حالی نے بھی شاعری کو بے کار سمجھ کر اسے ترک کرنا چاہا، مگر اپنی طبیعت سے بھی مجبور تھے اور شاعری سے بالکل قطع تعلق بھی نہیں کر سکتے تھے، اس وجہ سے ان کے اندر ایک عجیب کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ اسی کشمکش سے افادی شاعری پیدا ہوئی۔ بالکل اسی قسم کی کشمکش اور اسی قسم کے نتائج سلیم صاحب نے اقبال کے یہاں دکھائے ہیں اور ان

دونوں کے مقابلے میں انہوں نے ترقی پسندوں کو رکھا ہے۔ حالی اور اقبال کے یہاں ادب برائے زندگی کا نظریہ ایک اندرونی کشمکش کے ذریعے پیدا ہوا۔ ترقی پسندوں کے اندر اس نوعیت کی کوئی کشمکش نہیں ہوئی، انہیں یہ نظریہ گھڑا گھڑایا مل گیا (خواہ حالی اور اقبال سے خواہ مغرب سے) سلیم صاحب نے یہ ایک بنیادی اور نہایت ضروری فرق نکالا ہے مگر اس بات پر جتنا زور دینا چاہیے تھا اتنا نہیں دیا، حالانکہ اس نازک فرق سے ادیب کی مخصوص ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔

ادیب کی کمر پر جتنی بھی ذمہ داریاں لادی جائیں، ان سے مجھے فی الحال بحث نہیں ہے۔ یہ ذمہ داریاں ادیب کے لیے مفید ہوتی ہیں یا مضر، ادیب انہیں خوشی خوشی برداشت کرتا ہے یا رو رو کر، ان سب باتوں کا انحصار خاص حالات پر ہے لیکن ادیب کی سب سے بنیادی اور لازمی ذمہ داری ایک ہے جسے چھوڑ کر وہ ادیب رہ ہی نہیں سکتا، اور وہ ادب پیدا کرنا۔ حالی اور اقبال کی اہمیت ہمارے لیے اسی وجہ سے ہے، اور اسی لیے ہم ان کی بات غور سے سنتے ہیں کہ انہوں نے ادب پیدا کر کے دکھایا۔ ان کے نظریے ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے اور بعض اوقات ہم سب کے لیے اسی وجہ سے قابل قبول اور وزنی بن جاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا ادب پیدا کر کے دکھایا ہے جو کسی نہ کسی حد تک ان کے پیش کردہ معیار پر پورا اترتا ہے۔

ان دونوں کے مقابلے میں ہمیں ایسے ادیب نظر آتے ہیں جو ان کی طرح افادی ادب کا نظریہ پیش کرتے ہیں مگر فی الجملہ ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ عام طور سے تو یہ حضرات اس قسم کا ادب بھی پیدا نہیں کر سکتے جو ادب ہو یا نہ ہو مگر ان کے غیر ادبی مقاصد تو پورے کر دے۔

فی الحال میں افادی ادب یا ادب برائے زندگی والے رویے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں (چلتے چلتے ایک بامعنی لطیفہ ضرور سنا دوں۔ میرے ایک گمنام کرم فرما نے اپنے خط میں افادی ادب کے مروجہ نظریے کی وضاحت یوں کی: "کہ ادب برائے زندگی اور زندگی برائے مسلم دشمنی")۔ میں تو یہاں صرف اتنی بات دکھا رہا ہوں کہ افادی ادب کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے حالی اور اقبال نے ادب پیدا کر لیا، مگر ترقی پسند بالکل شروع کی تخلیقی اُمنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ادب پیدا کر نہیں سکے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کو تخلیقی صلاحیتوں کے فرق کی آڑ لے کر گول نہیں کیا جا سکتا۔

حالی اور اقبال کے اندر سب سے پہلے اور سب سے بنیادی طور پر ادب تخلیق کرنے کی خواہش اپنا کام کر رہی تھی، مگر اس زمانے میں تخلیقی کام مختلف وجوہات کی بنا پر بے وقعت سی چیز معلوم ہوتا ہے؟ چنانچہ ان کے اندر دو قوتوں کا تصادم ہوا۔ ایک طرف تخلیق کرنے کی خواہش تھی، دوسری طرف تخلیق نہ کرنے کی خواہش جب دو نفسیاتی قوتیں ٹکراتی ہیں تو سو فیصد جیت یا ہار تو کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ ایک قوت نسبتاً غالب آ جاتی ہے اور دونوں میں کوئی سمجھوتے کی صورت نکل آتی ہے۔ حالی اور اقبال میں چونکہ تخلیق کرنے کی خواہش بہت طاقت ور تھی اس لیے افادی ادب کے نظریے کی شکل میں ایک سمجھوتا سا ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے بغیر ان کا تخلیقی کام ناممکن تھا۔ اس نظریے کے سہارے انہوں نے اپنا ادب تخلیق کر لیا۔ یہ کشمکش ان دونوں میں عمر بھر جاری رہی۔ حالی سے متعلق شہادت تو سلیم صاحب نے پیش کر ہی دی ہے۔ اقبال کے بارے میں اس سے بہتر شہادت کیا ہوگی کہ انہیں آخر تک ابلیس کی بے پناہ دل کشی سے نجات نہ ملی۔ ابلیس کا ذکر کر کے میں اس کی زیادہ پُرلطف خوبیوں کی طرف توجہ دلانا نہیں چاہتا۔ ابلیس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اور یہ صرف و محض افادیت پرستانہ جذبہ نہیں ہے، بعض اوقات اس سے زیادہ غیر افادیت پرستانہ خواہش کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ پال ویلری نے اپنی مشہور نظم میں ابلیس کو سانپ کی شکل میں ابد آلا باد تک دانتوں سے اپنی دم چبانے میں مصروف دکھایا ہے۔ علم خصوصاً تخلیق کا راز حاصل کرنے کی خواہش کا تصور کچھ اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیر، تو کہنا یہ تھا کہ اقبال کو آخر تک غیر افادی چیزوں کی کشش سے چھٹکارا نہ ملا اور ان کے اندر وہ کشمکش جاری رہی۔

حالی اور اقبال کے برخلاف ترقی پسندوں کے یہاں ہمیں یہ دونوں قوتیں اس طرح متصادم نظر نہیں آتیں۔ بلوغت کے قریب پہنچ کر تو ہر آدمی ہی چار مہینے کے لیے شاعر ہو جاتا ہے، اس زمانے کو تو جانے دیجیے، ورنہ ترقی پسندوں کے یہاں کوئی قوی تخلیقی جذبہ نہیں ملتا۔ حالی اور اقبال کے یہاں بنیادی خواہش یہ تھی کہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کیا جائے۔ دیکھئے صاحب، غلط فہمی سے بچتے رہیے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا بُری بات ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تخلیق کرنا اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا دو متضاد باتیں ہیں، البتہ ذہنی تحریکات اور عوامل کو سمجھنا ہو تو انہیں ایک دوسرے سے نوعیت کے اعتبار سے الگ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس لحاظ سے تخلیق کی خواہش اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی خواہش دو الگ الگ باتیں ہیں۔ حالی اور اقبال تخلیق کرنا چاہتے تھے، انہوں نے تخلیق کی۔ ان کی تخلیق نے جو صورت اختیار کی، اس کا تعین ایک حد تک ان کے نظریے نے کیا۔ ترقی پسند تخلیق کرنا ہی نہیں چاہتے تھے، انہوں نے تخلیق نہیں کی۔ بنی نوع انسان کی خدمت کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا تھا، وہ ان کے لیے موزوں نہیں تھا اس لیے وہ بنی نوع انسان کی صحیح خدمت بھی نہ کر سکے۔

تو بات یہ معلوم ہوئی کہ جہاں تک فن کار کا تعلق ہے، اس کے لیے سب نظریے اچھے ہیں اور سب نظریے بُرے ہیں جو نظریہ فن کار کے اندر تخلیقی جدوجہد کے ضمن میں پیدا ہو، وہ اس کے لیے کسی نہ کسی حد تک مفید بھی ثابت ہو سکتا ہے اور فن کار کو مکمل خاموشی کا شکار ہو جانے سے بچا سکتا ہے، لیکن جو نظریہ تخلیقی کاوش سے الگ پیدا ہوا ہو اور اس کے باوجود تخلیق کی آخری شکل و صورت کا تعین کرنے پر بھی مصر ہو وہ فن کار کے لیے صرف تباہ کُن ہو گا۔ فن کی غرض و غایت اور نوعیت سے متعلق نظریوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ جہاں تک فن کار کی حیثیت سے فن کار کا تعلق ہے، اس کے لیے اصل چیز تخلیق کی خواہش ہے۔ فن کار اور غیر فن کار کا اصل فرق یہی ہے۔

مگر بد قسمتی سے یہی خواہش ہمارے ادیبوں میں بہت کم رہ گئی ہے۔ ترقی پسندی ایک مخصوص تحریک کی حیثیت سے پاکستان میں ختم تو ضرور ہو گئی ہے، مگر ہمارے ادبی ماحول اور ادیبوں پر عجیب قسم کے اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ادب برائے ادب کے نظریے سے تو عموماً ادیب تک بھڑکتے ہیں۔ یہ نظریہ غلط ہی سہی، مگر اس سے اتنا گھبرانا بھی کیا؟ ادب برائے زندگی کے نظریے کو بھی اب لوگ یک رُخا سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی مطمئن ان دونوں نظریوں سے نہیں ہیں۔ اب کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ دونوں نظریے غیر تسلی بخش اور مبالغہ آمیز ہیں، ان کے بجائے کوئی متوازن نظریہ ڈھونڈنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ادیب تخلیق کرنے کے بجائے اس فکر میں ہیں کہ کوئی ایسا نظریہ مل جائے جس سے تخلیق کا جواز ثابت ہو سکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر نظریہ کون سی ایسی ضروری چیز ہے جس کے بغیر نوالہ نہ ٹوٹے۔ اس قسم کی پریشانی تخلیق کرنے کی ذمہ داری سے بچنے کا ایک بہانہ ہے اور بس۔ یہ ہماری ذہنی اور روحانی کاہلی کی ایک علامت ہے۔ اگر تخلیقی خواہش زوروں پر ہوتی اور پھر نظریے کا سوال پیدا ہوتا تو خیر تسلی کی بات تھی کہ اندرونی تحریک کوئی سہارا ڈھونڈنا چاہتی ہے، لیکن تخلیقی خواہش تو صفر کے برابر ہے اور ہم

لوگ اس طرح نظریے کے انتظار میں بیٹھے ہیں جیسے نظریہ ہاتھ آتے ہی آسمان سے نظمیں اور افسانے برسنے لگیں گے۔ نظریہ نہ ہوا اسم اعظم ہو گیا۔ ہم لوگ تخلیقی کاوش سے تو جان چراتے ہیں، اس کے بدلے پارے کو قائم النار کرنے کا نسخہ پوچھتے پھرتے ہیں۔ ترقی پسندوں سے بدظن ہو جانے کے باوجود ہم بدستور نظریے کو تخلیق کا قائم مقام سمجھ رہے ہیں حالانکہ فن کار کے لیے تخلیق کی قائم مقام تو جنت بھی نہیں ہے۔

اس بات سے مجھے انکار نہیں کہ موجودہ زمانے میں، اور خصوصاً پاکستان میں تخلیقی کام کرنے والوں کو کسی نہ کسی فلسفے یا نظریہ کا سہارا عموماً ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اس بات پر بحث کرنے کے لیے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ یہاں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اس ضرورت کے باوجود تخلیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ صورتِ حال مہلک ہے کہ ان کے دل میں تخلیقی امنگ تو بے جان ہو چکی ہو اور وہ اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں کہ پہلے کوئی متوازن نظریہ دریافت ہو جائے تو ہم اپنا کام شروع کریں۔ خیر، نظریہ بھی ضروری سمجھ لیا جائے تو آخر توازن پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت ہے! "متوازن" نظریے طالب علموں یا زیادہ سے زیادہ نقادوں کے لیے ضروری ہیں۔ تخلیق کرنے والے اگر "متوازن" نظریوں کی مدد سے لکھیں گے تو وہ صرف متوازن یعنی بے جان ادب پیدا کر سکیں گے۔ "متوازن" نظریے کا مطلب صرف اتنا ہے ہ باپ، بیٹے اور گدھے تینوں میں سے کسی کو بھی تکلیف نہ ہو۔ تو ایسے نظریے کی تلاش اور انتظار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ آج کل ایک جاندار تخلیقی تحریک پیدا کرنے میں اگر کوئی چیز معاون ہو سکتی ہے تو نظریات نہیں، بلکہ تخلیق کرنے کی خواہش۔ یہ جملہ کچھ بے ڈھنگا سا تو ضرور ہے مگر ہمارے ادیبوں کی ادبی مشکلات کا حل یہی ہے کہ وہ تخلیق کرنے کی خواہش دل میں رکھنے کی خواہش پیدا کریں۔

یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے، اس کا جواب میں کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا، البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں اس خواہش کو اُبھرنے سے روک رہی ہیں، ہم انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم ان رکاوٹوں سے آگاہ ہو جائیں تو شاید ان میں سے بعض خود بخود ہی رفع ہو جائیں بہرحال، اس مسئلے کو براہِ راست سمجھنا سمجھانا ہمارے ادیبوں کا اہم ادبی فریضہ ہے۔ اپنی جگہ میں بھی تھوڑی بہت کوشش کروں گا کہ اس بحث کو آگے بڑھاؤں مگر یہ بات پیچیدہ ہے کہ جب تک اس کے مختلف اور متضاد پہلو پیش نہیں کیے جائیں گے، ہمارے تخلیقی کام میں کوئی آسانی نہیں پیدا ہوگی۔

(اپریل ۱۹۵۰ء)

افادی ادب

پچھلی دفعہ میں کہہ رہا تھا کہ ادیب کے لیے نظریہ اہم چیز نہیں ہے جتنی تخلیق کرنے کی خواہش۔ ادب برائے ادب کے نظریے میں تو چونکہ براہ راست تخلیق پر زور دیا جاتا ہے، اسی لیے اس نظریے کا پیرو چاہے گھٹیا چیز ہی لکھے مگر اس کی تخلیق کسی نہ کسی حد تک فنی طور پر موثر ضرور ہوگی۔ افادی ادب کے نظریے میں خطرہ یہ ہے کہ بعض دفعہ لکھنے والے کو افادیت ہی افادیت یاد رہ جاتی ہے، اور پھر چونکہ ادب ادب نہ رہے تو افادی ادب بھی نہیں رہتا، اس لیے ایسی تحریروں میں سے افادیت بھی غائب ہو جاتی ہے۔ مثال کے لیے اشتراکی روس کا نوے فیصد ادب موجود ہے۔ یہ مانا کہ آدمی ہنگامی حالات اور ضروریات کے مطابق بھی لکھ لے، لیکن اگر وہ ادیب ہے تو اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ہنگامی صورت ہے کیا۔ اگر لوگوں کے اندر جذبہ عمل بیدار کرنا یا انہیں میدان جنگ کی طرف دوڑانا ہی ٹھہرا تو یہ کام تو بیچ بازار میں کھڑے ہو کے زندہ باد، مردہ باد کے دو چار نعرے لگا دینے سے بھی ہو سکتا ہے۔ ادب کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا کہ ہنگامی حالات کے ماتحت لوگوں کو ہنگامی طور پر عمل کے لیے تیار کر دے۔ ادب کا کام پوری انسانی زندگی کو نظر میں رکھ کر یہ بتانا ہے کہ مخصوص حالات میں ایک خاص قسم کا عمل کیوں ضروری ہے۔ نعرے بھی اپنی جگہ ضروری ہیں، اور لوگوں کو فوراً میدانِ جنگ میں پہنچانا ہو تو شاید ادب سے زیادہ کام کرتے ہیں، لیکن سوال اس وقت کا ہے کہ جب سپاہی اجتماعی شعور سے کٹ کر اپنے انفرادی شعور میں واپس آ گئے ہوں، یعنی مثال کے طور پر جب وہ لڑ نہ رہے ہوں بلکہ دشمن کے انتظار میں مہینے بھر سے ایک خالی جگہ پڑے ہوں۔ تو ایسے وقت ہمیں بندوبست یہ کرنا ہے کہ انہیں اپنا عمل مہمل یا غلط یا فضول نہ معلوم ہونے لگے۔ یہاں صرف سچا ادب ہی ہمارے کام آ سکتا ہے، ایسا ادب جو ہمارے عمل کے مختلف پہلو ہمارے

سامنے لائے اور ہمیں یہ دکھائے (بلکہ دیکھنے دے) کہ اس قسم کا عمل ہمارے لیے کیوں ضروری ہے۔

یہاں کمیونسٹ حضرات یہ اعتراض کریں گے کہ عمل کی ضرورت کے بارے میں شک و شبہ تو صرف انحطاط پذیر طبقوں ہی کے افراد کے دل میں پیدا ہوتا ہے، محنت کش طبقے کو اپنی راہ عمل صاف نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات جوش میں آ کے یہی بات "سچے مسلمانوں" کے بارے میں بھی کہہ دیں، لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا عمل موثر بھی ہو، اور کئی سطحوں پر موثر ہو تو انسانی نفسیات کی پیچیدگی سے آنکھیں چرانا کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہے۔

جو بات میں کہہ رہا ہوں، اسے واضح کرنے کے لیے اچھے افادی ادب کی ایک مثال پیش کروں گا۔ جنگ کے زمانے میں لوگوں کو عمل کی ترغیب دینے کے لیے روس میں بھی بہت کچھ لکھا گیا اور فرانس میں بھی روس کے بیشتر افسانوں میں تو بس بہادر لوگ ہی دکھائے جاتے تھے جو ملک کی محبت سے بے تاب ہو کر بے دھڑک میدان میں کود پڑے۔ ممکن ہے اس زمانے میں ان چیزوں کا خاطر خواہ فائدہ ہوا ہو، لیکن اب تو سنا ہے کہ روس میں بھی ایسی کتابیں لوگ خرید کے رکھ تو لیتے ہیں، مگر پڑھتے نہیں یوں، نعرے تو فرانس میں بھی لگائے گئے ہوں گے، اور ان کی ضرورت بھی تھی، لیکن فرانس میں ہنگامی ضروریات کے تحت دو ایک چیزیں ایسی بھی ہو گئی ہیں جو بہت زبردست ادب نہ ہوں مگر جن کی اہمیت آج جنگ کے پانچ سال بعد بھی باقی ہے اور عمل جب بھی معرض بحث میں آئے، ان چیزوں سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی ادیبوں نے صرف یہ نہیں کہا کہ بڑھے چلو، انہوں نے دکھایا ہے کہ چلنا کیوں ضروری ہے۔

مثال کے طور پر میں سموں دبودوار کی کتاب "دوسروں کا خون" پیش کروں گا۔ یہاں یہ بتا دینا لازمی ہے کہ روسی نقادوں نے بندروں اور بھیڑیوں کی جو فہرست بنا رکھی ہے، اس میں محترمہ کا نام بھی شامل ہے۔ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ بھی اینگلو امریکن بلاک کی ایجنٹ، سرمایہ داروں کی زر خرید، عوام کی دشمن وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فلسفہ زیست کے مبلغوں میں سے بھی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ انسان اور زندگی کے دشمن ہیں، مایوسی اور بیزاری پھیلاتے ہیں اور موت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ خیر، اب یہ آپ خود دیکھ لیں گے کہ ان کی دعوت کس چیز کے لیے

ہے۔

اس ناول میں مصنف نے عمل کی سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، غرض ہر اہم مسئلے پر بحث کی ہے۔ یہ ناول ایسے زمانے میں لکھا گیا تھا جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ تھا، اور اس ناول کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو مدافعت پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن انہوں نے ایسے کردار نہیں چنے جو غم و غصہ کے مارے کھول رہے ہوں اور جرمنوں کو تہس نہس کر دینے پر تلے بیٹھے ہوں۔ ان کے تقریباً سارے ہی کردار ایسے ہیں جو مختلف وجوہات سے اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتے۔ ایک مصور ہیں مارسل صاحب جو زندگی سے بیزار ہیں، ہر چیز کو مہمل سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کسی بات کو بھی منطقی اور اخلاقی اعتبار سے جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ناول کی ہیروئن ہیلن ہے جو ذاتی زندگی کی تسکین اور تکمیل کو سب سے بڑی چیز سمجھتی ہے۔ ہیرو ژاں بلومار ہے جس کے دل میں طرح طرح کے اخلاقی وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بے ایمان اور بزدل کوئی بھی نہیں ہے، نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس تحریک سے الگ رہنا چاہتے ہیں، لیکن آخر میں سب کے سب کسی تخویف و تحریص یا وقتی جوش کے زیر اثر نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری کے قائل ہو کر تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں، یعنی اس ناول میں مصنف نے صرف جنگی ترانہ نہیں لکھا بلکہ ایک اخلاقی مسئلہ پیش کیا ہے اور ایک راستہ بجھایا ہے جس پر چل کر یہ مسئلہ ایک حد تک حل ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کا اہم ترین اخلاقی مسئلہ یہ ہے کہ ہم کسی مزعومہ نیک مقصد کی خاطر دوسروں کو قربان کر سکتے ہیں یا نہیں، دوسروں کا خون بہا سکتے ہیں یا نہیں۔

یہ مسئلہ ایک کردار ژاں بلومار کے ذریعہ پیش کیا گیا۔ ژاں کو لڑکپن ہی سے کسی مبہم جرم یا گناہ کا احساس ستاتا رہتا ہے مگر وہ اس کی تصریح نہیں کر سکتا۔ ایک دن کسی غریب عورت کی بچی مر جاتی ہے۔ ژاں اس کے غم میں برابر کا شریک ہونا چاہتا ہے لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ میرے آنسو اس عورت کے آنسو نہیں بن سکتے۔ یعنی ایک آدمی دوسرے آدمی کی اندرونی زندگی کو اپنا نہیں سکتا کیونکہ یہ دونوں دو الگ الگ ہستیاں ہیں اور آدمی جو اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے تو اسی وجہ سے کہ دوسروں کے دکھ درد کا مداوا اس کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ پوری طرح غم خواری بھی ناممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک الگ وجود رکھنا ہی اصل گناہ ہے۔ یہ تو ژاں کا پہلا احساس ہوا کہ ہر انسان ایک الگ ہستی ہے۔

دوسری طرف اسے یہ تجربہ ہوتا ہے کہ انسان الگ ہستی ہونے کے باوجود دوسروں کی ہستی میں دخیل ہوتا ہے اور دوسرے آدمی اور چیزیں اور واقعات اس کی ہستی میں دخیل ہوتے ہیں (فلسفہ زیست والوں پر کمیونسٹ الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ صرف انسان کی داخلی اور انفرادی زندگی کو دیکھتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی زندگیوں کے ایک دوسرے میں گتھے ہونے کا جیسا شدید اور نازک احساس ان لوگوں کو ہے، ویسا بہت ہی کم لوگوں کو ہوگا) ژاں دیکھتا ہے کہ اس کی ہر بات دوسروں کی زندگیوں پر اثرانداز ہو رہی ہے۔ اسے ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ اس کے ایک دوست کی محبوبہ ہیلن اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے مگر وہ اپنے دوست کے خیال سے اس کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ ہیلن مایوس ہو کے کہیں نکل جاتی ہے اور نوبت اسقاطِ حمل تک پہنچتی ہے۔ ژاں نے محبت کا جواب نہ دیا تو ہیلن پر مصیبت پڑی، جواب دیتا تو دوست کو تکلیف ہوتی۔ اس سارے تجربے کا خلاصہ وہ یوں بیان کرتا ہے:

"میں بولوں تو بھی مجرم، نہ بولوں تو بھی مجرم۔ میں جو بھی کروں، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہو گی۔"

وہ محسوس کرتا ہے کہ میرے ذرا سے ہاتھ ہلانے سے دنیا میں ایک نئی چیز ظہور پذیر ہوتی ہے جو فوراً میرے وجود کی حدوں سے باہر نکل کر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس سے ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکوں اور میری زندگی پاک اور بے داغ ہو، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ میں تو دوسروں کے راستے کا روڑا ہوں اور ان کی خوشی میں مخل ہوتا ہوں۔ غرض، انسان کے وجود کے ساتھ یہ عجیب قسم کی ذمہ داری چپکی ہوئی ہے۔ اس طرح بھی اسے اپنا وجود ایک گناہ معلوم ہوتا ہے۔

اب انفرادی طور پر اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس احساسِ گناہ سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

اس دوران میں ہٹلر آسٹریا پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہٹلر کا بندوبست ابھی سے کرنا چاہیے اور ہر قیمت پر آزادی برقرار رہنی چاہیے، لیکن ژاں کا خیال ہے کہ دوسروں کے خون سے آزادی کی قیمت ادا کرنا بڑی آسان بات ہے، ہر آدمی کی انفرادی زندگی ایسی قدر و قیمت رکھتی ہے جس کا مول تول یوں نہیں ہو سکتا۔ ہمیں کیا

حق پہنچتا ہے کہ دوسروں سے ان کی زندگی چھین لیں۔

لیکن جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ ایک مدافعتی گروہ کی سرداری قبول کرلیتا ہے۔ دوسرے لوگ اسے خطرناک کام نہیں کرنے دیتے، اس کا کام دوسروں کو جان دینے کے لیے بھیجنا ہے۔ یہ بات اسے پسند نہیں، وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ ایک بڑے مقصد کے لیے یہ ذریعہ مناسب ہے۔ اس کے خیال میں تو سب ذریعے بُرے ہیں لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں کہ ہمارے کسی عمل کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہم چاہتے کیا ہیں، اور اپنی سی کوشش کرنی چاہیے۔ ان غیر معمولی حالات میں وہ یہ بھی قبول کر لیتا ہے کہ دوسروں کے خون سے آزادی کی قیمت ادا کرے۔

اب ہیلن کی سنیے، وہ سمجھتی ہے کہ ذاتی زندگی کی تکمیل سب سے بڑا فرض ہے۔ آزادی نہیں ہے تو نہ سہی، زندہ رہنا ہی بڑی بات ہے۔ وہ ژاں کو خطرناک سرگرمیوں سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ جب وہ نہیں مانتا تو ناراض ہو کے چل دیتی ہے۔ اسے تجربہ ہوتا ہے کہ غلامی میں ذاتی زندگی کی تکمیل تو درکنار، چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تسکین بھی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اُسے بھی عمل کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور وہ آکے ژاں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ آخر وہ بم پھینکتے ہوئے زخمی ہو جاتی ہے۔

یہ ناول ٹیکنیک کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہے، ژاں، ہیلن کے بستر مرگ کے قریب بیٹھا ہے اور یہ سارے واقعات اسے یاد آ رہے ہیں کیونکہ ہیلن کی آنے والی موت نے اس کے سارے اخلاقی مسائل کو از سر نو زندہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کی موت کا ذمہ دار محسوس کر رہا ہے، اور وہ پھر سے احساس گناہ کا شکار ہو گیا ہے۔ مرنے سے پہلے ہیلن کو ذرا دیر کے لیے ہوش آتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں خوش ہوں کیونکہ یہ راستہ میں نے اپنے لیے خود منتخب کیا ہے۔ اس سے ژاں کو ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ ژاں کو پہلے بھی اسی طرح کا ایک تجربہ ہو چکا تھا جب وہ ایک اور عورت ماولین کے ساتھ اختلاط کرتا تھا تو ماولین کا رویہ قطعی انفعالی ہوتا تھا۔ اس سے ژاں کا احساسِ گناہ اور بڑھ جاتا تھا، لیکن ایسے وقت ہیلن کی آنکھیں یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں کہ یہ سب صرف میری مرضی سے ہو رہا ہے، چنانچہ ژاں کا احساسِ گناہ بالکل غائب ہو جایا کرتا تھا۔ یہی اس وقت ہوا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ہیلن نے یہ موت خود انتخاب کی ہے، اور اس کی قوت ارادی، اس کی آزادی محفوظ ہے تو وہ پھر اپنے آپ کو بے داغ محسوس کرنے لگا۔

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کا وجود ایک گناہ تو ضرور ہے لیکن اگر اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اور چاہے وہ اپنے عمل کے نتائج سے بے خبر ہو، لیکن اسے اپنے انتخاب کا شعور ہو تو یہ گناہ دھل بھی سکتا ہے، یعنی بے داغ ہونے کے معنی ہیں باشعور ہونا۔ یہی انسان کی آزادی ہے (اس فلسفے کو روس کے رسالوں میں قے اور اسہال سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔

اچھا، ہیلن سے یہ سن لینے کے بعد بھی ژاں کے اندر خلش باقی رہتی ہے۔ وہ کہتا ہے: ''لیکن جہاں تک مجھ سے ملاقات ہونے کا سوال ہے' یہ بات تو تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی تھی، تم تو اس طرح مجھ سے آ ٹکرائی تھیں جیسے کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے۔''

ہیلن جواب دیتی ہے: ''تم اپنے آپ کو خواہ مخواہ مجرم سمجھ رہے ہو، تم پتھر تو تھے لیکن سڑک بنانے کے لیے پتھر بھی تو چاہئیں۔ اس کے بغیر کوئی اپنے راستے کا انتخاب کیسے کر سکتا ہے؟

یہ اور بات ہے کہ ایسے جملوں پر روسی نقادوں کی نظریں نہیں پڑتیں، لیکن انسانی تعلقات کا ایسا حقیقت پرستانہ، نرم و نازک، بھرپور اور ہمت افزا تصور مجھے تو آج کل کسی اور ملک کے ادیب میں نظر نہیں آتا۔ انسانی تعلقات کی دشواریوں اور پریشانیوں کے ساتھ ساتھ یہاں اس بات کا اعتراف موجود ہے کہ بلند یا لطیف زندگی دوسرے انسانوں سے تعلقات رکھے بغیر ممکن نہیں۔ وجود کے گناہ سے چھٹکارا شعور کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اور شعور دوسرے انسانوں کے ذریعے ملتا ہے۔

تو فی الجملہ انسان کچھ اس قسم کی چیز ہوا: ''کچھ بھی نہیں اور سب کچھ۔ کرہ ارض پر ہر جگہ ساری انسانیت کے سامنے موجود، مگر سب سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ بھی۔ سڑک پر پڑے ہوئے روڑے کی طرح مجرم بھی اور بے گناہ بھی۔ اتنا بھاری بھی اور ہلکا بھی۔''

لیکن ژاں کے اخلاقی مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ ہیلن کے مرنے کے بعد وہ سوچتا ہے کہ خیر ہیلن نے تو اپنے راستے کا انتخاب کر لیا تھا، اس کے لیے تو میں ایک معصوم سا پتھر ہوں، لیکن جو جرمن بم سے قتل ہوئے ہیں ان کے بدلے میں کل بہت سے فرانسیسیوں کو گولی سے اڑایا جائے گا۔ انہوں نے تو اپنے لیے راستے کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ مَیں وہ چٹان ہوں جو انہیں کچلے گی۔ مَیں اس گناہ کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ مَیں ان کے لیے ہمیشہ ایک دوسری ہستی رہوں گا ان کے لیے مَیں ہمیشہ تقدیر کی اندھی طاقت

رہوں گا، ہمیشہ ان سے الگ رہوں گا۔ لیکن ایک ایسی اعلیٰ اور ارفع ترین چیز بھی ہے جو سب پتھروں اور سب چٹانوں کو بے ضرر اور بے داغ بنا دیتی ہے، جو ہر آدمی کو دوسرے آدمیوں اور مجھ سے بچالیتی ہے، یعنی آزادی۔ اگر میں اپنے آپ کو اس کی مدافعت کے لیے وقف کردوں تو میرا جوش و خروش بیکار نہیں جائے گا۔ تم (ہیلن) نے مجھے سکون قلب نہیں دیا، لیکن میں سکون قلب چاہوں ہی کیوں! تم نے مجھے اتنی ہمت دے دی ہے کہ میں اس تذبذب اور اس کرب کو قبول کرسکوں، اور جو جرم اور جو احساس گناہ میرے دل کو ہمیشہ برماتا رہے گا، اسے برداشت کرسکوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

یعنی یہ کتاب اس طرح ختم نہیں ہوتی جیسے اس اخلاقی مسئلے پر آخری لفظ پیش کر دیا ہو۔ مصنف نے ایک سچے فنکار اور معلم اخلاق کا رویہ اختیار کیا ہے یعنی یہ کہ ہم کسی اخلاقی مسئلے کے مختلف حل ڈھونڈ سکتے ہیں، لیکن کوئی آخری حل مل نہیں سکتا۔ اخلاقی مسئلہ حل کرلینے کے معنی اخلاقی موت کے ہوں گے۔ بلند اخلاق کا آدمی وہی ہے جو اخلاقی مسئلے کو ہمیشہ زندہ رکھے۔ اس کے معنی ہیں مستقل کرب کو برضا و رغبت قبول کرنا۔ عام آدمی میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے تو صحیح خیال اور صحیح عمل کی یہ کافی ضمانت ہے۔ صحیح سے مراد مطلقاً نہیں بلکہ نسبتاً) ولیوں کی بات تو چھوڑیے، عام آدمی کے لیے اس سے بلند تر اخلاقی درجہ اور کیا ہو گا۔ واقعی، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

تو اس ناول میں صرف ایک خاص وقت کے لیے پیغام عمل نہیں ہے، بلکہ ایک فرد کی مجموعی زندگی میں عمل کی حیثیت پر غور کیا گیا ہے کہ لڑائی میں دوسروں کو قتل کرنے کا عمل ہی نہیں بلکہ کسی بھی صاف اور بے داغ عمل کی صلاحیت آدمی میں ہے یا نہیں، اور اگر عمل کسی حد تک بے داغ بن سکتا ہے تو کس طرح۔ چنانچہ یہ ناول صرف جنگ کے بارے میں نہیں بلکہ عمل سے متعلق ہر مسئلے کے بارے میں ہے۔ یہ افادی ادب ضرور ہے لیکن اس کی افادیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔

جیسا میں نے کہا تھا، یہ کوئی بہت بڑا ناول نہیں ہے، اور ہنگامی ضروریات کے تحت لکھا گیا تھا، لیکن فرانس کے علاوہ دوسرے ملکوں میں آج کل جس قسم کا ادب پیدا ہو رہا ہے، اس کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ دوسرے ملکوں کے "غیر افادی" ناولوں میں بھی دو چار ہی ایسے ہوں گے جو اس کتاب کی برابری کرسکیں۔ اس عہد میں تو اکثر و بیشتر یہ فرانسیسی ادیبوں ہی کا فریضہ رہا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادی حقیقتوں

سے روشناس کرائیں اور ہمیں اتنی ہمت دیں کہ ہم اس "تذبذب اور کرب" کو قبول کر سکیں۔ خیر، روسی ادیبوں کا تو کہنا ہی کیا، وہ سارے اخلاقی مسائل حل کر چکے ہیں، لیکن جس زمانے میں انگریز، ادب جنگ سے گھبرا کر ٹھنک رہے تھے، اس زمانے میں فرانسیسی ادیب ایسے ہوش ربا سوالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد واقعی فورسٹر کی بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ مغرب میں پچھلے تین سو سال سے فرانس منارۂ نور بنا رہا ہے اور آج بھی ہے۔

خیر، اس کتاب کا ذکر تو مَیں نے اس لیے کیا تھا کہ آج پاکستان میں اگر ہمیں واقعی صرف و محض افادی ادب چاہیے تو پہلے، کم سے کم ادیبوں کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ ادب میں افادیت پیدا کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

(مئی ۱۹۵۰ء)

کامیو اور مقصدی ادب

پچھلی دفعہ میں نے ایسے ادب کی ایک مثال پیش کی تھی جو ایک خاص مقصد سے عمل کی تلقین کے لیے لکھا گیا ہو، لیکن اس کے باوجود ادب بھی ہو، جس کی ادبی دلچسپی اور انسانی افادیت اس مخصوص عمل کی ضرورت ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ ختم نہ ہو جائے بلکہ بعد میں بھی باقی رہے، چونکہ آج کل پاکستانی ادیبوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیسا ادب پیش کریں، اس لیے مذکورہ بالا قسم کے ادب کی ایک اور مثال پیش کروں تو دو چار اجنبی اور مشکل ناموں کی پنسیریاں لڑھانے کے باوجود غالباً مجھے معذرت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ حسب دستور مجھے "انسانوں" کی "افادیت" اور "مقصدیت" سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ "انسانوں" کے لیے تو اتنی ہی مقصدیت کافی ہوتی ہے کہ پارٹی یا لیڈر نے حکم دے دیا اور سولی پہ چڑھ گئے، باقی تسلی ہے — رام بھلی کریں گے۔ البتہ "بھیڑیوں، بندروں" کو یہ سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم کیوں مر رہے ہیں، کیوں جی رہے ہیں، جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔

اسی قسم کے ایک "بھیڑیے" کامیو نے ایک ناول لکھا ہے — "طاعون" جو حضرات روسی رسالے پڑھتے ہیں، وہ اس نام سے خوب واقف ہوں گے، اور اس ناول کے یہ دو جملے — صرف یہ دو جملے — بھی نظر سے گزرے ہوں گے کہ "ہم سب طاعون زدہ ہیں" اور "طاعون کیا ہے، زندگی ہی تو ہے۔" خیر، یہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ جملے کس موقع پر کن کرداروں نے کہے ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے، مگر یہاں صرف اتنا عرض کر دوں کہ یہ اقتباسات بالکل "لاتقربو الصلوۃ" کی قسم کے ہیں۔

اب کچھ مصنف کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ جنگ سے پہلے کامیو نے ایک ناول لکھا تھا "اجنبی" بس میں دکھایا گیا تھا کہ انسان ایک دوسرے سے بالکل اجنبی ہوتے ہیں،

اور کوئی کسی کی اصلی زندگی میں شریک نہیں ہو سکتا، لیکن جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہو گیا تو اس نے مدافعت کی تحریک میں باقاعدہ حصہ لیا، بلکہ وہ تحریک کے سربر آوردہ لوگوں میں سے تھا اور ایک خفیہ اخبار کی ادارت اس کے ذمے تھی۔ اس تحریک میں اسے انسانوں کی باہمی رفاقت اور ہمدردی کے بہت سے تجربے ہوئے اور اس کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہوئی، چنانچہ اس ناول "طاعون" کو ان سارے تجربات کا نچوڑ سمجھیے۔

ناول کے سرورق پر کامیو نے ڈیفو کا ایک جملہ نقل کیا ہے کہ ایک صورتِ حال کو دوسری صورتِ حال کی اصطلاح میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعون صرف استعارہ ہے۔ اس سے مراد ملک پر دشمنوں کا قبضہ بھی ہو سکتا ہے اور کوئی دوسری خطرناک صورت بھی۔ کتاب کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے پر کوئی مصیبت نازل ہو تو فرد کو دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اس مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیے یا نہیں، اور کرنا چاہیے تو کیوں۔ یہی سوال پھیل کر پوری انسانی زندگی کی نوعیت اور قدر و قیمت پر حاوی ہو جاتا ہے۔

ناول کی حیثیت سے تو فی الحال میں اس کتاب پر بحث نہیں کروں گا، لیکن اتنا ضرور کہہ دینا چاہیے کہ پچھلے دس پندرہ سال میں دنیا بھر میں جتنے ناول لکھے گئے ہیں، ان میں سے اس ناول کا بہت ہی اہم اور ممتاز مقام ہے۔ کامیو کوئی دقیقہ رس اور نکتہ سنج مفکر تو نہیں ہے، لیکن ہر چیز اور ہر جذبے کو براہ راست اور بنیادی شکل میں دیکھ سکنے کی اسے عجیب صلاحیت حاصل ہے۔ طاعون کا شروع ہونا اور پھیلنا، مختلف قسم کے لوگوں پر اس کا ردعمل، پورے شہر کے مجموعی تاثرات، موسموں کی کیفیات پر طاعون کا اثر، یہ سب باتیں کامیو نے ایسی سادگی اور ہمہ گیری کے ساتھ بیان کی ہیں کہ بائبل یاد آتی ہے۔ (ہے تو یہ غیر متعلق سی بات، مگر احمد علی نے بھی اپنے ناول "شامِ دہلی" میں ایک جگہ ہیضے کی وبا دکھائی ہے۔ ان دو مصنفوں نے جس طرح وبا کا نقشہ کھینچا ہے اس کا مقابلہ اور موازنہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہو گا)۔

کامیو نے طاعون کا حال ایک ڈاکٹر کی زبان سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ریو طاعون کی روک تھام کے انتظامات میں بھی پیش پیش ہے اور طاعون کے متعلق اپنے اور دوسرے لوگوں کے رویے کے متعلق غور و فکر بھی وہی کرتا ہے، اور کتاب میں جو مسائل پیش کیے گئے ہیں، وہ بھی اسی کے شعور میں پیدا ہوتے ہیں۔

جیساکہ میں نے کہا ہے، اس کتاب کا اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ ہم وبا کا مقابلہ کریں یا نہ کریں۔ ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے طاعون کی تباہ کاریاں بڑھتی جاتی ہیں، لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوتا جاتا ہے کہ اب ہماری تقدیر الگ الگ نہیں رہی بلکہ ہم سب کا حشر ایک سا ہوگا، اور وہ آ آ کر صفائی کے دستوں اور دوسری امدادی کمیٹیوں میں شریک ہوتے جاتے ہیں۔ بعض ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے اس رویے کی ایک خاص وجہ بھی رکھتے ہیں۔ ایک پادری ہے جو انسانوں کی مدد کرتا ہے کیونکہ خدا کا حکم ہے، اور مذہب ہمدردی سکھاتا ہے۔ ایک آدمی ہے کوتار جو پولیس کی نظروں میں مشتبہ ہونے کے سبب انسانوں سے بچتا پھرتا تھا، اب طاعون کے دوران میں اسے دوسرے آدمیوں سے ایک عجیب یگانگت کا احساس ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں میں اتحاد منظور ہو تو طاعون سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک اور آدمی ہے تارد۔ وہ ایک جج کا بیٹا ہے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے باپ کو سزائے موت سناتے دیکھا تھا، اس دن سے اُسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس آدمی کی موت کا ذمہ دار میں بھی ہوں کیونکہ میں بھی اس نظام اقدار کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرتا ہوں جس کی بدولت اس آدمی نے پھانسی پائی۔ اس چیز کو وہ طاعون کہتا ہے، اور ہر آدمی کو طاعون زدہ بتاتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ فطری چیز تو طاعون کا کیڑا ہے۔ ایمانداری، تندرستی جیسی چیزیں انسانی ارادے کی پیداوار ہیں۔ سکونِ قلب حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ آدمی اپنے اوپر کڑی نگاہ رکھے اور جہاں تک ممکن ہو سکے طاعون کو اپنے اندر سے خارج کرتا رہے۔ دنیا میں یا تو وبائیں ہیں یا ان کے شکار۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، وباؤں کا ساتھ نہ دیں۔ چنانچہ تارد انسانوں سے اس لیے ہمدردی کرتا ہے کہ طہارتِ قلب حاصل کر سکے اور ولی بن سکے۔ اسے کوئی انسانی خوشی درکار نہیں ہے۔

ان لوگوں کے برخلاف ایک اخبار نویس رواں بیر ہے جو اتفاقاً اس شہر میں پھنس گیا ہے۔ اُسے اس شہر والوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، وہ صرف ذاتی مسرت کا طالب ہے اور یہاں سے کسی طرح نکل بھاگنا چاہتا ہے، لیکن وہ صفائی کے دستے میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنی خوشی سے، بلکہ جب بھاگنے کا موقع ملتا ہے تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔

ڈاکٹر ریو کا خیال ہے کہ یہ لوگ جو اس طرح شہر کی خدمت کر رہے تھے تو یہ کوئی بہادری کا کام نہیں تھا۔ بہادری کی جگہ تو زندگی میں ثانوی ہے۔ یہ سب تو معمولی قسم کے آدمی تھے جنھیں اپنی انفرادی خوشی بہادرانہ کاموں سے کہیں زیادہ عزیز تھی، لیکن اس کے

باوجود یہ لوگ اپنا فرض انجام دے رہے تھے۔ ریو کے خیال میں اس کام کو بہادری کہنا تو آدمیت کی توہین ہے کیونکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہادری صرف غیر معمولی چیز ہے۔ عام طور سے آدمی بزدل اور برا ہوتا ہے۔ حالانکہ ریو کی رائے ہے کہ زیادہ تر شریف اور نیک ہوتے ہیں، ہر آدمی میں فطری طور پر اتنی شرافت ہوتی ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دے کر خوش ہوتا ہے۔ (یہ بھیڑیوں کا نظریہ حیات ہے) اگر یہ لوگ خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تو ان لوگوں کی بہادری کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکول میں استاد یہ سکھاتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو اسے تو ہم اس بات پر مبارک باد نہیں دیتے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ صفائی کے دستے میں شامل ہونے والے لوگ آخر اپنی جان خطرے میں ڈال رہے تھے۔ اس کا جواب ریو یہ دیتا ہے کہ تاریخ میں بار بار ایسا وقت آتا ہے جب دو اور دو چار کہنے والے کو اپنی جان دینی پڑتی ہے۔ تو سوال اس بات کا نہیں ہے کہ یہ بات کہنے سے کیا سزا یا کیا انعام ملے گا، اصل سوال تو یہ معلوم کرنے کا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے بھی ہیں یا نہیں یعنی آدمی اجتماعی خدمت کسی صلے کے لالچ میں نہیں کرتا، بلکہ اس کی فطرت یا کوئی نامعلوم لگن اسے مجبور کرتی ہے۔ (مگر یہ "بندروں" کی اخلاقیات ہے!)

دراصل ریو خود بھی نہیں جانتا کہ میں لوگوں کے علاج میں اتنی تندہی سے کام کیوں لے رہا ہوں بلکہ وہ تو یہاں تک تسلیم کرنے کو تیار ہے کہ شاید آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ذاتی خوشی کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دے۔ لیکن وہ خود اپنی خوشی کو خدمت پر ترجیح نہیں دے رہا۔ کیوں؟ اس کا سبب وہ خود بھی نہیں جانتا۔ اسے پتہ نہیں کہ جب طاعون ختم ہو جائے گا تو پھر کیا ہو گا، اور وہ خود یا دوسرے لوگ کیا سوچیں گے لیکن اس وقت اتنی بات یقینی ہے کہ اس کے سامنے کچھ بیمار موجود ہیں اور انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ علاج کرنا اور اس کا سبب دریافت کرنا، یہ دو کام انسان سے ایک وقت میں ممکن نہیں۔ اس وقت اہم ترین بات یہی ہے کہ لوگوں کا علاج کیا جائے، باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔

عمل کی فوری ضرورت کے تحت ریو کی نظروں میں نظریوں کا اختلاف اہم نہیں رہا۔ وہ خدا کو نہیں مانتا، اور کہتا ہے کہ اگر قادر مطلق خدا پر میرا اعتقاد ہو تو بیماروں کے

علاج کی کیا ضرورت ہے، سب کچھ اسی پر چھوڑ دینا کافی ہے۔ ریو نے کائنات کو جس شکل میں اپنے سامنے پایا ہے، اس کے خلاف لڑ رہا ہے، اور اس حد تک اپنے آپ کو راستی پر سمجھتا ہے۔ اس کے برخلاف پادری خدا کے حکم کے مطابق انسانوں سے ہمدردی کر رہا ہے، اور ریو کو بھی قائل کرنا چاہتا ہے۔ ریو اس سے کہتا ہے: "میں موت اور بیماری سے نفرت کرتا ہوں — خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو یا نہ ہو، ہم دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے خلاف مل کر لڑ رہے ہیں — اب تو خدا بھی ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتا۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس لڑائی میں کامیابی بھی حاصل ہوگی یا نہیں۔ اس وبا کے دوران میں لوگوں کو تجربہ ہوتا ہے کہ طاعون ایک عجیب و غریب اور ناقابل فہم قوت ہے۔ (کامیو نے طاعون کو ایک زندہ اور خونخوار جانور کی حیثیت دے دی) ڈاکٹر اچھی سے اچھی دوائیں بناتے ہیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب طاعون اپنا خراج اچھی طرح وصول کر چکتا ہے اور موتیں کم ہو جاتی ہیں تو یہی دوائیں اثر دکھانے لگتی ہیں، چنانچہ طاعون سے انسان جو لڑائی لڑ رہے ہیں، اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں جا سکتی۔ ریو کو اپنی جدوجہد کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ موت پر آخری فتح حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن وہ اپنی جدوجہد کا ماحصل ایک کبھی ختم نہ ہونے والی شکست بتاتا ہے۔ انسان کی مکمل فتح تو صرف اشتراکی ادب میں ملتی ہے، زندگی میں نہیں۔ یہ حقیقت پسندانہ رویہ نہیں ہے۔ کامیو نے اس کے برخلاف یہ تصور پیش کیا ہے کہ اگر انسان کو آخری فتح حاصل نہیں ہو سکتی تو اس کی ہمت کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی شکست کو بھی آخری شکست نہ بننے دے، اور نتیجے کا خیال کیے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھے (شکست کے سلسلے میں کامیو نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ اس سے پہلے بھی بیسیوں دفعہ وبائیں پھیلیں اور ختم ہو گئیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس میں کتنے آدمی مرے، کتنے نہیں۔ موجودہ زمانے میں ہم موتوں کا اندراج رجسٹر میں کر لیتے ہیں۔ اسی کا نام "ترقی ہے!)

اچھا، اس جدوجہد سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ شعور اور کچھ یادیں، لیکن کیا شعور انسانی کی تکمیل کے لیے کافی ہے؟ ریو کا خیال ہے کہ شعور حاصل کر کے ولی تو بنا جا سکتا ہے مگر آدمی نہیں، اور اسے ولی بننے کی اتنی آرزو نہیں جتنی آدمی بننے کی۔ انسانی زندگی کی تکمیل انسانی امید سے ہوتی ہے — آدمی کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں سے کم سے کم یہ ایک

ایسی چیز ہے جو بالکل ٹھوس ہے اور جسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روزمرہ کے مشغلے اور یہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں شعور کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں، ان کی وجہ سے آدمی بڑی بڑی حقیقتوں کو محسوس نہیں کر سکتا۔ طاعون شہر میں پھیل گیا، اور لوگ انہی چیزوں کے سہارے وبا سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرتے رہے اور جب طاعون ختم ہوگیا تو اپنی ذاتی خوشیوں میں ایسے غرق ہوئے جیسے پھر کوئی وبا آئے گی ہی نہیں، لیکن ریو کے خیال میں یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی قوت ہے۔ انسانی امید کی تکمیل بذاتِ خود ایک فتح ہے، چنانچہ وہ اسی سطح پر انسان کو قبول کرتا ہے۔

لیکن اسے یہ بھی معلوم ہے کہ طاعون کے جراثیم مرتے نہیں، چھپ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ پھر نکلیں گے اور پھر وبا پھیلے گی۔ اسی لیے اسے یہ ساری داستان سنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ صرف سکونِ قلب نہیں چاہتا؟ وہ اس ظلم اور بے انصافی کی ایک یادگار قائم کرنا چاہتا ہے جو ان انسانوں کے ساتھ ہوا، ان لوگوں کے حق میں شہادت دینا چاہتا ہے اور وہ اس وبا سے جو سبق اسے حاصل ہوا ہے وہ اوروں کو بھی بتانا چاہتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ آدمی میں تعریف کے قابل باتیں زیادہ ہیں اور نفرت کے قابل باتیں کم۔ یہ آخری اور مکمل فتح کا قصہ تو نہیں ہے، مگر وہ بتانا چاہتا ہے کہ اس وبا میں لوگوں کو کیا کیا کرنا پڑا کیونکہ موت اور ہلاکت کے خلاف کبھی ختم نہ ہونے والی جدوجہد میں یہی باتیں پھر کرنی پڑیں گی — ان تمام لوگوں کو جو ولی بننے کی صلاحیت تو نہیں رکھتے، لیکن وباؤں سے شکست بھی نہیں قبول کرنا چاہتے، بلکہ دوسروں کے دکھ درد کا مداوا کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں۔

یہ ہے عمل اور عمل کی ضرورت کا خاکہ جو کامیو نے پیش کیا ہے۔ اس میں وہ تیقن اور خود اعتمادی بالکل نہیں ہے جو ایسے پیغام سے وابستہ سمجھی جاتی ہے، مگر کامیو کا اثبات بہت مکمل ہے، غالباً بہت سے دوسرے لوگوں سے زیادہ مکمل ہے کیونکہ کامیو نے زندہ رہنے اور اچھی طرح زندہ رہنے کی خواہش کے سوا ہر چیز کو ثانوی قرار دیا ہے۔ ان ثانوی چیزوں کے متعلق وہ ہر قسم کی بحث کی گنجائش رکھتا ہے۔ اس کا اثبات اولین اور بنیادی چیز پر ہے۔ اس قسم کا اثبات اس لیے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ آج مختلف سیاسی فلسفوں نے، اور ان سے بھی زیادہ سیاسی جماعتوں کے طریقہ کار نے ثانوی جذبات کو اتنا اہم بنا دیا ہے کہ ان نظریات میں الجھنے کے بعد آدمی اپنے وجود کے بنیادی حقائق سے بھی

غافل ہو جاتا ہے اور یہ نشہ ایسا تیز ہے کہ بعض اوقات تو موت کے منہ میں پہنچ کر بھی نہیں چوکتا۔ کامیو اور اس جیسے دوسرے لکھنے والوں کو جو چیز ایک ممتاز حیثیت دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی بنیادی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور انسانیت کی بہترین اخلاقی اقدار کو بھی برقرار رکھا ہے، حالانکہ مختلف گروہ کامیو وغیرہ کو انسانیت کا دشمن ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ انہوں نے ان پرانی اخلاقی اقدار کو ایک بالکل نئی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مثالیت پرستی سے خالی نہیں ہیں جیساکہ روسی رسالوں میں بعض انگریزی رسالوں میں انہیں پیش کیا جاتا ہے۔

مقصدی ادب کے سلسلے میں ان لوگوں کا رویہ یہ نہیں ہے کہ ایک خاص قسم کے محدود عمل کی ترغیب دے کر سمجھیں کہ ہمارا کام ختم ہوگیا۔ اس کے بجائے یہ لوگ خالص عمل کے سرچشموں کا جائزہ لیتے ہیں اور خود انسان کے وجود کی گہرائیوں میں سے عمل کی ضرورت پیدا ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ادب ایک خاص مقصد کی خارجی تکمیل کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عمل کی ہر ضرورت کے وقت یہ ادب اس طرح پڑھا جاسکتا ہے جیسے اسی موقع کے لیے لکھا گیا ہو۔ یعنی یہ ادب اس مقام سے تخلیق ہوا ہے جہاں مقصدی ادب کی اصطلاح ہی بے کار یا غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ جس طرح سارتر کی تصریح کے مطابق وجود بذاتِ خود ایک ذمہ داری بن جاتا ہے، اسی طرح اس ادب کو اس کی ذمہ داری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دونوں عناصر ایک دوسرے کی بدولت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

(جون ۱۹۵۰ء)

ہمارے شاعر اور اتباعِ میر

جب اردو میں آزاد شاعری شروع ہوئی تو ہمارے بیشتر شاعروں نے اس کے معنی فی الجملہ بس اتنے سمجھے تھے کہ آزاد نظم وہ ہے جس میں قافیہ نہ ہو اور اس بے قافیہ نظم میں کہا کیا جائے، تو اس کا جواب یہ طے ہوگیا تھا کہ کسی نہ کسی قسم کی بیزاری یا شکستگی کا اظہار ہو۔ چنانچہ دو ڈھائی سال کے اندر ہی یہ حالت ہوگئی کہ دو شاعروں میں تمیز کرنا ممکن نہ رہا، ایک ہی نظم کو دو شاعروں کے نام سے بے کھٹکے پیش کیا جاسکتا تھا۔ نظم پڑھ کر آپ یہ بات بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آخر یہ بحر کیوں استعمال کی گئی ہے، ایک لائن کس وجہ سے بڑی ہے، دوسری کس وجہ سے چھوٹی ہے۔ اسی طرح یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ شاعر کو کسی شعری تجربے کی تجسیم کی ضرورت بھی پیش آئی ہے یا نہیں۔ یہ مانا کہ بعض تجربات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں تو وہ سرے سے غائب ہی ہو جاتے ہیں، لیکن ابہام کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاعر نے تجربے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، چنانچہ ان آزاد نظموں میں ہمیں بس اتنا محسوس ہوتا تھا کہ شاعر صاحب کچھ دل شکستہ ہیں۔ یہ دل شکستگی بھی آہستہ آہستہ محض اضمحلال بن کے رہ گئی۔ جس طرح جوش کے مقلدوں نے (اور ایک حد تک خود جوش نے بھی) محض جوش و خروش اور جذباتی بھپراؤ ہی کو شاعری سمجھ لیا تھا، اسی طرح شاعروں نے افسردگی اور اضمحلال کو شاعری سمجھا۔ اگر اضمحلال کو شاعری کا موضوع یا شاعرانہ تجربے تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھا جاتا تب بھی خیر ایک بات ہوتی، مگر ان حضرات کے لیے تو اضمحلال ہی شاعری بن گیا۔ اضمحلال بھی کیا، مضمحل آواز۔ ہمارے نئے شاعر کی تخلیقی جدوجہد کا ماحصل بس اتنا رہ گیا۔

یوں تو مسلسل ہنسی بھی آسانی سے برداشت نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی آدمی بغیر کسی خارجی یا داخلی جواز کے منہ بسورتا رہے تو کس میں اتنی طاقت ہے جو اس کے چہرے

کو دلچسپی سے دیکھ سکے۔ ہمارے شاعروں نے مغرب کی آزاد نظم اچھی طرح نہیں پڑھی تھی۔ ہمارے نقاد تو ان سے بھی دو چار ہاتھ آگے تھے۔ ہر شائع شدہ چیز کو پسند کرنا ہمارے نقادوں کا پیشہ ہی ٹھہرا۔ شاعروں نے کہا یہ شاعری ہے، نقادوں نے بھی اسے شاعری تسلیم کر لیا، البتہ پڑھنے والے تھوڑے ہی دن میں اکتانے لگے اور ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ واقعی کیا یہی شاعری ہے۔ جو لوگ شروع ہی سے آزاد نظم کے مخالف تھے ان کی بات نہیں، جو موافق تھے انہیں بھی شبہ ہونے لگا۔ ہمارے یہاں سچ پوچھیے تو تنقید معطل ہی سی ہے، چنانچہ ان — سوالوں پر باقاعدہ بحث تو نہیں ہوئی البتہ پڑھنے والے اب غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے، اور آہستہ آہستہ شاعر میں بھی یہ تبدیلی بالکل خاموشی سے وقوع پذیر ہوئی۔ نئی شاعری نے پچھلے پندرہ سال میں مجموعی حیثیت سے جو کچھ کیا ہے، اس سے خاصی بے اطمینانی پیدا ہو چکی ہے، اس لیے اسی تبدیلی سے کچھ لوگ خوش ہوئے اور یہ امید ہوئی کہ اب شاعری میں جان نہ سہی تو کچھ تازگی تو آئے گی ہی، لیکن اس تبدیلی کو شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور خوش ہونے کے مواقع روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر شاعری کس خاص ٹیکنیک سے تو پیدا نہیں ہوتی، شاعروں کی پوری زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ پچھلے دس سال سے ہمارے ادیبوں کی ذہنی زندگی جس ڈھرے پر چلتی رہی ہے، اس کا رنگ تو ابھرے گا ہی۔ جب نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی تھی تو شروع شروع میں لوگوں نے تھوڑا بہت پڑھا اور سوچا تھا لیکن ہمارے ادیب ان کاموں سے جلد ہی فارغ ہو گئے۔ جو حضرات خاص قسم کے سیاسی رجحانات رکھتے ہیں، انہیں تو خیالات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہدایات ہی بہت ہوتی ہیں۔ لیکن جو ادیب اپنے فن سے تھوڑا سا خلوص برتنا چاہتے ہیں، انہیں بھی پڑھنا یا سوچنا ایک اذیت معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ادیبوں کے نزدیک ادیب بننے کے لیے اپنے آپ کو ادیب سمجھ لینا کافی ہے، باقی کام خود بخود ہو جائے گا۔ اس ذہنی ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل ہمارے ہاں جو ادب پیدا ہو رہا ہے، اس میں نہ تو زندگی کا کوئی گہرا تجربہ ملتا ہے نہ ذہنی کاوش کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو ادیب جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس میں کم سے کم تھوڑا سا جذباتی تموج تو ہے، ہمارے ہاں تو اتنا بھی نہیں۔

ہمارے شاعروں نے غزل کی روایت میں کسی چیز کی تقلید شروع کی ہے تو سہل ممتنع کی ہے۔ سہل ممتنع کارگر ہوتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ شاعر نے زندگی کی کسی

بنیادی حقیقت کو محسوس کیا ہو یا کسی جذبے کی تہ تک پہنچ گیا ہو۔ جب تجربے پر شاعر کی گرفت ایسی سادہ اور ایسی مضبوط ہو تو اس کا اظہار پیچیدہ طریقے سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے واحد اسلوب سہل ممتنع لہ ہے۔

کے معنی صرف سہل انگاری کے ہوتے ہیں جو شاعر گہرے تجربات کی ذمہ داری سے بچتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اچھے شعر بھی کہنا چاہتا ہے، وہ اسلوب کی سادگی سے گہرائی کا فریب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کل ہمارے اکثر غزل گو حضرات نے اسی کی مشق شروع کر رکھی ہے۔ ان شاعروں کا دعوٰی ہے کہ وہ میر کی پیروی کر رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ واقعی میر کی پیروی کر بھی رہے ہیں تب بھی انہوں نے میر کا وہ رنگ اختیار نہیں کیا جس پر میر کی حقیقی عظمت کا انحصار ہے۔ میر کے اچھے شعروں میں بھی دو رنگ ملتے ہیں۔ ایک رنگ تو یہ ہے کہ کسی چھوٹے سے یا لمحاتی تجربے کو حسین اور سادے طریقے سے پیش کر دیا جائے ۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
ان کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

جس سے تھی ہم کو چشم کیا کیا میر
اس طرف اُن نے اک نگاہ نہ کی

دوسرا رنگ یہ ہے کہ خواہ براہ راست تعلق کسی چھوٹے تجربے سے ہو مگر جب وہ شعر میں ڈھل کر سامنے آئے تو اس پر شاعر کے سارے ذہنی اور جذباتی تجربات کی چھوٹ پڑ رہی ہو اور اس طرح وہ شعر ہمیں صرف ایک تجربے سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کی نوعیت سے آگاہ کرے ۔

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

ضعف بہت ہے میر تمہیں، کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

صبر بھی کیجئے بلا پہ میر صاحب جی کبھی
جب نہ تب رونا ہی دھونا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب، کوئی بات کرو

جب ترا نام لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

یہ رنگ وہ ہے جس کی تقلید میں آدمی خون تھوک جاتا ہے۔ خود میر نے کہا ہے ۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اس رنگ کے اشعار اردو شاعری کی وہ معراج ہیں جس تک پہنچنے کے لیے ہر اردو شاعر بیقرار رہا ہے اور آخر تھک ہار کر بیٹھ گیا ہے، اور اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کیا ہے ۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اس عاجزی اور بے بسی کی وجہ یہی ہے کہ اوروں سے اتنے درد و غم جمع نہیں ہوسکے اور وہ اپنی شخصیت کو ہمہ گیر نہیں بنا سکے۔ میر کے معاملے میں "درد و غم" جمع کرنے کی معنی مصیبتیں اٹھانے کے نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے متنوع تجربات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر غور کرنے کی طاقت کے۔ یہ طاقت جب غالب تک نے اپنے اندر نہیں پائی تو آج کل کے غزل گو حضرات کا تو ذکر ہی کیا۔ لیکن پرانے شاعروں نے کم سے کم میر کے اس عظیم انداز میں شعر کہنے کی اپنی سی کوشش تو کی، ہمارے ان شاعروں کو اس رنگ کا خیال ہی نہیں آیا۔ پہلا رنگ آسان تھا اور اس کے استعمال میں پوری ذہنی صلاحیتوں سے کام لینے کی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ اس کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔

میر کے اس ہلکے پھلکے رنگ کی تقلید پہلے بھی ہوتی رہی ہے، بلکہ چھوٹے شاعروں نے زیادہ تر اسی رنگ کو آزمایا ہے، لیکن اس رنگ میں ایک خدشہ بہت زبردست ہے۔

دوسرے رنگ کی تقلید میں چونکہ آدمی کو اپنی کئی صلاحیتوں سے کام لینا پڑتا ہے تو چاہے شعر میر کے برابر نہ کہہ سکے مگر محض ان صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کی وجہ سے اس کا کلام دلچسپی کا موجب بن سکتا ہے۔ پہلے رنگ میں آدمی یا تو کامیاب ہوگا یا ناکام ہوگا۔ بیچ کوئی بات نہیں ہو سکتی، اگر ناکام ہوا تب تو خیر بالکل ہی گیا، لیکن اگر کامیاب ہوا تو بھی میر کے برابر پہنچنا آسان نہیں اور اس رنگ میں پوری کامیابی حاصل کیے بغیر وقیع شعر ہو نہیں سکتا، کیونکہ اگر چھوٹا سا تجربہ پوری طرح حسین بھی نہ بن سکا تو ہمارے کس کام کا۔ دراصل بڑا شاعر جب کسی رنگ میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا ہے تو اس رنگ میں کہنے والے دوسرے شاعروں کے لیے زندگی دشوار کر جاتا ہے، مثلاً درد ہی کو لیجئے۔ اگر میر نہ ہوئے ہوتے تو درد کا رتبہ اردو شاعری میں یقیناً اور بلند سمجھا جاتا، لیکن فی الحال درد نہ تو پہلے رنگ میں میر کا مقابلہ کرسکتے ہیں نہ دوسرے رنگ میں، ان دونوں رنگوں کے بیچ بیچ چلتے ہیں۔ یا دوسری مثال بیدار دہلوی کی دیکھیے۔

انھوں نے پہلے رنگ میں میر تتبع کیا ہے۔ بیدار کے دو چار شعر پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ سہل ممتنع میں میر کی کامیابی کے بعد اس رنگ میں دوسروں کے شعر کتنے پھیکے ہو کے رہ جاتے ہیں ۔

صورت اس کی سما گئی جی میں
آہ کیا آن بھا گئی جی میں

—

دور سے بات خوش نہیں آتی
یوں ملاقات خوش نہیں آتی

—

ہیں تصور میں اس کے آنکھیں بند
لوگ جانے ہیں خواب کرتا ہوں

—

گو بزم میں ہم سے وہ نہ بولا
باتیں آنکھوں سے کر گئے ہم

—

عاشق نہ اگر وفا کرے گا
پھر اور کہو تو کیا کرے گا

—

اپنی آنکھوں اسے میں دیکھوں
ایسا بھی کبھو خدا کرے گا

صاف ستھری زبان ہے، مزے مزے کے شعر ہیں، لیکن ان شعروں کے بعد کے شعر دس پندرہ منٹ سے زیادہ مسلسل نہیں پڑھے جا سکتے کیونکہ ہلکا سا تجربہ ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا جائے تو ہمارے ادبی تجربے میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کرتا کہ ہمیں اس کی طلب ہو۔

بیدار کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ الفاظ کی نشست کا سلیقہ تھا، اور بیس باتیں تھیں۔ جب مجموعی طور سے ان کی شاعری کا تاثر یہ ہوتا ہے تو ہمارے ان نوجوان غزل گو شعرا کی کوششوں کا ماحصل کیا ہو گا، سہل ممتنع کے تازہ ترین نمونے میں جان بوجھ کر پیش نہیں کر رہا ہوں، لیکن بعض شعر تو سہل ہوتے ہوتے مہمل ممتنع کے درجے کو پہنچ جاتے ہیں۔ یوں ضرورت پڑے تو فنکار کو ہر ممکن اسلوب آزمانا چاہیے، لیکن اگر شاعروں کی ایک پوری نسل سہل ممتنع کے پیچھے پڑ جائے اور اسے اپنا واحد ذریعہ اظہار بنا لے تو خطرے کی بات ہے۔ اس رنگ کی ایسی عام مقبولیت صرف ذہنی کاہلی کی علامت ہے، یعنی ظاہری طور پر چاہے غزل نے آزاد نظم کی جگہ لے لی ہو، لیکن ذہنی سطح میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ حال کچھ سقیم ہی ہو گیا ہو گا۔ اس انداز سے چاہے مغربی ادب کی پیروی ہو چاہے اپنی روایت کو از سر نو زندہ کیا جائے، بات برابر ہے۔ جس ادب کی تخلیق میں دماغ استعمال نہ ہو، برساتی کھمبیوں کی طرح ہے جن سے زمین تو ڈھک جاتی ہے مگر غذا حاصل نہیں ہو سکتی۔

(جولائی ۱۹۵۰ء)

حاشیہ

یہاں "ساقی" کے کاتب سے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ شاید اصل میں یہ عبارت اس طرح ہوگی "..... واحد اسلوب سہل ممتنع ہے۔ لیکن آج کل سہل ممتنع کے معنی صرف....."

اِتباعِ میر

ابھی دو ایک مہینے ہوئے میں نے ذکر کیا تھا کہ پچھلے دو تین سال کے عرصہ میں غزل پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مقبول ہو گئی ہے، لیکن چونکہ ہمارے شاعروں کی ذہنی عادتوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں واقع ہوئی نہ ان کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے، اس لیے ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے بیشتر نئی غزلوں اور آزاد نظموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میر کا تتبع بھی عموماً اسی طرح ہوا ہے کہ جن عناصر پر میر کی حقیقی عظمت قائم ہے، انھیں نظرانداز کر کے صرف ایسی باتیں چن لی ہیں جو اپنی طبیعت اور ذہنی ضرورتوں سے مناسبت رکھتی ہوں، یعنی اس زمانے میں میر نے مقبولیت پائی بھی ہے تو صرف میر کی شخصیت اور شاعری کے ایک حصے نے۔ پھر بعض دفعہ میر کی اس مقبولیت کی ایک عجیب توجیہ کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فسادات کے دوران لوگوں کو ایسے ہولناک تجربات پیش آئے ہیں کہ اب ان میں سوچنے کی سکت نہیں رہی، اس کے بجائے جذبات کو بروئے کار آنے کا زیادہ موقع ملا ہے۔ اس وجہ سے شاعر غالب اور اقبال کی پیروی تو کر نہیں سکتے کیونکہ اس میں تفکر کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بجائے میر کی تقلید کرتے ہیں جس میں سوچنے کے بغیر اور خالی محسوس کرنے ہی سے کام چل جاتا ہے۔ اس دلیل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میر کی شاعری فکر کے عنصر سے خالی ہے یا میر سوچ نہیں سکتے، محسوس کر سکتے تھے، یا میر کے شاعرانہ تجربات میں تفکر سے زیادہ جذبات کو دخل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میر کی شاعری کا یہ تصور کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے، اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اس دلیل میں جس قسم کے شاعر کا حلیہ پیش کیا گیا ہے کیا ایسا شاعر اتنا بڑا شاعر ہو بھی سکتا ہے کہ اس کے بعد آنے والا ہر اردو شاعر اس کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرے، اور غالب جیسا "فکری" شاعر چیں بول جائے۔ اگر میر صرف جذبات کا

شاعر تھا تو غالب جیسے شاعر کو جسے معلوم تھا کہ میں اردو شاعری میں نئے عناصر کا اضافہ کر رہا ہوں، اور جسے اپنی برتری کا شدید احساس تھا، میر سے اپنا مقابلہ اور موازنہ کرنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آئی؟

جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میر کے یہاں دو رنگ ہیں۔ میر جذبات کا شاعر بھی ہے، اسے چھوٹے موٹے تجربات کو ایسے حسین طریقے سے پیش کرنا بھی آتا ہے کہ اس معاملے میں بھی دوسرے شاعر آسانی سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن اس کے علاوہ میر کے اندر ایک ایسی زبردست صلاحیت تھی جو کسی دوسرے اردو شاعر میں آدھی تہائی بھی نہیں تھی۔ میر کے دماغ میں اتنی طاقت تھی کہ صرف عشق کے تجربات یا جذباتی تجربات نہیں، صرف "شاعرانہ" تجربات بھی نہیں، بلکہ زندگی کے بہت سے چھوٹے بڑے اور مختلف نوعیت رکھنے والے تجربات پر ایک ساتھ غور کر سکے، اور ان سب کو ملا کر ایک عظیم تر تجربے کی شکل دے سکے۔ روزانہ زندگی کی وہ حقیقتیں جو عام شاعروں کے یہاں شاعرانہ تجربات کو ختم کر دیتی ہیں، اور اسی لیے عام شاعر ان سے بچ کر شاعری کرتے ہیں یا پھر انہیں قبول کر لیتے ہیں تو ان میں لطیف تر تجربات کی صلاحیت نہیں رہتی۔ میر ان حقیقتوں سے کترانا تو الگ رہا، خود آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان غیر شاعرانہ تجربات سے الگ رہ کر پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ تجربات اس کا لازمی جز ہیں اور انہی سے میر کی شاعری کو قوت، عظمت اور ہمہ گیری حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہم صرف زندگی کے چند تجربات خصوصاً لطیف تجربات سے دو چار نہیں ہوتے بلکہ اس شاعری میں ہمیں پوری زندگی ملتی ہے اور اپنے سارے تنوع اور تضاد، رفعتوں اور پستیوں، قوتوں اور مجبوریوں سمیت فکر محض کو شاعری میں سمونا بھی بڑی مشکل بات ہے، مگر تفکر اور شاعری، دونوں کو فنا کرنے والے تجربات کو بھی شاعری میں تبدیل کر دینا ایسی چیز ہے جو روز بروز ظہور میں نہیں آتی۔

اول تو یہی ثابت کرنا دشوار ہے کہ میر کی شاعری تفکر کے عنصر سے بالکل ہی عاری ہے، ممکن ہے کہ خالص مابعد الطبیعیاتی اور مطلق تفکر میر کے بس کا نہ ہو، اور اس قسم کا تفکر ہر بڑے شاعر کے لیے لازمی بھی نہیں لیکن زندگی کی حقیقتوں پر غور و فکر کرنا، اس تفکر کو احساس کی شکل میں بدلنا، دوسری طرف ذاتی احساسات کے متعلق معروضی طریقے سے سوچنا، پھر اس متنوع تفکر اور احساس کو حل کر کے ایک نیا تجربہ تخلیق کرنا، یہی تو میر کی

شاعری ہے بلکہ میر کی عظیم تر شاعری میں فکر اور احساس کے عناصر اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ یہ بتانا بالکل ناممکن ہے کہ پلہ کس کا بھاری ہے۔

پھر میر کو خالص جذبات کا شاعر سمجھنا اس وجہ سے اور بھی مشکل ہے کہ اپنی عظیم تر شاعری میں میر اپنے ذاتی جذبات کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو دوسرے شاعر دیتے ہیں۔ کم سے کم اپنی شاعری کے اس حصے میں (جو محض غنائیہ شاعری بن کر نہیں رہ جاتا) میر اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہی نہیں کہ اپنے جذبات کو کائنات کا مرکز سمجھ بیٹھیں۔ اپنے شدید ترین لمحوں میں بھی ایک عام آدمی کی مجموعی زندگی، ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی، بلکہ ان کی شاعری کا موضوع دراصل یہی مسئلہ ہے کہ فرد کے ذاتی تجربات کا مقام زندگی اور کائنات میں کیا ہے۔ یہ مسئلہ مابعد الطبیعیات سے غیر متعلق نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میر نے اس مسئلہ پر جس انداز سے غور کیا ہے، وہ خالص مابعد الطبیعیاتی تفکر کا انداز نہ ہو لیکن اگر میر کو خالص جذباتی شاعر مان بھی لیا جائے، تب بھی ان کی شاعری کی نوعیت بالکل دوسری قسم کی رہتی ہے۔ جس شاعر کے جذبات کا تعلق براہ راست پوری زندگی سے ہو، وہ اس شاعر سے مختلف قسم کا ہوگا جس کے جذبات کا تعلق صرف خود اس کی ذات سے ہو۔

حاصل کلام یہ کہ ہمارے نئے غزل گو جس قسم کی شاعری کر رہے ہیں، وہ چاہے اچھی ہو یا بُری اس کی ذمہ داری خود انہی کے اوپر ہونی چاہیے۔ اپنی کمزوریوں کی تاویل میں میر کی سند پیش کرنا اور پھر غلط قسم کی سند، کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ اس طرح میر کے ساتھ جو ناانصافی ہو گی وہ تو ہو گی ہی خود نئے شاعروں کو نقصان پہنچے گا کیونکہ وہ اپنی شاعری کی حقیقت بہت دنوں تک نہیں سمجھ سکیں گے۔

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

خانخاناں اور درباری زندگی

کوئی شاعر کسی دربار سے متعلق رہا تو اس سے اس کی زندگی اور شاعری پر کیا اثر پڑا؟

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ہم اس قسم کے اثر کو اچھا سمجھتے ہیں یا بُرا۔ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ اگر ہم دربار سے تعلق رکھنے ہی کو بذاتِ خود بُرا سمجھتے ہیں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ اس قسم کے شاعر کے متعلق غور کرتے ہوئے ہمیں اس کی اچھائیاں بھی بُرائیاں معلوم ہونے لگیں۔ ہر زمانے میں بہت سی رائیں اس بُری طرح رواج پا جاتی ہیں کہ پھر لوگ ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی راؤں میں سے آج کل یہ خیال بھی ہے کہ بادشاہت کا ادارہ بُری چیز ہے، اور جو چیز بھی اس سے متعلق ہو بُری ہے۔ اگر اس جذبہ کو صرف موجودہ زمانے تک محدود رکھا جاتا ہے تب بھی ایک بات تھی، لیکن ہوا یہ کہ بادشاہت کا ادارہ تاریخی حالات یا تاریخی ادوار کا لحاظ کیے بغیر مشروط طور پر قابلِ نفرت قرار پا چکا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے کیا ہم اسے بدل سکتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ زمانہ حال میں ہم اپنے لیے بادشاہت کا ادارہ پسند نہ کریں، لیکن جس زمانے میں اس ادارہ کو ایک بالکل فطری چیز سمجھا جاتا تھا، اس زمانے میں اس ادارہ نے لوگوں پر، اور ان کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں پر ہر دوسرے ادارہ کی طرح کچھ اثرات ڈالے ہوں گے، بعض اچھے بعض بُرے۔ تو اگر ہم ان سارے اثرات کو ایک قلم مردود قرار دے دیں تو ہمارا رویہ سراسر غیر سنجیدہ اور غیر علمی ہوگا کہ اس مخصوص زمانہ میں اس ادارے کی نوعیت اور اس کے اثرات کو ٹھیک طرح سمجھنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ اس مخصوص زمانہ میں اس ادارے کی جو حیثیت تھی، اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں، ورنہ ہم معروضی اور حقیقی معنی میں کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں

کرسکتے۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنے تعصبات سے کام نہیں لینا چاہیے جو مخصوص تاریخی حالات کی پیداوار ہیں، بلکہ تاریخی نقطہ نظر اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ جب ہم یہ غور کرنا شروع کریں کہ کسی شاعر پر درباری زندگی کا کیا اثر پڑا تو پہلے سے یہ فرض نہیں کرلینا چاہیے کہ یہ اثر لازمی طور پر غیر مناسب قسم کا ہی ہوگا جہاں تک کسی شاعر کی زندگی یا شاعری پر دربار کے اثر کا تعلق ہے، یہ اثر زندگی کے دوسرے واقعات کے اثر سے نوعیت میں کسی طرح مختلف یا انوکھا نہیں ہوتا۔ جس طرح افلاس کا معاملہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ غربت سے شاعر کی شاعری بالکل دب اور گھٹ کے رہ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ غربت کے اثر سے ردِ عمل کے طور پر شاعری اور چمک جائے، اسی طرح امارت یا دربار سے تعلق کا معاملہ ہے، اس کے اثرات بھی دونوں ہی طرح ہوسکتے ہیں۔ عام طور سے یہ اثرات (خواہ افلاس کے ہوں یا امارت کے) نہ تو یکسر اچھے ہی ہوتے ہیں نہ بالکل بُرے ہی، بلکہ ان سے بعض اچھائیاں پیدا ہوتی ہیں اور بعض بُرائیاں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دربار سے تعلق ایک طرز زندگی ہے اور اس کے اثرات اسی انداز کے ہوتے ہیں جیسے کسی اور طرز زندگی کے اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تاریخ کے بعض ادوار میں دربار سے تعلق کو ایک معقول اور شریفانہ طرز زندگی سمجھا گیا ہے۔ اگر معاشرے میں اس قسم کے طرز زندگی کو ایک خاص مقام حاصل ہے تو اس سے شاعری کی صلاحیتوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے، بلکہ دربار سے تعلق ان صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا وسیلہ بن سکتا ہے لیکن اس کے برخلاف اگر معاشرے کی روحانی اور تہذیبی زندگی میں دربار کی وہ جگہ باقی نہیں رہی تو پھر درباری زندگی سے شاعر کی صلاحیتوں کو نقصان پہنچنے یا ان کے بے راہ ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ کسی شاعر پر دربار کا کیا اثر پڑا، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس زمانہ میں مجموعی حیثیت سے معاشرے کے اندر دربار کی کیا جگہ تھی، یہ سمجھے بغیر ہم اچھے اور بُرے اثرات کا تعین نہیں کرسکتے۔ پھر اس کے آگے بات شاعر کے مزاج کی آتی ہے۔ ایک ہی زمانہ اور ایک ہی معاشرے میں رہنے کے باوجود شاعر درباری زندگی سے بالکل مختلف اور متضاد اثرات قبول کرسکتے ہیں۔ معاشرے میں دربار کی ایک جگہ ہونے کے باوجود ممکن ہے کہ شاعر کی غیرت یا خود پسندی اس درجہ کی ہو کہ غلامی کا شائبہ تک اسے گوارا نہ ہو اور درباری زندگی اسے ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دے۔ مثلاً نظیری اور عرفی دونوں اکبر کے دربار سے متعلق تھے۔ نظیری کو فی الجملہ اس

تعلق پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر عرفی کو بار بار اپنی آزادہ روی اور دنیا سے بے تعلقی کے اعلان کی ضرورت پیش آتی تھی۔ تو شاعر پر دربار کے اثرات کا معاملہ ایسا سیدھا سادا نہیں ہے، اس میں خاص پیچیدگیاں ہیں، اور شاعرانہ مزاج کی پیچیدگیوں کے ساتھ مل کر یہ اور الجھ جاتی ہیں۔

یہ بات طے کر لینے کے بعد آپ آیئے عبدالرحیم خانخاناں کی طرف۔ خانخاناں صرف شاعر نہیں تھا بلکہ خود دربار والا تھا۔ اکبر کے زمانے میں خود بادشاہ کے بعد شاعروں کی سرپرستی میں خانخاناں کا نمبر تھا۔ بہرصورت دیکھنا یہ ہے کہ اس طرز زندگی کا خانخاناں پر کیا اثر پڑا۔ یہاں ہمیں صرف دربار کا اثر نہیں بلکہ اکبر کے دربار کا اثر کہنا ہے۔ اکبر نے شاعروں اور عالموں کی سرپرستی کیوں شروع کی، یہ سوال تو نفسیات کا ہے، ممکن ہے کہ اس میں اکبر کی ناخواندگی کا بھی کچھ دخل ہو۔ بہرحال اکبر نے کسی نہ کسی تحریک کے تحت اپنے دربار کو ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز اور ایک تہذیبی ادارہ بنانے کی کوشش کی اس نے اچھے سے اچھے عالم اور شاعر ڈھونڈ کے جمع کیے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان میں سے جو لوگ انتظامی امور کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کو اس کا موقع بھی دیا۔ بادشاہ کی تقلید میں خاندانی امرا کو بھی علوم و فنون کی سرپرستی کرنی پڑی۔ یہ ٹھیک ہے کہ خانخاناں جیسے آدمی میں ذاتی جوہر اور شاعرانہ صلاحیت بذاتِ خود موجود تھی، لیکن اکبر کے سوا کسی اور بادشاہ کا دربار ہوتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ خانخاناں محض ایک اچھا سپہ سالار بن کے رہ جاتا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لینے کی اسے فرصت ہی نہ ہوتی، اور نہ ان کی طرف توجہ کرتا۔ چنانچہ خانخاناں کی تہذیبی سرگرمیوں میں اکبر کے دربار کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور موجود ہے، اور کچھ نہ سہی تو یہی بات ہے کہ اکبر کے زمانے میں ایسے امراء کے لیے ترقی کے امکانات کم تھے جنہیں علم و فن سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ کم سے کم اس قسم کا کوئی امیر اپنی تمام دوسری صلاحیتوں کے باوجود اکبر کے مقربین خاص میں شامل نہیں ہو سکتا تھا تو کم سے کم دربار میں ترقی کرنے کی خواہش نے ہی خانخاناں کے ذاتی رجحانات کو اور ابھارا ہو گا اور اس کے اندر مسابقت کا جذبہ پیدا کیا ہو گا۔ محض درباری زندگی اسے شاعر یا عالم تو نہیں بنا سکتی تھی، مگر اکبر کے دربار نے کم سے کم اس پر اتنا اچھا اثر تو ضرور ڈالا کہ اس کی شاعرانہ صلاحیت سلطنت کے نظم و نسق کے جھگڑوں میں پھنس کر ختم نہیں ہوئی بلکہ اسے اظہار اور ترقی کا موقع ملا۔ پھر اکبر کے دربار میں رہنے کی وجہ سے اسے نظیری اور عرفی جیسے شاعروں اور

ابوالفضل اور فیضی جیسے عالموں سے سابقہ پڑا، اور ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنی عزت قائم رکھنے کی فکر میں اسے حاکم اور سپہ سالار ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لینا پڑا۔ خانخاناں کی شاعرانہ صلاحیتیں کس پایہ کی تھیں، اس کا اندازہ کرنا ہو تو مولانا شبلی کی رائے سنیے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر خانخاناں شاعری پر پورا وقت اور پوری توجہ صرف کرسکتا تو وہ نظیری اور عرفی سے بڑا شاعر ہوتا۔ شبلی نے نظیری اور خان خاناں کی دو ہم طرح غزلیں لے کر ان کا موازنہ کیا ہے اور خانخاناں کی غزل کو نظیری کی غزل سے بہتر بتایا ہے۔ اس غزل کے دو ایک شعر دیکھیے ؎

شمار شوق ندانستہ ام کہ تاچند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ادائے حق محبت عنایت است زدوست
وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است

نہ زلف دانم و نے دام ایں قدر دانم!
ز پائے تا بہ سرم ہرچہ ہست در بند است

یہاں یہ عرض وارد ہوتا ہے کہ اگر خانخاناں میں ایسی زبردست شاعرانہ صلاحیتیں تھیں تو یہ درباری زندگی کا قصور ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں سے پورا کام نہ لے سکا۔ مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خانخاناں امیرزادہ تھا، اس کا آبائی پیشہ حاکمی اور سپہ سالاری تھا، وہ یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور تھا، اس لیے جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر خانخاناں کو اکبر کا دربار نصیب نہ ہوتا تو ممکن تھاکہ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اس حد تک بھی ظہور میں نہ آسکتیں۔

پھر خانخاناں کے علوم و فنون کی طرف اتنی زیادہ توجہ کرنے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ خانخاناں بیرم خاں کا بیٹا تھا اور بیرم خاں مرنے سے پہلے اکبر کے خلاف بغاوت کرچکا تھا۔ یہ تو اکبر کی انسانیت تھی کہ اس نے بیرم خاں کے بیٹے کو اس دشمنی کا خیال کیے بغیر اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ان حالات میں خانخاناں کے لیے لازمی ہو گیا کہ نہ صرف ترقی کے لیے بلکہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے بھی اپنے آپ کو ہر طرح سے اس توجہ کا اہل ثابت کرے اور جن جن خوبیوں کی وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں اعتماد حاصل ہوسکے، ان سب میں کمال حاصل کر کے دکھائے۔ چنانچہ خانخاناں کی علم پروری اور سخن

نجی میں اس کے ذاتی حالات اور اکبر کے میلانات کا خاصا دخل ہے۔

اور کچھ نہیں تو خانخاناں کی ہندی شاعری ہی لیجیے۔ اس طرف خانخاناں کی توجہ مبذول کرانے میں اکبر کا کتنا اثر شامل ہے۔ اکبر نے چونکہ ایک بالکل ہی نئی حکمت عملی کی بنیاد ڈالی تھی اور وہ ایک نئے قسم کا کلچر پیدا کرنا چاہتا تھا، اس لیے اپنے دربار میں اس نے عربی اور فارسی کے عالموں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے پنڈت اور ہندی کے شاعر بھی رکھے تھے۔ فارسی شاعری کی فوقیت تو ضرور حاصل تھی مگر ہندی شاعری کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ خانخاناں نے ہندی میں جب دوہے لکھنا شروع کیے تو اس کی تحریک بھی دربار ہی کے زیرِ اثر پیدا ہوئی، عام لوگوں سے ربط و ضبط رکھنے کی وجہ سے نہیں۔ یوں خانخاناں کو ہندی شاعری سے ذاتی مناسبت بھی ہو گئی، مگر یہ شوق دربار کی تحریک کے اثر سے ابھرا۔ پھر ان دوہوں میں خانخاناں نے جو خیالات نظم کیے ہیں، ان کا ماخذ بھی عوام نہیں بلکہ دربار کے پنڈتوں کی صحبت اور دربار کے مذہبی اور متصوفانہ مباحث اور مذاکرے ہیں۔ ہندو تصوف کا مطالعہ اکبر کے دربار میں بہت باقاعدہ طور پر ہوتا تھا، اور پھر اس کا مقابلہ و موازنہ دوسرے مذہب کے تصوف سے کیا جاتا تھا۔ یہیں سے خانخاناں نے اپنے دوہوں کے موضوعات اور اپنا انداز بیان حاصل کیا ہے۔

ہندوؤں کے علوم و فنون سے خانخاناں کا شوق صرف ہندی شاعری تک ہی محدود نہیں رہا، اس نے عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت بھی سیکھی اور جو علوم ہندوؤں سے مخصوص تھے، وہ بھی حاصل کیے۔ مثلاً اس نے جوتش کے متعلق کتاب لکھی ہے جس کا ایک مصرع فارسی میں ہے اور ایک سنسکرت میں۔

اس کی ذہنی زندگی پر دربار کا جو اثر پڑا، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اکبر کو خوش کرنے کے لیے اس نے تزک بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں کیا۔ اس ترجمہ کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے جیسے کہ خود اصل کتاب کی عبارت ہے، لیکن یہ زمانہ ابوالفضل جیسے لسان انشاپرداز کا ہے۔ اس کا اثر بھی خانخاناں پر نظر آتا ہے، چنانچہ اس نے جو عرضیاں بادشاہ کے حضور میں گزاری ہیں، ان میں ابوالفضل کا رنگ جھلکتا ہے اور وہاں خانخاناں نے اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔

یہ تو ہوئیں خانخاناں کی شاعرانہ اور ادیبانہ صفات۔ عالموں کی سرپرستی کا تخلیقی کام سے کوئی تعلق تو نہیں ہے لیکن یہ بیان کرنا بے جا نہ ہوگا کہ خود شاعروں کے دلوں میں

اس کی بڑی عزت تھی۔ اندازہ ہے کہ اکبر کے سوا اس زمانہ میں کسی کی شان میں اتنے قصیدے نہیں لکھے گئے ہوں گے جتنے خانخاناں کی شان میں لکھے گئے۔ یہاں تک کہ ایک صاحب ملا عبدالباقی نے ان تمام قصیدوں کا مجموعہ مع شاعروں کے حالات کے "مآثر رحیمی" کے نام سے ترتیب دیا۔

غرضیکہ چاہے آپ خانخاناں کی شاعری پر غور کریں، چاہے اس کے دوسرے کارناموں کو دیکھیں، اس کی زندگی کا کوئی پہلو دربار کے اثر سے خالی نہیں نظر آتا اور اس اثر میں کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر افسوس کیا جائے، بلکہ فی الجملہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگر خانخاناں کو اکبر کا دربار میسر نہ آتا تو شاید اس کے جوہر نہ کھلتے۔

(دسمبر ۱۹۵۰ء)

منٹو کے افسانے

منٹو کے متعلق لکھنے کی تحریک مجھے اس بات سے ہوئی ہے کہ پچھلے چار سال میں منٹو نے جو افسانے لکھے ہیں، ان کے تین مجموعے بیک وقت "چغد" "ٹھنڈا گوشت" اور خالی بوتلیں، خالی ڈبے" کے نام سے شائع ہوئے ہیں، اس زمانے میں منٹو کے فن میں جو اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کی طرف میں وقتاً فوقتاً اشارے کرتا رہا ہوں، اور ان تینوں مجموعوں میں کئی افسانے اتنی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں کہ ان پر فن کار کی شخصیت یا اور فروعی باتوں سے ہٹ کر صرف و محض انسانوں کی حیثیت سے غور ہونا چاہیے لیکن میرے لیے مشکل یہ آ پڑی ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانے ایسے زمانے میں لکھے گئے ہیں کہ جب صرف "ادبی سازشوں" کے سلسلے ہی میں میرا منٹو سے گٹھ جوڑ نہیں تھا بلکہ فن کار اور پاکستان کے لیے ایک شہری، دونوں حیثیتوں سے منٹو کے اندر جو طرح طرح کی نئی کشمکش جاری تھی، انہیں بھی میں بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ کشمکش اس وسعت اور شدت کے ساتھ کسی اور لکھنے والے میں نظر نہیں آتی تھی، اس لیے میں منٹو کی شخصیت میں اور زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔

اب سے دو سال پہلے اردو کے بہت سے ادبی رسالوں میں یہ بات بہت شد و مد سے ہر مہینے دہرائی جا رہی تھی کہ عسکری اپنی کاروباری مصلحتوں اور ضرورتوں کے لیے منٹو کو استعمال کر رہا ہے۔ منٹو نے اور میں نے اپنی دوستی پر کسی قسم کی روشنی ڈالنے سے احتراز کیا ہے، کیونکہ دوستیاں بحث مباحثے اور رد و قدح کی چیز نہیں ہوتیں۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے، اسے موضوعِ سخن بنانا مبتذل حرکت ہے۔ اپنی دوستی کے خالصتاً ذاتی پہلو پر میں آج بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں ہوں، لیکن افسانہ نگار منٹو کی شخصیت ایسی چیز ہے جس کی صرف مجھی کو نہیں، پاکستان کی تہذیبی زندگی کو،

بلکہ پورے ملک کو ضرورت ہے۔ اسی لیے میں یہ بتانے پر مجبور ہوا ہوں کہ میں نے دو ڈھائی سال کے عرصے میں اس شخصیت کے بارے میں کیا دریافت کیا ہے۔

"نیا قانون" کو تو میں نے ہمیشہ اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے مگر "بابو گوپی ناتھ" پڑھنے سے پہلے مجھے منٹو کی افسانہ نگاری پر سخت اعتراض تھا۔ اس سے مجھے کبھی انکار نہیں ہوا کہ جہاں تک افسانہ لکھنے اور اس میں مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کا تعلق ہے، اس پر تو منٹو کو قدرت حاصل ہے، لیکن مجھے منٹو کی یہ عادت پسند نہیں تھی کہ وہ چھوٹے بڑے، اچھے بُرے اہم اور غیر اہم ہر قسم کے تجربے پر افسانہ لکھتے ہیں۔ اتنا انتظار نہیں کرتے کہ چھوٹے تجربے بڑے تجربوں کی وضاحت کے کام آئیں، اور اس طرح زیادہ پہلو دار افسانہ تخلیق ہو سکے۔ مثلاً منٹو کا ایک افسانہ ہے "پھاہا" اپنی حد تک تو یہ افسانہ ٹھیک ہے، مگر میں یہ کہتا تھا کہ جو شخص "نیا قانون" جیسا معنی خیز افسانہ لکھ سکتا ہو، وہ آخر اتنی ہی بات سے مطمئن ہو کے کیوں رہ جائے۔ لیکن جب "بابو گوپی ناتھ" شائع ہوا تو پتہ چلا کہ منٹو میں چھوٹے تجربوں کو وضاحت کے لیے استعمال کرنے، انہیں آپس میں سمو کر بڑا تجربہ تخلیق کرنے اور متعدد اور متنوع تفصیلات کے ہجوم میں شدید ارتکاز پیدا کرنے کی کتنی بڑی صلاحیت ہے۔ اس افسانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منٹو کی ذہنی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ لحہ بہ لحہ نئے نئے تجربات سے گزرتی رہے بلکہ اس میں ارتقا کی بھی کیفیت ہے، اور منٹو کو اپنے دماغ پر اتنی قدرت حاصل ہے کہ زندگی کا جتنا اثبات اس سے اب تک ممکن ہوا ہے، اسے ایک افسانے کے اندر سمیٹ لے۔ یہ محسوس کر لینے کے بعد "پھاہا" جیسے افسانوں کی نوعیت میرے لیے بدل گئی۔ یعنی اب وہ مجھے بذاتِ خود مقاصد نہیں بلکہ ذرائع معلوم ہونے لگے ہیں۔ منٹو کو بھی یہ پتہ ہے کہ انسانی دماغ اور انسانی زندگی کے بارے میں ان کا علم کتابی نہیں ہے، نہ وہ خالص تفکر کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن زندگی کے بارے میں جو کچھ سوچتا سمجھتا ہے، وہ ٹھوس واقعات اور کیفیات کی مدد سے سوچتا ہے، تو منٹو نے چھوٹے بڑے تجربات کے بارے میں جو افسانے لکھے ہیں، وہ گویا ایک تفتیشی مہم کے حصے ہیں۔ چھوٹے سے تجربے پر افسانہ لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے کم سے کم اتنے ٹکڑے پر فن کار اپنی گرفت مضبوط کر لینا چاہتا ہے، اور اپنے آپ کو بتانا چاہتا ہے کہ میں نے زندگی سے کتنی واقفیت حاصل کر لی۔ یہ منٹو کے ذہنی عمل کا لازمی اسلوب ہے۔ میں ایسے حلقوں سے بھی واقف ہوں جو اس اسلوبِ عمل ہی کو منٹو کا سارا

ذہن سمجھتے ہیں مگر "نیا قانون"، "بابو گوپی ناتھ"، "جانکی" جیسے افسانوں کی موجودگی میں اس قسم کے شبہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان تین نئے مجموعوں میں بھی کچھ ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں بنیادی تجربہ نہ بہت وسیع ہے نہ بہت وقیع، مگر ایسے افسانے بھی ایک نئی جستجو اور جدوجہد کا پتہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ منٹو کے افسانوں کا خام مواد وہی رہے جو ہمیشہ تھا، مگر اپنے خام مواد کی طرف فنکار کا رویہ بدل رہا ہے یوں تو منٹو نے کبھی غیر ضروری الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن اب ان افسانوں میں منٹو کی توجہ اس بات پر مرکوز نظر آتی ہے کہ انداز بیان میں زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جامعیت ہو، کیفیات و واردات کی باریکیاں بھی شامل ہوں اور زورِ بیان بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، جن تفصیلات سے افسانہ ایک ٹھوس تجربہ بنتا ہے وہ بھی موجود ہوں اور تاثر کی وحدت بھی قائم رہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تجربات زیادہ تر اسلوب سے متعلق ہیں، لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ جب منٹو اپنے تازہ ترین تجربات کو سمیٹ کر آئندہ "بابو گوپی ناتھ" جیسا بھرپور افسانہ لکھیں تو اس نئے اسلوبِ بیان کی وجہ سے معنویت میں اضافہ نہ ہو۔

خیر، یہاں تک تو میں نے یہ بتایا ہے کہ "بابو گوپی ناتھ" پڑھنے کے بعد میں نے منٹو کے فن کار ذہن کے متعلق کیا بات دریافت کی، لیکن میں یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ منٹو کی فن کار شخصیت کی جدوجہد کو پورے ملک کے لیے اہم سمجھا جاتا ہے۔ اب اس اجمال کی بھی تفصیل سنیے۔ "بابو گوپی ناتھ" پڑھنے سے پہلے میں شاذ و نادر ہی منٹو سے ملنے جاتا تھا، کیونکہ عام رائے کے بموجب میں بھی منٹو کو ایسا آدمی سمجھتا تھا جس کی ساری دلچسپیاں لوگوں کو چونکانے اور بھڑکانے پر مرکوز ہوں، لیکن اس افسانے سے میں ایسا متاثر ہوا تھا کہ اب میں یہ باور کرنے کو مطلق تیار نہ تھا کہ کوئی چھوٹی شخصیت کا آدمی ایسا افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں فوراً منٹو سے ملنے پہنچا، اور جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا تو میں نے منٹو کو جیسا سنا تھا، اس کے بالکل برخلاف پایا۔ اس وقت پاکستان بنے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے اور ادیبوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ پاکستان کا حقیقت بن جانا کیسا ہی حیرت انگیز واقعہ سہی، مگر اب اسے اپنے شعور میں جگہ دی جائے، مگر اپنے شعور میں تبدیلیاں کرنا، کسی نئی چیز کو شعور میں جگہ دینا، ان سب باتوں میں تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے بیشتر ادیبوں کے ذہن تیار نہیں تھے، اور نہ آج ہیں، البتہ ایک منٹو کا ذہن ہے جو ٹھوس

تجربے سے انکار کر ہی نہیں سکتا، چنانچہ منٹو نے پاکستان کے وجود میں آتے ہی یہ بات مان لی تھی کہ چاہے کہ ہم اس حقیقت کے ظہور کے لیے پہلے سے تیار نہ ہوں، مگر اب اسے اپنے شعور سے باہر نہیں رکھا جا سکتا، اور چونکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے، اس لیے اپنی قبولیت میں اثباتی رنگ کیوں نہ ہو، اور اس حقیقت کو زیادہ سے زیادہ اثباتی چیز بننے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ منٹو نے اگر پاکستان کو قبول کر لیا تھا تو نہ تو اس میں کوئی رجعت پسندی تھی نہ کوئی سازش تھی۔ منٹو کی شخصیت سچے شکار کی شخصیت ہے۔ وہ کسی تجربے کو آخری اور مکمل تجربہ نہیں سمجھتا، ہمیشہ نئے سے نئے تجربے کے لیے تیار رہتا ہے اور جب اسے نیا اور ٹھوس تجربہ حاصل ہو جائے تو اس کے اظہار میں بھی نہیں جھجکتا۔ منٹو کے اندر گہری تبدیلیوں کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے، مگر یہ تبدیلیاں کسی کی فرمائش یا فہمائش سے واقع نہیں ہو سکتیں نہ رک سکتی ہیں، نہ منٹو کے لیے یہ ممکن ہے کہ اپنے تجربات کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ یہیں آ کر منٹو کا دوسروں سے جھگڑا پیدا ہوتا ہے — یعنی ان لوگوں سے جو چاہتے ہیں کہ فن کار اپنے تجربات کا صرف وہی پہلو دیکھے جو ان کی مصلحت بینی فن کار کو دکھانا چاہتی ہے۔ ان لوگوں میں ترقی پسند بھی شامل ہیں، پاکستان کی حکومت بھی اور ہر قسم کے مصلحت کوش اور اقتدار پسند لوگ بھی خواہ وہ اپنے آپ کو خالص ادیب ہی کیوں نہ کہتے ہوں۔ یہ کشمکش کچھ پاکستان تک ہی منحصر نہیں ہے۔ آج ساری دنیا میں فن کار کو یہ لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے۔ مختلف عناصر اس کے تجربات کو مختلف سمتوں میں محدود کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ وہ فن کار کے تجربات کو نہایت موزوں اور مفید آلہ کار سمجھتے ہیں۔ بہت سے فن کار ہیں جو بلند آہنگ آدرشوں سے مرعوب ہو کر یا ذہنی آرام طلبی کی وجہ سے یا تحسین و آفریں کے غلغلوں میں اپنی ہستی اور اس کے فرائض سے غافل ہو کر یہ پابندیاں قبول بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن ہر ملک میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ بھی نکل آتے ہیں جو بالکل طبعی طور پر حد بندیاں قبول نہیں کر سکتے، جنہیں نئے ذہنی اور روحانی تجربات کی ایسی لت پڑی ہے کہ ان کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے، جو اگر اپنے ٹھوس تجربات سے محروم ہو جائیں تو انہیں ایسا معلوم ہو جیسے ان کی آنکھیں چھن گئیں۔ یہ لوگ نہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم انسانیت کے رہنما اور محسن ہیں، نہ انہیں یہ دعویٰ ہے کہ صداقت ہمیں پر نازل ہوئی بلکہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ اپنی اہمیت یا غیر اہمیت پر زیادہ غور کریں۔ انہیں تو ہر وقت یہ دھن رہتی ہے کہ زندگی جس طرح ہمارے تجربے

میں آ رہی ہے، اسے جتنی صحت کے ساتھ بھی ممکن ہو سکے بیان کر دیں، خواہ اس بیان سے کسی کے مفاد کو نقصان پہنچے یا فائدہ۔ ہمارے ملک میں اس قسم کا ایک آدمی منٹو ہے، اور چونکہ منٹو کے سوا اس وقت کا آدمی اپنے یہاں اور کوئی نظر نہیں آتا، اس لیے منٹو کی ذہنی جدوجہد کی اہمیت میری نظروں میں اور بڑھ جاتی ہے ۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جب آپ منٹو کے یہ تین مجموعے پڑھیں تو ذرا اس نقطہ نظر سے بھی غور کیجئے۔ ان تین کتابوں میں آپ کو بہت سے ایسے افسانے ملیں گے جو منٹو کے بہترین افسانوں میں سے ہیں، اور کئی ایسے افسانے ملیں گے جن کا شمار اردو کے بہترین افسانوں میں ہوگا لیکن بعض دفعہ آپ کو یہ احساس بھی ہوگا کہ منٹو نے یہ افسانہ جھلاہٹ یا بیزاری کی رو میں لکھ دیا ہے۔ ممکن ہے درست ہو، لیکن منٹو کی جھلاہٹ بھی سیدھی سادی چیز ہے۔ اس کی تہ میں صداقت کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس، خود اپنے معتقدات کا ایماندارانہ تجزیہ کرنے کی خواہش، مختلف تجربات کا آپس میں مقابلہ اور موازنہ کرنے کی لگن، زندگی کی کسی ایک تفسیر پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے سے انکار، نئے تجربات کی لگن میں نفی کرتے ہوئے بھی اثبات کی خواہش — یہ ساری باتیں آپ کو منٹو کے چھوٹے سے چھوٹے افسانے میں ملیں گی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اسلوبِ بیان کی اتنی تبدیلی اور ایسی زبردست روحانی بے اطمینانی اور بے چینی جیسی ان نئے افسانوں میں ملتی ہے، ضرور اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ منٹو کے قلم سے "بابو گوپی ناتھ" کے برابر کا کوئی اور افسانہ تخلیق ہونے کو ہے۔

(جنوری، فروری ۱۹۵۱ء)

معاشرہ اور ادیب

پاکستان میں ادبی جمود اس درجے کو پہنچ چکا ہے کہ اب تو بتانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہر شخص جسے ادب سے ذرا بھی دلچسپی ہے گھٹن محسوس کر رہا ہے۔ لیکن کمال تو یہ ہے کہ گھٹن محسوس کرنے کے باوجود اس کیفیت کو ختم کرنے کے طریقوں پر غور و فکر بالکل نہیں ہو رہا، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے لوگوں نے اسے ایک ناگزیر یا مستقل کیفیت سمجھ لیا ہو۔ بعض لوگ وقتاً فوقتاً قدرے حسرت کے ساتھ اس آرزو کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اب تو کوئی تخلیقی تحریک شروع ہونی چاہیے، مگر ابھی تک یہ معلوم کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ تخلیقی تحریک کیا چیز ہوتی ہے، اپنے آپ سے پیدا ہو جاتی ہے یا اس کا انحصار دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے، اس کے نمودار ہونے کے لیے ارادی اور شعوری عمل سے بھی کام چل سکتا ہے یا آدمی یقین اور ایمان کامل کے ساتھ انتظار کیے چلے جانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اگر ارادی طور پر تخلیقی تحریک پیدا کر لینا ممکن ہے تو اس قسم کی کوشش کے ہمارے یہاں آثار تک نظر نہیں آتے، نیک نیتی کی البتہ کمی نہیں۔ اگر ہم اس تحریک کے اپنے آپ سے اپنے آپ نمودار ہونے کا انتظار کر رہے ہیں تب بھی ہمارے انتظار میں کوئی شوق یا شدت نہیں ہے، یوں ہی ایک مبہم سی خواہش کبھی کبھی دل میں جاگ اٹھتی ہے، اور وہ بھی چند لوگوں کے دل میں حکومت اور حکومت سے متعلق لوگوں کو تو بذاتِ خود ادب کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور ضروری بھی کیا ہے کہ ہو ہی۔ زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ خود ادیبوں کے دل میں بھی خالص ادبی سرگرمیوں کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو دو سال پہلے تھا، بلکہ اب ایک ایسی نئی بات پیدا ہوئی ہے جو متوازن قومی زندگی کے لیے بڑی مہلک ہے۔ آزادی ملنے سے پہلے عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ادیب قسم

کے لوگ کوئی کام جم کے نہیں کر سکتے اور کوئی ذمہ داری کا کام نہیں سنبھال سکتے۔ چلیے، ٹھیک تھا اس خیال کا تھوڑا سا جواز بھی مل سکتا ہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد سے ایک دو ادیب، چشم بد دور، اپنے آپ کو غیر ادیبوں سے زیادہ کار آمد ثابت کر چکے ہیں، اس لیے ادیبوں کی کارکردگی کے متعلق تو شاید زیادہ شبہات باقی نہیں رہے لیکن دنیاوی منفعت سے ادیبوں کی بے نیازی اور اپنے کام کو بذات خود ہر طرح تسکین بخش سمجھنے کی صلاحیت بڑے سے بڑے مادیت پرستوں سے اور کچھ نہیں تو خراجِ تحیر تو وصول کر ہی لیتی تھی۔ ادیبوں کو چاہے کتنا ہی حقیر سمجھا جاتا رہا ہو لیکن پھر بھی ادیبوں میں کوئی چیز تھی جو ناقابلِ گرفت اور ناقابل فہم تھی اور مرعوب ہونا جانتی ہی نہیں تھی، اس لیے ادیبوں کی اچھی بری کوئی نہ کوئی الگ حیثیت تو تھی ہی۔ اس لیے اور جگہ نہ سہی تو ایک محدود سے حلقے میں ادیب اپنے آپ کو کسی قابل تو محسوس کر سکتا تھا، لیکن اب پاکستان میں ادیب کی یہی الگ حیثیت روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ اربابِ اقتدار کو ادیب اور شاعر یا تو کھیل تماشوں کے وقت یاد آتے ہیں یا جب ان سے کوئی قومی خدمت لی جا سکتی ہو۔ مصیبت یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ادیب بھی اس صورتِ حال کو قبول کرتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے اندر سے وہ غرور غائب ہوتا چلا جا رہا ہے جو فن کار کے لیے اپنی مدافعت کا ہتھیار ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تخلیق میں بھی مدد دیتا ہے۔ شاید ادیبوں کے دل و دماغ پر یہ خیال مسلّط ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ادیب صرف زلہ ربا بن کر زندہ رہ سکتا ہے، اور اس میں ایسا ہرج ہی کیا ہے، صرف مادی نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ عام انسانی نقطۂ نظر سے بھی غور کریں تو واقعی کوئی ایسا ہرج بھی نہیں ہے۔ ایک عام آدمی کو زندگی میں اپنی خود داری سے کتنی دفعہ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، صرف خود داری کے سہارے زندگی نہیں کٹتی۔ تو اگر ادیب بھی اپنے غرور کو بالائے طاق رکھ دے تو ہمیں اتنی جلدی چیں بر جبیں نہیں ہونا چاہیے۔ ادیب کو بھی بعض وقت آدمی بننا پڑتا ہے لیکن یہ بھی نہ ہو کہ بالکل ہی آدمی بن جائے۔ بڑا ادیب پیدا کرنے کے لیے عموماً عام آدمی کا احترام لازمی ہوتا ہے، لیکن ادیب کے لازمی غرور کے بغیر بھی بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ آج پاکستان میں رونا اسی بات کا ہے کہ ہمارا پورا ماحول اسی غرور کا دشمن ہے اور ادیب کو قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اس غرور کا ذرا سا بھی جواز نہیں، اور اب ادیب بھی اس بات کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ آزادی ملنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ قومی زندگی میں ادیب کی حیثیت کچھ بہتر ہو، وہاں ہوا یہ

ہے کہ جو کچھ تھا وہ بھی گنوا بیٹھے۔ اب تو ڈر یہ ہے کہ تخلیقی تحریک شروع ہونے کے انتظار ہی انتظار میں کہیں ادیبوں کے دل سے تخلیق کی خواہش ہی رخصت نہ ہو جائے۔ اول تو پہلے ہی کیا رہی ہے، لیکن ملک میں تخلیقی کام کی بے وقعتی کا یہی حال رہا تو باقی بچی کھچی بھی کے دن اور چلے گی۔

اس تخلیقی لگن کو برقرار رکھنے کے لیے ادیبوں کی خود داری اور عزتِ نفس کو سہارا دینا اشد ضروری ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ادیبوں کو امیروں، وزیروں کے حضور میں باریابی کا موقع ملے، بلکہ خود داری کا زوال تو اسی خواہش سے شروع ہوا ہے۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ادیبوں کے جلسوں میں غیر ادیب آکر صدارت کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں سے کوئی بڑا ادیب نہیں ہے، اور صدارت کرتے ہوئے شاید ہم میں سے ہر ایک کو شرم آئے لیکن ہمارے ادبی جلسوں میں یہ تو محسوس ہونا چاہیے کہ یہاں صرف وہ لوگ جمع ہیں جنھیں تخلیقی کام سے ذاتی دلچسپی ہے اور جو اپنے ذاتی مسائل پر غور کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اور یہاں ان مسائل پر صرف و محض تخلیقی پہلو سے غور ہو گا۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں حال اتنا خراب ہو چکا ہے کہ ہر ادبی انجمن کا بڑا جلسہ غیر ادیبوں کی شمولیت کی وجہ سے صرف رسمیات ہو کے رہ جاتا ہے۔ پی، ای، این کی تو شکایت ہی فضول ہے، وہ ادیبوں کی انجمن ہی نہیں ہے، نہ ادب سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ افسوس نہیں بلکہ رنج تو اس بات کا ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق تک اپنی دیرینہ روایات برقرار نہیں رکھ سکتا۔ صرف ایک حلقے ہی سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ اور کوئی نہ سہی تو یہ انجمن آخر تک خالص ادبی اقدار کی محافظت نہ کرے گی مگر حلقے کے نئے رجحانات دیکھ کر پاکستان میں ادب کے مستقبل کا تصور کرنے سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔

آخر الامر آہ کیا ہو گا
کچھ تمھارے بھی دھیان پڑتی ہے

البتہ اب ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے جس کے متعلق پیش گوئی تو نہیں کی جا سکتی، مگر ممکن ہے کہ اس کی بدولت ادبی فضا کے اضمحلال میں تھوڑی بہت کمی واقع ہو۔ میرا مطلب پنجاب اکیڈمی سے ہے جو صلاح الدین صاحب کی کوششوں سے قائم ہوئی ہے۔ اب تک اخباروں سے جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس میں ایک بات بڑی امید افزا ہے۔ یہ ادارہ حکومت یا کسی اور کا دست نگر نہیں بننا چاہتا بلکہ براہ راست ان لوگوں سے مدد کا طالب ہے

جو ادب کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر شاید اس کا انتظام بھی ادیبوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتابوں کی نشرواشاعت کے سلسلے میں اگر یہ ادارہ کسی ادیب کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو اس کی قدردانی ادیبوں کی طرف سے ہوگی، یا اگر کسی کے ساتھ برا سلوک ہوگا تو وہ بھی ادیبوں کی طرف سے ہوگا، باہر کے لوگوں کی طرف سے نہیں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ادیبوں کا ایک الگ معاشرہ بن کے رہ جانا کوئی مستحسن بات ہے۔ قوم کی وسیع زندگی سے ادیبوں کا بے تعلق ہو جانا تو خود ادب کے لیے بھی سود مند نہیں ہو سکتا۔ لیکن ادب اور ادیب کی حیثیت جب اس طرح گر چکی ہو جس طرح ہمارے ملک میں ہوا ہے تو پھر ادب کی مدافعت اور محافظت کا واحد ذریعہ یہی رہ جاتا ہے کہ ادیب اور ادب سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تخلیقی کام کی حد تک اپنے آپ کو ایک الگ معاشرہ سمجھے اور جس طرح بھی بن پڑے، اپنی کوششوں سے زندہ رہنے کی جدوجہد کرے اور دوسروں کی قدر شناسی یا ناقدر شناسی کو خاطر ہی میں نہ لائے۔ میں تاکید کے ساتھ دہراتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس طرح ایک الگ معاشرہ سمجھ لینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ادیب روحانی طور پر بھی عام لوگوں کی زندگی سے الگ ہو جائے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنے کام کی داد لینے کے لیے ادیب اپنے حلقے سے باہر کہیں نہیں جائیں گے، بلکہ عزت اور ذلت دونوں کا ماخذ اپنی جماعت ہوگی۔ پاکستان میں ادب کی زندگی کا مجھے تو فی الحال صرف یہی طریقہ نظر آتا ہے ورنہ ویسے تو ملک میں ادیب کی اچھی خاصی "مانگ" ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ پاکستان کا ادیب اپنی روح کا مطالبہ پورا کرتا ہے یا کبھی کبھار اسسٹنٹ سیکرٹریوں اور ڈپٹی سیکرٹریوں کے ساتھ بیٹھ لینے میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے۔ اگر ادیبوں کی خودداری کسی طرح زندہ رہ سکی تو شاید مرگر کے کوئی تخلیقی تحریک پھر شروع ہو جائے، لیکن اگر ادیب تک تخلیقی کام کو فخر کی بات نہ سمجھ سکے تو پھر تخلیق کیسی!

(جون ۱۹۵۱ء)

ناپختہ ادب

کسی فن پارے میں فن کار نے اپنے ذاتی حالات کو کس حد تک استعمال کیا ہے، دوسروں کی زندگی کے کتنے اور کیسے پہلوؤں کو اپنے تجربے میں کس حد تک سمویا ہے، اپنے تخیل سے کتنا کچھ ایجاد کیا ہے، پھر اس پیچیدہ مرکب سے اپنے آپ کو کتنا علیحدہ رکھا ہے اور کس حد تک اپنے آپ کو اس میں کھو جانے دیا ہے، یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب پوری صحت کے ساتھ معلوم کرنا دشوار ہے۔ اگر فن پارہ کامیاب ہے تو یہ کام بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے، البتہ نیم پختہ یا بالکل کچی چیز میں اس بات کا اندازہ ذرا آسانی سے ہو جاتا ہے کیونکہ کچا فن کار فن پارے کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ براہِ راست یا ذرا گھما پھرا کے اپنی ڈائری لکھتا ہے۔

یہ کچا پن ہمارے ادب میں شروع سے موجود ہے۔ پندرہ سال پہلے جب ہمارے ادیبوں نے لکھنا شروع کیا، اس وقت سب کے سب نوجوان تھے، اور نو عمر لوگوں کی طرح انہیں سب سے زیادہ دلچسپی اپنے آپ سے اور اپنے ذاتی تجربات سے تھی۔ منٹو ضرور ایک ایسا آدمی تھا جو شروع ہی سے اپنے آپ کو نہیں بلکہ دوسروں کو دیکھتا تھا۔ ممکن ہے کہ جتنی شخصیت منٹو کی اپنے افسانوں میں ظاہر ہوتی ہے، اتنی کسی اور افسانہ نگار کی شخصیت ظاہر نہیں ہوتی، مگر اس کا اظہار براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ اندازِ بیان، فضا، لب و لہجے اور کرداروں کے ذریعے۔ منٹو ہمیشہ دوسروں کی زبان سے بولا ہے۔ یہ بات منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی موجود ہے۔ منٹو کا جو افسانہ سب سے پہلے مقبول ہوا وہ "نیا قانون" ہے۔ یہ بات منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی موجود ہے۔ منٹو کا جو افسانہ سب سے پہلے مقبول ہوا وہ "نیا قانون" ہے اور یہ افسانہ کسی حیثیت سے بھی منٹو کی ڈائری نہیں ہے بلکہ منٹو نے جب کبھی براہِ راست اپنے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، ہمیشہ خراب

افسانہ لکھا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کے اچھے سے اچھے ابتدائی افسانے دیکھ لیجیے، سب کے سب ذاتی رنگ میں ہوں گے، مثلاً احمد علی کا "ہماری گلی" اس میں ذاتی اعترافات کی خامیاں تو نہیں ہیں، مگر مصنف نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم گلی کو اس کی آنکھ سے دیکھیں اور ہمارے اندر وہی ردِ عمل پیدا ہو جو اس کے اندر ہوا ہے۔ کم سے کم اس قسم کی خواہش اس افسانے میں ضرور موجود ہے۔ کرشن چندر کا تو رنگ ہی خالصتاً یہی ہے۔ وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ ہمیں ہر چیز کو مصنف کی آنکھ سے دیکھنے اور مصنف کے ذاتی جذبات میں شریک ہونے کی دعوت دیں، بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم مصنف کو حساس، نیک دل، شریف اور انسان دوست آدمی سمجھیں۔ یوں تو ان کے مقاصد خاصے اچھے ہیں، وہ ہمیں سماجی برائیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے بلاتے ہیں، لیکن جب پردہ اٹھتا ہے تو سماجی بُرائیاں تو کتبوں کی شکل میں دیوار پر آویزاں دکھائی دیتی ہیں اور سب سے آگے بچارا غمزدہ مصنف نظر آتا ہے جس نے منہ پر رحم دلی اور معصومیت بے تحاشا پوت رکھی ہے۔ ہمارے نوجوان ادیب اپنے آپ سے ویسے ہی کون سی کم محبت کرتے تھے۔ کرشن چندر نے انہیں سکھایا کہ ادیبوں کو اور کچھ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ بہرحال، پانچ چھ سال تک اتنی بات ضرور رہی کہ جہاں ادیب اپنے آپ کو محبت کے قابل سمجھتے تھے، وہاں یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ سماج کے ہاتھوں ہم پر ظلم ہو رہا ہے، اور وہ کسی نہ کسی حد تک اس ظالم کو غور سے دیکھنا اور سمجھنا بھی چاہتے تھے، چنانچہ اس احساس کے تحت وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو دیکھنا شروع کر دیتے تھے، لیکن اب ہوا یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم کی حیثیت متعین سی ہو کے رہ گئی ہے۔ اب یہ بات ایسی صداقت بن گئی ہے جس پر غور کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ظالم تو ظالم، اب تو ہمارے ادیبوں کو "مظلوم" سے بھی کوئی گہری دلچسپی نہیں۔ پہلے کم سے کم یہ تو تھا کہ ادیب اپنی زندگی کے واقعات سے مزا دیتے تھے، انہیں اپنے تخیل میں بار بار دہرا کے ان میں تھوڑی سی پیچیدگی پیدا کرتے تھے تاکہ ان سے زیادہ دیر تک مزا لیا جا سکے، لیکن اب تو اس مزے کا احساس اور اس لطف اندوزی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ اب تو ہمارے افسانہ نگار اپنی زندگی کے ہر واقعے کو مکمل اور بنا بنایا افسانہ سمجھنے لگے ہیں۔ ان واقعات سے میرا مطلب صرف وہی باتیں نہیں ہیں جو اپنے ساتھ واقع ہوئی ہوں بلکہ وہ قصے بھی ہیں جو کہیں سننے میں آ گئے ہوں اور اس وجہ سے اہم اور گراں قدر معلوم ہوتے ہیں کہ خود ہم نے سنے

ہیں۔ آج کل افسانوں میں صرف یہی دو قسم کے واقعات استعمال ہو رہے ہیں اور ہمارے ادیبوں کی تخلیقی صلاحیت نے کام کرنا بند کر دیا ہے، ہر افسانہ نگار اپنے تجربات کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور افسانہ لکھتے ہوئے اسے بس یہ جلدی رہتی ہے کہ بوجھ پھینک کے بھاگوں۔ اگر ہمارے افسانہ نگار دوسروں میں دلچسپی نہیں لے سکتے یا غیر ذاتی تجربات کو اپنے اندر نشو ونما پا کر نئی چیزیں بننے کی اذیت برداشت نہیں کر سکتے تو کم سے کم اپنے ذاتی تجربات ہی سے تھوڑی سی علیحدگی اور معروضیت برت سکتے۔ لیکن انہیں اپنے واقعات ایسے عزیز ہیں کہ دم بھر کے لیے سینے سے الگ نہیں کرتے، پھر ان واقعات کی تعداد بھی اُنہیں اتنی اطمینان بخش نظر آتی ہے یا پھر یہ واقعات اُنہیں ایسے پیارے ہو گئے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ نئے واقعات کے مقابلے میں کہیں ماند پڑ کے نہ رہ جائیں، اس لیے ان واقعات کی تعداد میں اضافہ بھی نہیں کرنا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئے افسانہ نگار نے دو ایک دلچسپ افسانے لکھے اور ڈھیرا ہوا۔

کہتے ہیں کہ آج کل بڑے ناول لکھے جا رہے ہیں اور اردو ادب میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے، لیکن زیادہ تر تو یہ اضافہ چھپے ہوئے کاغذوں کے وزن ہی میں ہو رہا ہے۔ عام طور سے تو ان ناولوں میں بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ واقعے سے واقعہ چپکاتے چلے گئے اور ڈھائی تین سو صفحے کا اوسط پورا کر دیا۔ بعض دفعہ تو یہ ہوتا ہے کہ واقعات بلکہ خواہشات کی رو میں ناول نگار صاحب یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ناول میں تھوڑی سی واقعیت بھی ہونی چاہیے، مثلاً ابھی دو چار دن ہوئے میں ایک ناول کے ورق الٹ رہا تھا جو کہتے ہیں خاصا مقبول ہوا ہے۔ اس ناول کے ہیرو ایک صیغہ واحد متکلم ہیں، جو اس لیے مصور بنے ہیں کہ اپنی رشتہ دار لڑکیوں کو سامنے بٹھا کر وینس کا تصور مکمل برہنگی کے ساتھ کر سکیں۔ ناول کی ہیروئن ایک روایتی حیادار اور شرمیلی لڑکی ہے جو گناہ کے خیال سے بھی ڈرتی ہے، مگر مصور کے سامنے بیٹھتے ہی (غالباً مصور کے منہ سے بہتی ہوئی رال سے) اتنی متاثر ہوتی ہے کہ فوراً قمیض کے بٹن کھول دیتی ہے۔ خیر، چلیے یہاں تک بھی مانا کہ ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں لیکن دوسرے دن وہ اپنی اٹھارہ انیس سال کی کمائی صیغہ واحد متکلم کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ناول نگار کی بھی منساہٹ آڑے آ گئی اور قمیض کے ہٹ جانے پر ہی گزری ورنہ وہ تو نہ جانے کیا کیا اتروا لیتے۔ اگر ہمارے ادیب سچے واقعات بیان کر کے ہی مطمئن ہو جاتے تب بھی خیر ایک بات تھی ہم اُنہیں مجبور سمجھ کر معاف کر دیتے، لیکن اب

تو لوگ ان باتوں پر اُتر آئے ہیں جو اپنے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ نہیں ہوئیں۔ تخیل پرستی کے زمانے میں تو بچارے شاعر رگ گل سے بلبل کے پر ہی باندھا کرتے تھے، آج واقعہ نگاری کے زمانے سے تو بس ہوس ہی کھلتی رہتی ہے۔ حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہمارے یہاں کی پچانوے فیصد "ادبی" تحریریں نفسیاتی معالجوں کے لیے چاہے جتنی سود مند ہوں مگر ادبی تنقید کے دائرے سے باہر نکل چکی ہیں۔

(نومبر ۱۹۵۱ء)

تخلیق اور اسلوب

ورجینیا وولف نے کہا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں لوگوں کا کردار بدل گیا اور ۱۹۱۰ء میں بات صرف اتنی سی ہوئی تھی کہ کچھ پاگلوں نے لندن میں فرانس کے بعد تاثراتی مصوروں کی نمائش کر ڈالی تھی۔ یہ بیان ظاہر میں تو بڑا بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے لوگوں کا کردار ہی بدل جائے، لیکن یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ۱۹۴۷ء میں لوگوں کا کردار بدل گیا، چاہے خارجی واقعات کے ذریعے ہی بدلا ہو۔ اگر انسان کے کردار کا انحصار اس بات پر ہے کہ حقیقت کا ردِ عمل اعصاب پر کس قسم کا ہوتا ہے تو کم سے کم چند حساس آدمیوں کی حد تک یہ ممکن ہے کہ اظہار کا ایک نیا انداز وجود میں آئے تو ان کا کردار بدل جائے۔ ممکن ہے کہ اس انداز کا وجود میں آنا بھی بہت سے سماجی عوامل پر مبنی ہو مگر یہ بھی ہو سکتا ہے، بلکہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ہمارے محسوسات میں تبدیلیاں اظہار کے نئے اسلوب کے ذریعہ واقع ہوں۔ اسی حقیقت کو آسکر وائلڈ نے یوں بیان کیا تھا کہ فن فطرت کا تابع نہیں، بلکہ فطرت فن کی نقل اتارتی ہے، ہم کن چیزوں سے دلچسپی لیں کن سے نہ لیں اور کس قسم کی دلچسپی لیں، ان چیزوں کے اور خود اپنی دلچسپی کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہو، یہ سب باتیں ہمیں فن بتاتا ہے۔ ایک فرانسیسی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مُحبّت کرنا فطری چیز نہیں ہے، اسے تو سیکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے کے اسلوب فن متعین کرتا ہے۔ اگر انہی چیزوں کا نام کردار ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ نئے اسلوب کی ایجاد سے ہمارا کردار بدل جاتا ہے۔ اسلوب خارجی حالات یا ماضی اور حال کا عکس بھی سہی، لیکن ساتھ ہی ساتھ نئے اسلوب کی دریافت ایک نئے مستقبل کی تعمیر ہے۔ ہماری اردو زبان، ادب اور اس کے اسالیب ایسے زمانے کی پیداوار ہیں جب ہندوستان میں مسلمانوں کا خارجی اقتدار ختم ہو رہا تھا۔ مگر قوم نے

ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کر کے اپنے کردار، اپنے وجود کو از سرنو ترتیب دیا، اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا، اپنے مستقبل پر ایمان کا اظہار کیا، زندگی کی جدلیات سے عہدہ برآ ہونے کے جتنے داخلی طریقے قوم کے بہترین آدمیوں نے دریافت کیے تھے اور جن پر انسانوں کے کردار کا دارومدار ہوتا ہے، ان کا نقشہ پیش کیا، گویا نئے ذریعہ اظہار کی ایجاد قوم کے لیے نئی زندگی کی تخلیق تھی۔

پھر ۳۶ء کے قریب ایک نیا اسلوب وجود میں آیا، اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا کردار بھی بدلا سیاسی خیالات اور سماجی نظریے تو اور طریقوں سے بھی بدل سکتے تھے، لیکن ایک نئی قسم کی نثر اور نظم، خواہ وہ بُری ہی سہی، پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ عربوں کا طرز احساس اور حقیقت کے جملہ مظاہر کے متعلق ان کا ردِ عمل پہلے جیسا نہ رہا۔ ان تبدیلیوں میں بہت سی باتیں خوش ہونے کی تھیں، بہت سی افسوس کے قابل یہ الگ چیز ہے، لیکن جو لوگ اس نئے ادب کے زیر اثر آئے ان کا کردار تو الگ رہا، حواس خمسہ تک ان لوگوں سے مختلف ہوگئے جن کی نشوونما ۲۰ء سے لے کر ۳۶ء تک والے ادب کے ذریعے ہوئی تھی۔ الفاظ کے نئے انتخاب، جملوں کی نئی ترکیب، فقروں کی نئی نشست، نثر کے نئے آہنگ نے اعصاب کا عمل، بصارت اور سماعت کا انداز بدل دیا۔ بعض چیزیں نظر آنی بند ہوگئیں، بعض نئی چیزیں نظر آنے لگیں۔ یہ تبدیلیاں خفیف اور سطحی تھیں، کچھ ایسی زیادہ وقیع نہیں تھیں۔ یہ سب سہی، مگر تبدیلیاں پیدا ضرور ہوئیں، پھر چونکہ ہمارے ادیب اپنی کوششوں سے بڑی جلدی مطمئن ہوگئے، اس لیے ان تبدیلیوں میں وسعت اور گہرائی نہیں آسکی، بلکہ دو تین سال سے تو ان کا اثر بھی زائل ہونا شروع ہو گیا ہے، اور کہنے والوں کے احساس کا انداز کچھ فلمی قسم کا ہوتا جا رہا ہے۔

سال بھر سے تو حالت اتنی خراب ہوئی ہے کہ نیا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کا تو سوال ہی کیا ہے، ادیبوں میں ایک آدھ اچھا جملہ لکھنے کی خواہش بھی نظر نہیں آتی۔ اول تو اسلوبِ بیان سے دلچسپی نئے ادیبوں کو تھی ہی کم، اور جو تھی بھی وہ اس عقیدے کی نذر ہوگئی کہ ادب خارجی واقعت سے پیدا ہوتا ہے یعنی جب تک کوئی فساد، بلوہ، ہڑتال نہ ہو، ادب کا مواد دستیاب ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جب کوئی ایسا واقعہ پیش آگیا تو وہ بذاتِ خود اتنا دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ جو الفاظ سب سے پہلے آسانی سے مل جائیں۔" ان کی مدد سے اسے بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایسے واقعات میں مشکل یہ ہے کہ سب ہنگامے ایک سے ہوتے ہیں اور ان میں ایک سی باتیں ہوتی ہیں اگر ادیبوں کے پاس ان کے سوا اور کوئی

موضوع ہی نہ ہو تو پڑھنے والے ان کی تحریریں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک ہنگاموں پر ہی کیا منحصر ہے، اگر سب لوگ اپنے اپنے عشق یا ہوس کی داستانیں ایک ہی انداز میں سنانی شروع کر دیں تو بھی یہی حشر ہوتا ہے، جو چیز کسی کے عشق کو دلچسپ بناتی ہے، وہ طرزِ احساس ہے۔ ہمارے ادیبوں میں نہ تو نئے داخلی تجربوں کی سکت باقی رہی ہے نہ یہ شوق ہے کہ جو کچھ اور جتنا کچھ تجربے میں آیا ہے، اسی کے لیے کوئی موزوں اور موثر ذریعہ اظہار ڈھونڈیں۔ بعض اوقات داخلی تجربے اپنے لیے اسلوب بیان پیدا کرتے ہیں، وہاں بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسلوب بیان پیدا ہوگیا تو وہ نئے تجربوں کو وجود میں لاتا ہے، کیونکہ آخر اسلوب داخلی زندگی کی تفتیش کا ذریعہ ہے۔ بظاہر یہ مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے کہ چاہے کچھ کہنے کو ہو یا نہ ہو آدمی بولنا شروع کر دے۔ الفاظ میں معنی اپنے آپ سے اپنے آپ آتے چلے جائیں گے، لیکن اگر ادیب کو اپنے وسائل اظہار سے واقعی گہری دلچسپی ہو تو یہ کچھ ایسی انہونی بات نہیں ہے کہ انہیں استعمال کرنے کی خواہش ہی سے وہ تجربات ذہن میں روشن ہوتے چلے جائیں جو اس اسلوب کی مدد سے بیان ہوں گے۔ والیری نے اپنی کئی زبردست نظموں کے بارے میں بتایا ہے کہ پہلے دماغ میں ایک خاص قسم کا آہنگ پیدا ہوا، پھر ایک فقرہ اُبھر کے شعور کی سطح پر آیا، پھر کچھ عرصے سوچنے کے بعد نظم کا موضوع طے ہوا تو اسالیب بیان سے دلچسپی کوئی ایسی معمولی یا فروعی چیز نہیں ہے جیسی ہمارے یہاں سمجھی گئی ہے۔ تجربے تو ہر آدمی کے محدود ہی ہوتے ہیں، اُن کے لیے ایک نئی ہیئت تلاش کرنے کا شوق انہیں اتنی وسعت اور ہمہ گیری عطا کرتا ہے کہ آدمی بار بار ان کی تشکیل کرتا رہے اور پھر بھی وہ دلچسپی کا باعث بنے ہیں۔ ہمارے نئے ادب کی تحریک اسی لیے اتنی جلدی بے دم ہو کے رہ گئی کہ ہمارے ادیبوں کو اپنے تجربوں سے تو دلچسپی تھی، مگر اسالیب سے نہیں تھی، چنانچہ جب ان کے تجربے ختم ہو گئے تو ان کا لکھنا لکھانا بھی ختم ہوگیا یا ان کی تحریروں میں جان نہ رہی۔ آج کل کا ادبی تعطل بھی اسی وجہ سے اتنا شدید ہے کہ ہمارے داخلی تجربات سطحی اور معدودے چند سہی، مگر ان کی تشکیل کی خواہش بھی تو باقی نہیں رہی ہے۔ جب تک لوگوں میں اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی یا دوسرے الفاظ میں تجربات کی تشکیل کے ذرائع سے دلچسپی نہ ہو، ادب کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں جمود ختم تو کیا ہوگا اور بڑھے گا ہی۔

(دسمبر ۱۹۵۱ء)

عشق، اَدب اور معاشرہ

ہمارے یہاں ایک طرف تو ادیبوں میں تخلیق کی خواہش کمزور پڑ گئی ہے، دوسری طرف نظریہ سازی اور نظریہ بازی کا شوق لوگوں کو ہوگیا ہے۔ نظریہ بازی بذاتِ خود بُری چیز نہیں ہے، ادیبوں میں کوئی قومی تخلیقی لگن موجود ہو تو جھوٹے اور مہمل نظریے بھی کام دے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں نظریہ سازی عموماً ایسے لوگ کرتے ہیں جنہیں زندگی یا ادب کسی میں بھی تخلیقی کام سے کوئی سروکار نہیں، تخلیقی کام کی فطرت اور نوعیت کا کوئی اندازہ نہیں، مگر رشد و ہدایت سے دلچسپی ہے، اس لیے نظریے گھڑتے ہوئے انہیں اس بات کی بالکل فکر نہیں ہوتی کہ ہم جن چیزوں کے بارے میں نظریے بنا رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں کیا جگہ ہے، اور ان نظریوں کی مدد سے تخلیقی کام میں ترقی ہو گی یا تخلیق بالکل ہی بند ہو جائے گی۔ پھر یہ نظریے سیاسی جلسوں میں اس طرح بے سوچے سمجھے دہرائے جاتے ہیں کہ چاہے لوگ انہیں قبول کریں یا نہ کریں مگر کم سے کم دماغ میں موجود رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ فی الجملہ یہ ہوا ہے کہ ادیب کوئی چیز تخلیق کرنا بھی چاہتا ہے تو اسے یقین کے ساتھ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔ میرا مطلب ادبی قدر و قیمت سے نہیں ہے۔ یوں تو آدمی کو اپنی تخلیق کے بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں لیکن بہرصورت ادیب کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے تخلیقی کام کو لوگ قابل قدر چیز سمجھیں گے یا شغل بے کاراں یا بے راہ روی یا اگر اُسے یہی معلوم ہو جائے کہ اس کی تخلیق کو سماج کے لیے مضر سمجھا جائے گا تب بھی وہ اپنا رویہ صحیح طور پر متعین کر سکتا ہے۔ کم سے کم وہ یہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ میرے اور سماج کے درمیان ایک طرح کی عداوت ہے اور میں دوسروں سے کسی رحم یا نرمی کی توقع نہیں کر سکتا۔ ہمارے یہاں بالکل وہی حساب ہوا ہے کہ مرے پر سو درے! ایک تو ادیبوں کے دل میں ویسے ہی

کچھ لکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی، پھراوپر سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سماج سے ہمارا کیا تعلق ہے، دوستی یا عداوت کا یا ایک دوسرے سے بے نیازی کا۔

ہمارے یہاں زندگی میں ادب کی جگہ کے متعلق کیسے کیسے عجیب نظریے رائج ہیں، اس کا اندازہ ذرا اس واقعے سے کیجیے۔ ایک صحبت میں ایک عالم دین نے نصیحت فرمائی کہ اب ہمیں میر اور غالب پڑھنا چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے زوال کی نشانیاں ہیں، اب ہمیں عشق کرنا نہیں بلکہ لڑنا سیکھنا چاہیے چونکہ انہوں نے حسب توقع اقبال کو شہادت میں پیش کیا تھا، اس لیے ایک صاحب نے یاد دلایا کہ اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دوسرے صاحب نے تصریح کی کہ اقبال نے صرف صرف "کبھی کبھی" کی اجازت دی ہے، یہ نہیں کہا ہے کہ دل کو ہمیشہ کھلا چھوڑے رکھو۔ پہلا نظریہ جیسا کچھ ہے وہ تو ہے ہی، مگر اس میں ایک خوبی ضرور ہے۔ اس نظریے میں یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنا قومی غداری کے مترادف ہے۔ چلیے مان لیا، ٹھیک ہے۔ اب جن لوگوں کو ادب پڑھنے اور لکھنے سے دلچسپی ہے، اگر اُن میں ہمت ہے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم غدار ہی بن کر زندہ رہیں گے اور غدار بن جانے میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انہیں برداشت کرنے کو تیار ہیں، لیکن یہ "کبھی کبھی" والا نظریہ قومی زندگی اور فرد کے ذہنی توازن، دونوں کے لیے بڑا خطرناک ہے کیونکہ اس میں یہ مفروضہ شامل ہے کہ ادب اور عشق ہیں تو بُری چیزیں، مگر جیسے چھٹے چھ ماہے اتفاق سے شراب پی لینے یا کوئی چھوٹا موٹا گناہ کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح ان باتوں میں بھی اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس نظریے کے مطابق قومی زندگی کا نقشہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ ہمیں زندگی تو مجاہد کی طرح بسر کرنی چاہیے، لیکن تفریح کے لیے کبھی کبھار کسی سے دل لگالیں یا شعر گنگنالیں تو اتنی بات معافی کے قابل ہے۔ یہ بالکل چھاؤنی کی اخلاقیات ہے۔ یعنی ہفتہ بھر تو محنت سے پریڈ کرتے رہے، چھٹی کے دن آنکھ بچا کے بازار کی سیر کر آئے۔ غور کیجیے اگر کسی قوم کا مطمح نظر اسی قسم کی زندگی بن جائے تو وہ کیا چیز ہوگی۔ انسان میں بہت سی جبلتیں غائب تو نہیں ہو جائیں گی، نہ ان کا علاج یہ ہے کہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اگر وہ جبلتیں واقعی بُری ہیں تو وقتاً فوقتاً انہیں اظہار کی آزادی

دے دینے سے بھی ان کی برائی میں کمی نہیں آئے گی، بلکہ اس طرح تو وہ انسان کی زندگی کو سرتا سر گندگی بنا دیں گی۔ جو آدمی عشق کو گندگی سمجھتا ہے، وہ اتفاقاً عشق کر بیٹھنے کے بعد عمر بھر شرم سے پانی پانی ہوتا رہے گا، اور اسے اپنے اچھے اعمال بھی برائی سے ملوث معلوم ہوں گے۔ ان بری جبلتوں سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ تو یہی ہے کہ ان کی قلب ماہیت کی جائے۔ ان میں لطافت، وسعت، رفعت پیدا کی جائے۔ یہ قلب ماہیت فلسفہ، شعر، ادب اور فن ہی کی مدد سے ہوتی ہے۔ ادب کے اہم ترین اجتماعی فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے۔ عشق کرنا ادب سے نہیں سیکھا جاتا۔ یہ تو ایک جبلت ہے، ممکن ہے بُری جبلت ہو، مگر نسل انسانی کی بقا کے لیے ضروری بھی ہے۔ ادب تو یہ سکھاتا ہے کہ عشق معصومیت اور شرافت کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے اور چھچھورے پن کے ساتھ بھی۔ میر اور غالب کو مٹا دیجئے تو عشق تو لوگ پھر بھی کرتے رہیں گے، البتہ ذرا بے ڈھنگے پن، بے شعوری اور کمینے پن کے ساتھ کریں گے۔ ان عناصر سے قومی زندگی میں چند نئے اضافے تو ہوں گے، مگر ان اضافوں کی قدر و قیمت کیا ہوگی، یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ کلچر اور خصوصاً ذہنی کلچر کا ماحصل یہی ہے کہ انسانی فطرت کے سارے تقاضوں کے لیے مناسب جگہ نکل آئے اور اُن میں زیادہ سے زیادہ غلو پیدا ہو، یہ سب عناصر ایک دوسرے سے الگ الگ یا متصادم نہ رہیں بلکہ پوری زندگی ایک ایسا نقشہ بن جائے جس میں اندرونی ہم آہنگی ہو۔ انسانی تاریخ میں ہر چھوٹی بڑی تہذیب نے یہی کوشش کی ہے، اور اپنی بساط کے مطابق کوئی نہ کوئی نقش مرتب کیا ہے۔ پتہ نہیں "خالص اسلام" نے اس ضمن میں کیا کیا کیونکہ "خالص اسلام" کوئی تاریخی حقیقت نہیں، ہمارے زمانے کے چند زندگی سے ڈرنے والے بزرگوں کا ذہنی مفروضہ ہے۔ البتہ مسلمانوں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے بھی زندگی اور انسانی فطرت کی دعوتِ مبارزت قبول کی، اور جن عناصر کو صرف اچھا ہی نہیں بُرا بھی کہا جاسکتا ہے، انہیں نکھارنے، سنوارنے اور جلا دینے کی کوشش کی۔ رومی، حافظ، سعدی، میر، غالب، آتش یا حالی کے لیے عشق کوئی فروگذاشت یا حادثہ یا جھینپنے کی چیز نہیں تھی، ان کی پوری ذہنی اور روحانی طاقتیں تو اس بات پر صرف ہوئی تھیں کہ جنسی خواہش میں اتنی طاقت اور غلو آجائے کہ وہ صرف تین منٹ کی دل لگی — اور وہ بھی "کبھی کبھی" — نہ رہے بلکہ عام انسانی تعلقات میں بھی وہ جذباتی گہرائی پیدا ہو جائے جو عام آدمی صرف جنسی تعلقات میں دکھا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شاعر عشق کو انسان سے

آگے بڑھ کر فطرت اور کائنات سے متعلق نہ کر سکے ہوں جیسا کہ شیکسپیئر، ڈانٹے، گیٹے، رِلکے، جوئس یا کالی داس نے کر کے دکھایا ہے۔ بہر حال ہمارے ان شاعروں نے عشق کو اتنا ہمہ گیر تو بنا دیا کہ اس میں اجتماعی تعلقات بھی شامل ہو جائیں اور شخصی اور غیر شخصی جذبات کی حدیں مل جائیں۔ ان لوگوں نے عشق کو محض ذاتی اور وقتی تسکین کا وسیلہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے انسانی سماج کی جڑوں میں پیوست کر دیا جب سعدی اپنے محبوب سے شکایت کرتا ہے کہ ؎

سرد سیمینا بہ صحرای روی
لیک بدعہدی کہ بے ما می روی

تو اسے یہ رنج نہیں ہے کہ لو، کبھی کبھی کی تسلی کا ذریعہ بھی ہاتھ سے گیا۔ "بدعہدی" کا ذکر کر کے وہ عشق اور سماجی اقدار میں ایک تعلق اور ہم آہنگی پیدا کر رہا ہے۔ عشق کو تماش بینی سمجھ کے اس پر چار حرف نہیں بھیج رہا بلکہ جنسی تعلقات کو بھی سماجی اقدار کی تنظیم میں لا رہا ہے۔ عشق کو چھپے چوری کی چیز نہیں سمجھ رہا بلکہ عام انسانی تعلقات کا لازمی حصہ بتا رہا ہے جس پر عام اخلاقی معیاروں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فراق کا یہ شعر دیکھئے ؎

آنکھ بھری سی دل اُمڈا سا
آج تو حسن بھی ہے اپنا سا

یہ انسانی ہم آہنگی، یہ انسانی درد، انسانی شخصیت کا یہ رچا ہوا اور بھرپور احساس جس کے بغیر باوقار انفرادی اور اجتماعی زندگی ممکن ہی نہیں، کبھی کبھی کی نظر بازی سے حاصل نہیں ہوتا، عشق اور عام زندگی کو یک جان بنا دینے سے نصیب ہوتا ہے۔ فراق کے شعر میں جن تعلقات کا ذکر ہے، یہ عاشق اور معشوق کے نخرے نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے لذت حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی مل لیتے ہوں۔ یہ دو انسانی ہستیوں کا رشتہ ہے جن میں انسانی روح کے سارے کے سارے عناصر مشترک ہیں جن کی بدولت محبوب صرف جنسی خواہش کی تکمیل کا وسیلہ نہیں رہتا بلکہ عاشق کی انسانی شخصیت کا عکس بن جاتا ہے۔ یہاں فراق نے جنسی خواہش کو بڑھاوا نہیں دیا بلکہ جنسی خواہش کے اندر سے انسانی ہم آہنگی اور لگاؤ کے عناصر نکال کر چمکائے ہیں ؎

آخر الامر آہ کیا ہو گا
کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

کیا میر درد کا یہ شعر صرف جنسی ناآسودگی کا اظہار ہے؟ یا اس میں پورے نظام زندگی کی نامعلوم اور پُراسرار قوتوں کے سامنے انسانی روح کی بے اختیار چیخ گونجتی ہے جو جنسی خواہش رکھنے والے اور جنسی خواہش کا مرکز بننے والے، دونوں کے سینے سے ایک ساتھ نکلی ہے۔ اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ دل کی رسی کبھی کبھی ڈھیلی چھوڑ دینے والے زندگی کو اس عظیم احترام اور استعجاب کی نظر سے دیکھ بھی سکتے ہیں؟

ایک زمانہ تھا کہ صوفیوں اور شاعروں کی روحانی ریاضت کے طفیل ہمارے یہاں عشق کے تصور میں اتنی گیرائی آ گئی تھی کہ میر کے والد مرتے وقت اُنہیں یہ نصیحت کر سکتے تھے کہ "بیٹے، عشق کر"۔ یہ وصیت کرتے ہوئے اتنا تو انہیں صاف طور سے معلوم تھا کہ اس جملے کا مطلب چھٹی کے دن چاوڑی بازار جانے کا ہرگز نہیں۔ کہنا وہ یہی چاہتے تھے کہ اپنے عام انسانی تعلقات میں عشق کی سی شدت اور گہرائی پیدا کرو یا اپنے عشق کو اتنی وسعت دو کہ اس میں سارے انسان سما جائیں۔ میر کے زمانے میں ہماری تہذیب طہارتِ نفس کے اس درجے پر پہنچ گئی تھی۔ آج قومی "ترقی" کے زمانے میں بستر پہ لیٹ کے جہاد کرنے والے اُسے قومی زوال کا دور کہتے ہیں اور میر کی شاعری پر آوارگی پھیلانے کا الزام لگاتے ہیں جس نظام اقدار میں عشق ہمہ گیر بن کر سارے انسانی تعلقات پر حاوی ہو جانے کے بجائے صرف کبھی کبھی کی چیز رہ جائے، اس سماج میں لوگ مجاہد نہیں بنیں گے، بلکہ یہ کوشش کریں گے کہ کبھی کبھی کی بات روز ہی ہوتی رہے۔ اس قسم کی اخلاقیات اور فلسفے سے قلب میں اطمینان نہیں پیدا ہوتا بلکہ بے صبری اور ندیدا پن بڑھتا ہے۔ عشق کو باقی نظام زندگی سے باہر چھوڑ دینے کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اجتماعی اور اخلاقی رشتے کمزور پڑ جائیں۔ اگر اس کبھی کبھی کے عشق والے نظریے نے ہمارے یہاں رواج پایا اور لوگ اس تربیت نفس سے بھی محروم کر دیے گئے جو صرف ادب سے حاصل ہو سکتی ہے تو میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنا تو الگ رہا وہ اپنی بیویوں کو بھی چھوڑ چھوڑ کے بھاگ جائیں گے۔

(اس موضوع پر بحث آئندہ کئی مہینے تک جاری رہے گی)۔

(جنوری، فروری ۱۹۵۲ء)

عشق اور زندگی

تو وہ ایک بزرگ کی نصیحت کا ذکر تھا کہ اگر نوجوانوں نے میر اور غالب کی شاعری پڑھی تو آوارہ ہو جائیں گے اور جہاد کے مطلب کے نہیں رہیں گے۔ اس ضمن میں، مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ پوری قوم کی قوم کا ایک دم سے خواجہ سرا ہو جانا تو ممکن نہیں ہے۔ جب تک انسانوں میں جنسی حس موجود ہے، اس کے متعلق کوئی نہ کوئی رویہ ضرور اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ رویہ "مری جاں زلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھا ہے" والا بھی ہو سکتا ہے، اور "تُو اور آرائش خم کاکل۔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز" والا بھی۔ ان دونوں کے درمیان بڑی بڑی لطافتوں کی گنجائش ہے، لیکن اندیشہ تو یہ ہے کہ ملک میں اور کہیں نہ سہی تو اس کے دارالسلطنت میں جنس کے بارے میں جو رویہ "سرکاری" اور "باعزت" بنتا جا رہا ہے، وہ شاید "زلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھا ہے" تک بھی نہ پہنچ سکے۔ جنس کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا جائے، وہ بہرحال اجتماعی زندگی کی مرکزی اقدار میں سے ہوتا ہے، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہاتھ کے ہاتھ گھڑ کے دیدی جائے۔ خدا جانے کتنے معلوم اور غیر معلوم عوامل کتنے سال تک کام کرتے ہیں تب کہیں جا کے جنسی اقدار کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی لمبے چوڑے اور پیچیدہ عمل کے ذریعے ہماری قوم نے ایک ایسا جنسی رویہ تخلیق کیا تھا جو محض معاشی یا سماجی حالات کا پابند نہیں بلکہ اس حد تک خالص انسانی ہے کہ آج بھی جذباتی زندگی کی ترتیب میں معاون ہو سکتا ہے اور یہ رویہ غالب کے یہاں نہ سہی، میر کی شاعری کی تو جان ہے، اور اسی شاعری کو بعض بزرگ قومی زندگی کے لیے مضر بتاتے ہیں، اور "سرکاری عزت داروں" کے لیے یہ شاعری قابل اعتنا نہیں۔

پہلے اس شاعری کی ضرر رسانی ہی کو لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ شاعری صرف

شہوانی جذبات کا اظہار کرتی ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے، چلیے، امتحان کے طور پر ایک شعر لیتے ہیں ۔

درد ہم اس کو تو سمجھائیں گے پر
اپنے تئیں آپ بھی سمجھایئے گا

میں نے جان بوجھ کر ایسا شعر لیا ہے جسے آپ چاہیں تو شہوانی جذبات کی تمثیل نگاری کے طور پر آسانی سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو صاحب درمیان میں ہیں، وہ وعدہ کرتے ہیں کہ محبوب کو راہ راست پر لے آئیں گے لیکن ناکامی ہوئی تو عاشق کو صبر کرنا چاہیے، لیکن شعر سے یہ مطلب نکالنے کے لیے انسانی دماغ کو ایسی سیدھی سادی اور محدود چیز فرض کرنا پڑے گا جس میں بیک وقت ایک سے زیادہ خیال یا جذبے سما ہی نہیں سکتے۔ کم سے کم "مجاہدانہ اور عملی زندگی" کی تلقین کرنے والے یہی سمجھتے ہیں۔ بہر صورت میر درد "مفید اور صالح" خیالات سے واقف نہیں تھے، انسانی شخصیت کی پر اسرار گہرائیوں کا البتہ انہیں تھوڑا سا اندازہ تھا خیر ممکن ہے کہ اس شعر میں شہوانی خواہش کی تکمیل کا ہی ذکر ہو۔ مگر ایک سیدھی سادی اور واضح جبلی خواہش کے پیدا ہوتے ہی انسانی دماغ میں بیس جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر جب یہ کوئی ایسی خواہش ہو جس سے دو انسانی شخصیتوں میں آویزش شروع ہو جائے تو وہ صورت بھی پیش آسکتی ہے جس کا ذکر فراق نے کیا ہے ۔

وصال کو بھی بنا دے جو عین درد فراق
اسی سے چھوٹنے کا غم سہا نہیں جاتا

فراق کے شعر میں تو خیر بے پایاں استعجاب ملتا ہے لیکن "عملی زندگی" والوں کو بات سمجھانے کے لیے فارسی کا شعر لکھنا پڑے گا، حالانکہ یہ شعر نقل کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا کیونکہ "چہ قیامتی" بالکل "مس فرنٹیر میل" کا اشتہار ہے۔ بہرحال بیدل نے بھی اپنی بساط کے مطابق یہ بات کہی ہے، بلکہ کہہ کے رکھ دی ہے ۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نہ می رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

تو میر درد نے اپنے شعر میں شہوت پرستی کی حوصلہ افزائی نہیں کی، بلکہ جس شخص پر (محبت کا ذکر چھوڑیے) جنس کا غلبہ ہو، اُسے یاد دلایا ہے کہ انسانی ہستی میں بہت سے

عناصر ہیں جنہیں اس وقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ جنسی جذبے کی شدت سے اجتماعی زندگی میں اور خود فرد کی زندگی میں جو خرابیاں واقع ہو سکتی ہیں، ان سے بچنے کی پہلی صورت تو یہی ہے کہ انسانی ہستی کے دوسرے عناصر کو یاد سے محو نہ ہونے دیا جائے بلکہ جنسی جذبے کو ان سے مفاہمت کرنا سکھایا جائے۔ درد نے یہی کیا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ شعروں کی اس طرح تشریح کرنا اور ان کی افادیت جتانا شعر اور عشق دونوں ہی کی توہین ہے، لیکن آج کل ہم لوگ عزت ہی کس چیز کی کر رہے ہیں جو کسی چیز کی توہین ہو۔ بہرحال، میں اپنے چند دوستوں کے سامنے ضرور معذرت خواہ ہوں کہ مجھے عشق کے سلسلے میں "خرابی" جیسا لفظ استعمال کرنا پڑا ۔

ترک محبت کرنے والو کون بڑا جگ جیت لیا!
عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا تھا

محض بحث کی ضرورت کے لحاظ سے مجھے اچھا خاصا گمراہ کن لفظ استعمال کرنا پڑا ورنہ "خرابی" اور "دوستی" کا فیصلہ یوں بستر پر لیٹے لیٹے نہیں ہوا کرتا ۔

تھی شہر شہر زمانے میں جن کی رسوائی
فراق تھے وہی ناموسِ زندگی کے امیں

خیر، تو زندگی کا ایسا نقش مرتب کرنے کے لیے جس میں جنس دوسری چیزوں پر بالکل حاوی نہ ہو جائے، پہلی بات تو یہ ہوئی کہ عاشق اور محبوب دونوں کی ہستی اور اس کے سارے نفسیاتی عناصر کو نظر میں رکھا جائے۔ دوسری اور پہلی سے بھی زیادہ ضروری بات عاشق کو یہ سمجھنی ہے کہ جنس (میں اراداتاً عشق کے بجائے جنس کہہ رہا ہوں) ایک ایسی جبلت ہے جسے بہرحال ایک جسم میں رہنا ہے جس کی بیس ضرورتیں اور بھی ہیں، مثلاً کھانا، پینا، سونا وغیرہ۔ جنسی خواہش کی دھن میں ان ضرورتوں کو بھی نہیں بھولا جا سکتا۔ جنس پر دوسری جسمانی ضرورتوں کو غالب آتے ہوئے دیکھ کر اس جبلت کی طرف حقارت یا تضحیک کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن اس حقارت کا نتیجہ سماجی ضبط یا نظام نہیں ہوتا، بلکہ پوری سماج قحبہ خانہ بن سکتی ہے۔ اعلیٰ اور غیرمادی اقدار کی تشکیل کی بات تو چھوڑیے، یہ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے کہ نسل انسانی کی بقا کے لیے جنسی جبلت کا تھوڑا بہت احترام بھی کیا جائے ورنہ جہاد بغیر مجاہدوں کے ہی کرنا پڑے گا۔ تو اب مسئلہ یہ ہو جاتا ہے کہ آدمی جنس کے علاوہ دوسری جسمانی ضرورتوں کا اعتراف بھی کرے اور ساتھ ہی جنسی جذبے کا

احترام بھی اس کے دل میں باقی رہے — اور یہ حیاتیاتی اعتبار سے ضروری ہے۔ اب دیکھیے، میر نے دونوں حقیقتوں کو کس طرح بیک وقت تسلیم کیا ہے۔

روئے نے رات اس کے جو تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منڈکری سی مار سو گیا

اس سے بھی زیادہ توازن، درد اور عشق کا احترام اس شعر میں ملتا ہے۔

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی طاقت صاحب جی میں آنے دو

یہاں تو خیر میر نے جنس اور زندہ رہنے کی خواہش کا تقابل اور تضاد ہی پیش کیا ہے، اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندہ رہنے کی ضرورت کو عشق پر ترجیح دی ہو، لیکن بعض وقت میر کی نظروں میں عشق کی وقعت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اتنی آسانی سے فیصلہ نہیں کرسکتے۔ شعر نقل کرتے ہوئے مجھے شرمندگی ہو رہی ہے کہ ابھی میں نے عشق کی "خرابیوں" کا ذکر کیا ہے۔ یہ شعر کیا ہے، جو لوگ سمجھتے ہیں کہ عشق سے "خرابیاں" بھی پیدا ہوتی ہیں، ان کے منہ پر میر نے اچھا خاصا جوتا مارا ہے۔ خیر، شعر سنئے۔

کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو
خدا ہی جانے کہ کیا دل میں اس کے آئی ہو

جب جنسی جذبہ لطیف ہو "خدا ہی جانے کہ کیا دل میں اس کے آئی ہو"۔ بن جاتا ہے تو یہ وہی چیز ہے جو آدمی کو جہاد کے میدان میں بھیجتی ہے۔ خالص افادی اور "عملی" نقطۂ نظر سے تو جہاد کے لیے جانے والا سب سے زیادہ "بے عملی" کا نشان ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عمل کے ذریعے اپنے آپ ہی کو فنا کرتا ہے۔ ہمارے یہاں "عمل" کی تلقین کرنے والے "خدا ہی جانے کہ کیا دل میں اس کے آئی ہو" والی حقیقت کو بھول کر "عمل، عمل" چلاتے ہیں، چنانچہ "عمل" واقعی بڑھ رہا ہے، یعنی خود غرضی اور شکم پروری کے معنوں میں۔ ہمارے یہاں تین طبقے چند باتوں میں بالکل ایک جیسے ہیں۔ بااقتدار طبقہ، مولوی اور ترقی پسند، تینوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں، تینوں شعروادب اور روحانی اقدار کے خلاف ہیں اور تینوں "عمل" چاہتے ہیں — اور واقعی "باعمل" ہیں۔

تیسری چیز جس سے جنس یا عشق کو پہلے تو مقابلہ اور بعد میں مفاہمت کرنی پڑتی

ہے، وہ ہے سماجی زندگی اور اس کی ذمہ داریاں "باعمل" لوگوں کو تو صرف "عمل اور جہاد" ہی کی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں، مگر میر کو تو یہ تک یاد رہتا ہے کہ عام آدمی ہر وقت جہاد نہیں کرتا، عام آدمی کی سب سے پہلی مصروفیت نون، تیل، لکڑی ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑے عشق کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ یہاں پھر آدمی کی روحانی قوت کا امتحان ہوتا ہے۔ سماجی ذمہ داریوں کا اعتراف بھی ہوا، اور عشق کی شدت اور اہمیت بھی اپنی جگہ برقرار رہے۔ میر کے کلام میں اس کی ایک مثال دیکھئے ؎

جگر کاوی، ناکامی، دنیا ہے آخر
نہیں آئے گر وہ تو کچھ کام ہوگا!

اگر ہماری شاعری واقعی شہوت پرستی ہے تو یہ شہوت پرستی بڑی مہمل قسم کی ہے جس پر ہر ہر قدم پر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دنیا میں اور بھی بہت سی اہم چیزیں ہیں۔ یوں تو خالص جنسی خواہش میں بھی ایسی تازگی اور ایسا نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے جو اسے شہوت پرستی سے الگ کر دیتا ہے۔ مثلاً جرات کا شعر ہے ؎

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسائے میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

داغ کی شاعری نفس پرستی کے لیے بدنام ہے، لیکن داغ کے یہاں بھی ایسے شعر نکل آئیں گے جو نفسیات اور "عمل پسندی" سے کوسوں دور ہیں ؎

داغِ وارفتہ کو ہم ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغ وارفتہ طبیعت کا ٹھکانا کیا ہے
خانہ برباد نے مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

یہ تو آدمی آدمی پر منحصر ہے۔ بعض لوگ اپنی نماز کو بھی گندہ کر سکتے ہیں، اور بعض لوگ اپنی شہوت کو بھی پاکیزہ بنا لیتے ہیں۔ اپنی شاعری کی روایت میں جس کا تعلق فارسی کی روایت سے بھی ہے۔ (فارسی کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ وہ شاید زیادہ "اسلامی" ہے) یہی کوشش ملتی ہے کہ انسانی زندگی کے "ناپاک" عناصر میں سے بھی گندگی خارج کی جائے۔ آج کل ہم اپنی قومی روایتوں میں "گندگی" ڈھونڈ رہے ہیں، اور ہمیں صرف ایک

چیزپاک نظر آتی ہے۔ اپنا "عمل"

اب تک میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری عشقیہ شاعری میں عشق کو توجہ کا مرکز ضرور بنایا گیا ہے، مگر عشق کو ساری زندگی پر حاوی کردینے کے لیے نہیں بلکہ عشق اور دوسرے عناصر کو ساتھ ملا کر ایک نقش ترتیب دینے کے لیے، پھر اس عشق میں بھی عملی کامیابی اور حصول کو سب سے اعلیٰ قدر نہیں بتایا گیا۔ جن لوگوں کو صرف شہوت پرستی اور "عمل پسندی" درکار ہو انہیں شاعری کا سہارا لینے کیا ضرورت ہے۔ زندگی کا کوئی نیا، بامعنی اور حسین نقش مرتب کرنے کی فکر تو اُسے ہوتی ہے جسے "عمل" کی بے چارگی اور داماندگی کا علم ہو۔ خیر، اب اردو شاعری اور اس کے عشق میں حصول اور عملی کامیابی کی جگہ دیکھیے پہلے میر سے چلیے ؎

فقیرا نہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

کوئی نا اُمیدانہ کرتے نگاہ
مگر تم تو منہ بھی چھپا کر چلے

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

اس کے بعد کچھ شعر سب سے بڑے عشقیہ شاعر فراق کے ؎

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ سازِ درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

فراق اب اتفاقاتِ زمانہ کو بھی کیا کہیے
محبت کرنے والوں سے کسی کو دشمنی کب تھی

دل سے تری قسم تجھے ہم پائیں یا نہ پائیں
لالچ ہے دُور دُور قناعت ہے دُور دُور

کیا یہ سب شہوت پرستی ہے؟ عمل سے بے گانگی ہے؟ یا ان شعروں کے ذریعے انسان جنسی جذبے کی آشفتگیوں سے رہائی پاکر زیادہ متوازن اور زیادہ ہمہ گیر اور دُور رس عمل کے لیے تیار ہوتا ہے؟

جنسی جذبے اور انسانی نفسیات اور معاشرتی زندگی میں مفاہمت پیدا کرنا بھی بڑا کام ہے۔ یہ کام اردو شاعری نے کیا ہے، لیکن اس سے بھی مشکل اور اہم چیز یہ ہے کہ انسان فطرت اور کائنات کے درمیان اپنے آپ کو اجنبی اور بے گھرانہ محسوس کرے۔ یہاں یہ ماننا پڑے گا کہ اردو شاعری تو الگ فارسی شاعری بھی انسان اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکی۔ عشق کے ذریعے صرف حافظ یہاں تک پہنچے ہیں ؎

گدائے مے کدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم

لیکن ستاروں پر حکم چلانا اور اپنے آپ کو ستاروں میں شامل سمجھنا مختلف باتیں ہیں۔ چنانچہ جو تسکین ہمیں شیکسپیئر کی شاعری میں ملتی ہے، وہ اردو یا فارسی کے بڑے بڑے شاعر میں نہیں ملتی۔ بہرحال فراق نے اس طرف کاوش کی ہے مثلاً ؎

تارے بھی ہیں بیدار، زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

لیکن یہ موضوع ایسا ہے جس پر تفصیل سے بحث ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں اسے آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ اگلی دفعہ سے میں اردو اور فارسی کا پیچھا چھوڑ کے (جن سے میری واقفیت واجبی ہی واجبی ہے) مغربی ادب میں عشق کے مختلف تصورات کا ذکر کروں گا — اور فراق کا ذکر تو ظاہر ہے کہ رہے گا ہی۔ عشق اور فراق کی شاعری کی بات چل پڑے تو پھر دو چار صفحے لکھ کے آسودگی نہیں ہوتی ؎

اہلِ دل کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے، راز کی باتیں کرو

(مارچ ۱۹۵۲ء)

عشق اور شعور

جب پاکستان نیا نیا تھا تو سننے میں آتا تھا کہ اب دنیا میں ایک نئی تخلیقی قوت ظہور میں آئی ہے۔ یہ بھی سنتے تھے کہ اب ہر چیز نئی ہوگی، نئی اقدار بنیں گی، نیا کلچر پیدا ہو گا، نئی چیزیں بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ پرانی چیزیں بالکل ختم کی جائیں۔ چنانچہ یہ تخلیقی کام ہمارے یہاں بڑی شدومد سے ہو رہا ہے، مولوی، ترقی پسند اور بااقتدار طبقہ سب اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی زبان، ادب، کلچر سب کو آہستہ آہستہ برخاست کیا جا رہا ہے۔ رہا بچارا اسلام، تو وہ کوئی ایسی تکلیف دہ چیز نہیں۔ نئی تفسیر کے مطابق وہ تو دنیا کا سب سے زیادہ "عقلی" مذہب ہے، اپنی عقل کے ذریعے اسے "حالات" سے ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے۔ رہی شاعری کی مخالفت تو وہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر زمانے کے "ترقی پسندوں" نے اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہا ہے، ہر زمانے کے بااقتدار لوگوں اور مولویوں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی مولوی عورتوں کو مشورہ دیا کرتے تھے کہ اگر انھوں نے "سچ کہو، سچ کہو، ہمیشہ سچ کہو" سے آگے کوئی شعر گنگنایا تو ان کی عصمت زائل ہو جائے گی۔ پاکستان بننے کے بعد سے کلچر کی تخریب کے لیے یہ جہاد کا ایک نیا حیلہ ان کے ہاتھ لگا ہے۔ جن لوگوں میں واقعی جہاد کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ زندگی سے اتنا نہیں ڈرتے کہ جہاد کے سوا ہر چیز ہوا بن کے رہ جائے۔ اگر مجاہد واقعی اتنے کمزور طبیعت ہیں کہ میر کا ایک شعر پڑھ کے ان کا اخلاق خراب ہو جائے تو ان سے تو آپ اور میں ہی اچھا لڑ لیں گے۔

خیر، چلیے یہ بھی مانا کہ میر کا کلام پڑھنے سے اخلاق بگڑتا ہے۔ لیکن جس قسم کے "مجاہد" کا تصور ہمارے عمل پسندوں کے ذہن میں ہے، اُسے اخلاق کی ضرورت ہی کیا پڑے گی؟ جس آدمی میں خواہشات اور جذبات ہوں ہی نہ یا خارج ہو چکے ہوں، وہ تو

اخلاق اور بد اخلاقی دونوں سے ماورا ہے۔ سب سے اچھا اخلاق تو پتھروں کا ہوتا ہے۔ اگر اخلاقیات کے معنی چیزوں کے متعلق اپنا رویہ متعین کرنے کے ہیں تو اخلاق پر اصرار کرنے سے پہلے یہ شرط پوری کرنی پڑے گی کہ آدمی میں چیزوں سے تھوڑا سا لگاؤ تو موجود ہو جو ہر چیز سے بالکل بیگانہ اور بے تعلق ہو اُسے نہ اخلاق چاہیے نہ بے اخلاقی، نہ اُسے گمراہ ہو جانے کا کوئی خطرہ، جس پیچیدہ نفسیاتی عمل کے تحت آدمی کا اپنے گردوپیش سے تعلق قائم ہوتا ہے اسے جنسی جبلت پر مبنی نہ سمجھا جائے تب بھی اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس عمل میں جنس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر شاعر جنسی جذبے کو بھڑکانے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے تو بھی اخلاق پرستوں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے، کیونکہ وہ ایسے حالات تو پیدا کر دیتے ہیں جہاں اخلاق کی ضرورت محسوس ہو اور اخلاق عائد کیا جاسکے۔ انسان کی پہلی ضرورت اخلاق نہیں ہے، بلکہ زندگی کا شعور۔ ممکن ہے عشق بڑی چیز ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر عشق کی مدد کے بغیر زندگی کا شعور پیدا ہی نہ کر سکتے ہوں، لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ شاعر یا فن کار ہی زندگی کا مکمل شعور پیدا کر سکتے ہیں۔ اب اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہوں، وہ مولوی اور اخلاق پرست سدھار لیں۔ آخر ان کا بھی تو کوئی مصرف ہو۔ وہ تو جماد کے مطلب کے بھی نہیں ہیں۔

عشق کے ذریعے شاعر اینٹ یا پتھر سے لے کر چاند تاروں تک کائنات کی ہر چیز کو اپنے شعور میں کس طرح سمیٹ لیتا ہے۔ اس کی مثال یوں تو اردو غزل میں بھی ڈھونڈنے سے مل جائے گی، لیکن سب سے سیدھی سادی اور سامنے کی مثال شیکسپیئر کا "رومیو اینڈ جولیٹ" ہے۔ یوں اخلاق خراب کرنے کا سامان تو شیکسپیئر میں میر سے بھی زیادہ ہے لیکن عشق زندگی اور کائنات کے حسین اور غیر حسین ہر پہلو کا شعور حاصل کرنے کا وسیلہ کس طرح بن سکتا ہے، شیکسپیئر کے اس ڈرامے سے بہتر اس کا مظہر دنیا کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گا۔ رومیو کا عشق اتنا شدید اور وسیع ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ کائنات کی ہر چیز سے ہم آغوش ہو رہا ہے۔ یہ عشق اتنا معصوم اور حسین ہے کہ اس کے دائرے میں آتے ہی ہر چیز کی کثافت دور ہو جاتی ہے اور عشق کی صلاحیت شیکسپیئر نے اپنی تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے دکھائی ہے۔

اگر ہمیں اردو غزل سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو یہ کہ ہمارے شاعروں کا عشق اتنا بے پایاں اور ہمہ گیر کیوں نہیں ہے۔ ہمارے شاعر زندگی کی وسعتوں اور کائنات کی

لطافتوں کا اتنا شدید احساس کیوں نہیں رکھتے جس سے ہمارا اخلاق زیادہ وسیع، حسین اور جرات آمیز بن سکے۔ اگر ہمیں یہ شکایت پیدا ہو تو ایسا اعتراض تخلیقی ہو گا۔ اسے پتہ چلے گا کہ ہم اپنے کلچر میں اضافہ چاہتے ہیں، لیکن یہ شکایت کہ اردو غزل آوارہ گردی سکھاتی ہے اور اس لیے اس سے دامن بچانا چاہیے، ملک میں آورہ گردی کو فروغ دینے کے مترادف ہے، بلکہ اس اندازِ نظر میں تو یہ بھی صلاحیت ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کو بھی ناپاک بنا دے۔ اگر ہمیں پاکستان میں نیا کلچر اور نئی اقدار پیدا کرنی ہیں تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اُسے بھی مٹا دیں۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ ہمارا کلچر کن باتوں میں محدود ہے، اور اپنے کلچر کی روح برقرار رکھتے ہوئے ہم اسے کس طرح وسعت دے سکتے ہیں۔ اس دفعہ کا مضمون تو سرسری نوٹ بن کے رہ گیا، اگلے مہینے بشرط فرصت عشق کے چند ایسے تصورات کا ذکر کروں گا جو مغربی ادب میں ملتے ہیں، ہمارے ہاں نہیں یا ان کے ہاں زیادہ وضاحت سے ملتے ہیں۔

(اپریل ۱۹۵۱ء)

انتظار حسین کے افسانے

انتظار حسین صاحب نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "گلی کوچے" کے دیباچے میں اپنے نئے دستور کے مطابق تورگینیف کے کسی ناول میں سے ایک جملہ نقل کیا ہے:

"جس مرد کو اپنے دل و دماغ کی خبر نہیں ہے، اس غریب پہ تو ترس ہی کھانا چاہیے۔"

چونکہ انہیں شک ہے کہ اُن کے افسانے صحیح معنوں میں افسانے ہیں بھی یا نہیں، اس لیے انہیں اپنے اوپر ترس آتا ہے، اور پڑھنے والوں سے بھی وہ اس ردعمل کی توقع رکھتے ہیں۔ اگر پڑھنے والے ان کی توقعات پوری کر دیں تو طرفین کے درمیان بڑی اچھی مفاہمت ہو جاتی ہے لیکن مجھے تو انتظار کے افسانوں کے متعلق لکھنا ہے، اگر مَیں اُن پر یا اپنے اوپر ترس کھانے پر بیٹھ جاؤں تو میرا مضمون کیسے آگے چلے، ویسے آج کل دانش مندی اسی میں ہے کہ آدمی لکھنے والوں پر ترس کھائے اور چپکا بیٹھے رہے۔ لیکن انتظار حسین بہرحال اُن دو ایک باقی الصالحات میں سے ہیں جن کی تعریف کرنا اتنا ضروری نہیں ہے، اور جن کے افسانے سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ افسانے لکھنے سے پہلے افسانے کی کوئی منطقی تعریف ذہن میں رکھنا ضروری نہیں ہے۔ نہ یہ لازمی بات ہے کہ ہر آدمی کا افسانہ کسی نہ کسی مروجہ سانچے میں ڈھلا ہو۔ بہرحال جب کسی کے دس بارہ افسانے سامنے موجود ہوں اور اُن میں تھوڑی بہت ظاہری اور باطنی یگانگت بھی موجود ہو تو کم سے کم اُن افسانوں کی حد تک تو کوئی منطقی تعریف ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ انتظار کی کتاب پڑھنے کے بعد ان کے افسانے کے متعلق کچھ کہنا چاہیں تو سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان افسانوں کا مجموعی تاثر انفرادی تاثر سے زیادہ قوی ہے۔ انتظار کی کتاب بند کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا

کہ اس میں کتنے افسانے ہیں کیونکہ سبھی افسانوں کی فضا، کردار، مکالمے بالکل ایک ہی جیسے ہیں۔ یوں اُن کے افسانے میں کوئی نہ کوئی کردار ضرور ایسا ہوتا ہے جس پر اوروں سے زیادہ توجہ صرف کی گئی ہو۔ مگر ضمنی کرداروں کے بارے میں یہ یاد رکھنا دشوار ہے کہ وہ کون سے افسانے میں واقع ہوئے ہیں۔ ایک افسانے کے چھوٹے کردار بڑی آسانی سے دوسرے افسانوں میں منتقل کیے جا سکتے ہیں۔ پھر بڑے چھوٹے سب کرداروں میں تھوڑے بہت انفرادی اختلافات کے باوجود یکسانیت ہے۔ انتظار انفرادی کرداروں کے بجائے ایک ٹائپ پیش کرتے ہیں، یا چند ٹائپ۔ پلاٹ تو خیر ان کے افسانوں میں ہوتا ہی نہیں، لیکن جو تھوڑا بہت عمل ُان کے یہاں نظر آتا ہے، اس میں بھی فی الجملہ یکسانیت ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کی شکل کچھ اس طرح کی ہے کہ پہلے تو چند آدمیوں کی زندگی کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے، پھر پاکستان بن جاتا ہے، اور افسانے کے آخر میں کچھ لوگ تو پاکستان چلے آتے ہیں، کچھ نہیں آتے۔ انتظار کو اپنے کرداروں کی باطنی یا نجی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے — سوائے عقیلہ خالہ کے انہیں تو کرداروں کی زندگی کے صرف اس پہلو سے دلچسپی ہے جو دوسروں کے سامنے آتا ہے اور جسے گلی میں سے گزرتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے؛ ایک نظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ بار بار دیکھنے سے بھی تاثر میں نئے اضافے نہیں ہوتے، بس پہلا تاثر شدید ہوتا جاتا ہے، چنانچہ انتظار اپنا مرکزی کردار ایسے آدمی کو بناتے ہیں جس کی زیادہ تر زندگی دوسروں کی نظروں کے سامنے گزرتی ہو۔ چنانچہ یہ دوسرے لوگ بھی افسانے کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی مرکزی کردار، بلکہ شاید زیادہ ہی کیونکہ جس طرح پرانی داستانوں میں دیو کی جان کسی طوطے کے اندر ہوتی تھی، اسی طرح انتظار کے مرکزی کرداروں کی جان اپنے حلقے کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس کردار کو اپنے مخصوص حلقے میں سے نکال لیجیے، بالکل مردہ ہو کے رہ جائے گا۔ ہندوستان سے پاکستان چلے آنا تو دور کی بات ہے، ان کرداروں کو اُپنے شہر سے ہٹا کر کسی دوسرے شہر میں پہنچا دیجیے، وہ بات ہی نہیں رہے گی۔ پاکستان بننے سے انتظار کو فائدہ یہ پہنچا ہے کہ اُن کے کرداروں کی یہ اندرونی کمزوری چھپ گئی، اور رقت لبھاؤ میں مل گئی۔ دوسرے یہ کہ افسانوں کے خاتمے آسان ہو گئے۔ یہ بھی ایک قسم کا ادبی الاٹمنٹ ہے۔ آج کل جس قسم کا ادب پیدا ہو رہا ہے، اس کے پیش منظر مجھے احساس ہے کہ میں بچارے انتظار پر خواہ مخواہ طنز کر گیا لیکن میں اپنے تعصبات سے کیسے پیچھا چھڑاؤں، ادب میں مجھے ایسے کردار زیادہ

پسند نہیں جن کی زندگی میں معنویت خارجی واقعات کے طفیل آئی ہو پچھلے پانچ سال میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں، ان کا مجھے پورا احساس ہے، لیکن پھر بھی مجھے انتظار سے شکایت ہے کہ انہوں نے افسانوی تاثر کا سارا بوجھ انفعالیت پر کیوں ڈال دیا۔ اب تو ان کی خاصی عمر ہو گئی۔ کرشن چندر کا اثر اتنے دن تک نہیں چلنا چاہیے۔ انتظار کے کرداروں کی انفعالیت کا اندازہ ٹھیک طرح اس وقت ہوتا ہے جب ان کا مقابلہ اشرف صبوحی کے کرداروں سے کیا جائے۔ "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں اشرف صبوحی نے بھی ایسے کردار پیش کیے ہیں جو ایک خاص ماحول اور خاص تہذیب کی پیداوار ہیں، ان کے ماحول میں بھی شدید تبدیلیاں ہوئی ہیں، لیکن وہ اپنے رنگ میں ایسے رچ گئے ہیں کہ ماحول کی تبدیلیوں سے ان کے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ان کے کردار اور مزاج کو واضح ہونے کے لیے کسی خاص حلقے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انہیں کسی اور ملک میں پہنچا دیجیے، تب بھی ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ اشرف صبوحی کے کرداروں کو اپنی اقدار پر ایسا ایمان ہے کہ وہ کسی اور نظام اقدار کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو لوگ ایسے جامد ہو گئے ہوں اور حالات سے کسی قسم کا سمجھوتہ ہی نہ کر سکتے ہوں، وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر یہی خامی ان کی شخصیت کو بذاتِ خود مکمل بنا دیتی ہے۔ اسی لیے ان کرداروں میں ایک المیہ شان ہے اور یہ المیہ باطنی اور اندرونی ہے، حالانکہ اشرف صبوحی نے رونے رلانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برخلاف انتظار کے کرداروں کی شخصیت اتنی مضبوط نہیں کہ گردو پیش کی تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکے۔ ان کے کردار تو بس یہ دیکھ کر کہ انار کلی میں میرٹھ کی سی ریوڑیاں نہیں ملتیں، پانی کے بتاشے کی طرح پچک جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی "رزمیہ" ہمیشہ بن لکھی ہی رہے گی، کیونکہ ان میں مدافعت کی وہ طاقت نہیں ہے جو اشرف صبوحی کے کرداروں میں ہے یہ لوگ تو بدلنا چاہتے ہیں، مگر اپنے آپ کو بدلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، بس حالات سے پس کر رہ جاتے ہیں، چنانچہ افسانوں کے جس حصہ میں انتظار رونے رلانے کا بندوبست کرتے ہیں، وہ نہ تو المیہ ہے نہ زرمیہ، محض سوز خوانی ہے۔ انتظار کے کردار ہی ایسے ہیں جو صرف سازگار ماحول میں ہی پنپ سکتے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں کہ اپنا ماحول خود بن سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسے کردار غیر حقیقی نہیں ہیں، مگر یہ کیا ضرور ہے کہ کردار کی شکست دکھانے کے لیے افسانہ نگار خود بھی شکست زدہ بن جائے۔ یہ سب باتیں لکھنے سے میرا مقصد تنقیص نہیں ہے۔ اگر میں انتظار

کے افسانوں میں کوئی وصف نہ دیکھتا تو انہیں سمجھنے کی کوشش ہی کیوں کرتا۔

ان افسانوں کا قابل قدر حصہ وہی ہے جو دل گداز ہو جانے سے پہلے آتا ہے۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں، ان کے مرکزی کردار ایک خاص مقام پر اور ایک خاص حلقے میں ہی اپنا اظہار کرسکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اصل کردار گلی کوچے ہیں، اشخاص ان گلی کوچوں کی فضا کو نمایاں کرنے کا ایک وسیلہ ہیں۔ انتظار نے اپنی کتاب کا نام بہت موزوں رکھا ہے۔ یہی ان کے افسانوں کی منطقی تعریف ہے۔ انتظار کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان بننے اور گھر بار چھوڑنے کے بعد افسانے لکھنے شروع کیے، یعنی ایک حادثے نے اُنہیں افسانہ نگار بنایا، چنانچہ اب یہ ان کے لیے ناممکن سا ہوگیا ہے کہ اپنی یادوں کو یادیں نہ سمجھ کر افسانہ لکھیں۔ اسی چیز نے اُن کی کہانیوں میں ایک اضمحلال، ایک بڑھاپا سا پیدا کر دیا ہے۔ یوں انتظار میں کردار کا احساس بھی موجود ہے، فضا بھی پیدا کرسکتے ہیں، زبان میں بھی روانی ہے، لیکن صحیح معنوں میں افسانہ وہ اسی وقت لکھ سکتے ہیں جب وہ اپنی یادوں پر قابو پالیں۔

آخر میں یہ تنبیہہ پھر ضروری ہے کہ میں انتظار کی خامیوں پر زور نہیں دے رہا ہوں، بلکہ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ان کی تحریروں میں بعض کمزوریاں نہ ہوتیں تو ان کے افسانے اور بھی اچھے ہوتے۔

(جولائی، اگست ۱۹۵۲ء)

بے تعلقی اور بے اعتنائی!

اگر کوئی بات بار بار کہی جائے تو چاہے اُسے دہرانے والے احمق لوگ ہی کیوں نہ ہوں اور ان کی یہ حیثیت ظاہر ہی کیوں نہ ہو، مگر اس سے وہ لوگ بھی اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنہیں عام حالات میں یہ خیال بالکل مہمل معلوم ہوتا۔ پھر اگر دماغ کو انفعالی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو ہر قسم کے نظریوں سے بے تعلقی کا دعویٰ کرنے کے باوجود بعض ہلکے پھلکے خیالات دماغ میں نفوذ کر جاتے ہیں، ہر قسم کے نظریوں سے بے تعلقی بھی بُری چیز نہیں، کم سے کم ادب اور فن کی حدوں میں، لیکن ہمارے دماغ کو یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کس نظریے سے کیوں بے تعلق رہیں۔ بے تعلقی اور بے اعتنائی میں بڑا فرق ہے۔ بے تعلقی کا درجہ حاصل کرنے کے لیے پہلے چیزوں کا خیالات سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد تعلق توڑنے کی منزل آتی ہے، یعنی دماغ فاعلی حیثیت سے عمل کرتا ہے۔

بے اعتنائی میں دماغ کی حالت انفعالی ہوتی ہے۔ جب ذہن میں اتنی قوت نہ ہو کہ چیزوں پر عمل کر سکے تو چیزیں اس پر عمل شروع کر دیتی ہیں، اور حاوی ہو جاتی ہیں۔ بے تعلقی اپنے اختیار کی چیز ہے اور ذہنی اور روحانی کاوش سے حاصل ہوتی ہے۔ بے اعتنائی میں آدمی کسی چیز سے بھی تعلق توڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ بغیر اپنے اختیار کے بے جانے بوجھے، چیزوں سے منسلک ہو کے رہ جاتا ہے۔ پھر وہ چیزوں کو اپنے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا بلکہ چیزیں اسے اپنے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ بے تعلقی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی کو اپنے اندر کوئی مرکز مل گیا ہو۔ بے اعتنائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی اندرونی مرکز ہی نہ رہا ہو۔ بے تعلقی آزادی ہے۔ بے اعتنائی اندھی غلامی کا دوسرا نام ہے۔ اگر بے تعلقی اعلیٰ ترین اخلاقی صفت ہے تو بے اعتنائی سب سے بڑی بدی ہے۔ اس

سے بد اور کون ہو گا جو بد بھی نہ ہو سکے؟ کوئی تاجر یا ساہوکار اس بات پر فخر کرے کہ مجھے کسی نظریے سے کوئی سروکار نہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس نے چند ٹھوس چیزوں سے اپنا تعلق مضبوط کر لیا ہے۔ لیکن اگر ادیب، شاعر اور فن کار یہ کہیں کہ ہمیں کسی نظریے، کسی خیال سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر یہ تشویش ہوتی ہے کہ ایسے لوگ ادیب، شاعر اور فن کار رہ بھی سکیں گے یا نہیں۔

آج کل ہمارے یہاں جس ادبی جمود کی شکایت کی جا رہی ہے، اس میں اس بے اعتنائی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے ہمارے ادب میں، جو تخلیقی لہر آئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ادیبوں نے اپنے ذہن کی فاعلی قوت سے کام لیا اور جو نظریہ بھی سامنے آیا اس کی مدد سے پوری زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ نظریے اچھے تھے یا بُرے، یہ کوشش طفلانہ تھی یا پختہ کارانہ تھی، اس سے بحث نہیں، مگر کوشش ہوئی ضرور، اور کسی نہ کسی حد تک پوری زندگی کو سمجھنے کی کوشش ہوئی۔ آج کل ترقی پسندوں کو پشیمانی ہے کہ اس زمانے میں ہم نے ہر نئے لکھنے والے کو ترقی پسند کہہ دیا اور یہ نہ دیکھا کہ سماجی مسائل کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے، لیکن دراصل ۳۶ء اور ۴۴ء کے درمیان ترقی پسندی محض ایک ذہنی کیفیت تھی۔ جو آدمی اپنے دماغ سے کام لیتا نظر آتا تھا، اُسے اپنے اور غیر دونوں ترقی پسند کہنے لگتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کمیونسٹ پارٹی تو ترقی پسند تحریک کو ہمیشہ سے اپنا آلہ کار سمجھتی تھی اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی، لیکن ادیبوں کا ذہنی تجسس اور تخلیقی لگن انہیں کسی پارٹی کے سانچوں میں نہ ٹھہرنے دیتی تھی۔ جب ان دونوں چیزوں میں کمی آنے لگی اور جو لوگ ادیب بن چکے تھے، انہوں نے ادبی صلاحیتیں استعمال کیے بغیر ادیب بنے رہنا چاہا اور پھر نظریے زندگی کی تفتیش کا ذریعہ نہ رہے بلکہ اُنہوں نے زندگی کی جگہ لے لی۔ چنانچہ ان ادیبوں نے تو دماغ سے کام لینا یوں چھوڑا۔ باقی جو ادیب بچے، ان میں سے زیادہ تر اس نظریے بازی سے اس قدر بیزار ہوئے کہ انہوں نے طے کر لیا کہ ہر قسم کے نظریوں سے دلچسپی ادب کے لیے مہلک ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے چند نظریات کو جانچ پڑتال کے بعد ترک کر دیا ہو، بلکہ تمام نظریوں سے دامن بچانا وہ ادبی فریضہ سمجھنے لگے۔ نظریوں کو اختیار کرنا تو الگ رہا، نظریوں پر غور کرنے سے بھی انہیں عار آنے لگی۔ یعنی انہوں نے اپنے ذہنی تجسس ہی کا گلا گھونٹ دیا۔ پوری زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنے سے وہ یوں ڈرنے لگے کہ کہیں کسی نظریے کا شکار

نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کے پاس ایک ہی موضوع رہ جاتا ہے، یعنی ذاتی اور لمحاتی تاثرات۔ مگر پاکستان ایک نیا نیا ملک ہے جہاں ہر چیز اپنی خام شکل میں موجود ہے اور ہمیں اسے کوئی واضح صورت بخشنی ہے، اس لیے ہمارے سامنے جتنے مسائل ہیں، سب بنیادی ہیں اور پوری زندگی پر غور و فکر کے بغیر ہم ان کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکتے۔ ادیب اپنی پوری کوشش کے باوجود اس صورتِ حال سے بھی نظر نہیں بچا سکے۔ کم سے کم غیر شعوری طور پر یہ احساس ان کے اندر ضرور موجود ہے کہ ہم ادیب کی حیثیت سے بھی ان مسائل سے بچ کر نہیں بھاگ سکتے۔ چنانچہ اپنے ذاتی تاثرات پر بھی وہ یقین باقی نہیں رہ سکا۔ جس کی مدد سے بڑا ادب نہ سہی، کسی نہ کسی قسم کا ادب تو پیدا ہو سکتا۔ یعنی ایک طرف تو وہ تجربات ہیں جنھیں خارجی یا داخلی وجوہات سے ادیب اپنے شعور میں نہیں لانا چاہتے، دوسری طرف وہ تجربات ہیں جو لاشعوری طور پر بے وقعت معلوم ہوتے ہیں، پھر ادیب اپنی اس اُلجھن کو سمجھنا بھی نہیں چاہتے، کیونکہ ان کے نزدیک سوچنے سمجھنے کا مطلب نظریہ سازی ہے جو ادب کے لیے مہلک ہے۔ اس لیے ادیب یہ بات بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ان کے اندر کوئی اُلجھن ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رسالوں کے خاص نمبروں میں تو ہمارے مضمون، افسانے، نظمیں اور غزلیں آ ہی جاتی ہیں، یہ ہمارے ادیب ہونے کا بہت کافی ثبوت ہے۔

جب ہمارے ادیبوں میں خود اپنی ناکامی سے آنکھیں چار کرنے کی جرات نہیں تو ملک گیر یا عالم گیر یا کائنات گیر مسائل کو اپنے شعور میں جذب کرنے کی صلاحیت کہاں سے ہوگی!

یہ جرات پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہمارے ادیبوں کو دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی ہوتی اور وہ اپنے مسائل کو اجنبیوں کے نظریات کے ذریعہ اور ان نظریات کو اپنے مسائل کی روشنی میں پرکھ سکتے۔ لیکن جیسا میں نے شروع میں کہا تھا اگر ذہنی تجسس کم ہو جائے اور بے اعتنائی بڑھ جائے تو ذہن خالی ہو کے نہیں رہ جاتا، بلکہ ہر قسم کے الم غلم خیالات بلا کسی روک ٹوک کے آ کر دماغ میں جم جاتے ہیں۔ جب پاکستان بنا ہے تو کچھ ایسے لوگوں نے جنھیں ادب یا کسی تخلیقی سرگرمی سے براہ راست دلچسپی نہ تھی اور نہ اپنے مسائل کو ساری دنیا اور انسان کے مسائل کے ساتھ ملا کر دیکھنے کی اہلیت رکھتے تھے، یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب ہمیں مغرب کی تہذیب سے دلچسپی لینے

کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہماری تہذیبی روایت الگ ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم اپنی ایک الگ اور مستقل تہذیبی روایت رکھتے ہیں، لیکن ہمیں یہ تو سمجھنا چاہیے کہ یہ تہذیبی روایت کس زمانے میں اور کن اثرات کے تحت بنی تھی۔ آج کل زمانہ کیا ہے اور ہمارے اوپر کون کون سے عوامل کا اثر پڑ رہا ہے۔ بہرحال اگر کسی ملک میں دس پانچ آدمی آنکھیں بند کر کے احمقانہ باتیں بھی کرتے رہیں تو اس سے کوئی زبردست نقصان نہیں ہوتا، مگر خطرے کی بات یہ ہے کہ بہت سے ادیبوں نے بھی اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیے بغیر یہی کہنا شروع کر دیا ہے کہ مغرب کا ادب یا فلسفہ کیوں پڑھیں، اس کا ہماری زندگی سے کیا علاقہ؟ لیکن وہ اپنے آپ سے یہ سوال کیوں نہیں پوچھتے کہ ہم موٹر میں کیوں بیٹھیں، یہ ہمارے ملک میں تھوڑی بنتی ہے؟ اگر موٹر میں بیٹھنا حلال ہے تو پھر یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کیسے حرام ہو گیا کہ موٹر انسانی اخلاق، تہذیب، اعمال اور اقدار میں کیا تبدیلیاں پیدا کرتی ہے؟ ہمارے یہاں تو ادیبوں تک کا یہ رویہ ہو گیا ہے کہ زندگی جیسے چل رہی ہے چلنے دو، اس کے بارے میں سوچو مت۔ اچھا چلیے، غیروں کی تہذیب سے کوئی علاقہ نہ سہی، یہی دیکھیے کہ اپنی تہذیب اور روایت کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ پاکستان کو وجود میں آئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ کیا اس عرصے میں اسلامی یا ہند اسلامی تہذیبی تصورات کی کوئی شرح یا تفسیر آج تک ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ لوگ یہ دہرا دیتے ہیں کہ اسلام میں عورت کا درجہ بہت بلند ہے، اسلام کے معاشی اور سماجی اصول مساوات پر مبنی ہیں، لیکن یہ آج تک کسی نے بتایا کہ ان اصولوں کا اثر ہماری تہذیب پر کیا پڑا؟ ہمارے ادب اور فن کی شکل ان اصولوں نے کس طرح متعین کی؟ یوں پرانے اردو شاعروں اور ادیبوں کے متعلق مضمون تو بہت نکلتے ہیں، لیکن کبھی کسی نے تفصیل کے ساتھ ہمیں یہ سمجھایا کہ اس شاعری کا ہماری قوم کی خارجی اور داخلی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ روایت کا ذکر تو اکثر ہوتا ہے، لیکن یہ کبھی پتہ نہ چلا کہ اس کے عناصر کیا ہیں، وہ کس طرح وجود میں آئے اور آج ہمارا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ تو خیر لمبی چوڑی باتیں ہیں، کسی نے آج تک یہی نہیں بتایا کہ اردو میں سادہ جملہ کس طرح بنتا ہے اور پیچیدہ جملہ کس طرح بنتا ہے۔ اب ایسی روایت کو کیا لے کے چاٹیں۔ جسے ہم سمجھنے کی صلاحیت تک نہیں رکھتے۔ اپنی روایت کو تو ہم کیا زندہ کرتے، اس پانچ سال میں ہمارا ذہنی کارنامہ یہ ہے کہ ہمارے دل پر سے مغرب کا رعب بھی اٹھ گیا — یعنی سنجیدہ اور بامعنی سرگرمیوں میں، ورنہ مغربی رقاصاؤں کی

ٹانگوں کا رعب تو ہمارے یہاں بڑھ ہی رہا ہے۔

ادبی جمود کا احساس ادیبوں کو ہو تو گیا ہے، مگر ابھی تک اس کی ذمہ داری وہ دوسروں کے سر منڈھ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ادبی احتساب میں حکومت بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لے رہی ہے، لیکن اگر ادیب اس جمود کو توڑنا ہی چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے اوپر احتساب کریں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ داخلی جمود ٹوٹ جائے تو پھر خارجی پابندیاں بھی تخلیق کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ جائیں۔ اگر ادب میں جان آئے گی تو خود ادب اور ادیبوں کے اندر سے پھوٹے گی۔ یہ کوئی پٹرول تو ہے نہیں کہ راستہ چلتے گیلن دو گیلن بھروا لیا جائے۔

(ستمبر ۱۹۵۲ء)

خالص اسلام

پچھلی دفعہ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہمارے ادیبوں نے مغربی کلچر سے دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہمارا اس تہذیب سے بالواسطہ، بلاواسطہ کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ ذہنیت کچھ ادیبوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ سیاسیات اور معاشیات میں بھی ہمارا پورا قومی رویہ کچھ اس قسم کا ہے جیسے ہمارے ملک کی سرحدوں کے اس پار بس خلا ہی خلا ہے، اور کرۂ ارض پر بس ہمیں بستے ہیں۔ یہاں ذکر ذہنی فضا کا ہے، عمل کا نہیں، کیونکہ زندگی کی مجبوریاں کبھی کبھی عملاً ہماری آنکھیں کھول ہی دیتی ہیں، لیکن ہمیں بین الاقوامی معاملات سے کتنی دلچسپی ہے، اس کا اندازہ تو اس سے کر لیجئے کہ ہمارے اچھے سے اچھے اخباروں میں دوسرے ملکوں کے بارے میں کتنے مضمون چھپتے ہیں، اور جو دو چار مضمون چھپتے بھی ہیں، ان میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جن میں دنیا کے سیاسی اور معاشی رجحانات کا سنجیدہ اور قابل اعتماد تجزیہ ہو، کہتے ہیں کہ ہمیں اوروں سے نہ سہی مگر اسلامی ممالک سے گہری دلچسپی ہے، مگر یہی دیکھ لیجئے کہ ہمارے اخباروں نے مصر اور لبنان کے تازہ سیاسی واقعات کے متعلق اپنے پڑھنے والوں کو کیا بتایا۔ یہ تو ہمیں ضرور معلوم ہو گیا کہ شاہ فاروق جلاوطن ہونے کے بعد ناشتے میں کتنے انڈے کھاتے ہیں، مگر اخبار پڑھنے والوں کو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ بین الاقوامی سیاست میں، اور خود اسلامی ممالک کی سیاست میں ان واقعات کا کوئی ردِ عمل ہو گا یا نہیں۔ ہم تو اپنے آپ میں ایسے مگن ہو گئے ہیں کہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں کچھ ہوتا رہے، ہمیں کوئی واسطہ ہی نہیں، جب بین الاقوامی سیاست کے بارے میں ہمارا رویہ یہ ہے تو پھر علمی سرگرمیوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ ہمیں اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں کہ ہمیں صنعتی دور میں رہنا ہے، اور اگر ہم نے دنیا کی علمی ترقی کا ساتھ نہ دیا تو اپنی ہستی برقرار

رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ کلچر کو چھوڑیے، اس کی تو سمجھئے کہ کوئی مادی افادیت نہیں ہے۔ جب "طاؤس و رباب" کی منزل آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "شمشیر دسناں" کی منزل کے لیے ہی ہم اپنے آپ کو کہاں تیار کر رہے ہیں؟ ہم تو ان بین الاقوامی سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لے رہے جن کی افادیت خالص مادی ہے۔ ہم تو ذہنی طور سے اپنے آپ کو دنیا بھر سے الگ کر کے بیٹھ گئے ہیں، ہم نے تو اپنے لیے ایسی سنگین کوٹھڑی بنالی ہے جہاں باہر کا شور و غل تک سنائی نہ دے۔

اس علیحدگی کی نوعیت مکانی ہی نہیں، زمانی بھی ہے اور تو اور ہم نے اپنے آپ کو خود اپنی تاریخ سے بھی الگ کر لیا ہے۔ ہم اپنے نئے پن کے ایسے قائل ہیں کہ تیرہ سو سال میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ ہمارے لیے قابل قبول ہی نہیں۔ اصل میں قائل تو ہم ایک ہی بات کے ہیں۔ اپنے ذہنی تعطل کے اور ہماری جدوجہد کا ماحصل یہی ہے کہ کسی طرح تعطل قائم رہے۔ اس کا ذریعہ یہ ہے کہ نہ اوروں کے خیال اور عمل پر سنجیدگی سے غور کرو، نہ اپنی تاریخ پر، بس "خالص" اسلام کی پیروی کرو۔ یہ "خالص" اسلام ایسی چیز ہے جس کی تعبیر ہر آدمی اپنے طریقے پر کر سکتا ہے، اور اپنی خواہشات کے مطابق چونکہ دو آدمی کسی ایک تعبیر پر متفق نہیں ہو سکتے، اس لیے صلح کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تعطل جاری رکھا جائے۔ اس "خالص" اسلام کی تفسیریں بھی ایسی ایسی انتہا پسندانہ ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک گروہ کی رائے میں "خالص" اسلام یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے اور زانی کو سنگسار کیا جائے۔ (اس اصول کی صداقت تسلیم کروانے کے لیے جنوبی افریقہ کی مثال پیش کی جاتی ہے)۔ پھر "خالص" اسلام کی ایک تفسیر یہ بھی موجود ہے کہ دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھنا ضروری نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں تعداد کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی تفسیر کے مطابق قرآن نے شراب پینے کو منع نہیں کیا، شراب پی کے بدمست ہو جانے کو منع کیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ دونوں گروہوں کے خیال میں جو آدمی ان کی تفسیر کو نہیں مانتا، وہ "خالص" مسلمان نہیں ہے، اور اسے پاکستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو پاکستان کی ساری آبادی کو رہنے کے لیے کوئی نئی سرزمین تلاش کرنی پڑے گی۔ چنانچہ پاکستان کا دستور بنانے سے پہلے تو یہ طے ہونا چاہیے کہ یہاں رہنے کا حق کس کس کو حاصل ہے کیونکہ اگر ساری آبادی کو غیر مسلمان ہونے کے جرم میں نکال دیا گیا تو دستور سازی کا کام بالکل ہی آسان ہو جائے گا۔ ساری دنیا

سے مکانی اور زمانی علیحدگی کے نتیجے بھی بڑے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ پاکستان بنے پانچ سال ہوگئے، اور یہ بحث اب شروع ہوئی ہے کہ کوئی دستور اسلامی ہو سکتا ہے یا نہیں، اور دستور کے معنی کیا ہیں، پھر اوپر سے مزا یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ ہماری ساری زندگی کی روایت ہی الگ ہے، ہمیں یورپ سے کوئی واسطہ نہیں، دوسری طرف اسلامی دستور کا مطلب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مغربی مفکرین کے مقولے نقل کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں کم سے کم تھوڑی سی منطق تو ضرور ہونی چاہیے۔ یا تو ہم آخری دفعہ یہ طے کرلیں کہ ہمیں کسی اور قوم کے خیال اور عمل سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارے "خالص" اسلام کافی ہے یا پھر وہ رویہ اختیار کریں جو مسلمانوں کی تہذیب کے بڑے بڑے دوروں میں تھا، یعنی اسلام کو سب سے مکمل نظام زندگی سمجھیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کریں کہ اسلام انسانی فکر اور تہذیب کا ایک حصہ ہے، اور دوسروں کے فکر اور عمل پر غور کریں گے تو ہم اسلام کی معنویت کو اور بھی وضاحت کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ یہ ایسا فرض ہے جس سے بڑے بڑے اسلامی مفکر کبھی نہیں گھبرائے۔ پتہ نہیں یہ ہمارے اندر دوسروں کا ڈر اور دوسروں سے گھبراہٹ کیوں پیدا ہوگئی ہے۔ ہم دوسروں کا وجود صرف اُس وقت تسلیم کرتے ہیں جب ہمیں ان سے کوئی تکلیف پہنچے یا اُن سے کوئی خطرہ ہو یا ان کی ضرورت پیش آئے ورنہ عام طور سے ہم اُن سے بالکل بے تعلق رہنا چاہتے ہیں۔ مغرب کے ادب فن اور فکر سے بے اعتنائی کوئی چھوٹی سی اور بے وقعت چیز نہیں ہے۔ یہ ایک بہت وسیع رجحان کی علامت ہے — اس رجحان کی جس سے ہماری قومی زندگی کو بین الاقوامی اور اندرونی دونوں قسم کے معاملات میں شدید نقصان پہنچ رہا ہے اور اس رجحان کا مطلب یہ ہے کہ ہم ذہنی طور پر بالغ ہوئے اور بلوغت کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے گھبراتے ہیں۔ یہ زمانی اور مکانی علیحدگی تھوڑے دن کے لیے تو واقعی بڑی آرام دہ ہوتی ہے، لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم اسے برقرار کتنے دن رکھ سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کو بھی نہ دیکھیں، مگر دوسرے تو ہمیں دیکھ رہے ہیں کیا وہ ہماری اس "طفلگی" سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے؟

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)

میر، غالب اور چھوٹی بحر کا قصہ!

چھوٹی بحر میں اچھا شعر نکال لینا ہمارے یہاں ہمیشہ کمال کی دلیل سمجھا گیا ہے۔ چھوٹی بحر کی حیثیت گویا ایک کسوٹی سی رہی ہے جس سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ شاعر کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل ہے اور جس تجربے کا اظہار مقصود ہے، اس پر پورا قابو ہے یا نہیں۔ اس طرح چھوٹی بحر میں کامیاب شعر کہہ کر گویا شاعر اپنی فنی پختگی کا ثبوت دے دیتا ہے۔ یہ سب درست ہے، مگر جس انداز میں ہمارے یہاں چھوٹی بحر کا ذکر ہوتا ہے، اس سے کچھ یہ احساس ہوتا ہے جیسے چھوٹی بحر میں کامیابی کا کوئی یکساں اور غیر شخصی معیار ہے، اور اس میں ہر شاعر ایک ہی نوعیت کی کامیابی حاصل کرے گا۔ غالباً اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بحر کے اختصار میں کچھ ایسی کھٹک، چبھن اور نشتریت ہوتی ہے۔ آدمی کامیاب شعر سنتے ہی پھڑک اٹھتا ہے اور کبھی تلخی کام و دہن میں، کبھی شیرینی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ آگے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ اوروں کی تنقیدی بے حسی کا طعنہ کیا دوں، خود مجھی کو حال ہی میں غالب کی غزلیں الٹتے پلٹتے ہوئے احساس ہوا کہ چھوٹی بحر میں "دل کا معاملہ" ایسی بے ساختگی سے کھلتا ہے کہ سارے تکلفات بر طرف ہو جاتے ہیں۔ بڑی بحر میں تو ممکن بھی ہے کہ آدمی اپنا شخصی مزاج اور کردار چھپا لے جائے، مگر چھوٹی بحر تو لوہے کا کولھو ہے، گلاب ڈالو، گلاب کا عطر نکلے گا، مٹی ڈالو، مٹی کا عطر نکلے گا۔ یہاں آدمی کی اصلیت چھپائے نہیں چھپتی، کیونکہ یہاں شاعر کو اپنے تجربے کا ہی جوہر نہیں بلکہ اپنی پوری شخصیت کا جوہر پیش کرنا پڑتا ہے — ارادی طور پر نہیں، بلکہ یہاں آدمی اپنے ذریعہ اظہار کے ہاتھوں مجبور ہو کے رہ جاتا ہے۔ چونکہ اس حقیقت کا اندازہ مجھے غالب کی غزلیں دیکھ کر ہوا، اس لیے میں غالب ہی کے یہاں سے نمونے پیش کروں گا۔ غالب کی شخصیت کا میرے ذہن میں کیا تصور ہے، اس پر میں تفصیلی بحث نہیں کروں گا، کیونکہ آج

کل کے زمانے میں کہ جب پڑھنے لکھنے کی طرف لوگوں کی توجہ سرے سے ہے ہی نہیں، کسی موضوع پر تفصیل سے لکھنے کے لیے حضرت ایوب کی سی ہمت چاہیے، پھر غالب کی شخصیت پر آفتاب احمد صاحب کا طویل مضمون پہلے سے موجود ہے جس سے اچھی تنقید غالب پر میرے خیال میں ابھی تک نہیں لکھی گئی۔

غالب کے اشعار کے تجزیے سے پہلے ایک بات اور تصریح طلب ہے۔ یہ پابندی میرے اوپر سلیم احمد صاحب نے لگائی ہے، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ آج کل مضمون لکھنا سال بھر کی جیل بھگتنے کے برابر ہے، اور اس میں ایک کالم کا اضافہ کرنا ایسا ہے جیسے سزا کی مدت میں دو ہفتے اور بڑھ گئے ہوں۔ بہرحال مفلسی میں آٹا بھی گیلا سہی۔ سلیم احمد کا سوال یہ ہے کہ وہ کون سے تجربات ہیں جو چھوٹی بحر کا موضوع بنتے ہیں یا اس سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ سرسری طور سے سوچنے کی بعد چار قسم کے تجربات میری سمجھ میں آتے ہیں جو چھوٹی بحر کے لیے موزوں ہیں:

(۱) سیدھے سادے ابتدائی جذبات کی شدت اور وفور جو بے لاگ، بے تکلف، براہ راست اور فوری اظہار کا طالب ہو، غالباً اس کی مثالیں اردو سے زیادہ فارسی میں ملیں گی۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی
یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

(رودکی)

سرو سیمینا بہ صحرا می روی
لیک بدعہدی کہ بے ما می روی

(سعدی)

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ کی طرح
ہم کو ٹک جلد آن کر دیکھو

(میر حسن)

ایک دم بھی ملا نہ ہم کو قرار
اس دل بیقرار کے ہاتھوں

(میر حسن)

گل و گلزار خوش نہیں آتا
باغ بے حد خوش نہیں آتا

(درد)

حیف میرے یہ آہ کرنے کو
اور ترے ہنس کے واہ کرنے کو

(اثر)

راہ تکتے ہی تکتے ہم تو چلے
آیئے بھی کہیں جو آنا ہے

(اثر)

(۲) جذبات کی ثانوی اور لطیف تر اور قدرے پیچیدہ شکلیں۔ ایک شعر میں صرف ایک تجربہ لیا جائے، اُسے ہر دوسرے تجربے سے الگ کر کے دیکھا جائے اور سکون کے ساتھ اس پر تھوڑا سا غور کیا جائے۔ یہاں اظہار براہِ راست اور بے لاگ نہیں ہوگا بلکہ تھوڑے سے تکلف اور ادبیت کے ساتھ بہرحال، شاعر کی کوشش یہ ہوگی کہ شعر کا اثر فوری ہو اور شعر دل میں کھٹک اور چھبن سی پیدا کرے۔ یہاں وہ بات نہیں ہوگی کہ جذبہ شدت اور وفور سے خود بخود ابل پڑے اور کم سے کم الفاظ میں اپنا اظہار کرے۔ یہاں ذرا بات بنائی جاتی ہے، تجربے میں شعوری کوشش سے حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ اردو کی چھوٹی بحروں میں تجربات کی یہ تقسیم سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کی کامیاب ترین مثالیں اثر، بیدار، حسن بریلوی کے یہاں ملتی ہیں۔ گو انفرادی طور پر میر، درد اور غالب کے اس نوعیت کے اشعار مذکورہ بالا شاعروں کے شعروں سے بہتر ہوں گے ۔

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر تو پیار آتا ہے

(اثر)

ہم غلط احتمال رکھتے تھے
تجھ سے کیا کیا خیال رکھتے تھے

(اثر)

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے
دل تجھے اعتبار آتا ہے

(اثر)

اثر اس حال پہ بھی جیتا ہے
کیا کہوں اس کی سخت جانی کی

(اثر)

اُلفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی
حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

(حسن بریلوی)

ہم خاک بھی ہوگئے پر اب تک
جی سے نہ ترے غبار نکلا

(بیدار)

دور سے بات خوش نہیں آتی
یوں ملاقات خوش نہیں آتی

(بیدار)

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

(درد)

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

(میر)

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

(غالب)

(۳) جذبہ نہیں، بلکہ پیچیدہ تجربہ جس میں یا تو ایک ہی سلسلے کے کئی جذبے ملے جلے ہوں، یا کئی جذبوں کے درمیان تصادم اور کشمکش ہو یا ایک تجربے کو اپنی ساری زندگی یا دوسروں کی زندگی یا حیاتِ مطلق یا کائنات کے مقابل رکھ کر غور کیا گیا ہو۔ اس تجربے میں تہیں، پہلو، پیچیدگیاں چاہے جتنی بھی ہوں، اندرونی کشمکش کتنی بھی کیوں نہ ہو، مگر وحدت اتنی ہوتی ہے کہ اسے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کریں تو وہ تجربہ باقی ہی نہیں رہتا۔ اس کا اظہار یا تو مختصر الفاظ میں ہو گا یا بالکل نہیں ہو گا۔ اس قسم کے تجربات سے دوسرے درجے کا شعر بھی ہو سکتا ہے اور بڑے سے بڑا شعر بھی۔ یہ شاعر کی ذہنی اور روحانی کاوش اور شخصیت پر منحصر ہے۔ شیکسپیئر کے دو مشہور جملے

اسی قبیل کی چیزوں میں سے ہیں۔ اردو شاعروں میں سے فی الحال صرف چار نام چھانٹوں گا۔ میر، درد، غالب اور فراق ۔

آخر الامر آہ کیا ہو گا
کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

(درد)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(درد)

مصائب اور تھے پر دل کیا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

(میر)

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم منہ بھی ہم سے چھپا کر چلے

(میر)

بُرا حال اس کی گلی میں ہے میر
جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

(میر)

وہ توانائی مزاج نہیں
چھوڑیے مجھ کو لیکن آج نہیں

(فراق)

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آگیا ہوتا

(فراق)

اہل دل کو خراب رہنے دے
تیری آنکھوں سے یہ تو دور نہیں

(فراق)

چھڑ گئی ان کی آنکھوں کی بات
دنیا میں اب دن ہے کہ رات

(فراق)

دل اُمڈا سا آنکھ بھری سی
آج تو حسن بھی ہے اپنا سا

(فراق)

(۴) محبوب یا زندگی کی شکایت، گلے شکوے، طعنے، اپنے آپ کو بہتر یا برتر حق پر یا مظلوم سمجھ کر اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے، محبوب سے، زندگی سے، کائنات سے الگ کر کے کوئی کڑوی کسیلی یا دل میں چبھنے والی بات کہنا یا جلی کٹی سنانا یا دل کے پھپھولے پھوڑنا۔ یہاں اختصار اس لیے برتا جاتا ہے کہ چوٹ کراری پڑے۔ یہ اختصار تجربے کی جامعیت کا نہیں بلکہ تجربے کی تنگی اور انقباض کا ہے، چنانچہ واسوخت والی ذہنیت کو بھی چھوٹی بحر راس آتی ہے۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ غالب، داغ اور حسن بریلوی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس میں اور جو چاہے اضافہ کر لیجیے، میں کوئی چھوٹی بحر کی تاریخ تو لکھ نہیں رہا ہوں ۔

مرے ماتم میں وہ آئیں تو کہنا
کریں غم آپ کے دشمن کسی کا

(داغ)

ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام
کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے

(داغ)

تجھ کو اچھا کہا ہے کس کس نے
کہنے والوں کو خیر کیا کہیے

(داغ)

حضرت دل مزاج کیسا ہے
پھر بھی اس کوچے میں گزر ہو گا

(حسن بریلوی)

ترے در سے کوئی پھرا ہو گا
رہ گئے ہم تو خاک میں مل کے

(داغ)

اس قبیل کے اشعار میں شکایت یا طعنہ نہ سہی تو کم سے کم اپنی زندہ دلی، خوش طبعی اور شگفتگی مزاج کا مظاہرہ ضرور مقصود ہوتا ہے۔ یہاں دراصل شاعر تجربے سے نیلوط اپنے آپ کو نمائش کے لیے پیش کرتا ہے۔

اب آئیے غالب کی طرف یوں تو غالب کی چھوٹی بحروں میں آفاق گیر استعجاب اور تحیر بھی مل جائے گا ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

عشق کے المناک تجربوں پر معصومانہ تجسّس بھی ملے گا ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سپردگی کا وفور بھی ملے گا ؎

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

غالب حُسن کے ایک ذرا سے احساس کو پھیلا کر اُسے کائنات کی وسعتیں بھی دے سکتے ہیں ۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میَں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

مگر چھوٹی بحر میں شعر کہتے ہوئے غالب اپنے اندر سکڑ سمٹ جانے اور دوسروں سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کی ترغیب سے نہیں بچ سکتے۔ غالباً اختصار کی وجہ سے انہیں آسانی رہتی ہے اور خود بینی اور خود نمائی کا اچھا بہانہ مل جاتا ہے۔ "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔" والی غزل ان چند غزلوں میں سے ہے جہاں غالب اپنے آپ سے باہر نکل سکے ہیں، ان کے تفکر میں غیر شخصی انداز آیا ہے اور انہوں نے عشق، حیات اور کائنات کی طہارت اور معصومیت اور رچاؤ محسوس کیا ہے، لیکن یہاں بھی واسوخت نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا ۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

جب غالب اپنے عشق، زندگی یا کائنات پر غور کر رہے ہوں، اس وقت کی بات ہی چھوڑیے، اُنہیں مسکرانے کا برا بھلا موقع مل جائے، وہ دوسروں سے اپنی علیحدگی اور برتری جتائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ۔

غلطی ہائے مضامین مت پُوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اس شعر میں نالے کی نارسائی کا اتنا گلہ نہیں ہے، جتنی اس بات کی خوشی ہے کہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ غالب کی نظر میں لوگوں کی بے وقوفی یہ ہے کہ وہ درد میں ایک عظمت، ایک اثر محسوس کرتے ہیں۔ اپنی ہستی سے باہر کسی قوت پر، زندگی کی شرافت پر یقین رکھتے ہیں۔ غالب جس چیز سے مطمئن ہوتے ہیں، وہ یہ احساس ہے کہ زندگی ان سے بیگانگی برتتی ہے، اور اس طرح ان کی یکتائی کی (خواہ وہ تکلیف دہ کیوں نہ ہو) تصدیق کرتی ہے۔ یہ میری من گھڑت نہیں ہے، اسی غزل میں غالب نے کہا ہے ۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

اس شعر کے لہجہ میں کوئی درد یا کسک نہیں ہے، بلکہ آہ کی بے اثری سے غالب لطف لے رہے ہیں۔ آدمی کو اپنی ہستی کا احساس اپنے کسی فعل یا عمل یا سرگرمی کے ذریعہ ہوتا ہے چونکہ غالب کو اپنی ہستی کے وجود اور اس کے کائنات سے الگ ہونے کا احساس رونے کے ذریعے ہوتا ہے، اس لیے یہ سرگرمی بذاتِ خود تشفی بخش بن گئی ہے، خواہ یہ بے نتیجہ ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اگر اس کا کوئی نتیجہ نکلتا تو غالب کی ہستی پھر کائنات سے متعلق اور مربوط ہو جاتی اور اس کی یکتائی زائل ہو جاتی۔ اس کے لیے غالب تیار نہیں ہیں۔ ان کے لیے تو آہ کی بے اثری ہی زیادہ سود مند ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کے اور کائنات کے درمیان حد فاصل قائم رہتی ہے، بلکہ سد سکندری بن جاتی ہے، کیونکہ غالب کی جستجو کا منتہا عشق یعنی اپنے آپ کو حیات اور کائنات میں پیوست کرنا نہیں ہے بلکہ "اپنی ہوا باندھنا" ہے۔ چھوٹی شخصیت کا آدمی ہمیشہ رونے سے ڈرتا ہے، کیونکہ رونے کا مطلب ہی اپنی ہستی سے باہر جو دوسری قوتیں ہیں، ان کی مادرانہ شفقت کا اعتراف ہے۔ مثلاً ای، ایم فورسٹر نے (پاکستان پی، ای، این کے سارے لوگ فورسٹر کے پیرو ہیں) کہا ہے جس کتاب کو پڑھ کے رونا آ جائے، وہ اصلی فن پارہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف بودیلیئر نے بڑی نظم کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اسے پڑھ کے آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ خیر، اب آہ کی بے اثری کے متعلق میر کا شعر دیکھیے۔ بحر چھوٹی نہ سہی، بات بڑی ہے ۔

رونے نے رات اس کے جو تاثیر کچھ نہ کی

ناچار میر منڈکری سی مار سوگیا

میر کو ہوا باندھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ جب وہ منڈکری مار کے سوتے ہیں تو ان کے نیچے زمین جیسی ٹھوس چیز ہوتی ہے۔ آہ چاہے آسمان پر جائے یا نہ جائے، لیکن اگر آدمی کو زمین پر لے آئے تو یہی بہت بڑی کامرانی ہے۔ اسی ضمن میں فراق کا بھی ایک شعر سنتے چلیے ۔

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو

اے اہل دن یہ کارِ عبث بھی کیے چلو

غرض غالب کی توجہ یوں تو ہمیشہ ہی اپنے اوپر مرکوز رہتی ہے، لیکن چھوٹی بحر میں تو

وہ یوں محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے اس چھوٹی سی چادر میں اتنی جگہ کہاں کہ دوسرے بھی سما سکیں۔ میر چھوٹی بحروں میں کوشش کرتے ہیں کہ ساری زندگی کا جوہر نچوڑ لیں، اس زندگی کا جو صرف انہی کے نہیں بلکہ سبھی کے تجربے میں آجاتی ہے — اور کچھ نہیں تو کم سے کم ایک تجربے کا عطر تو کھنچ ہی آئے۔

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھیں جو تم نے پیار کیا

———

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا

———

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

———

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں
ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

———

وجہ کیا ہے کہ میر منہ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

———

بُرا حال اس کی گلی میں ہے میر
جو اُٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

———

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

میر کے یہاں "میں" اور "ہم" کے معنی عام انسانی تجربہ ہے۔ چھوٹی بحروں میں یہ عمومیت اور تاکیدی بن جاتی ہے کیونکہ میر اپنے اشعار میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور

جامعیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غالب چھوٹی بحروں میں اپنے اختصاص کا اعلان زیادہ کرتے ہیں۔ غالب اختصار کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ہر غیر ضروری چیز کو نظرانداز کر دیا جائے، اور ان کے لیے اپنی ذات کے سوا ہر چیز مدفاضل میں ہے چھوٹی بحروں میں میر اپنے تجربے کو دوسرے انسانوں کے تجربے میں گھلا ملا دیتے ہیں۔ غالب اپنے تجربے کو نتھار کر دوسروں کے تجربے سے الگ کر لیتے ہیں۔ غالب چھوٹی بحر کو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا تیکھا پن پوری کساوٹ اور آن بان کے ساتھ نظر آئے۔ چھوٹی بحروں میں میر کی ذات محو ہو کر انسانیت کا تجربہ بن جاتی ہے، اور غالب کی ذات بھلائے سے بھی نہیں بھولتی، بلکہ پہلو بدل بدل کر مقابلے پر آتی ہے۔ چھوٹی بحر میں وہ ہمیشہ کوئی انوٹ دار بات کہنا چاہتے ہیں اسی لیے وہ اپنے زاویہ نظر کو کسی اور کا زاویہ نظر کبھی نہیں بننے دیتے، چنانچہ جب وہ عام زندگی کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تب بھی ایک طعنے کا سا انداز آ جاتا ہے ۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب نے اپنی ذات سے متعلق جو اچھے شعر کہے ہیں، ان میں سے بہت سے چھوٹی بحروں میں ملیں گے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اور جب محبوب کی طرف توجہ کرتے ہیں تو چھوٹی بحروں میں عموماً ڈانٹ ڈپٹ، للکار، طعنے کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں ۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

لوگ کہتے ہیں کہ غالب نے عشق کی روایتیں بدل دیں اور محبوب کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ غالب کی انقلابی حیثیت جو کچھ بھی ہو، مگر یہ عشق ہے یا سامراج سے جنگ؟ عشق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس میں فتادگی اور اپنی تذلیل ہی ہو، مگر عشق سے مزاج میں تھوڑی سی خود فراموشی اور قبولیت بھی نہ پیدا ہوئی تو وہ عشق ہی کیا ہوا۔ کیٹس نے اپنی محبوبہ کو کچھ خط لکھے ہیں جن میں بڑی بے چارگی کا اظہار کیا ہے۔ آرنلڈ نے ان پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دوا فروش کے ملازم کا عشق ہے، مگر آرنلڈ جیسے لوگ جو عشق میں بہرحال اپنا وقار قائم رکھنا چاہتے ہیں، ان میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے معاشرے کے بارے میں دو چار سچی باتیں دل کھول کر کہیں لیں خیر، اب محبوب سے متعلق غالب کے کچھ شعر اور دیکھیے۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

صرف محبوب کے بارے ہی میں نہیں، بلکہ زندگی کی شکایت بھی وہ اسی انداز سے کرتے ہیں ۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

میرا مطلب یہ نہیں کہ غالب چھوٹی بحروں میں بس اسی قسم کے شعر کہتے ہیں، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ چھوٹی بحروں میں ان کے مزاج کی تلخی اور ترشی بڑے آسانی سے ابھر آتی ہے، اور وہ چھوٹی بحر کو اس طرح استعمال کرنے پر مائل ہیں کہ کسی کا گلہ کیا جاسکے۔ یہ تلخی اور ترشی ان کی خودنگری کا لازمی حصہ ہے کیونکہ جو آدمی اپنے آپ کو اس حد تک پسند کرتا ہو، وہ نہ محبوب سے مطمئن رہ سکتا ہے نہ دوسروں سے، نہ زندگی سے، چونکہ چھوٹی بحر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ تجربات کا خلاصہ پیش کیا جائے، اس لیے غالب بھی اپنے تجربات کا جوہر پیش کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ زندگی نے غالب سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ اُنہیں میر کا یہ نقطہ نظر کبھی قبول نہیں ہوگا ۔

لا علاجی ہے جو رہتی ہے مجھے آوارگی
کیجئے کیا میر صاحب بندگی بے چارگی

یہ غالب کا مخصوص مزاج ہے، اور اگر صرف ان کی چھوٹی بحر والی غزلوں کو ہی پیش نظر رکھا جائے تب بھی یہ مزاج بالکل واضح ہو جاتا ہے، بلکہ شاید یہاں ان کی اکڑ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو جاتی ہے۔

(نومبر ۱۹۵۲ء)

نئی غزل

والٹیئر کی "کاں دید" یا شاید کسی اور داستان میں ایک فلسفی صاحب اپنے چیلے کو کسی مشہور نقاد سے ملانے لے جاتے ہیں جن کی علمیت اور دقت نظر کا لوہا سارا یورپ مانتا ہے۔ بچارا نوجوان عقیدت مند سوچ سوچ کر بڑے سے بڑے شاعر کا نام لیتا ہے، مگر نقاد صاحب ہیں کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے، ہر آدمی میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ دونوں سامعین مرعوب ہو کے وہاں سے اٹھتے ہیں، اور گرو اپنے چیلے کی بصیرت افروزی کی خاطر کہتا ہے "دیکھا تم نے کیسا عظیم آدمی ہے۔ کتنا بلند مذاق ہے اس شخص کا، اسے کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔" لڑکپن میں یہ لطیفہ مجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ میں بار بار اسے سنایا کرتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ ایک دن مجھے بھی لوگ اسی قسم کا نقاد سمجھیں گے۔ (مرعوب تو خیر کیا ہوں گے) میری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ گو میں نے تعریف ہی زیادہ کی ہے، مگر تعریف کرنے کے مہینے بھر بعد ہی مجھے اسی چیز کی تھوڑی بہت تنقیص بھی کرنی پڑی ہے۔ نہ معلوم قصور کس کا ہے۔ بہرحال میرے ایک عزیز افسانہ نگار دوست کی رائے کے مطابق بروزن "کام بڑھئی کا!" میرا کام توڑ پھوڑ ہے چنانچہ آج یہ تخریبی عمل مجھے موجودہ غزل پر انجام دینا ہے اور حسب دستور یہ پھر ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک زمانہ میں، میں نے بڑی اُمید افزا باتیں کی تھیں۔

ادھر کچھ دنوں سے ایک نئی بحث چلی ہے کہ یہ زمانہ ادبی جمود کا ہے یا ادبی انحطاط کا۔ خیر، بادنجان کو بورانی کہیے یا بورانی کو بادنجان، اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔ خاقانی محقق بننے کے مزے شاید لے سکتا ہے لیکن جمود کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ادب کی کسی صنف میں کوئی چھوٹی موٹی نئی بات ہوتی بھی ہے تو وہ آگے نہیں چلتی۔ خود صاحب ایجاد اسے بار بار دہرانے لگتا ہے۔ پھر دوسرے لوگ یہ نسخہ لے اُڑتے ہیں اور ہر مرض

میں دو تولہ کنگنی پھانکنے لگتے ہیں۔ پہلے تو سہل ممتنع اور چھوٹی بحر کا زور ہوا، اور اس گمان کے ساتھ کہ یہ میر کی پیروی ہو رہی ہے۔ چلئے یہ دعویٰ بھی تسلیم، مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس قسم کے شعر ہونے لگے۔

ہم بھی یہیں ہیں
تم بھی یہیں ہو

یہ گویا میر کے اس شعر کا جدید ایڈیشن ہے۔

وجہ بے گانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں

پھر جب روزمرہ اور شوخی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو سنا ہے کسی نے فرما ڈالا — اتفاقاً اٹک گیا ہو گا۔

اطلاعاً عرض ہے کہ شاعر صاحب صرف آنسو کے شاکی ہیں۔

اب جدید ترین نسخہ غزل میں ایک نیا نکلا ہے۔ ناصر کاظمی نے فسادات کے تجربے کو جس طرح غزل میں سمویا ہے، اس پر کئی سال ہوئے میں مختصراً لکھ بھی چکا ہوں، اور ایک مفصل مضمون لکھنے کا ارادہ بھی ہے، لیکن ناصر کاظمی کی غزل کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگوں نے اب اُسے ابھی ایک نسخہ بنا ڈالا ہے۔ جس طرح لوگ غزل کہتے ہوئے یہ فرض کر لیتے تھے کہ چھوٹی بحر میں کہا تو غزل یقیناً اچھی ہوگی، اسی طرح اب یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر غزل میں وہ الفاظ اور ترکیبیں آ گئیں جو ناصر کاظمی نے استعمال کی ہیں تو غزل کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے مبتدی افسانہ نگار یہ حرکت کرتے تھے کہ افسانے میں دو چار جگہ چند اعضاء کا نام لے دیا، اور کوئی ناجائز جنسی تعلق دکھا دیا اور مطمئن ہو گئے کہ ہم نے افسانہ لکھ لیا۔ یا پھر افسانے کو کامیاب بنانے کے لیے ایک زمانے میں بنگال کے قحط کا ذکر کیا جاتا تھا۔ بالکل یہی غزل میں ہو رہا ہے۔ غزل میں ایک تو بحر چھوٹی ہو، دوسرے "قافلہ"۔ "سفر"۔ "منزل"۔ "چراغ"۔ "منہ اندھیرے" جیسے الفاظ آ جائیں پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ غزل گوئی کی ساری ذمہ داریاں پوری ہو گئیں۔ اگر ناصر کاظمی کا تخیل چند الفاظ کے گرد گھومتا ہے تو اس وجہ سے کہ یہ ان کے جذباتی تجربے کی نشانیاں اور علامتیں ہیں، ان کا تجربہ ان کے اندر جذب ہو کے رہ گیا ہے، لیکن جو لوگ غزل میں ان کی پیروی کر رہے ہیں، انھوں نے چند الفاظ کو

تجربے کا قائم مقام بلکہ نعم البدل سمجھ لیا ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہلدی پھٹکری لگائے بغیر بھی چوکھا رنگ آسکتا ہے۔ تجربے کے ساتھ جو درد سہنا پڑتا ہے، اس کی مصیبت سے بھی بچ گئے اور غزل گو بھی بن گئے! غدر کے بعد سے کچھ لوگوں نے جنہیں انگریزی شاعری سے بس دور کی یاد اللہ تھی، اردو شاعروں کو شرم دلانی شروع کی کہ تمہاری شاعری میں بناوٹی جذبات ہوتے ہیں، ذرا انگریزی کو دیکھو، وہاں لوگ فطرتی مناظر کے متعلق شاعری کرتے ہیں، اور فطرت سے متاثر ہو کے بڑا بڑا فلسفیانہ خیال نکالتے ہیں۔ جب اردو شاعروں کو اپنی کوتاہیوں پر واقعی شرم آنے لگی تو ساری کمی ایک دم سے پوری کرنے کی دُھن سمائی۔ چنانچہ جوش صاحب نے اردو شاعری میں یوں اضافہ کیا۔ بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے۔ کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے کوئی اور صاحب تھے جنہوں نے سوچا کہ فلسفیانہ موشگافیوں کی بھی کمی باقی نہ رہنی چاہیے، لہٰذا انہوں نے براہ راست نصیحت فرمائی ؎

دیکھیے فلسفیانہ تو نباتات کا جوش

کچھ ایسا ہی حال آج کل ہماری غزل میں ہو رہا ہے۔ آخر فسادات کے زمانے میں اتنے لوگوں نے پاپیادہ منزل بہ منزل سفر کیا ہے، اتنا عظیم اجتماعی تجربہ بے کار تو نہیں جانا چاہیے۔ اگر خود ہم پہ نہیں گزری تو کم سے کم کہانیاں تو سنی ہیں، پھر ناصر کاظمی نے قافلوں کا ذکر کر کے آخر لوگوں سے داد وصول ہی کی ہے، لہٰذا ان — لفظوں میں کچھ نہ کچھ جادو تو ضرور ہے۔ اگر خود ہمارا تجربہ ان لفظوں کا متقاضی نہیں ہے تو کیا ہوا، سننے والوں کو اپنے تجربے یاد آ جائیں گے اور ہماری غزل میں تجربہ وہ ڈال دیں گے۔ غرض بے دھڑک غزل ہونے لگی۔ خیر، جہاں تک ایسی غزلوں کو مشاعروں میں پڑھے جانے یا رسالوں میں چھپنے کا تعلق ہے، ممکن ہے اس سے کوئی خاص نقصان نہ ہو، لیکن مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ جب چند الفاظ بار بار اور خصوصاً بے ضرورت، محض مقبولیت کی امید میں، استعمال ہونے لگیں گے تو جن لوگوں کو واقعی انھی الفاظ کی ضرورت ہوگی، وہ بھی ان سے دامن بچانے لگیں گے اور اس طرح نقصان ہوگا تو ان لوگوں کا جو ان الفاظ کی مدد سے واقعی اچھی غزل کہہ سکتے تھے اور تو اور جب سے یہ الفاظ غزل گوئی کے فیشن میں داخل ہوئے ہیں، خود ناصر کاظمی نے ان سے اجتناب شروع کر دیا ہے، چنانچہ ان کی تازہ ترین غزلوں میں نئے اسالیب اظہار کی تلاش اور ایک طرح کی بے اطمینانی محسوس ہوئی ہے۔ اگر وہ یہی الفاظ

استعمال کرتے رہتے تو تین صورتیں ممکن تھیں۔ لوگ دوسروں کے یہاں یہی الفاظ پڑھتے پڑھتے ایسے تھک جاتے کہ اگر ناصر کے شعروں میں سچا تجربہ ہوتا بھی تو وہ اس پر دھیان نہ دیتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ناصر کاظمی ایک ہی قسم کے تجربات کو ایک ہی سے الفاظ میں دہراتے رہتے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ناصر کے لیے یہ الفاظ اپنے شعور کی سیاحی کا ذریعہ بن جاتے، اور جب بھی استعمال ہوتے اپنے ساتھ نئے نئے تجربات گھسیٹ کر لاتے یا پرانے تجربات میں نئے رشتے پیدا کرتے، مگر دوسروں نے ناصر کے اسالیب بیان کو اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ وہ خود ان سے کترانے لگے ہیں۔ ممکن ہے ناصر کاظمی اب پرانے تجربے چھوڑ کر نئے تجربوں کی تشکیل کی فکر میں ہوں۔ تب تو بات الگ ہے، لیکن اگر انہوں نے اپنے مخصوص الفاظ اپنے مقلدوں سے اکتا کر ترک کیے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی مقبولیت مہنگی پڑی۔

بہرصورت اس ایک مثال سے واضح ہوتا ہے کہ اول تو ہمارے ادب میں آج کل کوئی نیا تجربہ ہوتا نہیں، اگر ہوتا بھی ہے تو اس سے پیشتر آدمی اپنی دریافت کے سارے امکانات کی تلاش کر سکے، دوسرے لوگ ناکام نقلوں سے آگے چلنے کا راستہ ہی روک دیتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے کئی غزل گو مقلدوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہیں۔ ناصر کاظمی ذرا ہوشیار آدمی ہیں، انہوں نے پہلے ہی سے نئے راستے تلاش کرنے شروع کر دیے لیکن اگر وہ اپنے آپ کو بچا بھی لے جائیں تو بھی یہ خطرہ باقی رہتا ہے کہ محض نسخوں کے سہارے ہماری غزل کے دن زندہ رہے گی۔ جس طرح لوگ آزاد نظم سے بیزار ہو کے اسے چھوڑ بیٹھے، اسی طرح چار دن کے بعد غزل سے بھی رخصت چاہیں گے۔ ابھی تو غزل کا تھوڑا سا بھرم قائم ہے، اگر ہمارے غزل گو شاعروں نے خصوصاً تازہ ترین شاعروں نے یہ بات نہ سمجھی کہ تجربے اور اسلوب میں کیا تعلق، تو وہ بھرم بھی کے دن کا؟

(جنوری، فروری ۱۹۵۳ء)

اَدب، ادیب اور مسائل وقت

پچھلے تین مہینے سے ملک میں کچھ ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں کہ "ادبیت" جوش مارے تو آدمی جھلا کے بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ جس معاشرے میں ادب کی قدر نہ ہو وہاں یہ نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ پانچ سال بعد یہ حقیقت ہماری سمجھ میں آنی شروع ہوئی ہے کہ آدمی صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ملک میں دو چار آدمیوں نے افسانے لکھ لیے، دس پانچ نظمیں کہہ لیں، اس سے پیٹ تو واقعی نہیں بھرتا نہ جھگڑا فساد رک سکتا ہے۔ افسانے اور نظمیں پڑھنے لینے سے آدمی کی حیاتیاتی ضرورتیں اور نفسیاتی الجھنیں تو ختم نہیں ہو جاتیں، البتہ اگر کسی ملک کے لوگ کافی تعداد میں اور ٹھیک طرح لکھتے ہوں تو شاید حال بد سے بدتر نہیں ہونے پاتا یا بدتر بنتے بنتے سنبھل جاتا ہے۔ جب لوگوں کی ذہنی طاقت اس طرح گھٹی پڑی رہے گی جیسے ہمارے ملک میں ہوا ہے تو وہ جسمانی تخریب کی طرف ہی مائل ہوگی۔ خیر، یہ جسمانی تخریب جو دراصل پاکستانیوں کے لیے خود کشی کے برابر ہے، رک سکتی ہے یا نہیں اور کس طرح، یہ تو جن لوگوں کا کام ہے، وہ جانیں، مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ ادب پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

(۱) اس شور و شر کے زمانے میں کچھ لوگ تو عملی اعتبار سے یا ذہنی اعتبار سے تخریب کے قائل ہو چکے ہیں اور اپنے گھر کی چھت اپنے اوپر گرانا چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس خیال ہی سے خوش ہیں کہ ہم نے کہہ دیا تھا پاکستان نہیں چلے گا، اور اب وہی ہو رہا ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے ہیں جو پاکستان کے بہی خواہ ہونے کے باوجود ملک کی پیچیدہ مشکلات کا کوئی حل نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی محبت غصے اور انتقام کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ اپنا گھر جلتے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار ادیبوں کے دماغ پر اسی قسم کا اثر ہو۔

(۲) کچھ لوگ اتنے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ کچھ کرنا تو الگ رہا، احساس کی زحمت بھی اٹھانا نہیں چاہتے۔ تن بہ تقدیر بیٹھے ہیں۔ اس رجحان کے زیرِ اثر ممکن ہے بہت سے ادیب بالکل ہی لکھنا چھوڑ دیں۔

(۳) جو لوگ پاکستان کو کسی دوسرے ملک کے زیرِ نگیں لانا یا ایک خاص قسم کا معاشی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ اس انتشار سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کا ادب کس قسم کا ہوگا۔ بہرحال اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے آنکھیں بند نہیں رکھیں گے۔ وہ ادب پیدا کریں یا نہ کریں، بہرحال جس چیز کو وہ تعمیری کوشش سمجھتے ہیں، اس میں دریغ نہ کریں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعمیر ہماری تخریب ہو۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر پاکستان کے تصور میں معاشی انصاف شامل نہیں ہے، اور اسے حقیقت بنانے کی کوشش نہیں ہوتی تو پاکستان کی تحریک کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

(۴) بہت سے ادیب حالات سے گھبرا کر "ادب" میں پناہ لینے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کے رجحانات ہمیشہ سے موجود ہیں، اب اور تقویت پائیں گے۔ ہمارے یہاں جو لوگ "خالص ادب" کے قائل ہیں، وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ادب میں سماجی عوامل یا سیاسی واقعات کا ذکر نہیں آنا چاہیے، نہ ادیب کو ان معاملات میں پڑنا چاہیے۔ بعض دفعہ اس قسم کے اردو ادیب کچھ ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے کسی مغربی روایت کی پیروی کر رہے ہوں لیکن جہاں تک میں واقف ہوں، مجھے تو مغرب میں کوئی ایسی وقیع ادبی روایت نظر نہیں آتی جو سیاست سے اس درجہ گھبراتی ہو اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہنا چاہتی ہو۔ مجھے تو پورے مغربی ادب کی تاریخ میں کوئی ایسا شاعر دکھائی نہیں دیتا جو ڈانٹے کے برابر خالص ہو، لیکن ڈانٹے سیاسی مفکر تو الگ، سیاسی والنٹیئر تھا۔ اگر اُردو کے "خالص" ادیب کسی جدید روایت کی پیروی کے دعوے دار ہیں تو بھی فلوبیئر موجود ہے جو عمر بھر یہی جھینکتا رہا کہ میں سیاست سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اپنی تخلیقات کے اثر کو خالص جمالیاتی تسکین تک محدود رکھنا کیا معنی اس نے تو ایسے بڑے بولے پن سے کام لیا کہ یہاں تک کہہ دیا کہ لوگ میرا ناول پڑھ لیتے تو فرانس کو شکست نہ ہوتی۔ موجودہ زمانے کے خالص ترین شاعر والیری کو لیجیے اس نے تو ایک پوری کتاب حالاتِ حاضرہ پر لکھ ماری۔ خالص ترین ناول نگار جوئس کو دیکھیے، اس نے اپنے ناول کے پروف پڑھتے پڑھتے روزانہ

اخبار کی خبریں ناول میں داخل کر دیں۔ ادب اور سیاست کے تعلق پر میں اس لیے چل پڑا کہ اتنی کوفت مجھے ترقی پسندی سے بھی نہیں ہوتی جتنی "خالص" ادب سے ہوتی ہے۔ ترقی پسندی سے دنیا کا بھلا تو ہوتا ہے "خالص" ادب سے تو ادب کو کچھ نہیں ملتا۔ اس خلفشار کے زمانے میں ادب کو سب سے زیادہ خطرہ اسی ذہنیت سے ہے۔

اول تو سوال یہ ہے کہ ادیب ملک کے مستقبل سے کیوں غافل رہیں۔ مغربی ممالک میں تو لکھنے والے ہر قسم کے ہوتے ہیں، سیاسیات کے ماہر، معاشیات کے ماہر، اجتماعیات کے ماہر۔ بغرضِ محال ادیب ملک کے حالات سے بے نیاز بھی ہو جائیں تو بھی ایک بڑی جماعت ایسے لکھنے والوں کی موجود ہوتی ہے جو مختلف مسائل پر غور و فکر کر سکیں اور دوسروں کو سوچنے کی ترغیب دے سکیں۔ لیکن ہمارے یہاں تو لکھنے والے کے معنی ادیب کے ہیں، اور ذہنی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والوں میں لے دے کے بس ادیب لوگ ہی ایسے ہیں جن کا عام لوگوں سے کوئی تعلق ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں ادیبوں پر وہ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جو دوسرے ملکوں میں اجتماعی علوم کے ماہر انجام دیتے ہیں۔ ہمارے عوام بیچارے آج کل دو گروہوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ ایک تو وہ گروہ جو اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے، دوسرے وہ گروہ (یا گروہوں کا مجموعہ) جو اقتدار چھیننا چاہتا ہے۔ آخر ان بیچاروں کو یہ بتانے والا کون ہو گا کہ پاکستان اب بھی ان کا ہو سکتا ہے، اور ان کا ہو کے زندہ رہ سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ادیب پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائیں یا "اتحاد، یقین، تنظیم" کا ورد کریں۔ ورد اوراد کا زمانہ گیا۔ اگر حکومت نے معاشی انصاف قائم کرنے کی طرف توجہ نہ کی تو محض دعاؤں سے انتشار نہیں رک سکتا۔ لیکن ایسا بھی تو نہ ہو کہ ادیب حقیقت حاضرہ سے آنکھیں چرائیں اور اپنی ادبی سرگرمیوں کو دوسری انسانی سرگرمیوں سے بالکل الگ سمجھیں۔

اگر مجھے یقین آ جائے کہ ادیب لوگ گرد و پیش سے بے نیاز ہو کے واقعی ادب پیدا کر لیں گے تو میں خوشی سے یہ کہنے کو تیار ہوں کہ پاکستان کا جو حشر ہوتا ہے ہونے دو، کم سے کم تھوڑا بہت ادب تو تخلیق ہو جائے گا، لیکن سماجی تجربے سے بچ کر جس قسم کا ادب پیدا ہو سکتا ہے، وہ خود ادیب صاحب کے کام آئے تو آئے، ادب کی تاریخ کے کام نہیں آئے گا۔ میں مانتا ہوں کہ حالات واقعی مایوس کن ہیں، خصوصاً ادیبوں کے لیے، لیکن کیا ہمارے حالات اتنے ہی مایوس کن ہیں جتنے پچھلی جنگ میں فرانسیسی ادیبوں کے لیے

تھے؟ ان کی نظروں میں تو بعض دفعہ نہ اپنے ملک کا مستقبل باقی رہتا تھا نہ اپنا، بلکہ جن لوگوں کو جرمنوں کی قید میں رہنا پڑا، ان کے لیے تو موت اور حیات کا فرق تک مٹ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ادب پیدا کرتے رہے، اور ان کا ادب نہ تو سیاسی نعروں کا ادب تھا نہ "خالص" ادب — بلکہ حقیقت انسانی کے مطالعے کا ادب۔ یہ مطالعہ امید اور ناامیدی دونوں سے ماورا ہے، بلکہ نئی زندگی اسی مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ انہی فرانسیسی ادیبوں میں سے کسی نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ زندہ ہونے سے پہلے ان کی تضحیک ہوئی، اور اس سے پہلے ان پر مایوسی کا دورہ پڑا۔ اگر ادیبوں میں حقیقت انسانی کے مطالعے کی سچی لگن ہے — شہرت کی لگن نہیں — تو ادب مایوسی اور تضحیک کے دور سے گزر کے بھی نئی زندگی پا سکتا ہے۔ لیکن ادیب وہ جگر تو لائیں جو واقعی مایوس ہو سکے، جو واقعی تضحیک کے لائق ہو جو ایک طرف تو خدا سے یہ پوچھنے پر مجبور ہو جائے کہ تو مجھے کیوں چھوڑ گیا، اور دوسری طرف کانٹوں کا تاج پہن کر بھی یہ کہے کہ مجھے حقیقت کی تلاش ہے۔ خالص ادب بھی وہی تخلیق کر سکتا ہے جو آلودگی سے واقف ہو۔

(اپریل ۱۹۵۳ء)

۳- تبصرے

۱- قائداعظم میری نظر میں
۲- جینئس
۳- کچھ یادیں، کچھ آنسو

قائداعظم نے مسلمان قوم پر جتنا احسان کیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ لوگوں کو ان سے شخصی اور ذاتی عقیدت پیدا ہو جائے یہ بڑی حد تک درست ہے کہ قائداعظمؒ کا کارنامہ ہی ان کی زندگی اور ان کی سوانح عمری ہے۔ انہوں نے اپنے کام میں اپنے آپ کو اس طرح جذب کر دیا تھا کہ ان کی خارجی زندگی اور ان کی داخلی زندگی ایک ہو کر رہ گئی تھیں، ان کی سب سے بڑی سوانح حیات تو پاکستان ہے لیکن اس کے باوجود لوگ اپنے قائداعظم کی ذاتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات معلوم کرنے کے مشتاق رہتے ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب ہمارے لیے دلچسپ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں جتنے مضامین لکھے گئے ہیں، انہیں لوگوں نے تبرک کی طرح اٹھا اٹھا کے رکھا ہے — ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ مضامین کہیں ایک جگہ مل سکیں۔ ویسے تو نہ معلوم کتنی کچھ چیزیں اس ضمن میں لکھی گئی ہوں گی اور لکھی جا رہی ہیں۔ بہرحال صفیہ سلطانہ انور صاحبہ نے اس قسم کے چوالیس مضمونوں کا ایک مجموعہ بنام "قائداعظم میری نظر میں" مرتب کیا ہے۔ اگر محترمہ ذرا اور کاوش سے کام لیتیں تو ابھی کچھ اور اچھے مضمون بھی مل سکتے تھے۔ لیکن بہت سے مضمون جو اس سلسلے میں مشہور ہوئے ہیں، وہ زیر تبصرہ مجموعے میں آگئے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب نہایت قابلِ قدر ہے۔ پھر اس مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ جن حضرات نے قائداعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، ان میں وزیر، سیاست دان، صحافی، ڈاکٹر، ادیب ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ پھر ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے

قائداعظم کو خاصا قریب سے دیکھا، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو انہیں صرف دور سے دیکھ سکے۔ اس طرح کتاب میں نقطۂ نظر کا تنوع اور ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے اور ہمیں قائداعظم کی سیاسی اور شخصی دونوں قسم کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس میں قائداعظم کی پوری زندگی کی تصویر تو نہیں ملتی کیونکہ تقریباً سارے مضامین ۳۶ء کے بعد والے دور سے متعلق ہیں، بہرحال اس دور کا اچھا خاصا نقشہ ان جھلکیوں کی مدد سے مرتب ہو جاتا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ ان مضامین کو پڑھا جائے گا جن میں قائداعظم کے آخری ایام کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں سب سے اثر انگیز مضامین ڈاکٹر ریاض علی شاہ اور کرنل الٰہی بخش کے ہیں۔ جن لوگوں نے قائداعظم کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے ساتھ کچھ عرصہ گزارا ہے، ان میں سے سب سے دلچسپ مضامین ممتاز حسن اور الطاف حسین کے ہیں۔ دور سے دیکھنے والوں میں قائداعظم کی شخصیت اور ان کی عظمت کا سب سے موثر نقشہ سعادت حسن منٹو نے کھینچا ہے۔ عوام کو قائداعظم سے کیسی عقیدت تھی، اس کا صحیح عکس بھی اس مضمون میں آیا ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنے مضمون میں یہ انکشاف کیا ہے کہ قائداعظم فارسی کے اشعار نہ صرف سمجھتے تھے، بلکہ اگر موقع محل سے استعمال ہوتے تو لطف بھی لیتے تھے۔ ویسے بھی مختلف لکھنے والوں نے جابجا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قائداعظم صرف ایک خشک سیاست دان نہیں تھے بلکہ ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور ۴۵ء کے سے مصروف دور میں بھی ملٹن، شیلی، کیٹس وغیرہ انگریزی شاعروں کے مطالعے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک بتایا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قائداظم کو جو بے پناہ مصروفیت رہی، اس کے باوجود دو کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ ایک تو قرآن شریف، دوسرے شیکسپیئر۔ غرض اس کتاب سے قائداعظم کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی متنوع دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کا وصف یہ ہے کہ اس میں قائداعظم کو انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

کتاب نہایت صاف ستھری اور بڑے سلیقے سے چھپی ہے۔ اسے گوشہ ادب لاہور نے شائع کیا ہے اور قیمت سات روپے ہے۔ ۳۰ء، ۳۱ کے بعد اردو ادب میں اضافے تو بہت ہوئے ہیں لیکن ایک شکایت لوگوں کو یہ رہی ہے کہ ہمارے ہاں ناول نہیں لکھے جا سکے۔ بات یہ ہے کہ افسانے میں تو ایک چھوٹا سا تاثر بھی کافی ہوتا ہے، اس میں یہ ضرورت نہیں

پڑتی کہ ایک آدمی کے کردار کی نشوونما بھی دکھائی جائے یا اجتماعی زندگی کی عکاسی بھی ہو۔ اس کے برخلاف ناول کے لیے لکھنے والے کو ایک پوری عمر کا تجربہ درکار ہے۔ خود اردو ہی میں دیکھ لیجئے، مولوی نذیر احمد نے اپنے ناول اس وقت لکھے جب وہ پنشن لے چکے تھے۔ اسی طرح سرشار اور رسوا بھی پکی عمر کے ہو گئے جب ناول کی طرف آئے۔ ناول کے لیے عمر یا تجربے کی پختگی درکار ہے۔ ہمارا موجودہ اردو ادب دراصل جوانوں کا ادب ہے۔ پھر ۳۶ء کے بعد سے ہمارے ادیبوں نے ان تجربات کے متعلق لکھنا شروع کیا ہے جو اردو ادب کے لیے نئے ہیں، لہٰذا اردو میں ناول کی نئی روایت پیدا ہوتے ہوئے کچھ وقت لگے گا۔ بہرحال پچھلے ڈھائی تین سال سے ناول نگاری کا شوق ہمارے یہاں ترقی کر رہا ہے۔ شوق میں نے اس لیے کہا کہ ابھی تک موجودہ دور میں کوئی ایسا ناول نہیں لکھا گیا جس کی قدر و قیمت دیرپا ہو۔ جو بھی ناول سامنے آئے ہیں، ان کی حیثیت ایک کوشش کی ہے اور انہیں اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ کوشش تھوڑی سی کامیاب ہو گی اور تھوڑی سی ناکام۔ ابھی تک تو یہ حال رہا ہے کہ ہمارے نوجوان ناول نگار یا تو افسانے کو پھیلا کر ناول بناتے ہیں یا کئی افسانوں کو ایک جگہ جوڑ کر۔ یہی حال انور جلال کے "جینئس" کا ہے۔ اس میں انہوں نے کئی نئی باتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا کردار ایک ایسا شخص ہے جو ہم چشموں میں نمایاں حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ عجیب و غریب راؤں کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کی حقیقی دلچسپیاں چھوڑ بیٹھا ہے۔ اسے بس اسی بات میں مزا آتا ہے کہ لوگ اسے جینئس سمجھیں۔ ایسے کردار کے متعلق بہت اچھا ناول لکھا جا سکتا تھا لیکن ناول نگار یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کردار کو طنزیہ نظر سے دیکھا جائے یا جذباتی نظر سے، اس شخص کا کردار ناول کے بیشتر حصے میں ایک دوست کی نظروں سے پیش کیا گیا ہے، اور دوست بھی ایسا جو اس سے مرعوب ہے اور اسے تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہے، بلکہ ایک حد تک خود اس کا نقطہ نظر قبول کرنے کو تیار ہے، لہٰذا ناول نگار اپنا رویہ صحیح طریقے سے واضح نہیں کر سکا اور آخر میں ایک طرح کا تصنع پیدا ہو گیا ہے، یعنی ایک دن یہ دوست جینئس کو ڈانٹتا ہے اور اسے صاف لفظوں میں بتا دیتا ہے کہ تم خود اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو۔ یہ سنتے ہی جینئس کی ایک دم اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ معمولی آدمی بن جاتا ہے۔ یہ تصنع اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ناول نگار کو ناول کا کوئی مناسب انجام نہیں سوجھا۔ ناول چودہ حصوں میں تقسیم ہے اور

ہر حصہ ایک افسانے کی طرح پڑھا جاسکتا ہے کیونکہ ہر حصے میں ایک واقعہ یا ایک تاثر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ناول میں کسی سمت کا احساس نہیں پیدا ہونے پایا، ہر حصہ بجائے خود تو واقعی دلچسپ ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ ناول کدھر جا رہا ہے۔ ناول نگار کو ایک نئی بات سوجھی ہے۔ اس ناول کے چند کردار ہیں۔ درخت، پانی، اسٹریٹ لیمپ وغیرہ۔ ان کرداروں کے ذریعے دراصل جینئس کے کردار پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ اس قسم کے مزیدار ٹکڑوں کے باوجود ناول میں کوئی وحدت اور کوئی سمت نہیں پیدا ہو سکی۔ ان ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے والی چیز ہیرو کی ہیئت کے سوا کوئی نہیں۔ اس لیے ناول بکھر کے رہ گیا ہے اور ناول نگار کو ناول ایسے انھونے طریقے سے ختم کرنا پڑا۔ بہرصورت انور جلال صاحب نے یہ تو دکھایا ہے کہ انہیں دلچسپ عبارت لکھنی آتی ہے۔ نئے نئے خیال بھی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، البتہ ان میں کمی یہ ہے کہ وہ پورے غور و فکر کے ساتھ ان بکھرے بکھرے خیالات کو جوڑ کر ایک وحدت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ تو اردو ناول میں کوشش کا دور ہے، پھر یہ ناول مصنف کی پہلی کوشش ہے، اس اعتبار سے ایک سنجیدہ کتاب ہے اور جہاں تک داد کی مستحق ہے، داد ملنی چاہیے۔ امید ہے کہ انور جلال صاحب کی اگلی کوششیں اس سے بہتر ہوں گی۔ یہ کتاب انار کلی کتاب گھر لاہور نے شائع کی ہے۔

ہمارے یہاں ناول کی مقبولیت تو بڑھ گئی ہے لیکن افسانوں کا زور بھی کم نہیں ہوا، بلکہ افسانوں کے مجموعوں کی اشاعت تعداد میں اب بھی ناول سے زیادہ ہے۔ چنانچہ "کچھ یادیں، کچھ آنسو" اے حمید کے نو تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے تین چار ناول اور افسانوں کے تین چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور پچھلے پانچ سال میں جو افسانہ نگار ابھرے ہیں، ان میں اے حمید کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی مقبولیت میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن اب ان کی تحریروں میں یکسانیت آ چکی ہے۔ ان کا محبوب موضوع یہ ہے کہ کسی غیر ملک کے دیہات کی خوبصورتی اور اپنے موجودہ شہری ماحول کی بدصورتی کا تضاد پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کوئی افسانہ اجنبی قسم کے درختوں، پھلوں اور پھولوں کے ناموں سے خالی نہیں ہو گا۔ اس طرح شگوفے، پھلے، قوسِ قزح وغیرہ وغیرہ قسم کے لفظ بھی ہر دو تین صفحے کے بعد ان کے یہاں آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ صرف موضوع میں ہی نہیں بلکہ بیان اور الفاظ میں بھی اے حمید کے یہاں یک رنگی آ گئی ہے۔ یہ اندازِ تحریر تھوڑی دیر تک تو مزا دیتا ہے لیکن پھر پڑھنے والا تھکنے لگتا ہے۔ یہی اس میں بڑا خطرہ ہے۔ پھر اے

حمید کے یہاں جذباتیت ضرورت سے کسی قدر زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے ان کا واحد موضوع ہے ناکام محبت، اور وہ بھی معاشی اسباب کی بنا پر۔ یہ جذبات پرستی ان کے افسانوں کے ناموں ہی سے ظاہر ہے۔ مثلاً چاندنی اور جزیرے، وہ ڈالیاں چمن کی۔ ریل کے سائے، پھول گرتے ہیں وغیرہ۔ اصل میں آدمی کو اپنے کامیاب افسانوں سے ڈرنا چاہیے۔ جب ایک ہی نسخہ بار بار استعمال ہونے لگتا ہے تو وہ بے اثر ہو جاتا ہے۔ اے حمید کو ایک ہی بات بار بار دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، جیسا کہ ان کے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے، ان کا تجربہ خاصا وسیع ہے۔ انہیں مختلف طبقوں سے اچھی واقفیت ہے، خصوصاً غریب طبقے کا کردار اور گفتگو نہایت کامیابی سے پیش کر لیتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دو مخصوص موضوعات یعنی ناکام محبت اور دیہاتی زندگی کا حسن، ان دو چیزوں سے دستبردار ہو جائیں اور سیدھی سادی روزمرہ کی زندگی کے متعلق لکھیں تو یہ ان کی صلاحیتوں کا زیادہ صحیح استعمال ہو گا۔ پڑھنے والوں کا ایک طبقہ رومانیت کو ابھی تک پسند کرتا ہے لیکن وہ اچھے خاصے لکھنے والے کو بے راہ کر سکتا ہے اور اسی طبقے کے زیر اثر کچھ دنوں سے ہمارے افسانوں میں رومانیت کا زور بھی ہو چلا ہے۔ یہ ہمارے ادب کے لیے بھی خطرناک ہے اور قوم کے لیے بھی۔ اس وقت تو سیدھی سچی حقیقت نگاری کی ضرورت ہے جو معمولی انسانوں اور معمولی زندگی سے دلچسپی لے سکے۔ اگر اے حمید اپنے تجربے کا صحیح استعمال کریں اور ناکام محبت کرنے والوں کے بجائے عام آدمیوں کی طرف توجہ کریں تو وہ ہمارے ادب میں گرانقدر اضافہ کر سکتے ہیں۔ اصل میں انہیں یادیں اور آنسو دونوں چیزوں سے ڈرنا چاہیے۔ ان نو افسانوں کے اچھے ٹکڑے وہی ہیں جہاں نہ تو گرما گرم یادیں ہیں نہ جلتے ابلتے آنسو بلکہ وہی روزمرہ کے آدمی اور روزمرہ کی باتیں۔ اگر اے حمید قدرے ضبط سے کام لے سکیں تو ابھی ان کے اندر نشوونما کی بڑی گنجائش ہے۔ لنکا، برما، شمالی افریقہ وغیرہ کے بجائے اگر وہ پنجاب کی زندگی پیش کریں تو اس سے قومی ادب کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب انار کلی کتاب گھر، لاہور نے شائع کی ہے۔ (ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

(مئی ۱۹۵۳ء)

اَدب اور قارئینِ اَدب

ہمارے ادب پر جو پژمردگی طاری ہے، اس کیفیت کو اچھے خاصے تین سال ساڑھے تین سال ہو چکے ہیں اور ادیبوں اور پڑھنے والوں، دونوں کی نیک نیتی کے باوجود صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ بعض پُرخلوص حضرات ان تعطل سے تنگ آ کر یہ صلاح دیتے ہیں کہ ادبی جمود کا ذکر یا اس پر بحث بے کار سی بات ہے، اصل چیز تو یہ ہے کہ ادیب کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرے۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے مگر یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی نفسیاتی مریض کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنی قوتِ ارادی استعمال کرو یا رات کو سونے سے پہلے پانچ دفعہ "میں ٹھیک ہوتا جا رہا ہوں" کہہ لیا کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر مریض اپنی قوتِ ارادی استعمال کر سکے تو پھر کسی مشورے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایسے مریض میں صلاحیتیں تو سب ہوتی ہیں مگر وہ کسی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتیں، اور ان کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ ہمارے ادب اور ہمارے ادیبوں کا حال بھی بالکل یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں میں احساس بھی ہے، مشاہدہ بھی ہے، تخلیق کی بُری بھلی صلاحیت بھی ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر بھی استقلال کے ساتھ کام نہیں کرتا یہاں وہاں ایک چمک سی نظر آ جاتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب اپنی کاوشوں کی ایک سمت اور مرکز ڈھونڈتے تو ہیں، لیکن اپنے اندر نہیں بلکہ باہر۔ یعنی وہ پڑھنے والوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنجیدہ ادبی مذاق رکھنے والے قارئین کی ایک جماعت موجود ہو تو یہ خواہش اتنی بُری چیز نہیں، بلکہ بعض اوقات لکھنے والے کو بہت سی خامیوں سے بچا لیتی ہے، لیکن ہمارے ادیبوں کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ ان کے پاس قارئین کی کوئی ایسی جماعت نہیں جو مثبت نہ سہی، منفی طریقے سے ہی ان کی مدد کر سکے۔ چنانچہ موجودہ ادبی صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے ان لوگوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو ادبی کتابیں اور

رسالے خریدتے ہیں- اگر کوئی فرد یا چند افراد ہر قسم کے قارئین سے مکمل طور پر بے نیاز ہو کے تخلیقی یا تنقیدی کام کر سکیں تو نہایت مبارک بات ہے، لیکن جن ادیبوں کے لیے ماحول سے متعلق رہنا ضروری ہے، انہیں تو یہ غور کرنا ہی پڑے گا کہ ہماری تحریریں پڑھ کون رہا ہے؟ وہ ہمہ صفت ادیب جو اپنے پڑھنے والوں سے کوئی اثر ہی نہیں لیتے، ان کا تو ذکر ہی فضول ہے لیکن جو ادیب چاہتے ہیں کہ ہمارے پڑھنے والے ہم سے کوئی سخت مطالبہ کریں، انہیں تو اپنے قارئین کو سمجھنا ہی چاہیے-

یوں ادیبوں کو اپنے بارے میں جتنے بھی مغالطے ہوں، لیکن نئی ادبی تحریک پیدا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پڑھنے والوں کی ایک نئی جماعت پیدا ہوئی ہے، مثلاً ۲۰ء کے قریب نیاز فتح پوری اور ان کے قبیلے کے لوگ سامنے آئے جنہوں نے ایک طرف تو اردو ناول کا گلا گھونٹا، دوسری طرف اُردو نثر کی کمر توڑی- یہ ضلع کچہریوں کے سرشتے داروں اور عرائض نویسوں کا ادب تھا جو اپنی آمدنی سے بالکل مطمئن تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے دل میں اپنی زندگی کی وہ عزت اور محبت نہیں تھی جو سرشار، نذیر احمد یا سجاد حسین کے دل میں تھی- دوسرے طریقے سے یوں کہیے کہ یہ ان لوگوں کا ادب تھا جن کے یہاں کوئی خاندانی دھوبی، نائی، بہشتی لگا ہوا نہیں تھا، بلکہ جو پیسے دو پیسے فی عدد کے حساب سے اپنے کپڑے دھلواتے تھے، یعنی ان لوگوں کے سماجی تعلقات بہت ہی محدود اور تنگ ہو کر رہ گئے تھے، اور اوپر سے انہیں اس پر فخر بھی تھا- وزیرے چنیں شہریارے چناں! ایسے قارئین کے زیر اثر اردو نثر کیسی اپاہج ہو کے رہ گئی تھی، اس کا اندازہ اسی سے کر لیجیے کہ حضرات نیاز فتح پوری کیوپڈ اور سائیکی یا مریل شاعروں کی سرگزشت تو بیان کر سکتے تھے، لیکن اگر "رئیس التحریر" سے کہا جاتا کہ آپ کے محلے میں کوئی نائی رہتا ہے تو ذرا اس کا حلیہ پانچ سطروں میں لکھ دیجئے — ایسا مطالبہ سن کر ان کی ادبیت کو انتہائی صدمہ پہنچتا- فراق صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ ہمارے نئے شاعر محبوب کی بے نیازی کا شکوہ تو کرتے ہیں، لیکن اگر محبوب اُن پر عاشق ہو جائے تو کیا ہو! کچھ یہی بات میں نیاز اسکول کے جمال پرستوں کے بارے میں سوچتا ہوں- "مقیاس الشباب" جیسے فقرے میں عربی ترکیب کی گھن گرج تو ضرور ہے، لیکن جن صاحب نے یہ فقرہ لکھا ہے اگر ان کے سامنے منٹو کی کوئی ہیروئن پیش کر دی جاتی تو شاید تھرمامیٹر کی ضرورت پڑ جاتی-

خیر، اب ۳۶ء کے بعد والے دور کی طرف آیئے، یہ ان کلرکوں اور طالب علموں

کا ادب ہے۔ جو اپنی آمدنی سے غیر مطمئن ہیں یا جنھیں آمدنی کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔ اُن کے دل میں اپنی زندگی کی عزت یا محبت ہو یا نہ ہو، مگر انھیں زندگی کو دیکھنا ضرور پڑتا ہے۔ چاہے یہ لوگ اپنے محلے کے نائی اور دھوبی کو جانتے نہ ہوں، مگر جاننا ضرور چاہتے ہیں — نائی کی حیثیت سے بھی اور ایک فرد کی حیثیت سے بھی۔ نیاز فتح پوری وغیرہ کے نزدیک عبارت وہ اچھی تھی جس میں "ق" اور "ع" جیسے حروف بار بار آئیں۔ نئے ادیبوں کے لیے اچھی عبارت کے معنی تھے۔ حقیقت کا مشاہدہ۔ چنانچہ اردو ادب جو جمال پرستوں کی بدولت مر چلا تھا، پھر سے زندہ ہوا۔ (یہ جمال پرستوں کی اصطلاح میں نے محض اس لیے استعمال کی کہ عام طور سے ان لوگوں کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے، ورنہ لغت کی پنسیریاں لڑھکانے کو جمال سے کیا واسطہ)۔

پھر ۵۰ء کے قریب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اسے آپ چاہیں تو ادبی جمود کا زمانہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ پڑھنے والے ایک جماعت کی حیثیت سے بالکل ہی غائب ہو گئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کا ادب یا جو چیزیں ادب کے نام سے چھپتی ہیں، لڑکیوں کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ سال بھر پہلے میں نے اسے اسکول کی لڑکیوں کا ادب کہا تھا۔ اب یہ بات بالکل ہی واضح ہو چکی ہے۔ ہماری قومی زندگی کی اٹھان ہی کچھ ایسی رہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں صرف ایک اصولِ زندگی کو تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی ذاتی ترقی۔ ہر مرد کی خواہش یہ ہے کہ بلیک مارکیٹ کر کے جلدی سے لکھ پتی بنوں، ہر عورت کی خواہش یہ ہے کہ کسی ایسے آدمی سے شادی کروں جس کے پاس لمبی چوڑی کار ہو۔ ہمارے پاس اب بس یہی دو خواب رہ گئے ہیں، چنانچہ ہمارے بیشتر ادب کا موضوع بھی یہی ہے۔ مرد تو چونکہ بلیک مارکیٹ کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اسی لیے ان کے پاس ادب پڑھنے یا لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں۔ لڑکیاں چونکہ اپنی کار کے انتظار میں ہیں، اس لیے خالی وقت میں نٹھالی سے بیگار بھلی، "ادب" پڑھتی ہیں، اور ادب بھی وہی پڑھتی ہیں جس میں ہیرو کے پاس کار ہو۔ لہٰذا ہمارے بیشتر افسانوی ادب میں حقیقت کا مشاہدہ اور مطالعہ تو دور کی بات ہے، حقیقت کا احساس تک باقی نہیں رہا، اور تو اور، کردار نگاری تک ختم ہو گئی۔ بیسیوں افسانے دیکھ جائیے ہیرو وہی ہو گا، اس کا لباس، بات چیت، حرکات و سکنات کسی چیز میں بھی تو فرق نہیں ہو گا۔ کہانی عام طور سے یہ ہوتی ہے کہ کوئی فوجی افسر چھٹیوں میں کسی پُر فضا مقام پر آیا ہے جہاں عجیب و غریب ناموں والے درخت ہیں۔ اسے تنخواہ چاہے پانچ

سو روپے ملتی ہو، مگر کار اس کے پاس ہوگی، بیس ہزار کی۔ یہاں اس کی ملاقات ہیروئن سے ہوتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی سہیلیوں سے بھی۔ یہ لوگ پہاڑیوں پر اور جھیلوں کے کنارے ٹہلتے ہیں، آئس کریم کھاتے ہیں، اور ایک آدھ انگریزی گانا گانے کے بعد — کبھی تو بہار ہنسنے لگتی ہے، کبھی رونے لگتی ہے۔ قصہ ختم۔ ۳۶ء کے بعد والے ادب پر اکثر اعتراض ہوتا تھا کہ یہ تو نوجوانوں کی جنسی بے اطمینانی کا اظہار ہے۔ آج کل جو ادب پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں تو اتنی بات بھی نہیں کہی جا سکتی۔ اگر ان افسانوں میں لڑکیوں کی جنسی بے اطمینانی کا ایماندارانہ اظہار ہوتا تب بھی کوئی بات تھی، یہی بے اطمینانی معاشرے اور انسانی کردار کے مشاہدے اور مطالعے کا بہانہ بن سکتی تھی، لیکن فی الحال تو ہمیں ان افسانوں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ لڑکیاں کار میں بیٹھنا چاہتی ہیں، چنانچہ دراصل یہ افسانے رومانی بھی نہیں ہیں۔ یہاں جن خواہشات کا اظہار ہوتا ہے، وہ جنسی نہیں بلکہ معاشی ہیں۔

پھر ایک اور دلچسپ عمل رونما ہو رہا ہے۔ پڑھنے والے اور لکھنے والے کی تفریق بھی مٹتی جا رہی ہے۔ یہ ادب لڑکیوں کے لیے ہے اور اب اسے خود لڑکیاں ہی لکھ بھی رہی ہیں۔ اتنی لکھنے والیاں تو عصمت چغتائی کے دور میں بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ لیکن سماجی حقیقت کا جو شعور عصمت چغتائی میں تھا، اس کا آج نشان تک نہیں ملتا۔ کاغذی تصویروں سے کھیلنا سب سے قرۃ العین حیدر نے شروع کیا تھا، لیکن چونکہ وہ دور سماجی تنقید کا تھا، اس لیے قرۃ العین کے افسانوں میں حقیقت کا تھوڑا بہت احساس تو آ ہی جاتا تھا، اب وہ بھی غائب ہے۔

مختصر یہ کہ اب اردو ادب میں خواتین کا دور ہے، معنوی اعتبار سے بھی اور مادی اعتبار سے بھی۔ جمود کو توڑنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا مردوں میں ادب پڑھنے والوں کی ایک نئی جماعت پیدا ہو یا پھر عورتیں ہی تخلیقی یا تنقیدی طریقے سے سنجیدہ ادبی معیار قائم کریں۔ عصمت چغتائی نے تو لکھنا چھوڑ ہی رکھا ہے، اگر وہ لکھتیں بھی تو پتہ نہیں پاکستان کے ادب پر اُن کا اثر ہوتا یا نہ ہوتا، البتہ یہ فرض ممتاز شیریں کا ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی خبر لیں۔

(جولائی ۱۹۵۳ء)

شاعری اور قدرتِ الفاظ

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے، ایک رسالے کے مدیر نے کسی شاعر کی نظم کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان صاحب نے اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نظم میں لکس سوپ کا ذکر کیا ہے۔ انہی دنوں میں نے ایک اور شاعر کو خود اپنی تعریف میں یہ کہتے سنا تھا کہ نظم میں حیض کے کپڑوں کا نام پہلی دفعہ میں نے لیا ہے۔ خیر صابن کی قسمیں گنوانے سے تو شاعری نہیں ہوتی، لیکن اس سے ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے کے شاعر تمیز کے ساتھ بے تمیزی کے ساتھ، بہرحال یہ کوشش کر رہے تھے کہ جن چیزوں کو غیر شاعرانہ سمجھا جاتا ہے، ان کی مدد سے شاعری جذبہ پیدا کریں یا کم سے کم انہیں شاعری میں داخل کر لیں۔ اول تو غزل کی شاعری میں یہ بڑا نقص ہے کہ جب چند چیزیں محض علامت بن کے رہ جائیں اور انہیں وسیع ترین معنوں میں بھی استعمال کیا جاسکے تو پھر نئی چیزوں کو شاعری میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود پرانے غزل گو شاعروں کے یہاں کبھی کبھی ایسی چیزوں کا ذکر آ ہی جاتا ہے جو غزل کی عام زبان سے خارج تھیں۔ یہ بات کنگھی چوٹی کی شاعری یا واسوخت نما شاعری تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ جذبہ یا فکر کی شاعری میں بھی نمودار ہو جاتی تھی۔ معاملہ اصل میں غالب نے خراب کیا۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر، کہہ کے وہ نئی نئی چیزوں کو شاعرانہ تصرف میں لانے کے حق سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے۔ اقبال نے اپنی شاعرانہ زبان سے چیزوں کو اور بھی خارج کیا اور ان کی جگہ تصورات کو دی۔ بیچ میں ایک اکبر الہ آبادی ضرور ایسے ہوئے جنہوں نے زیادہ سے زیادہ چیزوں کو اپنی شاعری میں سمیٹنا چاہا لیکن لوگوں نے ان کی شاعری کو ہنسی مذاق سمجھ کر ٹال دیا اور اس کے شعری اسالیب پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مثلاً ہمارے کسی نقاد نے یہ سوچنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کہ۔

ان کی بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

جیسے شعر میں کسی قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اور کس طرح۔ چنانچہ الفاظ پر شاعرانہ قدرت حاصل کرنے کا خیال ہی ہمارے ادب سے رخصت ہوگیا اور ہمارے شاعر گنے چنے الفاظ کے ذریعے شاعری کرنے لگے۔

۳۸ء کے قریب ہمارے بعض شاعروں نے یہ ایک اُڑتی سی خبر سنی کہ یورپ میں تو آج کل شاعر لوگ اپنی نظموں میں ہر اُلٹی سیدھی چیز کا ذکر کر دیتے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ نسخہ تو سستا ہے، لاؤ ہم بھی آزما دیکھیں، چنانچہ لکس سوپ کے ذریعے ہمارے کئی شاعر ٹی۔ ایس ایلیٹ بن گئے اور میراجی نے تو نون۔ م راشد کو بودلیئر اور میلارمے کے برابر جا بٹھایا، لیکن ان مضحکہ خیز دعووں کے باوجود اتنی بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ یہ لوگ اردو شاعری اور شاعروں کے احساس کا دائرہ وسیع کرنے کی الٹی سیدھی کوشش ضرور کر رہے تھے۔ سات آٹھ سال کے عرصہ میں اتنی بات بھی باقی نہ رہی اور شاعرانہ سازو سامان صرف دو چار چیزوں تک محدود ہو کر رہ گیا — اُداس شام (زیادہ گہری اُداسی کی ضرورت پیش آئی تو رات سہی)، اُداس درخت، اُداس چڑیا، اور اُداس شاعر۔ ان لوگوں کی شاعری میں بھدی سے بھدی چیز جو نظر آتی ہے، وہ ہے اُداس بھیڑ۔ ان سے آگے جتنی چیزیں ہیں، وہ اتنی جاندار ہیں کہ ہمارے شاعروں کے بس میں نہیں آتیں۔ اس لیے وہ اس سے بارہ پتھر الگ ہی رہتے ہیں۔ کسی چیز کا وجود اس کے خصوصی امتیاز کے ساتھ محسوس کرانا تو دُور کی بات ہے، ہمارے شاعر تو چیزوں کے نام تک نہیں لے سکتے۔ یہ بات بھی ڈرنے کی ہے۔ اگر کوئی آدمی اُداس اُداس بیٹھا ہو، اسی طرح بیٹھا رہنا چاہتا ہو اور اپنی اس کیفیت پر ہم سے داد بھی طلب کر رہا ہو اور ایسے میں لکس سوپ کا نام آجائے تو خواہ مخواہ لوگ ہنس پڑیں گے اور اُس بیچارے کی محنت کا خون ہو گا۔ لہٰذا بات بھیڑ سے آگے نہیں بڑھنی چاہیے، بلکہ بھیڑ میں تو ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر وقت ہی اداس شاعر لگتی ہے۔ چنانچہ آج کل اردو شاعری کے جمالیاتی نظریے کو بڑی آسانی سے ایک فارمولا کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے جس کے مطابق ایک بچہ بھی شاعری کر سکتا ہے:

شاعری = اُداسی
اُداسی = بھیڑ

لہٰذا شاعری۔۔ بھیڑ

آج سے دس بارہ سال پہلے کے شاعر اپنے آپ کو ایلیٹ، بودلیئر، میلارمے کہا کرتے تھے۔ خدا جانے اس موجودہ جمالیاتی نظریے کے پیرو اپنی تعریف کن الفاظ میں کرتے ہوں گے، البتہ اس شاعری کو پڑھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے خود گھاس کھا رہے ہوں۔ اس سے تو وہ تعلی کا زمانہ ہی اچھا تھا کہ آدمی نظم پڑھ کر ہنس ہنسا تو لیتا ہے، مثلاً ایک صاحب نے نظم لکھی "سڑک بن رہی ہے" میرا جی نے اس میں نوجوانوں کی ساری اُلجھنیں دریافت کیں۔ ایسی باتوں پر ہنسنے کے بعد آپ اتنا تو کہہ سکتے تھے۔ چلو بیچاروں نے شاعری نہیں کی تو کم از کم سڑک بننے کا حال تو نظم کر دیا۔ آج کل تو جو نظم اٹھا کے دیکھیے اس میں بس بھیڑ نکلتی ہے — اور وہ بھی مادہ —

(اگست ۱۹۵۳ء)

اُردو اَدب کی موت

جشن آزادی کے موقع پر اخباروں اور رسالوں میں سال بھر کی ادبی سرگرمیوں کے جو جائزے پیش کیے جاتے ہیں، وہ بھی خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ ان جائزہ نگاروں کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ سال بھر میں جو چیزیں لکھی گئی ہیں، ان کی فہرست بنا دیں۔ ان چیزوں کی قدر و قیمت کیا تھی، اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ویسے بھی برس کے برس دن عیب گوئی کوئی اچھی بات نہیں۔ اس لیے کم سے کم ایک دن کے لیے جائزہ نگار اور پڑھنے والے، دونوں کو یہ فرض کرلینا پڑتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اچھا ہی ہوگا۔ یہاں تک بھی کچھ برا نہ تھا، لیکن بیچارے جائزہ نگار کو ایک فہرست ان لوگوں کی بھی بنانی پڑتی ہے جنھوں نے سرے سے کچھ لکھا ہی نہیں، اور دبی زبان میں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ادب کے ہر شعبے میں قحط سالی کا عالم رہا ہے اور جو کچھ ہوا بھی ہے، اس کی تعریف کے لیے جائزہ نگار کو "دلچسپ" سے زیادہ وزنی لفظ نہیں ملتا، لیکن اس کے باوجود جائزے کے آخر میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ "بہ حیثیت مجموعی" اس سال اردو ادب نے بڑی ترقی کی۔ یہ بالکل اس مشہور لطیفے کا سا حال ہے کہ سارا خاندان جل مرا، لیکن "سب خیریت ہے"۔ یا پھر ممکن ہے کہ جائزہ نگار حضرات یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہمیں تو اتنی بھی اُمید نہ تھی، جو کچھ ہوا اسی کو غنیمت سمجھو۔ اگر ہماری قناعت کا یہی حال رہا تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب ہم ۱۴ اگست کو یہ کہا کریں گے کہ اس سال افسانے اور نظمیں تو بالکل نہیں لکھی گئیں، لیکن بارہ دوا خانوں نے اپنی فہرستیں اردو میں شائع کیں، اس لیے "بحیثیت مجموعی" اردو نے بڑی ترقی کی۔ ہمارے یہاں لوگ تنقید نہیں لکھتے، مبارک باد دیتے ہیں۔ حالانکہ شاید وقت تعزیت کا آ پہنچا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں نے دوسروں کو بہت چونکا لیا لیکن ایسی بات نہیں سننا چاہتے جس سے خود چونکنا پڑے۔ سرمایہ داری کی موت کا اعلان ہو چکا، خدا کی موت کا

اعلان ہو چکا پتہ نہیں اردو ادب کی موت کے اعلان سے لوگ کیوں ہچکچا رہے ہیں، کیونکہ اب تو معاملہ جمود اور انحطاط سے بھی آگے پہنچ چکا۔ اگر صاف اردو ادب کی موت کا اقرار کر لیا جائے تو کم سے کم اتنا فائدہ ہو سکتا ہے کہ سال دو سال چپ رہنے کے بعد ہمارے ادیبوں میں دوبارہ جان آ جائے، یا اس دوران میں کچھ نئے ادیب پیدا ہو جائیں۔ ورنہ یہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو ادیب سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں، وہ اس بات کو بھول کر بلیک مارکیٹ یا کسی اور مفید کام میں لگ جائیں گے، پھر دو چار سال تو کسی کو ادیب بننے کی ہمت نہیں ہو گی۔ اس کے بعد اگر کوئی میدان میں آیا بھی تو پہلے سے سر پہ توا باندھ کے آئے گا۔ آج کل تو لوگ لکھ نہیں رہے، وضع داری برت رہے ہیں۔ ایک دفعہ یہ بات سمجھ میں آ جائے تو دل کو قرار آ جائے گا، اور ہم سب ادب اور ادیبوں پر فاتحہ پڑھ کے اپنے اپنے دھندے سے لگیں گے۔ اخباروں کے آزادی نمبروں میں جگہ بھی بچے گی، جائزہ نگار اتنی ہی آسانی سے بازار کے بھاؤ پر تبصرہ کر دیا کریں گے۔ دس پانچ سال بعد کچھ لوگوں کے دماغ میں ادب کا کیڑا کلبلائے تو وہ جانیں ان کا کام، ہمیں تو اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیے۔ ادب کا تابوت سر پر اٹھائے پھرنے سے کیا فائدہ؟ اب تو اُسے دفنا ہی دینا اچھا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بہتر تو یہ ہے کہ اب ہمیں یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اردو ادب مرا کیوں۔ یہ بھی ان لوگوں کا کام ہے جو کبھی آ کر ادب کو قبر سے نکالیں گے۔ ہمیں تو بس اپنے آپ کو اس لاش سے آزاد کرنا ہے۔ یہ ہمیں دنیا کا کوئی اور کام نہیں کرنے دیتی۔ یوں کسی کا جی چاہے تو چھپے چوری ادب "کر لیا" کرے۔ لیکن جائزہ نگاروں کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے اگر "بحیثیت مجموعی" اُردو ادب کی موت کا اعلان ہو جائے تو بہتر ہے۔

(ستمبر ۱۹۵۳ء)

ادیب!

جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا "بحیثیت مجموعی" اردو ادب مر چکا ہے کیونکہ جو تحریریں ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہیں، انہیں ادب سمجھنا اب ناممکن ہو گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے ادبی حلقے یہ حقیقت تسلیم کرنے سے کترا رہے ہیں۔ اگر ملک میں ادب کی کوئی جگہ معین ہوتی اور ادبی تخلیق کا کوئی منشا اور منتہا سماجی طور پر تسلیم ہو گیا ہوتا تو خیر ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ادیب لوگ شہرت کے بھوکے ہیں۔ یا ان کی روزی کا یہی ذریعہ ہے، اس لیے ادب کو ختم ہو جانے کے باوجود اپنے آپ کو ادیب کہلوائے چلے جا رہے ہیں (یعنی روس کے ادیبوں کا حال ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج پاکستان میں ادیبوں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا، اپنے حلقے میں بیٹھ کر ادیب اپنے آپ کو جو چاہیں سمجھا کریں۔ یوں تو اب سے چھ سال پہلے بھی ادیبوں کو کون سی جاگیریں بٹ رہی تھیں۔ میرا مطلب ادیبوں کی قدر و منزلت سے نہیں۔ میں صرف اتنی بات کہہ رہا ہوں کہ ہمارا اجتماعی شعور ادب کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ شاید ادب سے ڈرتا ہے، چنانچہ ہمارے معاشرے میں ادیب بننے سے آدمی کے پندار کو کوئی تقویت نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن سماج کی اس بے نیازی کے باوجود ادیب یہی سمجھے چلے جا رہے ہیں کہ ہمارا ادیب بنے رہنا ضروری ہے۔ مگر یہ رویہ احتجاجی یا باغیانہ ذرا بھی نہیں ہے۔ اگر ادیب سماج سے انحراف کرنے کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیت کو سماجی شخصیت کے مشاہدے، معائنے اور تفتیش کے لیے استعمال کرتے تو ادبی شہرت کی آرزو بھی شہادت کا رتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن قصہ تو یہی ہے کہ سماج نے ادب اور ادیب کو رد کر دیا، ادیب اپنی تخلیقی صلاحیت سے بھی کام نہیں لے رہے، اور اس کے باوجود ادیب بنے رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ ادیب بنے رہنے سے ادیبوں کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس سوال کا جواب ادب اور ادبی شخصیت کے

دائرے سے باہر نکل کے ہی ملے گا۔

اگر ادب کو اعصابی خلل کا نتیجہ کہہ دیا جائے تو میرے خیال میں اس سے ادب کی کوئی توہین نہیں ہوتی کسی چیز کی ماہیت دریافت کر لینے سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاغذ چیتھڑوں سے بنتا ہے، لیکن دونوں چیزوں کی قدر و قیمت الگ الگ ہے، تو ادب کا ماخذ اعصابی خلل ہی سہی، لیکن چونکہ ادب زندگی کے بارے میں علم حاصل کرنے اور اُس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بھی بن جاتا ہے، اس لیے ہم ادب کو صرف و محض اعصابی خلل کہہ کر نہیں ٹال سکتے، لیکن جب ایسی تحریریں ادب کے نام سے پیش کی جانے لگیں جن میں ادبی عناصر بقدرِ ذائقہ یا اس سے بھی کم ہوں تو پھر انہیں ادبی معیاروں سے جانچنا فضول ہے۔ ایسی صورت میں تو ان کی نفسیاتی ماہیت پر ہی غور کرنا زیادہ مفید ہو گا۔ اگر ہمارے ادیب ادب کی تخلیق نہیں کر رہے اور سماجی اہمیت حاصل کرنے کا موقع نہ ہونے کے باوجود ادیب بنے رہنا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ادیبوں کو اندرونی طور پر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پہنچ رہا ہو گا۔

یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آج کل پاکستان میں ادیب بن جانے سے کوئی سماجی درجہ حاصل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ادب تو ادیبوں کو آوارہ منش یا خطرناک بھی نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ ادب اور ادیبوں کے بارے میں ہمارے یہاں کوئی سوچتا ہی نہیں، چنانچہ یہاں بے روزگاری، مفلسی، جنسی غیر آسودگی، احساسِ کمتری کسی چیز کی بھی نفسیاتی تلافی ادیب بن جانے سے نہیں ہو سکتی۔ ہمارے یہاں ادب کسی چیز کا بھی نعم البدل نہیں بن سکتا۔ پھر اس حرکت کی توجیہ کس طرح ہو سکتی ہے؟

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس طرح کولھو کے بیل کو اندھوٹے پہنا دیے جاتے ہیں، اُسی طرح ہمارے ادیبوں نے اپنی آنکھوں پر ادب اوڑھ رکھا ہے۔ یعنی ہمارے ادیبوں کے لیے ادب زندگی کے مطالبات سے بچنے، بھاگنے اور انہیں اپنے شعور میں نہ آنے دینے کا ایک حربہ ہے۔ ہمارے ادیب اسے اپنی مدافعت کے لیے استعمال کر رہے ہیں، اور بس۔ عام طور سے تو ادیب کی شخصیت زیادہ سے زیادہ تحریکات کو اپنے اندر جذب کرتی ہے، لیکن ہمارے ادیبوں کی کوشش یہ ہے کہ ان کے نفسیاتی نظام میں باہر سے کسی قسم کی تحریک داخل نہ ہو۔ اگر کوئی آدمی بے حس، بے جان اور گٹھل ہو جانا چاہتا ہو تو پاکستان میں اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ ادیب بن جائے۔ زندگی کے سارے انفرادی اور

اجتماعی مسئلے اس ایک بات سے حل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ اردو کے ادیب ہیں تو پھر آپ کو اپنے جسم یا دماغ سے کام لینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ادیب بننے کے بعد آدمی کو زندگی سے پنشن مل جاتی ہے۔ اُردو کے ادیب سے آپ کوئی مطالبہ نہیں کرسکتے، کیونکہ ادیب بن جانے کے بعد خود اس کے اندر کسی قسم کے مطالبات باقی نہیں رہتے، ہر سوال کا جواب مہیا ہے۔

آپ کے ہمسائے کی آمدنی پانچ سو ہے، آپ کی آمدنی پچاس روپے کیوں ہے؟ ہم تو ادیب ہیں۔

آپ میلے کپڑے کیوں پہنتے ہیں؟ ہم ادیب ہیں۔

آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟ نہیں، ہم تو ادیب ہیں۔

پاکستان کا آئین کیسا ہو؟ ہمیں کیا معلوم، ہم تو ادیب ہیں۔

آج کل انگلستان کا وزیر اعظم کون ہے؟ روس کا دارالسلطنت کون سا ہے؟ ان باتوں کا ہم سے مطلب؟ ہم تو ادیب ہیں۔

آپ کوئی کتاب پڑھتے ہیں؟ نہیں، ہم تو ادیب ہیں۔

کبھی سوچتے ہیں؟ نہیں، ادیب آدمی ہیں۔

کبھی کچھ محسوس کرتے ہیں؟ نہیں، یہ ادیبوں کا کام نہیں۔

کچھ لکھتے ہیں؟ نہیں، ہم تو اردو کے ادیب ہیں، ہم تو رسالوں میں اپنی تصویر چھپواتے ہیں۔

دیکھا آپ نے، ادیب بن جانے سے زندگی کتنی آسان ہو جاتی ہے۔ نے غمِ دُزد نے غمِ کالا۔ ہمارے ادیب شہرت پسند نہیں ہیں۔ الزام بالکل غلط ہے۔ اگر شہرت کی ہوس ہوتی تو اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتے۔ شہرت پسند تو کیٹس تھا، عمر بھر اس فکر میں رہا کہ کسی طرح شیکسپیئر کے برابر پہنچ کے رہوں۔ نام و نمود کی آرزو تو ٹینی سن کو تھی جسے مرتے وقت یہ اطمینان نصیب ہوا کہ کوئی احمق مجھے اپنا دوست کہنے کی بھی جرات نہیں کرسکتا۔ ہمارے ادیب تو بیچارے عافیت پسند ہیں، دگر خواہی سلامت برکنار است، ان کا ایمان ہے۔ اگر بلیک مارکیٹ کرنے، رشوت لینے یا عشق لڑانے کے دھندے میں پڑیں تو جسم اور دماغ، دونوں حرکت میں آتے ہیں۔ اتنا آرام کہاں ہو گا، جتنا ادب میں ہے۔ ہمارے ادیبوں کو زندہ رہنے کے لیے واقعی ادب کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو تو خدا جانے

بیچاروں کا کیا حشر ہو۔ آپ کو میری بات کا یقین نہ آجائے تو کم سے کم لاہور کے لوگ مخدوم محمد اجمل صاحب سے فتویٰ لے سکتے ہیں (کیونکہ پاکستان میں نفسیات بس ایک ہی آدمی کو آتی ہے) مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں بار بار اردو ادب کی موت کا اعلان کرکے بیچارے اردو کے ادیبوں سے زندگی کا آخری سہارا بھی چھینے لے رہا ہوں، لیکن میں تو اس امکان پر غور کر رہا ہوں کہ اردو ادب دوبارہ زندہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر موجودہ ادیبوں کو قربان کر دینے سے ادب میں پھر جان آجائے تو یہ سودا گھاٹے کا نہیں رہے گا۔

(اکتوبر ۱۹۵۳ء)

کچھ فراق صاحب کے بارے میں!

فراق صاحب نے اپنی کسی غزل میں کہا ہے ۔

حقیقتوں کے خزانے لٹا دیے مَیں نے

اس پر کسی صاحب نے اعتراض کیا کہ فراق صاحب ذرا بتائیں تو سہی کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں کون سی حقیقتوں کے خزانے لٹائے ہیں۔ خیر، یہ بات تو بعد میں دیکھیں گے کہ فراق صاحب نے کیا کیا ہے، کیا نہیں، پہلے تو سوال یہ آتا ہے کہ شاعری سے ہم اس قسم کی توقع بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔

دراصل شاعری کے متعلق ہمارے یہاں عام لوگ جس طریقے سے سوچتے ہیں، اس پر انیسویں صدی کی انگریزی تنقید کا بڑا اثر پڑا ہے۔ اس کے ساتھ ترقی پسندوں کے نظریے اس بُری طرح گڈمڈ ہو رہے ہیں کہ ہم لوگ شاعری پڑھنا ہی بھول گئے ہیں۔ ہمیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ شعر اچھا ہے یا بُرا یا شعر ہوا بھی کہ نہیں۔ اس کے بجائے ہم شعر میں کوئی ایسا خیال یا نظریہ حیات ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں جسے تجریدی انداز میں بیان کیا جا سکے۔ یعنی ہم شاعر کو فلسفے یا سیاست یا معاشیات کا نعم البدل سمجھتے ہیں جس میں خوبی یہ ہے کہ جو بات فلسفی بھاری بھرکم طریقے سے کہے گا، وہ شاعر ہلکے پھلکے لفظوں میں کہہ دیتا ہے اور وہ ذہنی محنت سے بچ جاتے ہیں۔ ہمارے شاعر اور ان کے پڑھنے والے، دونوں کے دونوں یہ بھول چکے ہیں کہ شعر میں ایک بات ایسی بھی ہوتی ہے کہ جو نثر میں نہیں کہی جا سکتی۔ چنانچہ اس "خیال" پرستی کے دور میں اگر شعر کی جمالیاتی حقیقت پر زور دیا جائے تو یہ کچھ بیجا نہ ہو گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ شعر ایک جمالیاتی چیز سہی، لیکن انسانی تجربے اور کائنات کی ماہیت کی تفتیش کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ یہ بات ذرا بلند

بانگ معلوم ہوتی ہے۔ اسے بھی چھوڑیے۔ فرائڈ نے سینکڑوں مثالیں دے کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ ایک لفظ ایسا نہیں کہہ سکتے جو مہمل ہو اور جس کا تعلق بولنے والے کی ذات سے نہ ہو۔ تو شعر کامیاب ہو یا ناکام، اُس کے ساتھ شاعر کی ذات معرضِ بحث میں ضرور آتی ہے۔ پھر آپ کوئی چھوٹے سے چھوٹا جملہ ایسا نہیں کہہ سکتے جس میں سے کوئی نہ کوئی فلسفہ نہ نکلتا ہو۔ یعنی ہم اپنی معمولی سے معمولی باتوں میں بھی انسانی زندگی اور کائنات کے متعلق کسی نہ کسی رویہ کا اظہار ضرور کرتے ہیں، چاہے اس کا دائرہ کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو۔ چونکہ شعر میں جمالیاتی نظم کے علاوہ کسی نہ کسی قسم کا جذباتی یا فکری نظم بھی رونما ہوتا ہے جس سے ایک اشارہ یہ نکلتا ہے کہ شاعر نے خود حقیقت میں بھی کسی نہ کسی طرح کا نظم محسوس کیا ہے، اس لیے شعر میں غیر جمالیاتی معنویت عام گفتگو کی بہ نسبت زیادہ ہونی چاہیے، لہٰذا اگر ہم شعر میں کسی طرح کی حقیقت یا صداقت ڈھونڈیں تو یہ بھی شعر کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو گی۔ کسی شعر کی عظمت کا فیصلہ محض شعری یا جمالیاتی اقدار کے اندر رہ کے نہیں ہو سکتا، لیکن کوئی شعر واقعی شعر بھی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ محض شعری اقدار کے اندر رہ کے ہوتا ہے۔ شعر میں حقیقتوں کے خزانے تلاش کرنے سے پہلے ہمیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ شعر کی حیثیت سے یہ چیز کیسی ہے۔ اس کے بعد چاہے ہم اس شعر کی مدد سے شاعر کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کریں چاہے کائنات کی ماہیت کے بارے میں چھان بین کریں۔

فراق صاحب کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ آپ میری باتوں سے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں فراق صاحب کی شاعری کو سائنس کی حیثیت سے اہم خیال کرتا ہوں۔

شاعری کو شاعری سمجھ کر پڑھنے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ہمیں کس قسم کی حقیقت ملتی ہے۔ نفسیاتی، سماجی، فلسفیانہ حقیقتوں کے بارے میں تو خیر ادبی تنقید ہمیں روز ہی کچھ نہ کچھ بتاتی رہتی ہے، لیکن ادب میں ایک اور قسم کی حقیقت بھی ملتی ہے، کائنات کی بنیادی، مرکزی بلکہ جوہری قوت کا احساس۔ اس قوت کے مختلف نام ہو سکتے ہیں۔ اطالوی فلسفی دیوانتے نے اُسے وہ اصول بتایا ہے جو اپنے آپ سے اپنے آپ عمل کرتا ہے اور جسے حرکت میں آنے کے لیے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دیوانتے نے پوری انگریزی شاعری کا تجزیہ اس حساب سے کیا ہے کہ اُس اصول کا احساس

کس شاعر میں کس حد تک ہے اور کس شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی چیز کا دوسرا نام "اورگون" ہے جسے ماہر نفسیات ولہلم رائخ نے دریافت کیا ہے۔ جو قوت فلسفیوں کے یہاں محض ایک مفروضہ تھی اُسے رائخ نے ایک علمی حقیقت بنا دیا ہے، جس کا مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے، بلکہ جس سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے جیسے بجلی سے۔ یہ قوت پوری کائنات کا جوہر ہے اور ہر نامیاتی جسم میں موجود ہے۔ انسان کا جسم اور دماغ، دونوں اس قوت کے تابع ہیں۔ یوں تو یہ قوت ہر آدمی کے جسم میں کسی نہ کسی مقدار یا شدت کے ساتھ لہریں لیتی رہتی ہے لیکن اس کا احساس اور ادراک ہر آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ رائخ کے خیال میں بیتھوون نے اس قوت کو موسیقی کی شکل میں محسوس کیا اور وان گوگ نے سبز رنگ کی صورت میں۔ اس قوت کے براہ راست اظہار کا ذریعہ الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے باوجود آدمی کے الفاظ ہمیں بے کم و کاست اور نہایت سچائی کے ساتھ بتا دیتے ہیں کہ اس کا جسم اور دماغ اورگون کی قوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ پوری طرح صحت مند جسم اور دماغ وہ ہے جس میں "اورگون" کی لہریں بغیر کسی رکاوٹ کے دوڑتی رہیں۔

رائخ کی تحقیقات کو میرے خیال میں ابھی تک ادب اور فن کے مطالعے کے لیے تو استعمال نہیں کیا گیا، البتہ خود رائخ نے چلتے چلاتے دو چار اشارے ضرور کیے ہیں۔ رائخ کی کتاب پڑھتے ہوئے میں فراق صاحب کے بارے میں قطعاً نہیں سوچ رہا تھا، لیکن رائخ کے نظریات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے اپنے آپ فراق صاحب کے شعر یاد آتے چلے گئے اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اورگون کا جیسا ادراک فراق صاحب کو حاصل ہے، وہ کسی دوسرے اُردو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ حال یہ ہے کہ رائخ کے ہر چھوٹے سے چھوٹے خیال کے مقابل آپ فراق صاحب کے دس پندرہ شعر لکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں صرف دو چار مثالیں پیش کروں گا۔

ایک سیدھی سی بات تو فراق صاحب کے شعروں کی صوتی کیفیت ہی ہے۔ رائخ کے خیال میں ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح صحت مند آدمی وہ ہے جو اپنا سانس پیٹ سے لے کر حلق تک محسوس کر سکے۔ جس آدمی کا سانس بیچ میں رک جاتا ہے، اس کے اندر اورگون کی لہریں بھی آزادی کے ساتھ نہیں چل سکتیں، اور اس کی شخصیت بھی مریضانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ آدمی کی آواز اور بولنے کے طریقے سے اندازہ لگاتے ہیں

کہ اس کا کردار کیا ہوگا۔ اب آپ فراق صاحب کا کلام پڑھ کے دیکھ لیجئے۔ ایسے شعر صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا سانس گہرا ہو۔ اس بات کو محض لطیفہ نہ سمجھئے۔ آج تک کسی اُردو شاعر نے لمبی اور گہری؟ اس تعداد میں اور اس طرح استعمال نہیں کی، جیسے فراق صاحب نے کی ہیں۔ اِن آوازوں کا استعمال ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جسم کے اندر لہریں آگے بڑھ کر کائنات کی لہروں سے ملنا چاہتی ہیں۔

یہاں سے دوسری بات نکلتی ہے۔ رائخ کے خیال میں عام آدمی اپنے آپ کو فضا میں بہنے والی اورگون کی لہروں سے بچاتے رہتے ہیں۔ لیکن صحت مند آدمی وہ ہے جو اپنے اندر کی لہروں کو کائناتی لہروں سے مل جانے دے۔ کمزور جسمانی اور ذہنی نظام کے آدمی کو جب یہ چیز پیش آجاتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے یا اُسے بھوت پریت نظر آنے لگتے ہیں۔ یا وہ اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ سمجھنے لگتا ہے لیکن تندرست آدمی ان لہروں کے ارتباط سے ایک نئی توانائی اور ایک نیا سرور حاصل کرتا ہے۔ فراق صاحب کے اشعار میں عاشق، محبوب اور کائنات کس طرح گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں، یہ تو ایسی بات نہیں جو مَیں آپ کو یاد دلاؤں، بہرحال نمونے کا ایک شعر پھر سے پڑھ لیجئے ۔

تارے بھی ہیں بیدار زمین جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

رائخ کے نزدیک اورگون کی قوت کا ایک اظہار زبردست تاریخی تحریکیں بھی ہیں۔ تندرست آدمی جس طرح کائنات سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اسی طرح بڑی سیاسی تحریکوں سے بھی اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے، جو آدمی سیاست کے متعلق کوئی رائے دینے سے گریز کرے، وہ رائخ کے خیال میں ذہنی اور جسمانی مریض ہے۔ کچھ اسی قسم کی بات دیوانتے بھی ورڈز ورتھ کے بارے میں کہہ چکا ہے۔ دوسرے لوگ تو اُسے شاعر فطرت یا انسانی ذہن کا شاعر ہی بتاتے ہیں، لیکن دیوانتے نے اُسے تاریخ کا شاعر کہا ہے کیونکہ ورڈز ورتھ نے انقلاب فرانس کی تحریک میں خدا کا جلوہ دیکھا۔

فراق صاحب جس قسم کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں، مَیں ذاتی طور سے تو اپنے آپ کو اس سے وابستہ نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر فراق صاحب کسی نہ کسی عالمگیر سیاسی تحریک سے دلچسپی نہ رکھتے تو ان کا عشق ایسا نہ ہوتا نہ وہ ایسی عشقیہ شاعری کر سکتے۔

اس کائناتی قوت کا فراق صاحب کو صرف احساس ہی نہیں بلکہ شعور بھی حاصل ہے۔ "حیاتِ محض" کا فقرہ ان کے شعروں میں بار بار آتا ہے اور وہ اُسے زندگی کی ثانوی شکلوں میں سے بالکل الگ کر کے دیکھتے ہیں مثلاً ؎

دورِ حیاتِ محض تھا اس کے حریم ناز میں
کیف و اثر کا ذکر کیا، زیست کا بھی نشان نہ تھا

یہ "حیاتِ محض" کے ساتھ ساتھ "دور" کا لفظ بھی قابل غور ہے کیونکہ اورگون کی قوت ساکن نہیں رہتی بلکہ لہریں لیتی ہے۔

اورگون کے مشاہدے اور مطالعے کے بعد رائخ نے جو نفسیاتی اصول وضع کیے ہیں، ان کی بھی بہت سی مثالیں فراق صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اصول اپنی شاعرانہ بصیرت کے ذریعے دریافت کیے ہیں۔ مثلاً رائخ کہتا ہے کہ ہر آدمی اورگون کی قوت کو صرف ایک مخصوص مقدار تک برداشت کر سکتا ہے۔ اس کی زیادتی کو سہار لے جانا، ہر آدمی کے بس کا کام نہیں۔ مثال کے طور پر رائخ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک صاحب کی بیوی جنسی طور پر بے حس تھی۔ انہوں نے بیوی کو علاج کے لیے رائخ کے پاس بھیجا۔ جب وہ ٹھیک ہو کے واپس گئی تو تیسرے چوتھے دن وہ پاگل خانے تشریف لے گئے۔ اب اس کے بعد فراق صاحب کا یہ شعر پڑھئے ؎

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

اس شعر کا ایک ایک لفظ شاعرانہ بھی ہے اور سائنٹفک بھی۔ اورگون کی لہریں سرور یا نشاط ہی کی شکل میں محسوس ہوتی ہیں۔ اس قوت کی زیادتی، ٹھیٹ معنوں میں، بعض لوگوں کے لیے بار بن جاتی ہے۔ آپ آلوں سے ناپ کے دیکھ سکتے ہیں کہ کون آدمی کتنی مقدار سہار سکتا ہے۔ "بلائیں" بھی محض استعارہ نہیں ہے۔ جو لوگ اورگون کی شدت کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے، انہیں واقعی بھوت پریت نظر آنے لگتے ہیں اور محبت بھی واقعی اصطلاحی لفظ ہے۔ فراق صاحب عام طور پر محبت کے ساتھ سپردگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی اورگون کی حرکت کا صحیح بیان ہے۔ عام طور سے لوگ اپنے اعصابی اور ذہنی نظام کو "بکتربند" رکھتے ہیں، نہ باہر کی لہروں کو اپنے اندر آنے دیتے ہیں نہ اندر کی لہروں کو باہر نکلنے دیتے ہیں۔ محبت کی صلاحیت اسی آدمی میں ہوتی ہے جو اندر کی

لہروں کو محبوب کے سپرد کر سکے، یا قوت کے ان دو دائروں کو آپس میں گھل مل جانے دے۔ فراق صاحب کے شاعرانہ الفاظ اصطلاحی اس وجہ سے بن گئے ہیں کہ جن لفظوں کو ہم استعارہ سمجھتے ہیں، وہ رائخ کے نزدیک آدمی کے اندر والی قوت کی کیفیت کا بالکل صحیح بیان ہوتے ہیں۔ شاعر کے الفاظ ''عملی'' یوں بن جاتے ہیں کہ اُسے اورگون کا ادراک اوروں کی بہ نسبت زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر اردو شاعروں کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے یہاں بکتربند شخصیتیں کتنی ہیں، اور آزاد شخصیت کس کس کی ہے اور کس حد تک۔

اب ایک آخری مثال اور — فرائڈ کے نزدیک خود اذیتی اس طرح پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کے اندر دو رجحانات ہوتے ہیں، ایک تو جنسیت، دوسرے موت کی خواہش جب یہ دوسری چیز غالب آ جاتی ہے تو آدمی لذت کے بجائے اذیت ڈھونڈنے لگتا ہے۔ رائخ کے نزدیک موت کی خواہش کوئی چیز نہیں، نہ آدمی اذیت کی تلاش کرتا ہے۔ آدمی لذت یا نشاط ڈھونڈتا ہے، لیکن خارجی ماحول کے زیر اثر آدمی اس قابل ہی نہیں رہتا کہ نشاط حاصل کر سکے یا اُس میں نشاط کو سہارنے کی صلاحیت نہیں رہتی، چنانچہ اذیت کی تلاش ہمیشہ لذت پر ختم ہوتی ہے خود کشی کے بھی یہی معنی ہیں۔ آدمی کو اس کے سوا لذت کے حصول کا اور کوئی طریقہ دکھائی نہیں دیتا۔ خود اذیتی کے صرف یہ معنی ہیں کہ آدمی لذت ڈھونڈتا ہے، لیکن لذت کی تاب نہیں رکھتا۔ (یہ نظریہ پیش کرنے پر فرائڈ نے رائخ کو کمیونسٹ کہہ دیا تھا) اس تصریح کے بعد فراق صاحب کا یہ شعر پڑھ لیجئے ۔

تمہیں تو اہلِ ہوس امتحاں سے بھاگ چلے
یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

''اہلِ ہوس'' کو آج تک کسی اردو شاعر نے اس طرح نہیں سمجھا۔ عام طور سے ہماری شاعری میں بوالہوس وہ ہے جو ہمیشہ لذت اور نشاط حاصل کرتا ہے۔ فراق صاحب نے کہا ہے کہ بوالہوس نشاط کی تاب ہی نہیں رکھتا۔ اُسے ہر وقت پیاس لگتی ہے مگر پانی پینے کے بجائے اُسے مرنا قبول ہے۔ یہی کچھ رائخ نے بیان کیا ہے۔ خیر، یہاں تو میں صرف دو چار مثالیں دے سکا ہوں، اگر خدا نے توفیق دی تو میں رائخ کے نظریات کی روشنی میں فراق صاحب کی شاعری کا مطالعہ کسی نہ کسی دن ضرور پیش کروں گا۔ بس مشکل یہ ہے کہ رائخ کے نظریات کا استعمال ابھی مغرب کی ادبی تنقید میں بھی نہیں شروع ہوا۔ بات یہ ہے

کہ رائخ کے یہاں "روحانیت" کی سخت کمی ہے اور یہ چیز یونگ کے یہاں بڑی فراوانی سے موجود ہے۔ اسی لیے "روحانیت زدہ" نقاد ابھی تک یونگ میں اُلجھے پڑے ہیں حالانکہ رائخ کے مقابلہ میں یونگ محض داستان گو معلوم ہوتا ہے۔

(نومبر ۱۹۵۴ء)

اُردو ادب میں ایک نیا رجحان

یوں تو آج کل ہمارے ادب کی ایک ایسی گت بن چکی ہے کہ یہی پتہ نہیں چلتا زندہ ہے یا مردہ بہرحال ایک رجحان ایسا نمودار ہوا ہے جو کم سے کم مجھے تو بہت اُمید افزا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی "سنجیدگی" کی لعنت ہمارے یہاں سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ چیز نہ تو فارسی میں تھی نہ اُردو میں۔ ہمارے بڑے سے بڑے شاعر مناسب موقع پر ہجو گوئی کیا معنی، پھکڑپن سے بھی نہیں چوکتے تھے، اور وہ آدمی ہی کیا جو محبت کے ساتھ ساتھ نفرت نہ کر سکے یا جسے کبھی غصہ ہی نہ آئے۔ یہ خامی سب سے پہلے غالب کے دیوان میں نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت بیچ ہوا میں معلق رہتے ہیں، زمین پر اُتر کر عام انسانوں جیسی کوئی بات ہی نہیں کرتے، لیکن خیر، اس کا بدلہ انہوں نے اپنی نثر میں چکا دیا۔ جہاں کہیں ضرورت پیش آئی، وہ گالی دینے سے بھی نہیں کترائے۔ "متانت" کو ہمارے ادب میں سب سے پہلے حالی نے معیار بنایا۔ یہ وبا اصل میں انگلستان سے آئی تھی۔ حالی کی شخصیت ویسے ہی اعصاب زدہ تھی، یہ اثر سب سے پہلے انہی نے قبول کیا۔ اپنے اوپر ریاکاری کا شبہ تو اُنہیں ہر وقت ہی ہوتا رہتا تھا، جن اندرونی رجحانات سے وہ ڈرتے تھے، انہیں دبانے کے لیے یہ "متانت" کا لحاف اُنہوں نے انگلستان سے لے کے اوڑھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے میں یہ جذباتی طاعون حالی وغیرہ تک ہی محدود رہا ورنہ سرشار ہوتے نہ سجاد حسین نہ نذیر احمد نہ اکبر۔ سارا اُردو ادب گلے میں مفلر لپیٹ لیتا۔

۳۶ء کے بعد حالانکہ ہجو گوئی کا رُخ سماج کی طرف رہا، لیکن پھر بھی منٹو نے دیوندر ستیارتھی پر افسانہ لکھا اور دیوندر ستیارتھی نے منٹو پر، اور ٹھیک اُس زمانے میں جب نئے ادب کو ابھی بہت سی لڑائیاں لڑنی تھیں۔ جن دنوں ہمارے نئے ادیبوں میں جان تھی وہ لڑنے میں بھی تیز تھے۔ حال تو اس وقت سے پتلا ہوا جب ترقی پسندوں نے "شرافت"

اختیار کی اور "فحش نگاری" کے خلاف پولیس والوں کا رویہ اپنایا۔ اوپر سے اُردو کے پروفیسروں کا دَور دَورہ ہوا، انہوں نے غل مچایا کہ صاحب ایسا ادب لکھئے جسے ہم بھی سمجھ سکیں۔ اس میں آسانی تھی، لہٰذا ادیبوں نے بھی ان کی بات مانی۔ اب اگر کسی نے بیچ میں اعتراض کیا کہ حماقت کو ادب کیسے کہیں تو اردو کے ایم۔ اے نقادوں نے فوراً ڈانٹ پلائی کہ مولانا حالی فرما گئے ہیں۔ یہ باتیں ثقاہت اور متانت کے خلاف ہیں۔ اب اصول یہ قائم ہوا کہ بحث نظریاتی ہونی چاہیے، شخصی اور ذاتی نہیں۔ مگر قصہ تو یہی ہے کہ ادبی تنقید تو ادیبوں کے بارے میں ہی ہوتی ہے، یہ کوئی فلسفہ تو ہے نہیں کہ نظریات سے سر پھوڑا کریں۔ یہاں تو صاف صاف نام لے کے یہ بتانا پڑتا ہے کہ فلاں آدمی اچھا لکھتا ہے، فلاں آدمی جھک مارتا ہے۔ مولانا حالی چاہے جو کہتے ہوں، ادبی تنقید تو اسی کا نام ہے۔ اگر ثقاہت کا اتنا ہی خیال ہے تو آدمی پٹواری بنے، تنقید لکھنا ہی کیا لازم ہے، بہرحال، ہمارے ادب میں اُردو کے پروفیسروں کا اصول چل گیا، کیونکہ متانت اور علمیت کے ذریعے نقادوں اور ادیبوں، دونوں کی عزت کا بیمہ ہو گیا۔

لیکن اب نقادوں کی بدولت ادب کا ایسا برا حشر ہوا کہ پڑھنے والے نقادوں سے تو کیا لکھنے والوں سے بھی بیزار ہو گئے اور اُنہوں نے نام پوچھنے شروع کر دیے۔ چنانچہ اس ادبی قحط سالی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ متانت فراموش کرتے جا رہے ہیں، اور حماقت کو حماقت کہنا اتنا بڑا جرم نہیں رہا جتنا اُردو کے پروفیسروں نے بنا دیا تھا۔ آخر یہ گناہ میر اور سودا سے بھی تو سرزد ہوا ہے، ان کی عظمت میں کیا فرق آ گیا۔ اس زمانے میں بس ایک مرزا یگانہ ایسے تھے جو کھل کے بات کرتے تھے۔ لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ فراق صاحب اور جوش صاحب جیسے شاعر بھی بول پڑے۔ جوش کی مینڈکوں کے جلوس والی نظم تو ان کی اچھی نظموں میں سے ہے، بلکہ مجھے تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ جوش صاحب قافیے بھی استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اسی طرح فراق صاحب اور اثر صاحب کی بحث چل پڑی۔ نثر میں تو شاید فراق صاحب نے کچھ نہیں لکھا، لیکن کئی غزلوں کے مقطعوں میں اثر صاحب کا جواب دیا ہے۔ اس میں غضب کی بات یہ ہے کہ غزل کے باقی شعر تو فراق صاحب کے ٹھیٹ انداز میں ہیں، البتہ مقطع میں سخن گسترانہ بات آ جاتی ہے۔ یوں تو اثر صاحب بھی میرے بزرگ ہیں، لیکن میر اور سودا تو ان سے بھی زیادہ بزرگ ہیں۔ جب میں اُن دونوں کی نوک جھونک کا مزا لے سکتا ہوں، تو پھر فراق صاحب کی صاف گوئی کو کیوں نہ سراہوں؟

خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ اثر صاحب نے جن اصولوں کے مطابق فراق صاحب پر نکتہ چینی کی ہے، اگر انہی کو معیار مان لیا جائے تو دنیا کے بڑے ادب کا کم سے کم پچھتر فیصد حصہ جلا دینا پڑے گا۔ خیر اس بات پر تو میں پھر کبھی لکھوں گا کہ جو آدمی جسم کو نہیں دیکھ سکتا وہ ستاروں کو بھی نہیں دیکھ سکتا (اور ایک ہجو فراق صاحب کی بھی لکھوں گا، وہ اس بات پر کہ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں مجھے پروفیسر کیسے کہہ دیا — میں تو سیدھا سادا ان کا شاگرد ہوں) فی الحال صرف اتنا کہوں گا کہ فراق صاحب کے خلاف اثر صاحب کا مضمون دیکھ کر میں تو لرز اٹھا۔ جس ادب کو اثر صاحب بھی قبول کر سکیں، وہ تو میں نے پڑھا نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حضرت آدم کے وقت سے لے کر آج تک دنیا میں جتنی ثقاہت پیدا ہوئی ہے، وہ ایک طرف اور ییٹس کی یہ چار سطریں ایک طرف:

But love has pitched his mansion in
the place of excrement,
for nothing can be sole or whole
that has not been rent

یہ متانت پرستی تو ہمارے ادب کو لے ڈوبی، بلکہ دوسروں کے ادب کو بھی نہیں سمجھنے دیتی۔ خیر، ہمارے دو مشہور شاعروں میں اتنی ہمت تو پیدا ہوئی کہ جاندار ادب کی روایت زندہ کریں — یعنی جو میر اور سودا کی روایت ہے۔ خصوصاً فراق صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غنائیت اور طنز دونوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے جس سے اردو کے پروفیسروں کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ ہجو نگاری سے جذبات یا خیالات کی گہرائی میں کوئی فرق آ جاتا ہے۔

(دسمبر ۱۹۵۳ء)

مولانا محمد حسین آزاد کا طرز نگارش

جب کوئی زبان شروع ہوتی ہے تو اس زمانے میں ادب اور غیر ادب کے درمیان کوئی واضح حد بندی نہیں ہوتی۔ خالص تخلیق اور افادیت آپس میں اس بری طرح گڈمڈ ہوتی ہیں کہ ان دونوں کو الگ کرنا مشکل کیا جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ شعر میں مذہبی احکام تو الگ رہے، دواؤں کے نسخے تک لکھے جاتے ہیں۔ زبان کے ادبی اور غیر ادبی یا تخلیقی اور افادی استعمال میں امتیاز آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں اُردو کی شاعری اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ ہم ان چیزوں کو ادب میں شامل نہیں کرتے جو کسی غیر ادبی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ایک لمبی چوڑی رزمیہ مثنوی "فتوح الشام" اب سے پچیس تیس سال پہلے تک ہر گھر میں پڑھی جاتی تھی، لیکن کسی ادب کی تاریخ میں اس کا نام تک نہیں آتا۔ لیکن اُردو نثر کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اُردو نثر میں پہلی کتاب چاہے جب لکھی گئی ہو، لیکن باقاعدہ طور سے اُردو نثر کی ابتدا انیسویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ ادبی نثر اور غیر ادبی نثر کا فرق تو ابھی پندرہ بیس سال سے ہونے لگا ہے ورنہ جو شخص بھی کوئی کتاب لکھ دے، اُسے ادیب یا نثر نگار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے یہاں بہت سی کتابیں نثر کی ایسی ہیں جن کا شمار بے تکلف تخلیقی نثر میں ہوتا ہے اور انہیں ادب ہی کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً شبلی کی "شعر العجم" یا حالی کا مقدمہ "شعر و شاعری" اردو نثر میں مختلف قسم کے مطالب ادا کرنے کی صلاحیت لانے میں واقعی ان کتابوں کا بھی حصہ ہے۔ لیکن انہیں ادب اس وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ادبی کتابیں اتنی کم تھیں کہ ہم اپنی فہرست بڑھانے کے لیے انہیں بھی ادب میں شامل کر لیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ادب کی تعریف صرف چند موضوعات تک محدود رہنی چاہیے۔ اگر یہی بات ہوتی تو ہم محمد حسین آزاد کو بھی ادیبوں میں شامل نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن سوال

موضوع کا نہیں، ورنہ گبن جیسے مورخ کا ذکر ادب کی تاریخ یا نثر نگاروں کی فہرست میں نہ آتا۔ تخلیقی نثر کا تعین کرنے کے لیے دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ موضوع چاہے کچھ بھی ہو، لیکن اپنے موضوع کی طرف لکھنے والے کا رویہ کیا ہے۔ وہ صرف خیالات پیش کر رہا ہے۔ یا الفاظ کی مدد سے ایک چیز یا ایک ذہنی کیفیت تخلیق کر رہا ہے۔ ایک لکھنے والا تو وہ ہوتا ہے جو نثر کو صرف ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے خیالات پڑھنے والوں تک پہنچا دے۔ دوسرا لکھنے والا وہ ہوتا ہے جس کے لیے ذریعہ اور مقصد میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پہلی قسم کے لکھنے والے کی مثال شبلی اور حالی ہیں۔ دوسری قسم کے لکھنے والے کی مثال محمد حسین آزاد ہیں۔

یوں لکھنے کو تو آزاد نے ایک تخیلی کتاب "نیرنگ خیال" بھی لکھی ہے، لیکن اردو ادب میں ان کی جو کچھ اہمیت ہے، اس کا انحصار اس کتاب پر نہیں۔ اس کا خیال انھوں نے مغربی ادب سے مستعار لیا تھا اور وہ اسے ٹھیک طرح سے نہیں چلا سکے۔ پر تکلف نثر بھی اچھی نثر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ لکھنے والے کا اندرونی تجربہ اس کا متقاضی ہو۔ اس کتاب میں تو آزاد نے کھینچ کھانچ اور دھکیل دھکال کے قصے کو آگے بڑھایا ہے۔ اس رنگ میں تو وہ ٹکڑے کہیں بہتر ہیں جو آزاد نے "آبِ حیات" میں اُردو شاعری کے ہر دور کے بیان سے پہلے تعارف کے طور پر لکھے ہیں۔ جس قسم کا احترام ان کے دل میں اُردو شاعروں کے لیے تھا اور اُردو شاعری کی تاریخ میں انہیں جس قسم کا ڈرامہ نظر آتا تھا، وہ ان تعارفی ٹکڑوں میں بخوبی آگیا ہے۔ یہ حرکت، یہ جذباتی تعلق وہ اپنی تمثیلی کتاب "نیرنگ خیال" میں پیدا نہیں کر سکے۔ بعض اوقات عام لوگوں کی پسند اور ناپسند ادب میں بڑی ٹھیک رہنمائی کرتی ہے۔ "نیرنگ خیال" کے بعض حصوں کو لوگ اسکول کے زمانے میں سبق کے طور پر پڑھ تو لیتے ہیں، اس کے بعد کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا اور آزاد کی تحریروں میں اس کتاب کا واقعی یہی صحیح درجہ ہے۔

اگر میں نے آزاد کو تخلیقی نثر نگار کہا ہے تو اس کتاب کی بنا پر نہیں۔ اگر وہ شبلی اور حالی دونوں سے اچھے نثر نگار اور ادیب ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ شبلی اور حالی نے کوئی تخیلی اور تمثیلی حکایت نہیں لکھی اور آزاد نے لکھی ہے۔ آزاد کی برتری تو اس بات سے نکلتی ہے کہ باقی کتابوں میں ان کا موضوع بھی وہی تھا جو شبلی اور حالی کا۔ یعنی تاریخ، سوانح عمری، ادبی تنقید۔ مورخ، نقاد یا عالم کی حیثیت سے شبلی اور حالی چاہے ان سے بڑے

ہوں، لیکن نثر نگار کی حیثیت سے وہ آزاد کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ یہ محض مبالغہ یا زورِ بیان نہیں ہے۔ شبلی اور حالی کے دماغ کی ساخت اور قسم کی تھی، آزاد کے دماغ کی ساخت اور قسم کی۔ شبلی اور حالی نے اپنے اشعار میں جس قسم کی شخصیت کا اظہار کیا ہے، وہ شاید آزاد کی شخصیت کے قریب آجائے، لیکن ان دونوں کی جو شخصیت ان کی نثر میں دکھائی دیتی ہے، وہ آزاد کی شخصیت سے بالکل مختلف ہے، یا یوں کہیے کہ آزاد نے اپنی شخصیت کا اظہار اپنی نثر میں کر دیا ہے۔ شبلی اور حالی نے اپنی شخصیت کا ایک حصہ اپنی نثر میں استعمال کیا ہے اور دوسرا حصہ اپنے اشعار میں۔ اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی اور شبلی دونوں کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی تھی اور یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اس طرح آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ شبلی اور حالی کی شخصیت آزاد کی شخصیت سے زیادہ متنوع اور پہلو دار تھی اور ان کے مقابلے میں آزاد کی شخصیت محدود اور تنگ تھی۔ بہرحال شبلی اور حالی اپنی شخصیت کے دو متضاد حصوں کو آپس میں حل کر کے ایک نہیں بنا سکے، بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ تناقص بڑھتا ہی گیا۔ اس کے برخلاف آزاد کی شخصیت میں ایک وحدت ہے، ایک تکمیل ہے جس سے وہ دونوں خالی ہیں۔ تھے تو یہ تینوں کے تینوں ہمعصر؛ لیکن زمانے کے انقلاب سے جس طرح شبلی اور حالی متاثر ہوئے، اس طرح آزاد نہیں ہوئے۔ یوں ہونے کو تو انھوں نے بھی حالی کی طرح فطری شاعری کا پرچار کیا، خود بھی دوچار نظمیں فطرت کے مظاہر پر لکھیں۔ ظاہر میں تو وہ بھی زمانے کے ساتھ بدلنے کو تیار تھے، لیکن اندرونی طور پر انہیں یہ تبدیلیاں گوارا نہ تھیں۔ شبلی اور حالی تو "زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز" کی فکر میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سامنے زندگی کے دو نظام تھے، اور وہ کھینچ تان کے کسی نہ کسی طرح ان دونوں میں سمجھوتہ کرانا چاہتے تھے۔ یہ خلش حالی کو شبلی سے بھی زیادہ تھی، اسی لیے انہیں نقصان بھی زیادہ پہنچا۔ بعض دفعہ تو مقدمہ "شعر و شاعری" پڑھ کر یہ تعجب ہوتا ہے کہ جس شخص نے ایسا شعر کہا ہے ؎

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بے داد فن کہاں

وہ شعر کی ماہیت سمجھنے بیٹھا تو ایسی ایسی غلطیاں کیں۔ حالی میں یہ کمزوری اس لیے پیدا ہوئی کہ وہ جس معاشرے میں پلے بڑھے تھے، اس کی اقدار سے بے انتہا غیر مطمئن

ہوگئے اور اسے ایک ایسے معاشرے کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں لگ گئے جس سے وہ پوری طرح واقف بھی نہ تھے۔ آزاد بظاہر چاہے اصلاح پسند بن گئے ہوں، لیکن دراصل انہیں صرف اپنے معاشرے سے وابستگی تھی۔ کسی اور معاشرے کو وہ بالکل سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ اس لیے ایک طرف تو ان کی شخصیت میں وحدت برقرار رہی بلکہ اپنے نظامِ حیات کی شکست کے بعد تو اس سے ان کی محبت میں ایک کسک اور آگئی، دوسری طرف ماضی ان کے لیے حال کا قائم مقام بن گیا۔ شبلی اور حالی جب ماضی کے بارے میں لکھتے ہیں تو اپنے سارے احترام کے باوجود انہیں یہ احساس رہتا ہے کہ ہم ماضی کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ بلکہ حالی تو ماضی کا تذکرہ معذرت کے انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے بیان میں یہ احساس شامل رہتا ہے کہ اس ماضی میں بہت سی خرابیاں تھیں، لیکن تھا تو اپنا ہی ماضی، اس لیے اس کا احترام کرلینا چاہیے۔ آزاد کے لیے ماضی ایک زندہ حقیقت تھا۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں دیکھنے کا انہیں خیال ہی نہ آتا تھا۔ ماضی کو انہوں نے اس طرح قبول کیا تھا اور اس سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کرلیا تھا کہ ان کے لیے حقیقت ہی صرف یہ تھی۔ شبلی اور حالی کی تاریخ نگاری اور آزاد کی تاریخ نگاری میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ خود آزاد کی شخصیت میں وحدت ہے، اور وہ اپنے موضوع میں بھی ایک مکمل وحدت پاتے ہیں۔ چاہے وہ اردو شاعروں کے بارے میں لکھ رہے ہوں یا مغل بادشاہوں کے بارے میں انہیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کسی اور معاشرے کے معیاروں سے بھی جانچا جا سکتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے جن معیاروں سے اکبر اور شاہجہاں یا میر اور سودا اپنے آپ کو جانچتے، انہی معیاروں سے آزاد جانچتے ہیں بلکہ اصل میں جانچنے کا سوال ہی نہیں آتا۔ جانچنے کی کوشش تو اس چیز کی کی جاتی ہے جس سے ہم غیر مطمئن ہوں۔ آزاد کے لیے تو یہ زندگی اس درجہ قابلِ قبول ہے کہ اس کی تصویر پیش کردینا کافی ہے، اس کی اچھائیاں اور برائیاں ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اخلاقی الجھنوں میں پڑے بغیر اپنے موضوع کو قبول کرنے کی صلاحیت ایسی چیز ہے جو اس دور میں آزاد کے سوا اردو کے کسی اور نثر نگار میں نظر نہیں آتی۔

ان کی دوسری زبردست خوبی اس پہلی خوبی ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انہیں خیالات سے دلچسپی نہیں بلکہ انسانوں سے ہے۔ شبلی اور حالی کسی شخص کے حالات لکھتے ہوئے اس کی وہ باتیں یا کام نقل کرتے ہیں جن سے چند خیالات اخذ کیے

جاسکیں یا جو چند خیالات مثال کے طور پر پیش کیے جاسکیں، اور یہ خیالات عموماً وہ ہوتے ہیں جن سے مصنف کے نزدیک قومیں بنتی یا بگڑتی ہیں۔ ان دونوں کو براہ راست انسانی افعال اور انسانی جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برخلاف آزاد اگر کوئی بات دیکھتے ہیں تو انسانی زندگی کے مظاہر۔ پھر انہیں یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان مظاہر سے اخلاقی سبق کیا نکلتا ہے۔ ان کے لیے تو انسانی زندگی بذات خود اور برائے خود دلچسپی کی مستحق ہے۔ ادبی تخلیق کی بنیاد یہی احساس ہے۔ آزاد کا تخیل اصل میں مورخ یا نقاد کا تخیل نہیں، بلکہ افسانہ نگار کا تخیل تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی تاریخ نگاری محض طوطا کہانی ہے۔ ممکن ہے تاریخی واقعات کے بیان میں انہوں نے احتیاط سے کام نہ لیا ہو یا سنی سنائی باتیں نقل کر دی ہوں لیکن ایسے واقعات محض تاریخ سے بھی بڑی چیز کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی وہ ایک پورے معاشرے کی اندرونی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کی "دربار اکبری" یا "قصص ہند" یا "آب حیات" پڑھ کر ممکن ہے ہم اصل تاریخی واقعات بھول جاتے ہوں یا تاریخ سے ہماری واقفیت ناقص رہ جاتی ہو، لیکن جس معاشرے نے یہ تاریخ بنی ہے، وہ ہمارے دل و دماغ میں بس جاتا ہے۔ وہ محض واقعات کی فہرست نہیں بتاتے بلکہ ان واقعات کے پیچھے جو اجتماعی روح کام کر رہی تھی، اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔ وہ ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ ہمیں ایک نیا تجربہ دیتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ اس معاشرے میں رہنے والے اپنی زندگی کو کس طرح محسوس کرتے تھے۔ اسی کو تخلیق کہتے ہیں، چنانچہ آزاد کے اسلوب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ کسی بات پر بحث نہیں کرتے۔ کسی چیز کی تشریح نہیں کرتے، اپنی رائے نہیں دیتے۔ ان سب کے بجائے کسی قصے کی شکل میں ایک ٹھوس انسانی تجربہ ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس قصے کا مطلب کیا نکل سکتا ہے، اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں کیونکہ ادیب کے لیے انسانی تجربہ اس کے مطلب سے زیادہ وقیع چیز ہے، چنانچہ ان کی نثر ہمیں بچوں کی طرح انگلی پکڑ کے نہیں چلاتی بلکہ ہماری تخلیقی صلاحیت پر اعتماد کر کے ہمارے ذہن کو آزاد چھوڑتی ہے۔ شبلی اور حالی کی کتابیں پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن یا تو مصنف کے سپرد ہو کر رہ جاتا ہے یا اس سے بالکل الگ رہتا ہے۔ آزاد کی نثر خود پڑھنے والے کے تخلیقی ذہن کے ذریعہ عمل کرتی ہے۔

آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت تو ان کا تصویری تخیل ہے۔ یہ تو میں پہلے بھی

کہہ چکا ہوں کہ وہ خیالات کے بجائے انسانی تجربے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن انسانی تجربے کو پڑھنے والے تک منتقل کرنے کے لیے وہ ٹھوس تصویروں سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نثر کی ساری کوشش اسی بات پر صرف ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں کوئی تصویر پیدا ہو جائے۔ ان کی نثر میں آہنگ کا دخل بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ خصوصیت آبِ حیات سے کہیں زیادہ "دربارِ اکبری" میں موجود ہے جس طرح ان کی تخلیق کردہ ذہنی تصویریں چاہے آپ کو آزاد کے الفاظ یاد نہ رہیں، لیکن ان کا آہنگ ایک نغمہ کی طرح ہمارے ذہن میں گونجتا رہتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جو اردو نثر کی دو چار کتابوں ہی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ آزاد تو ہمارے ان نثر نگاروں میں ہیں جن کی کتابیں ہمارے ادیبوں کو سبق کی طرح پڑھنی چاہئیں کیونکہ ان کی نثر اظہار محض خیالات کا اظہار نہیں بلکہ تخلیق ہے۔ (ریڈیو پاکستان، کراچی)

(فروری ۱۹۵۴ء)

اَدب اور قارئینِ اَدب

اردو ادب کی موجودہ حالت کے لیے نام تو کئی تجویز کیے گئے، لیکن اس مسئلے کی تفتیش ابھی تک نہیں ہوئی، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب اپنے اندر کسی تبدیلی کے خیال سے ہی پریشان ہو جاتے ہیں، اوپر سے اُردو تنقید انہیں لوریاں دیتی رہتی ہے۔ یوں معجزے تو ہر وقت ہی ممکن ہیں، لیکن فی الحال خود ادیبوں کے اندر سے کسی معنی خیز تبدیلی پیدا ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ادب میں تو ایک دو نہیں، بیسیوں عناصر ہوتے ہیں۔ سماجی، نفسیاتی، فنی وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ادیب اول تو اپنے کام کے بارے میں سوچتے ہی نہیں، جیسا بن پڑتا ہے لکھے جاتے ہیں، لیکن اگر کبھی تھوڑا بہت سوچا بھی تو بس ایک بات لے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کی دُھن سوار ہوگئی تو سارا ادب اسی کو سمجھ لیا۔ فن کے پیچھے پڑے تو یہ بھی نہ دیکھا کہ فن پیدا کیوں ہوتا ہے۔ غرض ہر ادیب کوئی چھوٹا موٹا کام بڑی احتیاط سے سنبھال کے بیٹھ گیا ہے۔ اس لیے ہمارے ادب میں ایک ذہنی بے ربطی کا عالم ہے۔ ہر خیال اپنی جگہ پڑا اس طرح سسکتا رہتا ہے جیسے چھپکلی کی دم کٹ کے رہ گئی ہو۔ ان کٹے پھٹے خیالوں میں کوئی ربط پیدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ آج کل کے ادبی ماحول میں اس سوال کا جواب مجھے تو سوجھتا نہیں، کیونکہ ادیبوں نے تو بالکل ہمت ہار دی ہے۔ کوئی سیاست سے ڈر گیا ہے، کوئی فن سے، کوئی گروہ بندی سے، اور ادب سے سب ڈرے ہوئے ہیں۔ غرض اب تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ ادب کا مستقبل ادیبوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

چنانچہ ادیبوں کے بارے میں تو کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ بس ایک طبقہ پڑھنے والوں کا رہ گیا ہے جو اس ادبی انحطاط کو روک سکتا ہے۔ اردو ادب کو زندہ رکھنے کا فرض اگر کوئی انجام دے سکتا ہے تو یہ لوگ۔ پڑھنے والوں میں بھی تین گروہ ایسے ہیں جو اگر

واقعی پڑھنا سیکھ لیں تو ادیبوں تک کو جگا سکتے ہیں۔ یوں تو پچھلے بیس پچیس سال سے اُردو ادب کلرکوں اور طالب علموں ہی کے سہارے جی رہا ہے لیکن اب تو ان دو قسم کے لوگوں کے سوا کسی اور کو ادب سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ ایک تیسرا گروہ لڑکیوں کا سمجھئے۔ لڑکیاں ادب تو نہیں پڑھتیں، البتہ دلچسپ کتابیں ضرور پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ کتابیں زیادہ تر لڑکیاں ہی خریدتی ہیں۔ چنانچہ ادب کے مستقبل کا سارا دارومدار ان تین گروہوں پر ہے۔ ادیبوں پر نہیں، کیونکہ آج کل ادیب وہ نہیں لکھتے جو ان کا تجربہ کہتا ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں جو پڑھنے والے چاہتے ہیں۔ اس لیے اگر ادبی فضا کو بدلنا ہے تو تنقید کا رُخ ادیبوں کی طرف نہیں بلکہ پڑھنے والوں کی طرف ہونا چاہیے۔ اگر انہوں نے کہیں پڑھنا سیکھ لیا تو ادب کی ترقی کو اردو نقاد تک نہیں روک سکیں گے۔

اور پڑھنے والوں کی طرف سے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصے میں جب کبھی ادیبوں نے نئے ادبی مسائل کی طرف توجہ کی، پڑھنے والوں نے ہمیشہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ادیب صرف ادیبوں کے لیے لکھنے لگے اور پڑھنے والوں کو بھول ہی گئے۔ ہمارے پچھلے پندرہ سال کے ادب میں سب سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ تنقید شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ہاتھ سے نکل کر خالی خولی نقادوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ یہ بات نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ فیض اور راشد نے اپنی اپنی کتاب کا دیباچہ خود لکھا تھا، یعنی ان دنوں شاعر اور افسانہ نگار کسی نقاد کی مداخلت کے بغیر براہ راست اپنے پڑھنے والوں سے خطاب کرتے تھے، چنانچہ انہیں اپنی تخلیقی کام میں بھی یہ بات یاد رہتی تھی کہ ہمیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے جانا ہے۔ لیکن جب سے نقادوں کا گروہ وجود میں آیا ہے، لکھنے والے اپنے پڑھنے والوں کو بھول ہی گئے۔ چنانچہ پڑھنے والوں نے بھی اپنے ذہن کو چھٹی دے دی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ادیب آج کل لکھ تو وہی رہے ہیں جو پڑھنے والے چاہتے ہیں، لیکن انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والوں کے پاس دماغ نہیں ہوتا، صرف جذبات ہوتے ہیں، اور پڑھنے والوں نے بھی اپنے بارے میں ادیبوں کی یہ رائے قبول کر لی۔ اب سے پندرہ سال پہلے ادیبوں کے دل میں پڑھنے والوں کے دماغ کا احترام تھا۔ اسی کو میں لکھنے والے اور پڑھنے والے کا براہ راست تعلق کہتا ہوں۔ یہ تعلق آج باقی نہیں رہا۔ دونوں نے اپنا ذہن نقادوں کے حوالے کر دیا ہے۔

ادیبوں کی سہل انگاری تو اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ ان کے ذہن کو حرکت میں لانے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں تو نہیں آتا، البتہ پڑھنے والوں کی طرف سے میں ایسا بدگمان نہیں ہوں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنی کلاسوں میں جن پندرہ بیس طالب علموں سے واسطہ پڑتا ہے، ان میں سات آٹھ تو ضرور ایسے ہیں جو ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ملک میں دو چار ہزار طالب علم اور کلرک بھی ایسے نکل آئیں تو کیا ادب کی حالت نہیں بدل سکتی؟ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو تنقید نے جو راز اب تک چھپائے رکھا ہے، اُسے فاش کر دیا جائے۔ وہ یہ کہ پڑھنے والوں کے پاس بھی دماغ ہوتا ہے۔ اگر پڑھنے والوں کو اس کا پتہ چل گیا تو لکھنے والوں کی تو ضرور کم بختی آ جائے گی، لیکن اُردو ادب کی وہ حالت نہ رہے گی جو آج ہے۔ میں تو بس یہی آس لگائے بیٹھا ہوں کہ پڑھنے والے بھی اپنے آپ کو پہچانیں کیونکہ ادب کے خالق تو اصل میں وہی ہیں۔

(مارچ ۱۹۵۴ء)

قارئینِ ادب

یوں تو وقتاً فوقتاً طرح طرح کی سازشیں میرے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور میں ان سے انکار بھی کیسے کر سکتا ہوں، کیونکہ نہ الزام لگانے والوں کے پاس کوئی ثبوت ہے، نہ میرے پاس، لیکن اب تو ایک ایسی لغزش کرنے کو جی چاہتا ہے جس کے سلسلے میں کسی کو الزام لگانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے، میں خود ہی اقراری مجرم بن جاؤں۔ یہ کھلی ہوئی سازش میں نے کچھ دن ہوئے شروع بھی کر دی ہے۔ یعنی میں اُردو پڑھنے والوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اُن کا دماغ کام کرتا ہے اور فی الجملہ ادب کی تخلیق کرنے والے وہی ہیں۔ پچھلے پچیس تیس سال سے ہمارے یہاں خرابی یہ پیش آئی ہے کہ ادب کے متعلق سوچنا صرف ان لوگوں تک محدود ہو کے رہ گیا ہے جو ادیب ہیں یا نیم ادیب ہیں یا کچھ لکھے بغیر ادیب بنے ہوئے ہیں، یا ادیب بننا چاہتے ہیں، جو لوگ محض وقت گزارنے کے لیے کتابیں پڑھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں جو یہ جان کر ادب پڑھتے ہیں کہ ہمیں خود ادیب نہیں بننا، لیکن اس کے بغیر بھی ہماری زندگی میں ادب کے لیے جگہ ہے اور اسی لیے ادب ہماری سنجیدہ سوچ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ یہ صورتِ حال اب سے پچاس سال پہلے موجود تھی، لیکن جب لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے دونوں ادیب بن جائیں یا اپنے آپ کو ادیب سمجھنے لگیں تو ان کا ذہن پوری آزادی سے کام نہیں کر سکتا۔ ان کے سوچنے میں بھی ایک پیشہ وارانہ رنگ آ جاتا ہے۔ ایسی کیفیت کبھی کبھی ادب کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے، لیکن ہمارے یہاں تو کمال یہ ہوا ہے کہ لکھنے والے پڑھنے والوں کو دشمن سمجھنے لگے ہیں، جن کے خلاف حفاظتی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً اردو ادب کے متعلق کوئی نئی بات سوچنے اور کہنے کی کوشش کیجیے تو بہت سے اردو ادیبوں کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ٹھیک بھی ہے تو بھی کہنی نہیں

چاہیے- کیونکہ پڑھنے والے اُردو کی طرف سے بدظن ہو جائیں گے- اس بدظنی میں ڈرنے کی کیا بات ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا- ممکن ہے کوئی آدمی اپنے کھانے پینے کی طرف سے بدظن ہو جائے، لیکن اس کی وجہ سے وہ کھانا پینا چھوڑ تو نہیں دے گا- یہی حال زبان کا ہے- ہم کوئی زبان اس لیے تھوڑی بولتے ہیں کہ ہمیں اس کی طرف سے بڑی خوش فہمیاں ہیں- ایک عام آدمی کے لیے تو زبان کا معاملہ وہی ہے جو ہوا کا- جیسی ہوا میسر آگئی اسی میں سانس لینا پڑتا ہے- چاہے ہم اس سے بدظن ہو گئے ہوں، لیکن ہمارے یہاں تو زبان کو محض ادیبوں کی چیز سمجھا جاتا ہے- اگر دوسرے لوگ بھی یہی زبان استعمال کرتے ہیں تو گویا وہ احمق ہیں، اور ادیبوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ احمق بنے رہیں، پھر انجمن ترقی اُردو نے ہماری زبان کے متعلق یہ نظریہ پھیلایا ہے کہ بچاری اُردو تیس دانتوں میں زبان کی طرح رہتی ہے اور اتنی نحیف و نزار ہے کہ اگر چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت نہ کی گئی تو دشمن اسے ختم کر کے رکھ دیں گے- یہ خیال بہت سے لوگوں کے دل میں اس بُری طرح بیٹھ گیا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اگر اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان نہ سمجھا گیا تو اُردو زندہ نہیں رہے گی، چنانچہ اگر آپ دبی زبان سے بھی یہ کہہ دیں کہ غالب اور میر کا شمار دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں نہیں ہو سکتا تو فوراً اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ایسی بات سُن کے پڑھنے والے اُردو سے بدظن ہو جائیں گے- گویا پڑھنے والے اُردو سے محبت کرتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ وہ ایک فریب میں مبتلا ہیں- اور ادیبوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ یہ طلسم ٹوٹنے نہ پائے، لہٰذا اُردو نقادوں نے ادب کے متعلق سوچنے سمجھنے پر پابندی لگا رکھی ہے، یعنی ان کے نزدیک اُردو کا سب سے بڑا دشمن ہے دماغ، اور اس کے بعد دشمنی میں نمبر آتا ہے پڑھنے والوں کا-

جب ادیبوں کا اپنے پڑھنے والوں کی طرف یہ رویہ ہو تو ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں کس قسم کا ادب پیدا ہو گا- اب تو اردو ادب کی زندگی اسی طرح ممکن ہے کہ پڑھنے والے اپنی اہمیت سے واقف ہوں اور ادیبوں کو تسلی دیں کہ ہمارے گمراہ یا بدظن ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہمیں بھی اُردو سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو- ہمیں بھی غلط اور صحیح کی تھوڑی بہت تمیز ہے، آپ بے کھٹکے اپنے دماغ سے کام لیں، لیکن یہ کہنے کی ہمت پیدا ہونے سے پہلے پڑھنے والوں کو بھی تھوڑی سی قربانی کرنی پڑے گی- ہمارے یہاں تو پڑھنے والے بھی اپنے آپ کو ادیب سمجھتے ہیں، جیسے پڑھنے والے کی تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں،

حالانکہ ادیب تو ہر لڑکا بن سکتا ہے، پڑھنے والا بننے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ادیب تو ہمارے یہاں کھانچیوں بھرے پڑے ہیں، فی الحال تو ہمیں صحیح قسم کے پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اگر اس قسم کے پڑھنے والے صرف سازش کے ذریعے پیدا ہو سکتے ہیں تو میں ایسے لوگوں کی ایک خفیہ جماعت بنانے کو تیار ہوں جو اُردو زبان یا اُردو ادیبوں کے نفع نقصان کی پروا کیے بغیر اپنے ادب کے متعلق سوچنا چاہتے ہوں۔

(اپریل ۱۹۵۴ء)

مقدمہ شعروشاعری

اُردو تنقید کی مختصر سی تاریخ میں نہ تو کسی کتاب پر اتنی گالیاں پڑی ہوں گی نہ کسی کتاب کی اتنی تعریف ہوئی ہوگی جتنی مولانا حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ کہتے ہیں جب سے لے کر اب تک اس کتاب کے ساٹھ ستر ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پھر اس مرحلے میں اس کتاب پر بحث بھی اتنی شدومد سے ہوئی ہے کہ اس کا اچھا خاصا مقدمہ بن گیا ہے، چونکہ اس کتاب میں اُردو شاعری پر کچھ بجایا بے جا اعتراضات کیے گئے تھے، اس لیے اس کے شائع ہوتے ہی چاروں طرف سے ایک شور برپا ہوگیا اور حالی کے خیالات۔اور ذات، دونوں پر حملے ہونے لگے۔ اعتراض کرنے والے جو کچھ کہہ رہے تھے، کم سے کم میں تو اس کی تائید ہی کروں گا، لیکن حالی نے جس غرض سے اُردو شاعری کی بُرائی کی تھی، وہ بات معترضین کی سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے حالی کو صرف گستاخ اور منہ پھٹ گردانا اور انہیں بے نقط سنانی شروع کر دیں، اور ہنگامے کے وقت تو یہی معلوم ہوا کہ میدان دشمن کے ہاتھ رہا، چنانچہ ایک صاحب نے اپنی فتح کا اعلان بھی کر دیا ۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن جب مخالف کا زور کم ہو اور حالی کی پذیرائی شروع ہوئی تو اقبال نے انہیں یہ نذرِ عقیدت پیش کی ۔

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجا نہا افگند شورے کہ من دانم

مقدمہ شعروشاعری سے متعلق بہت سے لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ ایسی کتاب

اردو تو اردو، دنیا کی اور زبانوں میں بھی مشکل سے دستیاب ہوگی۔ بعض لوگوں نے ان کی تنقید کو ان کی شاعری سے بھی بڑھا دیا، مثلاً مہدی حسن افادی نے۔

میرے ذہن میں حالی کی عظمت دیوانِ حالی کے اس حصے سے ہے جو مقدمہ شعرو شاعری کی حیثیت سے لکھا گیا۔ وہ ۲۲۸ صفحے قطعاً غیر فانی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض لوگوں نے تو انہی خیالات کو دہرا کر نئی تنقیدی کتابیں لکھ ڈالیں۔ یہ لوگ نہ تو سرقے کے مرتکب ہو رہے تھے نہ تو اردو کے۔ حالی کے خیالات ذہنوں میں اس طرح سرایت کر گئے تھے کہ اس کتاب سے ہٹ کر سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

۳۶ء کے قریب جب وہ تحریک شروع ہوئی جسے نیا ادب کہتے ہیں تو حالی کی مقبولیت اور بڑھی، بلکہ حالی کو اس کا پیشرو سمجھا گیا، کیونکہ وہ ادب کی سماجی افادیت کے قائل تھے اور بہت سے نئے ادیب بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ پچھلے پندرہ بیس سال کے عرصے میں حالی کی ایسی بے ہنگم تعریفیں ہوئی ہیں جن کا تعلق ان کی تحریروں سے ذرا بھی نہیں ہے، مثلاً بعض اردو نقادوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالی کا تنقیدی نظریہ مارکسیت کے قریب ہے۔ ایک صاحب نے انہیں بیک وقت اردو کا ڈرائڈن، اردو کا باسویل، اردو کا بیکن کہا ہے۔ انگریزی ادب میں تو ابھی بہت سے نام رہ گئے ہیں، پتہ نہیں انہیں کیوں چھوڑ گئے۔ ایک اور نقاد کہتے ہیں ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعرو شاعری کے ذریعہ اسے ایک ذہن دیا۔ اول تو اس جملے کا مطلب ہی مبہم ہے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ حالی سے پہلے اردو کے شاعر ذہن سے کام نہیں لیتے تھے۔ حالی کی کتاب پڑھنے کے بعد ذہن بھی استعمال کرنے لگے۔ یا اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حالی سے پہلے کے شاعر شعر کہتے ہوئے چاہے ذہن سے کام لیتے ہوں، مگر ویسے شاعری کے متعلق نہ سوچتے تھے؟ اگر پہلی بات مراد ہے تو غالب کو فلسفی شاعر کیوں کہا جاتا ہے اوروں کا تو خیر ذکر ہی چھوڑیے۔ اگر دوسری بات مراد ہے تو میر کے ان بیسیوں اشعار کو کہاں لے جائیں جن میں تخلیقی عمل کو سمجھنے کی کوشش پائی جاتی ہے، اور کوشش بھی ایسی شدید کہ میں تو کہتا ہوں درحقیقت اردو میں دو ہی نقاد ہوئے ہیں، ایک تو میر دوسرے فراق۔ حالی تو شعر کی تاثیر کے ہی پھیر میں پڑے رہے۔ میر نے تو براہِ راست تخلیقی عمل کا مطالعہ کیا۔ بہرحال میرا مقصد یہ تھا کہ لوگوں نے ایک زمانے میں حالی کو گالیاں دیں تو انتہا کر دی، پھر جب تعریف کرنے پر آئے تو انتہا کر دی۔ اگر حالی کی تنقید کے بارے میں کسی نے سوچ

سمجھ کر رائے دی ہے تو کلیم الدین احمد اور فراق صاحب نے مثلاً فراق صاحب نے کہا ہے۔ حالی ایک حساس عقلیت کا پیغمبر ہے اور اس میں عقلیت کا تمام زور اور عقلیت کی کمزوریاں موجود ہیں، غرض چاہے، ہم حالی کی کتاب کو قبول کریں چاہے رد کر دیں، پچھلے ساٹھ سال سے یہ کتاب دلچسپی کا مرکز بنی رہی ہے۔ کلیم الدین احمد نے کہا ہے کہ اگر اس کتاب کو خضر راہ سمجھا جائے تو اردو ادب میں کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں۔ یہ رائے بالکل درست ہے، لیکن اردو ادب کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان غلطیوں کو سمجھیں جو اس کتاب کے بارے میں آج تک ہوتی چلی آئی ہیں۔ آج کل تو اس کتاب کو قبول کرنے کی ضرورت ہے نہ رد کرنے کی۔ اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کتاب ایک خاص زمانے میں کس غرض سے لکھی گئی تھی۔ اس کے پیچھے کون سی تحریک کام کر رہی تھی اور اسی کتاب نے پچھلے ساٹھ سال کے اردو ادب پر اچھا یا بُرا کس قسم کا اثر ڈالا۔ آج یہ کتاب ایک زندہ کتاب نہیں ہے، لیکن ہماری ساٹھ سال کی ادبی اور ذہنی تاریخ اس کتاب سے متعلق ہے۔ اس تاریخ کو سمجھے بغیر ہمارے ادب کی ترقی ممکن نہیں رہی اس کتاب کی اہمیت ہے، اور اسی لیے یہ کتاب ہمارے حال سے بھی متعلق ہے۔

جیسا میں نے شروع میں کہا تھا مقدمہ شعر و شاعری کی بحث بذاتِ خود ایک مقدمہ بن گئی ہے۔ یوں تو اس کتاب کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، لیکن اب ضرورت ایک ایسے ایڈیشن کی تھی جس کے ذریعے ہم اس کتاب کا صحیح تاریخی پس منظر اور اردو تنقید سے اس کا رشتہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ یہ ضرورت مکتبہ جدید لاہور نے اور ڈاکٹر وحید قریشی نے مل کر پوری کی ہے۔ مکتبہ جدید نے اس کتاب کا ایک تو خاص ایڈیشن ٹائپ میں شائع کیا جس کی قیمت دس روپے ہے۔ طباعت، جلد بندی وغیرہ کے سلسلے میں انہوں نے واقعی کمال کر دکھایا ہے۔ دوسرا ایڈیشن عام قسم کا ہے جس کی قیمت چھ روپے ہے۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر وحید قریشی نے ترتیب میں جس دیدہ ریزی اور جاں فشانی سے کام لیا ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ ایک تو یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے کتاب کے مختلف ایڈیشن پڑھے، ان کا آپس میں مقابلہ کیا اور ہمارے لیے صحیح ترین متن تیار کیا، لیکن اس ایڈیشن میں خاص چیز ضمیمے اور حاشیے ہیں۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اس کتاب کی تاریخ پیش کی ہے، پھر چار صفحات میں کچھ رائیں جمع کی ہیں جو شروع سے لے کر آج تک اس کتاب کے بارے میں دی گئیں، پھر ایک باب حالی کے ذاتی حالات اور ان کی شخصیت سے متعلق

ہے، پھر ایک پچاس صفحے کا مضمون حالی کی تنقید کے بارے میں ہے۔ غالباً کتاب کا یہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اس حصے میں ایک تو حالی کی تنقید کے محاسن اور معائب، دونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری طرف ان کا مقابلہ اور موازنہ شبلی سے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حالی نے کن کن مغربی نقادوں سے خیالات مستعار لیے، انہیں کس حد تک سمجھا اور کس حد تک نہیں سمجھا۔ یہ مضمون بذاتِ خود اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب کی قیمت تو اسی سے وصول ہو جاتی ہے لیکن متن کے بعد تین ضمیمے اور شامل ہیں۔ پہلا ضمیمہ تو کتاب کے حواشی زوائد اور مآخذ کے بارے میں ہے جہاں مرتب نے انگریزی نقادوں کے وہ ٹکڑے جمع کیے ہیں جو حالی نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں، جن کا اثر حالی کے تنقیدی نظریات پر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان مغربی خیالات کو حالی نے اپنے ادب پر کس طرح چسپاں کیا۔ دوسرے ضمیمے میں حالی کے مضامین، مکاتیب اور نثر یا نظم کی تصنیفات میں سے وہ حصے لے کر نقل کیے گئے ہیں جن کا تعلق شعر و ادب سے ہے۔ اسی طرح حالی کے سارے ادبی نظریات اس ایک کتاب میں جمع ہو گئے ہیں۔

تیسرا ضمیمہ ان تنقیدی راؤں پر مشتمل ہے جو حالی کی کتاب پر پچھلے بیس سال کے عرصے میں دی گئیں، یعنی اس حصے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ نئے ادیبوں نے حالی کو کس طرح پڑھا اور اُن سے کیا اثر لیا۔ آج کل کے ادب اور تنقید کو سمجھنے میں یہ ضمیمہ بہت مددگار ثابت ہو گا۔

(مئی ۱۹۵۴ء)

اردو زبان، سرکاری زبان

پچھلے دنوں زبان کے مسئلے پر بڑا شور و غل رہا۔ بعض لوگوں نے تو ایسا رونا دھونا مچایا کہ معلوم ہوتا تھا اردو زبان ہی مر گئی، حالانکہ مسلم لیگ نے جو فیصلہ کیا تھا، وہ تو ایک سیاسی چیز تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے سیاسی فیصلوں کا اثر تہذیبی زندگی پر اتنا ہی گہرا ہو جتنا یہ لوگ سمجھ رہے تھے۔ ہمارے ادیبوں میں اور چاہے ہزار خامیاں ہوں لیکن انہوں نے ہمیشہ فائدے نقصان کے خیال سے بے نیاز ہو کر لکھا ہے اور لکھتے ہوئے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ اردو قومی زبان ہے یا بن سکتی ہے، اس لیے اس میں لکھنا چاہیے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے اردو زبان کے مسئلے کو ہمیشہ سیاسی مسئلہ سمجھا ہے، ان کے نزدیک کسی زبان کی عظمت دو باتوں سے وابستہ ہے۔ ایک تو یہ کہ زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہو، دوسرے اس کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ اس زبان کے بولنے والے کہتے کیا ہیں اور وہ بات سننے کے لائق ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہونا یا نہ ہونا کتنی غیر اہم بات ہے، یہ اسی سے دیکھ لیجئے کہ آزادی ملنے سے پہلے ہمارے ادب کی کیا حالت تھی اور آج کیا حالت ہے اور تو اور آزادی ملنے کے بعد تو کتابوں کی فروخت میں بھی کمی آ گئی۔ رہی کسی زبان کے بولنے والوں کے مقابلے میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد تو کم سے کم دوگنی تو ہوگی، لیکن انگلستان سے آج کل ایک معقول ادبی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف فرانس میں اور کچھ نہیں تو ایک درجن ادبی رسالے تو ایسے نکلتے ہیں جنہیں پڑھے بغیر یورپ کے تہذیبی رجحانات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ رہی سیاسی اہمیت کی بات تو جرمن زبان کو لیجئے۔ دنیا میں اس زبان کے بولنے والے کتنے ہیں؟ پھر پچھلے چالیس سال کے عرصے میں جرمنی دو دفعہ بری طرح پٹ چکا ہے۔ اس کے باوجود کوئی مہذب قوم جرمن کتابوں سے

بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ فرض کیجیے آپ نے اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنا بھی دیا تو بھی آپ دنیا کے کتنے لوگوں کو اردو زبان اور ادب پڑھنے کی رغبت دلا سکیں گے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اردو میں کچھ لکھیے، اس کے بعد اردو کی عزت کرنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ اردو کا سارا مسئلہ اتنا ہی تو نہیں کہ یہ قومی زبان بنتی ہے یا نہیں۔ مجھے تو یہ دیکھ کر بڑی تسکین ہوئی کہ اردو ادیبوں نے قومی زبان کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنی زبان سے محبت ہے اور اس کے مستقبل پر یقین ہے۔ اردو کے سرکاری زبان بننے یا نہ بننے سے ادیبوں پر تھوڑا بہت اثر تو ضرور پڑے گا اور کچھ نہ ہی سہی تو معاشی لحاظ سے ہی سہی، یعنی اگر اردو پاکستان کی واحد قومی زبان بن گئی تو اردو کی کتابیں کچھ زیادہ بکنے لگیں گی لیکن کتابیں زیادہ بکنے کے اور بھی طریقے ہیں اگر ہم موجودہ اردو دانوں میں ہی ادب پڑھنے والوں کی تعداد بڑھا سکیں تو بھی ہم کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ لیکن ادب کی تخلیق کا انحصار اس بات پر نہیں کہ کتنی کتابیں بکتی ہیں اور ادیبوں کو کتنے پیسے ملتے ہیں جس زمانے میں منشی نول کشور شام کو صندوقچہ لے کر بیٹھ جاتے تھے اور ادیبوں کو چار آنے فی جز کے حساب سے اُجرت تقسیم کیا کرتے تھے، اس زمانے میں بھی ادیب اردو میں لکھتے تھے۔ جب کتاب کا معاوضہ پچاس روپے ملنے لگا اس وقت بھی ادیب اردو میں لکھتے رہے، اور آج کل پانچ سو تک معاوضہ مل جاتا ہے تو بھی اردو میں لکھتے ہیں۔ ہم ادیبوں کے لیے اردو زبان کا مسئلہ وہ نہیں جو مثلاً انجمن ترقی اردو کے لیے ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ریگستان میں بھی پھینک دیا جائے تو بھی اردو ہی میں لکھیں گے۔ اگر اردو ادیبوں میں تھوڑی بہت جان باقی ہے تو اردو کے قومی زبان بننے یا نہ بننے سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انگریزوں کے زمانے میں انگریزی کے سامنے اردو کو کوئی نہیں پوچھتا تھا، لیکن ہمارے لیے اردو ہی وسیلہ رہی۔ بلکہ ۳۶ء کے بعد تو اردو میں زیادہ تر تخلیقی کام ان لوگوں نے کیا جو انگریزی میں بھی لکھ سکتے تھے، لیکن جنھوں نے اردو کو ترجیح دی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی اردو کو نہ تو پاکستان میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی نہ ہندوستان میں۔ مگر ادیبوں کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب اگر اردو سرکاری زبان نہیں بن سکتی تو نہ بنے، یہ تو ہم ادیبوں کی ہمت پر موقوف ہے کہ ہم اپنی زبان کو کیا بناتے ہیں۔ جہاں تک ادیبوں کے کام کا تعلق ہے، اس میں نہ تو حکومت کوئی مدد کر سکتی ہے نہ کوئی اور انجمن۔ ہمارے لیے زبان ایک

بالکل دوسری چیز ہے۔ اگر ادیبوں میں اپنی ادیبانہ ذمہ داری کا احساس بیدار ہو جائے تو بہت ممکن ہے کہ اردو کے قومی زبان نہ بننے سے اردو کو فائدہ ہی پہنچے، کیونکہ پھر تو اپنی زبان کی غورو پرداخت اور نشوونما کا سارا کام ادیبوں ہی کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ چنانچہ ہمارے لیے قومی زبان کا مسئلہ اتنا اہم نہیں جتنا ملازمت ڈھونڈنے والوں کے لیے ہے۔ اگر اردو زبان سیاسی مسائل کی حدود سے باہر نکل آئے تو اچھا ہی رہے گا۔ خالص زبان اور بیان کے جو مسائل ہیں، ان سے ہم ادیب لوگ سلٹ لیں گے۔ بہرحال ادیبوں نے قومی زبان کے معاملے میں جو رویہ اختیار کیا ہے، بہت مناسب ہے یعنی ہمارا کام بہرصورت جاری ہے۔

ایک دفعہ میں نے کہا تھا کہ ہمارے ادیب ادب تخلیق نہیں کرتے بلکہ انہوں نے زندگی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ادب کو ایک ڈھال بنا رکھا ہے لیکن بعض حالات میں ادب بیماری کی حیثیت سے بھی مفید ہوتا ہے۔ فرد کے لیے بھی اور معاشرے کے لیے بھی۔ آج کل کا زمانہ بھی ایسا ہی ہے۔ ادب میں جمود بھی آتا ہے، ادب مرتا بھی ہے اور پھر سے زندہ بھی ہوتا ہے۔ سچے ادب میں یہ باتیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ آج کل تو یہ بھی مشکل ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ خواہ مخواہ ادب سے چپکے ہی رہیں، کیونکہ سیاسی لوگ تو الگ رہے، اب تو یہ حال ہوا ہے کہ جو لوگ اردو کا دم بھرتے ہیں، وہ بھی اردو کی ترقی کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ چرم سازی کی اصطلاحات اردو میں مرتب ہو جائیں۔ ہمارے ادیب چاہے ادب تخلیق نہ کر رہے ہوں، لیکن کم سے کم زبان اور انسانی تجربے کا تعلق تو ان کے دم سے کچھ نہ کچھ قائم ہے۔ اردو زبان چاہے قومی زبان بنے یا نہ بنے، انسانی زبان باقی رہے، یہی اردو کی زندگی ہے۔

(جون ۱۹۵۴ء)

انگریزی زبان اور نصابِ تعلیم

ان صفحات میں تو نہیں لیکن ایک اور رسالے میں تعلیم اور ادب کے تعلق پر میں پہلے کچھ لکھ چکا ہوں۔ تعلیم کے عام مسئلے سے قطع نظر ہمارے ملک میں انگریزی کی تعلیم کا مسئلہ ایک الگ ہی نوعیت رکھتا ہے۔ اردو کی بہی خواہی میں تو خیر میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہوں لیکن حکومت نے کم سے کم بیس سال کے لیے، انگریزی دفتروں پر مسلط کر ہی دی ہے۔ اگر آپ اس قانون کو منسوخ کرا بھی دیں تو بھی مغرب کی زبانوں سے بے تعلق ہو کر آپ اردو کو بیسویں صدی کی ایک زندہ زبان کی حیثیت نہیں دے سکتے۔ ہماری پہنچ لے دے کے بس ایک انگریزی تک ہے اس لیے ہمارے ادب کے مستقبل کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہمیں انگریزی کس طرح پڑھائی جاتی ہے۔ میرا مطلب صرف ادب کے طالب علموں سے نہیں۔ اگر سال بھر میں بیس پچیس آدمیوں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کر لیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سوال تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے عام پڑھے لکھے لوگوں کی ذہنی دلچسپیاں کتنی وسیع یا کتنی محدود رہتی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ہر آدمی کو تھوڑا بہت انگریزی ادب ضرور پڑھایا جائے۔ جو لوگ صرف و محض ادب پڑھنے لگتے ہیں تو اس قسم کا ادب پیدا ہوتا ہے جیسا نیاز فتح پوری کے زمانے کا ادب تھا۔ لیکن ادب پڑھے بغیر بھی ذہنی دلچسپیاں وسیع ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں میں انگریزی ذرا سوچ سمجھ کر پڑھائیں۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل کے بارے میں بھی واضح طریقے سے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا ہی نہیں چاہتے کہ ہماری زندگی میں کس چیز کا کیا مقام ہے اور اس کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی کی تعلیم کو ہی لیجیے اور جگہوں کے بارے میں تو مجھے علم نہیں مگر کراچی میں انگریزی کی جو درگت بن رہی ہے،

اُس سے میں بڑی تفصیل کے ساتھ واقف ہوں۔ اس موضوع پر کچھ لکھتے ہوئے تھوڑا سا ڈر بھی لگتا ہے۔ کیونکہ کراچی یونیورسٹی تو اتنی بھی تنقید برداشت نہیں کرتی جتنی حکومت برداشت کرلیتی ہے۔ آج میں کچھ لکھوں گا، کل وائس چانسلر صاحب میرے کالج کو حکم دیں گے کہ اسے نکال دو۔ بہرحال ایسا ڈر بھی کیا ہے، مجھے تو گھاس کھود کے بھی زندہ رہنا آتا ہے۔ مئں تو اپنے طالب علموں کو دیکھ دیکھ کر لرزتا ہوں کہ جن لوگوں کو انگریزی اس طرح پڑھائی جارہی ہو، وہ بیسویں صدی میں کیا کرسکیں گے۔ ہماری تعلیم ہر قسم کی حقیقتوں سے کتنی بیگانہ ہوچکی ہے، اس کا اندازہ اسی سے کرلیجئے کہ ایک طرف تو ملک میں یہ شور مچ رہا ہے کہ ہمیں ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں، فی الحال سائنس اور افادی علوم کی تعلیم زیادہ ضروری ہے، دوسری طرف انگریزی کے نصاب میں ادب کی اتنی بھرمار ہے کہ پڑھنے والوں کو ادب سے ہمیشہ کے لیے چڑ ہو جائے۔ ایک طرف انگریزی، زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے سر پر سوار ہے، دوسری طرف بی۔ اے کے امتحان میں ڈویژن کا تعین کرتے ہوئے انگریزی کے نمبر نہیں جوڑے جاتے۔ یعنی کراچی کا طریقہ تعلیم دیکھ کر یہی پتہ نہیں چلتا کہ انگریزی ہمارے لیے اہم ہے یا غیر اہم بی۔ اے کا طالب علم تو سنجیدگی سے انگریزی پڑھے بغیر بھی امتحان پاس کرسکتا ہے۔ پھر انگریزی کا پرچہ کبھی تو ایسا آتا ہے جیسے ایف۔ اے کے لیے ہو، کبھی ایسا جیسے ایم۔ اے کے لیے ہر سال ممتحن صاحبان اپنا معیار الگ بناتے ہیں۔ کیا پڑھیں کیا نہ پڑھیں، اس کا پتہ نہ تو پڑھنے والوں کو ہوتا ہے نہ پڑھانے والوں کو، اور ہو بھی کیسے، ہر نیا ممتحن ایک نئی عمارت بناتا ہے۔ اس کے باوجود ڈھیروں لڑکے پاس بھی ہو جاتے ہیں، خدا جانے کیسے۔ نہ معلوم ہماری قوم حقیقتوں کے اعتراف سے کیوں ڈرنے لگی ہے۔ اگر انگریزی ہمارے لیے اب بھی ضروری ہے تو اسے ٹھیک طرح پڑھائیے، اور یہ سمجھ کر پڑھائیے کہ ہمیں انگریزی کی ضرورت کیوں ہے، ورنہ پھر انگریزی کو بالکل ہی ختم کیجئے اور اپنی زبان کو جلد از جلد اس قابل بنائیے کہ ہم ہر علم یہاں تک کہ انگریزی ادب بھی اردو میں پڑھ سکیں۔ لیکن نہ تو ہم اردو کے لیے کچھ کررہے ہیں اور نہ انگریزی ڈھنگ سے پڑھتے ہیں۔ ایسی تعلیم ہمیں کہاں پہنچائے گی، کم سے کم ہمیں یہی طے کرلینا چاہیے کہ ادب بڑی حقیر چیز ہے، اور ہم نے اسے بالکل چھوڑ دیا۔ ہمارے یہاں تو مذاق یہ ہو رہا ہے کہ ایسے زمانے میں جب ہر لڑکا صنعتی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، یار لوگوں نے میٹرک کے نصاب میں پوپ کی "ریپ آف دی لوک" رکھ دی جسے لڑکے تو لڑکے استاد

بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے برخلاف ہندوستان والے کم سے کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ہم چاہتے کیا ہیں، مثلاً الہ آباد یونیورسٹی کا تازہ نصاب دیکھا۔ انھوں نے بی۔ اے کے عام طالب علموں کے لیے کوئی ادبی کتاب رکھی ہی نہیں۔ وہ تو صرف اس غرض سے انگریزی پڑھاتے ہیں کہ لڑکے اپنے اپنے مضمون کی کتابیں پڑھ اور سمجھ سکیں۔ ہماری تعلیم جن لوگوں کے ہاتھ آگئی ہے، وہ ہماری قوم کے ساتھ اچھا خاصا مذاق کر رہے ہیں۔ نہ تو ادب ہی ڈھنگ سے پڑھاتے ہیں، نہ ادب کو نصاب سے خارج کرتے ہیں۔ یہ تو میں بتا ہی چکا کہ بی۔ اے میں اگر کوئی انگریزی میں پورے سو نمبر بھی لے آئے تو بھی اُس کے ڈویژن پر اثر نہیں پڑتا۔ پھر ایک لطیفہ یہ ہے کہ نصاب دو سال کے لیے بنایا جاتا ہے، مگر طالب علموں کو اجازت ہے کہ وہ ایک سال بعد ہی امتحان دے سکتے ہیں، یعنی صرف ایک سال کے عرصے میں آدمی کو تین کتابیں اچھی طرح پڑھنی ہوتی ہیں، ایک تو شیکسپیئر کا ڈرامہ، دوسرے ڈیڑھ سو دو سو نظموں کا مجموعہ، تیسرے نثر کی کوئی مشکل سی کتاب۔ پھر اوپر سے دل لگی یہ کہ ممتحن جو سوال چاہے پوچھ سکتا ہے، معیار کوئی مقرر نہیں۔ یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ سال بھر میں آدمی کتنا پڑھ سکتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے لڑکے انگریزی ادب چھوڑ، صحیح انگریزی لکھنا بھی نہیں سیکھ سکتے، رٹ رٹا کے کسی نہ کسی طرح پاس ہو جاتے ہیں۔

اس سے بھی بڑا لطیفہ انگریزی کا وہ پرچہ ہے جو بعض لوگ ان کے بجائے لے لیتے ہیں۔ اس کے متعلق تو آج تک کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ ہے کون سا جانور۔ اس کے لیے کبھی تو ایسی کتاب رکھی جاتی ہے جو زیادہ سے زیادہ ایف۔ اے کے لیے ہونی چاہیے، اور کبھی نصاب بنانے والے اتنے سنجیدہ ہو جاتے ہیں جیسے پاکستان کے لیے دستور مرتب کر رہے ہوں، مثلاً اس سال ایک تو جو رجٹ ایلیٹ کا ایک دھوندوکاٹ ناول مقرر ہوا ہے، اور دوسرے نیومن کی اتنی ثقیل کتاب کہ ہمارے ہمارے طالب علموں کو پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آئے گی۔ جن کتابوں کو طالب علم شوق سے پڑھ بھی نہ سکیں، انہیں نصاب میں رکھنے سے فائدہ؟ اگر یہ طالب علموں کو سزا دینے کے خیال سے ہوتا ہے تو اور بات ہے۔ شاید کراچی یونیورسٹی نے اس میں بھی ایک زبردست اصلاحی مقصد پیش نظر رکھا ہے۔ لوگ ادب سے بدظن تو ہو ہی چکے ہیں، انہیں ادب سے بالکل بھگانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسی کتابیں پڑھوائی جائیں جن میں ذرا بھی مزا نہ آئے، تاکہ وہ پڑھنا لکھنا

چھوڑ کے درزی کے یہاں کام سیکھیں۔ ادب کو ادب کے ذریعے مارنے کا یہ نسخہ تیر بہدف ہے۔ ایسے انگریزی ادب سے تو اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو ہی بھلی، کچھ پلے تو پڑتی ہے۔

یہ تو میں نے آپ کو صرف اس انگریزی کا حال سنایا ہے جو ادب سے تعلق نہ رکھنے والوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ادب کے مستقبل کے لیے یہی زیادہ اہم بھی ہے۔ اگر ہمارے طالب علم ایمانداری کے ساتھ تھوڑی بہت انگریزی زبان سیکھ لیں تو یہ ہمارے ادب کے لیے بھی ایسے ادب سے کہیں بہتر ہے جو زبردستی ان کے حلق میں ٹھونسا جائے اور جسے ہضم کرنے کا وقت بھی انہیں نہ دیا جائے۔ اس پریشان خیالی سے ادب تو درکنار، پوری قومی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن ملک کی مصیبت یہ ہے کہ کسی کو ذرا سا اختیار بھی مل جائے تو پھر آپ اس سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اس کی سمجھ میں کوئی بات آئے گی، ممکن ہے میری یہ تحریر دیکھ کر کراچی یونیورسٹی کا انگریزی نصاب بنانے والے جا کے تھانے میں رپٹ لکھوائیں کہ ایک چھپے ہوئے کمیونسٹ یا ہندوستانی جاسوس کا پتہ اور چلا۔ غرض یہ کہ بچاری پاکستانی قوم کے ساتھ بھی یار لوگ اچھی دل لگی کر رہے ہیں۔ سیاسی لوگ تو کم و بیش ہر جگہ ایک سے ہی ہوتے ہیں، ان کی کیا شکایت لیکن ماہرین تعلیم جیسے قسمت نے ہمیں دیے ہیں، ویسے خدا کمیونسٹوں کو بھی نہ دے ؎

ہوئے تم دوست جس کے اُسکا دشمن آسمان کیوں ہو

(اکتوبر ۱۹۵۴ء)

اَدب اور طالب علم

پچھلے پندرہ سال سے اردو ادب کی قسمت طالب علموں سے وابستہ رہی ہے۔ طالب علموں نے جو کچھ لکھوانا چاہا ہے، وہی ادیبوں نے لکھا ہے۔ جیسے جیسے طالب علم اپنی ذہنی تربیت سے غافل ہوتے گئے، ویسے ہی ہمارے ادب کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ جو کچھ ادیبوں نے لکھ دیا، اسے طالب علموں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادیبوں نے بھی ذہنی کاوش چھوڑ دی اور اپنے آپ سے مطمئن ہو کے بیٹھ گئے۔ پھر پانچ چھ سال سے تو طالب علموں نے فی الجملہ ادب سے تخلیقی دلچسپی لینی ترک ہی کر دی ہے۔ یوں ایک آدھ شخص کو مضمون نگاری یا شاعری کا شوق ہوا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک جماعت کی حیثیت سے طالب علم ادب سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اس سے ہمارے ادب کو دو بڑے نقصان پہنچے ہیں۔ ایک تو ادیبوں سے نئے نئے مطالبے کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا، دوسرے ادب میں وہ تازگی نہیں رہی جو نوجوانوں کے تخلیقی تجربات سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی آج کل ادب کو طالب علموں سے کسی قسم کا حقیقی تعاون نہیں رہا، اور لوگ تو ادب سے پہلے ہی کنارہ کش ہو چکے تھے، اب نوجوانوں کی ذہنی قوت سے بھی ادب محروم ہو چکا ہے۔ پھر ادب بے جان نہ ہو تو کیا ہو۔ اس کے باوجود ادب کی قسمت اب بھی طالب علموں کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ ادب کو پڑھنے والوں کی اور کوئی جماعت نہ تو اب تک میسر ہوئی ہے اور نہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔

بہرحال لاہور، کراچی سے ایک بات میں بہتر ہے۔ کراچی میں ایک دو طالب علم ایسے نکل آتے ہیں جنہیں ادب سے گہرا لگاؤ ہو، لیکن یہ دیوانگی کی حد تک نہیں پہنچتا، لیکن میں جب بھی لاہور جاتا ہوں، یہ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں ہر سال چار پانچ طالب علم ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دیوانگی کی روایت نبھائے جاتے ہیں۔ چاہے یہ

دیوانگی دو چار سال سے زیادہ نہ چلے، لیکن لاہور کی ادبی فضا میں تھوڑا بہت ہنگامہ تو پیدا کر ہی جاتی ہے۔ ڈھائی سال پہلے میں لاہور گیا تھا تو گورنمنٹ کالج کے رسالے "راوی" کے ایک دو پرچے ایسے دیکھنے کو ملے جن کا ادبی معیار ہمارے اچھے سے اچھے رسالوں سے بلند تھا۔ کم سے کم اس پرچے میں ایک ایسا ذہنی تجسّس نظر آتا تھا جس کا ہمارے ادب میں پچھلے دس سال سے دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ ان مضمونوں میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ غلط ہوں یا صحیح، لیکن اس پرچے میں لکھنے والوں کو یہ احساس تو تھا کہ دنیا میں کچھ اور ملک بھی ہیں، اور وہاں کچھ ہو رہا ہے لیکن ہمارے ملک میں اپنی ذہنی دلچسپیوں کو زندہ رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں پچھلے مہینے لاہور گیا تو دیکھا کہ "راوی" تک وہ معیار برقرار نہیں رکھ سکا۔ پھر بھی مجھے لاہور میں چند طالب علم ایسے نظر آئے جو اچھے کپڑے پہن کر یا امریکی لہجے میں انگریزی بول کر نہیں بلکہ بڑے ادیبوں اور بڑی کتابوں کا نام لے کر فخر محسوس کرتے تھے۔ دو چار دن میں یہ پتہ چلانا تو مشکل تھا کہ ان لوگوں کی ذہنی دلچسپیاں کتنی گہری ہیں اور وہ ان کتابوں کو کس طرح پڑھ رہے ہیں، بہرحال چند ادیبوں، مصوروں، کتابوں کے نام سیکھ کر اور دوسروں کے سامنے دُہرا کر یہ لوگ اتنا تو محسوس کرتے تھے کہ اب ہم پہلے سے کچھ بہتر ہو گئے۔ کراچی میں تو اتنی بات بھی نہیں دکھائی دیتی۔ پڑھنا تو خیر اردو ادیبوں نے مدت سے چھوڑ رکھا ہے لیکن لاہور کے ادیب کم سے کم طالب علموں کی زبان سے ہی نئی کتابوں کے نام سن لیتے ہیں، چاہے یہ پتہ نہ چلے کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ اس حد تک تو لاہور کے طالب علم ضرور ادیبوں پر اثرانداز ہو رہے ہیں اور کچھ نہیں تو ادیبوں کو تھوڑا سا چوکنا ہی رہنا پڑتا ہے۔ غالباً ملک کا ماحول طالب علموں کو اجازت ہی نہیں دیتا کہ ادب سے اور زیادہ دلچسپی رکھیں، اور ادب پر شدت سے اثرانداز ہوں۔ ورنہ ممکن تھا کہ تین چار طالب علموں کی دیوانگی ہی ادب کی حالت سدھار دیتی۔ خیر، کچھ بھی ہو، مجھے اتنا بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک کچھ لوگ کتابیں پڑھنے کو فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ دوسری چیز مَیں نے لاہور میں ایک اور دیکھی۔ کراچی میں بیٹھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہمارے یہاں مصوروں کی جو ریل پیل ہے، وہ سرکاری وظیفوں کا کرشمہ ہے۔ لاہور میں تین چار مصوروں کا کام دیکھ کر مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ مصوری فیشن کیوں بن گئی، اس کے تو خیر کئی اسباب ہو سکتے ہیں، فی الحال اسے چھوڑیے۔ یہ ہنگامہ مصنوعی سہی تو بھی فیشن ہی فیشن میں کچھ لوگوں کی تخلیقی قوتیں بروئے کار آ گئی ہیں۔ لاہور کے مصوروں کو دیکھنے

کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہماری مصوری کا مستقبل چاہے جو ہو۔ اور ہمارے مصور بھی ادیبوں کی طرح آگے چل کے چاہے بیٹھ جائیں مگر فی الحال ان لوگوں میں کسی نہ کسی حد تک وہ تخلیقی جوہر ملتا ہے جو ادیبوں میں مفقود ہے۔ یہاں ایک بڑا دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہماری قوم کی تخلیقی قوت ادب کے بجائے مصوری میں کیوں ظاہر ہو رہی ہے؟ کیا یہ بات صحت مندی کی علامت ہے؟ بہر حال، اتنی بات ماننی پڑے گی کہ اس وقت جتنی اصلیت ہماری مصوری میں ہے، اتنی ہمارے ادب میں نہیں۔

(دسمبر ۱۹۵۴ء)

حلقہ اربابِ ذوق

جس زمانے میں نئے ادب کی تحریک زوروں پر تھی، صرف دو ادبی جماعتوں کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، ایک تو انجمن ترقی پسند مصنفین، دوسرے حلقہ اربابِ ذوق۔ خود حلقے والے تو یہ کہتے تھے کہ ہمارا کوئی خاص پروگرام نہیں، ہم کسی قسم کے خیالات پر پابندی لگائے بغیر ادب کو ادب کے لحاظ سے پڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ترقی پسندوں کی مخالفت نے حلقہ اربابِ ذوق کو ایک مدرسہ فکر کی حیثیت دے دی بہرحال ان دو رجحانات میں برابر کی چوٹ تھی۔ آج کل ہمارے ادب میں سوچنے کی روایت ہی ختم ہو کے رہ گئی تو کوئی مدرسہ فکر کہاں سے آئے، اس لیے حلقہ اربابِ ذوق کی وہ اہمیت تو نہیں رہی جو پانچ چھ سال پہلے تک تھی، اس کے باوجود پاکستان میں ادیبوں کی بس یہی ایک جماعت باقی رہ گئی ہے۔ چاہے اس کے کام کی نوعیت اور اس کا معیار وہ نہ رہا جو پہلے تھا، لیکن اس کی سرگرمیوں کو زندہ رکھنا بہرحال ضروری ہے۔ جس طرح اور لوگوں کو وقتاً فوقتاً حلقے سے اختلاف رہا ہے، اسی طرح میں بھی بعض باتوں سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس کے باوجود اور حلقے کی سرگرمیوں میں کوئی خاص حصہ نہ لینے کے باوجود، میں حلقے سے ایک وابستگی محسوس کرتا ہوں۔ اس جماعت میں سب سے اچھی بات یہی ہے کہ اس کا کوئی محدود ادبی پروگرام تک نہیں ہے۔ اس لیے چاہے عارضی طور پر اس کی سرگرمیاں کچھ ہلکی پڑ جائیں، لیکن یہ جماعت دوسری جماعتوں کی طرح مرتی نہیں۔ آج کل حلقے والے کوشش کر رہے ہیں کہ اس میں واقعی کچھ جان آئے۔ اس سلسلے میں پہلی چیز انہوں نے یہ کی ہے کہ "نئی تحریریں" کے نام سے کتابی شکل میں ایک رسالہ نکالا ہے تاکہ جو لوگ حلقے سے متعلق ہیں، ان کی ادبی کاوشیں یکجا پڑھنے والوں کے سامنے آئیں، ظاہر ہے کہ رسالہ نکالنے کا فیصلہ کر کے حلقہ لکھنے والوں کے تحریروں کا معیار تو ایک دم سے بلند نہیں کر سکتا۔ کوئی

رسالہ بھی ہو، آخر ویسی ہی چیزیں چھاپے گا جیسی ادیب لکھیں گے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر حلقے والے کوشش کرتے تو معیار کچھ اور بلند ہو سکتا تھا۔ بہر حال مجھے اس پہلے پرچے کے معیار کی اتنی شکایت نہیں۔ مجھے جو چیز اس میں نظر نہیں آئی، وہ تجربے کی روح ہے۔ حالانکہ حلقے کی خاص چیز یہی تھی۔ آج کل کے سے زمانے میں تو حلقے کو چاہیے تھا کہ اچھی اور معیاری چیزوں کی فکر میں پڑنے کے بجائے تجرباتی چیزیں شائع کی جاتیں، چاہے یہ تجربے مہمل اور احمقانہ ہی کیوں نہ ہوتے۔ اچھی چیزیں تو افراد اپنے آپ بھی لکھ لیتے ہیں، تجربے کرنے کے لیے کسی جماعت کی ضرورت پڑتی ہے، کم سے کم عام ادیبوں کو تو پڑتی ہے۔ مجھے تو حلقے سے بس یہ شکایت ہے کہ ایسا رسالہ کیوں نکالا جیسے اور بھی نکل رہے ہیں۔ تنقیدی حصے میں ایک چیز اور رسالوں سے الگ ہے۔ ن، م راشد نے ایلیٹ کے ایک نئے مضمون کا ترجمہ کیا ہے۔ ایسے ترجمے چھاپنے کی ہمت دوسرے رسالے نہیں کرتے۔ اس قسم کی چیزیں حلقے کو اپنی سرپرستی میں چھپوانی چاہئیں، لیکن اس ترجمے کے علاوہ جو تنقیدی مضمون ہیں، ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ ایسی چیزیں ہر جگہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حلقہ میراجی کی برسی تو ہر سال مناتا ہے، اب اُسے میراجی کی روایت کو بھی زندہ کرنا چاہیے۔ حلقے میں بزرگی اور متوازن مزاجی نہیں آنی چاہیے۔ یہ کام تو اور لوگ بھی کر لیں گے۔ حلقے کی اصل زندگی تو پاگل پن میں ہے۔ اگر یہ رسالہ تحقیقی ذہنیت سے خالی ہی رہے تو اچھا۔ حلقہ تخلیق کے نام پر قائم ہوا ہے، اور اسی کے نام پر زندہ رہ سکتا ہے۔

اس رسالے میں جو نظمیں، غزلیں اور افسانے شائع ہوئے ہیں، انہیں کوئی پسند کرے گا کوئی ناپسند۔ غرض ہم وہی کہیں گے جو دوسرے رسالوں میں چھپنے والی چیزوں کے متعلق کہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ حلقے کا رسالہ سب سے الگ پہچانا جائے۔

حلقے نے ایک بات البتہ اچھی کی ہے۔ امجد حسین نے مدت ہوئی لکھنا چھوڑ دیا تھا، ان سے ایک مضمون لکھوا لیا۔ میرے خیال میں یہی اس رسالے کی سب سے اچھی چیز ہے۔ طنز اور مزاح تو ہمارے یہاں ختم ہی ہو گئے، برسوں بعد ایک ایسی چیز آئی ہے جسے مزاح کہا جا سکے، پھر امجد حسین کو واقعی لکھنا آتا ہے۔

ان کا مضمون چند دلچسپ فقروں کا مجموعہ نہیں ہوتا، بلکہ شروع سے آخر تک مضمون ہوتا ہے۔

قیوم نظر نے وہ سلسلہ پھر شروع کیا ہے جس کی ابتدا میراجی نے کی تھی، یعنی

انفرادی طور سے نظموں کا تفصیلی جائزہ میرے خیال میں اس کام کے لیے تو حلقے کو رسالے کا ایک پورا حصہ وقف کر دینا چاہیے، بلکہ اچھی نظموں کے ساتھ ساتھ بری نظموں پر بھی بحث کی جائے، چاہے لکھنے والے کا نام چھوڑ دیا جائے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ یہ جائزہ اردو کی نظموں تک ہی محدود رہے۔ نئے تجربوں کا شوق دلانے کے لیے دوسری زبانوں کی چیزوں پر بھی بحث کی جا سکتی ہے۔

میں نے اس رسالے کی تعریف کرنے کے بجائے اس پر اعتراضات ہی زیادہ کیے ہیں، وہ اس لیے کہ میں حلقہ اربابِ ذوق کی اہمیت کا اب بھی قائل ہوں۔ میں حلقے کی کامیابی اس بات میں نہیں سمجھتا کہ وہ دوسرے رسالوں کے مقابلے کا رسالہ نکال دے۔ حلقے کے رسالے کو ایسی تخلیقات کے لیے وقف ہونا چاہیے جو ظاہر میں چاہے مہمل معلوم ہوں، لیکن جن کے ذریعے ہمارا ذہنی جمود ختم ہو اور اردو ادب میں اظہار کے نئے اسالیب وجود میں آئیں۔ بہرحال یہ تو اس رسالے کا پہلا ہی شمارہ ہے، اگر پڑھنے والوں نے اس کی ہمت افزائی کو تو مجھے امید ہے حلقہ اپنا تخلیقی فریضہ پہچان لے گا، اور اسے ادا بھی کرے گا۔

(جنوری ۱۹۵۵ء)

منٹو اور اُردُو ادب

منٹو نے اپنی زندگی میں تو سینکڑوں چیزوں کے بارے میں سچ بولا ہی، لیکن مر کے بھی وہ ہمیں ایک بات بتا گیا، اور وہ یہ کہ اردو ادب کی اس زبوں حالی کے دور میں بھی ہمارے پڑھنے والے اپنے ادب کی کتنی عزت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ادیب سچا ہو۔ یوں تو اس سات سال کے عرصے میں منٹو پر کس کا عتاب نازل نہیں ہوا، پہلے ترقی پسندوں نے اسے گالیاں دیں، پھر فحش نگاری کے جرم میں اس پر مقدمے چلے، حکومت نے اسے ملعون قرار دیا۔ اس کے بعد بعض ادبی حلقوں میں اس کے خلاف جو کھسر پسر ہوتی رہی، وہ مزید برآں۔ غرض اتنی مختلف قسم کی قوتیں منٹو کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ لیکن نہ تو منٹو نے اپنا اصولِ حیات بدلا نہ منٹو کے پڑھنے والوں کی عزت میں کوئی فرق آیا۔ منٹو چاہے شرابی ہو چاہے کچھ ہو، مگر اس کی موت پر اردو پڑھنے والوں نے جس بے ساختگی کے ساتھ رنج کا اظہار کیا ہے وہ کتنے مرنے والوں کے حصہ میں آتا ہے؟ منٹو کے پیچھے نہ تو کوئی سیاسی طاقت تھی نہ کوئی ادبی جماعت، اس کے باوجود مغربی پاکستان کے دور افتادہ اور چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں اس کا سوگ منایا گیا۔ اردو پڑھنے والوں نے دکھا دیا کہ وہ آزادیِ فکر، اخلاقی ہمت، کردار کی پختگی اور تخلیقی لگن کی کتنی قدر کر سکتے ہیں، اور ان کے دل میں سچے فن کار کی کتنی محبت ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر کوئی سچا فن کار بننے کی ہمت کر جائے تو پھر ان پڑھنے والوں نے یہ بھی دکھا دیا کہ وہ سچے اور جھوٹے کی کیسی پہچان رکھتے ہیں۔ ہم لکھنے والوں کا آخری سہارا اور ہمارے متعلق آخری فیصلہ کرنے والے یہی لوگ تو ہیں۔ اب ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ ادیبوں نے چاہے ادب کو چھوڑ دیا ہو، لیکن پڑھنے والوں نے نہیں چھوڑا۔ منٹو تو خیر مر گیا، لیکن چلتے چلتے ہمیں بتا گیا کہ پاکستان میں ادب زندہ رہ سکتا ہے۔ کسی اور کے سہارے نہیں، صرف پڑھنے والوں کے سہارے۔ اگر منٹو نہ

مرتا تو ہم یہی سمجھتے رہتے کہ پاکستان میں تو اب کرکٹ چلے گا' ادب نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو اردو ادب کو جو کچھ دے سکتا تھا' وہ دے چکا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں منٹو بڑا ناقابل اعتبار آدمی تھا۔ وہ بڑا لکھتے لکھتے ایک دم سے کوئی اچھی چیز پیش کر سکتا تھا۔ وہ اپنی ادبی زندگی میں یہی کرتا رہا۔ اس کی خراب صحت کا اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر کچھ بھی اثر کیوں نہ پڑا ہو' وہ بالکل غیر متوقع طور پر اچھا افسانہ لکھ کے دکھا سکتا تھا۔ بہرحال اب تو یہ سوال بے معنی سا ہے کہ منٹو بے وقت مرا یا وقت پر۔ لیکن اس کے مرنے سے ہمارے ادب کو ایک بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان میں بس وہی ایک آدمی تھا جس نے صرف و محض ادیب کی حیثیت سے جینے کی ہمت کی۔ اس کوشش میں خود اسے اور اس کے اہل و عیال کو جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں' اور اس نے جتنی بدنامی مول لی' وہ تو الگ بات ہے۔ منٹو جیسے خود دار اور باغیرت آدمی نے ان حالات میں کیسی اذیت برداشت کی ہو گی۔ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے منٹو کو دیکھا ہے' مگر ادب کو زندہ رکھنے کے لیے پاکستان میں یہ صلیب کسی نہ کسی کو اپنے کندھوں پر اٹھانی ہی تھی۔ قرعہ فال منٹو کے نام پڑا' اور اس نے یہ بارِ امانت اٹھایا۔ اس کے مرنے کے بعد آج یہ ہمت کسی اور ادیب میں نظر نہیں آتی۔ ایسا آدمی دس پندرہ سال تو پیدا ہوتا نہیں۔ منٹو نے جس قسم کی زندگی گزاری' اس پر چاہے ہمیں اعتراض ہو چاہے افسوس ہو' لیکن ادیبوں کے سامنے روحانی کاوش کا ایک نہ ایک ایسا نمونہ موجود ضرور ہونا چاہیے' ورنہ ادیبوں میں اخلاقی انحطاط شروع ہو رہا ہے۔ منٹو صرف ایک ادیب نہیں تھا' وہ تخلیقی کاوش کا ایک نمونہ تھا اور ہمارے پاس صرف ایک ہی نمونہ تھا' آج وہ بھی نہ رہا۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ منٹو کی شہرت جھوٹی تھی' اور محض ہنگامہ پسندی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ چلیے یہ بھی سہی' مگر ہمارے درمیان ایک ادیب تو ایسا تھا جسے شہرت حاصل تھی اور لوگوں کے دل میں جس کی عزت تھی۔ ایسی شخصیتیں ادب کے لیے ضروری ہوتی ہیں کیونکہ وہ ادب کی حفاظت کرتی ہیں۔ آج کل درجنوں ایسی قوتیں ہیں — سیاسی' نیم سیاسی' سرکاری' غیر سرکاری — جو ادب کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ منٹو جیسے ادیب کی ایسی جماعتوں سے علیحدگی بہت بڑے معنی رکھتی تھی۔ منٹو کا الگ رہنا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ ادب ان چیزوں سے الگ ایک چیز ہے۔

منٹو اس طرح واقعی ہمارے ادب اور ہماری تخلیقی روایت کی پاسبانی کر رہا تھا۔ منٹو اگر علیحدہ ہے تو کوئی جماعت لوگوں کی نظر میں ادیبوں کی نمائندہ نہیں بن سکتی تھی۔ اب جو چاہے اٹھ کے ادب اور ادیبوں کی نمائندگی کر لے، کیونکہ منٹو کے قدو قامت کا کوئی ادیب ہمارے درمیان باقی نہیں رہا۔ چلیئے، منٹو کے مرنے سے بہت سے لوگوں کا کام آسان ہو گیا۔ لیکن اُردو ادب کا کام؟

منٹو نے اردو ادب کو کیا دیا کیا نہیں، یہ تو الگ بات ہے، لیکن ہمارا ادب آج کل جن حالات سے گزر رہا ہے، انہیں دیکھتے ہوئے تو منٹو کا اٹھ جانا ادب کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ منٹو چاہے کچھ لکھے یا نہ لکھے، اس کی موجودگی بذاتِ خود ایک اہمیت رکھتی تھی، اور یہ اہمیت آج کسی اور کو حاصل نہیں کیونکہ اس مقام پر پہنچنے کے لیے پوری عمر کی کاوش درکار ہے۔

میں تو منٹو سے زیادہ اپنے ادب کو رو رہا ہوں۔

(فروری ۱۹۵۵ء)

اَدب، ادیب اور طالب علم

تین چار مہینے ہوئے میں نے ادب اور طالب علموں کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "فی الجملہ" طالب علموں نے ادب سے تخلیقی دلچسپی لینی ترک کر دی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالے "راوی" میں اسی موضوع پر ایک اداریہ نکلا ہے جس میں میرے مضمون کا کچھ حصہ نقل کرنے کے بعد رسالے کے ایڈیٹر صاحب نے بتایا ہے کہ طالب علم کہ دیوانگی کی روایت کسی نہ کسی حد تک نبھائے چلے آ رہے ہیں، لیکن ادیب اپنی تحریروں سے مطمئن ہو گئے ہیں، اسی لیے ادب میں جمود اور بے کیفی پیدا ہوئی۔ "راوی" کے مدیر گردیزی صاحب کی یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن میں نے تو صرف ایک عام فضا کا ذکر کیا تھا۔ لاہور میں تو واقعی طالب علموں کا ایک گروہ ہمیشہ ایسا موجود رہتا ہے جو ادب کو تخلیقی انداز سے پڑھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن سوال تو ہماری درس گاہوں کی فضا کا ہے۔ اسی لیے میں نے "فی الجملہ" کہا تھا۔ جن طالب علموں کو اپنے ادب اور مغربی ادب سے تخلیقی دلچسپی ہے، ان کی تعداد پچھلے چھ سات سال میں بہت تھوڑی رہ گئی ہے، اور ان میں سے بھی زیادہ تر بس لاہور میں ہیں۔ بحیثیت مجموعی طالب علموں کے دو گروہ ہیں۔ بڑا گروہ تو وہ ہے جسے ادب سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ دوسرے گروہ کا حال یہ ہے کہ مغربی ادب تو درکنار، وہ آج سے دس سال پہلے کا بھی ادب نہیں پڑھتا بلکہ جو کچھ آج لکھا جا رہا ہے، اُسی کو ادب سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے طالب علم، ادیبوں سے کیا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال میں گردیزی صاحب کی اتنی بات مانتا ہوں کہ ادبی جمود کی ذمہ داری محض طالب علموں پر نہیں رکھی جا سکتی۔ اس میں سب سے زیادہ قصوروار تو ادیب ہی ٹھہریں گے کیونکہ ادب کو زندہ رکھنا سب سے پہلے انہی کا کام ہے۔ طالب علموں سے البتہ یہ شکایت ضرور جائز ہوگی کہ ہمارے معاشرے میں اور سب

طبقے تو ادب سے بے تعلق ہو ہی چکے تھے، ادب کو بس طالب علموں اور کلرکوں کا سہارا رہ گیا ہے، لیکن طالب علم اب ایک جماعت کی حیثیت سے ادب کی تخلیق میں وہ حصہ نہیں لے رہے ہیں جو آج سے پندرہ سال پہلے لیا کرتے تھے۔

گردیزی صاحب نے اپنے اداریے میں ایک سوال بڑا اہم اٹھایا ہے، اور وہ یہ کہ طالب علم اپنے مطالبات ادیبوں تک کس طرح پہنچائیں۔ انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ادبی مجلسوں میں یا کسی ادیب کے آس پاس طالب علموں کا نظر آجانا اس بات کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ انہیں ادب سے کس نوعیت کا لگاؤ ہے، پھر ادیبوں کو کس طرح پتہ چلے کہ طالب علموں کے مطالبات کیا ہیں؟

گردیزی صاحب کی رائے ہے کہ ادیب، طالب علموں کی تحریروں کا جائزہ لیا کریں۔ ادیبوں اور طالب علموں میں مفاہمت پیدا کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا اس کے بغیر طالب علموں کے مطالبات ادیبوں تک پہنچ ہی نہیں سکتے؟ میرے خیال میں تو یہ معاملہ بالکل رائے عامہ کا سا ہے۔ اگر طالب علم اور ادیب دونوں کے دونوں ایک ہی تخلیقی کاوش میں شریک ہوں تو اس قسم کے میکانکی طریقے استعمال کیے بغیر بھی ان دونوں طبقوں کے درمیان مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے، لیکن سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طالب علم فرداً فرداً نہیں بلکہ ایک جماعت کی حیثیت سے چند مطالبات پیدا کریں۔ پسند یا ناپسند کا طریقہ صرف یہ نہیں کہ طالب علم ادیبوں کے نام کھلے خط یا اعلان نامے شائع کریں۔ اگر طالب علموں کے پاس کوئی بات کہنے کی ہے تو وہ ادیبوں تک پہنچ ہی جائے گی، اور اس کے ہزار طریقے ہیں۔ ادیبوں کو متاثر کرنے سے پہلے طالب علموں کا کام یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو متاثر کریں اور اپنی اجتماعی شخصیت کو بکھرنے سے بچائیں۔

گردیزی صاحب نے تیسری بات "راوی" کے معیار کے متعلق کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر "راوی" کا معیار کچھ گر گیا ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ جو باہر کے ادیب اس پرچے میں لکھتے ہیں، ان کی تحریر میں وہ زور نہیں رہا، لیکن میں نے اپنے مضمون میں جن تحریروں کی تعریف کی تھی، وہ باہر کے ادیبوں کی نہیں بلکہ خود طالب علموں کی لکھی ہوئی تھیں۔ طالب علموں کے ان مضمونوں میں کم سے کم مجھے وہ ذہنی تجسس نظر آیا تھا جو اردو کے اچھے سے اچھے رسالوں میں نہیں ملتا۔ اگر "راوی" یہ معیار قائم نہیں رکھ سکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ طالب علموں میں جس ذہنی تجسس کے نمونے ملتے ہیں، اسے کوئی

استقلال حاصل نہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو ادیبوں کے پاس جائے بغیر طالب علم اپنے ذہنی مطالبات سے انہیں آگاہ کر سکتے تھے مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا ادب اس بے کیفی کی دلدل سے طالب علموں کی مدد کے بغیر نہیں نکل سکتا، اور طالب علم اس وقت تک ادب کی تخلیقی مدد نہیں کر سکتے جب تک وہ ایک جماعت کی حیثیت سے چند ذہنی مطالبات نہ رکھتے ہوں۔ اگر ایسے مطالبات واقعی موجود ہوں تو ادیبوں کی کیا مجال ہے جو اُن سے بھاگ سکیں۔

(اپریل ۱۹۵۵ء)

سودا کی ہجویات

بعض دفعہ اردو کے ادب پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی اقدار مغرب سے مستعار لی گئی ہیں اور مشرقی ادب کی اقدار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ حالی کے زمانے سے لے کر آج تک اردو کے پرانے اور نئے ادب پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان میں بہت سے انگلستان کے وکٹورین عہد کے زیر اثر ہوئے ہیں، مثلاً ہجوگوئی کے بارے میں جو رویہ حالی کے زمانے میں پیدا ہوا، وہ سراسر ۱۹ویں صدی کی انگریزی تنقید کا عکس ہے۔ اس سے پہلے ہجوگوئی کا درجہ غزل کی شاعری کے برابر نہ سہی لیکن ہجویہ شاعری کو ایسی شرمناک چیز نہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے سے بڑے شاعر ہجو کہتے تھے، اور اس سے ان کے شاعرانہ رتبے میں کوئی فرق نہ آتا تھا، بلکہ شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کو جس طرح غزل کے شعر یاد ہوتے تھے اسی طرح ہجویہ شاعری بھی پڑھے لکھے آدمی کے ذہنی کلچر کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حالی کے زمانے میں وکٹورین عہد کے انگلستان سے ثقاہت کا وہ تنگ و تاریک معیار مستعار لیا گیا جو مشرق میں کبھی رائج نہیں رہا۔ اس معیار کے مطابق ہجوگوئی پست ذہنیت اور اخلاقی گراوٹ کی نشانی قرار پائی۔ شاعری کی تعریف یوں ہوئی کہ یہ "فطری جذبات" کا اظہار ہے۔ اب اگر ان دو باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بیزاری، غصہ، جھنجلاہٹ یعنی وہ جذبے جن کا اظہار ہجو میں ہوتا ہے، فطری جذبے ہی نہیں ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے ثقہ تنقید نے ان جذبوں کو اور ان سے پیدا ہونے والی شاعری کو فطرت سے خارج کس طرح سمجھ لیا۔

ایک اور بات جو ثقہ تنقید نگار نہیں سمجھ سکے، یہ تھی کہ جس معاشرے میں اندرونی ہم آہنگی ہو، جہاں اقدار مسلمہ ہوں اور لوگ ان پر ایمان رکھتے ہوں، جہاں فرد

کسی افادی مقصد سے سماج میں شامل نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو سماج کا ایک نامیاتی حصہ سمجھتا ہو اور اپنے معاشرے سے بذاتِ خود غیر مشروط طریقے پر محبت کرتا ہو، وہاں ہجوگوئی یا طنز نگاری کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ مثال کے طور پر یونان اور روم یا اٹھارہویں صدی کے یورپ ہی کو لیجئے۔ ان معاشروں میں طنز اور ہجو کو ایک مقررہ حیثیت حاصل تھی، ان کو سماجی اصلاح کا آلہ کار سمجھا جاتا تھا اور طنز نگار شاعر کا ایک سماجی رتبہ تھا۔ طنز اور ہجو سے لوگ اس وقت نفرت کرتے ہیں جب اقدار کا نظام ٹوٹ گیا ہو اور کچھ لوگ ایک نظام قائم کرنا چاہتے ہوں، اور اس لیے اپنے آپ کو نہایت سنجیدہ اور ثقہ بنا کر پیش کریں۔ فرانسیسی ناول نگار — استاں دال کے ایک کردار نے نہایت معقول بات کہی ہے کہ:

"جس ملک میں دو جماعتیں ہوں، وہاں لوگ تضحیک سے ڈرنے لگتے ہیں۔"

غرض سودا کی ہجویات پر غور کرنے سے پہلے یہ بات نظر میں رکھیے کہ طنز نگاری کو ادب کی وقیع صنف صرف دو قسم کے معاشروں میں سمجھا جاتا ہے۔ یا تو اس معاشرے میں جہاں اندرونی ہم آہنگی ہو، یا پھر اس معاشرے میں جہاں کم سے کم ادیبوں نے یہ بات تسلیم کرلی ہو کہ اندرونی ہم آہنگی باقی نہیں رہی۔ اگر انگریزی ادب سے مثالیں لینی ہوں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یا تو ڈرائیڈن اور پوپ کے زمانے میں یا جیمز جوئس کے زمانے میں۔

ہجو نگاری کے اس عمومی بیان کے بعد اب آئیے سودا کی ہجویات کی طرف۔ سودا کی ہجو نگاری پر ثقہ لوگوں کو اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو غلط طریقے سے استعمال کیا ہے، کیونکہ ہجو ذاتی اور شخصی بغض و عناد کا اظہار ہے۔ لیکن اگر شخصی جذبات کے اظہار کی بناء پر ہجو نگاری مردہ قرار پاتی ہے تو اس الزام سے غزل کی شاعری بھی نہیں بچ سکتی، کیونکہ شخصی تجربے کے بغیر تو غنائیہ شاعری بھی پیدا نہیں ہوتی۔ ہجو ہو یا غزل سرچشمہ تو دونوں کا ذاتی تجربات ہی ہوں گے۔ اگر شاعر اپنے جذباتی تجربے کی قلب ماہیت کرنے کے بعد اسے شاعرانہ تجربہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے تو ہمیں اس کی ہجو نگاری کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ پھر دوسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ سودا نے جن لوگوں کی ہجو کی ہے، ان سے سودا کو ذاتی عداوت تو ضرور ہوگی لیکن جس طرح سودا نے ان لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے، اس سے شخصی جذبے کی نوعیت بدل کر غیر شخصی ہو گئی ہے۔ سودا کی ہجویات میں یہ لوگ محض افراد باقی نہیں رہے جن سے سودا کو چڑ تھی، بلکہ علامت کا رنگ اختیار کر گئے ہیں۔ یہ لوگ محض اشخاص نہیں ہیں بلکہ ان مکروہ سماجی رجحانات کے

نمائندے ہیں جو سودا کو اپنے چاروں طرف نظر آ رہے ہیں۔

یہ محض میری حاشیہ آرائی نہیں ہے بلکہ خود سودا کو اس چیز کا احساس تھا۔ مثلاً "ہجواسپ" کا دوسرا نام سودا نے "تضحیک روزگار" رکھا ہے۔ یہ نام سودا کی ہجویات کو مجموعی طور سے بھی دیا جاسکتا ہے کیونکہ سودا نے جس طرح لوگوں کا مذاق اڑایا ہے، اس میں چند اخلاقی اقدار شامل ہیں۔ اپنی ہجویات میں سودا محض اپنے عناد کا اظہار نہیں کر رہے تھے بلکہ جن اشخاص کو ہجو کا موضوع بنایا تھا، انہیں چند تہذیبی اور اخلاقی معیاروں کے اعتبار سے پرکھ رہے تھے۔ سودا نے اس ہجو کے اوپر کسی نہ کسی شخص کا نام تو ضرور لکھا ہے لیکن اس سے غلط نتیجہ مرتب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیز تو ہر ملک اور ہر معاشرے میں طنز نگاری کی روایت میں شامل رہی ہے اور ہجو نگاری کی دیانت داری اور ذہنی، اخلاقی جرات کی لازمی شرط ہے، بلکہ روم میں تو اس بات پر اصرار کیا جاتا تھا کہ ہجو نگار جس آدمی پر طنز کرے اس کا نام لے۔ یہ پست اخلاقی نہیں ہے بلکہ معاشرے کی صحت مندی کی دلیل ہے۔

صرف یہی چیز نہیں بلکہ تعصبات سے الگ ہٹ کر دیکھیے تو سودا کی ہجویات میں وہ ساری باتیں ملیں گی جو کلاسیکی طنز کے لیے ضروری ہیں، مثلاً پہلی بات تو یہی ہے کہ طنز نگار کو اپنے زمانے کی تصویر پیش کرنی چاہیے۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، سودا کی ہجویات اصل میں تضحیک روزگار ہیں۔ سودا میں وہ چیز نمایاں تھی جو ایک بڑے شاعر کے لیے ضروری ہے، یعنی اپنے زمانے کا شعور۔ اس کا اظہار ہجویات میں سودا نے دو طریقوں سے کیا ہے۔ ایک طرف تو افراد کی تصویریں ہیں جو زمانے کے مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً بخیل، پیٹو، ظالم کوتوال، جھوٹے شاعر اور عالم، نیم حکیم، شیخی خورے امیر، ہوس کے غلام شیخ جی۔ دوسری طرف شہر آشوب میں بھی انہوں نے اپنے معاشرے کی حالت پر خاص طور پر تبصرہ کیا ہے، لیکن دونوں جگہ ایک بات نمایاں ہے۔ یعنی کردار کا احساس۔ جن نظموں میں انہوں نے کردار کا خاکہ پیش کیا ہے، وہاں ان کا انداز تنقیدی نہیں رہا بلکہ تخلیقی بن گیا ہے، مثلاً میر ضاحک کی ہجو جہاں انہیں پیٹو کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ دو چار شعر دیکھیے۔

سنگریزے تلک نہ اس سے بچے
معدے میں تو اس کے پہاڑ پچے

آدھ سیر آٹے کا خدا ہے کفیل
پیٹ اس کا ہے عمرو کی زنبیل
جو اُسے یہاں بلاوے ہے
آفت اپنے گھر پر لاوے ہے
بولتا آوے ہے قدم بہ قدم
کھو کھانے کو جلد دیویں دم
مارے لقمے تو اس طرح بدذات
جیسے جھاڑے کوئی پٹے کے ہاتھ
دیگچی جب یہ چاٹ کر چھوڑے
منہ کو کھانے سے موڑے تو موڑے

آپ نے دیکھا کہ سودا کے یہاں ہجو نگاری، کردار نگاری بن جاتی ہے۔ پھر سودا کی ہجویات میں قصہ گوئی کا فن بھی ملتا ہے، اور لطف یہ کہ قافیوں کے استعمال کے باوجود کہانی کی روانی میں کوئی خلل نہیں پڑتا، مثلاً میر ضاحک کی ہجو میں بنیے کا قصہ اور ہجو اسپ میں میدانِ کار زار کا خاکہ۔ سودا کی شہر آشوب کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ وہ معاشرے پر عمومی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ نمائندہ کرداروں کو لے کر ان کی حالت دکھاتے ہیں مثلاً ؎

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزر ہے سدا یوں حلف و دانے کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے
سوداگری کیجئے تو ہے اس میں بھی مشقت
دکھن میں بکے وہ خرید صفہاں ہے
دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجئے کھیتی!
اور مینہہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے
ہیں خشکی وتری کے تفکر میں شب و روز
نہ امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے

پھر اس کے علاوہ سودا کی تضحیک روزگار میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں

قہقہے اور آنسو ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ سودا کی ہجو نگاری محض بغض و عناد کی پیداوار نہیں، بلکہ محبت اس کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہجو نگاری ایک پوری تہذیب کی مرثیہ نگاری بھی ہے۔

مثلاً شہر آشوب کے دو بند دیکھیے ؎

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کہ یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو تک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ رویئے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

سودا کی ہجویات میں صرف اپنے معاشرے کی محبت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور ٹھوس چیز موجود ہے۔ یعنی چند اخلاقی اقدار جن کی رو سے وہ اپنے معاشرے کو جانچتے ہیں۔ دراصل سودا کے قصائد اور ہجویات کو ملا کر پڑھنا چاہیے۔ تب جا کر سودا کی مجموعی تصویر سامنے آتی ہے۔ سودا کی ہجویات میں تو ان کی تنقید اور تضحیک ملتی ہے، لیکن جن اخلاقی معیاروں کی رُو سے یہ تنقید ہوئی ہے، وہ ہمیں قصائد میں ملتی ہیں۔ خصوصاً وہ قصائد دیکھیے جو سودا نے حضرت اسد اللہ غالب علیؓ ابن طالبؓ ۔ حضرت امام کاظمین۔ حضرت علی موسیٰ رضا اور حضرت امام عسکری کی منقبت میں لکھے ہیں۔

ان سب قصائد میں یہ بات مشترک ہے کہ سودا نے جن صفات کی خاص تعریف کی ہے وہ عدل قناعت اور ہمت ہیں۔ ان میں بھی وہ زور عدل پر دیتے ہیں جس کی بدولت شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگیں۔ یہ ہے وہ مثبت معیار جس کی رُو سے وہ اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں اور اس جائزے کا نتیجہ اپنی ہجویات میں پیش کرتے ہیں۔ جب تک ان دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ نہ دیکھا جائے، ہم سودا کی ہجو نگاری کی روح کو نہیں

سمجھ سکتے۔ ان کی ہجو نگاری محض ناپسندیدہ یا منفی جذبات کا مظاہرہ نہیں بلکہ اس کا محرک ایک اخلاقی جذبہ ہے جو ٹھوس اخلاقی معیاروں کی روشنی میں اپنے معاشرے پر تخلیقی تنقید کرتا ہے۔ یہ ہجو نگاری ذہن اور شخصیت کی پستی نہیں بلکہ سوزِ دروں ہے۔

(مئی ۱۹۵۵ء)

پچیس سال کے ادب کا جائزہ

پچھلے ۲۵ سال کے عرصے میں کون کون سی ادبی تحریکیں چلیں، انہوں نے کس قسم کی تخلیقات پیش کیں، ان تخلیقات کا اردو میں کیا درجہ ہو گا، ان کے ذریعے ہمارے ادب میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور کوئی اضافہ ہوا بھی یا نہیں؟ یہ سب سوال اپنی جگہ نہایت اہم ہیں مگر میں اس پچیس سال کی مدت کے سلسلے میں صرف تاریخی نقطۂ نظر اختیار نہیں کر سکتا، کیونکہ ادب سے میری دلچسپی نہ تو عالمانہ رنگ کی ہے نہ تحقیقی رنگ کی کوئی پندرہ سال سے میں اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ مجھے لکھنا آجائے۔ اس کوشش نے مجھے یہی بتایا ہے کہ اگر آدمی لکھنا سیکھ سکتا ہے تو اپنے زمانے کے دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ مل کر، اکیلے نہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال میرے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ میرے زمانے میں دوسرے لوگ کیا لکھ رہے ہیں، کیسے لکھ رہے ہیں اور اپنے کام کے متعلق ان کا رویہ کیا ہے۔ شاید یہ سوال اور بھی اہم ہے کہ وہ کن لوگوں کے لیے لکھ رہے ہیں اور ان سے لکھوانے والے کون لوگ ہیں۔ یوں تو اپنے پیر مغاں ایذرا پاؤنڈ نے یہ بھی کہا ہے کہ لکھنے والا بنیادی طور پر تنہائی کا شکار ہوتا ہے اور اس وقت بولتا ہے جب اس سے خاموش نہیں رہا جاتا۔ یہ بات کسی نقاد نے نہیں کی بلکہ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے انگریزی شاعر نے کہی ہے، اس لیے غلط بھی ہوتی تو میں مان لیتا ۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبوذ ز راہ و رسم منزلہا

لیکن اگر ہم ایک ایسا معاشرہ فرض کر لیں جو ادیب کو اپنے اظہار کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہو تو غالباً لکھنے والے کا رویہ اپنے فن کے متعلق یہی ہو گا۔ ایسے معاشرے میں لکھنے والا ایک حد تک اس سوال سے بے نیاز رہ سکے گا کہ میں کن لوگوں کے لیے لکھ رہا

ہوں اور ان سے میرا کیا رشتہ کیا ہے، پھر ادیب پر معاشرے کے جو اثرات پڑتے ہیں ان کو ایک مسلمہ امر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں تو ہر زمانے کے ادیب کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے؟ خیر یہ تو تخلیقی عمل کا ایک رخ ہوا۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ایذرا پاؤنڈ نے پیش کر دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں تصویر یا نظم دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ جس معاشرے میں اس کی تخلیق ہوئی وہاں شرح سود کیا تھی یعنی معاشرہ ادیب کی ضرورت محسوس کرتا ہے یا نہیں، اسے کس حد تک اور کن شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہے، ادیب کے کام میں مدد کرتا ہے یا کھنڈت ڈالتا ہے۔ یہ باتیں معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور ادب پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر ادیب فاقے کرتے ہوئے یا مرتے ہوئے بھی حقیقی معنوں میں ادبی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں تو شاید ہم اس سوال کو اہم نہ سمجھیں یا بالکل ہی نظرانداز کر دیں کہ ادیب کن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آج کل کی طرح کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو چکی ہو جس پر ازلی جمود کا شبہ ہو سکے تو پھر دوسری چیزوں کے تجزیے کے ساتھ ساتھ یہ سوچنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ادیب جو چیزیں لکھتے ہیں، ان کے پڑھنے والے کون اور کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ ادیب سے کیا مطالبات کرتے ہیں اور ان کی نظر میں ادیب کی حیثیت کیا ہے۔ اسی لیے میں نے پچھلے ۲۵ سال کے اردو ادب پر غور کرنے کے لیے ایک ایسا موضوع چھانٹا ہے جو قطعاً غیر ادبی ہے، بلکہ ممکن ہے کہ ادب کے مورخوں اور عالموں کے لیے غیر ضروری ہو لیکن تخلیقی فنکار کے نقطہ نظر سے حال یہ ہے کہ ونڈھم لوئیس جیسے شخص کو جس کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہونے لگا ہے، یہ کہنا پڑا کہ اگر مجھے ایسا ماحول میسر آتا جہاں میری کتابیں زیادہ تعداد میں بکتیں تو میری تحریر میں اتنی خامیاں نہ ہوتیں جتنی اب ہیں۔ میر کے متعلق تو خیر کسی نے طنزاً ہی کہا تھا کہ

اپنا دیوان بغل میں داب کے میر
کہتے پھریے کہ کام شاعر کا

لیکن یہ بات دراصل ہر لکھنے والے کے متعلق صحیح ہے۔ کسی دور میں لکھنے والے کو اپنے خریدار گھر بیٹھے مل جاتے ہیں اور کسی دور میں ڈھونڈنے پڑتے ہیں، لیکن اس کا کام ایسے لوگوں کے بغیر نہیں چلتا جو کسی نہ کسی طرح اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں، چنانچہ اردو کے پچھلے ۲۵ سال کے بارے میں مجھے بھی یہی غور کرنا ہے کہ ادب کا اپنے

پڑھنے والوں سے کیا رشتہ تھا۔ اس ۲۵ سال کے دور کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے میر کی کیفیت دیکھتے چلئے ۔

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

اس شعر میں تو میر نے اپنی ذاتی زندگی اور اپنی شاعری کا تعلق واضح کیا ہے۔ ابھی پڑھنے والوں کا کوئی ذکر نہیں۔ اس شعر کی حدوں میں رہتے ہوئے ہم تخلیقی عمل کے متعلق یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ شاعر کو چند تجربات حاصل ہوئے جن کی معنویت ڈھونڈنے اور جن کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش میں اس کی پوری عمر صرف ہوئی ہے۔ اگر اس شعر کے سوا میر نے اپنے تخلیقی عمل کے متعلق اور کچھ نہ کہا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ شعران کے نزدیک ایک فرد کی ذاتی زندگی کا اظہار ہے، اور فن نہ تو برائے زندگی ہے نہ برائے فن بلکہ برائے شاعر۔ لیکن میر نے ایک اور جگہ دوسروں سے اپنی شعر گوئی کے تعلق کا بھی حال بیان کیا ہے ۔

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعری میں میر
یہ میرے شور نے رُوئے زمیں تمام لیا

اس شعر میں میر نے وہ پہلی بات بھی دہرائی ہے کہ شاعر دوسروں سے الگ ہو کر اپنے تجربات ہضم کرتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر میر نے یہ بھی بتایا ہے کہ دوسرے بھی اور کچھ نہ سہی تو سامعین کی حیثیت سے یا اثر پذیر ہونے والوں کی حیثیت سے تخلیقی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ شاعر کا شور روئے زمین اسی وقت لے سکتا ہے جب وہ اپنے تجربات کے ساتھ میں دوسروں کے تجربات کی بھی تشکیل کر رہا ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اور اس کے اجتماعی گروہ کے درمیان چند چیزیں مشترک ہوں، شاعر انہیں اپنی سمجھ کر قبول کرتا ہو، اور اس کا اجتماعی گروہ بھی اس کو اپنا ذریعہ اظہار سمجھ کر قبول کرتا ہو۔ یہ بات کسی حد تک میر کو حاصل تھی، بعد میں آنے والے اردو ادیبوں کو حاصل نہیں رہی۔ اچھا، میر نے اپنے تخلیقی عمل کا سلسلہ ایک اور چیز سے بھی ملایا ہے ۔

ریختہ رتبے کو پہونچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

یہاں آ کر دو عوامل ایک ہو گئے ہیں۔ ایک طرف تو شاعر کی جدوجہد ہے کہ وہ

اپنے تجربے کو الفاظ کی شکل میں لائے۔ دوسری طرف زبان اور اس کی روایت کی جدوجہد ہے کہ انسانی تجربات کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کی الفاظ اور محاوروں کے ذریعے تعریف پیش کی جائے۔ اگر کسی شاعر کے یہاں یہ دونوں کوششیں آپس میں حل ہو کر ایک ہی عمل بن جائیں تو اس کی تخلیقی سرگرمی زبان کے ماضی کو اپنے اندر جذب کر کے مستقبل کی آئینہ داری شروع کر دیتی ہے۔

اس طرح تخلیقی عمل میں تین چیزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ایک تو ادیب کی ذاتی شخصیت، دوسرے معاشرے کی اجتماعی شخصیت، تیسرے زبان کی شخصیت۔ یہ تینوں شخصیتیں میر کے یہاں ایک ہو گئی تھیں لیکن پچھلے سو سال سے اردو ادب میں تتر بتر ہوتی چلی گئی ہیں۔ خصوصاً پچھلے چالیس سال کے عرصے میں ایسے ادیبوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے جنھوں نے اپنے ذاتی تجربات کی تشکیل کے سلسلے میں خود زبان کے شعور میں بڑا اضافہ کیا ہو۔ معاشرے سے ادیب کا چاہے کوئی بھی رشتہ رہا ہو مگر فی الجملہ ادیب کی جدوجہد اور زبان کی جدوجہد میں جو وحدت ہونی چاہیے وہ ضرور ختم ہو گئی۔

اچھا اب اصل موضوع کی طرف آیئے۔ ۲۵ سال کا یہ دور جس پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں، ۳۰ کے قریب شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو ادیب ایک چھوٹے سے طبقے کے لیے اور ان کی دلچسپیوں کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ یہ صورت حال اردو میں بالکل نئی ہے۔ سرسید اور حالی کے زمانے میں ادیب کا تخاطب صرف چھوٹے سے پڑھے لکھے طبقے سے نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے سرسید اور ان کے ساتھی ہر مسئلے کو متوسط طبقے کی نظر سے دیکھتے ہوں اور اسی طبقے کی بھلائی کی باتیں سوچتے ہوں مگر اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے ہی سہی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم پوری قوم سے خطاب کر رہے ہیں، پھر اس زمانے میں نثر کی حد تک کم از کم یہ تقسیم شروع نہیں ہوئی تھی کہ فلاں چیز ادب ہے، فلاں نہیں۔ سیاست، تاریخ، فلسفہ، اخلاق، مذہب غرض پڑھے لکھے لوگوں کی اس زمانے میں جتنی بھی دلچسپیاں تھیں، سب کے متعلق لکھا جاتا تھا اور ایسی تحریروں کا شمار ادب میں ہوتا تھا۔ پڑھنے والوں کا ادیبوں سے مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ ہماری جتنی بھی ذہنی دلچسپیاں ہیں، ان سب کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ لیکن جب ہمارے یہاں جمال پرستی کی تحریک چلی تو ادبِ لطیف، ادب اور غیر ادب کی تفریق پیدا ہوئی۔ اب لکھنے والے ہر پڑھنے والے کے لیے نہیں بلکہ صرف اُن لوگوں کے لیے لکھنے لگے جو اس زمانے کے معیار کے مطابق

حساس اور باذوق تھے۔ اس ادب کے پڑھنے والے اور لکھنے والے، دونوں یہی سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں سے بلند ہیں۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر زبان اور پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا جس کا عام آدمی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ممکن ہے ظاہری طور پر یہ لوگ بھی کبھی کبھی اخلاق، مذہب، تاریخ، سیاست سے دلچسپی لیتے نظر آئیں، لیکن فی الجملہ یہ ادیب اپنے آپ کو فلسفی کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے اور فلسفے کا مطلب تھا کوئی ایسی بات کہنا جو عام اعتقادات کے خلاف ہو، مثلاً شیطان کی تعریف کر دی، گناہ کے تصور سے انکار کر دیا وغیرہ۔ جو لوگ ایسی تحریریں پڑھتے تھے، ان کا مطالبہ اپنے ادیبوں سے یہ تھا کہ ہمیں ایسی باتیں رٹا دیجیے جنھیں سن کر لوگ چونکیں اور ہمیں ملعون مردود یعنی اپنے سے مختلف سمجھنے لگیں۔

۳۵ء کے قریب مزاح نگاری نکلی۔ مزاح نگار جمال پرستوں کی بہ نسبت عام آدمیوں سے قریب تھے۔ لکھتے یہ بھی تھے ایک محدود طبقے کے لیے، مگر ان کے پڑھنے والوں کو حساس یا باذوق کہلانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ ان کی تحریروں کا مقصد ہنسنا ہنسانا اور تفریح طبع تھا۔ انھیں فلسفے یا تاریخ یا مذہب سے کوئی گہرا لگاؤ نہ تھا۔ ان کا موضوع تو متوسط طبقے کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تھے جن پر ہنسا جا سکے، اور ہنسنے کے بعد ذہن سے خارج کر دیا جائے، مثلاً عظیم بیگ چغتائی کے ہاں لڑکے لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ یا دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں میاں بیوی کے جھگڑے اب پڑھنے والوں کا مطالبہ تھا کہ ادیب تھوڑی دیر کے لیے ان کا دل خوش کر دیں اور بس اِس کے سوا ادب کا زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ۲۰ء سے ۳۶ء کے دور تک بھی ایسے ادیب بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے شراب کے سہارے یا بے خودی کے بہانے ادب کا نام لیتے ہوئے اپنی زندگی برباد کر دی۔ لیکن بحیثیت مجموعی لکھنے لکھانے کو فرصت کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ لکھنے والے ادب کو اچھے یا بُرے معنوں میں اپنی زندگی نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی بڑی یا چھوٹی ملازمت کرتے اور جب دفتر کے بعد وقت خالی بچتا تو حقہ پینے یا گپ اڑانے کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی شغل ہو جاتا۔ ادب کے ذریعے روزی کمانے کا خیال تو بھلا کس کو آ سکتا تھا۔ عام طور سے ان دنوں ادیبوں کو کسی قسم کا معاوضہ نہ ملتا تھا۔ وہ اسی کو بہت سمجھتے تھے کہ ہماری کوئی چیز چھپ گئی اور تھوڑی بہت شہرت حاصل ہوئی یعنی ادب کو معاشرے میں شطرنج کی سی حیثیت حاصل تھی، اس لیے ادیب کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے جس سے دماغ پر زور پڑے۔ ادب میں

سنجیدہ ذہنی دلچسپیاں بالکل خارج از بحث تھیں۔ ادب کا اجتماعی یا ذاتی زندگی پر بھی کوئی اثر پڑ سکتا ہے، اس قسم کا سوال نہ تو لکھنے والوں کے ذہن میں پیدا ہوا تھا نہ پڑھنے والوں کے ذہن میں۔

۳۶ء کے بعد ادب میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں، ان کے اسباب سے مجھے فی الحال سروکار نہیں۔ لیکن ادب کے متعلق لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے ذہن میں جو نئے تصورات پیدا ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ادب کسی ایک طبقے کے لیے نہیں بلکہ ہر آدمی کے لیے ہے۔ اس قسم کا ادب چاہے پیدا نہ ہوا ہو، بہرحال میں ایک رجحان، ایک سمت کا ذکر کر رہا ہوں۔

۲۔ ادب کا موضوع ہر چیز ہو سکتی ہے۔

۳۔ ادب سے تعلق رکھنے والوں کی ذہنی دلچسپیاں وسیع ہونی چاہیں۔ یہ اصول چاہے حقیقت نہ بن سکا ہو مگر نوجوان ادیبوں نے تھوڑی بہت کوشش کی ضرور۔

۴۔ ادب صرف بیکاری کا مشغلہ نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے، بعض لوگوں نے دعوئ کیا کہ ادب کے ذریعے پوری زندگی بدلی جاسکتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے چاہے زندگی بدلے نہ بدلے، ادب بجائے خود اہم ہے۔ بہرحال اس دور میں ادب محض تفنن طبع کی چیز نہیں ہے۔

۵۔ ادب لکھنے والے سے پوری زندگی مانگتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ ادب شراب کے نشے میں یا اپنے روحانی کیف میں غین پڑا رہے، بلکہ ادیب کو تخلیق کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے ادیبوں نے واقعی اس بات پر عمل کیا، مگر یہ چیز ہماری ادبی تحریک کے بنیادی تصورات میں سے تھی۔

۶۔ حالانکہ ادیب اس بات پر بھی تیار تھے کہ پیٹ بھرنے کے لیے کوئی اور کام کر لیں، لیکن ان کا مطالبہ تھا کہ ہم ایک اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں اس لیے ہمیں اپنے کام کا معاوضہ ملنا چاہیے، چنانچہ ادیبوں نے تھوڑے دن یہ کوشش کر کے بھی دیکھی کہ ہم صرف ادب کے سہارے زندہ رہیں۔ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ میرا موضوع بالکل غیر ادبی اور متبذل رہے گا، اس لیے میں اس آخری بات کو اتنی اہمیت دوں گا جتنی آپ شاید نہ دینا چاہیں، مگر میں اس نئے ادب کی تحریک کا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں کہ اس نے تھوڑے دن کے لیے ہی سہی، بہرحال ادیبوں کے دل میں اپنی اور اپنے کام کی اتنی

عزت پیدا کر دی کہ انہوں نے صرف ادب کے لیے اور ادب کے سہارے زندہ رہنا چاہا۔ یہ خواہش ادب اور ادیب کی آزادی کا پروانہ ہے۔ جمہوری معاشرے میں ادیبوں کی ایک ایسی چھوٹی موٹی جماعت کا موجود ہونا ضروری ہے کہ جو معاشی طور پر اپنے پڑھنے والوں کے سوا کسی اور کی دست نگر نہ ہو۔ یہ صرف ادب کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے پہلوؤں سے بھی صحت مندانہ سماجی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ یہاں دو باتیں اور یاد رکھنے کی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ سے ایک نوجوان ادیب نے پوچھا تھا کہ اگر میں اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دوں تو ادب کے ذریعے روٹی کما لوں گا یا نہیں۔ پاؤنڈ نے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے، لیکن پہلے یہ طے کر لیجئے کہ روٹی کمانے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادیبوں کا ادب کے ذریعے فی الحقیقت روٹی کمانا اتنا اہم نہیں جتنا اس امکان کا موجود ہونا۔ دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی آدمی سے پوری زندگی چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ اس کام میں اپنی پوری زندگی لگانے سے یوں ڈرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ کر کے دکھانے سے پہلے ہی بھوکوں مر جائیں گے۔ اگر آدمی کو اتنا بھروسا ہو کہ ادب میں پڑھ کر بھی فاقوں کی نوبت نہیں آئے گی تو زر اندوزی کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی درجنوں ایسے نوجوان نکل آئیں گے جو ادب کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ آج ہمارے یہاں نہ ادب کی عزت باقی رہی ہے نہ ادیب کے کام کی۔ مجھے یہ ادب بہت بڑی چیز معلوم ہوتا ہے، نئے ادب کی تحریک میں ہزار خامیاں سہی، لیکن یہ جرات اسی تحریک نے پیدا کر کے دکھائی، اور اس اصول کا ادب پر جو اثر پڑا اس کا اندازہ منٹو، عصمت، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فیض، میراجی کی تحریروں سے کر لیجئے۔ جو لوگ سرے سے ہی اس تحریک کے خلاف تھے، انہیں تو خیر چھوڑیے، لیکن جو لوگ اس تحریک سے متعلق رہے، ان پر جتنی شدید نکتہ چینیاں اس دور میں، میں نے کی ہیں اتنی شاید ہی کسی اور نے کی ہوں۔ اس کے باوجود مجھے فخر ہے کہ میں نے اردو ادب کا وہ دور دیکھا ہے کہ جب نوجوان ادیبوں نے ادبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ معاشی اعتبار سے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی تھی۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک ادیبوں کا ایک الگ طبقہ نہیں بنا تھا۔ لکھنے والے پڑھنے والوں سے ڈرتے نہ تھے اور اسی طرح پڑھنے والے بھی لکھنے والوں کو اپنی زندگی کا ایک حصہ خیال کرتے تھے۔ پھر ۴۵ء تک نقادوں کا ایک الگ طبقہ بھی وجود میں نہ آیا تھا جو ادیبوں اور پڑھنے والوں کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتے۔

ادیبوں کو نقادوں کے ذریعے نہیں بلکہ براہ راست پڑھنے والوں سے پتہ چلتا تھا کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں۔ اس باہمی اعتماد کی وجہ سے ادیبوں کو بھروسا رہتا تھا کہ اگر ہم اچھا لکھیں گے تو پڑھنے والے ہماری پشت پناہی کریں گے۔ اس بھروسے نے تھوڑے دن کے لیے ادیبوں میں یہ ہمت پیدا کر دی تھی کہ وہ سوچنے لگے تھے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہے تو بھی ادب کا سہارا کافی ہے۔ لیکن ادب میں سیاست بازی کے دخل اور نقادوں کی بہتات نے دو تخلیقی گروہوں یعنی پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کا تعاون ختم کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ آج مجھے ادیبوں کی موجودہ حیثیت کے متعلق کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے چونکہ یہ "ساقی" کا جوبلی نمبر ہے اس لیے اگر میں دو چار جملے شاہد احمد صاحب کے بارے میں بھی کہہ دوں تو بے جا نہ ہو گا کہ اگر ادیبوں کے دل میں اپنے کام کا احترام اور اس کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا خیال پیدا ہوا تو یہ ایک ادبی تحریک کے طفیل ہوا۔ لیکن اس ایک جذبے کو سہارا دینے میں شاہد صاحب نے ایک ناشر کی حیثیت سے جو خدمت انجام دی، غالباً اس کی پوری رُوداد کبھی تحریر میں نہیں آئے گی۔ اسی لیے میں اس موقع پر اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر شاہد صاجب نہ ہوتے تو چار چھ سال کے لیے بھی ادیبوں کے حوصلے بلند نہ رہ سکتے تھے — ادیبوں نے جس زندگی کا خواب دیکھا تھا، شاہد صاحب نے اپنی بساط بھر اسے حقیقت بنانے پر کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن اب تو وہ زمانہ بھی میر کا زمانہ ہو گیا۔

(جون ۱۹۵۵ء)

قارئینِ ادب اور تخلیقی عمل

تخلیقی صلاحیت کا اصل منبع انفرادی طور سے ادیب کی ذات ہے یا اجتماعی طور سے پڑھنے والوں کی شخصیت، اس سوال کا جواب شیکسپیئر کیا دیتا، یہ تو ہم معلوم نہیں کر سکتے لیکن اردو کے بہت سے ادیبوں کے نزدیک خود ان کی ذات تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ میں چونکہ باقاعدہ ادیب نہیں، کبھی کبھار لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس امید میں رہتا ہوں کہ اگر پڑھنے والے مدد کریں تو میں اور مجھ سے معمولی لکھنے والے کچھ بہتر لکھ سکتے ہیں، اس لیے میں کہتا رہتا ہوں کہ تخلیقی صلاحیت دراصل پڑھنے والوں میں ہوتی ہے پھر مجھے یہ بھی یقین رہا ہے کہ ذہنی اعتبار سے پڑھنے والوں کی حالت اتنی خراب نہیں ہوئی جتنی ادیبوں کی ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت پڑھنے والوں نے منٹو کی موت کے بعد دے دیا۔ یوں ادب کی موجودہ حالت سے تو سبھی بدظن یا غیر مطمئن ہیں، لیکن اگر ادیبوں کے دل میں اچھا لکھنے کی خواہش ہوتی تو وہ اس سلسلے میں کچھ کرتے، مثلاً ایک کرنے کی چیز تو یہی تھی کہ سارے ادیب بالجہر نہ سہی اپنے دل میں ہی یہ اعتراف کر لیتے کہ ہم سب کے سب معمولی صلاحیتوں کے لوگ ہیں، مگر اشتراک اور تعاون کے ذریعے معمولی صلاحیتوں سے بھی پورا کام لیں گے۔ اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ دو دو چار چار کے گروہوں میں بٹ کر من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کرنے کے بجائے افسانے اور نظمیں سامنے رکھ کر یہ سوچا جاتا کہ قابل قدر یا نئی چیزیں کہاں ملتی ہیں کہاں نہیں ملتیں، اور خامیاں کس قسم کی ہیں یعنی تعریف یا تنقیص کے بجائے ایک دوسرے کی کاوشوں کی نوعیت اور سمت متعین کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کے بجائے ہمارے ادیب نئے پودنے اور پرانے پودنے بنتے پھرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ پڑھنے والے اپنے ادیبوں سے بالکل ہی اکتا چکے ہیں۔ رسالوں کے موٹے موٹے خاص نمبر جو اتنے مقبول ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ

پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ آج کل نہ تو نئے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں نہ موجودہ لکھنے والوں سے کوئی امید وابستہ کی جاسکتی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ پرانے ادب کے متعلق گپ شپ سے ہی دل بہلایا جائے۔ جو لوگ ادیب بن چکے ہیں، انھیں اپنی پگڑی سنبھالنے کی فکر ہے، جو لوگ ادیب بننا چاہتے ہیں، وہ ادیب بننے کا ارادہ کرنے کے بعد ہی بے فکر ہو جاتے ہیں کہ ہم تو اردو ادب میں لافانی ہو ہی گئے، پڑھنے والے دونوں گروہوں سے بے نیاز ہیں، انھیں یہ تماشا دلچسپ تک نہیں معلوم ہوتا۔

اس قسم کے ''ادب'' سے بے تعلقی برت کے پڑھنے والوں نے اپنی صحت مندی کا ثبوت تو ضرور دیا ہے لیکن اپنی تربیت کی طرف وہ بھی متوجہ نہیں ہوئے۔ پچھلے پندرہ برس کے عرصے میں جو چیز پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت کی طرف وہ بھی متوجہ نہیں ہوئے۔ پچھلے پندرہ برس کے عرصے میں جو چیز پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت میں جارح رہی ہے، وہ ادیب بننے کا شوق ہے۔ پھر اس زمانے میں ادیب بننا آسان بھی رہا ہے، لیکن موٹے موٹے خاص نمبروں کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اب ہر مہینے دو چار نئے پھول کھلے بند ہو گئے اور اگر یہی حال رہا تو شاید نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ خیر، بعض لوگ تو اس وقت بھی ہمیں یہی یقین دلاتے رہیں گے کہ اردو ادب زندہ ہے۔ بہر حال اس وقت دو تین مہینے کے اندر لافانی ادیب بن جانے میں جو دقتیں پیش آ رہی ہیں، ان سے اردو ادب کو یہ فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ پڑھنے والے اپنی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ پڑھنے والے پڑھنا سیکھیں۔ ادیب بننے کے لیے نہیں، بلکہ محض پڑھنے کے لیے کیونکہ یہ خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں تو مدرسوں کی سی باتیں کر رہا ہوں لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پندرہ بیس سال سے اردو ادب طالب علموں اور کلرکوں ہی کے دم سے قائم ہے۔ اگر طالب علموں سے کہا جائے کہ پڑھنا سیکھو تو اس میں ان کی ہتک نہیں ہوتی، ادیبوں کی بھی اس سے مدد ہوتی ہے۔ ادیبوں کی انجمنیں تو بنتی ہی رہی ہیں اور کم سے کم آج کل کچھ نہیں کر رہی ہیں، اب تو پڑھنے والوں کے گروہ بننے چاہئیں۔ لڑنے لڑانے اور بٹیر بازی کے لیے نہیں، بلکہ ساتھ مل کر پڑھنے کے لیے اس سے میری مراد یہ ہے کہ سات آٹھ دوست صدر اور سیکرٹری کا انتخاب کیے بغیر ایک حلقہ بنالیں جس میں لوگ کتابیں اور رسالے پڑھ کر تبادلہ خیال کیا کریں۔ ادبی گپ شپ تو حلقہ بنائے بغیر بھی ہو سکتی ہے، لیکن اگر التزاماً لوگ اس کام کے

لیے جمع ہوں اور ایک دوسرے سے استفادہ کریں تو پڑھنے والے اپنی ذہنی تربیت خود کرسکتے ہیں لیکن ایسے حلقے کا بنیادی مقصد یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کے سب رکن ادیب بن جائیں گے، یہ تو ثانوی چیز ہے۔ ایسے حلقے میں تو وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو محض پڑھنے کو ایک قابل قدر سرگرمی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان حلقوں میں نہ تو ادیبوں کو آنے کی اجازت نہ پروفیسروں کو۔ یہ دو طبقے ایسے ہیں کہ جہاں ان لوگوں کا قدم پہنچا ادب رخصت ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ حلقے یا تو طالب علم بنائیں گے یا کلرک۔ طالب علموں اور کلرکوں، دونوں میں اتنی ذہنی تازگی موجود ہے کہ وہ پڑھنے اور بحث کرنے کے طریقے خود نکال سکتے ہیں۔

یہ میری تجویز نہیں ہے بلکہ کراچی میں تو آٹھ دس طالب علموں نے آج کل کی ادبی فضا سے اکتا کر اس قسم کا ایک حلقہ قائم کر بھی لیا ہے ہو سکتا ہے کہ اور شہروں میں بھی طالب علموں کو اس کا خیال پیدا ہوا ہو۔ اگر ایسے حلقوں میں کچھ اس قسم کا تعاون پیدا ہو سکے جیسا کہ ٹکٹ جمع کرنے والوں میں ہوتا ہے تو بھی یہ صورت ہمارے ادبی ماحول کے لیے نہایت سازگار ہو گی۔ فضول تعلی کی ضرورت بھی کیا ہے، اگر پڑھنے والوں کو اپنے اس شوق سے اتنی دلچسپی اور انہماک پیدا ہو گیا جتنا ٹکٹ جمع کرنے والوں کو ہوتا ہے تو بھی غنیمت ہے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ ٹکٹ جمع کرنے والوں کو ملکوں کے نام تو یاد ہوتے ہیں، ہمارے ادیبوں کو تو اپنے سوا اور کسی مصنف کا نام بھی نہیں آتا۔

غرض، ادبی جمود کا ایک ہی علاج ہے کہ پڑھنے والے اپنا ذہنی جمود ختم کریں کم سے کم وہ لکھنے والوں سے اتنا تو کہہ سکیں کہ ہمیں لکھنا نہیں آتا تو نہ آئے، پڑھنا تو آتا ہے۔ لکھنے والوں میں تو باہمی رقابت کی وجہ سے اشتراک اور تعاون پیدا نہیں ہو سکتا، پڑھنے والوں کے درمیان اشتراک ایسی مشکل چیز نہیں۔ اگر ٹکٹ جمع کرنے والے شہر در شہر انجمنوں کا سلسلہ قائم کرسکتے ہیں تو پڑھنے والے بھی آٹھ آٹھ دس دس کی جماعتیں بنا سکتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو واضح طور سے معلوم ہو جائے کہ ہمیں کیا پڑھنا چاہیے تو لکھنے والوں کو بھی جلد یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا، یا پھر انہی پڑھنے والوں میں سے نئے لکھنے والے بھی نکل آئیں گے۔

(جولائی ۱۹۵۵ء)

یونگ اور جعلی روحانیت

نفسیات کے ایک نئے مدرسہ فکر کے بانی یونگ اسی سال کے ہو چکے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کی برسی مختلف طریقوں سے منائی گئی ہے۔ مثلاً انگلستان میں لوگوں نے ان کے نام پر ایک ٹیم بنا کے کرکٹ کا میچ کھیل ڈالا۔ اگر امریکہ میں اسی قسم کا اعزازی بیس بال کا میچ ہوا ہو گا تو مس میرلن منرو نے بھی ضرور شرکت کی ہوگی۔ یونگ کی سالگرہ کے موقع پر امریکن اخبار نویسوں نے بتایا ہے کہ پیغمبر ہونے کے باوجود جب وہ شام کو ٹہلنے کے لیے نکلتے ہیں تو سڑک پر بچوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں، اور خیرو عافیت پوچھتے ہیں۔ اپنی صحت کا بھی انہیں بڑا خیال ہے۔ ورزش کے لیے روز تیسرے پہر لکڑی چیرتے ہیں۔ گھر کے آس پاس دیہاتی رہتے ہیں، سب کے سب ان کی خوش اخلاقی کے معترف ہیں۔ سر ہربرٹ ریڈ ان کی تصنیفات کے مجموعے مرتب کر رہے ہیں، اور ان کے پڑوسی کرسمس کے دن انہیں تحفے بھیجنا کبھی نہیں بھولتے۔ علاوہ ازیں انہوں نے "ٹائم" کے نامہ نگار کو بتایا ہے کہ مجھے ہنسنے کا بھی بہت شوق ہے، کیونکہ اتنی زبردست علمی محنت کے بعد دو چار دفعہ ہنس لینے سے تھکن دور ہو جاتی ہے۔ اس انٹرویو کے دوران میں انہوں نے ایک قہقہہ لگایا تھا اور لطیفہ بھی خود ہی فراہم کیا تھا۔ وہ زعفران کا کھیت یہ تھا — "میری باتیں بہت مشکل اور دقیق ہوتی ہیں" — بہرحال علمی حلقے (جن میں امریکہ کا اخبار "ٹائم" بھی شامل ہے) یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہیں کہ یونگ پیغمبر، عالم اور محقق تو ہیں ہی، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔

لیکن یہ عظیم انسان اسی سال کی عمر میں بھی ایک معمولی انسان کی چھوٹی سی گستاخی معاف نہیں کر سکا۔ یونگ کی پرورش روک فیلو کی بیٹی کی سرکار سے ہوتی تھی۔ اس دربار میں یونگ کی حیثیت بازی گر کی تھی۔ یعنی جو آدمی دربار میں پہنچا، اسے حکم ملا کہ یونگ

سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کراؤ۔ ایذرا پاؤنڈ نے جوئس کو بھی ان محترمہ سے وظیفہ دلوایا تھا تاکہ وہ اپنا پورا وقت اپنے ناول پر صرف کر سکے۔ بیگم صاحبہ نے جوئس کو حکم دیا کہ تم بھی یونگ سے اپنا تجزیہ کراؤ۔ جوئس نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی سزا یہ ملی کہ وظیفہ بند ہو گیا۔ مگر جوئس نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ یہ واقعہ کوئی تیس سال پہلے کا ہے لیکن یونگ کے دماغ میں "آر کی ٹائپ" کی طرح بیٹھ گیا۔ "ٹائم" کے پیغمبر نے اپنا بدلہ یوں لیا کہ جوئس کے متعلق ایک مضمون لکھ مارا جس میں فرمایا کہ جوئس کے ناول اندر سے کھوکھلے ہیں ان میں کوئی ٹھوس چیز نہیں ملتی۔ ٹھوس چیز شاید یونگ صاحب کتابوں میں گھاس یا بھوسا ڈھونڈتے ہوں۔ اگر وہ اس جلن، حسد، غصے اور نفرت یعنی ان تمام جذبوں کو جن کے اوپر انہوں نے روحانیت کا پردہ ڈال رکھا ہے، الگ کر کے جوئس کا آخری ناول پڑھتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ خود انہی کے نظریے جس طرح جوئس نے سمجھے ہیں شاید اس طرح انہوں نے بھی نہ سمجھے ہوں۔ پروفیسروں اور نقادوں نے ایک بات یہ مشہور کر دی ہے کہ فرائڈ ادب کو ادب کی طرح نہیں پڑھ سکتا تھا؛ اس کے برخلاف یونگ نے ادب اور فن کو نفسیاتی امراض کی علامتوں کے طور پر نہیں بلکہ بجائے خود قابل قدر سمجھا ہے۔ لیکن یہ پروفیسر لوگ خود ادب کو فلسفہ سمجھ کے پڑھتے ہیں۔ چونکہ انہیں یونگ کے یہاں مصنوعی فلسفہ اور نمائشی روحانیت زیادہ ملتی ہے، اس لیے ان لوگوں نے یونگ کو ادب دوست اور فرائڈ کو ادب دشمن مشہور کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کا لگاؤ فرائڈ کو شیکسپیئر، دوستوفسکی اور لیونارڈو ڈیونچی سے تھا؛ اس کی مثال یونگ کے یہاں نظر نہیں آتی۔ فرائڈ راست باز آدمی تھا۔ جب وہ ادب اور فن کو نفسیاتی تحقیق کے سلسلے میں استعمال کرتا تھا تو صاف کہہ دیتا تھا۔ اس کے برخلاف یونگ کو یہ ثابت کرنے کی فکر پڑی رہتی ہے کہ مَیں سب کچھ ہوں — عالم بھی، ادیب بھی، صاحب نظر بھی۔ چنانچہ یونگ نے ادب اور علم کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ ادب سے خالص جمالیاتی لطف حاصل کرنے کی صلاحیت کس میں زیادہ تھی، اس کا اندازہ ایک اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ فرائڈ نے اشعار کس طرح نقل کیے ہیں اور یونگ نے کس طرح۔ یونگ صاحب ایسے اشعار چھانٹتے ہیں جن میں کوئی خیال صراحتاً یا علامت کے ذریعے پیش کیا گیا ہو، اس سے آگے نہیں چل سکتے۔ فرائڈ اپنے علمی مضامین میں تو ضرور اشعار کو علمی طریقے سے پیش کرتا ہے، لیکن اپنے خطوں میں بلکہ بات چیت میں اس کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ شعر تو خیر شعر ہیں، فرائڈ تو

لطیفوں کو شعر بنا دیتا تھا۔ فرائڈ ایک سچا شاعر تھا کیونکہ اسے اپنے سائنس دان ہونے پر فخر تھا۔ یونگ صاحب طبیب کے سامنے ملا بنتے ہیں اور ملا کے سامنے طبیب۔

لیکن آج کل یونگ کو ملا بھی مان لیا گیا ہے اور طبیب بھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ یونیسکو کا عہد ہے — یہ وہ زمانہ ہے جب اسپنڈر کو بھی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں زبردست معاشرہ ادب اور دانشور کو حقیر خیال کرتا تھا۔ ۱۹۵۵ء کی زر پرستی ادیب اور دانشور کی طاقت سے واقف ہے۔ یہ زر پرستی پہلے تو ادیب اور دانشور کی تخلیقی جدوجہد کو خریدنے کی کوشش کرتی ہے، جب اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتی تو اپنے ادیب اور اپنے پیغمبر خود پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یونیسکو کے پہلے سیکرٹری جنرل جولین ہکسلے تھے۔ ترقی پسند، فرائڈ کو جتنی گالیاں بھی چاہیں دیں، لیکن ۱۹۵۵ء کی زر پرستی فرائڈ کے نام سے گھبرانے لگی ہے۔ ترقی پسند فرائڈ کی نفسیات کو سائنس کے بجائے قصہ کہانی سمجھا کریں، لیکن زر پرست ان سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ فرائڈ کی نفسیات کا رخ سماج کی بنیادی تبدیلیوں کی طرف ہے۔ فرائڈ کا ایک جملہ ترقی پسندوں نے چاہے نہ پڑھا ہو، لیکن زر پرست پڑھ بھی چکے ہیں اور سمجھ بھی چکے ہیں۔ فرائڈ نے اپنی تمام "رجعت پسندی" کے باوجود یہ بھی کہہ دیا ہے کہ موجودہ معاشرے میں نفسیاتی علاج پوری طرح کارگر نہیں ہو سکتا، اور نہ اس معاشرے میں کوئی اپنی ذہنی صحت برقرار رکھ سکتا ہے۔ زر پرست دنیا کا پیغمبر فرائڈ نہیں بلکہ یونگ ہے — جس کا عقیدہ ہے کہ زر پرستی، جھوٹ، نمائش پسندی اور ریاکاری کے سماجی ماحول میں رہ کر بھی بلکہ اس ماحول سے سمجھوتہ کر کے بھی ذہنی صحت اور روحانی ترقی ممکن ہے۔ یونگ نے زر پرست دنیا کو ایک بہت بڑا تحفہ دیا ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے اس عقیدے کو سائنس کی حیثیت دے دی ہے کہ خرابی سماج میں نہیں بلکہ فرد کے اندر ہوتی ہے۔

یونگ کو پیغمبر کا درجہ ایک اور وجہ سے بھی حاصل ہوا ہے۔ فرائڈ نے ۱۹۱۲ء میں ہی یونگ کے سر پر ستارہ بلندی چمکتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اُس زمانے میں یونگ کا خیال تھا کہ جنس کو اتنی اہمیت نہ دی جائے تو لوگ نئی نفسیات کی مخالفت چھوڑ دیں گے۔ اس ہوش مندی کے جواب میں فرائڈ نے کہا تھا کہ اگر ہم اپنے بنیادی نظریات سے دستبردار ہو جائیں تو لوگ نئی نفسیات کو بالکل ہی قبول کر لیں گے۔ اس کے علاوہ فرائڈ نے پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر کوئی شخص انسانیت کو جنس کی مصیبت سے نجات دلانے کا وعدہ کرے تو

چاہے وہ بکواس ہی کیوں نہ کرتا ہو، لوگ اسے ہیرو بنا دیں گے۔ چنانچہ یونگ صاحب ہیرو بن گئے ان کا ہر نظریہ پہلے سے بھی زیادہ پاکیزہ اور آلودگیوں سے دور ہوتا ہے۔ ان کی کتابوں میں انسان کو نہ تو بھوک ستاتی ہے نہ جنس — بس ذہنی تصویریں پریشان کرتی ہیں۔ چنانچہ زر پرست دنیا کو انھوں نے جنس کی لعنت سے بھی بچا لیا۔ اس سے اچھا پیغمبر اور کون ملے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو لوگ یونگ کو عارف اور پیغمبر سمجھتے ہیں، وہ جین رسل اور میرلن مزو کی کمر، کولہے کی نمائش کرکے پیسے بھی بٹورتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یونگ نے نفسیات کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ میں یونگ سے شدید نفرت کرتا ہوں لیکن اس نفرت کے باوجود یونگ کی کتابیں خریدتا رہوں گا، پڑھتا رہوں گا، ان سے فائدہ حاصل کرتا رہوں گا۔ فرائڈ سے مجھے شدید محبت ہے، لیکن میں نے اس کی کتابیں پڑھنی چھوڑ دی ہیں کیونکہ مجھے نفسیات کے اس رخ سے زیادہ دلچسپی ہے جدھر فرائڈ کا باغی شاگرد اور عقیدت مند رائخ چلا ہے لیکن یونگ کو جس طرح آگے بڑھایا جا رہا ہے، وہ انسانیت، علم اور ادب، بلکہ بنیادی اخلاقیات کے لیے بھی ایک عظیم خطرہ ہے۔ یونگ کی عالمگیر مقبولیت سے اگر کسی چیز میں اضافہ ہو سکتا ہے تو جھوٹ، ریاکاری اور نمائش پسندی میں — کیونکہ زر پرستی یونگ کو اپنی مدافعت کے لیے استعمال کر رہی ہے اور یونگ بھی بے قصور نہیں۔ فرائڈ کی نفسیات ایک ذہنی اور سماجی انقلاب کے جراثیم لے کر آئی تھی۔ یونگ نے مصلحت پسندی اور شرافت اختیار کرکے نئی نفسیات سے ہی نہیں بلکہ علم کی روح سے غداری کی ہے۔ نئی نفسیات جوہری قوت سے بھی زیادہ طاقت ور چیز تھی۔ یونگ نے اسے ایک پالتو بلی بنا دیا جو ادھیڑ عمر کی غیر شادی شدہ مالدار عورتوں کے پیر چاٹتی ہے۔

اسی لیے یونگ کی سالگرہ کے موقع پر تعریفوں کے سیلاب کے درمیان اور یونگ کے بہت سے نظریات کو بیش بہا سمجھتے ہوئے بھی میں کہوں گا — فرائڈ زندہ باد!

(اگست ۱۹۵۵ء)

ٹامس مان

کسی بڑے ادیب کی وفات پر اظہارِ افسوس احمقانہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے تو اس کے مرنے یا جینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ٹامس مان کا انتقال ایسے وقت ہوا ہے کہ جب ان کی موجودگی نئی بربریت کے مقابلے میں نہایت ضروری تھی۔ یوں تو اس بربریت کا حملہ ہر قسم کی تہذیبی اقدار اور ہر قسم کے بڑے ادب پر ہو رہا ہے، لیکن یورپ کے بڑے ادیبوں نے اس کے متعلق تین طرح کا رویہ اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ تو ان ادیبوں کا ہے جنھوں نے بڑا ادب تخلیق کرنے کے باوجود اپنی روح اس بربریت کے ہاتھ بیچ دی، مثلاً پال کلودیل دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور خاموش رہ کر اس بربریت کو تقویت پہنچائی مثلاً ایلیٹ۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر بھی اپنے ایمان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ انہی ادیبوں میں ٹامس مان بھی شامل تھے، اور ان کی موجودگی اس لیے ضروری تھی کہ آج کل ان کے مقابلے کا کوئی ناول نویس اور نثر نگار باقی نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں ٹامس مان آزاد خیالی کی اس روایت کے آخری نمائندوں میں سے تھے جو یورپ نے صدیوں میں پیدا کی تھی، اور اب تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس روایت پر ان کا ایمان اتنا محکم تھا کہ اس کی حفاظت کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی کے تیس سال ہجرت کے عالم میں بسر کیے لیکن جس وقت سے ان کا انتقال ہوا ہے، مغربی دنیا کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ذرا سی بے اطمینانی کا اظہار بھی ایک سیاسی جرم بن گیا ہے۔ ٹامس مان کو ہٹلر کے جرمنی سے تو خیر بھاگنا ہی پڑا تھا اور وہاں ان کا کتب خانہ جلایا گیا تھا، لیکن مرنے سے پہلے انھیں یہ تجربہ حاصل ہو گیا کہ "آزاد" اور جمہوری دنیا بھی آزادیِ فکر کی برداشت نہیں رکھتی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ لوگ پروست اور جوئس کے نام بھول کر ٹامس مان کو بیسویں صدی کا

سب سے بڑا ادیب کہا کرتے تھے، لیکن آزاد دنیا کے موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہونے کی سزا انہیں یہ ملی ہے کہ اب ان کی عظمت پر بھی لوگوں کو شبہ ہونے لگا ہے۔ ایک ہفتہ وار اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ بیسویں صدی کے ادب میں مان کا درجہ آسانی سے متعین نہیں ہو سکتا کیونکہ اس زمانے میں تو بہت سے بڑے ادیب ہوئے ہیں۔ مثلاً برنارڈ شا اور گالز وردی یعنی جس شخص نے بیسویں صدی کے سارے بڑے علوم اپنے جذباتی تجربے میں جذب کیے ہوں اور وسیع سے وسیع انتشار میں نظم پیدا کر کے دکھایا ہو، اس کا مقابلہ گالز وردی سے ہو رہا ہے جو اپنی بیوی کی کہانی بھی تمیز سے نہ لکھ سکا۔ ایسی بات کہنے کے لیے آدمی میں بڑی اخلاقی جرات چاہیے کیونکہ اس پر تو ادب کے مبتدی بھی ہنس پڑیں گے لیکن اس قسم کی جرات کے پیچھے پوری آزاد دنیا کی مالی اور سیاسی مدد موجود ہے۔ یونیسکو اور اس قبیل کے ادارے یہی فریضہ انجام دے رہے ہیں کہ لوگوں کے دل سے ادبی عظمت کا احترام اٹھ جائے۔ ٹامس مان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، یہ کوئی اتفاقی چیز نہیں۔ آہنی پردے کے پیچھے جو کچھ ہوتا ہے، اس کی داستانیں تو ہم بہت دن سے سن رہے ہیں لیکن "ریشمی پردے" کے پیچھے بھی حالات کچھ ایسے مختلف نہیں ہیں۔ "آزاد" دنیا بھی ادب اور ادیب سے اتنا ہی ڈرتی ہے چونکہ ادیب اس لعنت میں گرفتار ہوتا ہے کہ سولی پہ چڑھ کے بھی اپنے تجربات کی تشکیل سے باز نہیں آسکتا اس لیے ادب اور تخلیق کا یہ خوف کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔ اسی خوف کے ماتحت زر پرستی نے پروفیسروں، نقادوں اور ادیب نما لوگوں کو پالنا شروع کیا ہے تاکہ بڑے ادیبوں کی عظمت اور شہرت اور ان کا احترام پڑھنے والوں کے دل میں برقرار نہ رہنے پائے۔ پرانی بربریت کتب خانے جلاتی تھی، نئی بربریت کتب خانے قائم کرتی ہے۔ ہمارے یہاں جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب اور مغربی ادب الگ الگ چیزیں ہیں، اردو میں پروست اور جوئس کے ذکر سے کیا فائدہ، انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسپنڈر صاحب اور ان کے قبیلے کے لوگ پاکستان میں کیا کرنے آتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہیں کراچی کی ایک محفل میں اسپنڈر نے نہایت خود اطمینانی کے ساتھ کہا کہ ایذرا پاؤنڈ کو گولی مار دینی چاہیے۔ ایک طرف ایذرا پاؤنڈ اور اس کے ادبی جہاد کو نظر میں رکھیے، دوسری طرف اسپنڈر صاحب کو ملاحظہ فرمائیے جن کی شاعری اور استلذاذ بالنفس میں تمیز دشوار ہے۔ اردو ادب اور مغربی ادب کو الگ سمجھنے والوں کو ایک خبر اور بھی سنا دوں۔ کراچی یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے

نصاب سے ایلیٹ کو خارج کر کے اس کی جگہ رابرٹ فراسٹ کو رکھا گیا ہے۔ نصاب بنانے والی کمیٹی کے صدر کے الفاظ میں اس اقدام کی وجہ یہ ہے کہ ایلیٹ تو عالمگیر شاعر ہے، کسی خاص ملک کی نمائندگی نہیں کرتا۔ جن طالب علموں کی ذہنی تربیت ان اقدار کے ماتحت ہوگی، وہ کس قسم کا اردو ادب پیدا کریں گے؟ یہ ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے جو اردو ادب کو مریخ کا ادب سمجھتے ہیں۔ بہرحال وہ قوت جسے میں یونیسکو والی ذہنیت کہتا ہوں، ہر ملک میں اس بات پر پوری کوشش صرف کر رہی ہے کہ یا تو ادب کو مردہ چیز سمجھ کر پڑھا جائے، یا لوگ عظیم ادب کی طرف توجہ کرنا چھوڑ دیں۔ یہ معاملہ محض سیاسی خیالات کا نہیں۔ ایلیٹ نے تو فخر کے ساتھ اپنے آپ کو رجعت پسند کہا ہے۔ آج کی دنیا میں تو سچا ادب بذات خود مشتبہ چیز بن گیا ہے۔ کل تک جن باتوں پر روس کو گالیاں دی جاتی تھیں، وہ آج آزاد دنیا میں ہو رہی ہیں، بلکہ روس کے ادبی رویے میں تو خاصی تبدیلی نظر آتی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں تو آج کل ہیمنگ وے اور فاکز تک مقبول ہیں۔ اس سے بڑھ کے یہ بات ہے کہ روس کے ادیبوں کی تازہ ترین کانگریس میں آراگوں نے اعلان کیا ہے کہ پچھلے سو سال کے فرانسیسی ادب کی روایت سے بے توجہی برت کے آدمی ترقی پسند نہیں بن سکتا، اور اس سلسلے میں انھوں نے اپولی نیئر کی خاص طور سے تعریف کی ہے، لیکن یہ کیا بوالعجبی ہے کہ "جمہوری" دنیا میں ایذرا پاؤنڈ تو الگ رہا، ایلیٹ تک مشتبہ بن گیا ہے اور محض اتنی بات پر کہ وہ بڑا شاعر ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے درمیان ٹامس مان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے پیچھے جو عوامل کام کر رہے ہیں، وہ صرف و محض ادبی اور تہذیبی نہیں ہیں۔ ان عوامل کو شکست دینا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، چاہے وہ کتنا ہی بڑا ادیب کیوں نہ ہو۔ بہرحال ٹامس مان سے ہم یہ امید رکھ سکتے تھے کہ وہ ہمارے اندر ان حالات کا شعور پیدا کریں گے، اور ادیب کا فریضہ بھی اتنا ہی ہے۔ آج پوری دنیا کے ادیبوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو یہ فریضہ ادا کرنے کی اتنی ہمت رکھتے ہوں جتنی ٹامس مان میں تھی۔

(ستمبر ۱۹۵۵ء)

سرمایہ داری اور تنقید

اول تو ادب میں تنقید کی حیثیت کائی یا پھپوندی کی سی ہے بجائے خود اس کی کوئی ہستی نہیں، لیکن اگر یہ اپنی ثانوی جگہ پر قانع رہے تو ادب کے لیے مفید بھی ہو سکتی ہے، بلکہ آپ چاہیں تو ضروری بھی کہہ لیجیے۔ مگر تنقید ضروری یا فائدہ مند صرف اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک خادمہ کے فرائض انجام دینے پر قانع رہے۔ تنقید کا حوصلہ اس سے آگے بڑھا اور تخلیقی ادب کا ستیاناس ہوا۔ لیکن پچھلے تیس سال سے ہماری دنیا میں تنقید کی اہمیت بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے یوں تو اس کی وجوہات اور بھی ہوں گی، لیکن ایک بہت بڑی وجہ خالص سیاسی قسم کی ہے۔ تخلیق میں شعور کا دخل تو ضرور ہوتا ہے، لیکن لاشعوری عوامل تخلیق پر اس بری طرح حاوی رہتے ہیں کہ لکھنے والے کو خود پتہ نہیں چلتا کہ میری کوشش کے آخری نتائج کیا ہوں گے۔ اسی لیے تخلیقی کام کرنے والوں سے حکمران ذہنیت کے لوگ ہمیشہ خائف رہے ہیں۔ البتہ ادب میں تنقید ایسی چیز ہے جس کی راہیں متعین کی جا سکتی ہیں لہٰذا حکمران ذہنیت تنقید کو زیادہ قابلِ اعتبار سمجھتی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور پچھلے تیس سال سے تو تنقید ادیبوں اور پڑھنے والوں پر پہرہ دے ہی رہی ہے۔ تنقید سے ذہنوں کو "ڈھالنے" کا کام لیا جا رہا ہے۔ غالباً یہ بات سب سے پہلے انگریزوں کو سوجھی تھی کہ تنقید دوسروں کو غلام بنائے رکھنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے چنانچہ آج سے چالیس سال پہلے ایک انگریز پروفیسر اور نقاد نے شاعری کے متعلق ایک مقالہ پڑھتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ برطانوی سلطنت کے مستقبل کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہندوستانی لوگ انگریزی ادب کس طرح پڑھتے ہیں۔

تنقید نے تخلیق کے کام میں رکاوٹ خصوصاً اس وقت سے ڈالنی شروع کی جب روس کے حاکم ادب اور ادیبوں سے ڈرنے لگے۔ انقلاب سے پہلے عام طور سے رویہ کچھ

یوں تھا کہ ادب اور فن میں جو شخص کوئی نئی بات کرتا ہے، وہ انقلاب کے کام میں مدد دیتا ہے۔ اسی لیے یورپ کے بہت سے بڑے فنکاروں کو روس کے انقلابیوں سے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ لیکن کامیابی حاصل کرنے کے بعد روس کے رہنماؤں نے ادیبوں سے چھوت چھات برتنی شروع کر دی۔ ادیبوں کے بجائے انہیں نقاد کچھ زیادہ کار آمد نظر آئے۔ بااقتدار لوگوں کی شہ پا کر نقادوں نے دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کو "بھیڑیا" "گیدڑ"، بندر بنا کے رکھ دیا۔ لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اسٹالن کی پالیسی کی تعریف ایک "گیدڑ" یعنی ژید نے اپنے آخری ناول "تھیلیوس" میں کی۔ اور روس میں ادب پر جو احتساب ہوتا ہے، اس کا بہترین جواز ایک "بھیڑیے" یعنی ونڈہم لوئس نے پیش کیا۔ ترقی پسند نقادوں کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے بودیلیئر اور راں بو جیسے شاعروں کو کلودیل جیسی ذہنیت کے لوگوں کے سپرد کر دیا۔ ترقی پسند کہتے ہیں کہ انسانیت کے تہذیبی ورثے کے سچے وارث ہم ہیں، پھر انہوں نے اس بات کی اجازت کیسے دی کہ سرمایہ داروں کے روپے سے رجعت پسند نقاد بودیلیئر اور راں بو کی شاعری کو مسخ کریں؟ اگر روس کی ادبی پالیسی روس کے ادیبوں کے ہاتھ میں ہوتی تو دنیا کے ادب کو یہ ناقابل تلافی نقصان کبھی نہ پہنچتا کیونکہ مایاکوفسکی اگر بودیلیئر، لافورگ اور اپولی نیر کا جانشین نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن روس کے نقادوں کے لیے بڑے سے بڑے ادب کو رد کر دینا آسان تھا کیونکہ نقادوں کے اوپر تخلیق کی ذمہ داری تو تھی نہیں۔ ان کا کام تو ہوائی باتیں کرنا تھا۔ بہرحال اب روس میں نقادوں کی خدائی ختم ہو رہی ہے۔ اگر روس کی ادبی پالیسی تخلیقی فنکاروں نے مرتب کی، اور روسیوں نے آراگون کی بات کو توجہ کے قابل سمجھا تو شاید وہاں تخلیقی ادب کا خوف کم ہو جائے اور انیسویں صدی کی طرح روسی ایک بار پھر یورپ کی ادبی روایت میں اضافہ کر سکیں۔ اس کے برخلاف مغرب میں تنقید کی چودھرائیت زور پکڑ رہی ہے۔ سرمایہ داروں کے مالی وسائل اس کوشش میں صرف ہو رہے ہیں کہ نقاد تخلیقی فنکاروں پر حاوی ہو جائیں۔ آج کل جمہوری دنیا میں ادب بھی بڑے فائدے کی چیز بن گیا ہے، بشرطیکہ آدمی نقاد ہو۔ ادب کے سر کی یہ جوئیں آج کل خوب موٹی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ چنانچہ فن کاروں کے لیے زر پرستی نے یہ بہت بڑی ترغیب پیدا کر دی ہے کہ وہ تخلیقی کام چھوڑ کر نقاد بن جائیں۔ رہا وہ ادب جو پیدا ہو چکا ہے تو اس سے نبٹنے کے لیے پیشہ ور نقاد موجود ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے ادب کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ شکل پہچاننے میں نہیں آتی۔

ژید نے مغربی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ یہ روحانی کرب کی داستان ہے۔ آج کل کے مغربی نقاد ہر بڑے ادیب میں سکون اور شانتی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال کو رواج دیا ہے کہ جس ادب کو شانتی میسر نہیں آئی، وہ ادیب ہے ہی نہیں (کیٹس جیسا عظیم شاعر کہا کرتا تھا کہ شاعر کو سکون سے کیا واسطہ، اس کا کام تو سلگنا ہے) ادیب کی روحانی اذیت اور کرب کو یہ نقاد لوگ ناپختگی کی علامت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ حضرات اپنی کتابوں میں اس عنصر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کے برخلاف پڑھنے والے کو یہ سمجھاتے ہیں کہ تم اس کرب ورب کے چکر میں مت پڑو، ایک دم سے اس سکون کی منزل پر جا پہنچو جہاں فنکار اتنی جدوجہد کے بعد پہنچا تھا۔ ایک لحاظ سے نقاد بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان بیچاروں کو فن کار کے تخلیقی کرب کا تجربہ ہی کیا ہے۔ ان کے نزدیک تو ادب "موضوعات" کے متعلق ہوتا ہے، یعنی جس طرح سکول کے لڑکے کے سامنے امتحان کا پرچہ آگیا اور اس نے جواب لکھ دیے، نقادوں کے خیال میں تخلیقی عمل بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے سامنے حیات اور کائنات سے متعلق چند مسائل پیدا ہوئے اور اس نے اپنی رائے بیان کر دی۔ چنانچہ یہ پروفیسر صاحبان اپنی تنقید میں موضوعات کی فہرست بنا کے رکھ دیتے ہیں، اور آخر میں یہ بتاتے ہیں کہ فلاں شاعر کو شانتی کس طرح حاصل ہوئی۔ تنقید مکمل ہوگئی اور نقاد صاحب کو کسی سرکار سے مقررہ وظیفہ مل گیا۔ اب آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ دنیا ادب کی قدر نہیں کرتی؟

زر پرست دنیا کے ان کامیاب نقادوں کا ایک گروہ ہر وقت اپنے ساتھ بپتسمہ کا پانی لیے پھرتا ہے اور ادیبوں کو پکڑ پکڑ کر ان پر چھڑکتا ہے۔ ایسے نقادوں کے نزدیک ادب کی عظمت بس یہ ہے کہ اس کے یہاں عیسوی روح ملتی ہو۔ چلئے یہ بھی سہی، لیکن یہ لوگ عیسوی روح میں سے حضرت عیسیٰؑ کا غصہ خارج کر دیتے ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو انہیں عیسوی محبت بھی مشتبہ نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں تو عیسوی روح سے مراد بس ابتدائی گناہ کا عقیدہ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے تو تاجروں کو دھکے دے کے معبد سے نکالا تھا۔ یہ نقاد سونے کے بچھڑوں کو پوجتے ہیں اور عیسیٰؑ کا نام لے لے کر بود یلیئر اور راں بو تو الگ رہے، انہوں نے تو حضرت عیسیٰؑ کو بھی تجارت کا مال بنا دیا۔

جو نقاد براہ راست مذہب کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں، انہیں یونگ کا مصنوعی

تصوف مل گیا ہے، یہ لوگ ادب میں "آرکی ٹائپ" ڈھونڈتے ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں ادیب کی عظمت کا معیار ہے شخصیت کا انضباط۔ یہ معیار فی الحقیقت کوئی ادبی معیار نہیں۔ شخصیت کا انضباط تو اور قسم کے لوگ بھی حاصل کر سکتے ہیں، پھر ان میں اور کسی بڑے ادیب میں کیا فرق ہے؟ لیکن نقادوں کو اس بات سے مطلب ہے کہ فن کار کی روحانی اذیت کے آثار مٹ جائیں اور وہ اللہ میاں کی گائے نظر آنے لگے یعنی زر پرستی کے لیے ایسے نقادوں کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ادب کو بے ضرر بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً تاجروں کی تہذیب پر ایسی زہریلی طنز بہت کم ہوئی ہو گی۔ جیسی ٹژاری نے اپنے ڈرامے "شہنشاہ اُدبُو" میں کی ہے۔ نقادوں نے اس میں عیسائیت اور دو چار "آرکی ٹائپ" نکال کے دکھا دیے اور اس کی سماجی معنویت ختم کر کے رکھ دی۔

بڑے ادیبوں میں کچھ تو ایسے ہیں جنہیں عیسائیت یا یونگ کے ذریعے بے ضرر بنایا جاسکتا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کی سماجی تنقید کو اس طرح نہیں ٹلایا جا سکتا۔ ایسے لوگوں کو نقاد محض صناع بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور کی جاتی ہے کہ فن کار تو بہت اچھے ہیں، لیکن کہنے کو ان کے پاس کچھ نہیں — ایذرا پاؤنڈ کے متعلق بہت سے نقادوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ لیکن ایذرا پاؤنڈ کچھ اس قسم کا شاعر ہے کہ اگر آپ اس کے سیاسی اور معاشی نظریے الگ کر دیں تو اس کی فن کاری بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے بعض نقاد ایک شرعی حیلہ نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاؤنڈ باہر سے تو بہت پیچیدہ ہے، لیکن اندر سے بالکل سیدھا سادا (یعنی احمق) ہے۔ اگر یہ کوئی خرابی ہے تو پھر یہ نقص بیسویں صدی کے ہر بڑے ادیب میں ملے گا، خصوصاً ایلیٹ اور جوئس میں۔ بلکہ ہرمان بردخ نے تو کہا ہے کہ یہ خارجی پیچیدگی اور داخلی سادگی بیسویں صدی کے ادیب کے لیے لازمی ہے۔ مگر یہ باتیں تو صرف تخلیقی ادیبوں کے ہی تجربے میں آتی ہیں، نقادوں کا کام تو ادب کا زہر نچوڑ کے پھینکنا ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے بودیلیئر اور رانبو جیسے شاعروں کو برادری سے نکال رکھا ہے، اس لیے زر پرستوں کے پالے ہوئے نقاد اس کوشش میں کامیاب بھی ہیں۔ فلوبیئر کا ناول "مادام بوواری" اس طنزیہ جملے پر ختم ہوتا ہے کہ مصلحت پسند ادمے کو لیجن آف آنر مل گیا۔ آج فلوبیئر کے ناشر کو لیجن آف آنر ملتا ہے۔

پھر آج کل جمہوری دنیا میں وہی کچھ ہو رہا ہے جو ترقی پسندوں کے یہاں ہوا کرتا

تھا۔ یعنی سیاسی خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادیب کی عظمت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ابھی تو ایک دمی کو دنیا کا سب سے بڑا ادیب کہا جا رہا ہے، اور ابھی نقادوں نے اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے، کیونکہ اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو نقادوں کے آقاؤں کو پسند نہیں آئی۔ کل تک بعض نقاد سموں دبودوار کو فرانس کے نوجوان ناول نگاروں میں سب سے بلند سمجھتے تھے، آج پتہ چلا کہ انھیں ناول لکھنا ہی نہیں آتا، کیونکہ وہ سارتر کی دوست ہیں۔

یہ کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ اگلی دفعہ میں پوری تفصیل کے ساتھ سناؤں گا۔

(اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ادب، آزادیِ رائے اور تہذیبی آزادی کی انجمن

کسی نے قوموں کی نفسیات کے متعلق ایک لطیفہ گھڑا ہے۔ اگر کوئی فرانسیسی عورت بدشکل ہو تو یہ بات قبول کرلیتی ہے اور انکسار برتتی ہے۔ انگریز عورت بدشکل ہو تو سمجھتی ہے کہ میں برطانوی سلطنت کی رکن ہوں۔

اسی طرح اسپنڈر صاحب کہتے ہیں کہ میں گھامڑ سہی، میرے سیاں تو کوتوال ہیں۔ اس قسم کے ادیبوں کے لیے آج کل ایک یتیم خانہ کھلا ہوا ہے جس کا نام تہذیبی آزادی کی انجمن ہے۔ یہ انجمن یورپ کی ہر زبان میں رسالے نکالتی ہے جن میں عموماً وہ ادب لکھتے ہیں جو سوچنے سمجھنے کے کام سے فارغ ہو چکے ہیں اور اب پیسے بٹورنے کی آزادی کے سوا اور کسی آزادی کے قائل نہیں ہیں چنانچہ اسپنڈر صاحب بھی ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ "انکاونٹر" رسالے کا بظاہر تو مقصد ہے تہذیبی آزادی کی حفاظت، لیکن اسپنڈر صاحب پیٹ کے اتنے ہلکے ہیں کہ باطنی مقصد ان سے چھپایا نہیں جاتا۔ وہ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے جیب میں ایٹم بم لیے پھرتے ہوں۔ پچھلے سال کراچی آئے تھے تو انہوں نے بڑے بڑے غمزے دکھائے۔ ایک محفل میں بولے ایذرا پاؤنڈ کو گولی مار دینی چاہیے۔ ایک دوسری جگہ تقریر میں کہنے لگے کہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ روز وِیلٹ کے مقابلے میں ہٹلر بڑا تھا۔ ایک خاتون نے پوچھا کیوں؟ تو ناراض ہو کے بیٹھ گئے کہ میں ایسے لوگوں کے سامنے کیا تقریر کروں جو ہٹلر کو بُرا نہیں سمجھتے۔ خیر، ان باتوں کو تو محبوبانہ ادائیں سمجھ کے بھی ٹلایا جاسکتا ہے، مگر اگست کے پرچے میں انہوں نے جو اداریہ لکھا ہے، اس میں تو بالکل ہی کھل گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ باہر کے ملکوں میں جائیں تو اکثر سننے میں آتا ہے کہ اردو یا بنگالی وغیرہ میں فلاں ادیب اتنا اچھا ہے کہ یورپ والوں کو بھی اس سے واقف ہونا چاہیے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جس قوم کے پاس پیسہ اور سیاسی طاقت ہو، اسی کا ادب بڑا۔ چنانچہ

کسی کمزور قوم کے عظیم مصنف سے انگریزی میں تیسرے درجے کا ادیب ہونا بہتر ہے۔
اسپنڈر صاحب نے کمزور قوموں کے ادیبوں کو (جن میں فرانسیسی بھی شامل ہیں) مشورہ دیا ہے کہ انہیں اپنی حیثیت پر قانع رہنا چاہیے اور دنیا کے ادب میں اس سے زیادہ کسی حیثیت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔

اسپنڈر صاحب کا یہ مشورہ نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس سے ہمیں یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جس قسم کی تہذیبی آزادی کا پرچار کرتے ہیں، وہ دراصل کیا چیز ہے۔ تہذیبی آزادی کی انجمن نے جس حقیقت کو سات پردوں میں چھپا کے رکھا تھا، اسے اسپنڈر صاحب نے عریاں کر دیا۔ دیانت داری اسی کا نام ہے۔ ان کی بات اس حد تک بالکل درست ہے کہ آج کل انگریزی بولنے والی قومیں سیاسی اور معاشی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تہذیبی طور سے بھی دنیا پر چھا جانے کی کوشش کر رہی ہیں کیونکہ سیاسی اقتدار کا بہترین ذریعہ ہے، تہذیبی اقتدار۔ ایک کمزور قوم کے شاعر اکبر الہ ابادی نے یہ بات پچاس سال پہلے سمجھ لی تھی۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے۔ جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے۔

اسپنڈر صاحب کی یہ بات اس لحاظ سے تو بالکل درست ہے کہ انگریزی ادب کے ادیب اوروں کی بہ نسبت زیادہ پیسے کما سکتے ہیں، لیکن یہ چیز کہ طاقت ور قوموں کا ادب ہی توجہ کے لائق ہوتا ہے ذرا محل نظر ہے۔ اس سلسلے میں دو چار مثالوں پر غور فرمایئے۔ اسپنڈر صاحب نے تو شیکسپیئر کے زمانے کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے، میں اپنی مثال آج کل کے زمانے سے لوں گا۔

۱۔ پچھلے بیس سال سے یورپ کے فلسفے پر کیر کے گور حاوی ہے۔ اس دوران میں ڈنمارک کی سیاسی حیثیت کیا رہی ہے؟

۲۔ دوسری جنگ کے بعد یورپ کے فلسفے پر بہت سے نمایاں اثرات دو جرمن فلسفیوں یعنی ہائیڈیگر اور یاسپرس کے رہے۔ ۴۵ء میں جرمنی کے پاس کتنی سیاسی طاقت اور کتنا روپیہ تھا؟

۳۔ انگریزی بولنے والی قوموں کے مقابلے میں فرانس کچھ بھی نہیں، لیکن آج کل فرانسیسی کے معمولی ادیبوں کی کتابیں خود انگریزی بولنے والے ملکوں میں انگریزی کے اچھے ادیبوں کی کتابوں سے زیادہ بکتی ہیں۔ اسپنڈر صاحب ناشروں کی فہرستیں اٹھا

کے دیکھ لیں، خود پتہ چل جائے گا۔ اس کے برخلاف انگریزی کے ایلیٹ جیسے بڑے شاعر کو بھی فرانس میں وہ حیثیت نہیں دی جاتی جس کا وہ مستحق ہے۔

۴۔ جاپان میں سیاسی اقتدار تو انگریزی بولنے والوں کو حاصل ہے مگر تہذیبی اثر فرانس کا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ آج کل وہاں مقبول ترین مصنف سارتر اور کامیو ہیں۔ بلکہ ایک جاپانی پروفیسر صاحب بتا رہے تھے کہ کامیو کے ناول "طاعون" کا ترجمہ وہاں کے نصاب میں داخل ہے۔

یہ ساری باتیں اسپنڈر صاحب کے سامنے تھیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے بڑبولے پن میں آ کے ایسا بے ہنگم دعویٰ کر گئے۔ اصل میں انہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ اب فرانسیسی ادب اور تہذیب کے لیے دُنیا میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ فرانس کے خلاف ایک وجہ تو ذاتی ہے۔ ۴۶ء میں یورپ کے دانشوروں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی، یہ طے کرنے کے لیے کہ یورپ کی تہذیب کیا چیز ہے۔ اس کانفرنس کی کارروائی کا خلاصہ "ساقی" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس جلسے میں اسپنڈر صاحب نے صرف جذباتی قسم کی باتیں کیں۔ اس پر فرانسیسیوں نے ان کا مذاق اڑایا، بلکہ ایک رسالے نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ انگلستان میں کیا اور کوئی آدمی نہیں تھا جو انہیں بھیجا۔ اس دن سے اسپنڈر صاحب خار کھائے بیٹھے ہیں۔

اس ذاتی وجہ کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس کے سبب بعض حلقوں نے فرانس کے خلاف تہذیبی جہاد شروع کر دیا ہے، فرانس میں آزاد خیالی کی روایت ابھی تک قائم ہے۔ فرانسیسی ادیبوں کو اپنے پڑھنے والوں کا تعاون حاصل ہے، اس لیے وہ آسانی سے دھونس یا لالچ میں نہیں آتے اور اپنے خیالات کا بے کھٹکے اظہار کرتے ہیں۔ یہ چیز بعض لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ مثلاً جب یونیسکو قائم ہوئی اور جولین ہکسلے اس کے سیکرٹری بنائے گئے تو فرانسیسی وفد نے اس ادارے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ انہیں اعتراض یہ تھا کہ جولین ہکسلے نہ تو ادیب ہیں نہ سائنس داں، ایسے آدمی کو سیکرٹری بنانے میں علم و ادب کی توہین ہوتی ہے۔ پھر فرانسیسی ادیبوں کو دعویٰ ہے کہ ہم پوری انسانیت کے نمائندے ہیں، اس لیے بہت سے فرانسیسی ادیب ایسے ہیں جو ہر قسم کی استعمار پرستی کی مخالفت کرنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ ادب اور غیر ادب کو اس طرح الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے جس طرح انگریزی یا جرمن ادیب۔ پال والیری جیسے خالص شاعر تک نے بین الاقوامی سیاست پر ایک کتاب لکھ دی ہے۔ پھر دنیا میں فرانسیسی

ادیبوں کی عزت بھی اور زبانوں کے ادیبوں سے زیادہ ہے۔ چنانچہ فرانسیسی ادیبوں کی یہ مقبولیت اور ان کی آزاد خیالی زر پرستوں کو بڑی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً جب سے سارتر نے امن کانگریس میں شرکت کی ہے، فرانسیسی ادیب اور بھی مشتبہ بن گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سناتا چلوں۔ امن کانگریس کے معاملے میں سارتر کے ایک ساتھی امیتی آنیل ان سے لڑ پڑے، اور کھُلے خط میں سارتر کو بڑی گالیاں دیں بلکہ سارتر سے یہ تک پوچھ لیا کہ اخباروں میں آپ کی ایک تصویر چھپی ہے جس میں آپ آراگون کی بیٹی کے بالوں سے کھیل رہے ہیں، اس واقعے کا آپ کی نئی پالیسی سے کیا تعلق ہے۔ اس کے بعد وہ سارتر کے ادبی نظریات سے بھی کنارہ کش ہوگئے۔ سارتر ذمہ دار ادب کے قائل ہیں، انہوں نے غیر ذمہ دار ادب کا نظریہ پیش کیا۔ ان کی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تہذیبی آزادی کی انجمن کے فرانسیسی رسالے نے بڑی مزیدار بات کہی ہے۔ تبصرہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ ان ادیبوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ امیتی آنیل نے آج غیر ذمہ دار ادب کا ڈھونگ رچایا ہے، مگر کل تو وہی ذمہ دار ادب والوں میں شامل تھے، ممکن ہے اس غیر ذمہ داری میں بھی وہی پرانی ذمہ داری چھپی ہوئی ہو۔

غرض سارتر کا امن کانگریس میں جانا تھا کہ زر پرستوں کی طرف سے جہاد شروع ہوگیا۔ پہلے تو سارتر کے معمولی سے معمولی ناول یا ڈرامے کو شاہکار سمجھا جاتا تھا، اب ایک خاص قسم کے نقادوں نے ان کے فلسفے، ان کے ادب اور ان کی شخصیت میں ہزار خرابیاں نکالنی شروع کر دیں۔ خاص اعتراض یہ وارد ہوا کہ سارتر نے جن لوگوں کو پہلے رد کر دیا تھا، اب انہیں میں جا شامل ہوئے۔ مگر یہی نقاد کل تک ان کے ڈرامے "خدا اور شیطان" کی تعریف کیوں کر رہے تھے؟ اس ڈرامے میں انہوں نے یہی تو ثابت کیا تھا کہ انسان نہ تو خدا بن سکتا ہے نہ شیطان، اس لیے زندگی کی نجاست اور آلودگی قبول کرکے ہی وہ اپنے جوہر کی تخلیق کرتا ہے۔ سارتر کے عمل اور فلسفے میں کوئی تضاد نہیں، البتہ ان کے انتخاب پر اعتراض کیا جاتا ہے، جیسا ان کے دوست امیتی آنبل نے کیا ہے۔ مگر زر پرستوں کے نقادوں نے یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ سارتر کی ادبی اہمیت ہی سے انکار کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ آج کل سارتر کا نیا ڈراما "نیکراسوف" نقادوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی یہ ہے نیکراسوف روس کا وزیر ہے۔ ایک دن خبر آتی ہے کہ آپیرا میں نظر نہیں آیا، حالانکہ دوسرے وزیر موجود تھے۔ چنانچہ سرمایہ داروں کے اخبار فرض کر لیتے ہیں کہ

نیکراسوف کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ ادھر ایک اخبار کی اشاعت گرتی جا رہی ہے۔ ایڈیٹر اپنے رپورٹر کو حکم دیتا ہے کہ اگر تم نے چوبیس گھنٹے کے اندر اخبار کی اشاعت بڑھانے کی کوئی ترکیب نہ نکالی تو میں تمہیں برخاست کر دوں گا۔ رپورٹر اسی ادھیڑبن میں ہے کہ اسے ایک شخص ملتا ہے جو نیکراسوف سے مشابہ ہے۔ رپورٹر اسے پیسے دے کر یہ بیان دینے پر راضی کر لیتا ہے کہ میں نیکراسوف ہوں اور روس سے بھاگ آیا ہوں۔ غرض اس ڈرامے میں سارتر نے زر پرست اخباروں کا طریقہ عمل دکھایا ہے۔ نقاد کہتے ہیں کہ سارتر نے فرانس کے فلاں فلاں اخبار نویسوں کا سچا کردار پیش کیا ہے، یہ تو غیر ادبی حرکت ہے۔ سارتر جواب دیتے ہیں کہ میں یونانی اور رومن ڈرامے کی ادبی روایت کی پیروی کر رہا ہوں۔ اب یہ آپ فیصلہ کریں کہ کون ٹھیک کہتا ہے۔ ویسے ہمارے ہاں تو سودا جیسے شاعروں نے لوگوں کے نام لے لے کر ہجویں لکھی ہیں۔

فرانسیسی ادیبوں میں سارتر کے بعد سب سے بڑا جرم ان کی دوست سمون وبود وار سے سرزد ہوا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ان کے فلسفے کی تو کتابوں کا قائل ہوں مگر ان کے ناول مجھ سے نہیں پڑھے جاتے۔

ان کے ناولوں میں جو فلسفیانہ نظریے ہوتے ہیں، وہ میں چھ سال پہلے "ساقی" میں پیش کر چکا ہوں۔

میرے نزدیک ان کے ناولوں کی قدر و قیمت یہ ہے کہ سارتر کے ناولوں کا فلسفہ سمجھ میں نہ آئے تو ان کے ناول پڑھ لیجیے۔ بہرحال نقادوں کے خیال میں ان کا درجہ فرانس کے نوجوان ناول نگاروں میں سب سے بلند تھا اور وہ ان کے ناول "مہمان" کو اس دور کا بہترین فرانسیسی ناول سمجھا کرتے تھے، مگر اب یہی لوگ کہتے ہیں کہ انہیں ناول لکھنا ہی نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ اب انہوں نے ایک نیا اور لمبا چوڑا ناول لکھا ہے۔ "پنڈت لوگ"۔ اس کتاب نے آج کل ادب کی دنیا میں پورا ۱۹۵۷ء برپا کر رکھا ہے۔ اس کتاب کے طفیل زر پرستوں کے نزدیک پوری فرانسیسی تہذیب گردن زدنی ہو گئی ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے دکھایا یہ ہے کہ فرانسیسی ادیبوں کی زندگی اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ وہ فلسفہ تو بہت بگھارتے ہیں، لیکن کسی واضح اور قطعی فیصلے یا انتخاب کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ پژمردگی اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ فرانسیسی ادیب ان قوتوں کا ساتھ دیں جو ایک بہتر نظامِ زندگی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔

فرانسیسی ادیبوں کا یہ تجزیہ زر پرستوں کو پسند نہیں آیا۔ اوپر سے ایک ستم یہ ہوا کہ سارتر نے اپنے رسالے کا ایک خاص نمبر نکال ڈالا جس میں بائیں بازو کی مختلف جماعتوں کی تاریخ بیان کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اب بائیں بازو کو کیا کرنا چاہیے چونکہ سارتر کا پوری دنیا کے پڑھے لکھے لوگوں پر بڑا اثر ہے، اس لیے زر پرست اور بھی پریشان ہوئے۔ تہذیبی آزادی کی انجمن کے توپ خانے حرکت میں آ گئے اور فرانسیسی ادب اور تہذیب پر گولہ باری شروع ہو گئی۔

چنانچہ اسپنڈر صاحب کے رسالے کے اسی اگست والے نمبر میں ایک طویل مضمون فرانسیسی دانشوروں کے خلاف نکلا ہے جو دراصل یورپ کی تہذیبی اور ذہنی آزادی پر حملہ ہے۔ اس مضمون کی کیا اہمیت ہے، یہ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ اردو کے ادیب یورپ کے ادب کے متعلق ایک لفظ نہیں سننا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یورپ کے مردے یورپ میں گڑیں گے، ہمیں کیا مطلب؟ لیکن بین الاقوامی زر پرستی نے ایسا جال پھیلایا ہے کہ اردو کے ادیب بھی ان قوتوں کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو اپنا سیاسی اقتدار جمانے کے لیے دنیا بھر کی ذہنی اور تہذیبی آزادی چھین لینا چاہتی ہیں۔ فرانسیسی دانشوروں کے خلاف یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اور ایک جرمن ڈاکٹر لوتی سے لکھوایا گیا ہے۔ اس مضمون کے پیچھے جو مقصد کارفرما ہے، اسے "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ" تک نے محسوس کر لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اخبار بظاہر تو ادبی ہے، لیکن دراصل ادب میں برطانیہ کی قدامت پرستانہ سیاسی پالیسی پر چلتا ہے۔ یہ اخبار قدامت پرستی میں اتنا کٹر ہے کہ اس نے جیمز جوئس کے انتقال پر بھی اداریہ نہیں لکھا اور جب ایلیٹ نے احتجاج کیا تو ان کا خط چھاپنے سے بھی انکار کر دیا۔ لیکن اس اخبار تک نے ڈاکٹر لوتی کے مضمون پر اداریہ لکھا ہے اور ان کے نقطۂ نظر کی مخالفت کی ہے مثلاً ڈاکٹر لوتی نے کہا تھا کہ فرانسیسی ادیب فلسفے میں پڑے رہتے ہیں اور محض ہوائی باتیں کرتے ہیں، ان میں ٹھوس اور معروضی فکر کی صلاحیت نہیں۔ اس کے برخلاف اس اخبار نے کہا ہے کہ فرانسیسی ادیب معروضی تجزیے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر لوتی نے سارتر کے خاص نمبر میں طرح طرح کی خرابیاں نکالی تھیں۔ اس اخبار نے اپنے اداریے کا بڑا حصہ اسی خاص نمبر کی تعریف میں صرف کیا ہے۔ ڈاکٹر لوتی نے ثابت کیا تھا کہ فرانسیسی ادیبوں کا دماغ بنجر ہو کے رہ گیا ہے۔ اس اخبار نے امید ظاہر کی ہے کہ فرانسیسی ابھی دنیا کو بہت کچھ دے سکتے ہیں،

یعنی قدامت پرست انگریزوں تک کو یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ یورپ کی تہذیبی اقدار جنہیں یورپ نے اپنے خون جگر سے پالا ہے، بعض لوگوں کو ناگوار گزر رہی ہیں، اور وہ اسپنڈر جیسے لوگوں کے ذریعے انہیں مٹانا چاہتے ہیں چونکہ ہم نے بھی یورپ اور خصوصاً فرانس سے بہت کچھ سیکھا ہے، اور فرانسیسی ادب آج بھی ایشیا کے لیے بہت بڑی معنویت رکھتا ہے، اس لیے میں اگلی دفعہ ڈاکٹر لوتی کے مضمون کا خلاصہ پیش کروں گا۔ ان کے اعتراضات کا جواب دوں گا اور اپنی بساط بھر یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ فرانسیسی کیا چیز ہے، اور ہم ایشیا والوں کے لیے فرانسیسی ادیب کیا اہمیت رکھتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ زر پرستوں کی ادبی تنقید پر بھی روشنی ڈالوں گا جو عیسوی اقدار پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود برنانو پر موریاک کو ترجیح دیتی ہے اور ایمانویل مونیئے جیسے عیسائی کا مذاق اڑاتی ہے کیونکہ یہ دونوں دنیا میں امن چاہتے تھے۔

(نومبر ۱۹۵۵ء)

زرپرستوں کی تنقیدِ ادب

اسپنڈر صاحب کے رسالے میں فرانسیسی دانشوروں کے خلاف جو مضمون نکلا ہے، اس دفعہ میں اس کا خلاصہ پیش کر کے صاحب مضمون کے اعتراضات کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن اس پرچے میں جگہ اتنی کم ہے کہ بات نامکمل رہ جاتی، لہٰذا وہ بحث آئندہ پرچے کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔ بہرحال، اسپنڈر صاحب کا رسالہ ایسی باغ و بہار چیز ہے کہ نئے سے نئے موضوعات فراہم کرتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ رسالہ اتنے دن سے جاری ہے اور مَیں نے اس سے پہلے کبھی پڑھا ہی نہیں۔ اگست کے شمارے میں فرانسیسی دانشوروں پر ایک مضمون دیکھ کر مَیں نے پورے پرچے کا جائزہ لیا تو ایک بالکل ہی نیا عالم نظر آیا۔ والیری کی وفات پر ایلیٹ نے کہا تھا کہ جس چیز کو ہم یورپ کہتے ہیں، وہ مرچکا ہے، اور آج اس کا آخری نمائندہ بھی رخصت ہوا۔ جن اقدار کے غائب ہو جانے کو ایلیٹ نے یورپ کی موت سے تعبیر کیا ہے، ان کا حشر دیکھنا ہو تو اسپنڈر صاحب کا رسالہ پڑھیے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے فرانس کے زبردست نقاد ژولیاں باں دا نے ایک کتاب لکھی تھی "عالموں کی غداری" یہ فقرہ ایک عرصے تک یورپ کی تنقید میں ضرب المثل بنا رہا۔ اس کتاب میں باں دا نے کہا یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ سے یورپ میں عالم یا اہل قلم کا فریضہ یہ رہا ہے کہ ہر قسم کے تعصب اور جانبداری سے بے نیاز ہو کر صداقت کی تلاش کی جائے، لیکن بیسویں صدی کے ادیب نظریہ بازی اور سیاست میں پھنس کر اپنے اس فریضے سے غداری کر رہے ہیں اور صداقت کی جستجو چھوڑ دی ہے۔ باں دا نے یہ بات ۳۶ء کے قریب محسوس کی تھی لیکن اب یورپ کے بعض ادیب (جن میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو عیسائیت کا دم بھرتے ہیں) پستی کی ایک اور منزل بھی طے کر چکے ہیں۔ باں دا کے ذہن میں جو ادیب تھے، وہ تو سیاسی جوش میں اندھے ہو کر صداقت کو دیکھ نہیں سکتے تھے، لیکن اب

بعض ادیبوں نے سیاسی عقیدے کی خاطر نہیں، بلکہ چند ناگفتہ بہ وجوہات کی بنا پر صداقت کو جان بوجھ کر مسخ کرنے کا شیوہ اختیار کیا ہے۔ ۳۶ء کے ادیب تو صداقت کے بجائے سیاست کے پرستار بن گئے تھے، ۵۵ء کے بعض ادیب باطل کو اپنا مذہب بنا رہے ہیں اور ایسے ادیبوں کو زر پرست سماج میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ جیسا عظیم شاعر پاگل خانے میں بند ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سود خوری کی بدولت ادب اور فن میں گھن لگ جاتا ہے، اور تاج محل صرف وہی قوم بنا سکتی ہے جو سود خوری کو حرام سمجھتی ہو۔ اس کے برخلاف اسپنڈر جیسے پانچویں درجے کے شاعر کو برطانوی روح کا نمائندہ بنا کر ملکوں ملکوں پھرایا جاتا ہے، کیونکہ اسپنڈر صاحب جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے کے قابل نہیں۔ صداقت کی جستجو ادب کا فریضہ ہے — اسے وہ ازمنہ وسطیٰ کا دقیانوسی عقیدہ سمجھتے ہیں۔ مغرب کے ادیبوں میں اسپنڈر جیسے لوگوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ سیاست یا فلسفہ تو الگ رہا، ادبی تنقید تک میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس رائے کے پیچھے کون سا مقصد کام کر رہا ہے۔ مثلاً لایونل ٹرلنگ امریکہ کے ان نقادوں میں سے ہیں جو ۵۵ء میں بھی آزاد خیالی کی روایت پر قائم ہیں، اور اخلاقی جرات ان میں اتنی ہے کہ "پرسپکٹو" جیسے "سرکاری" رسالے کے اداریے میں انہوں نے لکھ دیا کہ امریکہ میں بھی اتنی ہی اچھائیاں، برائیاں ہیں جتنی کسی اور قوم میں ہوتی ہیں، اور اچھے ادیب کسی ملک کی نمائندگی نہیں کرتے، ان کا کام تو لکھنا ہے۔ ایسے خیالات اسپنڈر جیسے لوگوں کے لیے موت کا پیغام ہیں، چنانچہ اسپنڈر کے رسالے میں ان کی کتاب پر ایک ڈھیلا ڈھالا تبصرہ کیا گیا اور ان کے خلاف یہ بات ڈھونڈ کے نکالی گئی کہ ان کو لکھنا نہیں آتا۔

جب ادبی تنقید میں دیانتداری کا یہ حال ہو تو سیاست سے متعلق چیزوں میں اسپنڈر صاحبان جو کچھ کر گزریں، وہ تھوڑا ہے ("صاحبان" میں نے اس لیے کہا کہ میرے نزدیک اسپنڈر کا نام ایک خاص قسم کے ادیبوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے)۔ اب اس کی بھی ایک مثال دیکھیے۔ اسپنڈر کے رسالے میں ایک پروفیسر صاحب چین میں دانشوروں کی حالت زار دکھاتے ہوئے یہ فرما گئے کہ فلاں ماہر عمرانیات اپنے عہدے سے برطرف کر دیا گیا ہے اور بڑی مصیبت میں دن گزار رہا ہے۔ اس کے جواب میں کسی دیانت دار آدمی نے خط لکھا کہ صاحب تخیل سے اتنا کام نہ لیجیے، میں تو اس سے مل کر آ رہا ہوں، اسے تو بڑی ذمہ داری کا کام سپرد ہوا ہے۔ وہ نہایت خوش و خرم ہے۔

احتجاج کا دوسرا خط مشہور نقاد ولیم ایمپسن نے لکھا جنہیں سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں، لیکن اسپنڈر صاحبان کی اتنی کھلی بے ایمانی دیکھ کر انہیں بھی غصہ آگیا۔ مزے کی چیز پروفیسر صاحب کا جواب الجواب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ شخص کیا کر رہا ہے، میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مصیبت میں ہی ہوگا، لیکن اگر واقعی خوش و خرم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اخلاقی اعتبار سے کچا نکل گیا۔

یعنی اگر کوئی آدمی اسپنڈر صاحبان کی اجازت کے بغیر اپنے بال بچوں میں بیٹھ کر ہنستا ہے تو وہ گردن زدنی ٹھہرا!

زر پرستی مغرب کے بہت سے ادیبوں کو یہاں لے آئی ہے۔

اردو کے ادیب کہیں کہ پھر ہم سے کیا!

جی، آپ سے بھی اس کا تعلق ہے، چاہے آپ اسے محسوس نہ کریں۔ ایذرا پاؤنڈ کو تو خیر چھوڑیے، اسے تو اسپنڈر صاحب گولی مار ہی دیں گے، لیکن اب تو ہماری یونیورسٹیوں میں ایلیٹ جیسے رجعت پسند شاعر کو پڑھنے کی بھی اجازت نہیں رہے گی کیونکہ وہ بڑا شاعر ہے اور اس لیے خطرناک ہے۔ اب تو آپ کو ایلیٹ کی بجائے رابرٹ فراسٹ پڑھایا جائے گا۔ اگر آپ رابرٹ فراسٹ کی اہمیت کے قائل نہ ہوں تو خواجہ منظور حسین سے پوچھ آیئے جنہیں اردو کے ادیبوں کی واحد انجمن (حلقہ ارباب ذوق) اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر چکی ہے۔

(دسمبر ۱۹۵۵ء)

جوابِ آں تنقید

اسپنڈر صاحب کے رسالے میں جو مضمون فرانسیسی دانشوروں کے خلاف شائع ہوا ہے، اس کا خلاصہ پیش کرنا اور اس کا جواب دینا۔ میں اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ صاحب مضمون کو اصل میں چند ذہنی رجحانات پر اعتراض ہے جو فرانسیسی ادیبوں کے یہاں ملتے ہیں اور جو بعض لوگوں کو ناگوار گزرے ہیں۔ سب سے خطرناک چیز تو فرانسیسیوں کی ذہنی آزادی ہے۔ موریاک جیسا شخص جو نہایت معتبر اور شریف آدمی تھا۔ ایک دم سے اعلان کر دیتا ہے کہ کیتھولک لوگوں کو بائیں بازو والی جماعتوں کو ووٹ دینا چاہیے۔ اس قسم کی ذہنی آزادی زر پرستوں کو گراں گزرتی ہے۔ چنانچہ اسپنڈر صاحب کا یہ جہاد فرانسیسیوں کے خلاف نہیں بلکہ انسانی ذہن کے خلاف ہے، انسانی تاریخ کے خلاف ہے۔ اردو کے ادیبوں کو تو اسپنڈر صاحب یہ کہہ کر نظرانداز کر سکتے ہیں کہ جو قوم سیاسی اعتبار سے کمزور ہو ہم اس کا ادب کیوں پڑھیں، لیکن فرانسیسی ادیب دنیا بھر میں فساد مچاتے ہیں — اپنی قوم کی سیاسی کمزوری کے باوجود کسی بڑے فرانسیسی ادیب کے منہ سے کوئی بات نکلی اور اس کی گونج ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اسی لیے فرانسیسی اوروں سے زیادہ خطرناک ہیں، اور تہذیبی آزادی کی انجمن کو پریشان رکھتے ہیں، پھر یہ مضمون اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ فرانسیسی ادیبوں کو تو زر پرست سوچنے سے نہیں روک سکتے، کیونکہ انہیں اپنے پڑھنے والوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مگر جو ملک اقتصادی اعتبار سے کمزور ہیں اور جہاں ادیبوں اور پڑھنے والوں میں ایسا تعاون نہیں، وہاں بین الاقوامی زر پرستی خیالات پر بڑی آسانی سے پابندی عائد کر سکتی ہے، اسی لیے میں ڈاکٹر لوتی کے مضمون کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ آپ کے لیے کس قسم کے خیالات حرام قرار دیے جاسکتے ہیں۔

فرانسیسی دانشوروں پر تہذیبی آزادی کی انجمن کے اعتراضات نمبروار سنیئے:

۱- فرانس میں بائیں بازو کے ادیبوں نے یہ بے ایمانی کی ہے کہ "دانشور" کا لفظ اپنے لیے محفوظ کرکے بیٹھ گئے ہیں، جیسے دوسرے لوگ دانشور ہوتے ہی نہیں۔ اٹھارہویں صدی سے ہر بڑا فرانسیسی ادیب "ذمہ دار ادب" کا حامی رہا ہے، چاہے زبان سے نہ کہتا ہو۔ ان لوگوں کا مذہب انسانیت پرستی ہے۔ چاہے یہ لوگ اپنے آپ کو معلم اخلاق بلکہ اخلاقیات کے پاسبان سمجھتے ہیں، اور بڑے کروفر کے ساتھ دنیا بھر کی سیاست کے متعلق فیصلے دیا کرتے ہیں، انہیں ٹھوس حقیقتوں سے کوئی واسطہ نہیں، بنیادی اصولوں کے جھگڑے میں پڑے رہتے ہیں۔

صاحب مضمون کا اصل اعتراض یہ ہے کہ فرانسیسی ادیب آزادی، انصاف اور مساوات جیسی اخلاقی اقدار پر ایمان کیوں رکھتے ہیں، اور انہیں زر پرستوں کی سیاست پر کیوں عائد کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ "حقیقتوں" کو اخلاقیات سے آزاد ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی غلام بن جائے تو اسے حقیقت سمجھ کے قبول کرلے، اپنی پستی یا دوسروں کے ظلم کو اخلاقی معیاروں سے نہ جانچے۔ پھر تہذیبی آزادی کی انجمن چاہتی ہے کہ لوگ گاجر مولی پر نظمیں لکھیں اور کسی سماجی ذمہ داری کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ یعنی رابرٹ فراسٹ اور کارل سینڈ برگ بن جائیں۔ سارتر، کامیو اور مالرو نہ بنیں کیونکہ یہ لوگ زر پرستوں کے لیے دردِ سر ہیں، غلاموں کے دل میں انسانی وقار کا خیال پیدا کرتے ہیں۔ بچارے اسپنڈر صاحب کے لیے بھی تو بڑی پریشانی ہے جو لوگ سارتر کو پڑھتے ہیں، وہ ان سے ہاتھ نہیں ملاتے۔ ایسی اخلاقیات کس کام کی۔

۲- بائیں بازو کے ادیبوں کا فریضہ تھا، سماج پر تنقید کرنا اور ایک بہتر دنیا کے خواب دیکھنا۔ پیغمبری کا یہ منصب روس کے پاس چلا گیا اس لیے فرانسیسی دانشوروں کے پاس کوئی کام نہیں رہا مگر پیغمبری کا ڈھونگ انہوں نے ابھی تک نہیں چھوڑا۔ نہ تو ان کے دل میں معروضی مطالعے کی خواہش ہے نہ تجزیے کا حوصلہ، نہ اپنے خیالات میں تنظیم پیدا کرنے کا وقت۔ بس پیغمبر بننے کا شوق ہے۔ دنیا میں کسی پر بھی ظلم ہو رہا ہو، سب سے پہلے فرانسیسی ادیب احتجاج کرتے ہیں کیونکہ انہی احتجاجوں کے بل پر ان کی پیغمبری قائم ہے ورنہ انہیں تو بس اپنے آپ سے مطلب ہے۔ گھر کے تالاب کی چھوٹی سی لہر کو انسانی روح کی نشوونما کا ایک درجہ بنا کے دکھاتے ہیں۔

ڈاکٹر لوتی کو جو چیز ناگوار گزر رہی ہے، وہ بس یہی ہے کہ فرانسیسی ادیب مظالم کے خلاف، سرمایہ داری اور استعمار پرستی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں لیکن جو لوگ زر پرستی کے شکار ہیں، ان کے لیے فرانسیسی ادیب اسی لیے اہم بن جاتے ہیں۔ ایسا جگر دار دنیا میں اور کون ہے جو خود اپنے ملک کے مفاد کے خلاف لکھے؟ فرانسیسی استعمار کا جیسا تجزیہ آپ کو فرانسیسی ادیبوں کے یہاں ملے گا' ویسا خود مراکش یا انڈو چائنا والوں کی تحریروں میں نہیں ہوگا۔ فرانسیسی ادیبوں کی یہ پیغمبری اسپنڈر صاحبان کے لیے ڈھونگ سہی، مگر اس کا حال ان لوگوں سے پوچھیے جو سیاسی یا اقتصادی طور پر غلام ہیں' اور جنھیں اسپنڈر صاحبان کی طرف سے تحفے میں بس تہذیبی آزادی کی انجمن ملتی ہے۔ ڈاکٹر لوتی کا خیال ہے کہ فرانسیسی دانشوروں کے پاس اب کوئی کام نہیں رہا' بس پیغمبری کا بہروپ باقی ہے۔ لیکن سر ہربرٹ ریڈ' کامیو کی کتاب "باغی" کے متعلق کہتے ہیں کہ یورپ کے اوپر جو مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی' وہ اس کتاب کے شائع ہونے سے چھٹ گئی ہے۔ ہم تو کمزور قوم کے لوگ ہیں' ہمیں کیا معلوم کہ ان دونوں میں سے کون ٹھیک کہتا ہے' اسپنڈر صاحب ہی بتائیں یہ تو شاہاں بشاہاں می دہند کا معاملہ ہے۔ رہی کمزور قوموں کی بات تو مثلاً جاپان میں ادیبوں کی دو جماعتیں بن گئی ہیں' ایک سارتر کی پیرو ہے دوسری کامیو کی۔ اور فرانسیسی ادیبوں کے خیالات میں کوئی نظام ہے یا نہیں' یہ تو اسی بات سے ظاہر ہے کہ وہ تالاب کی لہر کو انسانی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیتے ہیں۔ یعنی وہ جانتے ہیں کہ اصل فلسفہ وہی ہے جو ہمارے چھوٹے چھوٹے افعال میں بھی معنی پیدا کر سکے۔ حقیقت نگاری کوئی فلسفہ نہیں بلکہ وہ ادراک ہے جو کسی چیز کو بھی بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ ویسے تو ڈاکٹر لوتی بھی اس چیز کی تعریف ہی کرتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ فرانسیسی ادیب میونسپل الیکشن کا سلسلہ بین الاقوامی سیاست سے ملا دیتے ہیں۔

۳۔ فرانسیسی ادیب صحیح علم اور تجزیے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کی ہر بات تجریدی ہوتی ہے۔ فرانس کے مسائل کے بارے میں تو سوچتے نہیں' ابدی اصولوں میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت ختم ہو چکی ہے' اس لیے سیاست اختیار کی ہے۔

یعنی اعتراض پھر وہی ہے کہ فرانسیسی ادیبوں کے لیے سیاست اتنی اہم کیوں ہو گئی ہے اور وہ اخلاقی اقدار پر اتنے کیوں مصر ہیں' زر پرستوں کو من مانی کیوں نہیں کرنے دیتے۔ جناب' کمزور قوموں میں — اور خود اسپنڈر صاحبان کے ملکوں میں بھی'

فرانسیسیوں کی پیغمبری اسی لیے چل رہی ہے کہ ان کے لیے ہر مقامی مسئلہ ایک کائناتی مسئلہ ہے۔ فرانسیسی ادیب اپنے ملک کے مسائل کے متعلق سوچتے ہوئے پوری انسانیت کے مسائل کے متعلق سوچتے ہیں۔ اسی لیے سارتر اور کامیو کی لڑائی جاپانی ادیبوں کی لڑائی بن جاتی ہے اور فرانس کا مقامی مسئلہ پاکستان یا ہندوستان یا انگلستان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ فرانسیسی ادیب اپنے چھوٹے موٹے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی عمل اور انسانی تقدیر پر روشنی ڈالتے ہیں، اسی لیے دنیا ان کی بات سنتی ہے۔ مگر ڈاکٹر لوتی کہتے ہیں کہ فرانسیسی ادیب زمان و مکان سے ماورا ہیں! رہی تخلیقی صلاحیت تو اس کا حال انگلستان اور امریکہ کے پبلشر بتائیں گے۔ انگلستان اور امریکہ میں تو اب پروفیسر ہی پروفیسر رہ گئے ہیں۔ سال بسال ایسی کتابوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جنہیں پروفیسر ہی پڑھ سکتے ہیں، دوسری طرف فرانس کا کوئی بھی ادبی ہفتہ وار اخبار اٹھا کے دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ تخلیقی صلاحیت کسے کہتے ہیں۔

۴۔ فرانسیسی ادیبوں کا دعویٰ ہے کہ ہم پوری انسانی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہمارا کام دنیا کو متحد کرنا ہے۔ اس معاملے میں فرانسیسی ادیبوں کے باہمی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ کاروباری معاملہ ہے۔ فرانس کے لیے ادب ایک تجارت ہے۔ چنانچہ اپنی تہذیبی فوقیت برقرار رکھنے کے لیے فرانسیسی ادیب وقتاً فوقتاً ظلم اور بے انصافی کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں تاکہ ساری دنیا انہیں اپنا نمائندہ تسلیم کرلے۔

اگر فرانسیسی ادیب اپنی کتابیں بیچنے کی خاطر فرانسیسی سلطنت ختم کرنے کو تیار ہیں تو ایسی تجارت دنیا کے لیے رحمت ہے۔ ذرا اسپنڈر صاحب بھی تو کسی دن ایسی تجارت کا حوصلہ دکھائیں۔ وہ ایٹم بم کی دھونس میں اپنی دعوتیں کراتے پھرتے ہیں۔

۵۔ فرانسیسی ادیبوں کے لیے ادب ایک تجارت ہے، اور فرانس کی حکومت بھی اس کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ چنانچہ پیرس یونیورسٹی میں لوتریاموں، ساد اور برتوں جیسے گندے مصنف پڑھائے جاتے ہیں اور کوکتو جیسا آدمی فرانس اکادمی کا رکن ہے۔

تہذیبی آزادی کی انجمن والے چونکہ خود کاروباری لوگ ہیں، اس لیے وہ یہ حقیقت نہیں دیکھ سکتے کہ فرانسیسی ادیبوں کی اپنے پڑھنے والوں کے دل میں کیا جگہ ہے اور حکومت کو اس رائے عامہ کے سامنے کس طرح دبنا پڑتا ہے۔ کوکتو کو فرانس اکادمی میں حکومت نے نہیں پہنچایا، بلکہ اس کے پڑھنے والوں نے۔

۶۔ فرانس کی تہذیب کی بنیاد عقلیت، انفرادیت اور جاگیرداری پر ہے۔ فرانس

صنعتی تہذیب کو قبول نہیں کرسکا۔ اسی لیے فرانسیسی ادیب شکست خوردہ ذہنیت کے اسیر ہیں، اور انہوں نے "امریکیت" کو اپنے لیے ہوا بنا رکھا ہے۔

اگر صنعتی تہذیب کو قبول کرنے کے معنی ہیں زر پرستی پر ایمان لانا تب تو واقعی فرانسیسی ادیبوں نے اسے کبھی قبول نہیں کیا، اور نہ اس کی امید نظر آتی ہے، لیکن جہاں تک صنعت پر مبنی سماج کو اخلاقی اعتبار سے سمجھنے کا معاملہ ہے، یہ کام سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جرات کے ساتھ بودیلیئر نے کیا ہے۔ مشینوں کو انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی میں جذب کرنے کی کوشش سب سے پہلے اپولی نیئر نے کی۔ دوسرے ملکوں کے ادیب تو یہی شکایت کرتے رہے کہ مشینوں نے انسان کو فطرت سے الگ کر دیا۔ سیں تگزوپری نے دوسرا رخ پیش کیا کہ مشین انسان کو فطرت سے قریب لاتی ہے۔ فرانسیسی ادیبوں نے مشین کو رد نہیں کیا، بلکہ اسے انسانیت عطا کرنی چاہی ہے، انسان کو مشین بن جانے سے بچانا چاہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تہذیبی آزادی کی انجمن یہ بات نہیں چاہتی۔

۷۔ فرانسیسی ادیبوں میں جو لوگ کیتھلک ہیں، وہ "صنعتی عوامی تہذیب" کو بالکل ہی رد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی آج کل کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

یوں تو دوسرے ملکوں میں بھی بعض ادیب کیتھلک ہیں، لیکن وہ زر پرستی کے حامی بن کے رہ گئے ہیں۔ انہیں بس حضرت عیسیٰؑ کا ترحم یاد ہے، جس کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زر پرستی کے خلاف احتجاج نہ کیا جائے۔ مگر فرانسیسی ادیبوں کی عیسائیت بڑی خوفناک چیز ہے، خود یورپ کے خلاف بھی بغاوت کر بیٹھتی ہے۔ فرانسیسی ادیبوں کو حضرت عیسیٰؑ کا انصاف اور غصہ بھی یاد ہے۔ انہیں یاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے تاجروں کو معبد سے نکال دیا تھا۔ اسی لیے برنانو اور ایمانویل مونیے جیسے عیسائی اپنے آپ کو قدامت پسند کہنے کے باوجود زر پرستی کے خلاف اتنا شدید احتجاج کرتے ہیں جتنا کوئی اور کرے گا۔ پھر یہ لوگ انصاف اور صداقت کے معاملے میں ذرا بھی رعایت سے کام نہیں لیتے، مثلاً پانچ چھ سال پہلے مغرب کے کچھ ادیبوں کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا تھا کہ ادیبوں کا ایک وفد سائیبریا جا کے وہاں کے حالات کی تحقیقات کرے۔ مونیے نے اس مطالبے کی حمایت کرتے ہوئے ایک بات اور بڑھائی کہ ادیبوں کا دوسرا وفد شمالی افریقہ جا کے فرانسیسیوں کے مظالم کی تحقیقات کرے۔ اس پر "انصاف پسند" چپ ہو کے بیٹھ رہے۔ فرانس کے کیتھلک ادیب اسی طرح کی خطرناک بات کہہ گزرتے ہیں جیسے پچھلے مہینے موریاک نے کہہ دی۔ پھر

تہذیبی آزادی کی انجمن برنانو اور مونیے کو ترقی کا دشمن کیوں نہ بتاتے؟ مگر مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس انجمن کا انگریزی رسالہ برنانو کا مذاق اڑاتا ہے، اور فرانسیسی رسالے میں برنانو کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں، کیونکہ فرانس میں برنانو کا نام چلتا ہے۔

۸۔ سارے فرانسیسی ادیبوں کے یہاں بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ فرد کو مشین کا پرزہ بن کے نہیں رہ جانا چاہیے۔ اسے وہ "انسان کی آزادی" کہتے ہیں۔

سارے اعتراضات کا جواب تو مَیں دے آیا ہوں۔ اب یہ آپ خود سوچیے کہ تہذیبی آزادی کی انجمن کو آزادی کا یہ تصور کیوں بُرا لگا۔ اگر یہ تصور غلط ہے تو روس میں کیا برائی ہے؟ اور اگر یہ تصور درست ہے تو فرانسیسی ادیبوں کے خلاف یہ جہاد کیوں؟ اس سوال پر غور کیجیے، اور اگر کہیں اردو کے ادیبوں سے ملاقات ہو تو انہیں بھی بتائیے کہ اس جھگڑے کا اردو ادب کے مستقبل سے کیا تعلق ہے —

(جنوری ۱۹۵۶ء)

فراق صاحب کی تنقید غزل

آج کل اردو کے اکثر نقاد اس مسئلے سے الجھ رہے ہیں کہ غزل کیا چیز ہے، ہمارے ادب میں اس کی کیا جگہ ہے، اس کا مستقبل کیا ہے۔ پچھلے دو تین سال کے عرصے میں اس موضوع پر رسالوں کے سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں صفحے خرچ ہو چکے ہیں لیکن فی الجملہ بات وہیں کی وہیں ہے جہاں سے چلی تھی۔ نقاد اسی ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ غزل کی صنف کے متعلق ہمارے شعور میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ اگر کسی چیز کو اضافہ کہا جاسکتا ہے تو وہ فراق صاحب کا ایک پرانا مضمون ہے۔ یہ مضمون بیس سال پہلے "نگار" میں شائع ہوا تھا اور اب ادارہ فروغ اردو نے اُسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس مضمون کو اضافہ مَیں یوں کہتا ہوں کہ یہ بیس سال پرانی چیز ہے، اور لوگ اس سے عموماً واقف ہیں۔ اس عرصے میں فراق صاحب اردو غزل کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس لیے جن لوگوں نے فراق صاحب کی اور تنقیدی کتابیں غور سے پڑھی ہیں، ان کے لیے شاید اس چھوٹی سی کتاب میں کوئی نئی بات نہ ہو، لیکن یہ پہلا مضمون ہے جس میں نیاز فتح پوری کے قول کے مطابق فراق صاحب کی تنقیدی بصیرت پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی ہے، بلکہ ان کی یہ بصیرت اس زمانے میں دو چار دوستوں کے سوا اوروں کے لیے "راز" ہی تھی۔

اس تمہید سے میرا مقصد یہ نہیں کہ اردو غزل گوئی کے بارے میں یہ مقالہ صرف ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور جو لوگ فراق صاحب کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس کا پڑھنا ضروری ہے، مَیں تو فراق صاحب کے مداحین کو ہی یاد دلا رہا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے وہ زمانہ یاد رکھیں جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ ویسے یہ کتاب آج بھی پڑھنے کی چیز ہے اور آئندہ بھی رہے گی، کیونکہ غزل کو صنف کی حیثیت سے آج تک نہ کوئی اس طرح سمجھ سکا ہے نہ پیش کر سکا ہے۔ خصوصاً غزل کے مختلف عناصر کے جمالیاتی

پہلوؤں کو اس طرح تجربے میں لانے کی یہ صلاحیت آج تک کسی نقاد نے ظاہر نہیں کی، اگر کسی نقاد میں چھپی پڑی ہو تو اور بات ہے، دوسرے نقاد غزل کی ظاہری خصوصیات سے خارجی طور پر بحث کرتے ہیں۔ فراق صاحب نے مطلع اور مقطع جیسی چیزوں کی بھی جمالیاتی اور باطنی تفسیر پیش کی ہے۔ گو یہ مضمون لکھا تو گیا تھا مناظرے اور مباحثے کی غرض سے، ایک صاحب نے نظم کی حمایت میں غزل کی مخالفت کی تھی، فراق صاحب نے جواب میں یہ مضمون لکھا، مگر اس مباحثے نے فراق صاحب کے وجدان اور ذہن کو جس طرح جگا دیا، یہ آپ کتاب پڑھیں گے تو معلوم ہو گا۔

چونکہ بحث غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے بارے میں بھی تھی، اس لیے فراق صاحب نے نظم کو بھی ایک صنف کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہاں اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ فراق صاحب کے اس مضمون میں نظم سے مراد وہ نظمیں ہیں جو اس زمانے میں ہمارے یہاں لکھی جا رہی تھیں، مغرب کی نظم سے یہاں بحث نہیں۔ فراق صاحب نے خود بھی اس کی تصریح کر دی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی وہ اچھی نظمیں بھی خارج از بحث ہیں جو پچھلے پندرہ سال میں لکھی گئی ہیں، مثلاً فیض کی نظمیں، یہ بات بھی فراق صاحب نے ایک نوٹ میں واضح کر دی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ انہوں نے جو باتیں بیس سال پہلے کی اردو نظم کے بارے میں کہی ہیں، وہ اس پندرہ سال کے دور کی بہت سی نظموں پر بھی عائد ہوتی ہیں، بہرحال، نظم گو حضرات بھی اس کتاب سے کم از کم یہ تو معلوم کر ہی سکتے ہیں کہ ان کے یہاں کچاپن کہاں رہ جاتا ہے، اور ان کی نظمیں معمولی غزل گو شعرا کے درجے کو بھی کیوں نہیں پہنچ سکتیں۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں، یہ کتاب اردو غزل کی تاریخ نہیں، بلکہ اردو غزل کو ایک صنف کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ صرف نظریہ بازی بھی نہیں، بلکہ عملی تنقید ہے (جیسی فراق صاحب کی ہر تنقید ہوتی ہے)۔ فراق صاحب نے صرف غزل کی خوبیوں کی طرف اشارے نہیں کیے، بلکہ مثالیں دے کر ہمیں وہ خوبیاں محسوس کرا دی ہیں۔ یوں بعد میں تو فراق صاحب کی تنقید نے بڑی بڑی بصیرتیں حاصل کی ہیں لیکن اس بیس سال پرانے مضمون میں بھی قدم قدم پر چونکانے والی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کی جذباتی شاعری کے متعلق ان کے بیانات عام طور سے یا تو لوگ اس مدرسے کی شاعری میں کھو جاتے ہیں اور اپنے ذوق کو ہمیشہ کے لیے تباہ یا محدود کر لیتے ہیں یا پھر اس شاعری کو

یک قلم رد کر دیتے ہیں۔ فراق صاحب نے اس مدرسہ شعر کے دونوں پہلوؤں کو دیکھا ہے، بلکہ اس سے بھی مشکل کام یہ سرانجام دیا ہے کہ اردو غزل کی تاریخ میں اردو غزل کے احیاء کی تاریخ میں جذباتی اسکول کی جگہ متعین کی ہے۔ اسی طرح امیر مینائی اور داغ کی طربیہ شاعری کو کسی طرح کے تعصب کے بغیر پیش کیا ہے، یہ دو مثالیں میں نے اس لیے چھانٹیں کہ ان دونوں مدرسوں کی شاعری کو صحیح طور سے سمجھنا آج ہمارے لیے ہمیشہ سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

ان دو اسلوبوں کی شاعری کے ضمن میں فراق صاحب نے غم اور نشاط کے متعلق جو بحث کی ہے، وہ بڑی سے بڑی شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور خود فراق صاحب کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ انہوں نے اردو شاعری کو کیا کچھ دیا ہے، ان صفحوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کتاب میں سے چند صفحے نہ سہی تو چند ٹکڑے ضرور نقل کر دوں، لیکن ایسی چیزیں خود دریافت کرنے میں جو مزا آتا ہے، میں اس سے آپ کو محروم نہیں کرنا چاہتا۔

(مارچ ۱۹۵۶ء)

مجاز کی موت پر

یہ بڑا ظلم ہے کہ مجاز کے انتقال پر ان کی یاد میں مضمون لکھا جائے اور ان کی شخصیت کا بھرپور تذکرہ نہ کیا جائے۔ بہت سے ادیب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ادب ان کی شخصیت پر حاوی آ جاتا ہے اور ہم ان کی شخصیت سے دلچسپی لیتے ہیں تو ان کی تخلیقات کے طفیل، لیکن مجاز نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی یا بنالی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ان کے کلام سے واقف ہونا ضروری نہ تھا؛ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ آخر ان کی شاعری کو ختم کرکے رکھ دیا۔ مجاز صرف رند مشرب یا ہنسوڑ نہ تھے، اُن کے اندر کچھ ایسی گدگداہٹ تھی کہ دوسرے تو خیر اس سے لطف لیتے ہی، وہ خود بھی اس کے مزے سے واقف ہو گئے تھے، اور بڑی جلدی اس کے سرور میں آگئے۔ یہ چیز ان کی شاعری کو تو مار گئی لیکن اس کی بدولت وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ایک افسانہ بنے رہیں گے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی جاذب نظر شخصیت کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میں نے انہیں بس ایک ہی دفعہ دیکھا ہے یعنی جسے دیکھنا کہہ سکیں۔ جب میں نے لکھنا لکھانا شروع کیا ہے تو مجاز افسانہ بن چکے تھے۔ جن نظموں کی بدولت انہیں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ لکھی جاچکی تھیں اور بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ اس فوری مقبولیت کی وجہ سے مجاز کے اندر بھی تخلیقی کام کی طرف سے ایک بے نیازی آگئی تھی اور وہ قہقہہ پروری میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ جب ان سے ملاقات ہوئی تو ایک دوری کا احساس درمیان میں حائل رہا اور وہ بزرگ ہی معلوم ہوتے رہے، سڑک چلتے کی علیک سلیک سے زیادہ تعلقات نہ بڑھنے پائے۔ ان کی معصوم شرارت کا مظاہرہ میں بس ایک ہی دفعہ دیکھ سکا اور وہ بھی عجیب حالات میں۔ فراق صاحب اور ان کے ایک عزیز دوست کے

درمیان چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں جس پر فراق صاحب کو بڑا رنج تھا اور وہ چاہتے تھے کہ صلح صفائی ہو جائے۔ چنانچہ وہ مجاز کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن تماشا یہ ہو رہا تھا کہ جب فراق صاحب یہ سمجھتے کہ میں نے مجاز کو قائل کر دیا تو مجاز بیچ میں کوئی ہلکا پھلکا لطیفہ چھوڑ دیتے اور فراق صاحب جھنجلا کے اپنی بات پھر الف سے شروع کرتے۔ اسی ہیرا پھیری میں رات کے بارہ بج گئے۔ فراق صاحب بار بار بگڑ کے کہتے — "مجاز، میں جانتا ہوں کہ تمہارے اس چلبلے پن میں بڑی معصومیت ہے، لیکن ایسی معصومیت کی وجہ سے قومیں برباد ہو گئی ہیں۔" لیکن مجاز ہیں کہ اس بات میں بھی کوئی لطیفہ نکال لیتے ہیں۔

یہ مجاز کی عام زندگی کا عام انداز تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ہنسی میں اُڑا دیا۔ یہ مجاز کا المیہ ہے۔ ان کی شاعری کو موت نے نہیں بلکہ خود اُنہی نے ہم سے — چھین لیا۔ بہرحال مجاز کی شخصیت ان کے جاننے والوں کو بہار ضرور دکھلا گئی، اور ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ ایسا بے لوث قہقہہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہ قہقہہ بھی کچھ کھوئے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔ محرومیوں کی زندگی بسر کرنے کے بعد بھی ہنسی میں زہر تو زہر، تلخی تک نہ آنے پائے۔ یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔ اسی لیے مجاز کی شاعری سے کچھ زیادہ مناسبت نہ رکھنے کے باوجود میرے دل میں ان کا ہمیشہ احترام رہا ہے۔ اسے میری بدتوفیقی کہیے کہ اُن کے ساتھ کبھی کھُل کے ہنس نہیں سکا۔

میں نے جو باتیں کہی ہیں، ان میں سے بعض غالباً ایسی ہیں جو کسی کے مرنے پر نہیں کہی جاتیں۔ لیکن میں ادیبوں کی موت کے سلسلے میں کچھ بے رحم واقع ہوا ہوں۔ ادیب بننا اور اوکھلی میں سر دینا ایک ہی بات ہے جو چوٹوں سے ڈرے وہ اس طرف کیوں آئے؟ دوسرے لوگ ممکن ہے منکر نکیر سے بچ جائیں مگر ادیب کے لیے کوئی مفر نہیں، اس لیے میں تعزیتی جذبات کا سہارا لینے کے بجائے اپنی رائے کا صاف صاف اظہار کروں گا۔

شاعری میں مجاز ابھی تک اپنی آواز نہیں پا سکے تھے، ویسے وہ کئی آوازوں میں بولے۔ ایک تو ان کے یہاں خاص تقلیدی رنگ ہے، جیسے "ریل گاڑی"۔ دوسرے زمانے کے رواج کے مطابق انقلاب پسندی ہے۔ تیسرے نوجوانی کی طرب اندوزی اور شوخی جیسے "نورا کی چارہ گری"۔ چوتھے محرومیوں سے پیدا ہونے والی افسردگی، جھنجلاہٹ اور تلخی

ہے جیسے "اے غم دل کیا کروں۔" ان میں سے کوئی رنگ بھی پختہ نہیں ہو سکتا۔ اور انہوں نے کسی بھی رنگ کے امکانات کا پورا جائزہ نہیں لیا، بہرحال مجاز کے یہاں ایک حد تک فارسی غزل کا سا بناؤ، سجاوٹ اور تیکھاپن موجود تھا۔ کبھی کبھی ان کے شعروں پر ایک مدہوش اور قلندرانہ کج کلاہی کی چھوٹ سی پڑنے لگتی تھی ۔

اور کیا چاہیے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو باندازِ دگر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانی سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

لیکن مصیبت یہ ہے کہ فراق کی آواز ہی نہیں، ہرکچی آواز مرمر کے پالی جاتی ہے۔ مجاز نے مرنا تو سیکھا، یہ دوسرا ہنر نہیں سیکھا جس میں موت بھی خون تھوک جاتی ہے۔

لیکن بعض دفعہ ادیب ایسی چیز بھی لکھ جاتا ہے جس کی اہمیت خالص ادبی قدرو قیمت کے ماوراء ہوتی ہے مثلاً وکٹر ہیوگو کا ناول "لے مزرابل" یارومیں رولاں کا ناول "ژان کرستوف"۔ ان کتابوں میں ادبی اعتبار سے بیس خرابیاں نکالی جاسکتی ہیں مگراس کے باوجود اپنے زمانے کے چند رجحانات کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے (Myths) کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ یہی حال مجاز کی دو ایک نظموں کا ہے، خصوصاً "اے غم دل کیا کروں والی نظم کا۔ ان دو تین نظموں کی بدولت مجاز ادبی تاریخ تو الگ رہی، ہماری سماجی تاریخ میں داخل ہو چکے ہیں۔ مجاز اپنے پیچھے ایک افسانہ چھوڑ گئے ہیں جو آسانی سے نہیں مرے گا۔ (امروز)

(اپریل ۱۹۵۶ء)

کہانی کے روپ

کہانی کے عنصر کی ڈرامے میں کیا جگہ ہے؟ کہانی ڈرامے میں کس طرح استعمال ہوتی ہے، اور کیا شکل اختیار کرتی ہے، اس پر ڈرامے کی فنی خصوصیات اور لوازمات کا کیا اثر پڑتا ہے؟ ان سوالوں پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کہانی بذاتِ خود کیا چیز ہے؟ کیونکہ ایک دوسرا لفظ بھی ہے جو ہم روزمرہ کی گفتگو میں نہایت اطمینان کے ساتھ کہانی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں، یعنی پلاٹ — ان دو لفظوں کا فرق سمجھے بغیر ہم ڈرامے میں کہانی کی جگہ متعین نہیں کرسکتے۔ یوں تو پلاٹ کا لفظ اب اردو کا لفظ بن چکا ہے لیکن اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے، اور بعض لوگ پلاٹ کی جگہ ماجرا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس ترجمے سے ہی ظاہر ہے کہ عام طور سے لوگوں کے ذہن میں کہانی اور پلاٹ کا فرق واضح نہیں ہوتا۔ ماجرا سے مراد صرف وہ واقعات ہیں جو کہیں پیش آئے، لیکن یہ چیز کہانی ہے، پلاٹ نہیں۔ کہانی کا مطلب ہے واقعات کا ایک سلسلہ، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کہانی کہنے کی خوبی یہ ہے کہ ہر واقعہ بجائے خود اتنا دلچسپ ہو کہ ہم اس بیان سے اکتانے کے بجائے آگے اور سننا چاہیں۔ کہانی کے فن کی بنیاد ہے تجسس کے جذبے پر۔ واقعات کا بیان اگر ہمارے اندر تجسس پیدا کرتا ہے تو یہ اچھی کہانی ہوتی ہے لیکن اگر تجسس بیدار نہیں ہوا تو کہانی اچھی نہیں ہوسکتی۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ ہم ہر واقعہ سننے کے بعد پوچھیں کہ پھر کیا ہوا۔

پلاٹ بھی واقعات کا سلسلہ ہوتا ہے، یعنی پلاٹ کے اندر بھی کہانی ہوتی ہے، مگر کہانی کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز ہونی چاہیے، جب جا کے پلاٹ بنتا ہے، یہ چیز ہے منطقی رشتہ یا اسباب و نتائج کا علاقہ۔ اگر چند دلچسپ واقعات ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو کہانی تو بن جائے گی، لیکن پلاٹ نہیں بنے گا۔ پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کسی اور

واقعے کا نتیجہ ہو اور اس سے کوئی نیا واقعہ نکلے۔ پلاٹ کے یہ اجزا یعنی واقعات منتشر یا ایک دوسرے سے آزاد نہیں رہ سکتے۔ ان کے درمیان منطقی ربط ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ مختلف واقعات کو ملا کر ایک نقش مرتب کرنا چاہیے۔ چنانچہ پلاٹ میں اس نقش کی اہمیت انفرادی واقعات سے زیادہ ہوتی ہے، بلکہ واقعات اس نقش سے ہی اپنے معنی حاصل کرتے ہیں۔ فرداً فرداً ان کی اہمیت یہاں وہ نہیں ہوتی جو کہانی میں ہوتی ہے۔ پلاٹ کی خوبی یہ ہے کہ واقعات ایک نقش میں بندھ جائیں، ایک دوسرے سے متعلق ہوں، ایک دوسرے پر اثر ڈالیں، اور کوئی واقعہ اس نقش سے باہر نہ رہنے پائے۔ ترتیب، نظم اور انضباط سے پلاٹ پیدا ہوتا ہے۔

اگر میں کہانی اور پلاٹ کے فرق کو ایک مثال سے واضح کر دوں تو بہتر ہو گا۔ اگر میں کہوں کہ ایک آدمی مر گیا، اور دو دن بعد اس کی بیوی مر گئی تو یہ کہانی ہوئی، کیونکہ یہ دو واقعات ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں جن میں کوئی لازمی ربط نہیں۔ بیوی کی موت شوہر کی موت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک الگ واقعہ ہے۔ لیکن اگر میں کہوں کہ ایک آدمی مر گیا، اس رنج میں اس کی بیوی نے زہر کھا لیا اور وہ بھی مر گئی تو یہ پلاٹ ہو گیا، کیونکہ اب یہ دونوں واقعات ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں رہے بلکہ ان میں ایک ربط پیدا ہو گیا۔ شوہر کی موت سبب ہے، اور بیوی کی موت نتیجہ ہے۔ اب یہ بکھرے ہوئے واقعات نہیں رہے بلکہ ایک نقش بن گیا ہے۔

یہ تو ہوئی کہانی کی بات۔ ہمارے موضوع کا دوسرا عنصر ہے ڈراما۔ اب اسے دیکھیے۔ ڈراما کہانی پر ایک بہت بڑی پابندی عائد کرتا ہے۔ داستان یا ناول تو پڑھنے کی چیز ہوتی ہے، اور پڑھنے کا انحصار آدمی کی مرضی پر ہوتا ہے۔ یہاں آدمی خود مختار ہے، جب چاہے کتاب پڑھے جب چاہے نہ پڑھے۔ پڑھنے والے کی یہ آزادی لکھنے والے کو بھی آزادی دے دیتی ہے۔ وہ اپنی کہانی کو جتنا چاہے طویل کرتا چلا جائے۔ جب تک اس کا ذہن نئے واقعات ایجاد کر رہا ہے؟ اس کی کہانی جاری رہ سکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ادب میں "طلسم ہوشربا" دس ہزار صفحے کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ کی داستانیں بھی ملا لی جائیں تو اچھے خاصے پچاس ہزار صفحے بنتے ہیں لیکن یہ کہانی لازمی طور سے یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ابھی یہ پچاس ہزار صفحے تک اور چل سکتی ہے۔ غرض داستان گو یا ناول نگار پر وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنا مالک ہے، کیونکہ پڑھنے والا بھی اس معاملے میں اپنا مالک

ہے۔ مگر ڈرامے کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ڈراما فی الاصل پڑھنے کی نہیں، دیکھنے اور سننے کی چیز ہے، اور دیکھنے والا صرف اتنی ہی دیر تک دیکھ سکتا ہے جتنی دیر تماشا دکھانے والے اسے اجازت دیں۔ اس لیے یہاں دیکھنے والا خود مختار نہیں ہو سکتا۔ پھر تماشا دکھانے والے بھی پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔ انہیں بھی یہ بات پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے کہ دیکھنے والے کتنی دیر تک دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ تماشا دکھانے اور دیکھنے والے، دونوں ایک دوسرے کے پابند بن کے رہ جاتے ہیں اور دونوں کو وقت کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ ڈراما تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ڈرامے کی نوعیت کہانی پر یہ پہلی پابندی عائد کرتی ہے، یعنی ڈرامے میں کہانی کا مختصر ہونا لازمی ہے۔ یہاں کوئی لامتناہی نہیں بن سکتی۔

پھر داستان گو اور ناول نویس کو ایک اور آسانی حاصل ہے۔ ناول نویس پڑھنے والے کا تجسس بیدار کرنے کے بعد سے غیر معین وقفے تک قائم رکھ سکتا ہے۔ پڑھنے والا دن بھر ناول پڑھنے کے بعد اسے ایک ایسی جگہ بھی چھوڑ سکتا ہے جہاں وہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس بات کو وہ اگلے دن تک ملتوی کر سکتا ہے۔ مگر ڈرامے میں کل کبھی نہیں آتی، یہاں التوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈرامہ نگار کو جو کچھ کہنا ہے، سب ایک ہی نشست میں کہنا پڑے گا۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ تماشا دیکھنے والوں کے تجسس کو غیر آسودہ چھوڑ دے، اور تماشائی یہ سوچتے ہوئے گھر واپس جائیں کہ اس کے بعد کیا ہوا، چنانچہ ڈرامہ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ دیکھنے والے کے تجسس کو بیدار کرے اور ایک معینہ وقفے کے اندر اس تجسس کو ختم بھی کر دے تاکہ تماشائی مطمئن ہو کر اٹھیں۔ ڈرامہ نگار کی اس مجبوری کے سبب ڈرامے کے لیے پلاٹ ضروری بن جاتا ہے۔ ناول میں تو یہ بات ممکن ہے کہ واقعات سلسلہ در سلسلہ ایک لڑی میں پرو دیے جائیں، خواہ ان میں منطقی رشتہ ہو یا نہ ہو، مگر ڈرامے میں منطقی رشتہ، واقعات کی ترتیب، تنظیم اور انضباط لازمی چیز ہے کیونکہ ڈرامہ نگار کے لیے تجسس کو بیدار کرنے کے بعد اسے تین چار گھنٹے کے اندر ہی اندر ختم کرنا بھی ضروری ہے۔ ڈرامے کے لیے محض کہانی کافی نہیں، اسے پلاٹ بننا پڑتا ہے۔

مگر جو شرائط کہانی والے لکھنے والے پر عائد ہوتی ہیں، وہ ڈرامہ نگار پر اور سختی کے ساتھ عائد ہوتی ہیں۔ اگر کسی ناول میں چند واقعات ایسے آگئے ہیں جو دلچسپ نہیں ہیں تو آپ انہیں چھوڑ سکتے ہیں یا سرسری طور سے نظر ڈال کر آگے بڑھ سکتے ہیں لیکن ڈراما

دیکھتے ہوئے آپ بیچ کا کوئی حصہ نہیں چھوڑ سکتے جب تک آپ تھیٹر میں بیٹھے ہیں، سارا ڈراما دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اس لیے ڈرامے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ واقعات فرداً فرداً بھی دلچسپ ہوں۔ جو شرائط کہانی کے لیے ضروری ہیں، وہ ڈرامے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ پھر ڈرامے کی مخصوص شرائط الگ ہیں۔ یعنی بچارے ڈرامہ نگار کے اوپر دُہری دُہری پابندیاں ہوتی ہیں۔

یوں تو آپ انسان کی ہر سرگرمی کو ہی کاروباری چیز کہہ سکتے ہیں، چنانچہ ناول کو بھی۔ لیکن ڈراما تو کھلم کھلا کاروباری چیز ہے جس سے طرح طرح کے لوگوں کی روزی وابستہ ہوتی ہے۔ ڈرامے کی کامیابی یا ناکامی کا تعلق صرف لکھنے والے سے ہی نہیں ہوتا، بلکہ بیس قسم کے آدمیوں کی روزی تھیٹر کے ذریعے چلتی ہے۔ ڈرامے کی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ لوگ اسے دیکھنے بھی آئیں۔ ڈرامے کو تھیٹر سے الگ نہیں کہا جاسکتا، تھیٹر کے بغیر ڈرامے کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر تماشا دیکھنے والے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے، بے پڑھے، مہذب، غیر مہذب، لیکن چونکہ یہ سب لوگ پیسے دیتے ہیں، اس لیے تماشا دکھانے والوں کو سب کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنا پڑتا ہے۔ ناول نویس تو ایک خاص طبقے کے لیے لکھ سکتا ہے، ایک خاص ذہنی معیار کے لوگوں کے لیے لکھ سکتا ہے، مگر ڈراما نگار کے ذہن میں اپنے سامعین کا تصور اتنا واضح نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو ہر آدمی کے لیے لکھنا ہے۔ یوں تو ڈرامے میں معنویت چاہے کتنی ہی ہو، لیکن سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر قسم کے لوگ اور ہر ذہنی معیار کے آدمی اسے دلچسپی سے دیکھ سکیں۔ لہٰذا ڈرامے کی کہانی کو صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ ہر آدمی کے لیے دلچسپ ہونا چاہیے۔ یہ پابندی ادیبوں کو گراں گزرتی ہے، لیکن دنیا کے عظیم ترین ڈرامہ نگاروں نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا ہے۔

پھر ایک بات دیکھنے کی یہ بھی ہے کہ ڈرامہ خالص اور بے میل فن نہیں ہے، یہ تو کئی فنون کا مجموعہ ہے۔ ناول کے فن میں تو دو طرح کے آدمی برسرِ کار آتے ہیں — ایک تو لکھنے والا دوسرا پڑھنے والا۔ لکھنے والا براہِ راست پڑھنے والے سے متعلق ہوتا ہے، اور اپنی بات براہِ راست کہہ سکتا ہے۔ لیکن ڈرامے میں لکھنے والے اور دیکھنے والے کے درمیان میں بیس قسم کے آدمی آتے ہیں۔ ڈرامہ نگار اپنے ناظرین سے براہِ راست کچھ نہیں کہہ سکتا، بلکہ اوروں کی وساطت سے بولتا ہے۔ اس کی بات جن لوگوں کے ذریعے

ناظرین تک پہنچتی ہے، ان میں پروڈیوسر، ایکٹر، موسیقار یہاں تک کہ پردہ کھینچنے والے تک شامل ہیں اور یہ سب لوگ اہم ہیں۔ پردہ کھینچنے والا اگر پردہ گرانے میں دیر یا جلدی کر دے تو سارا ڈراما غارت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں تو ڈراما نگار ان درجن بھر آدمیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اسی لیے ڈرامے میں کہانی کے کہنے کے طریقے ناول سے مختلف ہیں۔ یہاں تشریح و تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ ڈراما نگار کو یاد رکھنا پڑتا ہے کہ میں براہ راست اپنے ناظرین سے نہیں بول سکتا، میری ترجمانی تو ایکٹر وغیرہ قسم کے لوگ کریں گے، اور وہ اپنے جسم کی حرکات سے، اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ سے۔ چنانچہ کہانی کہتے وقت اسے اپنے فن کی یہ لازمی شرط ذہن میں رکھنی پڑتی ہے کیونکہ وہ صرف الفاظ کے ذریعے نہیں بلکہ کئی اور چیزوں کے ذریعے بولتا ہے۔ ناول نویس کا ذریعہ اظہار صرف الفاظ ہیں، ڈرامہ نگار کا ذریعہ اظہار متعدد چیزیں ہیں، اسی لیے اس کا کام ناول نویس کے کام سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہے۔

اس وجہ سے اور بھی کہ ڈراما کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ واقعات کو زندہ شکل میں پیش کرتا ہے۔ یوں تو ناول پڑھتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم حقیقت اور تخیل کے فرق کو بھول جاتے ہیں لیکن ڈرامے کی تو زندگی ہی اس بات پر قائم ہے کہ ہم سائے کو اصلیت سمجھ لیں۔ اس لیے ڈرامے میں عمل ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔ یہاں کہانی کہنے والے دراصل ایکٹر ہوتے ہیں، اور وہ کہانی بیان نہیں کرتے بلکہ خود کہانی یا واقعہ بن جاتے ہیں۔ ڈرامے میں کہانی سنائی جاتی بلکہ کہانی وجود میں آتی ہے جو چیز ہم اسٹیج پر دیکھتے ہیں، وہ مکمل اور وقوع پائے ہوئے واقعات نہیں ہوتے بلکہ وقوع پاتے ہوئے واقعات یہاں کہانی کہنے والا نہیں بولتا، بلکہ کہانی خود بولتی ہے۔ یہ ناول اور ڈرامے کا بنیادی فرق ہے۔ اسی لیے ارسطو نے ٹریجیڈی میں عمل کو کردار سے زیادہ اہم بتایا ہے۔ کہانی زندگی سے نکلتی ہے، لیکن ڈرامے میں کہانی پھر زندگی بن جاتی ہے، یا کم سے کم زندگی کا روپ دھارنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں اس کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔

اسی سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناول میں تو بعض اوقات کہانی اور کردار الگ ہو سکتے ہیں، لیکن ڈرامے میں واقعات اور کردار کا تعلق جسم اور جان کا سا ہے۔ واقعات کردار کے ذریعے وجود میں آتے ہیں، اور کردار واقعات کے ذریعے، انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈرامے میں مختلف عناصر جس طرح ایک

دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں، ویسے ناول میں نہیں ہوتے۔ اتنا شدید انضباط پیدا کرنا چونکہ ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں، اسی لیے ڈرامے کا فن ناول کے فن سے زیادہ مشکل ہے، ورنہ یوں تو کہانی دونوں میں ہی ہوتی ہے۔ (ریڈیو پاکستان، کراچی)

(مئی ۱۹۵۶ء)

خواجہ منظور حسین اور نقد اقبال

بڑے شاعروں کو سمجھنے کا ایک ذریعہ نفرت بھی ہے۔ یہ کام کوئی ایک دن کا تو ہوتا نہیں، اس میں تو رد اور قبول کا ایک لمبا سلسلہ چلتا ہے۔ کبھی تو پڑھنے والا ٹوٹ کے محبت کرتا ہے، کبھی ٹوٹ کے نفرت۔ بہرحال شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری شخصیت اس محبت یا نفرت کے حوالے کر دے۔ ویسے تو یہ محبت بھی کچھ ایسی درست نہیں ہوتی اور نہ یہ نفرت، مگر اس احمقانہ اور غیر پروفیسرانہ محبت اور نفرت کے بغیر آدمی بڑے شاعر کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ یوں تو ہر پروفیسر شیکسپیئر کا کلام پسند کرتا ہے بڑی محبت اور بڑی نفرت سے اور کچھ نہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک بڑے شاعر کو اپنے سے زیادہ سمجھ رہا ہے۔ آخر پہاڑ سے سر ٹکرانے میں بھی تو ایک مزا ہے، اور سر ٹکرائے بغیر پتہ بھی نہیں چلتا کہ پہاڑ کیا چیز ہے۔

اس کے برخلاف ادب پڑھنے کا "عالمانہ" طریقہ یہ ہے کہ آدمی زندگی اور ادب سے ڈر کے توازن کی کوٹھڑی میں جا گھسے، قدم قدم پر لرزے کہ میری ذرا سی غلطی سرزد ہوئی اور میری ساری شخصیت ریت کی دیوار کی طرح بیٹھی۔ کھُل کے مردانہ وار نفرت کے بجائے بڑے شاعر کے متعلق سرپرستانہ حقارت کا رویہ اختیار کرے۔ کوئی چھوٹی موٹی صحیح بات کہنے کے شوق میں ایک بڑے شاعر کو اپنی سطح پر کھینچ لائے۔ اس قسم کی تنقید کا ایک نمونہ ہے خواجہ منظور حسین (پروفیسر انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور) کا تازہ مضمون "اقبال کا فرنگ" جس میں پروفیسر صاحب (موصوف) نے اقبال کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھا ہے جیسے وہ ایک بڑا شاعر نہیں بلکہ ان کے ساتھ کوئی مدرس ہے۔ انہیں اقبال سے شکایت ہے کہ یورپ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے اس موضوع کے ساتھ "ناروا سلوک" کیا ہے اور "نفسی یکطرفہ پن اور جذباتی سطحیت سے کام لیا ہے؟" اور یہ بات

پروفیسر صاحب (موصوف) کے نزدیک اہلِ علم اور صاحبانِ فکر و نظر کی شان کے خلاف ہے۔ اہلِ علم کے شایانِ شان بات یہ ہوتی ہے کہ اگر دریاؤں کے پانچ نقصان بتائے جاتے ہیں تو پانچ فائدے بھی گنوائیں۔ اقبال نے اس طرح جدول وار نہیں لکھا۔ ظاہر ہے ایسی چیزیں پڑھتے ہوئے اہل علم کو تکلیف ہونی ہی چاہیے۔ پروفیسر صاحب موصوف کا شکوہ بجا ہے لیکن عام قاری کی حیثیت سے مجھے یہ شکایت ہے کہ اگر انہیں اقبال پر اعتراض کرنا ہی تھا تو اپنے طالب علموں کو سنا کر خوش ہو لیتے۔ جب اردو لکھنی نہیں آتی تو مضمون نگاری کیا ضروری ہے۔ اپنے مضمون میں انہوں نے بتایا ہے کہ اچھے شعر پڑھنے سے مزاج میں ترتیب، تناسب اور زیبائی کی تربیت ہوتی ہے اور اپنی دانست میں وہ اچھے ہی شعر پڑھتے ہوں گے لیکن نثر وہ ایسی لکھتے ہیں "یہ معاملہ شعری اظہار سے زیادہ دانش و بینش سے پیوند رکھتا ہے — " سب سے اچھی شاعری کے معنوں اور مواد میں سچائی اور سنجیدگی کی برتری کو زبان اور محاورے اور وطن کی برتری سے جو اس کے طرز اور اسلوب کی خصوصیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔" ایسی اوبڑ کھابڑ نثر پڑھنے کے بعد اگر میں پروفیسر صاحب موصوف کے ساتھ "ناروا سلوک" کر جاؤں تو مجھے معذور سمجھیے۔

خیر، اب اصل مضمون کی طرف آیئے، پروفیسر صاحب موصوف نے اس لمبے چوڑے مضمون میں صرف دو باتیں کہی ہیں۔ (۱) اقبال یورپ کے متعلق جن جذبات کا اظہار کرتے ہیں، وہ ہمارے پرانے شاعروں میں بھی موجود ہے۔ (۲) اقبال نے یورپ کے صرف منفی پہلو دکھائے ہیں، خوبیوں کی تعریف نہیں کی۔

انگریزوں کا تسلط ہماری قومی زندگی کا اتنا بڑا واقعہ ہے کہ ہماری شاعری میں اس کے کچھ نہ کچھ اثرات نظر آنے ہی چاہیں تھے، لیکن پروفیسر صاحب موصوف کا دعویٰ ہے کہ ہمارے شاعر اپنے جام جہاں نما میں فرنگیوں کی ایک ایک حرکت کا معائنہ کرتے رہے اور اس تخریبی عمل کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جس نے ہمارے شاعروں کے شعور پر اپنا نقش نہ چھوڑا ہو۔ یہ صرف تعلی ہے۔ اقبال تو خیر بیچارے تخلیقی فن کار تھے، پروفیسر صاحب موصوف ماشاء اللہ اہل علم ہیں اور وہ بھی بڑی عین سے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اردو میں "ایک ایک حرکت" اور "کوئی پہلو" کے کیا معنی ہیں۔ پھر اس دعوے کا ثبوت بھی ہونا چاہیے۔ پروفیسر صاحب موصوف کا تو حال یہ ہے کہ جہاں کسی شعر میں محبوب کی طرف اشارا ہوا اور وہ چور چور چلا دیے۔ ان کے نزدیک "حسن"، "زلف"، "ابرو"، "بت" ان

سب لفظوں سے مراد انگریز ہیں۔ ان حسابوں سے یہ شعر بھی انگریز کے بارے میں ہی ہوں گے۔

وہ ادھر باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

ہم چھین کے لے بھی گئے پان آپ کے منہ کا
کہتے ہی رہے آپ کہ دیں گے نہ دیا ہے

ذرا گھر کو انشا کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اور سب سے زیادہ تو وہ نظیر کا شعر "بیٹھے سے بیگار بھلی"۔ اس جام جہاں نما میں بھی انگریز کی ایک ایک چال کا نقشہ کھینچا ہے — مگر پروفیسر صاحب موصوف بیچارے بھی کیا کریں۔ معصوم آدمی ہیں، انہیں کیا پتہ کہ لوگوں کا محبوب بھی ہوتا ہے اور وہ انگریزوں کی سی حرکتیں بھی کرتا ہے۔ یہ باتیں بہو بیٹیوں کے جاننے کی نہیں۔

چلئے فی الحال ہم ان کا دعویٰ قبول کیے لیتے ہیں۔ مان لیا کہ ہمارے شاعروں نے اپنے جام جہاں نما میں انگریزوں کی ایک ایک حرکت دکھا دی ہے، اور اقبال اس مربوط سلسلہ فکر کی ایک کڑی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ کے ساتھ بے انصافی اقبال ہی نے نہیں بلکہ ہمارے سارے شاعروں نے کی ہے۔ اس میں اکیلے اقبال کا قصور نہیں بلکہ سب مجرم ہیں۔ پھر پروفیسر صاحب موصوف اقبال ہی کو کیوں الزام دیتے ہیں، وہ جام جہاں نما جو دوسرے شاعروں کے پاس تھا، وہی اقبال کے پاس تھا۔ یا تو دونوں کی تعریف کیجیے یا دونوں کو گردن زدنی قرار دیجیے۔ اس اعتبار سے پروفیسر صاحب موصوف کے مضمون کا عنوان "اقبال کا فرنگ" نہیں بلکہ اردو شاعری کا فرنگ "ہونا چاہیے۔ بڑی عین والے "اہل علم" کے یہاں اگر منطق بھی نہ ہو تو پھر ان سے اقبال جیسے لوگ ہی اچھے۔

پروفیسر صاحب موصوف ایک جگہ تو کہتے ہیں کہ "فرنگ کی نسبت اقبال کے تاثرات کی جڑیں ان کے ملک اور قوم کے نفس اور تاریخ میں پیوست ہیں۔" یعنی یورپ کے متعلق اقبال کا جو رویہ ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں کے جذبات یہی رہے ہیں۔ ان جذبات کی تصریح آگے چل کر یوں فرمائی ہے۔ "ایک محکوم ملک

کا باشندہ اپنی دبی ہوئی اور کچلی ہوئی عصبیت سے کام لے کر شعر میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔" چلیے یہ بھی تسلیم، مگر پروفیسر صاحب موصوف اپنے مضمون کے شروع میں فرما چکے ہیں "انہیں ایسے شعر کہنے کا خیال اپنے پڑھنے والوں کے سُود بہبود کی خاطر آیا۔" اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) اقبال یورپ سے نفرت کرتے تھے، پڑھنے والے نفرت نہیں کرتے تھے، اس لیے اقبال کوشش کرتے تھے کہ پڑھنے والے بھی یورپ سے نفرت کرنے لگیں۔ (۲) پڑھنے والے یورپ سے نفرت کرتے تھے، اقبال نے یہ اجتماعی جذبات نظم کرکے مقبول ہونا چاہا۔ یہ بالکل اَن مل بے جوڑ خیالات آپ کے سامنے حاضر ہیں اگر آپ صاحب فکر و نظر یا اہلِ علم ہیں تو شاید ان میں کوئی ربط قائم کر لیں۔

ویسے خود پروفیسر صاحب موصوف نے بھی اپنا مضمون پڑھنے والوں کے سود و بہبود کے خیال سے مجبور ہو کے لکھا ہے۔ وہ قوم کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خطرہ یہ ہے، اقبال نے اچھے شعر بھی کہے ہیں اور بُرے بھی۔ لیکن اکثر لوگ ان کی اچھی اور بُری چیزوں میں امتیاز نہیں کرتے اور ہر درجے کے کلام سے یکساں اثر پذیر ہوتے ہیں۔" اور یہ صحیح ادبی ذوق اور متوازن انفرادی اور اجتماعی مزاج دونوں کے حق میں بُرا ہے۔ اقبال کے بُرے شعروں کے متعلق فرماتے ہیں۔ "ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو نہ کوئی خاص لفظی نوک پلک رکھتا ہے نہ معنوی اعتبار سے چنداں درخورِ اعتنا ہے۔" ان دو جملوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف نے کتابیں تو ضرور پڑھی ہیں لیکن ادب نہیں پڑھا۔ انفرادی اور اجتماعی مزاج پر کسی شاعر کا اچھا اثر بھی پڑ سکتا ہے اور بُرا بھی۔ لیکن اچھے شعروں کا اچھا اثر پڑے گا اور بُرے شعروں کا بُرا۔ یہ بات محض کوئی پروفیسر ہی کہہ سکتا تھا۔ اگر ہم پروفیسر صاحب سے اقبال کے اچھے شعروں کا ایک انتخاب کرا کے قانوناً ہر شخص کو پڑھوائیں تو کیا محض ان کے "صحیح ادبی ذوق کے سہارے ہم سب اچھے آدمی بن جائیں گے؟ اہل علم بھی کیسے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ اور دوسری بات تو پروفیسر صاحب موصوف نے ایسی کہی ہے جو کم سے کم ایک پروفیسر کو نہیں کہنی چاہیے تھی۔ کیا ہم کسی بڑے شاعر کے کلام کو اچھے اشعار اور بُرے اشعار دو خانوں میں اس طرح بانٹ سکتے ہیں کہ ایک حصہ کو درخورِ اعتنا سمجھیں اور دوسرے کو نہ سمجھیں؟ بڑے شاعر کے کلام میں کوئی ایسی بھی چیز ہوتی ہے جسے ہم نظرانداز کر سکیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے ورڈسورتھ کا تو پڑھا ہی ہوگا۔ اگر ہم اس میں سے ایسے ٹکڑے نکال

دیں جو نہ کوئی خاص لفظی نوک پلک رکھتے ہیں نہ معنوی اعتبار سے چنداں درخورِ اعتنا ہیں تو نظم کہاں رہے گی؟ بڑے شاعر کو پرکھنے کا یہ نتیجہ نہیں کہ اچھے اچھے شعر چھانٹ کے پڑھ لیے اور باقی ردی کھاتے میں ڈال دیے۔ ایسے شاعر میں سب سے بڑی چیز تو اس کی وحدت ہوتی ہے۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ شاعر کے بُرے شعروں اور اچھے شعروں کے درمیان کیا تعلق ہے۔ اس کے بُرے شعروں کے بغیر اچھے شعر وجود میں کیوں نہیں آسکتے تھے، اور اس کی خوبیاں اس کی خامیوں سے کس طرح پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ایسے لازمی سوال ہیں جنہیں پروفیسر صاحب موصوف نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن اسے اقبال نے یورپ کے بارے میں عصبیت اور جذبات پرستی سے کام لیا ہو، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگر وہ پوری انصاف پسندی سے کام لیتے تو تیسرے درجے کے شاعر بن کے رہ جاتے۔ اگر پروفیسر صاحب موصوف کو تنقید لکھے بغیر چین نہیں آرہا تھا تو انہیں یہ بتانا چاہیے تھا کہ عصبیت اور سطحیت نے اقبال کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ اصل چیز تو یہ ہے، ورنہ اتنی بات تو ہر اخبار بین جانتا ہے کہ یورپ میں بہت سی باتیں قابلِ تعریف ہیں۔ ہاں ایک بات اور عرض کر دوں۔ ذاتی طور سے میں میر کو اقبال سے بڑا شاعر مانتا ہوں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ میر کے کلام کا تھوڑا بہت حصہ ناقابل اعتنا سمجھ کر نظرانداز کیا جاسکتا ہے، مگر اقبال نے ایک شعر ایسا نہیں کہا جسے پڑھنا ضروری نہ ہو۔

اقبال نے یورپ کو سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں یا جس تساہل سے کام لیا ہے، اس پر بڑے بنیادی اعتراضات کیے جاسکتے ہیں لیکن پروفیسر صاحب موصوف کے مضمون کی سطح بڑی عامیانہ اور مبتذل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پروفیسر صاحب کسی ایف۔ اے کے طالب علم کو ڈانٹ رہے ہوں۔ اقبال نے بعض معاملات میں کم بینی ضرور دکھائی ہے لیکن یہی کم بینی ان کی شاعری کو فائدہ پہنچا گئی ہے۔ اپنی کوتاہی کو ایک نئی قوت میں تبدیل کر دینا کسی بڑے شاعر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ مگر پروفیسر صاحب موصوف اقبال کو جس قسم کا توازن سکھا رہے ہیں، وہ تو کسی باتصویر رسالے کی مدد سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کو تو خیر یورپ سے عداوت ہوئی، لیکن یورپ میں رہتے ہوئے جن ادیبوں نے یورپ کی مدنیت اور تہذیب پر حملے کیے ہیں، انہیں کیا کہیے گا؟ جس قسم کے توازن کا مطالبہ پروفیسر صاحب موصوف اقبال سے کرتے ہیں کیا وہ ڈی۔ ایچ لارنس ہنری ملر یا برنانو میں ملتا ہے؟ مثلاً اقبال کو یورپ سے شکایت ہے کہ وہاں جذب و سرور نہیں ملتا اس کے جواب میں پروفیسر

صاحب موصوف یورپ کے بیس ادیبوں کے نام گنوا سکتے ہیں کہ لیجیے جذب و سرور موجود ہے، مگر اتنی بات کافی نہیں۔ سوال پوری تہذیب کے طرز احساس کا ہے۔ آج ۵۶ء میں بھی فرانسیسی شاعروں کی پوری نسل رو رہی ہے کہ یورپ کو دے کارت نے بلاک کر ڈالا۔ اگر پروفیسری صاحب موصوف کو پروفیسرانہ دلائل ہی قائل کر سکتے ہیں تو میں ان کی خدمت میں پروفیسر کلوڈویژے کا ایک مضمون پیش کر دوں گا۔

پروفیسر صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں ایک کھلبے بازی یہ کی ہے کہ جو باتیں اقبال کے بعض معتقد کرتے ہیں، انہیں اقبال سے منسوب کر دیا ہے۔ مثلاً اقبال نے کہا ہے ۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اچھا صاحب یہ خوبی یورپ میں نہ سہی، آپ کے اندر ہے۔ اقبال نے کہا ہے ۔

فرنگ رہ گزرِ سیل بے پناہ میں ہے

اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ اچھا کیا آپ خطرے سے محفوظ ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ بعض لوگ اقبال کے اشعار کو تعلی کے طور پر استعما کرتے ہیں لیکن اس ذہنیت کو اقبال سے منسوب کرنا بے ایمانی ہے۔

پروفیسر صاحب موصوف نے اقبال کے اشعار پر ردو قدح کی جسارت اسی انداز میں فرمائی ہے۔ اقبال بیچارے نے ایک سیدھی سادی بات کہی تھی ۔

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ یہ تاسف و حرماں کا مقام ہوگا۔ اگر ایشیا والوں نے یورپ کی تہذیب کو خیرباد کہہ کر گھنے بنوں اور چٹیل صحراؤں کی راہ لی۔ بہت خوب ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ اقبال کے شعر میں صحراؤں کی راہ لینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے سحر فرنگ کے ٹوٹنے سے یہ مطلب نکالا ہے تو شعر فہمی عالم بالا معلوم شد۔

اقبال کا شعر ہے ۔

زہر اب ہے اس قوم کے حق میں مۓ افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خود دارد ہنر مند

پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ یورپ کے علوم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگانی چاہیے۔ اب بتایئے ایسے ظالم کا کیا کرے کوئی۔ اقبال نے کب کہا ہے کہ یورپ کے علوم حاصل نہ کرو۔ اس نے یہ شرط لگائی ہے کہ یورپ کے علوم صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتے کہ جب ایشیا والوں میں ایک خاص قسم کا کردار ہو، خصوصاً تخلیقی صلاحیت ہو لیکن پروفیسر صاحب موصوف انسانی میراث کی دہائی دینے لگے۔ اقبال تو خود یورپ کی خوبیوں کا معترف تھا۔

سرور و سوز میں ناپائیدار ہے ورنہ
مۓ فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف

ہمارے پروفیسر صاحب موصوف نے اس شعر کا وہ ستیاناس کیا ہے کہ اردو کے سارے شاعر اپنی قبروں میں تلملا اٹھیں گے فرماتے ہیں۔ "یہ نہیں کھلتا کہ آلائش یا آمیزش کا دریا سرور سوز سے کیا خاص ربط ہے۔"

غرض کہاں تک نقل کروں، پورا مضمون زعفرانِ زار ہے۔ اقبال کو وہ کس قدر سمجھ سکتے ہیں، اس کا حال ان کے ایک جملے سے ظاہر ہے "حوریانِ فرنگی کو دیکھ دیکھ کر ان کے دل کی نیا ڈانواں ڈول ہوتی ہے اور نظریں لڑکھڑاتی ہیں۔" یہ جملہ پروفیسر صاحب موصوف کے مزاج اور شخصیت کی نمائندگی شاید کرتا ہو، اقبال کی نہیں۔ اقبال کے یہاں بیس خامیاں سہی، مگر عورت کے متعلق یہ رکاکت نہیں ملتی۔ جب آدمی اپنے آپ میں اس قدر الجھا ہو تو اس سے شعر سمجھنے سمجھانے کی امید رکھنی فضول ہے۔ اس مضمون میں انہیں دراصل ایک ہی بات کہنی تھی، اور وہ انہوں نے کہہ دی ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے اقبال سے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں، ورنہ وہ ایسی بے تکی باتیں کیوں کرتے کہ اقبال کے یاں جوئے خوں کی تشبیہ مارلو کے یہاں سے آئی ہے اور زندگی کی رنگارنگی کا احساس موں تین کے یہاں سے۔

(اگست ۱۹۵۶ء)

ژولیاں باندا

پچھلے دس سال کے عرصے میں ہم چونکہ یورپ کے ادب سے بالکل بے نیاز ہوچکے ہیں اور کپڑے کے معاملے میں چاہے خود کفیل ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، ادب کے معاملے میں ضرور ہوگئے ہیں، اس لیے اردو پڑھنے والوں کے لیے یہ خبر کوئی دلچسپی نہیں رکھے گی کہ ژولیاں باندا کا انتقال ہوگیا۔ لیکن ۳۶ء کے بعد سے ۴۵ء تک اردو کے ادیب اس نام سے کچھ ایسے نا آشنا نہیں تھے۔ انھیں اتنا ضرور معلوم تھا کہ ٹی ایس ایلیٹ نے بیسویں صدی کے چار پانچ بڑے نقادوں کی فہرست میں باندا کا نام بھی شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے باندا کا ایک فقرہ سن رکھا تھا جو ان دنوں یورپ بھر میں گونج رہا تھا — "اہلِ قلم کی غداری"۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہمارے یہاں بھی اور یورپ میں بھی ترقی پسندی زوروں پر تھی اور ادیبوں سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ سیاست سے دلچسپی لیں اور واضح رویہ اختیار کریں۔ اس کے برخلاف باندا کا نظریہ تھا کہ اہل قلم کا کام تو تہذیب کی ابدی اقدار کی حفاظت ہے، اور جن لوگوں نے قوم پرستی کے جوش میں آکر روزمرہ کی سیاست میں حصہ لیا ہے اور آمریت یا جنگ کی حمایت کی ہے، وہ اہل قلم نہیں رہے۔ اہل قلم کی غداری کا مطلب تھا ادیبوں کا اپنے فریضے سے غافل ہو جانا۔ باندا کی اس کتاب کو اتنی اہمیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ کوئی پمفلٹ نہ تھا، بلکہ یونان سے لے کر موجودہ دور تک مغربی ذہن کی تاریخ تھی۔ پھر باندا پر یہ الزام بھی عائد نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ جمال پرستی میں پڑگیا ہے یا مثالی دنیا میں رہتا ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے سروکار نہیں رکھتا کیونکہ باندا کے نزدیک ڈریفس والا مقدمہ فرانسیسی تہذیب کا ایک زبردست واقعہ تھا، اور جن ادیبوں نے متعصب قوم پرستوں کے خلاف ڈریفس کی حمایت کی تھی، وہ اہلِ قلم کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ مارسل پروست پر باندا بیس اعتراض کرتا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی مانتا تھا کہ

پروست نے جنگ اور نسلی تعصب کی مخالفت کی ہے، اس لیے وہ سچا ادیب ہے۔ اپنی بے لاگ تنقید اور علمیت کی وجہ سے فرانس کے ادیبوں پر باندا کا بڑا رعب تھا۔ چنانچہ لوگ اس خیال سے گھبراتے تھے کہ ترقی پسند بن کر کہیں ہم اپنے فریضے سے تو غداری نہیں کر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۳۶ء میں ژید اور مالرو کے ساتھ ساتھ باندا نے بھی اعلان کیا کہ ادیبوں کو ترقی پسند قوتوں کی حمایت کرنی پڑے گی تو جو لوگ تذبذب میں پڑے ہوئے تھے، انہیں فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملی اور یورپ بھر کے ادیبوں میں یہ بات پھیل گئی کہ لو بھئی، اب تو باندا نے بھی اجازت دے دی۔

ژولیاں باندا عموماً اس مسلک کا پیرو کار سمجھا جاتا ہے جسے اِنسان پسندی کہتے ہیں، لیکن امریکہ کے پال ایلمر مور اور اردنگ بلیٹ جیسے انسان پسندوں اور باندا میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ امریکی انسان پسند پرانے معاشی نظام کا استحکام چاہتے تھے اور انہیں سماج میں کوئی ایسی تبدیلی پسند نہ تھی جس سے سرمایہ داری کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کے برخلاف باندا صداقت اور انصاف کے چند ابدی اصولوں کا قائل تھا، اور اگر ان اصولوں کی رو سے سماج میں بنیادی تبدیلیاں لازمی ٹھہریں تو وہ تبدیلیوں کی حمایت کرتا تھا۔ انہیں اصولوں کی حمایت میں اسے کبھی ترقی پسندوں کے حق میں بولنا پڑا کبھی ان کے خلاف۔ بہرحال، اس نے مرتے دم تک اپنی آزادی برقرار رکھی، اور جو بات سچ سمجھی وہ کہی۔

ویسے باندا بیسویں صدی کے فلسفے اور ادب کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے کا کوئی بڑا فلسفی اور ادیب ایسا نہیں بچا جس کو اس نے رد نہ کیا ہو۔ بیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب عام طور سے دے کارت اور اس کی عقلیت کو دنیا کے لیے ایک لعنت سمجھتے رہے ہیں لیکن باندا اپنے آپ کو دے کارت کا آخری مقلد کہتا تھا اور اس پر فخر بھی کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے ادب کے خلاف باندا کے جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے ادیب اس کے نام سے چڑنے لگے تھے، اور اُسے ادب کا دشمن کہتے تھے۔ بہرحال دنیا بھر سے لڑائی مول لینے کے لیے بھی ہمت چاہیے۔ اور گروہ بندی کی دنیا میں اکیلے رہ کر مقبول ترین ادیبوں کی مخالفت کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ یورپ میں بھی آزاد خیالی ختم ہو رہی ہے، اور ژولیاں باندا اس روایت کے آخری نمائندوں میں سے ہے۔

باندا مرنے سے پہلے اپنی آزاد خیالی کا ایک اور مظاہرہ کر گیا جس کے صلے میں امریکہ کے دوست آج کل اُسے گالیاں دے رہے ہیں۔ یعنی اس نے روس کی تعریف میں

دو چار مضمون لکھ دیے اس سے پہلے باندا مارکسیت کے خلاف لکھ چکا ہے اور امریکہ کی تعریف بھی کرچکا ہے۔ لیکن امریکہ والے، اور خصوصاً امریکہ کے حامی یہ بات برداشت نہیں کرسکتے کہ روس کے حق میں ایک کلمہ بھی کہا جائے۔ چنانچہ اب اس جرگے کے لوگ باندا کو موقع پرست بتارہے ہیں۔

باندا کے نام اور کام سے اردو والوں کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، اس کے انتقال پر امریکہ پسند جماعت نے جو کچھ کیا ہے، اس میں ہمارے لیے عبرت کا سامان ضرور ہے۔ امریکی طرز زندگی جہاں جہاں پہنچ رہا ہے، صداقت پرستی اور آزاد خیالی ختم ہوتی جارہی ہے۔ یورپ نے دو ہزار سال میں جو تہذیبی اقدار پیدا کی تھیں، وہ کوکا کولا کے دھارے میں بہتی چلی جارہی ہیں۔ خیر، یورپ میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں احساسِ زیاں تو ہے لیکن اپنے یہاں؟

(اکتوبر ۱۹۵۶ء)

تھیٹر اور قومی تعمیر

قومی تعمیر میں تھیٹر کا حصہ کیا ہو سکتا ہے، اس سوال پر غور کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم عمومی طور سے دیکھیں کہ کسی بھی قوم کی تعمیر میں تھیٹر کس طرح معاون ہو سکتا ہے اور دوسرا طریقہ ہے کہ ہم خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے متعلق سوچیں، اور دیکھیں کہ ہماری قوم کی زندگی میں تھیٹر کی کیا جگہ رہی ہے اور آئندہ کیا جگہ ہو سکتی ہے۔ یہ دوسرا نقطہ نظر اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ڈراما کوئی پڑھنے پڑھانے کی چیز تو ہے نہیں۔

اگر ڈراما دیکھنے والے نہ ہوں تو ڈرامے کا وجود اور عدم برابر ہے، اس لیے ڈرامے کے مستقبل پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ہماری قوم تھیٹر کو کس حد تک اور کس طرح قبول کر سکتی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے یہاں ڈراما یورپ سے آیا ہے۔ ہندوؤں کی بات الگ ہے ان کے یہاں تو ڈرامے کی روایت کئی ہزار سال پرانی ہے اور ان کے ڈرامے کی نوعیت بھی وہی رہی ہے جو یونانی ڈرامے یا قرون وسطیٰ کے عیسوی ڈرامے کی تھی۔ مثلاً ہندوؤں کے یہاں رام لیلا کی حیثیت ایک مذہبی اور تہذیبی ادارے کی ہے لیکن مسلمانوں کے یہاں تھیٹر قومی زندگی کا حصہ کبھی نہیں رہا، کیونکہ یوں تو ہماری تہذیب میں طرح طرح کے عناصر شامل ہیں لیکن بہرحال ہمارے کلچر کی بنیاد سامی ہے اور دنیا کی یہی ایک بڑی تہذیب ہے جس میں یہ ڈراما ایک مذہبی یا سماجی ادارے کی حیثیت سے کسی زمانے میں بھی نہیں ملتا۔ ویسے تو لوگوں نے عہد نامہ قدیم میں بھی ڈرامائی عنصر ڈھونڈ نکالے ہیں مثلاً غزل الغزلات" جسے سامی تہذیب میں ڈرامے کی موجودگی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ بات اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ سامی تہذیب نے

ڈرامے کو وہ اہمیت کبھی نہیں دی جو شاعری کو حاصل رہی ہے۔ اس لیے سوانگ یا نقل یا دوسری ڈراما نما چیزوں کے باوجود مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں ڈرامے کو مرکزی حیثیت کبھی نہیں ملی۔ اس میں شرمانے یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو اپنی اپنی تہذیب کے رجحانات ہیں لیکن اگر ہم تھیٹر کو اپنی قومی زندگی کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ ماننا ہو گا کہ ہم نے ڈرامے کو اس نظر سے کبھی نہیں دیکھا جس نظر سے یورپ نے دیکھا ہے، اور ہمارے یہاں ڈرامے کا شوق ابھی سو سال سے یورپ کے زیر اثر شروع ہوا ہے۔

چنانچہ اپنی قومی اور تھیٹر کے متعلق غور کرنے سے پہلے یہ دیکھیے کہ یورپ میں ڈرامے نے قومی زندگی میں کون کون سے فرائض انجام دیے ہیں۔ ڈرامے کے موضوعات اور پیشکش کے انداز تو خیر زمانے کے ساتھ بدلتے ہی رہتے ہیں، لیکن یونان سے لے کر آج تک یورپ کے ڈرامے میں تین بنیادی عناصر دکھائی دیتے ہیں جن کی اضافی اہمیت ہر دور میں الگ رہی ہے۔

پہلا عنصر تو یہ ہے تفریحِ طبع۔ یہ تھیٹر کا لازمی جز ہے۔ اگر یہ چیز نہ ملے تو لوگ تھیٹر میں آئیں گے ہی نہیں۔ چنانچہ یورپ میں مذہبی اور فلسفیانہ ڈرامے نے بھی کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی قسم کی تفریح بہم پہنچائی ہے اور یہ بھی ایک طرح کی سماجی خدمت ہے۔ البتہ تہذیبی اور سماجی زوال کے موقع پر تھیٹر محض مسخرے پن پر بھی اُتر آیا ہے۔ مثلاً اٹھارہویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک۔ چنانچہ تفریحِ طبع فراہم کرتے ہوئے تھیٹر سماج کی ایک لازمی خدمت بھی انجام دے سکتا ہے اور لوگوں کو ذہنی طور سے کاہل بھی بنا سکتا ہے۔

دوسرا عنصر ہے لوگوں کے سامنے سماجی مسائل پیش کرنا۔ یہ چیز بھی مذہبی ڈرامے کا حصہ رہی ہے۔ یونان اور روم میں، اور پھر سترہویں صدی کے وسط سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک کلاسیکیت کے زیر اثر یورپ میں طربیے کا مقصد یہ لیا جاتا تھا کہ لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں فطرت نگاروں کے نظریات نے تو ڈرامے کا بنیادی فرض ہی بتایا تھا کہ تھیٹر کے ذریعے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل ناظرین کے سامنے پیش کیے جائیں۔ یہ عنصر بھی لازمی سہی، لیکن جیسا اس رجحان میں غلو سے کام لیا جاتا ہے تو ڈراما نگاروں میں تنگ نظری آ جاتی ہے اور ان کی دنیا شہر کی نالیوں تک سکڑ

کے رہ جاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یورپ کی سماجی زندگی اور ڈراما کی ایک مناظرہ بن جاتا ہے۔ تھیٹر کے اس انداز کی بہترین مثال گالزوردی ہے جس کے ڈرامے دو چار سال کے بعد دلچسپ تک نہیں رہتے۔

تیسرا عنصر ہے مذہب یا فلسفہ یا انسانی زندگانی کا ایک آفاق گیر تصور، یورپ کی تہذیب کے عظیم ترین ادوار میں، یعنی یونان میں، قرونِ وسطیٰ میں، شیکسپیئر کے انگلستان اور راسین کے فرانس میں ڈرامہ سماجی مسائل تک محدود رہنے کے بجائے یہ دیکھتا تھا کہ انسان کا رشتہ کائنات اور اس کی قوتوں سے کیا ہے اور انسانی تقدیر کا کوئی عالمگیر تصور پیش کرتا تھا۔ یعنی تھیٹر قوم کی پوری زندگی کا نچوڑ شدید ارتکاز کے ساتھ ناظرین کے سامنے لاتا تھا، اور قوم کی عمیق ترین روحانی جدوجہد کی تصویر کھینچتا تھا۔ یورپ کے ڈرامے میں یہ عنصر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ماند پڑ گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد سے نئے ڈرامہ نگاروں نے اسے پھر زندہ کیا ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں تھیٹر دراصل ایک معبد ہے اور تھیٹر دیکھنا ایک قسم کی عبادت۔ جب تھیٹر کی یہ حیثیت باقی نہیں رہتی تو ڈراما مر جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق جب تک لوگوں میں زندگی، انسان اور کائنات کی عظمت کا احساس نہ ہو تھیٹر میں جان نہیں آتی، اور تھیٹر کا قومی زندگی میں سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ قوم کے احساس اور روح کو بیدار رکھے۔ اس کے مقابلے میں اصلاحی فریضہ ایک چھوٹی سی چیز ہے۔

زندگی میں ڈرامے نے تین قسم کے فرائض انجام دیے ہیں، اور ہر دور میں ان میں سے کسی ایک فریضے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں ڈرامہ یورپ کے اثر سے پیدا ہوا ہے، اس لیے میں نے یہ تین رجحانات مغربی ڈرامے کے حوالے سے بتائے ہیں — چین اور جاپان کے ڈرامے میں بھی شدید روحانیت کے باوجود آپ کو باقی دو عنصر مل جائیں گے۔

اگر ہم تھیٹر کو پاکستانی قوم کی زندگی کا ایک حصہ بنانا چاہتے ہیں تو ان تین فرائض میں سے کسی کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ قومی تعمیر کو اتنی خشک چیز نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس میں تفریح کے لیے جگہ ہی نہ نکل سکے۔ تھیٹر قومی تعمیر میں حصہ لے گا اور اسی تفریح کو ایک سنجیدہ چیز بنا کر یہ صرف تھیٹر کی مالیات کا مسئلہ نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا معاملہ ہے جو لوگ اکتاہٹ کا شکار ہوں وہ کسی قسم کی بھی تعمیر نہیں کر سکتے۔ نہ قومی نہ انفرادی۔ چاہے قوم اپنی تعمیر کر چکی ہو یا کر رہی ہو، اس کے کچھ نہ کچھ سماجی مسائل ضرور ہوتے ہیں،

اور اگر ملک میں تھیٹر زندہ ہے تو کوئی چاہے یا نہ چاہے ڈرامے میں ان مسائل کا عکس ضرور آ جاتا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں بھی اگر تھیٹر کی تحریک واقعی چل پڑے تو ہمارے ڈرامے سے پہلا مطالبہ تو ہر طرف سے یہی ہو گا کہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کی طرف توجہ کی جائے اور اس میں کوئی شرمانے کی بات نہیں، اور نہ اس سے فن یا ادب کی "روح" مجروح ہوتی ہے۔

سب سے پہلے تو ہمارے تھیٹر کو یہی فریضہ انجام دینا پڑے گا۔ لیکن قومی تعمیر کے حامیوں کو یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارا ڈراما بس یہیں رک جائے اور آگے نہ بڑھے۔ جب ہم کسی جماعت کو قوم کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس انسانی تقدیر کا ایک تصور اور ایک انفرادی نظام احساس موجود ہے۔ اس نظام تصور کی تخلیق میں یوں تو اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں لیکن اس ضمن میں سب سے بڑا کام فن کاروں کا ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ ڈراما نگاروں کا کیونکہ تھیٹر میں تخلیق کا آدھا کام فن کار کرتے ہیں اور آدھا ناظرین۔ اگر ہمارے ہاں تھیٹر ایک قومی ادارہ بن جائے اور ناظرین کی تخلیقی قوتوں کو اس طرح برسرکار لے آئے تو یہ قومی تعمیر میں تھیٹر کا سب سے بڑا حصہ ہو گا۔

(دسمبر ۱۹۵۶ء)

زرپرستی اور شعورِ ذات

جو لوگ تہذیبی اور تخلیقی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کے سامنے پانچ سال پہلے تک یہ مسئلہ تھا کہ دنیا کی بیشتر آبادی ادب اور کلچر سے بے نیاز ہو چکی ہے، اور جو اقلیت ان چیزوں سے دلچسپی رکھتی ہے، وہ اتنی طاقتور نہیں کہ ان کی حفاظت کر سکے۔ لیکن اب کلچر تو الگ رہا، خود انسانی شعور کا مستقبل غور طلب چیز بن گیا ہے۔ زر پرست ممالک انسانی شعور ہی کو اپنے لیے مہلک سمجھنے لگے ہیں، اور یہ کچھ غلط بھی نہیں۔ فرائڈ اور رائخ جیسے مفکرین سے قطع نظر، آج سے تین سو سال پہلے شیکسپیئر نے "میکبتھ" میں دکھا دیا تھا کہ سیاسی اور ذہنی آزادی کا دار و مدار خود آگاہی پر ہے، اور جب لوگ اپنے شعور سے ڈرنے لگتے ہیں تو وہ غلام بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ڈرامے میں اسکاٹ لینڈ کا المیہ یہی ہے کہ میکبتھ ظلم پر ظلم ڈھا رہا ہے، لیکن اسکاٹ لینڈ اپنے آپ کو جاننے سے ڈرتا ہے۔ جب لوگ اپنے محسوسات اور جذبات کو قبول کرنے کی ہمت پیدا کر لیتے ہیں تو ظالم سے نجات ملتی ہے۔ ظالم چاہے کوئی فرد ہو یا گروہ، یا کوئی ملک، اس کا لاشعور یہ حقیقت خوب سمجھتا ہے، اور وہ محکوموں کو بے بس بنائے رکھنے کے لیے اُنہیں خود ان کے محسوسات سے بے خبر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے ظلم اور بے انصافی کا سب سے بڑا دشمن ادب ہوتا ہے، اور اسی لیے استحصال کے بل پر زندہ رہنے والے لوگ ادب کے مخالف ہوتے ہیں۔

لیکن آج کل مغرب میں کمال یہ ہوا ہے کہ انسانی شعور کو ختم کرنے کی کوشش میں سب سے آگے ہیں ادیب اور ماہرین نفسیات۔ مثلاً ولیم فاکنر ایک طرف تو ذہنی آزادی کی حمایت میں اپیلیں شائع کرتے ہیں، دوسری طرف انہوں نے کہا ہے کہ ایٹم بم نے سارے روحانی مسائل ختم کر دیے ہیں، اب صرف انسان کے زندہ بچنے یا نہ بچنے کا جسمانی مسئلہ باقی رہ گیا ہے۔ اگر روحانی مسئلے ختم ہو گئے ہیں تو ذہنی آزادی کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

اب یہ فائز صاحب بتائیں کہ ایٹم بم کے مقابلے میں جسم کو صرف جسم کے ذریعے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔

خیر، فائز نے تو ذہنی آزادی کا ڈھونگ برقرار رکھا بھی ہے۔ پچھلے چھ مہینے سے یورپ کے بہت سے ادیب، اور خصوصاً فرانس کے ادیب، صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ذہنی آزادی نہیں چاہیے بلکہ اپنی سلطنت چاہیے۔

اسی طرح نفسیات میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے جو شروع تو امریکہ سے ہوا ہے لیکن یورپ بھی جلد ہی اس کی حمایت کرے گا۔ امریکہ کے ماہرین نفسیات نے فرائڈ کے خلاف پچھلے سال سے ایک مقدس جہاد شروع کیا ہے۔ فرائڈ کی نفسیات اس اصول پر مبنی ہے کہ انسان صرف خود آگاہی کے ذریعے صحت مندی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ دنیا کے ہر مذہب اور ہر اخلاقی نظام کا بنیادی اصول ہے، اور مشرق نے تو ہمیشہ اسی بات پر زور دیا ہے۔ مگر امریکہ کے ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ خود آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کا مطلب ہے جان بوجھ کے پاگل بننا۔ ان کا خیال ہے کہ فرائڈ نے اس اصول کو سائنس کا درجہ دے کر انسانیت کو کنویں میں دھکیل رکھا تھا۔ اب یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ذہنی بیماریوں کا علاج صرف دواؤں کے ذریعے ہو، اور ذہن کے قصے کو درمیان نہ لایا جائے، یعنی ان کا نظریہ ہے کہ انسان کے اندر اصلی چیز جسم یا مشین ہے اور ذہن کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس طرح بات نفسیات اور علم طب سے چل کر فلسفے تک پہنچتی ہے۔ یہ ماہرین نفسیات ایک خاص نظام زندگی کے قائل ہیں، اور وہی انہیں مجبور کرتا ہے کہ فرائڈ اور خود آگاہی کے فلسفے کی مخالفت کریں۔ ورنہ جہاں تک دواؤں کے ذریعے ذہنی علاج کا تعلق ہے، یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں۔ خود آگاہی کے عمل میں مریض اور معالج دونوں کو جس کرب سے گزرنا پڑتا ہے، اس سے گھبرا کر فرائڈ خود کہا کرتا تھا کہ اگر ذہنی امراض کا علاج گولی کھانے سے ہو سکتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر فرائڈ کے شاگرد رائخ نے تو ایسا نفسیاتی علاج ایجاد بھی کر لیا ہے جس میں زیادہ عمل جسم پر ہی ہوتا ہے، لیکن اس نے خود آگاہی کی ضرورت پر فرائڈ سے بھی زیادہ زور دیا ہے۔ امریکن لوگوں نے کوئی نئی بات کہی ہے تو یہ کہ انسان کا ذہن اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔

اس نظریے کے تحت امریکہ کے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے پچھلے دو سال میں بہت سی ایسی دوائیں ایجاد کر ڈالی ہیں جن کے ذریعے پاگل مہینے بھر میں اچھے ہو جاتے

ہیں اور کام کاج کرنے لگتے ہیں۔ جس چیز کو یہ لوگ اچھا ہونا کہتے ہیں مجھے اس پر بھی شک ہے۔ دراصل یہ لوگ ایک مرض کو ختم کرکے دوسرا مرض پیدا کرتے ہیں جو ظاہر میں تو اتنا ڈراؤنا نہیں مگر فی الجملہ شاید معاشرے کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو۔ ان دواؤں سے (Schizophrenia) تو ضرور ختم ہو جاتا ہے مگر اس کے بجائے (Compulsion) پیدا ہو جاتی ہے۔

اسے بھی چھوڑیے۔ ان دواؤں سے امریکہ ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کو ایک خطرہ لاحق ہوا ہے۔ ان دونوں کا اثر سکون آور ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اعصابی بے چینی محسوس کرتے ہیں وہ بھی یہ گولیاں کھاتے ہیں، چنانچہ امریکہ میں سکون آور گولیاں کھانا ایک فیشن بن گیا ہے۔ اب یہ فیشن دوسرے ملکوں میں بھی پھیلے گا۔ ان گولیوں کا عمل یہ ہے کہ اعصابی اور عضلاتی نظام کا تناؤ کم کر دیتی ہیں اور اس طرح آدمی کی بے چینی خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ یہ سکون اصل نہیں بلکہ نقلی اور جھوٹا ہو گا۔ ایسی دوائیں مسلسل کھاتے رہنے سے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، یا تو جسم آہستہ آہستہ مرجھا کے ختم ہو جائے یا ایک دم سے پھٹ پڑے۔ یعنی اب ایک ایسی قوت ایجاد ہوئی ہے جو انسان کے لیے ایٹم بم سے بھی زیادہ مہلک ہے اور اس کا نام آبِ حیات رکھا گیا ہے خود آگاہی سے گھبرانے کا انجام یہی ہوتا ہے کہ پہلے تو آدمی دوسروں کو مارے، اور جب اس سے اُکتا جائے تو خودکشی کرلے۔ یہ ہیں فاکز صاحب کے جسمانی مسائل۔

پھر ان دواؤں کی ایک سماجی اور سیاسی معنویت بھی ہے جن گایوں کو یہ دوائیں کھلائی جاتی ہیں، وہ دودھ تو نہایت سکون کے ساتھ دینے لگتی ہیں، مگر دودھ کی غذائیت کم ہو جاتی ہے۔ یہ دوا کھانے کے بعد مرغیاں اتنی بُردبار ہو جاتی ہیں کہ ڈربے میں پانچ کے بجائے دس بھر دی جائیں تو بھی چوں نہیں کرتیں۔

چنانچہ یہ دوائیں انسانوں کو بھی بُردبار بنا سکتی ہیں۔

"لائف" کے ایک مضمون نگار نے تو یہ تجویز پیش بھی کی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے لوگ بہت گڑبڑ کرتے ہیں، یہ دوا لے جا کر وہاں کھیتوں میں چھڑکی جائے، یعنی سکون آلود گولیاں بھی ایٹم بم کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

اقتصادیات کے ماہر کہتے ہیں کہ اب ہمارا معاشی نظام اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں، مگر استعمار پرست اور زر پرست ملکوں کی انسانی حقیقت یہ ہے کہ

وہاں کے لوگ اب صرف دو طرح کے خواب دیکھتے ہیں یا تو دوسروں کی ہلاکت کے یا اپنی ہلاکت کے۔ اوپر سے یہ لوگ اپنے ادب اور اپنے شعور کا گلا گھونٹ رہے ہیں تاکہ ان خوابوں کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں۔ مغرب نے فرائڈ جیسا آدمی پیدا کیا تھا جس نے انسان کو اندرونی اور خارجی آزادی کا عملی راستہ دکھایا اور اب مغرب ہی فرائڈ کی جان کا دشمن ہے۔ شعور کی بدولت ہی مغرب نے اپنی سیاسی اور اقتصادی سلطنت تعمیر کی تھی، لیکن آج اس سلطنت کو بچانے کی خاطر مغرب شعور کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ سلطنت تو الگ رہی، شعور کے بغیر کیا انسان اپنی زندگی محفوظ رکھتا ہے؟ کیا مغرب کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال ہی پوچھ لے؟

اور مشرق کے سامنے یہ سوال ہے کہ اپنے شعور کی توسیع کے بغیر کیا ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں، کیا ایٹم بم کے زمانے میں اس کے بغیر ہم اپنی جان بچا سکتے ہیں؟

اگر مغرب مر رہا ہے تو اس میں صرف خوش ہونے کی بات نہیں۔ اگر مشرق اپنے شعور کی پرورش سے غافل رہا تو ممکن ہے مغرب ہمیں بھی ساتھ لے ڈوبے۔ مشرق کی موت اور زندگی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ انسانی شعور کو اپنی زندگی میں کیا درجہ دیتا ہے۔ یہ انتخاب ویسے ہے مشکل کام کیونکہ ایک طرف تو شعور کو اپنی زندگی میں کیا درجہ دیتا ہے۔ یہ انتخابات ویسے ہے مشکل کام کیونکہ ایک طرف تو شعور کی جان گسل ہفت خواں ہے، اور دوسری طرف سکون آور گولیاں۔

(جنوری ۱۹۵۷ء)

فراق اور ہجویاتِ اثر

اردو کے ادبی حلقوں میں جو ذہنی اضمحلال طاری ہے، اس کی شہادت اس سے بہتر کیا ہو گی کہ لوگ ہنسنے ہنسانے کے نام سے ڈرنے لگے ہیں۔ پہلے تو رسالوں نے خود ہی فراق صاحب کے بارے میں اثر لکھنوی صاحب کے اعتراضات شائع کیے، اور اب جو سلسلہ چل پڑا تو خود ہی گھبرا رہے ہیں، اور "دونوں بزرگوں" کو مشورہ دیتے ہیں کہ تحمل سے کام لیں۔ اول تو "بزرگوں" کا لفظ ہی محل نظر ہے۔

اثر صاحب تو واقعی بزرگ ہیں کیونکہ وہ عمر میں ہم سب سے بڑے ہیں، اور اس اعتبار سے ہم پر ان کا احترام واجب ہے، لیکن فراق صاحب تو محض "بزرگ" نہیں ہیں اگر ہم اردو زبان کے چار بڑے شاعروں کا انتخاب کرنا چاہیں تو میر، غالب، اقبال اور فراق یہی چار نام آئیں گے۔ اتنے بڑے شاعر "بزرگ" نہیں ہوا کرتے۔ وہ تو ہر زمانے میں اپنے پڑھنے والوں کے ہم عصر ہوتے ہیں۔ ذرا میر یا غالب کے نام کے ساتھ "بزرگ" کا لفظ لگا کر دیکھیے تو کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

پھر اس چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ اگر چلتا ہی رہے تو کیا برا ہے۔ فراق صاحب نے نثر لکھنی چھوڑ ہی رکھی ہے۔ اس بہانے ان کی کوئی تحریر ہی پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ فراق صاحب کے انداز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹی بات کو چھوٹا نہیں رہنے دیتے، بلکہ ہر چیز کو پوری انسانی زندگی اور تہذیب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اثر صاحب سے مناظرے کے دوران میں بھی یہی ہوا ہے، اور وہ چلتے چلاتے ادب کے بارے میں ایسی دقیق باتیں کہہ گئے ہیں جو دوسروں کے "سنجیدہ" مضامین میں بھی نہیں ملتیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فراق صاحب کو غصہ آ جائے تو ان کا ذہن اور تیزی سے کام کرتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مناظرہ بازی چلتی ہی رہے تو اس میں ہم اردو پڑھنے والوں کا

فائدہ ہی ہے۔

ویسے ذاتی طور پر مجھے اثر صاحب کے مضامین زیادہ پسند آئے ہیں کیونکہ جب پُر تکلف، مقطع اور شیروانی کے بٹن گلے تک بند رکھنے والے حضرات غصے میں آ کے اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں تو مجھے یہ تماشا بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے، ایسا تماشا دیکھ کے آدمی انسانی تہذیب کے بہت سے راز سمجھتا ہے۔

اردو رسالوں نے تو اس مناظرے کو روکنے کی اپنی سی کوشش کر ہی لی، مگر پچھلے مہینے ساقی میں فراق صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اسے پڑھ کے مجھے ایک اور ہی بدگمانی ہوئی۔ پندرہ سولہ سال پہلے جب میں الہ آباد میں پڑھتا تھا تو مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اثر صاحب سے فراق صاحب کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں، بلکہ ایک مرتبہ چند طالب علموں نے اثر صاحب کا مجموعہ کلام پڑھ کر فراق صاحب سے کہا تھا کہ اس میں تو زحافات ہی زحافات ہیں، شاعری نظر نہیں آتی، تو فراق صاحب نے اثر صاحب کے بارے میں ایک کلمہ خیر ہی کہا تھا کہ چلو ادب میں ایسے لوگ بھی ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے اسی دوران میں دونوں کے درمیان کوئی بدمزگی پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن فراق صاحب تو ایسے آدمی نہیں کہ بات دل میں رکھیں ان کی لوگوں سے لڑائی بھی ہوتے دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ہفتہ بھر میں پھر ویسے کے ویسے ہو گئے۔ چنانچہ فراق صاحب کا نیا مضمون پڑھ کر مجھے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ فراق صاحب کی اثر صاحب سے صلح صفائی ہو چکی ہے اور فراق صاحب نے اپنے دوست کے نام کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے اثر صاحب کے متعلق یہ شعر کہے ہیں۔ اثر صاحب کے کلام کو چاہے لوگ یاد رکھیں یا نہ رکھیں، لیکن فراق صاحب کے کہے ہوئے ہجویہ اشعار کی بدولت اثر صاحب کا نام اردو ادب کی تاریخ کے حاشیے میں تو ضرور آ جائے گا۔ ایک طرح فراق صاحب نے اردو ادب کے استادوں کے لیے مصیبت ضرور پیدا کر دی ہے۔ پوپ اپنے زمانے کے متشاعروں پر ہجویں لکھ کے مرگیا۔ مصیبت انگریزی پڑھنے والوں کی آتی ہے کہ طالب علم بیچ میں پوچھتے ہیں کہ فلاں صاحب کون تھے اور فلاں صاحب کون تھے۔ بہر حال فراق صاحب تو دوست نوازی کر ہی گزرے۔ یہ چند شعر فراق صاحب کی لکھی ہوئی "مناجاتِ اثر" کے ملاحظہ فرمائیے، اور کہیے کہ اردو ادب انہیں کیسے بھول سکے گا۔

یارب مجھے میری ہی زباں دے
یعنی کمزوریِ بیاں دے
اشعار تمام پھسپھسے ہوں
افکار تمام لجلجے ہوں
ہر جذبہ عشق گلگلا ہو
ہر شعر کا چہرہ پلپلا ہو
ہر شعر ادا سے منہ چھپائے
بوڑھے نخروں کا لطف آئے
پیہم تخیل کھانستی ہو
افکار کی سڑسڑی بندھی ہو
ہر بیت ادھیڑ عمر کی ہو
یعنی کافی اُتر چکی ہو
بے حس غمزوں سے میری بیتیں
ٹھنڈے نخروں سے میری بیتیں
بڑھیوں کی طرح مٹکتیاں ہوں
سوکھی چھتیاں لٹکتیاں ہوں

یہ مناجات ہی کیا، فراق صاحب نے اپنے نئے مضمون میں جتنے شعر بھی لکھے ہیں، اردو کے ہجویہ اَدب میں شاہکاروں کا درجہ رکھتے ہیں یہ اردو اَدب میں اضافہ تو ضرور ہے لیکن فراق صاحب کی دوست پروری اچھی بات نہیں۔ ظاہر تو کرتے ہیں کہ ہماری لڑائی ہو رہی ہے، لیکن در پردہ اپنے دوست اثر لکھنوی صاحب کو بقائے دوام بخش رہے ہیں۔ یہ دھاندلی ہے۔ میَں "ساقی" کے ذریعے فراق صاحب کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔

(ستمبر ۱۹۵۷ء)

کچھ ہجو گوئی کے بارے میں!

ساقی میں فراق صاحب کے جو ہجویہ اشعار شائع ہوئے تھے، ان سے اور کچھ نہیں تو ایک فائدہ ضرور ہوا ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ ہندوستان پاکستان میں شریف، نیک دل اور معصوم لوگوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے جس دن سے فراق صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا، جو شرافت دلوں میں چھپی پڑی تھی، وہ ابھرتی چلی آ رہی ہے۔ "بزرگ لوگ" ساقی سے اپیلیں کر رہے ہیں کہ اس "طوفانِ بے تمیزی" کو روکا جائے، لیکن ساتھ اپنی پاک نفسی کے باوجود یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ساقی نے فراق صاحب کا مضمون اشاعت بڑھانے کی غرض سے چھاپا ہے۔ خیر ساقی والوں کا گھٹیا پن مسلم، مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اثر لکھنوی صاحب کئی سال سے فراق صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے ڈومینوں کی زبان استعمال کر رہے ہیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اثر صاحب اسی قسم کی زبان کے ماہر ہیں، چشم ما روشن دلِ ما شاد ہمیں دو چار نئے لفظ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کرے اثر صاحب ہمارے علم میں اسی طرح اضافہ کرتے رہیں لیکن "نیک دل حضرات کو کیا ہوا تھا کہ انہوں نے اثر صاحب کے خلاف آج تک احتجاج نہیں کیا، اور بولے تو اس وقت جب فراق صاحب نے تخلیقی انداز میں اثر صاحب کا جواب دیا۔ یوں واسطے تو ادب، تہذیب، شرافت سب کے دیے جا رہے ہیں۔ لیکن اصل قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "شرفائے ادب" اثر صاحب کو تو ہر قسم کی زبان استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں مگر یہ نہیں چاہتے کہ اثر صاحب کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی کہے۔

دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ جس مہینے ساقی نے فراق صاحب کے ہجویہ اشعار چھاپے ہیں، اسی مہینے صحیفہ نے ادبی معرکوں پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں مندرجہ ذیل قسم کے اشعار نقل ہیں ۔

سینو اے اہل سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام

تیرہ رو، مضحک سرا پازور ہے
دُم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے

بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا بُو تیمار
آتے جاتے جاویں، اس کو جوتے مار

عقل سے کس طرح ہوئے بہرہ ور
ہے کسی حافظ کا نطفہ ماچہ خر

جس جگہ منہ میں رکھی میں نے زباں
ہوتے اس جاگہ جو مرزا بے گماں

استرے کانوں میں اپنے باندھ کر
کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

فراق صاحب کی ہجو نگاری ''طوفانِ بے تمیزی'' سہی، لیکن خدائے سخن میر تقی میر کے متعلق کیا حکم ہے۔ اگر فراق صاحب کے سو پچاس ہجویہ اشعار کہہ دینے سے، بقول پروفیسر آل احمد سرور، ہمارے ادب کا ستارہ گردش میں آجائے گا، تو کیا میر کی ہجو نگاری کا بھی یہی نتیجہ نکلا تھا؟ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ ''فراق صاحب اور اثر صاحب کی چھیڑ چھاڑ'' شرفائے ادب کے لیے بڑی تکلیف دہ ہو گئی ہے۔'' میں جاننا چاہتا ہوں کہ میر کے مندرجہ بالا ہجویہ اشعار پڑھنے کے بعد وہ میر کا شمار شرفائے ادب میں کر سکیں گے یا نہیں؟

چلیے ہم مان گئے کہ ساقی گھٹیا رسالہ ہے، اور اشاعت بڑھانے کی خاطر اس نے

فراق صاحب کا مضمون چھاپا لیکن صحیفہ تو حکومت مغربی پاکستان کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے اور اس کے مدیر عابد علی عابد صاحب ہیں جو اُردو اور فارسی ادب کے عالم ہیں اور شاعری کے معاملے میں ساقی کے خلاف احتجاج کرنے والوں سے بہتر مذاق رکھتے ہیں، مگر انہوں نے جو میر کے ہجویہ اشعار چھاپے ہیں ان کے خلاف نہ تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی بولے، نہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، نہ پروفیسر آل احمد سرور۔ کیا ہم امید رکھیں کہ مہینے بھر کے اندر اندر یہ حضرات میر تقی میر اور حکومت مغربی پاکستان کے رسالے صحیفہ کے خلاف اپنے احتجاج شائع کر دیں گے؟

جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعلق ہے، میں یہ سمجھ کے خاموش رہتا ہوں کہ وہ نیک دل بزرگ ہیں، اور انہیں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا پسند نہیں لیکن پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے اخبار "ہماری زبان میں جو اداریہ لکھا ہے تو پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو ہند کے نہیں بلکہ انجمن ترقی دروغ کے سیکرٹری ہیں۔ نیاز مندانِ لاہور نے کسی کے متعلق لکھا تھا کہ ہموں بقال پر کیا ہاتھ اٹھائیں۔ کچھ ایسا ہی خیال میرا پروفیسر صاحب کے بارے میں ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے نقاہت کی ٹٹی کے پیچھے سے جو افترا پردازی کی ہے، اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ پروفیسر آل احمد سرور کا نام اپنے قلم سے لکھوں۔

اگر پروفیسر صاحب کو واقعی صلح صفائی منظور تھی تو وہ دردمندانہ اپیل پر اکتفا کرتے، لیکن انہوں نے سارا الزام فراق صاحب کے سر رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے بیان کے مطابق اس ادبی لڑائی کی کہانی یوں ہے "اثر صاحب نے ادبی تنقید کے رنگ میں فراق صاحب کی شاعری پر چند اعتراضات کیے تھے جس پر فراق صاحب کو غصہ آگیا۔ فراق صاحب کا قصور یہ ہے کہ وہ ادبی بحث میں بہت جلد اوچھے وار پر اُتر آتے ہیں۔ انہیں اپنے غصہ پر قابو نہیں رہتا۔ چنانچہ انہوں نے مشتعل ہو کر اثر صاحب کی ذات اور شخصیت پر حملے شروع کر دیے۔"

اول تو پروفیسر صاحب نے بالکل غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اثر صاحب نے ابتدا ہی بازاری زبان سے کی ہے اور وہ کئی سال سے فراق صاحب کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں جو کم سے کم پروفیسر صاحب کے معیارِ شرافت پر پورے نہیں اتریں گے۔ دوسری غلط بیانی پروفیسر صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ فراق صاحب اپنے اوپر اعتراض

برداشت نہیں کرسکتے۔ جو لوگ فراق صاحب سے مل چکے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ فراق صاحب کو اپنے اوپر اعتراض سننے میں مزا آتا ہے اور ان کا جواب دینے میں بھی۔ تیسرا سفید جھوٹ یہ ہے کہ فراق صاحب کو اپنے غصے پر قابو نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ اٹھا ہے کہ فراق صاحب اپنے غصے کو کبھی نہیں دباتے، لیکن غصے کے اظہار کے لیے تو بڑی شرافت نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس آدمی کو غصہ نہ آئے، اس کے دل میں ضرور کھوٹ ہوتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کسی نفسیات کے طالب علم سے پوچھ لیں، غصہ نہ آنا تو بذاتِ خود ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ رہی یہ بات کہ فراق صاحب غصے میں اوچھے وار پر اترتے ہیں تو یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔

مگر فراق صاحب کا ذہن کبھی اس شدت اور نزاکت کے ساتھ کام نہیں کرتا جتنا غصے میں مثلاً زیر بحث مضمون ہی کو لیجیے۔ اپنی تحریر کی ابتدا انہوں نے اس بات سے کی ہے کہ ہنسنے ہنسانے کا تہذیب میں کیا مقام ہے کیا یہ اوچھا وار ہے (اوچھے ہتھیار کی بجائے اوچھا وار۔ پروفیسر آل احمد سرور کی اختراع ہے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں)۔

پروفیسر صاحب کی جانبداری تو اسی بات سے ثابت ہوتی ہے کہ فراق صاحب کو انہوں نے صرف ایک "قافیہ طراز منفرد شاعر" بتایا ہے اور اثر صاحب کی نظم و نثر کو "اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ" کہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے فراق صاحب کی ہجو سے اہل نظر کی آنکھیں کچھ ایسی بھیگیں کہ یہ سرمہ بہہ چلا، اسی لیے پروفیسر آل احمد سرور صاحب جیسے از اہل نظر بوکھلا گئے، چنانچہ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ اگر اثر صاحب کی حمایت میں بولنا ہے تو کوئی معقول قسم کی دلیل تو لائیں۔ کہتا انہیں صرف یہ کہتا کہ لوگو، ہمارے اثر صاحب کو نہ چھیڑو بجائے خود یہ خیال نہایت مبارک ہے لیکن پروفیسر صاحب نے دل کی بات نہیں کی، بلکہ ادب، شرافت اور تہذیب کی دہائی دی ہے۔ پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اگر یہ ہجوگوئی جاری رہی تو ہمارے ادب کا ستارہ گردش میں آجائے گا لیکن پروفیسر صاحب دنیا کی کسی بڑی تہذیب یا بڑے ادب کی کوئی مثال پیش نہیں کرسکتے جس کا ستارہ محض ہجوگوئی کی بدولت گردش میں آیا ہو۔ البتہ اردو ادب کا ستارہ واقعی گردش میں ہے، کیونکہ جو لوگ اپنے آپ کو ادیب سمجھتے ہیں، وہ صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اپنے حقیقی جذبات پیش کرنے کی جرات نہیں رکھتے۔ جن کے دل میں شرافت کا احترام ہو تو ہو، لفظوں کا احترام ذرا نہیں۔ مثلاً میں ابھی عرض کروں گا کہ پروفیسر صاحب نے جملے کے جملے ایسے لکھ دیے

ہیں جن سے کوئی واضح مطلب بر آمد نہیں ہوتا۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، پروفیسر صاحب کو اس ادبی لڑائی میں تین قسم کے اعتراض ہیں:

۱۔ ہجو گوئی تہذیب کے خلاف ہے۔

۲۔ اگر ہجو لکھے بغیر چارہ نہ ہو تو کم سے کم اس میں ذاتی اور شخصی رنگ نہ آنے پائے۔

۳۔ حالانکہ پروفیسر صاحب نے صاف طور سے نہیں کہا، لیکن غالباً ان کا منشا یہ ہے کہ ہجو میں کوئی رکیک بات، مثلاً 'چرکیں'، کا رنگ نہ آنے پائے۔

اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پروفیسر صاحب نے یہ کس طرح فرض کر لیا کہ تہذیب اور ہجو نگاری میں باپ مارے کا بیر ہے۔ یونانی تہذیب، رومی تہذیب، قرونِ وسطیٰ کی تہذیب، خود اپنی پرانی تہذیب غرض دنیا کی کون سی ایسی بڑی تہذیب ہے جس میں ہجو نگاری کو ایک قابلِ قدر جگہ حاصل نہ رہی ہو بلکہ یونان اور روم میں تو ہجو نگاری کو ایک لازمی سماجی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ کون سی تہذیب کو معیار سمجھتے ہیں۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ انجمن ترقی اردو ہند کے سیکرٹری صاحب جو ارشاد فرمادیں، ہم اسے قرآن و حدیث سمجھ لیں۔ پروفیسر آل احمد سرور وقتاً فوقتاً ذرا ہاتھ پیر بچا کے ترقی پسندی سے بھی لگاوٹ بازی کرتے رہے ہیں لیکن کبھی انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہجو نگاری کی عظیم روایت کا زوال سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں صرف ایک سرمایہ دارانہ معاشرہ ایسا ہے جو ہجو گوئی سے مستقل ڈرتا رہا ہے، کیونکہ اس معاشرے کے دل میں چور ہے۔ کیا پروفیسر صاحب کو اتنی بات بھی معلوم نہیں روس کی اشتراکی تہذیب میں ہجو گوئی کھلم کھلا اور بے جھجک طور سے ہوئی ہے۔ نہ معلوم پروفیسر صاحب کے ذہن میں دنیا کی کون سی تہذیب ہے جس کا واسطہ دے کر وہ فراق صاحب اور اثر صاحب کو ہجو گوئی سے روکنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک ہماری پرانی تہذیب کی روایات کا تعلق ہے، انہیں تو وہ مانتے نہیں، کیونکہ انہوں نے خود کہا ہے "ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کی تقلید ہر حال میں لازم نہیں۔" چلیے اگر پروفیسر صاحب کی رائے یہی ہے تو ہم نے ماضی کو چھوڑا۔ اب زمانہ حال میں آئیے۔ یہاں پروفیسر صاحب صاف طریقے سے ہماری رہنمائی نہیں کرتے۔ انہوں نے بس اتنا کہا ہے "جدید دور میں زندگی کے ہزاروں کرشمے پکار پکار کر اہل بصیرت کو دعوتِ نظر دے رہے ہیں، پروفیسر

صاحب کے اہلِ بصیرت ہونے میں جو شک لائے وہ کافر، لیکن ہم جیسے عام لوگ جدید دور کے کرشموں کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں، پروفیسر صاحب نہیں بتاتے۔ اگر ان کرشموں سے مراد نئی نئی قسم کے ہوائی جہاز ہیں تو شاید ہمارا فریضہ یہ ہو گا کہ ہر وقت بیٹھے آسمان کو تکا کریں، لیکن اگر پروفیسر صاحب جدید دور کے کرشموں میں ادب کو شامل کرتے ہیں تو پھر صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم بیسویں صدی کے بڑے ادیبوں کی کتابیں پڑھ کر معلوم کریں کہ ان کا ہجوگوئی کے سلسلے میں کیا رویہ رہا ہے۔

لایئے سب سے پہلے بیسویں صدی کے سب سے بڑے مغربی ادیب جیمس جوائس کو لیتے ہیں جس کے بارے میں ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ وہ صرف ادیب نہیں بلکہ یورپ کی پوری تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ پھر جوائس ایسا آدمی نہیں جسے محض پھکڑباز کہہ کر ٹلایا جا سکے۔ آج کل نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کی کتابیں عیسوئیت کی روح میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اب اس کی ہجوگوئی کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے جان بوجھ کر چرکیں کے رنگ کا ٹکڑا انتخاب کیا ہے کیونکہ "شرفائے ادب" کو سب سے زیادہ اسی پر اعتراض ہے، جوائس اپنے ناشر کی زبان سے کہلواتا ہے:

'll penance do with farts and groans, Kneeling upon my marrow hones. This very next I lent I will unbare my penitent buttocks to the air and sobbing beside my printing press my awful sin I will confess

اس کے بعد جوائس کی ایک دوسری ہجو کی چار لائنیں دیکھیے جن میں اس نے بتایا ہے کہ سماج میں ہجو نگار کا فریضہ کیا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ جوائس یہاں ہجونگاری کے متعلق یونانیوں کا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے جس کی تائید ارسطو بھی کرتا ہے:

Myself unto myself wil give this name katharsis, pargative thus I relieve their timid arses, perform my office of katharsis,

اب پروفیسر صاحب فرمائیں کہ ان شعروں سے انگریزی ادب کا ستارہ کس طرح گردش میں آیا۔ ممکن ہے وہ اعتراض کریں کہ یہ اشعار تو ایک بڑے آدمی کے کمزور پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں، مگر میں نے یہ اشعار ایک ایسی کتاب سے لیے ہیں جس کا نام ہے Essential james joyce اور یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، ہیری لیول نے جو امریکہ کے ایک

نہایت ممتاز نقاد ہیں۔

اب اہلِ بصیرت جدید دور کا دوسرا کرشمہ دیکھیں۔ یورپ کی شاعری میں جتنے بھی اسالیب بیان استعمال ہوئے ہیں، آج ان کا سب سے بڑا ماہر ایذرا پاؤنڈ ہے جسے ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنا استاد مانا ہے۔ پھر اس کی غیر مکمل نظم Cantos کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ جب پوری ہو جائے گی تو بیسویں صدی کے انگریزی ادب میں عظیم ترین نظم ثابت ہوگی۔ پاؤنڈ خالی شاعر بھی نہیں۔ وہ کنفوشش کی اخلاقیات کا پیرو اور مبلغ ہے۔ اس نظم کا اقتباس حاضر ہے یہ بھی چرکیں کے رنگ میں ہے:

Addressing crowds through their arse holes, addressing the multitudes in the ooze.

چلتے چلاتے ایک اقتباس اور دیکھیے:

Claiming that the shit used tobe blacker and richer and the fabians crying for the pertrification of putrefaction, For a new dung-Flow cut in lozenges.

اس قسم کے اشعار بے خیالی میں یا غصے کے مارے آپے سے باہر ہو کر نہیں لکھے۔ پاؤنڈ کا عقیدہ ہے کہ وہ ایسے معاملات میں بھی مغربی شاعری کی دقیع ترین روایات کی پیروی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور کو معلوم ہونا چاہیے کہ غزل ہی نہیں بلکہ ہجو بھی اس کیفیت سے پیدا ہوئی ہے جسے ورڈزورتھ نے Emotion recollected in tranguilfty کہا ہے۔ یہ بات تو فراق صاحب کے بس میں بھی نہیں تھی کہ وہ غصے کے مارے بے قابو ہو جاتے اور ساتھ "مناجات اثر" جیسی چیز بھی لکھ دیتے۔

مغربی ادب کے نمونے تو میں نے پیش کر دیے لیکن ممکن ہے کہ جدید دور کے کرشموں سے پروفیسر صاحب کا اشارہ روس کی طرف ہو۔ لہٰذا روس کی اشتراکی تہذیب سے بھی ایک مثال لیجیے۔ ادب اور فن کے میدان میں اشتراکی روس نے جو سب سے بڑا آدمی پیدا کیا ہے، وہ آئسنسٹائن ہے۔ اسے فلم کا شیکپیئر کہا جاتا ہے۔ فلمسازی تو الگ رہی، اس کی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ میرے خیال میں ارسطو کے تنقیدی نظریوں کو یورپ کی ادبی تاریخ میں شاید دو چار آدمیوں نے ہی اس طرح سمجھا ہو گا۔ شرفائے ادب کو چاہے اس پر افسوس ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی اپنے ہمعصر پوڈوفکن سے لڑائی رہتی تھی اور ان دونوں کے درمیان چرکیں والا رنگ اکثر چلتا تھا۔ فی الحال ایک معمولی سا نمونہ ملاحظہ

فرمایئے۔ آئسنسٹائن نے اپنے کتے کا نام پوڈوفکن رکھ دیا تھا۔ کیا اس بات سے روس کی اشتراکی تہذیب کا تہذیب کا ستارہ گردش میں آگیا؟

رہی یہ بات کہ تنقید کو شخصی رنگ سے پاک ہونا چاہیے تو پرانے اَدب کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے، لیکن پروفیسر صاحب اس کی تقلید کے قائل نہیں۔ لہٰذا میں انہیں یاد دلاؤں گا کہ یورپ کی کلاسیکی تہذیبوں میں ہجو نگار کو پورا پورا حق حاصل تھا کہ وہ جس آدمی کی ہجو لکھے، اس کا نام بھی لے۔ اسی لیے تو پرانے معاشرے میں ہجو نگار ایک بہت بڑی طاقت تھا اور ظالم، جابر اور مکار لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ ہجو نگار کے اس حق کو جدید دور کے مغربی شاعروں نے پھر سے استعمال کیا ہے بلکہ ایذرا پاؤنڈ تو بار بار کہتا ہے کہ جو معاشرہ، ہجو نگار کو یہ حق نہیں دیتا کہ لوگوں کا نام لے سکے، اس کی بنیاد فریب اور دغا پر ہے کیونکہ ذاتیات کو بحث میں لائے بغیر ہجو نگار اپنا سماجی فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ طنز میں لکھنے والے کو لوگوں کا نام لینے اور ذاتیات کو زیر بحث لانے کا کس حد تک حق پہنچتا ہے، اس کی تازہ ترین مثال سارتر کا ڈرامہ "نیکر اسوف" ہے جو لوگ زر پرستی کے حامی ہیں، وہ سارتر کو مطعون کرتے ہیں کہ اس نے زندہ لوگوں کے نام لے کر بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے، لیکن سارتر کہتا ہے کہ میں مغربی ادب کی مسلمہ اقدار کی پیروی کر رہا ہوں۔

پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ جن رسالوں نے اثر صاحب اور فراق صاحب کے مضمون چھاپے ہیں، انہوں نے اردو اَدب کو رُسوا کیا ہے۔ مدرس لوگ رسوائی کسے کہتے ہیں اور نیک نامی کسے، یہ تو میں جانتا نہیں، البتہ یہ مجھے معلوم ہے کہ رسالے والوں کا فریضہ کیا ہے۔ ادبی رسالے کا تو ایک ہی فریضہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی چیزیں شائع کرے جو حقیقی معنوں میں ادب ہوں۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک فراق صاحب ایک قابل قدر اور اہم شاعر ہیں اور اثر صاحب کی نظم و نثر دونوں اہل نظر کی آنکھ کا سُرمہ ہیں۔ جب ان دونوں کو پروفیسر صاحب تک کی بارگاہ سے سند مل چکی ہو تو ہم رسالوں والے گھٹیا لوگ تو ان حضرات کی ہر تحریر کو ہی ادب سمجھیں گے۔

ذاتی طور سے میں کس چیز کو ادب سمجھتا ہوں، اس کی بھی ایک مثال حاضر ہے۔ فراق صاحب کے جس مضمون پر پروفیسر صاحب اتنے چراغ پا ہوئے ہیں، اس میں سے ایک شعر لیتا ہوں۔ اثر صاحب بزرگ ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں، اس لیے مجھے

افسوس ہے کہ اس شعر میں ان کا نام آتا ہے لیکن فراق صاحب نے رکیک الفاظ استعمال کرنے کے باوجود ادبِ انسانی اور انسانی شخصیت کے ارتقاء کے متعلق ایک بہت بڑی بات کہی ہے، اس لیے میں یہ شعر نقل کرنے پر مجبور ہوں ؎

کی تھی نہ مہینوں سے جو جذبات کی پاکی
ہر بیت اثر داد کھجاتی نظر آئی

یہ پروفیسر آل احمد سرور کے تو پلے پڑے گا نہیں، لیکن یہاں فراق صاحب نے وہ بات کہی ہے جو ایمرسن نے شاعری کے بارے میں کہی تھی — شاعری جذبات کی پرورش کا نہیں بلکہ جذبات کی تہذیب کا نام ہے۔ فراق صاحب اپنے مضامین میں بار بار کہتے رہے ہیں کہ شاعری جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جذبات کی قلب ماہیت کرتی ہے۔ یہ بات ہمیں فراق صاحب کی غزلوں کے سینکڑوں اشعار میں نظر آتی ہے۔ آج یہی چیز ان کے ہجویہ شعر میں بھی ملاحظہ فرمایئے چونکہ ہم جذبات کی ایسی قلب ماہیت کو ادب سمجھتے ہیں، اسی لیے ہم نے فراق صاحب کے ہجویہ اشعار ساقی میں شائع کیے تھے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک چاہے یہ اردو ادب کی رسوائی ہو، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اگر ساقی کے صفحات میں ایک شعر بھی ایسا شائع ہوا ہے جسے سچا ادب کہا جا سکے، تو ہم اس بات پر فخر کریں گے، اور ہمیں واقعی فخر ہے کہ ساقی کے ذریعے فراق صاحب ایک ہجو نگار شاعر کے طور پر پہلی بار اردو پڑھنے والوں کے سامنے آئے۔ اسی طرح اگر اثر صاحب بھی فراق صاحب کے خلاف ایسے ہجویہ اشعار لکھیں جو واقعی ادب ہوں تو ہم انہیں بھی چھاپیں گے، اور انہیں چھاپ کر فخر محسوس کریں گے۔ ہم رسالوں والے گھٹیا سہی، لیکن ہمارا تو کام ہی یہ ہے کہ اُردو ادب میں اضافہ کریں۔ پروفیسر صاحبان سے ہماری استدعا ہے کہ وہ کم سے کم اپنا کام تو کر کے دکھائیں۔ آل احمد سرور صاحب پروفیسر ہیں، ہم ان سے اتنی توقع تو کر سکتے تھے کہ وہ ایک واضح خیال واضح الفاظ میں پیش کر سکیں گے، لیکن وہ اتنا بھی نہ کر سکے۔

بہرحال اب پروفیسر صاحب ساقی سے اُلجھ پڑے ہیں تو میں اُن کی خدمت میں ایک بات اور عرض کروں گا، میں اُنہیں ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصے میں وہ ہمیں بس اتنا بتا دیں کہ دنیا کی وہ کون سی بڑی تہذیبیں یا ادب ہے جس کا ستارہ محض ہجو گوئی کی بدولت گردش میں آیا ہو۔ یہ ایک سیدھا سادا سوال ہے، اُمید ہے کہ پروفیسر صاحب ہماری معلومات میں اضافہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر وہ ایک مہینے کے عرصے میں بھی ایسی کوئی مثال

نہ ڈھونڈ سکے تو پھر شرافت نفس کا تقاضا ہے کہ وہ ساقی سے معافی مانگیں۔ ہم دو گھٹیا آدمی یعنی شاہد احمد دہلوی صاحب اور یہ خاکسار، پروفیسر صاحب کے جواب کا انتظار کریں گے!

(نومبر ۱۹۵۷ء)

مجموعے / افسانے / ناول

مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (ناول)

مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (افسانے)

مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (داستان، مضامین، ڈرامے)

مجموعہ راجندر سنگھ بیدی

مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد

مجموعہ محمد حسن عسکری

کتاب	مصنف
چہار چمن (ناول)	بانو قدسیہ
مسافرنامے (سفرنامے)	رفیق ڈوگر
جنم کہانیاں (کہانیاں)	انتظار حسین
قصہ کہانیاں (کہانیاں)	انتظار حسین
بارش اور خوشبو (افسانے)	اے حمید
منٹو راما	سعادت حسن منٹو
منٹو نما	سعادت حسن منٹو
منٹو نامہ	سعادت حسن منٹو
منٹو تراجم / باقیات	سعادت حسن منٹو
منٹو کہانیاں	سعادت حسن منٹو
منٹو ڈرامے	سعادت حسن منٹو
سرخ فیتہ	قدرت اللہ شہاب

ISBN 969-35-0837-8
9789693508376

Rs 450.00